بسم اللہ الرحمن الرحیم
فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون
فتاویٰ حصاریہ
و
مقالات علمیہ
مصنف
مولانا حضرت عبدالقادر حصاری
www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون

فتاویٰ حصاریہ

و

مقالاتِ علمیہ

مصنف

محقق العصر حضرت مولانا عبد القادر حصاری رحمہ اللہ

جلد چہارم

کاوش و پیشکش
شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف حفظہ اللہ
بانی دار الحدیث راجووال اوکاڑہ

جمع و ترتیب
حضرت مولانا ابراہیم خلیل حفظہ اللہ
آف حجرہ شاہ مقیم اوکاڑہ

ناشر
عبد اللطیف ربانی مکتبہ اصحاب الحدیث
حافظ پلازہ مچھلی منڈی بالمقابل جلال دین ہسپتال
اُردو بازار، لاہور

نام کتاب .... فتاویٰ حصاریہ ومقالات علمیہ

نام مصنف .... محقق العصر حضرت مولانا عبدالقادر حصاری رحمہ اللہ

کاوش وکوشش .... شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف (راجووال)

نام مرتب .... مولانا ابراہیم خلیل حجرہ شاہ مقیم

طبع اوّل 2012ء

مطبع .... العربیہ پرانی انارکلی لاہور

قیمت مکمل سیٹ .... سات ہزار روپے

تعداد 600

ناشر

مکتبہ اصحاب الحدیث

حافظ پلازہ، مچھلی منڈی بالمقابل جلال الدین ہسپتال، اردو بازار، لاہور

042-37321823 - 0301-4227379

فہرست عنوانات جلد چہارم

قرأت سے متعلقہ مسائل

کیا نماز میں زبان سے نیت کے الفاظ پڑھنا جائز ہے؟	۸
مدرک رکوع مدرک رکعت نہیں	۱۰
مولوی عبداللہ کا رکوع کی رکعت میں ہیر پھیر	۲۳
رکوع میں ملنے سے رکعت نہیں ہوتی	۲۹
نماز میں جہری و سری دونوں (طرح) بسملہ پڑھنا جائز ہے	۳۶
سورہ فاتحہ کی فضیلت اور مقلدین میں اس کی بے قدری	۴۱
نماز میں ترتیب قرآن	۵۵
نماز میں سورتوں کے تعین کا مسئلہ	۵۸

رکوع کے مسائل

مقتدی کو سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کا حکم	۶۰
نماز میں رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا خلاف سنت ہے	۶۵
مذاکرہ علمیہ بابت ارسال الیدین بعد الرکوع	۶۸

درود شریف کے متعلقات

قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود پڑھنے کا مسئلہ	۷۳
برھان حصاری بجواب تعاقب قاری	۷۶
مسائل ثلاثہ کی تحقیق	۱۱۳
نماز میں درود "دوران قرأت"	۱۲۰

دفع مصیبت کے لئے درود پڑھانا ۱۳۶
مستنداور صحیح درودو سلام کون سا ہے؟ ۱۳۷

سہو کا بیان

سہو کے سجدے کب کئے جائیں ۱۳۴
بھول کر پانچ رکعت نماز ۱۳۸
کیا قعدہ اولیٰ میں بھول کر حرکت کرنے سے سجدہ سہو لازم ہے ۱۳۹

دعا بعد الفریضہ

فرض نمازوں کے بعد بالالتزام ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟ ۱۴۷
نماز کے بعد دعا ۱۴۸
تسبیح مروجہ پر ذکر اللہ کرنے کا جواز ۱۵۷
رکعات نماز وغیرہ پر مشتمل سوالات کے جوابات ۱۶۱
کیا مغرب کی دو سنتیں مسجد میں پڑھنی جائز ہیں؟ ۱۶۳
نماز عشاء سے پہلے چار رکعت سنت ثابت نہیں؟ ۱۷۵
ہر فرض نماز کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھنا کیسا ہے؟ ۱۷۸

جمعہ کے مسائل

ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حنیفہ کا تقابل ۱۸۱
مسئلہ اقامت جمعہ فی القریٰ ۱۸۳
اہل دیہات پر جمعہ ۱۸۵
دیہات میں جمعہ کی فرضیت ایک غلط فتویٰ اور اس پر تبصرہ ۱۹۶
مستورات پر نماز جمعۃ المبارک ۲۲۴
خطبہ جمعہ میں ادائیگی نماز ۲۲۹

خطیب کا حاضرین کو منبر پر سلام کہنے کا حکم ۲۳۲
خطبہ سے پہلے منبر پر سلام کہنا ۲۳۷

نماز احتیاطی

احناف اور احتیاط الظہر ۲۴۴
نماز احتیاطی ۲۴۸

نماز قصر کے مسائل

نماز قصر کے لئے کتنی مسافت شرط ہے ۲۶۵
تعاقب بر فتوئی قصر در سسرال ۲۶۹
سفری نماز کی حضر میں ادائیگی ۲۷۶
حضر و مطر (اقامت اور بارش) میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا مسئلہ ۲۷۷

وتر کے مسائل

ایک رکعت نماز شرع میں پائی جاتی ہے ۲۹۷
تین رکعت وتر دو تشہد کے ساتھ پڑھنا ثابت نہیں ۳۰۵
مسئلہ قضاء وتر کی تحقیق ۳۱۳
مسئلہ قضاء وتر کی تحقیق ۳۱۹
نماز وتر پڑھنے کی کیفیت ۳۲۸

قیام رمضان

قیام رمضان ۳۳۳
ماہ رمضان المبارک کا قیام ۳۳۶
تہجد اور تراویح ایک ہی نماز ہے ۳۴۷

مسئلہ تراویح اور بزرگان احناف ۳۵۳
مسئلہ تراویح بیس سوالات کے جوابات ۳٦۴
بیس رکعت تراویح پر فقہ حنفی کی رو سے ایک نظر ۳۹۷
مسئلہ تراویح پر مناظرہ ۴۰٦
آٹھ رکعت تراویح مسنون ہونے پر علماء کا اتفاق ۴۲۹
تحقیق مسئلہ تراویح پسروری اشتہار کا جواب ۴۳۷
تحقیق مسائل تعاقب پر فتویٰ تراویح ۴۴۲
نماز تراویح میں قرآن سنا کر اجرت لینا شرعاً کیسا ہے؟ ۴۴٦
نماز تراویح گھر میں پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں؟ ۴۵۲
کیا نماز تراویح ایک رات میں دو مرتبہ پڑھنی جائز ہے؟ ۴٦۱
مسئلہ تراویح و امامت نابالغ ۴٦۳
کیا وتروں کے بعد دو نفل پڑھنا ثابت ہیں؟ ۴۷۰
کیا وتروں کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھنا بدعت ہیں؟ ۴۷۴
ہر فرض نماز اور وتروں کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھنا بدعت ہے ۵۰۱

جنازہ کے مسائل

تلقین میت ۵۳۴
مسئلہ تلقین میت ۵۳۵
نماز جنازہ کے لئے منادی کا حکم ۵۳٦
جنازہ کے لئے سپیکر پر اعلان ۵۴۰
جنازہ لے جاتے وقت میت کا رخ کس طرف ہو ۵۴۷
جنازہ میں شریک ہونے والوں کے اوصاف ۵۴۹
کیا مستورات گھروں میں نماز جنازہ پڑھ سکتی ہیں؟ ۵۵۳
جنازہ میں حنفیہ کی تکبیریں اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اختلاف ۵۵۴
نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کی تحقیق ۵۵٦

نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم	۵۵۷
نماز جنازہ میں قرأت قرآن کی تحقیق	۵۷۴
سوال درباره مروجہ فاتحہ خوانی وقل	۵۸۰
نماز جنازہ بالجہر کے متعلق حکم	۵۸۵
جنازہ بالجہر کے بارہ میں	۵۹۱
نماز جنازہ میں آمین آمین کہنا	۵۹۴
ایک تعاقب مشرک بدعتی کا جنازہ	۵۹۸
فتاویٰ جنازہ تارک حج وزکوٰۃ وغیرہ	۵۹۹
بے نماز کا جنازہ	۶۰۱
حج اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے صاحب حیثیت کا جنازہ	۶۰۶
بے نماز کے جنازہ کا فیصلہ	۶۱۲
مقروض میت کی کفالت اور اس کا جنازہ	۶۱۵
مذاکرہ علمیہ (جنازہ منافق)	۶۲۴
میت کو کس رخ دفن کرنا چاہئے	۶۲۹
قبر میں مٹی ڈالتے وقت آیت منہا خلقنا کم پڑھنے کی شرعی حیثیت	۶۳۱
قبروں پر اذان کہنا	۶۳۵
مسئلہ تزاور الاموات فی قبورھم	۶۴۳
قبرستان میں قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر---الخ	۶۵۰
صاحب میت کتنے دن اپنے گھر روٹی نہ پکائے	۶۵۱
زندوں کا اموات کو نفع پہنچانا	۶۵۲
دفن کے بعد گھر پر کپڑا بچھا کر تین روز تک بیٹھنا اور ایصال ثواب کرنا جائز ہے یا نہیں؟	۶۵۹
میت کا تیجا کرنا کیسا ہے؟	۶۶۰
ایصال ثواب وعذاب قبر	۶۶۱
میت پر فاتحہ خوانی	۶۷۵
مروجہ فاتحہ خوانی اور تعزیت کا مسنون طریقہ	۶۷۸

سوال: کیا نماز میں زبان سے نیت کے الفاظ پڑھنا جائز ہے؟

الجواب وهو الموفق للصواب: نماز میں اظہار نیت زبان سے کرنا بدعت ہے کیونکہ زمانہ مبارک آنحضرت ﷺ و صحابہ رضوان اللہ علیہم اور تابعین رحمتہ اللہ علیہم میں اس کی کچھ سند و اصل پائی نہیں جاتی اور جو چیز قرون مشہود لہا بالخیر کے بعد دین میں پیدا کی جائے وہ بدعت ہے۔ اس کے بدعت اور غیر مشروع ہونے پر جو حدیث صحیح بخاری وغیرہ میں مذکور ہے' دلیل صریح اور قوی ہے۔ من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو رد۔ "جو ایسی چیز پر عمل کرے جس کا ہم نے حکم نہیں دیا وہ مردود اور مطروح ہے۔" پس بموجب اس حدیث شریف کے نماز میں زبان سے نیت کرنا بدعات میں سے ہے۔ لہٰذا علمائے حدیث اور فقہاء رحمتہ اللہ علیہم نے اس کو بدعت سیئہ فرمایا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ زاد المعاد میں رقمطراز ہیں: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قام الى الصلوٰة قال الله اكبر ولم يقل شيئا قبلها ولا تلفظ بالنية ولا قال اصلى صلوة كذا مستقبلا للقبلة اربع ركعات اماما او ماموما ولا قال اداءً ولا قضاءً ولا فرض للوقت وبهذه عشر بدع لم ينقل عنه احد قط لا بسند صحيح ولا بسند ضعيف ولا مسند ولا مرسل بل ولا عن احد من اصحابه وما استحبه احد من التابعين ولا الائمة الاربع الخ۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر فرماتے اور اس سے پہلے کچھ نہ فرماتے اور نہ زبانی نیت کرتے اور نہ یوں کہتے کہ میں فلاں نماز کی چار رکعت کعبہ کی طرف منہ کر کے امام یا مقتدی ہو کر پڑھتا ہوں اور نہ ادا یا قضا یا فرض کا نام لیتے۔ یہ دس بدعات ہیں' کسی نے آپ سے کبھی نقل نہیں کیا' نہ سند صحیح سے اور نہ سند ضعیف سے اور نہ مسند سے اور نہ مرسل سے بلکہ آپ کے زمانہ میں سے بھی کسی سے منقول نہیں ہوا اور تابعین میں سے بھی کسی نے اسے مستحب نہیں کہا اور نہ چاروں اماموں نے الخ۔"

اور مولانا عبدالحی حنفی لکھنوی عمدة الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ میں تحریر فرماتے ہیں احدها الاكتفاء بنية القلب وهو مجزى اتفاقا وهو الطريقة المشروعة الماثورة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم واصحابه فلم ينقل عن احد منهم التكلم بنويت او الذى صلوة كذا فى وقت كذا ونحو ذلك كما حققه ابن الهمام فى فتح القدير وابن قيم فى زاد المعاد۔ یعنی "پہلا اس کا اکتفا کرنا ہے ساتھ نیت دل کے اور وہ کافی ہے بالاتفاق اور یہی طریقہ مشروع و منقول ہے رسول اللہ ﷺ سے اور آپ کے اصحاب سے اور ان میں

سے کسی ایک سے بھی منقول نہیں ہوا کہ انھوں نے زبان سے یوں کہا ہو کہ نیت کی میں نے یا نیت کرتا ہوں میں فلاں نماز فلاں وقت میں اور نہ مثل ان الفاظ کے کوئی اور الفاظ کہے۔ ابن الہمام نے فتح القدیر (حاشیہ ہدایہ) اور ابن قیم نے زادالمعاد میں ایسا ہی تحقیق فرمایا ہے۔"

اور مولانا عبدالحی لکھنوی نے آکام النفائس میں ارقام فرمایا ہے : کثیرا ما سئلت عن التلفظ بالنیۃ ھل ثبت ذلک من فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ وھل لہ اصل فی شرع فاجبت بانہ لم یثبت ذلک من اصحاب الشرع ولا من احد من اصحابہ الخ۔ یعنی "زبانی نیت کرنے کا مسئلہ مجھ سے بہت دفعہ پوچھا گیا کہ آیا رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحاب سے ثابت ہے یا نہیں اور آیا شرع میں اس کی کوئی اصل بھی ہے تو میں نے یہی جواب دیا کہ نہ تو شارع علیہ السلام والصلوٰۃ ہی سے یہ ثابت ہوا اور نہ ان کے صحابیوں میں سے کسی ایک سے ثابت ہوا۔"

اور مجدد الف ثانی رحمہ اللہ جلد اول مکتوب صد وہشتا دو ششم میں تحریر فرماتے ہیں : وہم چنیں است آنچہ علماء در نیت نماز مستحسن داشتہ اند کہ باوجود ارادہ قلب بزبان نیز باید گفت وحالانکہ ازاں سرور علیہ وعلی آلہ الصلوۃ والسلام ثابت شدہ نہ بروایت صحیح ونہ بروایت ضعیف ونہ از صحابہ کرام وتابعین عظام کہ بزبان نیت کردہ باشند بلکہ چوں اقامت می گفتند تکبیر تحریمہ می فرمودند پس نیت بزبان بدعت باشد۔

اور نواب قطب الدین دہلوی نے مظاہر حق شرح مشکوۃ میں ماتحت حدیث انما الاعمال بالنیات کے تحریر فرمایا ہے کہ نماز میں زبان سے نیت کرنا بدعت ہے' واللہ تعالیٰ اعلم۔ (المرقوم ۱۳/ جمادی الثانی)

سوال : ماہ رجب کے پہلے جمعہ میں جو نماز بعض دیار میں پڑھتے ہیں جس کو صلوٰۃ الرغائب کہتے ہیں' کیا یہ نماز جائز ہے یا نہیں؟

الجواب هو الموفق للصواب : قال اللہ تعالیٰ ام لھم شرکاء شرعوالھم من الدین مالم یاذن بہ اللہ الایۃ۔ یہ تشریع بلا امر شارع ہے جو جائز نہیں بلکہ بدعت ہے۔ فتاویٰ شامی ص-۱۷ میں ہے : ومن ھھنا یعلم کریھۃ الاجتماع علی صلوۃ الرغائب التی تفعل فی رجب فی اول جمعۃ وانھا بدعۃ الخ۔ یعنی "اس جگہ سے معلوم ہو جاتی

ہے' کراہت اجتماع صلوۃ الرغائب کے لیے جو اول جمعہ رجب کے پڑھی جاتی ہے۔" اور شامی ص ۴۲۵ میں ہے : لانها لم توثر علی هذه الکیفیة فی تلک اللیالی المنهومة وانکلنت الصلوة خیر موضوع الخ۔ یعنی "صلوۃ الرغائب میں کیفیت کے ساتھ ان راتوں میں ماثور نہیں اگرچہ نماز بہتر (عمل) ہے (لیکن عدم ثبوت کی وجہ سے صلوۃ الرغائب جائز نہیں بلکہ بدعت ہے۔"

محمد عباس خطیب مسجد اہلحدیث پاک پتن

اعتصام جلد ۱' شمارہ ۲۹' مورخہ ۱۴/ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء

(نوٹ) مندرجہ بالا یہ فتویٰ ضروری اور حسب موقعہ ہونے کی وجہ سے درج کیا گیا ہے۔ (خلیل)

مدرک رکوع مدرک رکعت نہیں

حضرات! کسی حد تک یہ صحیح بات ہے کہ اس نازک دور میں فروعی مسائل پر بحث کرنا زیبا نہیں ہے لیکن اس امر کو بھی قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارا اصلی مذہب عبادت الٰہی ہے جس میں نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اسے اسلام اور کفر کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے اس فریضہ کی ادائیگی سب پر لازم ہے لیکن اس کی صحت کے لیے شارع علیہ السلام نے کئی ارکان و شروط بیان فرمائے ہیں' جن کے ترک اور فقدان سے نماز کا بطلان متیقن ہے۔ منجملہ ان کے ایک قیام اور دوم سورہ فاتحہ ہے بلکہ سورہ فاتحہ کو تمام ارکان اور شروط پر ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہاں تک کہ اس کو نماز میں بمنزلہ روح کے قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح جسم بغیر روح کے مردہ اور بیکار ہے' اسی طرح نماز بغیر فاتحہ کے بالکل مردہ اور بیکار ہے۔ اس لیے حدیث قدسی میں فاتحہ ہی کو مجسم نماز ٹھہرایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فاتحہ کے منتفی ہونے سے نماز کا وجود ہی منتفی ہے۔ لیکن افسوس اور صد افسوس ہے کہ اس قرآن عظیم کے متعلق دو گروہ سخت خسارہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایک حنفی گروہ ہے جو سرے سے سورہ فاتحہ کو نماز کا رکن اور فرض ہی تصور نہیں کرتا۔ دوسرا گروہ بعض اہلحدیث حضرات کا ہے جو فاتحہ کو نماز کا رکن بلکہ عین نماز قرار دیتے ہوئے مقتدی مدرک رکوع کو جس سے قیام اور فاتحہ دو فرض فوت ہو گئے ہیں مدرک رکعت بتلاتے ہیں اور اس کا فتویٰ دیتے ہیں۔ چنانچہ صحیفہ اہلحدیث کراچی میں ماہ شعبان کے

شروع ہی میں اس مسئلہ پر بحث شروع کی گئی ہے اور یہ اعلان کیا گیا ہے کہ رکوع کی رکعت کا مدلل ثبوت پیش کریں گے۔ اس مضمون کے نامہ نگار ہمارے ایک دیرینہ کرم فرما مہربان دوست ہیں جن کا اسم گرامی مولوی محمد اسحاق ہے اور وہ مہاجر کوٹ کپوری ہیں۔

انہوں نے اس معرکتہ الآراء مسئلہ کی تحقیق کے لیے قدم اٹھایا ہے جس پر میں ان کو یہ شعر عرض کرتا ہوں۔

سنبھل کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

چونکہ یہ راقم الحروف اس فریق سے ہے جو قیام اور فاتحہ کی رکنیت وفرضیت کے پیش نظر اصولاً رکوع کی رکعت کو ہرگز شمار نہیں کرتے' اس لیے یہ خادم العلماء مولوی محمد اسحاق صاحب کے مضمون پر تبصرہ کرے گا۔ مولوی صاحب اور دیگر ارکان جماعت کو ضد اور تعصب سے علیحدہ رہ کر غور وتدبر کرنا ہو گا کیونکہ

تعصب میں تمیز حق و باطل ہو نہیں سکتی
تعصب میں کوئی مشکل آساں ہو نہیں سکتی

قبل اس کے کہ میں مولوی صاحب کے دلائل پر تبصرہ کروں' چند اصول مسلمہ علماء محدثین و محققین پیش کرتا ہوں کہ بحث کی کامیابی کا دارومدار ان اصولوں پر ہے۔ جو دعویٰ ان اصولوں کی بنا پر دلائل شرعیہ سے ثابت ہوا' وہ بالکل صحیح اور سچا ہو گا اور جو خلاف ہوا' وہ غلط اور باطل ہو گا' اس کو مسترد کیا جائے گا۔

میرے محترم دوست کو ان اصولوں کی رُو سے بحث کرنی چاہیے ورنہ دعویٰ اور دلائل کی مثل داخل دفتر کر دیں گے۔

بس ہو کے رہے گا عشق اور ہوس میں بھی امتیاز
اب آیا ہے مزاج تیرا امتحان پر

(۱) محلی ابن حزم جلد ۱' ص ۵۵ میں ہے : والواجب اذا اختلف الناس او نازع واحد فی المسئلة ان یرجع الی القرآن وسنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا الی شئی غیرھما ولا یجوز الرجوع الی عمل اھل المدینة ولا غیرھم۔ یعنی "جب تمام لوگوں کا یا کسی ایک شخص کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو اس وقت واجب یہ ہے کہ صرف

قرآن وحدیث نبوی کی طرف رجوع کیا جائے' سوائے ان کے کسی اہل مدینہ وغیرہ کے عمل کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔" کیونکہ قرآن میں ہے کہ جب تمہارا کسی چیز میں نزاع ہو تو تم اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

جزاء القراۃ ص-۲۷ میں امام الدنیا فی الحدیث نے فرمایا ہے کہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایما اختلفتم فی شئی فحکمہ الی اللہ والی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی "نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ اور محمد ﷺ کی طرف ہے۔" یعنی قرآن اور حدیث نبوی سے فیصلہ کراؤ۔

ان دلائل سے ثابت ہوا کہ عند الاختلاف والتنازع اللہ ورسول کے کلام سے فیصلہ کرنا کرانا ہو گا اور بغیر قرآن وحدیث نبوی کسی کے قول وفعل کی طرف رجوع کرنا حلال نہیں ہے۔ اس لیے محدثین کا یہ دعویٰ ہے۔

اصل دیں آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفیٰ بر جاں مسلم داشتن

(۲) باعتبار ثبوت اور دلالت کے دلائل شرعیہ کی چار قسمیں ہیں۔ ایک قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت۔ یعنی وہ دلیل جس کا ثبوت یقینی ہے اور اس کی دلالت بھی اپنے مدلول پر یقینی ہے۔ دوم قطعی الثبوت وظنی الدلالت' یعنی ثبوت کے لحاظ سے تو وہ دلیل یقینی ہے لیکن اس کی دلالت اپنے مدلول پر ظنی ہے۔ سوم ظنی الثبوت وظنی الدلالت' یعنی ثبوت کے لحاظ سے بھی ظنی ہے اور دلالت کے لحاظ سے بھی ظنی ہے۔ چہارم ظنی الثبوت وقطعی الدلالت' یعنی ثبوت کے لحاظ سے تو دلیل ظنی ہے مگر اس کی دلالت اپنے مدلول پر قطعی ہے۔ ان دلائل سے استدلال حسب المدارج ہے۔ اگر ان دلائل میں تعارض اور تناقض ظاہر ہو تو علیٰ حسب المراتب ایک کو دوسری دلیل پر ترجیح ہو گی۔ مثلاً قطعی الثبوت کو ظنی الثبوت پر ترجیح ہو گی اور قطعی الدلالت ظنی الدلالت پر راجح ہو گی۔ یہ قاعدہ مسلم اور علماء اسلام میں معمول بہا ہے۔

محلّٰی جلد-۱' ص-۵۱ میں ہے: ولا یحل ترک الیقین بالظنون۔ یعنی یقین کو ظن کے مقابلہ میں ترک کرنا حلال نہیں ہے۔ ہاں تعارض میں تطبیق ترجیح پر عند المحدثین مقدم ہے لیکن اس میں دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ دلائل میں ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے مساوات

ہو۔ دوم یہ کہ دونوں پر یکساں عمل قائم رہے' ایک کے عمل سے دوسری کا ترک لازم نہ آئے' فتفکر۔

(۳) محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث احکام (فرض' سنت' حلال' حرام) میں حجت نہیں ہے۔ نووی شرح مسلم میں ہے : فانهم متفقون علی انه لا یحتج بالضعیف فی الاحکام۔ یعنی "تمام محدثین اس امر پر متفق ہیں کہ احکام میں ضعیف حدیث سے استدلال نہیں کیا جائے گا۔

(۴) اجماع امت کے حجت شرعی ہونے میں تو اختلاف ہے' البتہ اجماع صحابہ سب کے نزدیک حجت ہے لیکن جمہوریت کسی کے نزدیک بھی حجت نہیں ہے۔ نیل الاوطار جلد۔۴' ص۔۲۳۵ ملاحظہ ہو۔ نیز محلّٰی جلد۔۳' ص۔۲۴۶ میں ہے : فان قیل هذا قول الجمهور قلنا ما امر الله تعالٰی قط ولا رسوله باتباع الجمهور لا فی آیة ولا فی خبر صحیح۔ یعنی "اگر یہ کہا جائے کہ فلاں مسئلہ پر جمہور کا یہ قول ہے تو ہم یہ جواب دیں گے کہ جمہور کی اتباع کا اللہ تعالٰی اور اس کے رسول نے کسی آیت اور حدیث صحیح میں ہرگز کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ جمہور علماء کیا؟ صحابہ کا اختلاف ہو تو تب بھی کسی کا قول نہیں لیا جائے گا' صرف کلام اللہ وکلام الرسول کی طرف رجوع ہو گا۔ چنانچہ محلّٰی میں ہے : واذا تنازع الصحابة رضی الله عنهم فالرد الی کلام الله تعالٰی وکلام رسوله صلی الله علیه وسلم۔

(۵) جو چیز کسی چیز کا رکن ہو' اس کا اداءً یا قضاءً پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر اس کو پورا نہ کیا تو وہ چیز باطل اور کالعدم متصور ہو گی کیونکہ رکن کی تعریف یہ ہے : والرکن ما یحتاج الیه الشئی فی ما هیته بان لا یتصور ذلک الشئی بغیره۔ یعنی "رکن وہ چیز ہے کہ اس کی طرف کوئی شئی اپنی ماہیت میں بایں طور محتاج ہو کہ اس کے بغیر اس شئی کا وجود ہی متصور نہ ہو۔"

یہ اصول حنفیہ کو بھی مسلم ہے۔ چنانچہ شرح عقائد نسفی ص۔۷۹ بحث ایمان میں ہے : مع القطع بانه لا تحقق للشئی بدون رکنه۔ یعنی "یہ یقینی اصول ہے کہ کسی چیز کا تحقق بغیر اس کے رکن کے نہیں ہو تا۔" مثلاً تصدیق بالقلب ایمان کا رکن ہے تو بغیر اس کے کسی مومن کا ایمان صحیح اور قائم نہ ہو گا۔ یہ اصول مولوی محمد اسحاق صاحب اور ان کے ہم خیال

علماء کو بھی لازم ہے۔ چنانچہ فوائد ستاریہ میں شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ورکن ہے' اس کے ترک سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ (تفسیر فوائد ستاریہ ص۔۱۸۴)

مقدمہ ابن الصلاح ص۔۱۴' اقسام حدیث صحیح میں ہے : واعلاها الاول وهو الذى يقول فيه اهل الحديث كثيرا صحيح متفق عليه۔ یعنی "اول اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیث وہ ہے جس کو بخاری و مسلم نے متفقہ طور پر روایت کیا ہے اور اہل حدیث علماء اس حدیث پر متفق علیہ کہا کرتے ہیں۔" اس سے بخاری و مسلم کا اتفاق مراد ہے لیکن اس سے امت اسلامیہ کا اتفاق بھی لازم آجاتا ہے۔

لاتفاق الامة على تلقى ما اتفقا عليه بالقبول۔ "کیونکہ بخاری و مسلم کی متفقہ احادیث پر امت کا تلقی بالقبول کی رُو سے اتفاق ہے۔"

پھر علامہ ابن الصلاح فرماتے ہیں : وهذا القسم جميعه مقطوع بصحة والعلم اليقين النظرى واقع به۔ یعنی "حدیث صحیح کی یہ قسم قطعی صحیح ہے جس سے علم الیقین نظری حاصل ہے۔"

ملا علی قاری مرقاۃ جلد۔ا' ص۔۱۵ میں فرماتے ہیں : اتفقت العلماء على تلقى الصحيحين بالقبول وانهما اصح الكتب المنولفة۔ یعنی "علماء اسلام کا بخاری و مسلم کی احادیث کو قبولیت سے لے لینے پر اتفاق ہے اور اسپر بھی اتفاق ہے کہ وہ حدیث کی تمام کتابوں سے زیادہ صحیح ہیں۔"

علامہ ابن الہمام نے فتح القدیر باب الاحرام میں فرمایا ہے کہ : لان ما فى الصحيحين اقوى۔ یعنی "بخاری و مسلم میں جو احادیث ہیں' وہ سب سے زیادہ قوی ہیں۔"

شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے حجتہ اللہ میں فرمایا ہے کہ محدثین کا اتفاق ہے کہ صحیحین میں جو کچھ متصل و مرفوع ہے وہ قطعی طور پر صحیح ہے۔

اس تصریح سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اگر دیگر کتب کی احادیث کا بخاری و مسلم کی احادیث سے تعارض ہوا تو بخاری و مسلم کی احادیث ان پر راجح ہوں گی۔

شفاء العی ص۔۲۰ میں ہے : وقال السخاوى ويظهر فائدة التقسيم عند التعارض بتقديم مراتب التفاوت ما اخرجاه ارجح مما على شرطهما من حيثية التلقى۔ یعنی

"امام سخاوی نے فرمایا ہے کہ اس تقسیم حدیث صحیح کا فائدہ تعارض کے وقت ظاہر ہو گا کہ جس حدیث کو بخاری و مسلم روایت کریں گے' وہ قبولیت سے لے لینے کی حیثیت سے ان احادیث پر مقدم اور راجح ہو گی جو بخاری و مسلم کی شرطوں کی بنا پر صحیح ہیں۔

سلعة القربة توضیح شرح نخبہ ص۔۲۵ میں ہے' "یہاں تک جس قدر حدیث مقبول کے اقسام بیان کئے گئے ان کا ثمرہ بوقت تعارض ظاہر ہو گا جب دو قسم میں تعارض ہو گا مثلاً صحیح لذاتہ ولغیرہ میں تو اعلیٰ کو ادنیٰ پر ترجیح دی جائے گی' علی ہذا القیاس۔" اس سے یہ ظاہر ہوا کہ بخاری و مسلم کی احادیث کو دیگر کتب حدیث ابوداؤد' نسائی' ترمذی' ابن ماجہ' دار قطنی' دارمی وغیرہ کی احادیث پر بوقت تعارض ترجیح ہو گی' کیونکہ بخاری و مسلم طبقہ اولیٰ کی کتابیں ہیں جن کی صحت پر علماء امت کا اتفاق ہے اور دیگر کتب طبقہ ثانیہ کی ہیں جن میں ہر قسم کی احادیث ہیں وہ درجہ صحت میں صحیحین کے برابر نہیں ہیں۔ چنانچہ عجالہ نافعہ میں ہے "طبقہ ثانیہ احادیثے کہ دریں ہرسہ صفت بدرجہ احادیث صحیحین نرسیدہ اند۔"

(۷) احسن التفسیر کے فوائد ستاریہ ص۔۱۹۷ بحث فاتحہ خلف الامام میں یہ اصول منقول ہے : وقد صح فی الاصول ان الاخذ بالاحوط والخروج من الخلاف اولٰی۔ یعنی "یہ قاعدہ علم اصول میں صحیح ہو چکا ہے کہ احوط کا لینا اور خلاف سے نکلنا بہتر ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ اصول حدیث سے بھی ثابت ہے کہ ترمذی اور نسائی میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' آپ نے فرمایا جو تمہیں شک میں ڈالے' اسے چھوڑ کر وہ چیز اختیار کرو جس میں تمہیں کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ دیگر احادیث قویۃ اور اقوال صحابہ وتعامل سلف وصوفیہ سے بھی اس کی تائید پائی جاتی ہے۔ مثلاً بعض علماء کہتے ہیں کہ مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے' اس کے بغیر نماز نہ ہو گی اور بعض کہتے ہیں کہ مقتدی پر فرض نہیں اور اس کے بغیر نماز ہو جائے گی تو احتیاط یہ ہے کہ فاتحہ پڑھ لینی چاہیے تاکہ بالاتفاق نماز صحیح ہو جائے اور اختلاف سے نکل جائے اور شبہ نہ رہے۔ پس یہ اصول درست ہے' کما لا یخفٰی علی اہل البصیرۃ۔

یہ اصول بمنزلہ ہفت افلاک ہیں جو محقق عالم میدان تحقیق میں نکل کر معراج دلائل پر چڑھتا ہوا' ان ہفت افلاک سے صحیح سالم گذر گیا' وہ تو مقصود عرش پر بہت جلد پہنچ جائے گا ورنہ جس فلک پر پہنچ کر معراج دلائل سے پھسل گیا تو وہیں گر کر اپنا دعویٰ چکنا چور کر لے

گا اور عرش مقصود پر نہ پہنچ سکے گا۔

اب ہم مسئلہ مدرک رکوع کی اِن سات اصولوں کی رُو سے تحقیق کرتے ہیں۔ ناظرین اہل علم انصاف سے غور فرمائیں۔

فریقین کا متفقہ دعویٰ اور اس کی مسلمہ دلیل: واضح ہو کہ فریقین کا یہ متفقہ دعویٰ ہے کہ سورہ فاتحہ نماز کا رکن اعظم ہے جس کا ادا کرنا مقتدی پر بھی ایسا ہی فرض ہے جیسا منفرد اور امام پر فرض ہے۔ حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ میں فرمان نبوی عام ہے کہ لا صلوٰۃ لمن لم یقراء بفاتحۃ الکتاب۔ یعنی "جس شخص نے سورہ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز صحیح نہیں ہے۔" یہ حدیث متواتر ہے۔

جزء القراۃ ص-۴ میں ہے: تواتر الخبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا صلوٰۃ الا بقراۃ ام القرآن۔ یعنی "یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر نقل سے آچکی ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز صحیح نہیں ہے۔" یہ حدیث قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے جس سے نماز میں فاتحہ کی رکنیت ثابت ہے۔

حدیث مسیئی صلوٰۃ میں ہے: فکبر ثم اقرا ما تیسر من القرآن۔ یعنی "تکبیر کہہ پھر جو قرآن میں سے آسان ہے' وہ پڑھ۔"

دوسری حدیث نے اس کی تفسیر کر دی کہ فکبر ثم اقرا بام القرآن۔ یعنی "تکبیر کہہ پھر سورہ فاتحہ پڑھ۔" یہ حدیث بھی قطعی ہے' جس سے فاتحہ کی فرضیت ثابت ہے۔ دیگر حدیث قسمت الصلوٰۃ قدسی ہے جو ثبوت اور دلالت کی رُو سے قطعی ہے اور فاتحہ کو مجسم نماز قرار دے رہی ہے۔ اگر نماز میں اس کا وجود ہو گا تو نماز ہو گی ورنہ نماز ہی نہ ہو گی۔ جب نماز کی جزء واحد پر پوری نماز کا اطلاق ہے تو اس سے ثابت ہو گیا کہ فاتحہ نماز کا رکن اعظم ہے۔ پس قاعدہ نمبر-۳ کی رُو سے سورہ فاتحہ کا نماز کا رکن ہونا ثابت ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے فاتحہ کا نام صلوٰۃ اور صلوٰۃ کا نام قرآن (آیت قرآن الفجر میں) رکھ کر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ یہ رکن ہے جو داخل فی الماہیت ہے۔

یہ بات فریق مدرکین رکعت کو بھی مسلم ہے۔ چنانچہ رئیس المدرکین مولانا حافظ عبدالستار صاحب دام فیضہ نے تفسیر احسن التفاسیر کے فوائد ستاریہ میں جابجا اس کا ذکر کیا ہے کہ قرآت فاتحہ ارکان نماز میں سے ایک بڑا رکن ہے' اس کے فقدان سے ساری نماز کا

فقدان لازم آتا ہے۔ جس نماز میں فاتحہ نہ پڑھی جائے' وہ نماز عنداللہ مقبول نہیں' مردود ہے اور ہر شے مرکب جیسا کہ اپنے جمیع اجزاء کے انتفاء سے منتفی ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنے بعض اجزاء کے انتفاء سے بھی منتفی ہو جاتی ہے۔

نیز ص-۱۵۶ میں فرماتے ہیں کہ اس کا نام ام القران ہے اور بغیر اس کے نماز بھی نہیں ہوتی' خواہ مقتدی ہو' خواہ منفرد اور اسی صفحہ کے کالم نمبر۲ میں ہے' "اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی جس رکعت کے شروع میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ رکعت نہیں ہو گی اور ص-۱۵۷ میں ہے کہ یہ سورہ بمنزلہ بنیاد کے ہے اور جس چیز کی بنیاد نہ ہو' وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

نیز فوائد ستاریہ کے ص-۱۷۶ پر امام حافظ ابن عبدالبر سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ جس شخص نے سورہ فاتحہ نہ پڑھی' اس کی نماز نہیں ہوئی' عام ہے۔ اس کو کوئی چیز خاص نہیں کر سکتی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے فرمان سے نمازیوں میں سے کسی نمازی (مدرک وغیرہ) کو خاص نہیں کیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ مدرک رکوع مدرک رکعت نہیں ہے کیونکہ اس کی رکعت میں سورہ فاتحہ موجود نہیں ہے جو بمنزلہ بنیاد ہے' جس رکعت کی بنیاد نہ ہو' وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے فقدان سے رکعت کا فقدان لازم آگیا۔ کیونکہ رکعت جیسے تمام اجزاء قیام' فاتحہ' رکوع' سجود' قومہ' جلسہ وغیرہ کے انتفاء سے منتفی ہو جاتی ہے' ایسا ہی فاتحہ جزء اعظم کے انتفاء سے منتفی ہو جاتی ہے۔ یہ رکعت بغیر فاتحہ باطل اور مردود ہے' خیروبرکت سے خالی ہے۔ کیونکہ اس کے شروع میں الحمد نہیں پائی گئی جو مجسم نماز ہے۔ جب شارع نے اس کے بغیر نماز کے وجود کی نفی کر دی تو اب باقی کیا رہ گیا؟

دوسرا رکن نماز کا قیام ہے: (عدم ادراک کی دوسری دلیل) دوسرا رکن نماز کا قیام ہے۔ یہ بھی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت دلائل سے ثابت ہے۔ چنانچہ امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ کتاب القراۃ ص-۱۷ میں فرماتے ہیں : والقیام فرض فی الکتاب والسنۃ قال اللہ تعالٰی وقوموا لِلّٰہ قانتین وقال اذا قمتم الی الصلوٰۃ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم صل قائما فان لم تستطع فقاعدا۔ یعنی "نماز میں قیام بروئے کتاب وسنت فرض ہے۔ اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ تم اللہ تعالٰی کے لیے فرماں بردار بن کر (دنیوی کلام سے) چپ

چاپ کھڑے ہو جاؤ۔ اور فرمایا جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو۔ اور فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ تم کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو تو پھر بیٹھ کر نماز پڑھو۔"

حدیث مسئی الصلوٰۃ میں ہے : فاذا استویت قائما یعنی "جب تو خوب سیدھا کھڑا ہو جائے" دیگر روایت میں ہے : اذا قمت الی الصلوٰۃ فکبر۔ یعنی "جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو جائے تو پھر تکبیر کہہ۔" دیگر روایت میں بصیغہ امر وارد ہے : وَاَقِمْ یعنی قیام کر، کھڑا ہو۔ ان مجموعہ دلائل سے قیام در نماز کی فرضیت ثابت ہو گئی جس کے بغیر فرض نماز جائز نہیں ہے۔

محلّٰی جلد۔۳، ص۔۵۸ میں ہے : واما صلوٰۃ الفرض فلا یحل لاحد ان یصلیھا الا واقفا الا لعذر ولقولہ تعالٰی وقوموا لِلّٰہ قانتین فاوجب اللّٰہ تعالٰی القیام الا لمن کان لہ عذر اسقط عنہ بالنص۔ یعنی "فرض نماز بغیر قیام کسی شخص کے لیے پڑھنا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ عذر شرعی ہو کیونکہ اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالٰی کے لیے عاجز بن کر چپ چاپ کھڑے ہو جاؤ۔ پس اللہ تعالٰی نے قیام کو نماز میں فرض کر دیا ہے۔ مگر یہ کہ کوئی نص شرعی اس شخص سے اس فرض کو ساقط کر دے (تو یہ اور بات ہے)"

قیام اور فاتحہ ہر دو کا فرض ہونا نمازی پر ثابت ہوا۔ حدیث مسیئی الصلوٰۃ میں نبی کریم ﷺ نے ان ہر دو فرضوں اور دیگر فرائض کی تعلیم دے کر فرمایا : ثم افعل ذالک فی صلوٰتک کلھا۔ یعنی "تو اس طرح اپنی تمام نماز میں پڑھ۔"

محلّٰی جلد۔۳، ص۔۲۳۶ میں ہے : فوجب بھذا الامر فرضا ان یفعل فی باقی صلوٰتہ فی کل رکعۃ بمثل ھذا۔ یعنی "اس حکم نبوی سے نمازی پر یہ فرض ہو گیا کہ ہر رکعت میں یہ سب کام کرے۔"

احمد اور ابن حبان اور بیہقی کی روایت مسیئی صلوٰۃ کے قصہ میں یہ الفاظ وارد ہیں : ثم افعل ذالک فی کل رکعۃ۔ یعنی "ہر رکعت میں یہ سب کام کر۔" اگر ان کاموں (فرائض) میں سے کوئی کام چھوڑ دیا تو نماز پوری نہ ہو گی۔

چنانچہ جزاء القراۃ میں حدیث مسیئی کے قصہ میں یہ الفاظ ہیں : فانک ان اتممت صلوٰتک علی ھذا فقد اتممت ومن انتقص من ھذا فانما ینقص من صلوتہ۔ یعنی "اگر تو نے اس طرح نماز پورے طور پر پڑھی تو تو نے نماز کو پورا کیا اور جس نے اس سے

کچھ کم کر دیا' اس نے نماز کو گھٹا دیا۔ یہ قصہ اس اعرابی کا ہے جس نے تین بار نماز پڑھی تھی تو آپ نے تین بار ہی یہ فرمایا تھا کہ اِرجع فصل فانک لم تصل یعنی "تو جا لوٹ کر پھر نماز پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔"

اس نے ارکان نماز کو پورا نہیں کیا تھا تب آپ نے یہ فرمایا تھا۔ چونکہ ارکان نماز سب برابر ہیں۔ تمام ارکان اور ہر رکن کا ادا کرنا نماز میں فرض ہے اور جو کوئی کسی رکن کو ترک کرے گا اس کی نماز نہ ہو گی اور بحکم ارجع فصل اس کو دوبارہ تمام نماز یا وہ رکعت جس کا رکن ترک کیا ہے یا اس سے رہ گیا ہے ادا کرنی پڑے گی یا بحکم فاقضوا اس کی قضا دینی پڑے گی۔ جس مدرک سے قیام اور فاتحہ دو رکن فوت ہوئے ہیں' اس کو بحکم فصل اور بحکم فاقضوا دوبارہ وہ رکعت پڑھنی فرض ہے تاوقتیکہ قطعی نص اس فرض کو ساقط نہ کر دے۔

رکعت یا ارکان نماز کی قضا کا حکم اور عدم ادراک رکعت کی تیسری دلیل:

جو رکعت یا رکن کسی شخص سے فوت ہو جائے تو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت حدیث سے یہ ثابت ہے کہ اس کی قضا دے۔ چنانچہ مسلم شریف میں ہے : عن ابی هريرة قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا ثوب بالصلوٰة فلا يسعى اليها احدكم ولكن ليمش وعليه السكينة والوقار صل ما ادركت واقض ما سبقك۔ یعنی "ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز کے لیے تکبیر کہی جائے تو اس کی طرف کوئی شخص دوڑ کر نہ جائے بلکہ تسلی اور آرام کو لازم پکڑ کر چلے۔ جس قدر نماز پا لے وہ ساتھ پڑھ لے اور جو نماز تجھ سے پہلے گذر جائے اس کی قضا دے۔"

بخاری و مسلم کی متفقہ روایت میں یہ ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے : فما ادركتم فصلوا وما فاتكم فاتموا۔ یعنی "جو نماز تم امام کے ساتھ پا لو وہ پڑھ لو اور جو چیز فوت ہو جائے اس کو پورا کرو۔"

ان احادیث پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ ان احادیث سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ جس شخص نے امام کو رکوع کی حالت میں پا لیا' اس کی وہ رکعت شمار نہیں کی جائے گی کیونکہ اس سے قیام اور قراۃ (ام القرآن) فوت ہو گئے ہیں اور حدیث میں ہر اس چیز کو پورا کرنے کا حکم وارد ہے جو

اس سے فوت ہو جائے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے جو اس مسئلہ پر نص ہے کہ ہر وہ چیز جو مسبوق سے سبقت کر جائے اور اس سے فوت ہو جائے اور اس کا ادا کرنا فرض اور لازم ہے' اس کا پورا کرنا اور اس کی قضا دینا بھی فرض اور لازم ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ رکن کی حیثیت رکھتی ہو۔ اس قطعی دلیل کے مقابلہ میں کوئی دلیل قطعی وارد نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ اس کو یہ ارکان اور فرائض معاف ہیں اور مسبوق سے ساقط ہیں' من ادعی فعلیہ البیان۔

جزاء القرآۃ ص۔۲۰ میں امام الدنیا فی الحدیث نے ان احادیث کی بنا پر فرمایا ہے : فمن فاته فرض القرآۃ والقیام فعلیه اتمامه کما امر النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم۔ یعنی "جس شخص کے دو فرض قیام اور قرآۃ فوت ہو جائیں تو اس کے ذمہ ان کا پورا کرنا لازم ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اور حکم دیا ہے۔"

محلی میں امام المحققین علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں : وان من ادرک الرکوع فقد فاته الوقفة وقرآۃ ام القرآن وکلاهما فرض لا تتم الصلٰوۃ الا به وهو مامور بنص کلام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بقضاء ما سبقه واتمام ما فاته فلا یجوز تخصیص شیئی من ذالک بغیر نص آخر ولا سبیل الی وجوده۔ یعنی "جس شخص نے امام کے ساتھ رکوع پایا ہے' اس کے دو فرض قیام اور سورہ فاتحہ پڑھنا فوت ہو گئے ہیں اور یہ ایسے فرض ہیں جن کے بغیر نماز پوری نہیں ہوتی' اس لیے یہ بحکم نبوی اس بات پر مامور ہے کہ جو چیز اس سے رہ گئی ہے' اس کی قضا دے اور جو فوت ہوئی ہے اس کو پورا کرے اور اُس عام حکم سے کسی چیز کی تخصیص بغیر کسی نص دیگر (قطعی) کے جائز نہیں ہے اور دوسری دلیل مخصص کے ملنے کا یہاں کوئی رستہ ہی نہیں ہے۔"

علماء احناف کو بھی یہ مسلم ہے کہ جس چیز کا کوئی رکن فوت ہو جائے تو اس کا اعادہ واجب ہے۔

عینی جلد۔۳' ص۔۷۵ میں حدیث مسیئی صلٰوۃ سے مسائل اخذ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ الثامن فیه الاعادۃ علی من یخل بشیئی من الارکان۔ یعنی "حدیث مسیئی صلٰوۃ سے آٹھواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جو شخص کسی رکن کو ارکان نماز میں سے چھوڑ

دے' اس پر نماز کا اعادہ ہے۔"

قراۃ چھوڑ دینے سے حنفیہ کے نزدیک اعادہ اس لیے نہیں ہے کہ امام مقتدی کے اس فرض کا حامل ہے لیکن اہلحدیث کا یہ مذہب نہیں ہے۔ چنانچہ جزاء القراۃ ص۔۵ میں ہے : اتفق اھل العلم وانتم انه لا یحتمل الامام فرضا عن القوم۔ یعنی "تمام اہل علم اور تمہارا (حنفیہ) اس بات پر اتفاق ہے کہ امام قوم کے فرض کا حامل نہیں ہو سکتا" (پھر قراۃ کا حامل کیسے ہو گیا جو فرض ہے) بہرکیف تمام علماء اسلام کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ کسی چیز کا رکن رہ جائے تو اس کا اعادہ واجب ہے' کیونکہ نہ تو اس نے اس رکن کو خود ادا کیا ہے اور نہ اس کا کوئی دوسرا حامل ہوا ہے اور نہ اس کی معافی کی قطعی اور یقینی دلیل وارد ہے۔ اگر کوئی مدعی ہے تو وہ علمی میدان میں آکر پیش کرے۔

عدم ادراک کی چوتھی دلیل نماز کی حقیقت قرآت قرآن اور ذکر الٰہی ہے:

بروئے حدیث نماز کی حقیقت قرآت قرآن اور ذکر الٰہی وغیرہ ہے۔ چنانچہ کتاب القراۃ میں امام بیہقی نے اور جزاء القراۃ میں امام بخاری رحمہما اللہ نے یہ حدیث متعدد طرق سے ذکر کی ہے کہ آنحضور ﷺ کا یہ فرمان ہے : انما الصلوٰۃ لقراۃ القرآن ولذکر اللہ ولحاجۃ المرء الی ربہ فاذا کنت فیھا فلیکن ذالک شانک۔ یعنی "سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں ہے کہ نماز قرآن پڑھنے اور ذکر الٰہی کرنے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بندہ کی حاجت پیش کرنے کے لیے ہے۔ جب تو نماز میں ہو تو تیرا یہی کام ہونا چاہیے۔"

پس اس بنا پر جس رکعت میں یہ تینوں نہ ہوں وہ نماز نہیں ہے اور جس نے سورہ فاتحہ پڑھ لی' اس نے ان تینوں کو جمع کر لیا اور جس سے سورہ فاتحہ رہ گئی' اس سے یہ تینوں کام رہ گئے' اس کو وہ رکعت دوبارہ پڑھنی ہو گی۔ مثلاً تراویح پڑھاتے ہوئے امام نے صرف ایک رکعت وتر پڑھانا شروع کیا اور ایک مقتدی مسبوق امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہوا تو اس پر لازم ہے کہ وہ کھڑے ہو کر ایک رکعت پوری کرے' اس کی وہ رکعت نہیں ہوئی کیونکہ وہ رکعت بغیر قراۃ کے ہے اور کوئی نماز بغیر قراۃ کے نہیں ہے۔

چنانچہ امام المحدثین جزاء القراۃ میں فرماتے ہیں : فالذی لا یدرک القیام والقراۃ فی الوتر صارت صلوٰۃ بغیر قراۃ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب۔ یعنی "جس شخص نے قیام اور قراۃ کو وتر نماز میں نہ پایا تو اس کی نماز بغیر قراۃ کے

ہو گئی اور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز صحیح نہیں ہے۔"

اِسی طرح نماز خوف بھی کم از کم ایک رکعت ہے۔ اگر اس میں بھی مقتدی امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہوا تو اس کی نماز بھی بغیر قراۃ کے ہو گئی جو صحیح اور مقبول نہیں ہے۔ چنانچہ امام الدنیا فی الحدیث فرماتے ہیں: فالذی یدرک الرکوع والسجود من صلوٰۃ الخوف وھی رکعۃ لم یقم قائما فی صلوٰۃ اجمع ولم یدرک شیئا من القراۃ وقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کل صلوٰۃ لا یقرا فیھا بفاتحۃ الکتاب فھی خداج ولم یخص صلوٰۃ دون صلوٰۃ۔ یعنی "جس نے نماز خوف ایک رکعت کا رکوع اور سجود پایا اُس نے تمام نماز نہیں پائی جبکہ قراۃ نہیں پائی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر وہ نماز جس میں فاتحہ نہیں پڑھی گئی وہ جسم بے روح ہے۔ آپ نے کسی نماز کو دیگر نمازوں میں سے خاص نہیں کیا کہ فلاں نماز تو ہو جاتی ہے اور فلاں نہیں ہوتی' سب نمازوں کے لیے یہ عام حکم ہے۔"

پس اسی طرح ہر اس رکعت کو جان لینا چاہیے جس میں مقتدی رکوع میں ملا ہے کہ وہ رکعت بغیر قراۃ اور قیام کے ہے جو خداج اور بالکل ناکارہ ہے' اس کا اعادہ کرنا چاہیے۔

عدم ادراک کی پانچویں دلیل ... رکوع کی رکعت کا اختلاف اور اس میں احتیاط:

رکوع والی رکعت جس میں مقتدی نے قیام و قراۃ نہیں پائی' علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء رکعت کو شمار کرتے ہیں اور ایک جماعت اہل حدیث کی جو تحقیق عمیق رکھتی ہے اور فاتحہ کو ہر رکعت کا رکن اور قیام کو فرض اعتقاد رکھتی ہے' وہ رکعت کو رکوع میں ملنے سے شمار نہیں کرتی۔ چنانچہ امام الدنیا فی الحدیث امام بخاری اور امام ابن حزم مجدد قرن خامس اسی جماعت کے اراکین سے ہیں۔ نیز علامہ شوکانی نیل الاوطار میں فرماتے ہیں: وھو قول ابی ھریرۃ وجماعۃ بل حکاہ البخاری فی جزاء القراۃ خلف الامام عن کل من ذھب الی وجوب القراۃ خلف الامام واختارہ ابن خزیمۃ والضبعی وغیرھما من الشافعیتہ وقواہ الشیخ تقی الدین السبکی من المتاخرین۔ یعنی "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے اور ایک جماعت (سلف و خلف) کا بھی یہی مذہب ہے بلکہ امام بخاری نے تو یہ بیان کیا ہے کہ یہ ہر اس شخص کا مذہب ہے جو قراۃ خلف الامام کا قائل ہے اور امام ابن خزیمہ' ضبعی وغیرہ جو شافعیہ سے ہیں' یہی مذہب رکھتے ہیں اور شیخ تقی الدین سبکی جو متاخرین میں

سے ہیں' اس مذہب کو قوی قرار دیتے ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ بلاشک ازروئے دلائل قطعیہ یہی مذہب قوی ہے اور اس اصول شرع کے مطابق ہے کہ قال البخاری قال عدة من اھل العلم ان کل ماموم یقضی فرض نفسه والقیام والقرأة والرکوع والسجود وعندھم فرض فلا یسقط الرکوع والسجود عن الماموم وکذالک القرأة فرض فلا یزول فرض عن احد الا بکتاب او سنة یعنی "امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سے اہل علم نے یہ کہا ہے کہ ہر مقتدی اپنا فرض خود ادا کرے۔ قیام اور قراۃ اور رکوع اور سجود حنفیہ کے نزدیک بھی فرض ہیں۔ رکوع اور سجود مقتدی سے (بالاتفاق) ساقط نہیں ہیں تو قراۃ بھی فرض ہے یہ بھی ساقط نہیں ہے کیونکہ کوئی فرض کسی کے ذمہ سے زائل نہیں ہو سکتا جب تک قرآن وحدیث سے کوئی دلیل قطعی زائل کرنے والی نہ ہو۔"

عبدالقادر عارف حصاری

الارشاد جدید' جلد۔۳' شمارہ۔۱۷' ۱۸' ۱۹' ۲۰

مولوی عبداللہ کا رکوع کی رکعت میں ہیر پھیر

مولوی عبداللہ صاحب ڈیرہ غازی خان والے پہلے اس مسئلہ پر عقیدہ و عمل رکھتے تھے کہ رکوع میں امام کے ساتھ مل جائے تو رکعت ہو جاتی ہے اس کا اعادہ کرنا خلاف شرع اور گناہ ہے۔ چنانچہ اپنے رسالہ رکوع کی رکعت کے ص۔۳ میں لکھتے ہیں : "سابقہ میری تحریریں اور عقیدہ غلط تھا۔"

میں کہتا ہوں کہ جس علم کی بنا پر مولوی صاحب موصوف کا سابقہ عقیدہ اور تحریریں تھیں' وہ غلط تھا۔ وہی علم ان کا اب موجود ہے جو ان کے دماغ کا اور دل کا فہم ہے۔ یہ بات نہیں کہ مولوی صاحب پاکستان سے نکل کر مدینہ یونیورسٹی میں چلے گئے تھے۔ وہاں سے رب زدنی علما کا ورد کرتے اور علم حدیث کے شیوخ سے تعلیم حاصل کر کے ڈیرہ غازی خان میں آئے تو مزید تحقیق کی پھر عقیدہ اور عمل بدل گیا۔ اگر یہ بات ہوتی تو کوئی تعجب نہ ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مولوی صاحب ڈیرہ غازی خاں میں رہے' وہی علم اور وہی کتابیں اور وہی دلائل ان کے پاس موجود تھے لیکن جماعت غرباء اہلحدیث سے مخاصمت جاری تھی۔ جب وہ

رکوع کی رکعت کا مسئلہ بیان کرتے یا لکھتے تو مولوی صاحب کا نفس بس کھوتا اور کینہ بغض کی وجہ سے جوش میں آجاتا تب ایک دن مدہوش ہو کر رسالے لکھنے لگے۔ اب شرمندہ تھے کہ جن دلائل کو میں مان چکا ہوں کہ ان سے رکوع کی رکعت ثابت ہے۔ اب اگر صرف انہی کی تکذیب کروں تو بری بات ہے' اہل علم بھی مجھے بے اعتبار سمجھیں گے۔ تب ایک حدیث بے اصل اور بے سند مسند احمد کی شرح بلوغ الامانی سے نکال لی اور یہ کہہ دیا کہ سب سے پہلے میں وہ حدیث پیش کرتا ہوں جس سے میرے پرانے خیالات تبدیل ہو گئے۔

پھر حدیث لکھ کر یوں ترجمہ کیا' "یعنی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جو شخص امام کو رکوع میں پائے پس چاہیے کہ وہ امام کے ساتھ رکوع کرے اور اس رکعت کو دوبارہ پڑھے۔"

اس حدیث کو دیکھ کر اپنے سابقہ خیالات کو تبدیل کر لیا۔ اس حدیث کا مستند کتب حدیث میں نام ونشان نہیں ہے۔ کسی بے سند حدیث پر آنکھ بند کر کے گرے ہیں اور ابوبکرہ کی صحیح حدیث کو جس سے جمہور محدثین نے استدلال کیا تھا' اس کو ضعیف قرار دے دیا ہے ۔

نہ فروعت محکم آمد نہ اصول

شرم بایدت از خدا و رسول

رئیس الحفاظ امام الناقدین حافظ ابن حجر نے تلخیص الحبیر ص ۱۲۷ میں لکھا ہے : وھذا ھو المعروف موقوف واما المرفوع فلا اصل لہ یعنی "یہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے' مرفوع کی کوئی اصل نہیں ہے۔" یعنی کسی مستند کتب میں سند کے ساتھ یہ روایت پائی نہیں گئی۔

بہرحال ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی موقوف حدیث کو مرفوع بنا رہے ہیں حالانکہ مرفوع ثابت نہیں ہے۔ اگر ثابت ہوتی تو وہ علماء جو رکوع کی رکعت کے قائل نہیں ہیں' وہ اسے اپنے ثبوت میں پیش کرتے۔

پھر مولانا عبدالوہاب صاحب محدث دہلوی اور مولانا عبدالجلیل صاحب محدث سامرودی جنہوں نے عرب وعجم کی کتب حدیث کا ورق ورق چھان مارا' ضرور اس حدیث کو تسلیم کر کے رکوع کی رکعت کو شمار نہ کرتے۔ یہ مولوی صاحب موصوف ان تبحرین فی العلوم ہستیوں

کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے ہاتھی اور شیر کے مقابلہ میں مچھر ہے۔ چنانچہ علامۃ الدہر قاضی القضاۃ حافظ ابن حجر کو بھی اس نے کاٹ کھایا۔ کہتے ہیں "ابن حجر نے تساہل فرمایا' ابن حجر کے فرمانے سے کیا ہوتا ہے۔"

یہ کس قدر حماقت عظمیٰ ہے کہ حافظ ابن حجر کی کتابوں سے حوالے دے کر اپنا ثبوت لا رہے ہیں۔ فتح الباری' لسان المیزان' تہذیب التہذیب وغیرہ جو حافظ صاحب کی کتابیں ہیں اور وہ تمام علماء اسلام جو عرب و عجم میں ہیں' ان کے نزدیک مسلم ہیں اور مستند ہیں۔ علم رجال اور تنقید رجال میں ان کے اقوال سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اگر حافظ ابن حجر کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا تو تمہارے حوالے جو ابن حجر کی کتابوں سے تھے' باطل ہو گئے کہ ان کی نقل کا اعتبار نہ رہا۔

میں حیران ہوں کہ بغیر ثبوت کے حافظ صاحب کی بات کی تغلیط کر رہے ہیں۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔ حافظ ابن حجر وہ علامۃ الدہر ہیں جنہوں نے فتح الباری جیسی شاندار کتاب لکھی' جو عرب و عجم میں پڑھی جاتی ہے۔ یہ ایک ہی کتاب ان کے جامع العلوم اور تبحرفی الحدیث ہونے پر پختہ دلیل ہے۔

یہ مولوی صاحب حافظ ابن حجر تو کیا مولانا عثمان ایسے محقق رحمانی کے مقابلہ میں بلحاظ علم ایک مکھی کے پر برابر بھی قدر نہیں رکھتے' حافظ ابن حجر تو بڑی مقدس ہستی تھے کہ انہوں نے ہر فن میں ڈیڑھ سو کتابوں سے زائد لکھی ہیں جو سب مستند ہیں۔ اس لیے ان کو شیخ مشائخ الاسلام کہا گیا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ حافظ ابن حجر معصوم تھے' کوئی غلطی ان سے ہو جانا ممکن نہیں بلکہ بعض غلطیاں ہوئیں' لیکن ان کی غلطی وہی علماء ظاہر کر سکتے ہیں جو ان کی طرح جامع العلوم اور ماہر فنون ہوں۔ یہ مولوی صاحب کس باغ کی مولی ہیں کہ ابن حجر کی بغیر کسی ثبوت کے غلطی قرار دیں۔

اچھا سنو! حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے اب جو ان مولوی صاحب نے اس بے اصل روایت کی رو سے اپنا عقیدہ رکوع کا بدلا کہ رکعت نہیں ہوتی تو یہ خود بھی نااہل قرار پائے' ان کا اعتبار نہ کیا جائے۔ حافظ صاحب کی یہ صاحب یوں تردید کرتے ہیں کہ "یہ روایت ابن خزیمہ کی ہے' ابن خزیمہ میں اس کی سند

ہو گی" یہ بالکل غلط ہے کہ یہ حدیث ابن خزیمہ کی ہے۔ اگر یہ حدیث ابن خزیمہ میں معتبر اور مستند حوالے سے ثابت کر دیں تو ان کو یک صد روپیہ انعام۔ اگر یہ حدیث صحیح ابن خزیمہ میں ہو تو پھر صحیح ہے کیونکہ صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان سے بھی فائق ہے۔

چنانچہ تدریب الراوی کے ص۔۵۴ میں ہے : صحیح ابن خزیمة اعلٰی مرتبة من صحیح ابن حبان لشدة تحریه حتّٰی انه یتوقف فی التصحیح لادنی کلام فی الاسناد۔ یعنی "صحیح ابن خزیمہ کا مرتبہ صحیح ابن حبان سے زیادہ بلند ہے، کیونکہ حدیث کی تشخیص میں بہت شدت کرتے ہیں۔ اگر کسی حدیث کی اسناد میں معمولی سا بھی کلام ہو تو اس کو قبول کرنے میں توقف کرتے ہیں۔"

پھر اگر یہ حدیث ابن خزیمہ کی صحیح میں ہوتی تو حافظ صاحب بحرالعلوم اس کو بے اصل نہ کہتے، کیونکہ صحیح ابن خزیمہ میں ہونے سے اس کی اصل پائی گئی۔ باقی رہا مولوی صاحب موصوف کا یہ کہنا کہ ابن خزیمہ میں اس کی سند ہو گی، مسائل کی تحقیق میں ہو گی فقط ماضی تکیہ کا گوز شتر کے برابر ہے، اس کو اپنے گھر میں رکھو۔

اچھا مولوی صاحب موصوف نے جو الکل پچو سے تیر تکا چلایا، اس کا رد بھی علامہ ابن حجر نے کر دیا ہے۔ چنانچہ تلخیص الحبیر ص۔۱۲۷ میں ہے کہ اس روایت بے اصل سے ابن خزیمہ نے استدلال کیا ہے، یہ ابو عاصم عبادی نے حکایت کی ہے۔ پھر حافظ صاحب فرماتے ہیں : وراجعت صحیح ابن خزیمة فوجدته اخرج عن ابی هریرة من ادرک رکعة من الصلٰوة فقد ادرکها قبل ان یقیم الامام صلبه وترجم له ذکر الوقت الذی یکون فیه المأموم مدرکا للرکعة اذا رکع امامه قبل۔ یعنی "میں نے یہ حکایت سن کر صحیح ابن خزیمہ کی طرف مراجعت کی تو وہاں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت یوں درج تھی کہ جس نے نماز کی ایک رکعت امام کی پیٹھ سیدھا کرنے سے پہلے پالی، اس نے نماز پالی۔ اس حدیث پر یوں عنوان ہے کہ اس وقت کا ذکر جس میں امام کے رکوع کرنے پر مقتدی رکعت پا سکتا ہے۔" هذا مغایر لما نقلوه عنه ویؤید ذالک انه ترجم بعد ذالک باب ادراک الامام ساجدا والامر بالاقتداء به فی السجود وان لا یعتد به اذا المدرک للسجدة انما یکون بادراک الرکوع قبلها۔ یعنی ابن خزیمہ کا یہ کلام، اس کلام کے بالکل خلاف ہے جو علماء نے یہ نقل کرتے ہیں کہ رکوع میں ملنے سے رکعت نہیں ہوتی اور رکوع میں ملنے پر رکعت ہو جانے پر ان کا

مضمون تائید کر رہا ہے کہ ابن خزیمہ نے اس کے بعد یوں دوسرا عنوان قائم کیا ہے کہ یہ
ب ہے امام کو سجدے میں پانے اور سجدے میں اس کی اقتداء کرنے اور اس کو شمار میں نہ
بنے کا' اس لیے کہ رکعت تو رکوع کو پانے سے ملا کرتی ہے' جب تک سجدے سے پہلے
کوع نہ ملے تو اس سجدے کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔

بعض علماء امام ابن خزیمہ کو ان علماء میں شمار کرتے ہیں جو رکوع کی رکعت شمار نہیں
کرتے۔ انہی میں سے امام ابن حجر بھی تھے۔ چنانچہ فتح الباری میں یہ لکھا ہے کہ ابن خزیمہ
نہی میں سے ہیں لیکن جب حافظ ابن حجر نے تلخیص لکھی ہے تو اس امر کی دوبارہ تحقیق کی
ر اصل کتاب صحیح ابن خزیمہ کی طرف رجوع کیا تو وہاں اپنی نقل کے خلاف پایا اور دیگر
قلین ابو عاصم عبادی کے بھی خلاف تھا تو اس غلطی کو ظاہر کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ امام ابن حجر نے صحیح ابن خزیمہ کو دیکھا' وہاں اس روایت کو منقولہ
ولوی صاحب موصوف کا نام و نشان بھی نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت ہے کہ رکوع میں ملنے
ے رکعت ہو جاتی ہے۔ اس حوالہ سے مولوی صاحب موصوف کی بات کٹ گئی کہ جس
وایت کی بنا پر رجوع کیا تھا' وہ بے اصل تھی' ہباء منثورا ہو گئی اور ان کا یہ کہنا کہ یہ
ضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث اور صحیح ثابت ہے کہ رکوع میں ملنے سے رکعت
بارہ پڑھنی ہو گی' سفید جھوٹ ہے اور اب وہ اس وعید کے مستوجب ہو گئے کہ فرمایا
نحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے من کذب علی متعمدًا فلیتبوا مقعدہ من النار۔ "جس نے مجھ پر جان
جھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں سمجھ لے۔"

مولوی صاحب موصوف نے یہ جان کر کہ ایک ماہر فن نے اس روایت کو بے اصل کہا
ہے اور فتح الربانی شرح مسند احمد سے یہ روایت نقل کی ہے' وہاں بھی اس کو بے اصل لکھا
ہے تو پھر بھی اس جھوٹی روایت کو عمداً نقل کیا اور یہ لکھ دیا ہے کہ "نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے فرمایا ہے کہ جس نے امام کو رکوع میں پایا' پس چاہیے کہ وہ امام کے ساتھ رکوع کرے
ر رکعت دوبارہ پڑھے' کیسی صاف حدیث ہے' فرمان نبوی چمک رہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ روایت بے سند ہے' اس کا کسی کتاب میں وجود نہیں ہے اور حافظ
بن حجر کی تحقیق عمیق انیق نے یہ آفتاب کی طرح روشن کر دیا کہ یہ روایت ابن خزیمہ میں
نہیں ہے بلکہ دیگر الفاظ سے ہے جو اعتداد رکعت پر دال ہیں' جس سے مولوی صاحب کا

جھوٹ ثابت ہوا۔

مولوی صاحب موصوف حارث کی طرح قیاس کر کے خود رائی مجتہد بن کر یہ ظلم کرتے ہیں کہ اسماء الرجال کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں تو صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی احادیث کے راویوں پر جرح مبہم اور مرجوح لے کر تعدیل وتوثیق اور راجح کو ترک کرتے ہوئے ان احادیث کی تضعیف کرتے ہیں اور ذرہ بھر انصاف نہیں کرتے اور جب ضد اور تعصب سے لبریز ہو کر اپنے مخالف سے مقابلہ کرتے ہیں تو بے سند اور بے اصل احادیث کو صحیح قرار دے دیتے ہیں۔ اس شخص کو علماء سابقین متقدمین ومتاخرین کی تحقیقات اور اپنے اساتذہ کی تعلیمات اور علمی اور اصولی کتابوں کے تاثرات لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس صرف اپنے گھر کی شرع اور گھر کے اصول اور گھر کا علم ہے جو معلم الملکوت نے ان کے دل پر القاء کر دیا۔ اب علماء اہلحدیث تو اس وجہ سے ان سے اعراض رکھتے ہیں' صرف عوام کالانعام ان کی مولویت سے دھوکہ کھا جاتے ہیں جو نئے نئے مسائل خلاف جمہور علماء بلکہ اجماع کے خلاف اپنی تقریروں اور تحریروں میں ظاہر کر رہے ہیں۔

یہ شخص کبھی کہتا ہے کہ ننگے سر نماز جائز نہیں' کبھی یہ مشہور کرتا ہے کہ گھوڑا حرام ہے' کبھی اشتہار دیتا ہے کہ قربانی کرنا صرف ایک دن مسنون ہے باقی دنوں میں جائز نہیں' کبھی یہ لکھتا ہے کہ درس گاہوں سے جو علماء تعلیم وتدریس کی تنخواہیں کھا رہے ہیں' یہ حرام کھا رہے ہیں۔ کبھی یہ کہتا ہے کہ حج بدل کرنے کرانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کبھی یہ بیان کرتا ہے کہ ایصال ثواب کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور میت کی طرف سے قربانی کرنا جائز نہیں ہے' وغیرھا من المسائل الباطلہ الغرض یہ مولوی صاحب زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں ؎

نہ پیروی قیس و فرہاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

بدالقادر عارف حصاری

فہ اہلحدیث جلد۔۵۵' شمارہ۔۲' مورخہ ۲۹ محرم سنہ۔۱۳۹۳ھ

مسئلہ فاتحہ خلف الامام

رکوع میں ملنے سے رکعت نہیں ہوتی

ایک شخص اس وقت نماز میں شامل ہوتا ہے جبکہ امام رکوع چلا گیا آیا اس کی یہ رکعت ہو جائے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اس کے لیئے اصولی طور پر بڑی مدلل بحث کی ضرورت ہے فی الحال اختصاراً اس پر کچھ لکھا جاتا ہے، علماء اہل حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ قادر علی قراۃ فاتحہ غیر عاجز پر نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا فرض عین ہے۔ اور یہ ہر رکعت میں بطور رکنیت فرض ہے جو کسی وقت ساقط نہیں ہے، غنیۃ میں ہے کہ فاتحہ نماز کا رکن ہے اور جس حدیث میں سورہ فاتحہ کو نماز کہا گیا ہے اس پر امام بیہقیؒ نے کتاب القراءۃ صفحہ ۱۵ میں لکھا ہے کہ "وفی ذالك ولالة علی کونها رکنا فیها حتی سماها باسمها ولم یفرق بین الامام والماموم والمنفرد" یعنی اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ سورہ فاتحہ نماز کا رکن ہے کیونکہ اس کا نام ہی نماز رکھا گیا ہے اور امام اور مقتدی اور منفرد کا کوئی فرق رسول اللہ ﷺ نے بیان نہیں کیا یہ سب کے لیے یکساں رکن ہے حجۃ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۴ میں ہے کہ "وما ذکر النبی ﷺ بلفظ الرکنیة کقوله صلعم لا صلوٰة الا بفاتحة الکتاب" یعنی اس حدیث سے کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ نماز کا رکن ہے، اور حدیث قسمت الصلوٰۃ سے ثابت ہوتا ہے کہ فاتحہ نماز کا رکن بعینہ ہے چنانچہ شرح مسلم میں لکھا ہے " ففیه دلیل علی وجوبها بعینها فی الصلوٰة " اور رکن بعینہ کا حکم یہ ہے کہ "لایحتمل السقوط فی حال من الاحوال" کہ وہ کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا، اور فاتحہ نماز کی ہر رکعت کا رکن ہے چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں کہ 'والصحیح الذی علیه جمهور العلماء من السلف والخلف وجوب فاتحة فی کل رکعة لقوله صلعم للاعرابی ثم افعل ذالك فی صلوٰتك کلها " یعنی صحیح مذہب یہ ہے جس پر سلف اور خلف کے جمہور علماء قائم ہیں کہ سورہ فاتحہ ہر رکعت میں فرض ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اعرابی کو یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ساری نماز میں اسی طرح ان فرائض کو ادا کرتے رہو، اس واسطے امام نووی نے مسلم شریف

کی بتویب کرتے ہوے یہ باب باندھا ہے "باب وجوب قراءة الفاتحة فی کل رکعة" کہ سورہ فاتحہ ہر رکعت میں فرض ہے' اور احمد اور ابن حبان اور بیہقی ۔ جو قصہ مسیئ صلوٰۃ کا ذکر کیا ہے جس میں قراءۃ ام القرآن کا حکم وارد ہے اس حدیث کے آخر میں ہے کہ "ثم افعل ذالك فی کل رکعة" پھر ہر رکعت میں ام القرآن وغیرہ ارکان کو ادا کرو' اور نیل میں ہے ابو سعید سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ "امرنا رسول اللہ ﷺ ان نقراء بفاتحة الكتاب فی کل رکعته" کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو حکم فرمایا ہے کہ ہم نماز کی ہر رکعت میں فاتحہ پڑھیں' ان دلائل سے یہ واضح ہوا کہ سورہ فاتحہ نماز کی ہر رکعت کا رکن ہے' اور رکن کی تعریف یہ ہے کہ "رکن الشیئی مایقوم به ذالك الشئی " کہ رکن چیز کا وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ چیز قائم ہے' (قمر الاقمار) رکن کے بغیر وہ چیز باطل ہوتی ہے اور اس کے وجود کا تحقق نہیں ہوتا چنانچہ شرح عقائد نسفی صفحہ ۷۹ بحث ایمان میں ہے کہ " مع القطع بانه لاتحقق لشئی بدون رکنه" یعنی یہ قطعی بات ہے کہ کسی شئی کا تحقق بغیر رکن کے نہیں ہوتا' مثلاً اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ایمان کا رکن ہیں ان کے ساتھ ایمان کا وجود قائم ہے اگر کوئی ان میں سے نہ ہو تو ایمان کا وجود محقق نہ ہوگا' کیونکہ رکن ہر چیز کا اس چیز کی ماہیت کا جزو ہوتا ہے جب وہ منتفی ہو جائے تو وہ چیز بھی منتفی ہو جاتی ہے' اس واسطے نیل الاوطار میں حدیث "لا صلوٰة لمن لم یقرا بفاتحة الكتاب" پر نفی ذات پر بحث کرتے ہوے لکھا ہے کہ "واذا كان المنفی الصلوٰة الشرعیة لستقام نفی الذات لان المرکب کما ینتفی بانتفاء جمیع اجزائه ینتفی بانتفاء بعضها" یعنی جب حدیث میں صلوٰۃ شرعیہ کی نفی ہے کہ اس کا وجود بغیر فاتحہ کے نہیں ہے تو اس سے نفی ذات کی متحکم ہوگئی کیونکہ مرکب جیسے تمام اجزاء کے منتفی ہونے سے منتفی ہو جاتا ہے' چنانچہ شارع نے اس کا نام نماز بھی اس واسطے رکھا ہے کہ نماز کا وجود اس کے ساتھ ایسا قائم ہے کہ اگر فاتحہ کسی رکعت میں منتفی ہوگئی تو نماز کی وہ رکعت بھی منتفی ہو جائے گی اور اگر تمام نماز سے فاتحہ منتفی ہوگئی تو تمام نماز بھی منتفی ہو جائے گی' حجۃ اللہ میں ہے " وما سمی الشارع الصلوٰة بها فانه تبیه بلیغ علی کونه رکناً فی الصلوٰة" یعنی جس چیز کو شارع نماز کہہ دے۔

تو یہ اس بات پر تنبیہ بلیغ ہوتی ہے کہ وہ چیز نماز کا رکن ہے جب وہ رکن رہ گیا تو اس چیز کا اعادہ واجب ہے اس واسطے امام ابوعوانہ محدث نے اپنی مسند میں اس عنوان سے باب منعقد کیا ہے کہ " بیان الدلیل علی ایجاب اعادة الصلوٰة لمن لم یقراء بفاتحة الکتاب فصاعداً" یعنی اس باب میں اس دلیل کا بیان ہے کہ جس شخص نے سورہ فاتحہ نہ پڑھی اس پر نماز کا اعادہ واجب ہے' قرآن کریم میں آیت "فاقراء واماتیسر من القرآن" جو وارد ہے اس کے متعلق تفسیر کشاف' تفسیر مدارک' روح المعانی...... 'تفسیر ابوالسعود وغیرہ اور فتح الباری میں یہ لکھا ہے کہ " والمرا دبالقراء ة الصلوٰة لان القراء ة بعض ارکانها" اس آیت میں قراء ۃ قرآن سے مراد نماز ہے کیونکہ قراء ۃ نماز کے ارکان میں سے ہے' پس مطلق قراء ۃ احناف کے نزدیک اور مخصوص قراء ۃ فاتحہ محدثین کے نزدیک نماز کا رکن ہے اور رکن چیز کی ماہیت کا جزو ہوتا ہے جس کی نفی سے اس چیز کی نفی لازم آجاتی ہے اس واسطے تفسیر روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۲۱۰ میں حدیث لاصلوٰۃ کی نفی پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ' 'لان الفاتحة اذاکانت جزا ء من ماهیة الصلوٰة تنتفی الماهیة عند عدم قراء تها" مدرک رکوع کے مدرک رکعت ہونے کے قائلین بھی اس مسئلہ میں ہمارے ساتھ متفق ہیں کہ سورہ فاتحہ نماز کا رکن ہے اور اس کے بغیر نماز کا وجود نہیں ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بہت تشدد کرنے والے حضرات کے امام مولانا حافظ عبدالستار صاحب دہلوی فوائد ستاریہ میں ام الکتاب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی جس رکعت کے شروع میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ رکعت نہیں ہوگی (صفحہ ۱۵۶) ایک نام اس کا سورۃ الاساس بھی ہے کیونکہ یہ نماز کی رکن رکین ہے' (تا آخر) اس نام سے بھی معلوم ہوا کہ بغیر سورہ فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی کیونکہ یہ سورت بمنزلہ بنیاد کے ہے اور جس چیز کی بنیاد نہ ہو وہ قائم نہیں رہ سکتی (صفحہ ۱۵۷) نیز صفحہ ۱۷۲ میں حافظ ابن کثیر کی عبارت پیش کر کے ترجمہ کرتے ہیں " قراء ۃ فاتحہ ارکان نماز میں سے ایک بڑا رکن ہے اس لیے کہ اس میں اطلاق پوری عبادت یعنی نماز کا ہے اور صفحہ ۱۷۸ میں ہے یہ نماز کا رکن اور شرط ہے بموجب قاعدہ " اذافات الشرط فات الشروط" کہ شرط کے فقدان سے مشروط کا فقدان لازم آتا

ہے الحمد کے فقدان سے ساری نماز کا فقدان لازم آئے گا۔ جب شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سرے سے نماز کے وجود ہی کی نفی کر دی تو اب باقی کیا رہ گیا؟ صفحہ ۱۸۲ اور ۱۸۳ میں ہے کہ بغیر الحمد کے نماز ہی ناکافی ہے اس نمازی کی مغفرت ذنوب کے لیے کفایت ہی نہیں کر سکتی تو ظاہر ہے کہ وہ کالعدم اور بے کار ہے۔

مسند احمد میں مرفوعاً بایں الفاظ مروی ہیں "لا نقبل صلوٰۃ لا یقراء فیها بام القرآن" یعنی جس نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ نماز عنداللہ مقبول نہیں مردود ہے' غنیۃ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض و رکن ہے اس کے ترک کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور فرماتے ہیں' پس ثابت ہوا کہ فاتحہ نماز کا رکن ہے نہ صرف رکن ہے بلکہ بمنزلہ اصل کے ہے۔ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جس نے سورہ فاتحہ نماز میں نہ پڑھی تو وہ نماز خداج ہے اس کا معنی لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اونٹنی مرا ہوا بچہ ڈال دے "یعنی کچا بچہ" جس سے انسان کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے اس وقت اہل عرب لفظ خداج استعمال کرتے ہیں' اسی طرح اس نماز کو جس کا کوئی رکن و جزو ناقص ہو خداج کہتے ہیں" (صفحہ ۱۸۵ اور صفحہ ۱۸۶)" نیز صفحہ ۱۹۲ میں رقم طراز ہیں کہ ہمیں نبی ﷺ نے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا۔

کذا فی فتح البیان صفحہ ۴۸۲ جلد ۳ یہ تمام عبارتیں ہمارے مذہب کو صحیح ثابت کرتی ہیں اور نتیجہ صاف ہے کہ رکوع میں ملنے سے مقتدی کی رکعت نہیں ہوتی کیونکہ اس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی گئی اور جس رکعت کے شروع میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ رکعت نہیں ہوگی کیونکہ سورہ فاتحہ نماز کا رکن رکین ہے اور بمنزلہ بنیاد کے ہے اور جس چیز کی بنیاد نہ ہو وہ قائم نہیں رہ سکتی' یہ نماز کا بڑا رکن ہے جس پر اطلاق پوری نماز کا ہے پس اس کے بغیر رکعت پوری نہیں ہوتی یہ نماز کا رکن اور شرط ہے بموجب قاعدہ کہ شرط کے فقدان سے مشروط کا فقدان لازم آتا ہے الحمد سے رکوع والی رکعت کا فقدان لازم آئے گا جب شارع نے شروع سے نماز کے وجود کی ہی نفی کر دی تو رکوع والی رکعت کا وجود کیسے باقی رہ گیا جس میں فاتحہ رہ گئی۔ بغیر الحمد کے نماز ناکافی ہے تو مدرک رکوع کی رکعت بھی ناکافی ہے پھر وہ مغفرت ذنوب کے لئے نمازی کو کفایت نہیں کر سکتی کیونکہ کالعدم اور بے کار ہے' مدرک رکوع نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی

رکعت جب تک کہ وہ اعادہ نہ کرلے مقبول نہ ہوگی۔

امام بخاریؒ جزاء القراءۃ صفحہ ۲۰ میں فرماتے ہیں " قال ابو قتادہ وانس و ابوھریرۃ ماعن النبی ﷺ اذا اتیتم الصلوٰۃ فما ادرکتم فصلوا ومافاتکم فاتموافمن فاتہ فرض القراءۃ والقیام فعلیہ اتمامہ کما امر النبی ﷺ" یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم نماز (باجماعت) میں آؤ تو جس قدر تم امام کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اس کو پورا کرلو پس جس شخص کے دو فرض فوت ہو گئے ہوں ایک فاتحہ پڑھنا اور دوم قیام کرنا تو اس پر ان کا پورا کرنا واجب ہے جیسی کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو تم سے رہ جائے اسکو پورا کرلو اور اس پر امام بخاری نے متعدد طریقوں سے بار بار یہ حدیث اپنے مبارک رسالہ میں سورہ فاتحہ خلف الامام کی بحث کرتے ہوئے پیش کی ہے کہ " ما ادرکتم فصلو اومافا تکم فاقضوا" کہ جو نماز امام کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اس کی قضا دو۔

سورہ فاتحہ چونکہ پوری نماز کا حکم رکھتی ہے اور ہر رکعت کا بڑا رکن ہے اور اس کا روح رواں ہے اس لیے مدرک رکوع کو چاہیئے کہ بغیر فاتحہ والی رکعت کا شمار نہ کرے اور امام کے سلام کے بعد کھڑے ہو کر اس کا اعادہ کرلے اور قضا دیدے' نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۲۱ میں ہے "ومن الدلة علی ماذھبنا الیہ فی ھذہ المسئلة حدیث ابی قتادہ وابی ھریرۃ المتفق علیھما بلفظ ماادرکتم فصلوا ومافاتکم فاتموا قال الحافظ فی الفتح قد استدل بھما علی ان من ادرک الامام راکعالم یحتسب لہ تلك الرکعة فلامر باتمام مافاتہ لانہ فاتہ القیام والقراءۃ فیہ الخ" نیز علامہ وحیدالزمان امام ابن حزم سے نقل کرتے ھیں "ثمہ استدلال علی ماذھب الیہ من انہ لابد فی الاعتداد بالرکعة من ادراك القیام والقراءۃ بحدیث ماادرکتم فصلوا وما فانکم فاتمو اثمحزم بانہ لافرق بین فوت الرکعة والرکن والذکر المفروض لان الکل فرض لاتتم الصلوٰۃ الابہ قال فھو مامور بقضاء ماسبقہ بہ الامام واتمام فلا یحوز تحقق شئی من ذالك بغیر نص آخر ولاسبیل الی وجودہ" علامہ ابن حزم محلی جلد ثالث صفحہ ۲۳۶ میں فرماتے ہیں"وقراءۃ ام القرآن قرض فی کل رکعة من کل صلوٰۃ اماما کان اومامو مااومنفرد " پھر جلد ۳ صفحہ ۲۴۳ میں فرماتے ہیں کہ " فان حباء والامام راکع فلیرکع معہ ولا یعتد بتلك الرکعة لانہ لم یدرك القیام ولا القراءۃ ولکن لیقضیھا اذا اسلم الامام الخ" علماء اہل حدیث میں سے امام بخاری وامام ابن حزم وعلامہ

شوکانی مشہور محقق ہیں رحمہ اللہ علیہم اجمعین ان ہر سہ محققین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو مقتدی کا قیام اور قراءۃ ام القرآن ہر دو رکن فوت ہو جائیں یا ان میں سے ایک فوت ہو جائے تو بحکم حدیث " وما فاتکم فاتموا "ان فوت شدہ رکنوں کی قضا و اتمام ضروری ہے' اور یہ حدیث جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے اس مسئلہ میں دلیل قوی ہے جس کے برابر کوئی دلیل قائلین رکعت کے پاس موجود نہیں ہے۔ من ادعی فعلیہ البیان تعجب ہے کہ جس رکعت کے دو رکن ایک قیام اور دوم قراءۃ ام القرآن فوت ہو جائیں پھر وہ کس طرح قابل اعتداد و شمار ہو سکتی ہے؟ حدیث ابوبکرہ جس کو قائلین رکعت پیش کیا کرتے ہیں وہ محتمل ہے جو اس بارہ میں نص نہیں ہے امام الدنیا فی الحدیث امام بخاری اس حدیث پر فرماتے ہیں " ولیس فی جوابه ان اعتد بالرکوع دون القیام والقیام فرض فی الکتاب والسنة قال الله تعالی وقوموا لله قانتین وقال اذاقمتم الی الصلوٰة وقال النبی ﷺ الخ" یعنی امام بخاریؒ نے فرمایا کہ حدیث ابوبکرہ کی بنا پر یہ جواب درست نہیں ہے کہ قیام سے بے پرواہ ہو کر محض رکوع سے رکعت کو شمار کر لیا تھا کیونکہ قیام بروئے کتاب و سنت فرض ہے کہ اللہ تعالی نے قوموا للہ فرمایا ہے اور حدیث میں ہے " صل قائما فان لم تستطع فقاعدا " کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لو' امام ابن حزم اس حدیث پر فرماتے ہیں" واما حدیثا ابی بکرة فلا حجة لهم فیه اصلاً لانه لیس فیه انه اجتزاء بتلك الرکعة وانه لم یقضها فسقط تعلقهم به جهلة" کہ حدیث ابوبکرہ میں رکوع سے رکعت ہونے پر بالکل کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس میں کوئی ذکر نہیں کہ ابوبکرہ نے اس رکعت کا شمار کر لیا تھا اور قضا نہیں دی تھی پس ان کا تعلق اس دلیل سے بالکل ساقط ہے پھر امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ " وبیقین یدری کل ذهن سلیم......وان من ادرك الرکعة فقد فاتتهم الوقفةو قرأةام القرآن وکلاهما فرض لاتتم الصلوٰة الابه "یعنی جس کی حس صحیح سالم ہے وہ یقیناً یہ جان لے گا کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پایا ہے اس کے دو فرض فوت ہو گئے ہیں ایک قیام اور دوسری قرأۃ ام القرآن یہ ہر دو فرض ہیں جن کے ایک کے بعد بھی نماز پوری نہیں ہوتی چہ جائے کہ دونوں فوت ہو جائیں' پس اصل حدیث صحیح صرف ابوبکرہ والی ہی قائلین رکعات کے پاس تھی جو بالکل مجمل اور محتمل ہے اور وہ ان ادلہ صریحہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی جن سے فاتحہ اور قیام کی رکنیت اور فوت شدہ رکعات اور ارکان کی قضا و اتمام ثابت ہے۔ تنقیح الرواۃ میں ایک اور جواب ہے کہ "واجیب عنه بانه ﷺ لم یامره بالاعادة لان ابابکرة کان جاهلا" باقی دلیلیں ان کی یا تو بالکل ضعیف ہیں یا محتمل ہیں اور ضعیف حجت نہیں اور

محتملہ سے دعویٰ ثابت نہیں ہوسکتا کیونکہ " اذاجاء الاحتمال سقط الاستدلال" محتمل کی مثال یہ ہے کہ قائلین رکعات ایک دلیل "من ادرك ركعة من الصلوٰة فقد ادرك الصلوٰة "یا اس کی مثل الفاظ میں پیش کرتے ہیں اور رکعات سے مراد رکوع لیتے ہیں حالانکہ مراد اس سے کامل رکعات ہے چنانچہ نیل الاوطار صفحہ ۲۱۹ جلد۲ میں ہے "ان مسمی الركعة جميع اذكارها واركانها حقيقة شرعية عرفية وهما مقدمتان على اللغوية "یعنی رکعات تمام ارکان اور اذکار رکعات کا نام ہے حقیقت شرعیہ عرفیہ یہی ہے جو لغویہ پر مقدم ہے۔ اس واسطے امام الدنیا بالحدیث نے فرمایا کہ "قال النبی ﷺ من ادرك من الصلوٰة ركعة فقد ادرك الصلوٰة ولم يقل من ادرك الركوع او السجود او التشهد "یعنی رسول اللہ ﷺ نے ادراک رکعات کاملہ کا ارشاد فرمایا ہے اور کسی ایک رکن رکوع یا سجود یا تشہد کے ادراک پر یہ نہیں فرمایا کہ اس نے نماز پالی۔

عبدالقادر عارف حصاری مدظلہ الباری
اہل حدیث سوہدرہ جلد ۸ شمارہ ۳۴ و ۳۵۔
مورخہ ۸ و ۱۴ ستمبر ۱۹۵۶ء۔

نماز میں جہری وسری (دونوں طرح) بسملہ جائز ہے

ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث (۱۵ جولائی ۱۹۶۶ء) میں ایک مضمون بعنوان ''سنت نبوی اور سلف کا طرز عمل'' صفحہ ۸ پر درج ہے جس کا بقایا صفحہ ۱۰ پر ہے۔ اس صفحہ کے کالم نمبر تین میں ابن عبدالبر سے نقل کیا گیا ہے ''حضرت ابن عبدالبر حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے باپ نے جب مجھے نماز میں "بسم الله الرحمن الرحيم" پڑھتے سنا تو فرمایا بیٹا! اپنے آپ کو دین حدث اور بدعت سے بچاؤ۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ ابوبکر صدیقؓ عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ کے ساتھ نمازیں پڑھیں ہیں اور میں نے ان میں سے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا۔ تم بھی آئندہ نماز میں یہ نہ کہو۔ اور جب پڑھنا چاہو "الحمد لله رب العالمين" آخر تک پڑھ لیا کرو۔ ابن عبدالبرؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ سے زیادہ کسی شخص کو اسلام میں بدعت کو ناپسند اور مکروہ سمجھنے والا نہیں دیکھا۔

اس حدیث کو لکھ کر مضمون نگار نے کوئی تنقید یا اصلاح نہیں کی اور نہ ہی مدیر اخبار نے ہی اس پر کوئی اصلاحی نوٹ دیا ہے۔ اب عوام اور خصوصاً مقلدین حنفیہ اس سے سمجھیں گے کہ "بسم الله" جہری نمازوں میں جہر سے پڑھنا ناجائز اور بدعت ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جائے گا کہ علماء روپڑی نے بسملہ بالجہر نماز میں پڑھنا بدعت مان لیا ہے۔ حالانکہ یہ غلط اور باطل ہے۔

روپڑی خاندان میں حضرت العلام محدث روپڑیؒ مجتہدِ زمانہ مانے گئے ہیں۔ آپ اپنی ایک تصنیفِ لطیف رسالہ ''رفع یدین اور آمین'' کے صفحہ ۱۱ میں رقم طراز ہیں۔ بسم اللہ دونوں طرح پڑھنی درست ہے آہستہ آواز سے بھی اور بلند آواز سے بھی۔ نیز صفحہ ۹۳ پر لکھتے ہیں' جب آہستہ اور جہر دونوں طرح کی روایتیں آگئیں تو دونوں طرح سے عمل صحیح ہوا۔

اسی طرح بعض دیگر رسالوں میں بھی ہے۔ دیگر محدثین محققین نے بھی اس اختلافی مسئلہ پر تحقیقی اور تنقیدی بحث کرنے کے بعد یہی فیصلہ دیا ہے جو حضرت العلام نے دیا ہے۔ چنانچہ امام حازمیؒ بسملہ بالجہر وبالسر پر بحث کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر فرماتے ہیں" والصواب في هذا الباب ان يقال هذا امر متسع و القول بالحصر فيه ممتنع و كل من ذهب فيه الى رواية فهو مصيب متمسك بالسنة" یعنی اس بارے میں درست بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس امر میں اہل اسلام کے لیے فراخی ہے کوئی جس طرح چاہے عمل کرے' جس روایت پر اعتماد کر کے عمل کرے گا وہی سنت پر عمل کرنے والا قرار پائے گا (یہ اختلاف مباح ہے) اس میں ایک

طرف حصر کرنا کہ بسملہ جہر سے پڑھے اور آہستہ پڑھنا منع ہے یا یوں کہے کہ جہر سے پڑھنا بدعت اور منع ہے۔ آہستہ پڑھنا چاہیئے یہ یکطرفہ حصر ممتنع ہے۔

علامہ زرقانی شرح مؤطا جلد ا صفحہ ۱۶۵ میں فرماتے ہیں "والانصاف فی قول السیوطی قد کثرت الاحادیث الواردۃ فی البسملۃ اثباتا ونفیا و کلاالا مزین صحیح انہ صلعم قرأ بھا و ترکھا و جھر بھا و اخفاھا" یعنی انصاف امام سیوطی کے اس قول میں ہے کہ اس مسئلہ میں بہت سی احادیث وارد ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ دونوں طرح صحیح ہے۔ علامہ محقق یمنی سبل السلام جلد ا صفحہ ۱۷۱ میں تحقیقی نظر کے بعد یہ فیصلہ فرماتے ہیں "والاصل ان البسملۃ من القرآن واطال الجدال بین العلماء من الطوائف لاختلاف المذاھب والاقرب انہ صلعم کان یقرأ بھا تارۃ جھرۃ تارۃ یخفیھا" یعنی اصل بات یہ ہے کہ بسملہ قرآن میں سے ہے اور مذاہب میں اختلاف کی وجہ سے اس میں نزاع اور جھگڑا طویل پیدا ہو گیا ہے حق کے بہت قریب یہی بات ہے کہ حضور ﷺ نے کبھی بسملہ بلند آواز سے پڑھی ہے اور کبھی آہستہ آواز سے ہر دو جائز ہیں۔ امام شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں فریقین کے دلائل پر جرح قدح کرنے کے بعد آخر یہی فیصلہ دیا ہے کہ "جواز الامرین ماخوذۃ من ھذہ الادلۃ فلا نطول بذکرھا" یعنی جہر اور سر دونوں کا جائز ہونا ان دلیلوں سے لیا گیا ہے' بحث کو طول دینا ٹھیک نہیں ہے۔

اب حدیث ابن عبدالبر کے پیش کردہ مضمون نگار کی بابت یہ عرض ہے کہ اس سے عوام کو دھوکا نہ کھانا چاہیئے اور قائلین بسملہ بالسر کو بھی اس سے خوش نہ ہونا چاہیئے کہ یہ حدیث رولیۃً قابل استدلال نہیں ہے۔ اور نہ اس کو سنت اور بدعت کے تقابل میں پیش کرنا صحیح ہے کیونکہ اس روایت کا دارومدار ابن عبداللہ بن مغفل پر ہے اور وہ راوی مجہول ہے۔ نیل الاوطار جلد ا صفحہ ۲۰۵ میں ہے "وھو مجھول لا یعرف" یعنی یہ راوی مجہول ہے پہچانا نہیں گیا۔ نیز یہ لکھا ہے" وقال ابن خزیمۃ ھذا الحدیث غیر صحیح" یعنی امام ابن خزیمہ نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ "وقال الخطیب وغیرہ ضعیف" یعنی امام خطیب وغیرہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ "وسبب تضعیف ھذاالحدیث ماذکرناہ من جھالۃ ابن عبداللہ بن مغفل والمجھول لاتقوم بہ حجۃ" یعنی اس حدیث کے ضعیف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس میں ابن عبداللہ بن مغفل راوی مجہول ہے اور جس روایت میں راوی مجہول ہو' اس سے دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ امام ترمذی نے اس روایت کو خواہ مخواہ حسن کہہ دیا ہے جو اس کی اپنی اصطلاح ہے اس

تحسین کو امام نوویؒ نے مسترد کر دیا ہے۔ چنانچہ نیل الاوطار میں ہے "قال النووی ولا یرد علی هولاء الحفاظ قول الترمذی انه حسن" یعنی امام ترمذی کا اس حدیث کو حسن کہنا اس حدیث کو ضعیف کہنے والے حفاظ کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔

میں کہتا ہوں کہ امام ترمذی کی تصحیح کا بھی دیگر ائمہ کے مقابلہ میں کچھ اعتبار نہیں ہے۔

کثیر بن عبداللہ مزنی راوی کے ترجمہ میں امام ذہبیؒ فرماتے ہیں " فلهذا لایعتمد العلماء علی تصحیح الترمذی" ترمذی کی تصحیح پر علماء محققین کو اعتماد نہیں تو تحسین پر کیا ہونا تھا۔ پس یہ روایت نا قابل اعتبار ہے۔ ابن احمد کی یہ روایت مسند احمد میں بھی ہے۔ اس کی شرح فتح الربانی جلد ۳ صفحہ ۱۸۸ میں ہے امام خطیب وغیرہ سے اس کی تضعیف نقل کی ہے۔ اور تضعیف کا سبب راوی کا مجہول ہونا بیان کیا ہے۔ "والمجهول لاتقوم به حجة" جس روایت میں راوی مجہول ہو اس سے دلیل نہیں لی جا سکتی ہے۔

پھر درایت کی رو سے بھی یہ روایت قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس سے بہ ظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ بسملہ نہ پڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ نیل الاوطار میں ہے " والحدیث استدل به القائلون بترك قرأة البسملة فی الصلوٰة" یعنی اس حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ بسملہ نماز میں نہ پڑھنی چاہیئے۔ یہ امام مالک وغیرہ بعض علماء کا مذہب ہے جو سراسر غلط ہے۔ جس کو احادیث جہر و سر صاف رد کر رہی ہیں۔ اس حدیث میں صاف ذکر ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرات خلفائے عمرؓ وغیرہ کو بسملہ کہتے سنا ہی نہیں ہے اور یہ کہا " ولاتقلها اذا انت قرأت فقل الحمد لله رب العالمین" یعنی بسملہ مت پڑھ جب پڑھنا شروع کرے تو (الحمدللہ سے شروع کر) یہ احادیث متواترہ کے خلاف ہے اس لیے یہ روایت مردود ہے۔ اسی طرح حضرت انسؓ سے جو روایت " لایذکرن لایقرأون" وغیرہ الفاظ سے مروی ہیں سب مضطرب ہونے کی وجہ سے مردود ہیں۔ چنانچہ سبل السلام میں ہے" قال ابن عبدالبر فی الاستذکار بعد سرده روایات انس هذه مالفظه هذا لاضطراب لاتقوم معه حجة لا حصر من الفقهاء الذین یقرأون بسم الله الرحمن الرحیم والذین لایقرأون" پھر یہ روایت درایت کی رو سے بایں طور بھی مردود ہے کہ بسملہ بالجہر پر آں حضور ﷺ صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ محدثین کا تعامل پایا گیا ہے۔ سبل السلام جلد ا صفحہ ۱۷۲ میں ہے" وروی الجهر

اور آپ کے صحابہ کرامؓ اور آپ کی ازواج مطہرہ سے بسم اللہ کی قرآت بالجہر مروی ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے " فذهب الشافعیؒ الی انه یجهر بهامع الفاتحه والسورة وهو مذهب طوائف من الصحابة والتابعین وائمة المسلمین سلفا وخلفا فجهر من الصحابة ابو هریرة وابن عمروابن عباس ومعاویه وحکاه ابن عبدالبر والبیهقی عن عمرو علی ونقله الخطیب عن الخلفاء الاربعة وهم ابوبکر وعمر وعثمان وعلی وهو غریب ومن التابعین الخ' والحجة فی ذالك انها بعض الفاتحة فیجهر بها کسائر ابعاضها"یعنی امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ وہ سورہ فاتحہ اور دیگر سورہ کے ساتھ بسملہ بالجہر پڑھتے ہیں۔اسی طرح دیگر صحابہ کرامؓ ابو ہریرہؓ 'ابن عمرؓ 'ابن عباسؓ 'اور معاویہؓ وغیرہ سے مروی ہے' ابن عبدالبر اور بیہقی نے خلفائے راشدینؓ حضرت ابوبکرؓ وغیرہ سے بھی نقل کیا ہے۔مگر یہ غریب ہے اور تابعین سے بھی بسملہ جہری مروی ہے۔پھر حافظ ابن کثیر نے تمیں تابعین کے اسمائے گرامی درج کیے ہیں اور دلیل ان سب کی یہ ہے کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی جز ہے۔جب سورہ فاتحہ کو پڑھا جائے گا تو اس کے تمام اجزاء کو پڑھا جائے گا۔جب فاتحہ کے تمام اجزاء اور حصے پڑھے گئے تو پھر بسم اللہ بھی پڑھی جائے گی۔

اس تعامل سے ثابت ہوا کہ امام قرأت کے وقت بسملہ بالجہر پڑھے تو یہ بدعت نہیں ہے۔رحمۃ المھداۃ فصل رابع مشکوۃ کے صفحہ ۴۳ پر صحابہ کرامؓ کے تعامل کی روایات درج ہیں۔ان میں سے حضرت معاویہؓ کی روایت بھی ہے کہ انہوں نے مدینہ میں جہری نماز پڑھائی تو بسم اللہ شروع فاتحہ میں پڑھی اور جب سورہ پڑھی تو پھر بسم اللہ نہ پڑھی۔مہاجرین کو یہ ناگوار گزرا تو پکار اٹھے۔"یا معاویة اسرقت الصلوٰۃ ام نسیت"یعنی اے معاویہؓ کیا آپ نے نماز سے چوری کرلی یا یہ چیزیں (بسملہ وغیرہ) پڑھنا بھول گئے ہیں؟۔پھر حضرت معاویہؓ نے دوبارہ نماز پڑھائی تو فاتحہ اور سورہ کے شروع میں بسم اللہ پڑھی' یہ واقعہ مسجد نبوی کا ہے۔

پس عہد معاویہؓ میں صحابہؓ اور تابعین کا بسم اللہ بالجہر پر اجماع پایا گیا تو اب اس سے انکار کرنا مکابرہ یا باطل مجادلہ ہے اور اس کو بدعت کہنا مردود ہے۔رحمۃ المھداۃ میں صحابہ کرامؓ سے کئی روایات نقل کی ہیں۔جن سے بسم اللہ بالجہر کا ثبوت پایا گیا ہے۔بلوغ المرام میں حضرت ابو ہریرہؓ (جو مشہور صحابیؓ اہلحدیث تھے) سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے نماز پڑھائی تو بسم اللہ اور آمین بالجہر کہی اور پھر یہ فرمایا کہ "والذی نفسی بیده انی لاشبهکم صلوٰۃ برسول اللہ ﷺ رواه

النسائی و ابن خزیمہ "یعنی خدا کی قسم بہ نسبت تمہاری میری نماز آنحضرت ﷺ کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

امام نسائی نے بسملہ بالجہر کا باب منعقد کر کے پھر اس حدیث کو ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوا کہ اس حدیث سے بسم اللہ بالجہر ثابت ہے۔ "وھو اصح حدیث ورد فی ذالك فھو موید للاصل وھو کون البسملة حکمھا حکم الفاتحة فی القرأة جھراً وسراً اذھو ظاھر فی انه کان صلعم یقرأ البسملة لقول ابی ھریرۃؓ انی لاشبھکم صلوٰۃ برسول اللہ ﷺ" یعنی یہ حدیث سب حدیثوں سے زیادہ صحیح ہے جو بسملہ بالجہر کے بارے میں وارد ہیں اور یہ اس اصل قاعدہ کی بھی مؤید ہیں کہ بسملہ کا حکم وہی ہے جو فاتحہ کا حکم ہے کہ اگر فاتحہ کی قرأت جہر سے ہو تو بسملہ بالجہر ہے اور اگر فاتحہ آہستہ ہو تو بسم اللہ آہستہ پڑھی جائے۔ اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے بسم اللہ بلند آواز سے پڑھی۔ کیونکہ ان کا حلفیہ بیان ہے کہ میری نماز آں حضرت ﷺ کے ساتھ زیادہ مشابہ ہے۔ اس پر کسی نے انکار نہیں کیا تو اجماع سکوتی حسب قاعدہ اصول فقہ حنفیہ پایا گیا۔ فللہ الحمد۔

محقق امیر یمنی فرماتے ہیں "ویبعد من الصحابی ان یبتلك رسول اللہ ﷺ فیھا ثم یقول والذی نفسی بیدہ انی لاشبھکم" یعنی یہ شانِ صحابہ سے بہت بعید بات ہے کہ وہ اپنی نماز میں ایسی بدعت پیدا کریں جو رسول اللہ ﷺ نے نہ کی ہو اور یہ حلفیہ بیان دیں کہ میری نماز رسول اللہ ﷺ کے مشابہ ہے (کیونکہ صحابہ کرام بدعت سے بہت بچتے تھے)۔

خلاصہ کلام: خلاصہ کلام یہ ہے کہ بسملہ جہری نماز میں بلند آواز سے پڑھنا جائز ہے، بدعت نہیں ہے۔ اور جو روایت اخبار تنظیم اہلحدیث میں درج ہے وہ روایت اور درایت کی رو سے مردود ہے۔ عوام اور خواص کو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔

ھذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۶۷ء۔

سورہ فاتحہ کی فضیلت اور مقلدین میں اس کی بے قدری

حضرات! سورہ فاتحہ قرآن مجید کی مشہور سورت ہے جو ہر مسلمان نمازی کو یاد اور حفظ ہے۔ لیکن اس کی فضیلت اور حقیقت اور قدر اور درجہ بہت کم لوگ جانتے ہیں اس لیے اس کے حکم کی قدر نہیں کرتے۔ تفسیر در منثور جلد ا صفحہ ۴ میں یہ حدیث ہے "قال رسول الله ﷺ ما انزل الله فی التوراة ولا فی الانجیل ولا فی الزبور ولا فی القرآن مثل ام القرآن وھی السبع المثانی والقرآن العظیم الذی اوتیت وھی مقسومة بینی وبین عبدی ولعبدی ماساء ل" یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ جیسی کوئی سورت نہ تورات میں اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے نہ انجیل میں نہ زبور میں نہ قرآن میں۔ یہ سبع مثانی ہے یعنی یہ سات آیتیں ہیں کہ نماز کی تمام رکعتوں میں دہرا کر ان کو پڑھا جاتا ہے اور اس کا نام قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گا ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ میں نے اس کو اپنے اور اپنے بندے پڑھنے والے کے درمیان تقسیم کرلیا ہے اور میرے بندے کو وہی چیز ملے گی جس کا اس نے سوال کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سورۃ فاتحہ سب آسمانی و رحمانی کتابوں سے افضل ہے اور شان درجہ میں اس کے برابر کوئی سورت نہیں ہے اور تفسیر در منثور میں یہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے اور اس وقت جرائیلؑ بھی بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک آسمان سے آواز آئی تو جرائیلؑ نے آسمان کی طرف دیکھا تو فرمایا کہ اے محمد ﷺ آسمان سے ایک فرشتہ اترا ہے جو پہلے کبھی زمین پر نہیں اترا تھا۔ اس فرشتہ نے آکر سلام کہا اور یہ فرمایا کہ یا رسول اللہ! کہ میں جناب کو یہ بشارت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو نور ایسے عنایت فرمائے ہیں جو آنجناب سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے اور وہ یہ ہیں ایک سورہ فاتحہ دوسری وہ آیات جو سورہ بقرہ کے آخر میں ہیں (امن الرسول سے آخر تک) تیسری حدیث در منثور میں یہ ہے کہ ابو زید بیان کرتے ہیں کہ میں آنحضور ﷺ کے ہمراہ مدینہ منورہ کے بعض راستوں میں تھا تو آنجناب ﷺ نے کسی شخص سے سنا وہ تہجد کی نماز میں سورہ فاتحہ پڑھ رہا ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہ سورت ہے کہ جس کے برابر درجہ میں کوئی سورت نہیں ہے تمام زمین پر۔ اور چوتھی حدیث میں یہ ہے جناب نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کی طرف توجہ فرما کر یہ کہا" الا اخبرك بافضل القرآن فتلا علیه الحمد لله رب العالمین

"یعنی کیا میں تجھے ایسی سورت کی خبر نہ دوں جو قرآن مجید سے بہت زیادہ افضل ہے پھر سورہ فاتحہ پڑھ کر سنائی۔ اور صحیح حدیثوں سے یہ نقل کیا ہے "فاتحه الکتاب شفاء من السم" کہ سورہ فاتحہ ہر زہر کی دوا ہے اور یہ بھی فرمایا" شفاء من کل داء" کہ فاتحہ ہر بیماری کے لئے شفاء ہے۔ صحابہ کرام نے سانپ کے کاٹے ہوئے شخص پر اور مرگی والے پر اور دیوانہ پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا وہ صحت یاب ہو گئے۔ اور حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" انها انزلت من کنز تحت العرش "یعنی فاتحہ اس خزانہ سے لا کر اتاری گئی جو عرش کے نیچے ہے۔ امام سیوطی کی تفسیر درمنثور میں یہ سب حدیثیں ہیں اور امام سیوطی نے اپنی تفسیر اتقان میں لکھا ہے "خمسة وعشرین اسما للفاتحه" کہ سورہ فاتحہ کے پچیس نام ہیں۔ کثرت ناموں کی چیز کی فضیلت اور فوقیت اور درجات پر دال ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے اسماء کثیرہ ہیں اور جناب نبی کریم ﷺ کے اسماء کثیرہ ہیں جو آپ کے درجات عالیہ پر دال ہیں۔ اسی طرح سورہ فاتحہ کے بہت سے نام ہیں۔ پس اس کی بھی باقی قرآن پر بہت فضیلت ہے اور درجات عالیہ ہیں۔ سورہ فاتحہ کے ناموں کی اگر الگ الگ تشریح کی جاوے تو اس کی تمام فضیلت نمایاں ہو جائے گی لیکن پھر مضمون بہت طویل ہو جائے گا اس لئے صرف دو تین ناموں کی تشریح راقم السطور کرتا ہے اسی طرح باقی ناموں کو سمجھ لیں۔ تفسیر اتقان صفحہ ۵۵ تفسیر خازن صفحہ ۴ فتح البیان صفحہ ۱۹ ابن کثیر صفحہ ۱۳ میں سورہ فاتحہ کا نام کافیہ لکھا ہے یعنی یہ سورہ کفائت کرنے والی ہے "الکافية لانها تکفی فی الصلوٰة عن غیرها ولا یکفی غیرها عنها" یعنی اس سورہ کا نام کافیہ ہے کیونکہ یہ اکیلی ہی باقی قرآن سے کفائت کر جاتی ہے اور باقی قرآن اس کی جگہ کفائت نہیں کرتا (یہ ضرور پڑھنی پڑے گی) کتاب القرآۃ بیہقی صفحہ ۹ میں ہے" ان النبی ﷺ قال ام القرآن عوض من غیرها ولیس غیرها منها عوض رواته ثقات "یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ جو سارے قرآن کی ماں ہے یہ اپنے غیر کا عوض ہے اور اس کے سوا باقی قرآن اس کا عوض نہیں ہے۔ یہ ضرور پڑھنی پڑے گی۔ اس کی تائید اس مرسل حدیث سے ہوتی ہے جو درمنثور صفحہ ۵ میں ہے کہ جس شخص نے سورہ فاتحہ پڑھ لی اس نے گویا تورات' انجیل' زبور اور قرآن سب پڑھ لئے۔ ابو نعیم اور دیلمی کی روایت درمنثور میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جاوے اور باقی قرآن ترازو کے

دوسرے پلڑے میں رکھا جاوے تو سورہ فاتحہ کی باقی قرآن پر سات گنا فضیلت ہے۔(صفحہ ۵)دوسرا سبع مثانی ہے تفسیر اتقان جلد ا صفحہ ۵۳ میں ہے "عن عمر قال السبع المثانی فاتحة الکتاب تثنیٰ فی کل رکعة" یعنی اس کو سبع مثانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں دہرا کر پڑھی جاتی ہے۔اس کا نام صلوٰۃ ہے یعنی نماز کیونکہ یہ نماز کی روح ہے اور ارکان جسم نماز کے ہیں جیسے روح کے بغیر جسم بے کار اور مردہ ہے اسی طرح سورہ فاتحہ کے بغیر نماز مردہ ہے چنانچہ درمنثور صفحہ ۶ پر یہ حدیث ہے "عن ابی ھریرة امرنی رسول اللہ ﷺ قال کل صلوٰۃ لا یقرا فیھا بفاتحہ الکتاب فھی خداج" یعنی رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہر ایک نماز جس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی گئی وہ مردہ ہے اس حدیث میں دو عموم ہیں ایک لفظ کل کا کہ ہر نماز خواہ امام کی ہو یا منفرد کی یا مقتدی کی جس نے فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز مردہ ہے دوسرا لفظ صلوٰۃ نکرہ ہے جو حیز نفی میں وارد ہے یہ بھی ہر نمازی کے لئے عام ہے۔کہ بغیر فاتحہ کے سب کی نماز مردہ ہے۔اور حدیث مسلم وغیرہ اس کو قوت دیتی ہے۔"عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من صلی صلوٰۃ لم یقراء فیھا بام القرآن فھی خداج فھی خداج ثلاث مرات غیر تام (الحدیث)۔یعنی جس شخص نے کوئی نماز پڑھی اور اس میں فاتحہ نہ پڑھی تو وہ مردہ ہے' مردہ ہے' مردہ ہے۔اس میں بھی دو عموم ہیں ایک لفظ من عام ہے دوسرا لفظ صلوٰۃ نکرہ عام ہے۔یہ حدیث ہر نمازی اور ہر نماز کو شامل ہے اور لفظ خداج کا معنی مردہ ہے۔ قاموس جلد ۲ ص ۱۸۴ میں ہے "الخداج القاء الناقة ولد ھاقبل تمام الایام" یعنی خداج عرب کے محاورہ میں یہ ہے کہ اونٹنی اپنا بچہ قبل میعاد کچا ہی ڈالدے وہ مردہ ہوتا ہے۔اس لیے ہم نے خداج کا مرادی معنی مردہ کیا ہے۔حدیث میں ممانعت آئی ہے کہ نماز کو خداج کرنے سے بچو۔چنانچہ مسند احمد بمع شرح فتح الربانی جز خامس میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اتقوا خداج الصلوٰۃ" یعنی نماز کو مردہ کرنے سے بچو۔بعض لوگ کہتے ہیں نماز ناقص ہے پوری نہیں ہے۔میں کہتا ہوں کہ اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ ناقص ہے۔اس میں فاتحہ کی روح نہیں ہے۔ناقص نماز اللہ قبول نہیں کرتا۔پوری نماز قبول کرتا ہے۔

ترغیب منذری میں یہ حدیث وارد ہے "فاتموا صلاتکم فان اللہ لایقبل

الا تاما" نماز کو پوری کرو پس تحقیق اللہ تعالیٰ پوری نماز قبول کرتا ہے ناقص نہیں کرتا۔ پس فاتحہ کے بغیر نماز قبول نہیں ہے۔ فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۲۱۰ میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "لا تقبل صلوٰۃ لا یقراء فیھا بام القرآن" کہ بغیر سورہ فاتحہ پڑھے نماز قبول نہ ہوگی۔ یہ حدیث بھی عام ہے کہ کوئی نماز ہو بغیر فاتحہ کے قبول نہیں ہے۔

ان دلائل سے خوب ثابت ہوا کہ سورہ فاتحہ مدارج عالیہ رکھنے والی نماز کی روح ہے۔ اس کے بغیر نماز مردہ ہے ہرگز قبول نہ ہوگی، خواہ وہ مقتدی ہو۔ چنانچہ ان حدیثوں کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ مقتدی کیا کرے تو فرمایا کہ آہستہ پڑھ لے (مسلم)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کا نام صلوٰۃ ہے جو مسلم کی حدیث قدسی سے ثابت ہے اور یہ نماز کی ماہیت میں داخل ہے اس لئے اس کو نماز کا رکن اعظم قرار دیا گیا ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث قدسی میں جو یہ الفاظ ہیں "قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی" یعنی فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ میں نے صلوٰۃ یعنی فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر لیا ہے پھر آگے حدیث میں اس کی تفصیل ہے۔ اس حدیث پر امام نووی نے صحیح مسلم کی شرح میں یہ تشریح کی ہے کہ سورہ فاتحہ کو اللہ تعالیٰ نے نماز اس لیئے فرمایا ہے "بانھا لا تصح الا بھا" کہ سورہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز صحیح نہیں ہوتی۔ میں کہتا ہوں کہ اسی چیز کو نماز کا رکن کہتے ہیں جس کے بغیر نماز صحیح نہ ہو۔ چنانچہ حنفی مذہب کی مشہور درسی کتاب عقائد نسفی کے صفحہ ۹۷ بحث ایمان میں لکھا ہے "مع القطع بانہ لا تحقق فلشئی بدون رکنہ" یعنی یہ قطعی بات ہے کہ رکن کے بغیر کسی چیز کا تحقق نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی شیخ العرب والعجمؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی جلد ۲ صفحہ ۴ میں رقمطراز ہیں "وما ذکرہ النبی ﷺ بلفظ الرکنیۃ کقولہ صلعم لا صلوٰۃ الا بفاتحہ الکتاب" یعنی وہ چیز جس کو نبی کریم ﷺ لفظ رکنیت سے ذکر کریں وہ رکن ہے جیسے یہ فرمایا کہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز صحیح نہیں ہے۔

اس حدیث میں لفظ رکن کا نہیں ہے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا مقصد یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے یہ فرمادیا کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز صحیح نہیں ہے تو اس سے فاتحہ کا نماز کا رکن ہونا ثابت ہو گیا۔ حضرت شیخ المشائخ تاج الاولیاء جیلانیؒ نے اپنی کتاب غنیۃ الطالبین

میں سورہ فاتحہ کی بابت یہ فرمایا ہے کہ "فان قرآتها فريضة وهي ركن بطل الصلوٰة بتر کہا" (صفحہ ۲۳ مطبوعہ اسلامیہ لاہور) یعنی سورہ فاتحہ نماز میں پڑھنا فرض بطور رکن ہے کہ اس کو چھوڑنے سے نماز باطل ہے۔ تفسیر ابن کثیر جلد ا صفحہ ۱۹ میں حدیث قدسی قسمت الصلوٰۃ پر لکھا ہے "فدل على عظمة القراء ة في الصلوٰة وانها من اكبر اركانها" یعنی حدیث قدسی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فاتحہ نماز کے سب رکنوں سے بہت بڑا رکن ہے۔ کتاب القرات میں حدیث قدسی پر لکھا ہے "وفي ذالك دلالة على كونها ركنا فيها حتى سماها باسمها ولم يفرق فيها بين الامام والماموم والمنفرد" یعنی حدیث قدسی میں جو اللہ تعالیٰ نے فاتحہ کو نماز کہا ہے اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ فاتحہ نماز کا رکن ہے اور ایسا بڑا رکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فاتحہ کا نام ہی نماز رکھ دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس حدیث میں کوئی فرق نہیں کیا اس رکن میں سب شامل ہیں۔ امام اور مقتدی اور اکیلا پڑھنے والا جیسے حدیث میں آیا ہے۔ "الحج عرفة" یعنی حج عرفہ ہے کہ عرفات میں حاجیوں کے کھڑے ہوئے بغیر کسی کا حج نہیں ہوتا تو اس کا نام حج رکھ دیا۔ اسی طرح فاتحہ کا نام نماز رکھ دیا کہ اس کے بغیر نماز بالکل باطل ہے۔ چنانچہ رئیس الائمہ امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔ ھدایہ کتاب حنفیہ کے صفحہ ۱۰۴ میں شافعیہ کا یہی مذہب لکھا ہے کہ فاتحہ نماز کا رکن ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے "حتى لوترك حرفا منها لاتجوز صلوٰة" یعنی شافعیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر فاتحہ کا ایک حرف بھی چھوڑ دیا تو نماز جائز نہ ہوگی۔ اور علامہ انور شاہ صاحب جو دیوبند کے بہت بڑے شیخ الحدیث ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی شافعیہ کا یہی مذہب لکھا ہے۔ "عبدالشافعي ركن عند من ذهب اليه سواء كان في حق الامام والمنفردا والمقتدى ايضا" یعنی امام شافعی اور شافعیہ کے نزدیک سورہ فاتحہ نماز کا رکن ہے خواہ امام ہو یا اکیلا ہو یا مقتدی ہو پھر لکھا ہے "والجمهو رفيها مع الشافعية" یعنی اکثر علماء شافعیہ کے ساتھ ہیں کہ سب رکن قرار دیتے ہیں جب سورہ فاتحہ کے فضائل اور حکم معلوم کر لیا کہ یہ نماز کا رکن اعظم ہے بلکہ عین نماز ہے تو اب بعض مقلدین نے جو سورہ فاتحہ کی بے قدری کی ہے وہ اب غور سے سن لیں (یعنی مقلدین میں فاتحہ کی بے قدری)۔

(1) بعض مقلدین نے سورہ فاتحہ کی پہلی بے قدری یہ کی ہے کہ اس کے نماز کا رکن ہونے

سے انکار کر دیا۔ ھدایہ جلد ا صفحہ ۸ میں ہے "فقراء ة الفاتحة لا تتعین رکنا عدنا" یعنی ہمارے حنفیہ کے نزدیک فاتحہ نماز کا رکن نہیں ہے اور صفحہ ۱۱۸ ہدایہ میں ہے "وادنیٰ مایجزیء من القرائه فی الصلوٰۃ آیة عند ابی حنیفة" یعنی ادنیٰ درجہ نماز میں القراۃ کا یہی ہے کہ قرآن کی ایک آیت کہیں سے پڑھ دے یہ مذہب امام ابو حنیفہ کا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو مقلدین منسوب ہوتے ہیں اور وہ اپنے امام کی دیگر سب ائمہ محدثین پر ان کی فوقیت بتا کر ان کے مناقب و فضائل بیان کرنے میں رطب اللسان رہتے ہیں اور قرآن و حدیث کا ان کو بڑا ماہر قرار دیتے ہیں۔ اب ان کا مذہب یہ معلوم کر لیں کہ احادیث نبویہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سورہ فاتحہ جس کی مثل تمام کتب الہیہ میں نہیں ہے اور وہ رکن نماز ہے اس کے سراسر خلاف ان کے امام اور مقلدین یہ حکم لگا رہے ہیں کہ قرآن میں سے کہیں سے کوئی آیت پڑھ دو نماز کا فرض ادا ہو جائے گا۔ چنانچہ فرقہ بریلویہ کے مجدد احمد رضا خاں صاحب جو مرتے ہوئے یہ وصیت کر گئے ہیں کہ تم ہمیشہ میرے مذہب پر قائم رہنا جو میری کتابوں میں ہے۔ وہ اپنی کتاب احکام شریعت حصہ دوم کے صفحہ ۱۶۷ میں لکھتے ہیں "ہمارے امام اعظمؒ کے نزدیک صرف مدھامتان سے بھی نماز جائز ہے اور اس میں اصلاً ذکر خلاف نہ پایا درمختار میں ہے "اقلها احرف کلم یلد" یعنی ایک آیت ایسی ہو کہ جس کے چھ حروف ہوں جیسے لم یلد یہ تو لاعلمی ہے اس کے تو پانچ حروف ہیں۔ پھر تفصیل سے لکھا ہے کہ مدھامتان سے نماز جائز ہے بدائع میں ہے "فی ظاهر الروایة قدر ادنی المفرض بالایة التامة کقوله تعالیٰ "مدها متان "وماواله ابو حنیفة اقیس" کہ ادنیٰ فرض قرآۃ کا نماز میں پوری آیت ہے جیسے مدھا متان اور ابوحنیفہ کی یہ بات کہ محض ایک آیت سے فرض ادا ہو جاتا ہے یہ اندازہ بہت ٹھیک ہے۔

آگے پھر صفحہ ۱۶۸ پر خاں صاحب یہ لکھتے ہیں مثل فجر میں جبکہ وقت قدر واجب سے کم رہا ہو ایسے وقت میں "ثم نظر" کہ بالاجماع ہمارے امام کے نزدیک ادائے فرض کو کافی ہے مدھامتان سے جلد ادا ہو جائے گا کہ اس میں حرف بھی زائد ہیں، الخ۔ بہرحال اس گروہ نے سورہ فاتحہ کی بے قدری کی ہے کہ جو سورت نماز کی ماہیت میں داخل تھی اس سے اعراض کر کے کسی غیر معین آیت قصیرہ سے نماز جائز کر دی۔ یہ شریعت کوئی ہے لیکن

شریعت محمد یہ وہ ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے۔ تفسیر روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۲۱۰ میں ہے "لان الفاتحة اذا كانت جزاء من ماهية الصلوٰة تنتفي الماهية عند عدم قرائتها" یعنی سورہ فاتحہ نماز کی ماہیت میں داخل ہے ماہیت کے انتفاء سے نماز کا انتفاء لازم آتا ہے۔

اور تلخیص ابن حجر کے صفحہ ۸۷ میں ہے رواہ الدارقطنی بلفظ "لا تجزیء صلوٰة لا يقراء فيها بام القرآن" کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی گئی وہ نماز کفائت نہ کرے گی یعنی فرض ادا نہ ہوگا (وصححہ ابن القطان)۔ اور بندہ نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ نماز مردہ ہے۔ علامہ زمخشری نے اساس البلاغۃ میں لکھا ہے کہ "اخدج صلوٰة نقص بعض ارکانها" کہ نماز خداج وہ ہوتی ہے کہ جس کا بعض رکن کم ہو جائے۔ اور امام الدنیا فی الحدیث نے اپنے رسالہ جزاء القرائۃ میں ابو عبید سے خداج کا یہ معنی نقل کیا ہے کہ اونٹنی کچا بچہ ڈال دے والسقط میت "لا ینفع به" کہ وہ کچا بچہ مردہ ہوتا ہے جس سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا جاتا ہے۔

(2) ہدایہ فصل فی القرائۃ صفحہ ۱۴۸ میں ہے "وهو مخير في الاخريين معناه ان شاء سكت وان شاء قراء وان شاء سبح وكذا روى عن ابي حنيفه" یعنی چار رکعت فرض نماز پڑھنے والا دو آخری رکعتوں میں مختار ہے خواہ خاموش رہے کچھ نہ پڑھے اور خواہ کوئی آیت پڑھ لے اور خواہ تسبیح سبحان اللہ وغیرہ پڑھ لے نماز ہو جائے گی۔ یہ فاتحہ کی دوسری بے قدری ہے جو خلاف حدیث نبوی ہے۔

چنانچہ فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۳۱۰ میں ہے "دليل الجمهور قوله صلعم وافعل ذالك في صلوٰتك كلها بعدان امره بالقراءة" یعنی جمہور علماء جو تمام نماز میں سورہ فاتحہ کو رکن قرار دیتے ہیں ان کی وہ حدیث جو آنجناب نے مسیی ءصلوٰۃ کو جس نے خراب نماز پڑھی تھی یہ حکم فرمایا تھا کہ تمام نماز میں اسی طرح عمل کیا کر اور اس میں آنحضرت ﷺ نے قرأت کا حکم دیا تھا تو اس سے ہر رکعت نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا متعین ہوا۔ پھر فتح الباری میں آگے یہ لکھا ہے "وفي رواية لاحمد وابن حبان ثم افعل ذالك في كل ركعة" یعنی مسیی صلوٰۃ کو آنحضرت ﷺ نے یہ حکم فرمایا کہ اسی طرح نماز کی ہر رکعت میں عمل کر جس طرح تجھے پہلی رکعت میں طریقہ نماز کا سکھایا ہے۔ یہ حدیث مسند احمد اور ابن

حبان میں ہے اور تلخیص الجیر ابن حجر کے صفحہ ۸۷ میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔ اور پھر یہ لکھا "وعند البخاری من حدیث ابی قتادہ ان النبی ﷺ کان یقراء فی کل رکعة بفاتحه الکتاب" یعنی بخاری میں حدیث ابوقتادہ کی ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ ہر رکعت نماز میں فاتحہ پڑھا کرتے تھے' اس حدیث میں لفظ کان وارد ہے کہ جب وہ صیغہ مضارع پر آئے تو دوام کو مفید ہوتا ہے جبکہ اس کے خلاف دلیل نہ ہو۔ پھر آگے تلخیص میں امام حافظ ابن حجر یہ فرماتے ہیں "وھذا مع قولہ ﷺ "صلوا کما رأیتونی اصلی" دلیل علی وجوب التکریر" یعنی اس حدیث ابوقتادہ کے ساتھ یہ حدیث ملا لو کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو نماز پڑھائی اور پھر ان کو یہ ارشاد فرمایا کہ تم نے جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھا کرو۔ پس حدیث سے ثابت ہوا کہ ہر رکعت نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا فرض ہے۔ ان دلائل سے امام ابوحنیفہ اہل الرائے اور ان کے مقلدین کا مذہب کہ فرض کی نماز کی آخری دو رکعتوں میں خاموش رہو یا تسبیح پڑھ لو تو یہ جائز ہے سراسر باطل اور خلاف شریعت محمدی ہے۔ اور یہ شریعت کوفیہ ہے' جو کوفہ میں ایجاد ہو کر دنیا میں پھیل گئی ہے اس میں سورہ فاتحہ ذی شان عالیہ کی بے قدری پائی جاتی ہے۔ اس لئے کتب حدیث پر اعتماد رکھو اور کتب فقہ چھوڑ دو کہ ان میں شریعت کوفیہ ہوتی ہے۔

(3) تیسری سورہ فاتحہ کی بے قدری اس مذہب کوفیہ میں یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جو شخص سورہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھے گا اس کے منہ میں آگ کے انگارے یا پتھر پڑیں گے۔ نعوذ باللہ من ھذا القول۔

مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی حنفی نے امام الکلام کے صفحہ ۱۸۱ میں ایسی ہر ایک روایت کو باطل کیا ہے۔ پس ایسی روایت سے اھل باطل ہی دلیل لے کر سورہ فاتحہ کی توہین اور بے قدری کرتے ہیں' اور صفحہ ۱۸۳ میں ایسی ہی باطل روایت ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے "لا اثر له فی کتب المحدثین الثقاق" یعنی معتبر ائمہ محدثین کی کتابوں میں ایسی باطل روایتوں کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا اور جو علماء حنفیہ ایسی لچر اور بیہودہ روایتوں کو ذکر کر کے عوام کالانعام کو خوف دلاتے ہیں' ان کا علماء حدیث میں کوئی شمار نہیں ہے۔ بہر حال ایسی باتوں کو بیان کرنے والے سورہ فاتحہ اور سلف صالحین اور محدثین عظام کی توہین اور بے قدری کرتے ہیں جو فاتحہ خلف الامام کے قائلین سے تھے۔

☆ رکن دو قسم کا ہوتا ہے ایک رکن معینہ جو کبھی ساقط نہیں ہوتا۔ دوسرا رکن غیر جو کبھی ساقط ہو جاتا ہے سورہ فاتحہ نماز رکن معینہ ہے جو حدیث قدسی سے ثابت ہے۔ منہ۔

قاضی ابو یوسف کے سامنے کدو کے بارہ میں حدیث نبوی سن کر یہ کہا تھا کہ میں کدو کو پسند نہیں کرتا' تو قاضی ابو یوسف نے اس کو مرتد قرار دے کر اس کے قتل کا حکم صادر کیا تھا کہ اس نے حدیث نبوی کی اس طرح توہین کی تھی۔ (شرح فقہ اکبر ملا علی قاری) ایسے بے دین اور بے ہودہ لوگ اپنے مشائخ اور صوفیہ کرام حنفیہ کے منہ میں انگارے' پتھر' گندگی ڈالنے کا مستحق قرار دیتے ہیں چنانچہ امام الکلام اور غیث الغمام اور عمدۃ الرعایہ میں ان مشائخ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور امام الکلام صفحہ ۳۰ میں مولانا عبدالحئی صاحب نے اپنے ایک شیخ الاسلام عبدالرحیم صاحب کا ذکر کیا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ "لو کان فی فمی یوم القیامۃ جمرۃ احب الی من ان یقال لاصلوٰۃ لك" یعنی اگر قیامت کے دن میرے منہ میں آگ کا انگارہ ہو تو یہ مجھے اس حساب کتاب سے زیادہ محبوب ہے جو مجھے کہا جائے کہ تو نے جو نمازیں امام کے پیچھے بغیر فاتحہ کے پڑھی ہیں وہ صحیح اور قبول نہیں ہیں۔ پس ان مقلدین حنفیہ کو قیامت کے دن پتہ لگے گا انشاء اللہ تعالی۔ جب ان کے مونہوں میں جہنم کے اندر آگ کے انگارے' پتھر اور گندگی بھرے گی کہ تم نے اتنی درجوں اور فضائل والی کلام الٰہی فاتحہ امام کی تقلید کا طوق پہن کر نہ پڑھی تھی اب اس کی سزا کا مزہ پالو کہ نمازیں نہ ہوئیں۔

(4) چوتھی سورہ فاتحہ کی بے قدری ان مقلدین نے یہ کی ہے کہ اس کو نماز جنازہ سے نکال دیا ہے اور وہ نہیں پڑھتے کیونکہ شرح وقایہ میں فتاوی عالمگیری' قاضی خان وغیرہ کتب حنفیہ میں ہے کہ نماز جنازہ میں قرآۃ قرآن نہیں ہے بلکہ فتاوی قاضی خان جلد ۱ صفحہ ۹۳ میں ہے "یدعو الی صلوٰۃ الجنازۃ بالادعیۃ المعروفۃ و لا یقراء بفاتحہ الکتاب" سورۃ فاتحہ نماز جنازہ میں میت کے حق میں ادعیہ معروفہ پڑھے اور سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ سورہ فاتحہ نماز جنازہ میں پڑھنا احادیث نبویہ اور آثار صحابہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی حنفی نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ امام الکلام صفحہ ۳۱۴ میں لکھتے ہیں "اعلم انه قد وردت احادیث مرفوعة و آثار موقوفة دالة علیٰ شرعیة قرائة الفاتحه بعد التکبیرۃ الاولی" یعنی یہ بات جان لو کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کی شرعیت احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ سے ثابت ہے۔ پھر صفحہ ۳۱۸ میں لکھا ہے "وقال ایضاً ھی من ارکانها العموم حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرآ بفاتحه الکتاب" یعنی علامہ

قسطانی نے اپنی کتاب ارشاد الساری شرح صحیح بخاری میں یہ کہا ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھنا نماز کے ارکان میں سے ایک رکن ہے کیونکہ حدیث نبوی میں یہ حکم عام آیا ہے کہ جو شخص فاتحہ نہ پڑھے اس کی کوئی نماز نہیں ہے یعنی یہ حکم عام ہے جو نماز کو شامل ہے' پھر لکھتے ہیں "وبه قال الشافعي واحمد وقال مالك و الكوفيون ليس فيها قراءة "یعنی امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہی مذہب ہے اور امام مالک اور کوفیوں کا یہ مذہب ہے کہ نماز جنازہ میں کوئی قراءۃ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اماموں میں سے کسی کا قول خلاف حدیث ہو تو امکان ہوتا ہے کہ ان کو حدیث شخین کی بابت فاتحہ نہ ملی ہو لیکن حنفیوں کا یہ کوئی عذر نہیں ہے۔ وہ اگر نہ پڑھیں تو یہ احادیث کی خلاف ورزی بوجہ تقلید کے ہے جو شرک ہے۔ اب کتب حدیث میں یہ مسئلہ صاف موجود ہے پھر اس کے خلاف کوئی عمل کرے یا فتویٰ دے تو یہ روش یہود کی ہے جو سراسر گمراہی ہے۔ بہشتی زیور حصہ گیارہ صفحہ ۹۲ نماز جنازہ کے بارہ میں طریقہ بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے "اس نماز میں التحیات اور قرآن مجید کی قراءۃ وغیرہ نہیں ہے ☆۔" یہ مسئلہ خلاف حدیث ہے "عن طلحة بن عبدالله بن عوف قال صليت خلف ابن عباس علىٰ جنازة فقراء بفاتحة الكتاب و سورة وجهر حتى اسمعنا فلما فرغ اخذت بيده فساء لته فقال سنة وحق اخرجه النسائي وابن الجارود في المنتقىٰ صفحه ٢٢٤ واسناد هما صحيح" یعنی طلحہ بن عبداللہ نے بیان کیا کہ میں نے ابن عباس کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی انہوں نے سورہ فاتحہ اور ایک سورت زور سے پڑھی۔ سلام کے بعد میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور دریافت کیا تو مجھے یہ جواب دیا کہ یہ طریق سنت نبوی اور واجب ہے۔ اور محلی جلد ۵ صفحہ ۱۳۹ میں ہے "ان المسور بن مخرمةؓ صلىٰ على جنازة فقراء فى التكبيرة الاولىٰ فاتحة الكتاب و سورة قصيرة ورفع بهما صوته" یعنی مسور بن مخرمہ صحابی نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی تو انہوں نے پہلی تکبیر کے بعد فاتحہ اور ایک چھوٹی سی سورت پڑھی اور پڑھتے ہوئے آواز بلند کیا۔ اور غنیۃ الطالبین جلد ۲ صفحہ ۱۳۴ میں ہے کہ مجاہد تابعی نے بیان کیا کہ میں نے اٹھارہ صحابہ سے ملاقات کی تو ان سے دریافت کیا کہ نماز جنازہ کا طریقہ کیا ہے۔ ان سب نے بتایا کہ پہلے تکبیر کہہ پھر سورہ فاتحہ پڑھ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پڑھ (پھر یہ دعا پڑھ لے) خلاصہ کلام یہ ہے کہ تقلید شخصی کے بھنور میں پڑ کر مقلدین نے سورہ فاتحہ بے مثل کے فضائل اور

احکام کونظر انداز کر دیا ہے اور تقلید کی وجہ سے اس کی نہایت بے قدری کی ہے۔

(5) پانچویں بے قدری مقلدین نے سورہ فاتحہ کی یہ کی ہے کہ جس شخص کو نکسیر چلنے کی بیماری ہو اس کے لیئے سورہ فاتحہ عظیم المرتبت کو مریض کی پیشانی پر خون نجس اور پیشاب سے لکھنے کا فتویٰ جاری کیا ہے جس میں ایسی توہین ہے جو مفضی الی الکفر ہے چنانچہ یہ فتویٰ کتب فقہ میں درج ہے''فتاویٰ قاضی خان صفحہ ۳۶۴۔ فتاویٰ سراجیہ۔ فتاویٰ عالمگیری جلد ۵ صفحہ ۸۳۴ جس کو پانچ سو علماء حنفیہ نے بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ان کے حکم سے مرتب کیا تھا' اس لیئے ان کے نام سے مشہور ہے۔

ردالمختار شامی جلد ا صفحہ ۲۴ عربی عبارت ہے''وکذا اختارہ صاحب الهدایہ فی التجنیس فقال لو رعف فکتب الفاتحة بالدم علی جبهته وانفه جاز للاستشفاء وبالبول ایضاً ان علم فیه شفاء لاباس به''یعنی اگر کسی کو نکسیر چلے اور وہ بند نہ ہو تو اس مریض کی پیشانی اور ناک پر خون یا پیشاب سے سورہ فاتحہ لکھ دے تو جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے' میں کہتا ہوں کہ حدیث میں یہ ہے''استنزهوا من البول'' کہ تم پیشاب سے بچو کہ قبر میں زیادہ عذاب بول کی بد پرہیزی سے ہوگا۔ آنحضور ﷺ نے ایک شخص کو قبر کے عذاب میں دیکھا تو اس کی یہ وجہ بیان فرمائی''کان لا یستنزه من بوله'' کہ وہ معذب فی القبر شخص اپنے بول سے نہ بچتا تھا۔ یہ اہل قیاس کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بعض مریضوں کو جو جنگل میں رہتے تھے اور آب و ہوا مخالف پڑنے کی وجہ سے بیمار ہو گئے تھے تو ان کو انٹوں کا پیشاب اور اونٹنیوں کا دودھ ملا کر پلایا تھا۔ اس سے پیشاب سے علاج کرنا درست ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ ان کو فقاہت فی الحدیث نصیب نہیں ہے۔ یہ محدثین کرام کے دشمن اور اہل قیاس کے شدائی ہیں۔ علم حدیث میں یتیم اور مسکین ہیں اور ان کی کتابیں فقہ کی قیاسوں اور لغو مسائل سے بھرپور ہیں۔ چنانچہ ان کی نادانی اس مسئلہ میں ملاحظہ کرلو کہ جس حدیث میں پیشاب سے بچنے کا حکم ہے اور اس سے عذاب قبر ہوتا ہے اس سے انسان کا پیشاب مراد ہے جو نجس العین ہے جس کی وجہ سے صاحب قبر کو عذاب ہوا۔ صحیح بخاری میں یہ جملہ قابل غور ہے''کان لا یستنزه من بوله''بولہ کے لفظ میں جو ضمیر ہے وہ قبر والے کی طرف راجع ہے کہ وہ اپنے بول سے نہ بچتا تھا۔ اسی طرح ''استنزهوا من البول'' سے انسان کا بول مراد ہے۔ اس میں لفظ بول پر جو الف لام ہے یا

تو عہد خارجی ہے کہ اس میں خاص انسان کا بول مراد ہے جیسا کہ الف لام عہد خارجی کی تعریف میں علماء نحو بتاتے ہیں (کما ھو مسلم) یا پھر لفظ البول میں الف لام عوض ضمیر کا ہے کہ اصل میں یہ بولہ ہے کہ ہر انسان اپنے بول سے بچے۔

الف لام کا عوض ضمیر کے آنا بعض کتب نحو میں مذکور ہے۔ مغنی اللبیب بحث ال میں یہ لکھا "اجاز الکوفیون و بعضالبصریین و کثیر من المتاخرین نیابةال عن الضمیر اعضاف الیه" یعنی علماء نحو کوفیوں اور بعض بصریوں نے اور بہت سے علماء نحو متاخرین نے مضاف الیہ کی ضمیر کے عوض اور نیابت میں لانا جائز رکھا ہے۔ اسی بناء پر اس حدیث کی تشریح میں جناب مجتہد العصر امیر یمنی اپنی کتاب سبل السلام شرح بلوغ المرام جلد ا صفحہ ۴۹ میں یہ فرماتے ہیں' والحدیث نص فی بول الانسان لان الالف واللام فی البول فی حدیث الباب عوض عن المضاف الی من بوله" یعنی اس حدیث میں تصریح ہے کہ انسان کا بول ناپاک ہے کیونکہ اس حدیث میں لفظ البول پر جو الف لام ہے وہ مضاف الیہ کی ضمیر کے عوض میں ہے اصل میں یہ لفظ بولہ ہے پھر اس توجیہ کا ثبوت یہ دیا ہے کہ بخاری شریف میں معذب فی القبر کے بارے میں لفظ بولہ موجود ہے اس کی تائید علامہ سندی حنفی محشی صحیح بخاری کی تقریر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے زیر باب صحیح بخاری باب ماجاء فی غسل البول کی حدیث پر لکھی ہے امام بخاری نے باب میں لکھا ہے "قال النبی ﷺ لصاحب القبر لا یستتزہ من بوله ولم یذکر سوی بول الناس "یعنی نبی کریم ﷺ نے قبر والے کی بابت یہ فرمایا کہ وہ اپنے بول سے نہ بچتا تھا۔ سو بول انسان کے کسی اور چیز کے بول کا ذکر نہ کیا۔

علامہ سندی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ان بولوں پر استدلال کرنا صحیح نہیں جو ماکول اللحم حیوانوں کے ہیں۔ کیونکہ اس کا اس حدیث میں ذکر نہیں ہے کہ وہ نجس ہیں۔ " لوجوب حمله علٰی معنی بوله توفیق بین الروایات اما بحمل اللام علی العهد او علی انه بدل من المضاف الیه الخ" یعنی اس حدیث میں لفظ بولہ کو انسان کے بول پر محمول کرنا واجب ہے تا کہ جن حدیثوں میں بول حیوانات ماکول اللحم کے پاک ہونے کا ذکر ہے۔ تا کہ ان کے ساتھ یہ حدیث موافق ہو جائے اور جس حدیث میں لفظ البول ہے اس میں یا تو الف لام عہد کا ہے کہ خاص وہ بول مراد ہے جو انسان کا ہے یا اس

میں لام مضاف الیہ کے بدلہ میں ہے یعنی اصل میں من بولہ ہے۔ پس اس حدیث سے ماکول اللحم حیوان کے پیشاب کے پلید ہونے پر دلیل لینا باطل ہے۔ محدثین نے حدیث عرینہ سے حیوانات ماکول اللحم کے پیشابوں کے پاک ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اور اس حدیث کے باب باندھے ہیں۔ امام شوکانیؒ نے بھی نیل الاوطار جلد اصفحہ ۴۹ پر بحث کی ہے اور حدیث البول میں الف لام کو عہد اور ضمیر کے عوض لکھا ہے اور آخر بحث کے یہ کہا ہے "لم نجد القائلین بالنجاسة دلیلا" کہ حیوان کے پیشاب کے پلید ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ مسلم میں حدیث ہے" ان الله لم یجعل شفاء کم فیما حرم علیکم "یعنی اللہ تعالی نے تمہارے لیئے حرام میں شفاء نہیں رکھی تو پیشاب اور خون سے علاج کرنا حرام ہوا۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے "نهی رسول اللهﷺ عن کل دواء خبیث "یعنی جناب رسول اللہﷺ نے حرام اور پلید دوا کے استعمال سے منع فرمایا۔ اس لیئے شراب سے دوا کرنے سے منع کیا گیا۔ پھر علی سبیل التسلیم کہ نجس اور حرام سے دوا جائز ہو۔ تو یہ صرف کھانے پینے لگانے کے بارے میں ہوسکتا ہے لیکن قرآن پلید چیز سے لکھنے کو اس پر قیاس کرنا باطل ہے کیونکہ قرآن کے سراسر منافی ہے اس پر کوئی شرعی دلیل نہیں ہے تو اس توہین قرآن سے کفر لازم ہے اور اونٹوں کے پیشاب پر انسان کے خون اور پیشاب پر قیاس کرنا اور کھانے پینے پر قرآن کریم کی سورہ فاتحہ ذی شان کو پیشاب خون سے لکھنے کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک میزان شعرانی جلد اصفحہ ۱۲۷ میں امام ابوحنیفہؒ کے دادا استاد امام نخعیؒ کا یہ فتویٰ ہے "جمیع ابوال الحیوانات الطاهرة طاهر "یعنی تمام پاک جانوروں کے پیشاب پاک ہیں' ترمذی میں ہے "هو قول اکثر اهل العلم قالوا لا باس ببول مایو کل لحمه "یعنی اکثر علماء دین کا یہی مذہب ہے کہ جن حیوانوں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کے پیشاب کا کوئی حرج نہیں ہے۔ اس قیاسی فرقہ کے قیاس اور استدلال ایسے ہی ہیں۔ ان کی بعض کتب فقہ میں یہ لکھا ہے کہ کتے کے بچہ کو اٹھا کر نماز پڑھنا جائز ہے کیونکہ آنحضرتﷺ نے اپنی نواسی امامہ کو اٹھا کر نماز پڑھی تھی۔ ان قیاسیوں نے کتے نجس العین کو آنحضرتﷺ کی پاک نواسی پر قیاس کرلیا۔ یہی بول کا مسئلہ ہے کہ انسان کے بول کو اونٹ کے بول پر قیاس کرلیا حالانکہ اونٹ کا پیشاب پاک ہے۔ طحاوی معانی الاثار جلد اصفحہ ۱۶۴ میں ہے کہ ایک قوم اہل علم کا یہ مذہب

☆۔ دیوبندی درسگاہ میں یہ حدیثیں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں پھر اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں یہ مرض تقلید کا اثر ہے۔

ہے کہ ماکول اللحم حیوان کا پیشاب طاہر ہے جیسا کہ اس کا گوشت طاہر ہے امام محمد بن حسن کا یہی مذہب تھا۔

(6) چھٹی بے قدری فاتحہ کی یہ کرتے ہیں کہ اس کو رسومات بدعیہ میں استعمال کرتے ہیں جو مقام گناہ ہے اور گناہ نجاست ہے۔ مثلاً طعام پر فاتحہ جس کو ختم مروجہ کہتے ہیں۔ میت کے گھر پر فرش بچھا کر مسلسل کئی روز ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور عوام اہل میت کے گھر جاتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم فاتحہ خوانی کے لیئے جا رہے ہیں۔ میت کو دفن کر کے چالیس قدم پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ الغرض بدعات مروجہ تیجا' ساتواں' چالیسواں' شبرات' یوم عاشورہ' میلاد اور عرس وغیرہ رسومات میں فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور ایسے موقعوں پر فاتحہ کی فضیلت بیان کر کے شکم پروری کا اکل بالباطل سے نفع حاصل کرتے ہیں لیکن جن مواقع پر سورہ فاتحہ پڑھنا مشروع اور مامور بہ ہے وہاں پڑھنے اور بتانے سے مقلدین اہل بدعت کو قولنج قلبی عارض ہو جاتی ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ مقلدین کے نزدیک فاتحہ کی کوئی قدر نہیں ہے۔ والسلام۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ باری

صحیفہ اہل حدیث جلد ۵ شمارہ ۹' ۱۰' ۱۱' ۱۳' ۱۵

مورخہ یکم وسولہ جمادی الاول یکم جمادی الثانی یکم رجب و یکم شعبان ۱۳۹۴ھ۔

نماز میں ترتیب قرآن

الاستفتاء کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ امام نے نماز کی پہلی رکعت میں قصداً یا سہواً سورہ تکاثر پڑھی اور دوسری رکعت میں سورہ والعادیات پڑھی اور سجدہ سہو بھی نہیں کیا' کیا یہ نماز ہوگئی یا دوبارہ لوٹائی جو یا سجدہ سہو کیا جائے مطلع فرمائیں؟۔

(سائل کمال الدین ہابڑی والا ڈیرہ غازیخان)۔

الجواب بعون الوهاب وهوالموفق للصواب الحمد لله رب العالمین اما بعد فاقول وبالله التوفیق۔ واضح ہو کہ اگر سہواً سورتوں کو خلاف ترتیب پڑھا جائے تو کسی کے نزدیک بھی کوئی خطا نہیں ہے۔ چنانچہ فقہ کی کتاب خلاصہ میں ہے "فهو مکروه الاذاوقع من غیر قصدٍ" یعنی عمداً مکروہ ہے سہواً مکروہ نہیں ہے۔ البتہ اگر قصداً خلاف سورتوں کی موجودہ ترتیب کے پڑھے گا تو اس میں مذاہب کا اختلاف ہے۔ اہلحدیث جواز کے قائل ہیں اور حنفیہ مالکیہ کراہت کے قائل ہیں۔ بخاری کے حاشیہ صفحہ ۱۰۷ جلد ۱ میں مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری فرماتے ہیں۔ "وهذا مکروه عند الحنفیه لان رعایة ترتیب المصحف العثمانی مستحبة" لیکن اس کراہت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے مذہب اہلحدیث راجح اور صواب ہے۔ اول یہ جاننا چاہیئے کہ قرآن میں سورتوں کی موجودہ ترتیب عثمانی نہیں بلکہ نبوی ہے۔ مسند ابوداؤد طیالسی صفحہ ۱۵۱' سنن ابی داؤد جلد ۱ صفحہ ۱۹۸' ابن ماجہ صفحہ ۹۶' فتح الباری پارہ ۲ صفحہ ۲۴۳ میں بحوالہ مسند احمد اور کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۲۳۲ میں بحوالہ ابن جریر' طبرانی' ابونعیم' اوس بن حذیفہ سے مروی ہے کہ "فسألنا اصحاب رسول الله ﷺ قلنا کیف تحزبون القرآن قالوا نحزبه ثلاث سور وخمس سور وسبع سور وتسع سور واحدی عشره وثلاث وحزب المفصل من ق حتے نختم ـ الحدیث بطوله واللفظ لاحمد" "ہم نے اصحاب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ قرآن مجید کی منزلوں کی تقسیم آپ لوگوں نے کیسے کی ہوئی ہے۔ صحابہؓ نے جواباً فرمایا کہ اس کی پہلی منزل میں بقرہ' ال عمران' نساء تین سورتیں ہیں۔ دوسری منزل میں مائدہ' انعام' اعراف' انفال' توبہ پانچ سورتیں ہیں۔ تیسری منزل میں یونس' ہود' یوسف' رعد' ابراہیم' حجر' نحل' سات سورتیں ہیں۔ چوتھی منزل میں بنی اسرائیل' کہف' مریم' طہٰ' انبیاء' مومنون' نور فرقان ۹ سورتیں ہیں۔ پانچویں

منزل میں شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، سجدہ، احزاب، سباء، فاطر، یٰس گیارہ سورتیں ہیں۔ چھٹی منزل میں صافات، ص، زمر، مومن، حم سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمد، فتح، حجرات تیرہ ہیں۔ اور ساتویں منزل میں ۶۵ سورتیں ہیں۔ جو ق سے آخر قرآن تک سورہ والناس پر ختم ہے۔ ان سات منزلوں کو حفاظ و قرأ اپنی اصطلاح میں فمی بشوق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس حدیث کے راوی اوس بن حذیفہ وفد ثقیف میں شامل ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ حضور ﷺ نے اس وفد کو مناسب جگہ پر ٹھہرایا۔ جب تک یہ ٹھہرا رہا رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز کے بعد ان کے پاس روزانہ تشریف لے جایا کرتے تھے، جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ میں اس کی تصریح ہے اور مسند طیالسی میں ابتدائی الفاظ یہ ہیں "فلما اصبحنا سألنا اصحاب رسول الله ﷺ الحدیث" اس سے ظاہر ہوا ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی موجودہ ترتیب عہد نبوی میں ہو چکی تھی۔ اب اسی ترتیب سے ہمارا یہ قرآن موجود ہے۔ فللہ الحمد، پس یہ کہنا کہ یہ ترتیب عثمانی ہے خطا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے صرف ایک قرأۃ پر قرآن جمع کیا ہے کہ پہلے سات قرأتوں پر پڑھا جاتا تھا۔ اس سے اختلاف ہونے لگا تو ایک قرأۃ پر جمع کر دیا۔ ورنہ قرآن کی آیات اور سورتوں کی ترتیب نبوی ہے۔ آپؐ نے قرآن مجید کا آخری سال میں جبرائیل سے دوبار دور کیا تھا۔ اب یہ جاننا چاہیئے کہ قرآنی سورتوں کی ابتدائی سورت فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ بالاتفاق معمول بہا جو ترتیب کے بالکل خلاف ہے کیونکہ سورت فاتحہ سب سورتوں سے مقدم ہے۔ تو اب آگے جو سورت نمازی چاہے پڑھ لے کیونکہ دوسری رکعت میں فاتحہ سے دوبارہ ابتداء ہوئی ہے۔ علاوہ اس کے خلاف ترتیب پڑھنا صحابہؓ کا معمول بہا ہے۔ اگر مکروہ ہوتا تو وہ ہرگز نہ پڑھتے۔ چنانچہ امام بخاریؒ جو امام الدنیا فی الحدیث ہیں۔ اپنی جامع صحیح بخاری میں یہ باب منعقد فرماتے ہیں "باب الجمع بین السورتین فی رکعة والقرآءه بالخواتیم وبسورة قبل سورة " یعنی یہ باب سورہ مقدمہ فی ترتیب المصحف کو قرأۃ میں متاخرہ کرنے کے جواز میں ہے۔ پھر اس کو اس طرح ثابت کیا ہے "قرء الاحنف بالکهف فی الاولی وفی الثانیة بیوسف اویونس " یعنی احنف بن قیس نے صبح کی پہلی رکعت میں سورہ کہف پڑھی اور دوسری میں سورہ یوسف یا یونس پڑھی۔ یہ ترتیب مصحف عثمانی کے خلاف ہے۔ حضرت احنف بن قیس

مخضرمین میں سے ہیں جن کا درجہ صحابہ اور اکابر تابعین کے مابین ہے۔ پھر آگے صحیح بخاری میں یوں ہے" و ذکر انه صلے مع عمر الصبح بھما" یعنی احنف نے ذکر کیا کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے ہمراہ صبح کی نماز پڑھی تو انہوں نے بھی اسی طرح پڑھا تھا۔ اب یہ سنت خلیفہ راشد ہوگئی۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کی اقتداء کرنا ہوگا۔ نیز حضور ﷺ کا ارشاد عالی ہے" فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین الخ" پس اس مسئلہ میں حضرت عمرؓ کی اقتدا کریں۔ امام صاحبؒ کی تقلید کوئی منصوص چیز نہیں ہے وہ محض حسن عقیدت پر مبنی ہے۔ پھر امام بخاریؒ نے ایک صحابی کلثوم بن مہرم کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ سورہ فاتحہ پڑھ کر سورہ اخلاص پڑھا کرتے تھے۔ بعدہ کوئی سورت پڑھتے تھے۔ الفاظ یہ ہیں" کان کلما افتتح سورة یقرأ بھالھم فی الصلوٰة مما یقرأ به افتتح بقل ھو اللہ احد حتے یفرغ منھا ثم یقرأ بسورة اخری معھا و کان یصنع ذالك فی کل رکعة" الحدیث۔ یہ صاف ترتیب قرآنی کے خلاف ہے اس کو حضور ﷺ نے جائز رکھا تو اس سے ثابت ہوا نماز میں خلاف ترتیب پڑھا جانے سے نماز یں باعث نقص نہیں ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف الحصاری

صحیفہ اہلحدیث کراچی جلد ۴۱ شمارہ ۱۳ مورخہ یکم و ۱۶ ارجب ۱۳۹۰ھ۔

نماز میں سورتوں کے تعین کا مسئلہ

طبرانی صغیر جلد ۲ صفحہ ۴۴ میں یہ حدیث ہے "عن عبداللہ بن مسعودؓ قال کان رسول اللہ ﷺ یقرأ فی صلوٰۃ الفجر یوم الجمعۃ الم تنزیل السجدہ وھل اتی علی الانسان" یعنی عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان کیا کہ جناب رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن نماز فجر کی دو رکعتوں میں سورہ سجدہ اور سورہ دھر پڑھا کرتے تھے۔ اس حدیث شریف سے جمعہ کے دن صبح کی نماز میں ان دو سورتوں کی تقرری و تعین عمل نبویؐ سے ثابت ہوگئی ہے۔ اگر کوئی مقلد حنفی یہ کہے کہ اس حدیث سے دوام ثابت نہیں ہوتا۔ کسی دن رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن صبح کی نماز میں یہ دو سورتیں پڑھیں تو صحابی نے اس فعل کی حکایت کردی۔ یہ بات اتفاقیہ ہے۔ دوام نہیں تو اس کا جواب دو طرح سے ہے ایک یہ کہ عربی قاعدہ کی رو سے لفظ کان صیغہ مضارع پر وارد ہے تو یہ ماضی استمراری ہے۔ جمعہ کی نماز ہمیشہ سورج ڈھلنے پر پڑھنے کا ثبوت علامہ سندھی حاشیہ بخاری میں یوں پیش کرتے ہیں۔ "وصیغۃ المضارع تزل علی الاعتیاد والاستمرار بعد کان" یعنی لفظ کان کے بعد صیغہ مضارع کا آجائے تو ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے اور مرقاۃ صفحہ ۴۲۹ میں حدیث ینادی بالصلوات پر علامہ ملا علی قاری یہ لکھتے ہیں "والاظھر ان ایراد المضارع لیفید الاستمرار" یعنی یہ بات بہت ظاہر ہے کہ مضارعہ کا صیغہ استمرار کو مفید ہے یہ دو گواہ حنفی عالم مسلمہ ہیں تو ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ جمعہ کے دن صبح کی نماز میں ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بلوغ المرام صفحہ ۴۹ میں یہ حدیث مذکور ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے بیان کیا "کان رسول اللہ ﷺ یقراء فی صلوٰۃ الفجر یوم الجمعۃ الم تنزیل السجدۃ وھل اتی علی الانسان" (متفق علیہ) یعنی رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن نماز فجر میں سورہ سجدہ اور سورہ دھر پڑھا کرتے تھے وللطبرانی صفحہ ۸۱ جلد ۲ میں یہ حدیث ابن مسعود یدیم ذالک یعنی رسول اللہ ﷺ ہمیشہ جمعہ کے دن یہ سورتیں پڑھا کرتے تھے لیکن حنفی مسلک کے مطابق ہدایہ جلد ۱ صفحہ ۱۰۰ باب القرأۃ میں ہے "ویکرہ ان یوقت بشئی من القرآن فی الشئی من الصلوات" یعنی پانچ نمازوں میں سے کسی نماز میں سورہ قرآن کی مقرر کرکے پڑھنا مکروہ و ناجائز ہے۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں اس عبارت کے نیچے

یہ لکھا ہے "کالسجدة والانسان بفجر الجمعة" یعنی جیسے سورہ سجدہ اور سورہ انسان (دھر) جمعہ کے دن فجر کی نماز میں پڑھتے ہیں۔ بروئے حدیث جو چیز سنت تھی اس کو مکروہ ورنا جائز قرار دے دیا۔ یہ مسلک ابن مسعودؓ کے خلاف ہے اور حدیث کے بھی خلاف ہوا۔

عبدالقادر عارف الحصاری

الاسلام لاہور جلد ۳ شمارہ ۲'۳' مورخہ ۷ اربیع الاول ۱۳۹۷ھ۔

مقتدی کو سمع اللہ کہنے کا حکم

واضح ہو کہ جس طرح دیگر فروعی مسائل میں ائمہ دین کا اختلاف ہے' اسی طرح اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ مقتدی رکوع کے بعد تسمیع پڑھے یا نہ؟

امام شافعی' حضرت عطاء' امام ابن سیرین اور امام اسحاق وغیرہ تسمیع و تحمید دونوں کو جمع کرنے کے قائل ہیں۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ تسمیع کے قائل نہیں' وہ صرف تحمید کے قائل یعنی ربنا لک الحمد کے قائل ہیں' کیونکہ دلائل کی رُو سے یہی راجح اور صحیح ہے' اختلافی مسائل میں راجح چیز کو قبول کرنا قرین تقویٰ ہے' مقلدین کی طرح محض حسن عقیدت کی بنا پر تقلید نہیں کرنی چاہیے ھل یقلد الا عصبی او غبی۔

مقتدی کو تسمیع پڑھنے کی دلیل: منتقی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مرفوع متفق علیہ درج ہے' جس میں یہ وارد ہے کہ ثم یکبر حین یرکع ثم یقول سمع اللہ لمن حمدہ حین یرفع صلبہ من الرکعۃ ثم یقول وھو قائم ربنا لک الحمد۔ یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کو جاتے وقت تکبیر کہتے اور رکوع سے پیٹھ سیدھی کرتے وقت سمع اللہ پڑھتے اور سیدھے کھڑے ہو کر ربنا لک الحمد پڑھتے تھے۔" یہ حدیث مرفوع ہے اور فعلی ہے۔ اس کے مطابق ہر نمازی کو نماز میں پڑھنے کا حکم ہے' کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھا کر نمازیوں کو یہ حکم فرمایا ہوا ہے: صلوا کما رایتمونی أصلی "کہ تم اسی طرح نماز ادا کرو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔"

ہاں اگر کسی خاص نمازی مثلاً منفرد' مقتدی' مسافر' بیمار وغیرہ کے لیے کوئی خاص حکم علیحدہ آجائے تو پھر وہ اس کا پابند ہو گا' ورنہ اس حکم کی تعمیل ہر نمازی پر لازم ہے۔ نیل الاوطار جلد-۲' ص-۲۵۰ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر یہ لکھا ہے: فیہ متمسک لمن قال انہ یجمع بین التسمیع والتحمید کل مصل من غیر فرق بین الامام والموتم والمنفرد۔ "یہ حدیث اس شخص کی دلیل ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہر نمازی تسمیع اور تحمید کو جمع کرے' اس میں امام' مقتدی' اکیلے نمازی کا کوئی فرق نہیں ہے' یہ سنت سب کے لیے قابل عمل ہے کہ حالت ارتفاع میں تسمیع اور حالت استواء وقیام میں تحمید کہے۔

نیز نیل کے اسی صفحہ میں ہے : ان قولہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوا کما رایتمونی أصلی یدل علی عدم اختصاص ذلک بالامام۔ یعنی "آنحضرت ﷺ کا فرمان کہ تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے" یہ اس بات پر دال ہے کہ تسمیع امام کے ساتھ خاص نہیں ہے' ہر نمازی کے لیے مسنون ہے۔

مانعین تسمیع کی دلیل پر تبصرہ: جو لوگ مقتدی کو تسمیع پڑھنے سے روکتے ہیں' وہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے مقتدیوں کو یوں خطاب کیا ہے : اذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا ربنا لک الحمد۔ (بخاری و مسلم) "کہ جب امام سمع اللہ کہے تو تم مقتدی لوگ یوں کہو ربنا لک الحمد۔ طرز استدلال یہ ہے کہ اس حکم سے کلمات کی جدا جدا تقسیم ظاہر ہے کہ امام تسمیع کرے اور مقتدی تحمید کہے' پس معلوم ہوا کہ مقتدی سمع اللہ نہ پڑھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حکم میں تقسیم مقصود نہیں ہے' نہ اس میں امام کی تحمید سے نفی مقصود ہے اور نہ مقتدی سے تسمیع کی نفی مفہوم ہے۔ اس میں صرف مقتدی کو تحمید کا وقت بتلایا ہے کہ وہ امام کی تسمیع کے بعد ہو' پہلے نہ ہو' کیونکہ امام کی تحمید تسمیع کے بعد ہو گی اور اس کے ساتھ مقتدی کی تحمید موافق پڑ جائے گی۔ اس کی مثال اور نظیر یہ حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا اذا قال الامام ولا الضالین فقولوا آمین۔ یعنی "جب امام ولا الضالین پڑھ کر آمین کہے گا اور مقتدی یہ کلمہ سن کر آمین کہے گا" جب اس کلمہ کے ختم ہونے پر دونوں آمین کہیں گے تو دونوں کی آمین میں توافق واقع ہو جائے گا" پس یہی مقصود ہے' ورنہ نہ امام سے آمین کی نفی مقصود ہے اور نہ مقتدی سے ولا الضالین کی نفی مقصود ہے کہ حدیث سے امام کو آمین کہنا ثابت ہے اور یہ ارشاد ہے : اذا امن الامام فامنوا کہ جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آمین کہو تاکہ دونوں کی آمین باہم موافق ہو جائے اور مقتدی کے لیے فاتحہ پڑھنے کا ثبوت ہے کہ حدیث میں ہے کہ جب بلند آواز سے قراۃ کروں تو فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھو۔ ٹھیک اسی طرح حدیث اذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا ربنا لک الحمد کا مطلب سمجھ لیں کہ امام کی تسمیع کے بعد مقتدی تحمید کہے کہ امام بھی بعد میں تحمید کرے گا۔

چنانچہ امام طحاوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث لائے ہیں کہ خسفت الشمس

فی حیاۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فصلی بالناس فلما رفع راسہ من الرکوع قال سمع اللّٰہ لمن حمدہ ربنا ولک الحمد۔ (طحاوی جلد۱، ص۱۴۱) یعنی "حضور ﷺ کی زندگی میں سورج کو گرہن ہوا تو آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی تو رکوع سے سر اٹھاتے وقت سمع اللّٰہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد پڑھا۔" اسی طرح امام طحاوی نے اور کئی احادیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ امام تسمیع کے بعد تحمید کرے اور ان احادیث سے امام ابوحنیفہ کا رد کیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ امام ربنا لک الحمد نہ کہے اور وہ اسی حدیث سے دلیل لیتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے: اذا قال الامام سمع اللّٰہ لمن حمدہ فقولوا اللّٰھم ربنا لک الحمد۔ "امام جب سمع اللّٰہ پڑھے تو تم ربنا لک الحمد کہو۔"

امام طحاوی فرماتے ہیں: لیس فی قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا قال الامام سمع اللّٰہ لمن حمدہ فقولوا ربنا لک الحمد دلیل علٰی ان ذلک یقولہ المأموم دون غیرہ ولو کان ذلک کذالک لاستعمال ان یقولھا من لیس بمأموم فقد رایناکم اجمعون ان المصلی وحدہ یقولھا مع قولہ سمع اللّٰہ لمن حمدہ۔ یعنی رسول اللّٰہ ﷺ کے اس فرمان سے یہ دلیل نہیں لی جا سکتی کہ جب امام سمع اللّٰہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو یعنی مقتدی کے سوا دوسرا کوئی نمازی تحمید نہ کرے۔ اگر یہ حکم ہوتا تو پھر اکیلے کو بالاتفاق تحمید کرنا درست جانتے۔ اس دلیل سے اس کو بھی تحمید درست نہ رہے گی۔ پھر فرماتے ہیں، پس جس طرح منفرد نمازی تحمید کہتا ہے، حالانکہ وہ مقتدی نہیں اور حدیث مذکورہ اس کی نفی نہیں کرتی تو اس طرح امام بھی تحمید کرے گا اور حدیث مذکورہ اس سے تحمید کی نفی نہیں کرتی۔

امام طحاوی فرماتے ہیں: بھذا ناخذ کہ ہم اسی مسلک کو اختیار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں اما ابو حنیفۃ فکان یذھب فی ذلک الی القول الاول۔ (طحاوی جلد۱، ص۱۴۲) یعنی "ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب پہلا قول ہے کہ امام ربنا لک الحمد نہ کہے۔" امام طحاوی شافعی ہو کر حنفی بنے تھے مگر جب یہ مذہب احادیث کے خلاف پڑتا ہے تو بیچارے مجبور ہو کر اس وقت غیر مقلد ہو جاتے ہیں۔ اب اسی اصول پر مقتدی کے لیے تسمیع کا مسئلہ سمجھ لیں کہ جیسے امام سے تحمید کی نفی مقصود نہیں، اسی طرح مقتدی سے تسمیع کی نفی مقصود نہیں کہ عدم ذکر سے عدم شئی کا لازم نہیں آتا۔

مثلاً دیکھو نسائی میں حدیث وارد ہے : عن ابی ہریرة قال کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا رفع راسہ من الرکوع قال اللّٰھم ربنا لک الحمد۔ یعنی "ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رکوع سے سر اٹھایا تو اللّٰھم ربنا ولک الحمد پڑھا" اس میں تسمیع کا ذکر نہیں ہے' لیکن اس سے تسمیع کی نفی مقصود نہیں' تحمید کا ثابت کرنا مقصود ہے کہ تسمیع دوسری حدیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح حکم فقولوا ربنا لک الحمد سے تسمیع کی نفی مقصود نہیں ہے۔ اس سے سکوت ہے۔ اگر نفی مقصود ہو تو پھر منفرد کے لیے تحمید ناجائز ہو گی' کیونکہ اکیلا نمازی کے لیے تسمیع اور تحمید کا جمع کرنا ثابت نہیں ہے' صرف نماز نبوی امام' مقتدی' منفرد سب کے لیے نمونہ حسنہ ہے جو اصل ہے سب نمازیوں کے لیے کہ وہ اس کے مطابق نماز ادا کریں۔ اس میں تسمیع و تحمید دونوں ہیں' ان میں سے کسی ایک کی تخصیص کسی ایک ایک نمازی کے لیے کرنا محض اپنی رائے ہے' دلائل کا اقتضاء یہ نہیں ہے۔ امام طحاوی اور امام ابن عبدالبر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ منفرد تسمیع و تحمید دونوں جمع کرے۔

امام شوکانی فرماتے ہیں : فیلحق بھما الموتم لان الاصل استواء الثلاثة فی المشروع فی الصلوٰة الا ما صرح الشرع باستثنائہ۔ یعنی "مقتدی بھی ان دونوں کے ساتھ امور نماز میں لاحق ہے کیونکہ قاعدہ کے لحاظ سے امور نماز میں تینوں برابر کے شریک ہیں مگر شرع کسی کو مستثنیٰ کرے تو علیحدہ بات ہے لیکن استثناء ثابت نہیں۔"

مقتدی کے لیے تسمیع کی دوسری دلیل: نیل الاوطار جلد۔۲' ص۔۲۴۰ میں ہے :

عن ابی ہریرة قال کنا اذا صلینا خلف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال سمع اللّٰہ لمن حمدہ قال من ورائہ سمع اللّٰہ لمن حمدہ۔ یعنی "ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں تو آپ سمع اللّٰہ کہتے ہیں۔" (اخرجہ الدارقطنی)

یہ حدیث صریح دلیل ہے کہ مقتدی بھی سمع اللّٰہ کہے' یہ حدیث ضعیف بتلائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ مسئلہ اپنے اصل اعتبار سے ثابت ہے۔ یہ حدیث موید ہے کہ تائید کا کام دے رہی ہے اور یہ حدیث سابق کا بیان ہے جو فقولوا ربنا لک الحمد کے الفاظ سے گذر چکی ہے' اس کے خلاف عدم تسمیع پر بلفظہ کوئی حدیث وارد نہیں ہے۔

تیسری دلیل: نیل الاوطار کے حوالہ مذکورہ میں بتخریج دار قطنی یہ حدیث وارد ہے:

عن بریدة قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یابریدة اذا رفعت رأسک من الرکوع فقل سمع اللّٰہ لمن حمدہ اللّٰھم ربنا لک الحمد ملأ السموت وملء الارض وملء ما شئت من شیئی بعد۔ یعنی "بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بریدہ! جب تم رکوع سے سر اٹھاؤ تو یہ کہو سمع اللّٰہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد الخ۔"

امام شوکانی عالم ربانی اس پر لکھتے ہیں: وظاھرہ عدم الفرق بین کونہ منفردا او اماما او ماموما۔ یعنی "بظاہر یہ حدیث عام ہے جس میں ہر نمازی' امام' منفرد' مقتدی شامل ہے' کیونکہ ان میں بحیثیت امام ونمازی ہونے کے کوئی فرق نہیں ہے۔

اگر کوئی خاص مقتدی کے لیے تسمیع کا ثبوت مانگے تو پھر کل کو کوئی من چلا عورت' بچے' مسافر' بیمار وغیرہ کے لیے اس کا ثبوت طلب کرے گا' یا کوئی نفلی نماز کے لیے الگ اور فرض کے لیے الگ ثبوت مانگے گا' سو یہ غلط ہے۔ کیونکہ اصل قاعدہ اپنی جگہ قائم ہے کہ نماز میں ہر نمازی کے لیے رکوع کے بعد تسمیع وتحمید کہنا مسنون ہے جس میں مقتدی بھی شامل ہے اور حدیث فقولوا ربنا لک الحمد صرف وقت کا اظہار کرتی ہے تاکہ امام کے ساتھ ربنا لک الحمد کہنے کا توافق پایا جائے اور اس توافق پر ملائکہ کا توافق ہو کہ مغفرت گناہوں کی ہو۔

چنانچہ اس حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں: فقولوا اللّٰھم ربنا لک الحمد فانہ من وافق قولہ قول الملائکة غفرلہ ما تقدم من ذنبہ۔ "امام کی تسمیع کے بعد تم اللّٰھم ربنا لک الحمد کہو کہ جس کا یہ کہنا ملائکہ کے کہنے سے موافق ہوا' اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔" امام کی تسمیع کے ساتھ تسمیع اور تحمید کے ساتھ تحمید ہونے سے یہ ٹھیک موافق ہو جاتی ہے۔ تحمید مقتدی کی امام کی تسمیع کے بعد واقع ہونی ضروری ہے' پہلے نہ ہو' پہلے تسمیع کہہ سکتا ہے کہ وہ تسمیع کے ساتھ موافق رہے۔

عبدالقادر عارف الحصاری

اہلحدیث سوہدرہ' مورخہ ۱۵ مارچ وکیم اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

نماز میں رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا خلاف سنت ہے

سوال : کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ رکوع کے بعد قومہ میں مثل قیام نماز کے دونوں ہاتھ باندھنا جائز اور مسنون ہے یا نہیں؟ اگر مسنون ہے تو عام طور پر کئی لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ قومہ میں ہاتھ نہیں باندھتے تو کیا یہ سب لوگ تارک سنت ہیں؟ اگر تارک سنت ہیں تو بموجب حدیث نبوی فمن لم يعمل بسنتي فليس مني۔ یہ سب نمازی امت اجابت سے خارج ہیں اور اگر یہ ہاتھ باندھنا ثابت اور مسنون نہیں تو پھر مولانا سید بدیع الدین شاہ صاحب جو بڑے مشہور عالم ہیں' وہ رکوع کے بعد قومہ میں ہاتھ کیوں باندھتے ہیں؟ اور جب وہ ہاتھ باندھے کھڑے ہوں تو ان کی اقتداء میں سب مقتدیوں کو ہاتھ باندھنے چاہئیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو یہ عمل ارسال ید امام کی اقتداء کے خلاف ہو گا۔ ایک حدیث میں یہ پڑھا ہے : انما جعل الامام ليؤتم فلا تختلفوا عليه۔ یعنی "امام اس لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے اور تم امام کے ان افعال میں مخالفت نہ کرو۔" جیسے دوسری روایت میں ہے : فاصنعوا كما يصنع الامام۔ "کہ جس طرح امام کرے' تم بھی اسی طرح کرو۔" اگر امام کی طرح ہاتھ باندھیں گے تو یہ ناجائز فعل میں اطاعت ہو گی۔ بہرحال اس مسئلہ میں بڑی الجھن ہے۔ اس کی تحقیق کی جائے' مہربانی ہو گی۔ بینوا توجروا۔

(السائل یکے از جماعت اہلحدیث)

الجواب بعون الوهاب الحمد لله رب العالمين اما بعد فاقول بالله التوفيق۔

سوال مذکورہ کا جواب یہ ہے کہ مسلم شریف جلد۔۲' ص ۷۷ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے :ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو رد۔ یعنی "جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے کوئی سا عمل کیا جس پر ہمارا حکم وارد نہ تھا تو وہ عمل یا وہ شخص جس نے ایسا عمل کیا ہے' مردود ہے۔"

امام نووی اس حدیث پر اپنی شرح میں فرماتے ہیں : هذا الحديث قاعدة عظيمة من قواعد الاسلام وهو من جوامع كلمه صلى الله عليه وسلم فانه صريح في رد كل البدع والمخترعات۔ یعنی "یہ حدیث نبی کریم ﷺ کے جامع کلمات میں سے ہے اور اسلامی اصولوں میں سے بہت بڑا اصول ہے۔ اس سے تمام بدعات اور اختراعی امور رد ہو

جاتے ہیں۔"

پھر لکھتے ہیں : هذالحديث مما ينبغي حفظه واستعماله في ابطال المنكرات واشاعة الاستدلال به۔ "یہ حدیث اس لائق ہے کہ ہر اہل علم اس کو حفظ کر لے اور اسلام میں جس قدر منکرات پیدا ہوں' ان پر اسی کو استعمال کرے اور اس سے دلیل پکڑنے کی عام اشاعت کرے۔" اس لیے راقم الحروف اس حدیث کو پیش نظر رکھ کر اس قاعدہ عظیم کی رُو سے کہتا ہے کہ رکوع کے بعد قومہ میں دونوں ہاتھ باندھنا نہ قول نبوی سے ثابت ہے' نہ فعل نبوی سے' نہ تعامل خلفاء وصحابہ کرام سے ثابت ہے۔ یہ امر منکر اور محدث ہے' اس لیے مردود ہے' اس سے بچنا واجب ہے۔

چنانچہ جناب رئیس المحققین حضرت العلام مولانا نواب صدیق حسن خاں صاحب جن کا علمی درجہ بہت بلند تھا اور وہ مجتہد العصر تھے۔ موجودہ علماء ان کے مقابلہ میں جملہ فنون علمیہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ علماء اسلام میں نواب ہی تھے' رحمہ اللہ۔ وہ اپنی کتاب نزل الابرار میں تحریر فرماتے ہیں : وقد رايت مشائخنا من اهل الحديث والشوافع والاحناف والحنابلة كلهم يرسلون ايديهم في هذا القيام وما رايت احدا منهم يضع يمينه على شماله فيه فالذي يقول بالوضع فيه كانه يخالف الاجماع ويحدث في الدين۔ یعنی "میں نے اپنے مشائخ اہلحدیث کو دیکھا اور شافعی علماء وعلماء حنفیہ اور علماء حنابلہ کو دیکھا' سب اپنے ہاتھوں کو رکوع کے بعد نیچے چھوڑ دیتے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کو بھی قومہ میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر باندھے ہوئے نہیں دیکھا۔ پس جو شخص اس زمانہ میں اس کا قائل ہے' وہ اجماع امت کا مخالف ہے اور دین میں بدعت پیدا کرتا ہے۔"

جو شخص یہ کہتا ہے کہ رکوع کے بعد ارسال یدین کی دلیل لاؤ' یہ مطالبہ غلط اور انسان کی طبعی فطرت اور عادت کے خلاف ہے کیونکہ اصل ارسال ہے اور خلاف عادت ایک تکلیف ہے جو بغیر قول وفعل شارع کے اختیار نہیں کی جا سکتی۔

الروضہ الندیہ حاشیہ الدرر البھیہ جلد ۱' ص۔ ۳۳ میں ہے : فعملوا بالارسال بناء على الاصل اذا لوضع امر جديد يحتاج الى الدليل واذ لا دليل لهم فاضطروا الى الارسال۔ یعنی "ارسال یدین پر جو لوگ عمل کرتے ہیں' وہ اس وجہ سے کہ ارسال اصل ہے اور وضع

امر جدید ہے جو دلیل کا محتاج ہے۔ جب دلیل موجود نہیں ہے تو ارسال پر عمل لامحالہ ہے۔"

وضع یمین بر شمال کے بارہ میں دو قسم کی احادیث آئی ہیں۔ ایک وہ جن میں مطلق نماز میں ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے۔ کسی جگہ کی تخصیص نہیں ہے' دوسری وہ روایات جن میں قیام قبل از رکوع میں ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے تو بااصول محدثین مطلق مقید اور عام وخاص پر محمول ہوتا ہے۔

نیل الاوطار جلد۔۲' ص۔۲۲۹ پر ہے : وبناء العام علی الخاص واجب کما تقرر فی الاصول وھذا الا محیص عنه۔ یعنی "عام حکم کی خاص حکم پر بنا رکھنا واجب ہے' جیسا کہ یہ اصول مقرر ہے' جس سے بھاگنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

چنانچہ تمام علماء اسلام کا سوائے کسی شاذ ونادر کے اس پر تعامل جاری ہے کہ قیام قبل از رکوع میں ہاتھ باندھتے ہیں اور قومہ میں چھوڑتے ہیں۔ ہدایہ فقہ کی کتاب جلد۔۱' ص۔۸۶ میں ہے : یرسل فی القومة۔ یعنی "قومہ میں دونوں ہاتھوں کو چھوڑ دے۔"

پس مطلق اور عام احادیث سے قومہ میں ہاتھ باندھنے کا ثبوت لینا سراسر سینہ زوری ہے کیونکہ یہ منبع اصول کے خلاف ہے۔ جناب حضرت العلام مولانا حافظ عبداللہ صاحب محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ جو مولانا سید بدیع الدین صاحب کے اُستاد ہیں' اپنی کتاب "ارسال الیدین بعد الرکوع" ص۔۱۸ پر ارشاد فرماتے ہیں : "پس حدیث کا معنی ایسا کرنا جو اجماع کے خلاف ہو' یہ سراسر گمراہی ہے۔ اپنی رائے پر ایسا فریفتہ نہ ہونا چاہیے کہ کسی کی پرواہ نہ ہو۔ اسی چیز نے گمراہ فرقوں کو گمراہ کیا ہے۔"

بعض مولوی نماز کسوف میں رکوع کے بعد کھڑے ہو کر قرأت کرنے پر ہاتھ باندھنے سے رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ بھی کج فہمی ہے' کیونکہ یہ قیام قرأت کے لیے ہے' جس کے بعد پھر رکوع ہے۔ اس طرح کئی قیام اور رکوع ہوتے ہیں' پس جس رکوع کے بعد قرأت کا قیام نہیں بلکہ اعتدال ہے جس کے بعد سجدہ ہے' اس میں ہاتھ باندھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : من السنة وضع الیمین علی الشمال فی الصلٰوة۔ یعنی "دایاں ہاتھ بائیں پر نماز میں رکھنا سنت ہے۔"

پھر اس کی حد بندی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یوں آئی ہے: انه كان اذا قام الى الصلوٰة وضع يمينه على رصغه فلا يزول كذالك حتى يركع الا ان يصلح ثوبه او يحك جسده۔ (اخرجه ابن عبدالبر) یعنی "حضرت علی رضی اللہ عنہ جب نماز کی طرف کھڑے ہوتے تو اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے پہنچے پر رکھتے تھے' یہاں تک کہ رکوع کرتے۔ ہاتھ باندھنے کی حالت میں کپڑا درست کرنا ہوتا یا کھجلانا ہوتا تو یہ کام کر لیتے۔"

اس حدیث علی رضی اللہ عنہ سے واضح ہو گیا کہ سنت یہ ہے کہ رکوع کرنے تک قیام میں ہاتھ باندھنے چاہئیں' ان کو بغیر ضرورت نہ چھوڑے۔ اس طرح سے رکوع کے بعد قومہ میں اعتدال کے وقت ہاتھ باندھنا مشروع نہیں ہے اور وضع الید علی الید صرف اس قیام کے ساتھ مخصوص ہے جس میں قرأت مشروع ہے کیونکہ یہ قیام قرأت کرنے یا سننے کی غرض سے مقرر ہے۔ پس رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا بدعت ہے۔ اگر امام رکوع کے بعد ہاتھ باندھے تو مقتدی اس کی اطاعت نہ کرے کہ اطاعت امام کے امور مشروع میں ہے جو افعال نماز ہیں اور جو افعال نماز نہیں ہیں' ان میں اطاعت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور' جلد۔۲۱' شمارہ۔۲۸

مذاکرہ علمیہ

سوال: یٰاَیُّھَا الْعُلَمَآءُ! کیا حکم ہے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بارے میں کہ مصلی بعد از رکوع حالت قومہ میں ہاتھوں کو چھوڑے یا سینے پر باندھے یا مثل رفع الیدین روکے رکھے' کتاب وسنت سے بالصریح جواب عنایت فرمائیں۔ بینوا و توجروا۔

سائل: ابو محمد سلطان احمد میانوالی عفی عنہ

مدرس مدرسہ دارالسلام' پرنس روڈ کراچی نمبر۱

۲۱/ محرم الحرام سنہ۔۱۳۸۴ھ' ۲۹/ مئی سنہ۔۱۹۶۴ء بروز جمعہ

الجواب: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ الحمد للہ رب العالمین۔ اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔ مصلی کو بعد از رکوع حالت قومہ میں اپنے ہاتھوں کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ دریں حالت ہاتھوں کا باندھنا یا رفع الیدین کر کے روک رکھنا نہ کسی شرعی دلیل سے ثابت

ہے اور نہ اس پر قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر میں اور نہ محدثین کے زمانہ میں عمل پایا گیا ہے۔ یہ چودھویں صدی کے بعض غیر مجتہد علماء کا اختراع ہے جو جدت پسند ہیں اور غیر معمول بہا مسائل سے اپنی شہرت چاہتے ہیں' ان کی طرف سے ایک دو رسالے بھی شائع ہوئے ہیں مگر جس طرح مرزائیوں کو مرزا غلام احمد کی نبوت کا ثبوت دینا مشکل تھا اور وہ باوجود محنت شاقہ کے ثبوت نہ دے سکے' اس طرح یہ علم بھی رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کے ثبوت سے عاجز اور قاصر رہے۔

واضح ہو کہ نماز میں ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کے بارہ میں تین قسم کی روایتیں آئی ہیں۔ ایک مطلق ہاتھ پر ہاتھ باندھنے کے بارہ میں ہیں' جیسے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں : صف القدمین ووضع الید علی الید من السنة اخرجه ابوداؤد وغیرہ۔ یعنی "قدموں کا برابر رکھنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھنا سنت ہے۔" دوسری قیام میں ہاتھ باندھنے کے متعلق ہیں جیسے نسائی نے حضرت وائل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' وہ کہتے ہیں : رایت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اذا کان قائما فی الصلوٰة قبض بیمینه علی شماله۔ یعنی "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ جب نماز میں کھڑے ہوتے تو دائیاں ہاتھ بائیں پر رکھتے تھے۔" تیسری قیام قبل الرکوع کے بارے میں وارد ہیں' جیسے نسائی میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ نے خبر دی ہے : قلت لا نظرن الی صلوٰة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کیف یصلی فنظرت الیه فقام فکبر ورفع یدیه حتی حاذتا باذنیه ثم وضع یده الیمنٰی علی کفه الیسری والرسغ والساعد فلما اراد ان یرکع رفع یدیه مثلها۔ (الحدیث) یعنی "میں کہتا ہوں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میرے تصور میں ہے کہ آپ نماز کیسے پڑھتے تھے۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ کھڑے ہوئے پس تکبیر تحریمہ کہی اور رفع یدین کیا یہاں تک کہ دونوں کانوں کے برابر ہاتھ کئے پھر دائیاں ہاتھ اپنی بائیں ہتھیلی اور گٹ اور بازو پر رکھا۔ پس جب رکوع کا ارادہ کیا تو پہلے کی طرح رفع یدین کیا۔"

پس پہلی قسم کی احادیث دوسری قسم کی احادیث پر محمول ہیں اور دوسری قسم کی احادیث تیسری قسم کی احادیث پر محمول ہیں کیونکہ ایک تو محدثین کا اصول یہ ہے : الاحادیث یفسر بعضها بعضا یعنی "احادیث باہم ایک دوسری کی تفسیر کر دیتی ہیں۔" دوسرا یہ کہ علم اصول کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ مطلق مقید پر محمول ہوتا ہے۔

نور الانوار میں امام المحدثین حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ اصول درج ہے : والمطلق محمول علی المقید (ص۔۹۲) نیز یہ صراحت ہے : فاذا وردا فی مسئلۃ شرعیۃ فالمطلق محمول علی المقید ای یراد بہ المقید وان کانا فی حادثتین عند الشافعی رحمۃ اللہ علیہ۔ یعنی "جب مطلق اور مقید دونوں ایک مسئلہ شرعی میں وارد ہوں تو مطلق مقید پر محمول ہو گا یعنی مطلق سے مقید ہی مراد لیا جائے گا اگرچہ دونوں دو حادثوں میں وارد ہوئے ہوں۔" امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے کیونکہ مطلق ساکت اور مجمل ہوتا ہے اور مقید ناطق اور مفسر ہوتا ہے' اس لیے مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔

چنانچہ نیل الاوطار جلد۔۲' ص۔۱۹۳ میں ہے : وحمل المطلق علی المقید واجب علی ما ھو الحق فی الاصول۔ جب ایک حدیث میں مطلق ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا ذکر ہے نماز کی قید نہیں اور دوسری میں نماز کی قید ہے پھر دوسری میں نماز کے محل کا ذکر نہیں تو تیسری میں قیام کا ذکر ہے پھر قیام کا اطلاق قومہ پر بھی آیا ہے (اگرچہ عرف شرع میں عام طور پر قیام وہی مراد ہوتا ہے جس میں قرآت ہے اور وہ رکوع سے پہلے ہے) تو چوتھی حدیث میں قیام قبل از رکوع کی قید آگئی ہے جس سے مطلق قیام کا اطلاق باطل ہوا۔

نور الانوار میں ہے : فاذا ثبت تقییدۃ بطل اطلاقہ۔ یعنی "جب مطلق کی قید دوسری دلیل سے ثابت ہو جائے تو اطلاق باطل ہو جاتا ہے۔" جب اصول کی ان تصریحات کی رُو سے وہ احادیث جن میں نماز کا ذکر ہے اور جن میں مطلق قیام کا ذکر ہے ان احادیث پر محمول کی جائیں جن میں قیام قبل از رکوع کا ذکر ہے تو اس سے ان مولویوں کا استدلال باطل ہو جاتا ہے جو قومہ کو قیام کا ایک فرد قرار دے کر قیام کی احادیث سے دلیل لاتے ہیں۔ ہاں اگر وہ خاص قومہ میں ہاتھ باندھنے کی کوئی صریح حدیث پیش کر دیں تو پھر مطلق کے دو فرد ثابت ہو جائیں گے اور پھر وہ اپنے اطلاق پر رہ جائے گا۔

چنانچہ تحفۃ الاحوذی جلد۔۱' ص۔۳ میں ہے : ان المطلق اذا قید بقیدین متنافیین لم یحمل علی واحد منھما ویرجع الی اصل الاطلاق۔ یعنی "مطلق کی جب دو قیدیں متنافی ثابت ہو جائیں تو وہ کسی ایک پر محمول نہیں رہے گا' مطلق ہی رہ جائے گا۔" لیکن مسئلہ ہاتھ باندھنے کے بارہ میں صرف ایک قید ہی ثابت ہے' اس لیے مطلق مقید پر محمول ہے۔

ابوداؤد جلد۔۱' ص۔۱۰۵ میں وائل رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کے یہ الفاظ ہیں : فقام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاستقبل القبلۃ فکبر فرفع یدیہ حتّٰی حاذتا اذنیہ ثم اخذ شمالہ بیمینہ فلما اراد ان یرکع رفعھما مثل ذالک۔ (الحدیث) یعنی "آنحضور ﷺ کھڑے ہوئے پس قبلہ کی طرف متوجہ ہوئے اور تکبیر تحریمہ کہی پس رفع یدین کیا اور ہاتھوں کو یہاں تک اٹھایا کہ دونوں کانوں تک لے گئے پھر بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ سے پکڑا پھر جب ارادہ کیا رکوع کرنے کا تو مثل سابق کے رفع یدین کیا" اس حدیث میں تکبیر تحریمہ کے بعد اور رکوع سے پہلے ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے جس سے مطلق قیام کی تقیید ثابت ہو گئی کہ احادیث میں قیام سے وہی مراد ہے جو قراۃ والا رکوع سے قبل ہے۔

فصل رابع مشکوٰۃ الرحمۃ المھداۃ کے ص ۱۴۱ میں ہے: عن جریر الضبی قال کان علی اذا ام فی الصلوٰۃ وضع یمینہ علی رسغہ فلا یزال کذالک حتّٰی یرکع مارکع۔ (الحدیث) یعنی "حضرت علی رضی اللہ عنہ جب نماز میں امامت کراتے تو دایاں ہاتھ بائیں کے پہنچے پر رکھتے اور اسی حال پر رہتے یہاں تک کہ رکوع کرتے جب بھی کرتے۔" رحمۃ المھداۃ کے اسی صفحہ میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے والنحر کا معنی یہ کیا ہے نماز میں دایاں ہاتھ بائیں پر رکھنا۔ ان کے عمل سے ثابت ہوا نماز میں اس کا محل وہ قیام ہے جو رکوع سے پہلے ہے۔ حدیث عمل علی رضی اللہ عنہ میں لفظ حتّٰی وارد ہے جو انتہاء غایت کے لیے آتا ہے' اس سے ہاتھ باندھنے کی حد رکوع تک ثابت ہو گئی اور اس سے مطلق نماز اور قیام کی احادیث مقید ہو گئیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یوں روایت آئی ہے جو اس کی مؤید ہے: کان اذا قام الی الصلوٰۃ قال ھکذا ووضع الیمنی علی الیسرٰی فی الصلوٰۃ اخرجہ ابن عبدالبر۔ یعنی "حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب نماز کی طرف کھڑے ہوتے تو نماز میں دایاں ہاتھ بائیں پر رکھتے" اس سے بھی پہلا قیام مراد ہے جیسا کہ اس پر قام الی الصلوٰۃ جملہ دلالت کر رہا ہے اور فی الصلوٰۃ کے الفاظ جو بعض احادیث میں ہیں' اس سے مراد بھی یہی قیام ہے جو نماز کی طرف کھڑے ہونے کے وقت ہے اور ان روایتوں میں لفظ اذا وارد ہے جو شرط کے لیے چونکہ شرط اپنے مشروط کے لیے قید ہوتی ہے' اس لیے یہ حالت قیام قبل رکوع والی مقید ہو گئی۔ اب دوسرے کسی قیام یا جلسہ میں ہاتھ باندھنے جائز نہیں۔

چنانچہ مرعاۃ المفاتیح جلد اول' ص ۵۵۸ میں ہے: ومحل الوضع منھا کل قیام ھو

قبل الرکوع لان الاصل هو الارسال کما هو وضع الانسان خارج الصلوۃ فلا یترک هذا الاصل الا فیما ورد النص علی خلافه وهو القیام قبل الرکوع واما القومة ای الاعتدال بعد الرفع الراس من الرکوع فلم یرد حدیث مرفوع صریح صحیح یدل علی الوضع فیه فیکون فیه العمل علی الاصل والاحادیث المطلقة تحمل علی المقیدۃ۔ یعنی "ہاتھ باندھنے کا موقعہ قیام قبل الرکوع ہے کیونکہ اصل طبعی حالت انسان کی ہاتھ نیچے کو چھوڑنا ہے جیسا کہ نماز کے باہر اس کی یہی حالت عموماً رہتی ہے کہ ہاتھ لٹکے ہوتے ہیں پس بغیر کسی دلیل شرعی کے یہ حالت اصلی قائم رہے گی۔ دلیل شرعی کوئی وارد نہیں جو قومہ میں ہاتھ باندھنے پر دلالت کرے تو احادیث مطلقہ کو مقیدہ پر محمول کیا جائے گا۔" (اگر دلیل ہوتی تو قرون ثلاثہ میں ضرور اس پر کسی صحابی' تابعی' تبع تابعی یا کسی امام مجتہد کا تعامل ہوتا اور اگر کسی کا تعامل ہوتا تو ضرور منقول ہوتا لیکن منقول نہیں تو یہ بدعت ہے۔)

جناب فاضل محقق مولانا عبیداللہ صاحب محدث مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ بڑا نہایت صحیح اور عین حق ہے۔ اس کے خلاف مذہب شاذ قومہ میں ہاتھ باندھنے والوں کا ہے جن کے پاس سوائے احتمال ظن' قیاس کے کوئی دلیل صریح نہیں ہے۔ یہ لوگ عوام کو مغالطہ دینے کے لیے حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی ایک روایت مسند احمد سے پیش کرتے ہیں جس میں راوی نے رکوع اور سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد یہ بیان کر دیا ہے : ورایته ممسکا یمینه علی شماله فی الصلوۃ "کہ نماز میں دائیاں ہاتھ بائیں پر رکھے ہوئے میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ اس حدیث میں واؤ ترتیب کے لیے نہیں ہے' راوی نے افعال نبویہ کو تقدم تاخر سے بلا ترتیب ذکر کیا ہے۔

اس کی نظیر مہلب الطائی کی روایت ہے' وہ کہتے ہیں : رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ینصرف عن یمینه ویساره ورأیته یضع یده علی صدره۔ (مرعاۃ المفاتیح جلد ۱' ص ۵۵۷) اس میں راوی نے دو چیزیں خلاف ترتیب ذکر کی ہیں۔ ایک انصراف دوم وضع ید۔ اصل بات یہ ہے کہ وضع ید نماز میں پہلے ہے اور انصراف سلام کے وقت ہے۔ اس طرح بہت احادیث میں تقدم وتاخر افعال کا موجود ہے' اس لیے حافظ ابن حجر نے تلخیص ص ۳۸۸ میں لکھا ہے : والواو لا تستلزم الترتیب کہ واؤ ترتیب کو مستلزم

نہیں ہے۔ اصول شاشی میں ہے : ولا یشترط فیه معنی الترتیب والمقارنة یعنی "واؤ" میں ترتیب اور مقارنت شرط نہیں ہے۔

جب ترتیب شرط اور لازم نہ رہی تو حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی دیگر روایتوں پر اس روایت کو محمول کریں گے جن میں قیام قبل الرکوع میں ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے کیونکہ سب روایتوں میں ایک بار ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے' دو بار نہیں کہ ایک بار تو قیام قبل الرکوع میں ہاتھوں کا ذکر ہوا اور اسی روایت میں قومہ میں باندھنے کا بھی ذکر ہو' اگر اس طرح ہوتا تو فیصلہ ہو جاتا۔ اب یہ روایت جس میں خلاف ترتیب ذکر کرنے کا احتمال قوی ہے' اس مسئلہ نادرہ پر دلیل کیسے بن سکتی ہے۔ باقی ارسال یدین کو سدل ممنوعہ قرار دے کر جو قومہ میں ہاتھ چھوڑنے کو منع کرتے ہیں یہ جہالت اور صریح سینہ زوری ہے کیونکہ سدل کا معنی ارسال ید اختراعی ہے جو پرویزی طرز کا ہے' کسی محدث کامل نے متقدمین اور متاخرین میں سے یہ معنی نہیں کیا۔

نیل الاوطار میں سدل کی روایتوں کو مجروح کر کے سدل ثیاب سے مخصوص کیا ہے جو فعل یہود تھا۔ پس قومہ میں ہاتھ باندھنا بھی اختراعی مذہب ہے اور سدل کا معنی ارسال ید بھی اختراعی ہے گویا مذہب بھی مردود اور استدلال بھی باطل اور مردود ہے۔ مسلمانوں کو ایسی بدعت سے بچنا چاہیے' یہ اجماع امت کے خلاف جاری ہوئی ہے' ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف الحصاری

ارشاد جدید کراچی' جلد۔۲' شمارہ۔۱۳'۱۴' بمطابق جولائی سنہ۔۱۹۹۴ء

الاعتصام جلد۔۱۵' شمارہ۔ ۲' ۳/ جولائی سنہ۔۱۹۹۴ء

قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود پڑھنے کا مسئلہ

"الاعتصام" کے باب الفتاویٰ پر ایک نظر: "الاعتصام" مجریہ ۱۱/ اپریل سنہ۔۱۹۴۹ء میں باب الفتاوی کے تحت سائل میجر عزیز کا ایک سوال یوں درج ہے : "تشہد اولیٰ میں اگر غلطی سے درود بھی پڑھے تو کیا سجدہ سہو کرنا پڑتا ہے؟"

اس کا جواب۔ مفتی فاضل گوندلوی صاحب نے ارقام فرمایا ہے : "سجدہ سہو ادا کرے اور

حدیث میں ہے جو نماز میں کمی بیشی کرے وہ نماز پوری کر کے بعد میں سجدہ کرے۔"

مفتی صاحب کا یہ فتویٰ غلط ہے اور اہل رائے کی فقہ کی رو سے دیا گیا ہے اور ایسے لفظوں سے کوئی حدیث نہیں ہے کہ نماز میں ہر کمی بیشی خواہ ذکر الٰہی یا قرآت وغیرہ میں ہو۔ ہاں ارکان نماز اور رکعتوں کی کمی بیشی میں سجدہ سہو کرنا ضروری ہے۔ حدیث میں ہے۔ "آنحضرت ﷺ کوئی سورۃ پڑھتے ہوئے ایک آیت بھول گئے تھے تو آپ ﷺ نے کوئی سجدہ سہو نہیں کیا۔"

اور نیل الاوطار جز ثانی ص۔۲۰۰ میں ہے: حضرت معاویہ نے مدینہ منورہ میں لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جس میں قرآت بالجہر کی تو بسم اللہ نہ پڑھی اور نیچے جاتے وقت اور نہ اٹھتے وقت تکبیریں کہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو انصار اور مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پکار کر کہا کہ آپ نے نماز کو ناقص کر دیا۔ بسم اللہ اور تکبیریں کہاں گئیں۔؟ پھر اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کو نماز پڑھاتے تو بسم اللہ بھی پڑھتے اور تکبیریں بھی کہتے رہے۔ (اخرجہ الحاکم فی المستدرک وقال صحیح علی شرط مسلم)

اس روایت سے ثابت ہوا کہ: ذکر اور قرآت کی کمی بیشی کے ظاہر ہونے پر سجدہ سہو نہیں ہے۔ اگر سجدہ سہو کیا ہوتا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابی راوی حدیث اس کو بیان کرتے اور نہ ہی یہ کسی اور حدیث سے ثابت ہے۔ تو پھر تشہد اولیٰ میں درود شریف پڑھنے سے سجدہ سہو کیسے لازم ہو سکتا ہے۔ بلکہ قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود شریف پڑھنا عمداً بھی جائز ہے۔

رئیس المحدثین امام شافعی اس کے جواز کے قائل ہیں۔ چنانچہ کتاب الام میں انہوں نے اس کی صراحت کی ہے۔ البتہ حنفیہ کا یہ مذہب ہے کہ اگر تشہد اولیٰ میں درود شریف سہواً پڑھے تو سجدہ سہو کرے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ چنانچہ حافظ عنایت اللہ صاحب گجراتی اپنی کتاب "نماز نبوی" کے حاشیہ ص۔۷ پر لکھتے ہیں۔ "بہار شریعت حصہ سوم) بریلوی حنفیوں کی فقہ میں جو لکھا ہے کہ درمیانی تشہد میں اگر بھول کر درود شریف پڑھا تو سجدہ سہو کرے اور اگر عمداً پڑھا تو نماز دہرائے۔" یہ صریحاً غلط ہے اور دیگر اپنی کتاب کے ص۔۶ پر متن میں یہ لکھا ہے: "اور اگر تشہد اولیٰ میں درود شریف پڑھ کر کھڑا ہوا ہے' تب بھی کوئی حرج نہیں' اس پر سجدہ کا خیال غلط ہے۔" اور مولانا حافظ عنایت اللہ صاحب گجراتی نے اپنے رسالہ کشف الحجاب ص ۳۹ پر مسئلہ کے عنوان سے یہ لکھا ہے۔

اگر قعدہ اولی میں تشہد کے بعد درود اگر سہواً پڑھے تو سجدہ سہو کرے۔ اور عمداً پڑھے تو نماز دہرائے۔ یہ اعادہ واجب ہے۔ تو آنجناب اس پر تعاقب فرماتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ درمیانی تشہد میں درود شریف کی حدیث میں کوئی روک نہیں۔ بلکہ امام شافعی نے تشہد اول میں بھی سلام کے ساتھ صلوۃ جوڑ کر پڑھنا بتایا ہے' جیسا کہ ان کی کتاب الام میں اس کی تصریح ہے۔

نیز امام غزالی نے کیمیاسعادت اور امام نووی نے کتاب الاذکار میں تشہد اول میں سلام کے ساتھ درود جوڑ کر پڑھنا بتایا ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی اس کی آیت اشارۃً موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : صلوا علیہ وسلمو تسلیما فرما کر صلوۃ وسلام دونوں کو جوڑ کر بیان کیا۔ پھر کتب حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ ہر جگہ "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھا جاتا ہے اور کتاب مذکورہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مطلق زیادت کے موجب سجدہ قرار دینا بھی ٹھیک نہیں' کیونکہ تشہد اول میں اسال اللہ الجنۃ واعوذ باللہ من النار کی زیادت جابر بن عبداللہ سے مرفوعاً مروی ہے جو کہ ابوداؤد ص ۲۴۰' طیالسی' نسائی ص ۱۸۹' ابن ماجہ ص ۶۵' مستدرک ص ۲۶۷' بیہقی ص ۱۴۶' طحاوی ص ۱۵۶ کی اول جلدوں میں موجود ہے اور مجمع الزوائد ج ۲ میں بحوالہ بزار اور طبرانی میں عبداللہ بن زبیر سے اس تشہد میں اللھم اغفرلی واھدنی پڑھنا بھی مرفوعاً آیا ہے۔ لہٰذا اس تشہد میں درود شریف پر سجدہ بتانا اختراع اور دہری غلطی ہے۔

اس تصریح کے بعد میں کہتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کا اسم گرامی تشہد یا قرات قرآن میں کوئی شخص پڑھے یا سنے تو درود پڑھنا چاہئے' لعموم ادلۃ الماضیۃ۔ پس "الاعتصام" کے مفتی گوندلوی صاحب کا فتوی بے دلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے۔

جیسے کسی عذاب کی آیت سن کر پناہ مانگنااور رحمت کی بشارت سن کر جنت اور رحمت کا سوال کرنا جائز ہے۔ اور حدیث سے ثابت ہے۔ جیسے کسی عذاب کی آیت سن کر پناہ مانگنا اور رحمت کی بشارت سن کر جنت اور رحمت کا سوال کرنا جائز ہے اور حدیث سے ثابت ہے۔ ایسے ہی نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی پر درود پڑھنا جائز ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور' جلد ۲۲' شمارہ ۲۲' مورخہ ۲۲/ اگست سنہ ۱۹۶۹ء

برہان حصاری بجواب تعاقب قاری

قعدہ اولیٰ میں درود شریف پڑھنے کا مسئلہ: اخبار "الاعتصام" لاہور مجریہ ۱۱/ اپریل سنہ ۱۹۶۹ء میں ایک فتویٰ حافظ محمد گوندلوی مدظلہ کی طرف سے مندرجہ بالا مسئلہ کے بارے میں شائع ہوا تھا کہ قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد بھول کر درود شریف پڑھا جائے تو اس پر سجدہ سہو کرنا لازم ہوتا ہے' اس پر بغرض اصلاح تعاقب کیا گیا تھا کہ یہ فتویٰ غلط ہے' کیونکہ اس پر کوئی دلیل شرعی وارد نہیں ہے۔ یہ تعاقب اخبار تنظیم اہل حدیث لاہور مجریہ ۲۲/ اگست سنہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح حافظ محمد صاحب گوندلوی کے بعض دیگر مسائل پر بھی تعاقب ہو رہے ہیں' ان میں سے کسی کا جواب الجواب دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جس سے یہ مترشح ہے کہ بقاعدہ خاموشی نیم رضا' ان کو وہ اصلاح مسلم ہے' ورنہ وہ ضرور اس کی اصلاح کرتے' تو اس پر حسن ظن یہ ہے کہ وہ ہماری اصلاح کو تسلیم کرتے ہیں' ورنہ عمداً کسی غلط بات پر خاموشی اختیار کرنا جرم ہے۔

حضرت مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی کے ایک شاگرد نے ہمارے تعاقب پر بنام "سیف الباری' علی تعاقب الحصاری" بندہ راقم الحروف پر تعاقب کیا ہے۔

جس کا اب جواب سنئے! سب سے پہلے یہ اصول سمجھ لیجئے کہ قرآن حکیم میں احکام نماز سب کے سب ایک ہی جگہ پر ذکر نہیں ہیں' بلکہ متفرق مقامات پر احکام کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً "ربک فکبر" (اپنے رب کی کبریائی بیان کر) یعنی اللہ اکبر کہو۔ "قوموا للہ قانتین" (یعنی اپنے اللہ کے فرمانبردار ہو کر چپ چاپ قیام کرو) "وارکعوا واسجدوا" (رکوع کرو اور سجدہ کرو) "فاقرأوا ماتیسر من القرآن" (یعنی جس قدر آسان ہو' نماز میں قرآن پڑھو)

ٹھیک اسی طرح حکم ہوا: یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ یعنی "اے ایمان والو! تم اپنے نبی پر درود وسلام بھیجو۔" اس میں حکم ہے کہ اہل ایمان جب نماز پڑھیں تو نماز میں اپنے نبی پر درود وسلام پڑھیں' چنانچہ ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت مسلم وابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ "ہم سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے' بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ہم لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے آپ پر

درود شریف پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ پس ہم کس طرح یعنی کن الفاظ سے آپ ﷺ پر درود پڑھا کریں؟ تب آپ نے ارشاد فرمایا کہ یوں کہا کرو۔ پھر درود ابراہیم کی تعلیم دی۔

اسی حدیث کو دوسرے طریق میں امام احمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ یہ الفاظ ہیں : کیف نصلی علیک اذا نحن صلینا فی صلوتنا۔ یعنی "جب ہم اپنی نماز میں درود پڑھنا چاہیں تو کس طرح پڑھیں۔" میں کہتا ہوں کہ مسند احمد کی اسی روایت میں ہے کہ صحابی نے یہ کہا ہے کہ یارسول اللہ ام السلام علیک فقد عرفنا فکیف نصلی علیک۔ یعنی "یارسول اللہ! ہم نے آپ پر سلام کہنا تو معلوم کر لیا اب یہ فرمایئے کہ نماز میں درود شریف کس طرح پڑھا کریں؟ اسی طرح بہت سی روایتوں میں یہ وارد ہے کہ سلام تو ہم نے پہچان لیا ہے' یعنی جو تشہد میں پڑھا جاتا ہے۔ اب آپ بموجب امر الٰہی کے جو سلام کے ساتھ درود شریف کا حکم ہے اس کی تعلیم دیں۔ تب آپ ﷺ نے درود ابراہیمی کی تعلیم دی۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آیت مذکورہ "صلوا علیه وسلموا تسلیما" کا حکم نماز کے بارے میں وارد ہے اور درود پڑھنا واجب ہے۔ اب رہا یہ کہ اس کا نماز میں مقام کون سا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں درود اور سلام دونوں کا حکم وارد ہے اور دونوں کی تعمیل نماز میں ہوتی ہے' تو جب قعدہ اولی اور قعدہ ثانیہ میں سلام پڑھا جائے گا' تو درود بھی نماز میں ساتھ ہی پڑھا جائے گا۔ کیونکہ آیت اور حدیث میں سلام اور درود کا حکم دیا گیا ہے' تو قعدہ اولیٰ میں درود پڑھنے کی ممانعت وارد نہیں ہے' بلکہ آیت اور حدیث کا اقتضاء یہ ہے کہ سلام اور درود دونوں پڑھے جائیں۔ پھر نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی بھی کلمہ شہادت میں آگیا ہے' تو آپ کا اسم گرامی بولنے اور سننے پر درود پڑھنا واجب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ عموم ادلہ اس پر دلیل ہیں' تو پھر بھول کر درود پڑھنے سے جو سجدہ سہو لکھا ہے یہ خلاف منقول ومعقول ہے اسی لئے قابل قبول نہیں ہے۔

اب ہم تعاقب کنندہ کا جواب شروع کرتے ہیں۔ ان کے قول کا عنوان تعاقب قاری اور جواب کا عنوان برھان حصاری ہو گا' ناظرین انصاف سے ملاحظہ فرمائیں :

تعاقب قاری : لفظ "بھی" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی جو فتوے حضرت حافظ گوندلوی کے تھے' وہ بھی غلط تھے۔ تو ان سب کے علاوہ اس کو ذکر کرنا ترجیح بلا مرجح اور تقدیم بلا مقدم ہے۔

برھان حصاری : افسوس ہے کہ تعاقب کرنے والے میاں صاحب لفظ بھی کے محاورہ کو بھی نہ سمجھ سکے' ایسے لوگ ناواقف ہوتے ہیں جن کو لغویات کی پرواہ نہیں ہوتی۔ ناظرین تنظیم اہلحدیث کو خوب معلوم ہے کہ عرصہ دراز سے اخبار تنظیم اہل حدیث میں مفتی صاحب گوندلوی کے غلط مسائل پر تنقید وتردید جاری ہے۔ الحمدللہ اکثر اہل علم نے اس سلسلے کو پسند کیا ہے' ایک تو اس سلسلے سے مسائل کی تحقیق ہو رہی ہے۔ دوم جو لوگ حضرت حافظ صاحب کے ہر فتویٰ کو صحیح سمجھ کر تسلیم کر لیتے ہیں' اب وہ غور و فکر کے بعد ان کے مسئلہ کو لیتے ہیں۔ جب یہ سلسلہ جاری ہے اور پہلے ان کے کئی غلط مسائل کے دلائل کے ساتھ ان کی تنقید اور اصلاح کی گئی تو ایک یہ مسئلہ کہ قعدہ اولیٰ میں کوئی شخص سہواً درود شریف پڑھ لے تو وہ سجدہ کرے' اس کی بھی تغلیط کی گئی۔ لفظ "بھی" سابقہ مسائل کے ساتھ ربط پیدا کر رہا ہے' تو پھر اس کو اپنی کم فہمی سے ترجیح بلا مرجح اور تقدیم بلا مقدم ٹھرانا کون سا انصاف ہے؟ اخبار تنظیم اہلحدیث میں حکومت کو توجہ دلانے کے لئے ایک عنوان میں لکھا ہے۔ قرآن سنت کے حقوق کیلئے بھی کچھ کیجئے۔ (تنظیم مطبوعہ ۱۲/ ستمبر سنہ ۱۹۹۹ء) اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟

جو بھی اس کا جواب دو گے ہمیں
اس کی تصویر پا لو گے ہمیں

جو حضرات "بھی" کے محاورہ کو خوب سمجھتے ہیں' انہیں معلوم ہے جس طرح پہلے مسائل ہماری تحقیق کی رو سے غلط تھے' یہ مسئلہ بھی غلط ہے۔ بات بالکل صاف ہے پس اس پر اعتراض لغو ہے۔ قرآن نے مومن کی شان یہ بیان کی ہے : والذین هم عن اللغو معرضون۔ پھر قاری صاحب لکھتے ہیں۔ لفظ غلط کو مطلق ظاہر کرنا یہ خود غلط ہے۔ "میرے" نزدیک کا لفظ زیادہ کرنا چاہیے۔

میں کہتا ہوں کہ فلاں مسئلہ میرے نزدیک یا اہل علم کے نزدیک یوں ہے' کہنا علماء کا کام نہیں' عام محاورہ ہے۔ شرع میں یہ قانون ہے کہ جو مسئلہ دلیل شرعی سے مدلل ہے وہ صحیح ہے۔ لیکن اگر دلیل شرعی سے خالی ہے تو وہ غلط ہے۔ "میرے نزدیک" "فلاں کے نزدیک" کہنا کوئی شریعت نہیں۔ راقم الحروف نے شرع کی رو سے لکھا ہے کہ یہ فتویٰ غلط ہے' کیونکہ اس پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی دلیل شرعی پیش نہ کریں گے اور

محض اہل علم کا حوالہ دے کر کہیں گے کہ یہ مسئلہ ان کے نزدیک یوں ہے تو اس میں کوئی وزن نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ قعدہ اولیٰ پر درود پڑھنے پر سجدہ سہو لازم کرنا غلط ہے کیونکہ اس پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ پس مفتی صاحب گوندلوی اور ان کے حلقہ کے علماء کو دلیل سے ثابت کرنی چاہئے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

تعاقب قاری : کیا اہل رائے کے تمام فتوے غلط ہیں؟ صحیح کو غلط کہنا تو ہدایت کا انکار ہے۔ اگر بعض صحیح ہیں اور بعض غلط' تو کیا اہل الرائے کی فقہ سے جو فتویٰ صحیح ہو' کیا دینے سے وہ بھی غلط ہو جاتا ہے؟

برھان حصاری : قاری صاحب کو اہل علم کی اصطلاحات سے بالکل لاعلمی ہے' ورنہ ایسی لایعنی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ محققین اور مورخین نے لکھا ہے کہ ممالک اسلامیہ میں دو قسم کے لوگ ہیں : (۱) اہلحدیث (۲) اہل رائے۔

اہل رائے کے جو مسائل مسلک اہلحدیث کے خلاف ہیں وہ سب غلط ہیں۔ جب اختلاف کے وقت مقابلہ ہوتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسلک اہلحدیث ہے' یہ مسلک اہل رائے ہے

پس مسلک اہلحدیث حق ہے اور مسلک اہل رائے باطل ہے۔ مثلاً امام شافعی مسلک اہلحدیث میں شامل ہوتے ہیں تو ان کا مسلک یہ ہے کہ قعدہ اولیٰ میں درود شریف پڑھنا چاہئے۔ چنانچہ ان کی کتاب الام میں اس کی تصریح موجود ہے اور امام ابوحنیفہ اہل رائے میں شمار ہوتے ہیں' بلکہ وہ ان کے پیشوا ہیں' تو ان کی رائے یہ ہے۔ قعدہ اولیٰ میں درود پڑھا گیا تو اس پر سجدہ سہو لازم ہو گا۔ اب باعث نزاع یہ معاملہ ہے کہ ہم مسلک اہلحدیث پر قائم ہیں اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ قعدہ اولیٰ میں درود شریف پڑھنا چاہئے۔

دوم یہ کہ جو شخص درود نہیں پڑھتا' وہ اگر بھول سے درود قعدہ اولیٰ میں پڑھ لے تو اس پر سجدہ سہو نہیں ہے۔ کیونکہ قرأت واذکار کی کمی بیشی میں سجدہ سہو نہیں ہوا کرتا۔ افعال نماز کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر ان میں کمی یا بیشی ہو جائے تو اس پر سہو کا سجدہ ہے۔

پس اہل رائے اور ان کے مقلدین کا مسلک اہل حدیث کے مقابلہ میں مردود ہے۔ تاریخ ابن خلدون ج ۱' ص ۳۷۲ میں ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "متقدمین میں فقہ دو طریقے پر

منقسم ہو گئی۔ ایک طریقہ اہل رائے والقیاس کا اور وہ عراق والے ہیں۔ دوسرا طریقہ اہلحدیث کا ہے اور وہ حجاز و مکہ و مدینہ والے ہیں۔"

اہل عراق میں حدیث کم تھی جس کی وجہ پہلے ذکر ہو چکی ہے انہوں نے قیاس سے زیادہ کام لیا اور وہ قیاس میں خوب ماہر ہوئے۔ اسی وجہ سے ان کو اہل رائے کہا گیا۔ اہل رائے کی جماعت کے سردار امام ابوحنیفہ ہیں' جن کے شاگردوں میں یہ مذہب قائم ہوا۔

اس تاریخی ثبوت سے یہ ظاہر ہوا کہ اہل حدیث کے مقابلہ میں دوسرا گروہ اہل رائے کا ہے' جن کے مسائل اختلافیہ اہل حدیث کے خلاف ہوتے ہیں۔ پس جو شخص بھی کسی اختلافی مسئلہ میں اہل رائے کی موافقت کرے گا' اس کو اہل رائے یا ان کا مقلد قرار دیا جائے گا۔ خصوصا جب اس کے کئی مسائل اور کئی فتوے اہل رائے کے مطابق ہوں گے تو اس کے مقلد اور اہل رائے ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

حضرت العلام مفتی اعظم حافظ صاحب روپڑی رحمہ اللہ کے مسائل اور فتوے ملاحظہ فرمائیے' وہ اہلحدیث کے مسلک کے عین موافق ہیں۔ اس کے برعکس مولانا مفتی گوندلوی صاحب کے اکثر فتوے فرقہ اہل الرائے کے مطابق ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے ان پر تعاقب شروع کر رکھا ہے۔ ورنہ حاشا وکلا مولانا گوندلوی صاحب سے ہماری ذاتی کوئی عداوت نہیں ہے' بلکہ بندہ آپ کو عالم فاضل اور اپنے سے فائق تصور کرتا ہے۔ لیکن جب ان کا فتویٰ ان علمائے حدیث کے خلاف ہوتا ہے جو ان سے بھی زیادہ عالم وفائق ہیں تو پھر دلائل کی رو سے تحقیق کر کے ان کے غلط فتوے کی تردید کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ الحق یعلوا ولا یعلی "وبعض اوقات' کسی مسئلہ میں حق ادنیٰ درجہ کے ساتھ ہوتا ہے اور اعلیٰ اس سے محروم رہتا ہے"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ بعض مسائل میں کچھ صحابہ دیگر صحابہ میں سے حق پر تھے' تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ العاقل تکفیه الاشارہ۔

تعاقب قاری : بلکہ اس سے بھی عام حدیث آئی ہے' جو ذکر الٰہی اور قرآت کو متضمن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : من نسی شیئا من صلوته فلیسجد سجدتین وھی جالس۔ (راوہ احمد والنسائی والطبرانی فی الکبیر) معلوم ہوا کہ جو فعل مسنون ہو نماز میں' اس کے سہو سے سجدہ کرنا چاہئے۔ خواہ وہ ذکر الٰہی ہو یا قرآت' اس کے

علاوہ...... الخ۔

برھان حصاری :

ہر کہ نداند بداند کہ داند

در جہل مرکب ابد الدہر بماند

جناب مفتی صاحب گوندلوی کے شاگرد کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس حدیث سے وہ استدلال کر رہے ہیں، وہ نہ روایت کی رو سے قابل حجت ہے اور نہ درائت کی رو سے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ پیش کردہ حدیث کی اسناد کا دارومدار محمد بن عجلان پر ہے اور وہ مدلس ہے۔ چنانچہ تحقیق الکلام حصہ دوم، ص۔۲۱۰ میں حضرت العلامہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارک پوری مرحوم نے اس کو طبقات المدلسین کے حوالہ سے ثابت کیا ہے۔ جب ابن عجلان مدلس ہوا تو اس کی جو روایت لفظ "عن" سے نسائی و مسند احمد وغیرہ میں مذکور ہے وہ ضعیف ہے کیونکہ محدثین کا اصول مسلمہ ہے کہ "مدلس راوی جب کوئی حدیث لفظ "عن" سے روایت کرے، تو وہ حدیث قابل حجت نہیں رہتی، ضعیف ہو جاتی ہے۔"

علاوہ ازیں محمد بن عجلان سئی الحفظ ہے۔ چنانچہ جناب مولانا مبارک پوری نے تحقیق الکلام حصہ دوم کی تیسری دلیل کے جواب نمبر۔۲ میں اس کو ثابت کیا ہے اور ابکار المنن میں بھی اس کی تفصیل ہے کہ جو راوی "سئی الحفظ" ہو وہ ضعیف ہوتا ہے۔

راوی ضعیف ہو تو روایت ضعیف قرار پاتی ہے اور ضعیف دلیل سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہوتا، تو یہ دلیل مثبت دعویٰ نہ رہی، قاری صاحب کا دعویٰ خارج ہوا۔

اب اس حدیث پر درائت کی رو سے غور فرمایئے! حدیث کا یہ جملہ محل استدلال ہے : من نسی شیئا من صلوته فلیسجد سجدتین وھو جالس۔ یعنی "جو شخص اپنی نماز میں سے کوئی چیز بھول جائے تو وہ آخر نماز میں بیٹھ کر دو سجدے سہو کے کرے۔"

اسی جملہ پر تعلیقات سلفیہ نسائی اور فتح الربانی شرح مسند احمد میں یہ لکھا ہے : "قوله من نسی شیئا" عمومه مخصوص بغیر الارکان فان السجود لا تجزی من الرکن عند العلماء۔ یعنی "اس حدیث کا مفہوم خاص کیا گیا ہے، ان چیزوں کے ساتھ جو نماز کے ارکان کے بغیر ہیں، کیونکہ سجدہ سہو رکن کی جگہ کفایت نہیں کرتا، بلکہ اس رکعت کا اعادہ واجب ہو جاتا ہے۔ سب علما کا یہی مذہب ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کسی رکعت میں سورہ فاتحہ بھول جائے تو اس رکعت کا اعادہ واجب ہے۔

جب یہ حدیث عام مخصوص منہ البعض ہو گئی تو یہ ظنی ہو گئی' اب دیگر دلائل سے بھی یہ مخصوص ہو سکے گی اور وہ بایں طور کہ اس حکم کا مورد انواع فعلیہ میں سے ہے۔ یعنی نماز کے انواع دو طرح کے ہیں : (۱) قولیہ (یعنی قرآت اذکار وغیرہ) (۲) فعلیہ (یعنی قیام' رکوع' سجود اور قعدہ وغیرہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو نسیان واقعہ ہوا وہ انواع فعلیہ سے ہے۔ چنانچہ احادیث کے تمام متون ملاحظہ کیے جائیں تو ان میں یہ الفاظ ملیں گے : لم یجلس۔ وعلیہ جلوس۔ سجد سجدتین۔ وسجد معہ ناس مکان مانسی من الجلوس۔ یعنی "آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتوں کے بعد نہ بیٹھے' بھول سے کھڑے ہو گئے۔ پھر سجدہ سہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ نے کیا جو جلسہ رہ جانے کی وجہ سے تھا۔

جب قعدہ اولیٰ بھول جانے کی وجہ سے سجدہ سہو ہوا تو یہ نماز کی فعلی نوع تھی' جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا : من نسی شیئا من صلوتہ ای من افعال صلوتہ۔ یعنی "نماز کے انواع فعلیہ سے اگر کوئی شخص کوئی چیز بھول جائے تو وہ سجدہ سہو کرے۔" کلام کے قرائن کے ساتھ "عام" خاص ہو جاتا ہے اور ہر عام اپنی نوع کے افراد میں دائر رہتا ہے' دوسری نوع کے افراد کو شامل نہیں ہوتا۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو صدقہ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا : من انفق زوجین فی سبیل اللہ دخل الجنۃ۔ "جس شخص نے اللہ کی راہ میں کسی چیز کا جوڑا خرچ کیا' وہ جنت میں داخل ہوا۔" مثلاً دو روپے یا دو کپڑے اللہ کی راہ میں دئے تو وہ جنتی ہوا۔

اس حدیث میں لفظ "من" عام ہے جو سب انسانوں کو شامل ہے۔ جیسے من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ میں عام ہے لیکن پہلی حدیث کا عام' قرائن نے مومنوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ کفار اور مشرکین اور یہود وہنود اس بشارت میں داخل نہیں ہیں۔ تو یہ عموم اپنی نوعیت کے افراد کو حاوی رہے گا کہ خطاب انہی سے ہوا ہے۔ ٹھیک اسی طرح حدیث زیر بحث کا حال ہے کہ ان لوگوں سے مخصوص ہے جو بغیر ارکان کے' دیگر افعال نماز سے بھول جائیں اور ان میں کمی بیشی ہو جائے۔ نوع قولیہ اس میں داخل نہیں ہے۔ پس

قرآت اور اذکار مسنونہ میں اگر نسیان واقعہ ہوا تو سجدہ سہو لازم نہ ہو گا۔

آنحضرت محمد ﷺ نے جن مواضع میں نسیان واقع ہونے پر سجدہ سہو کیا ہے وہ سب نوع فعلیہ سے ہیں۔ اگر شک کی وجہ سے سجدہ کا حکم دیا تو وہ بھی' جزائے فعلیہ کی بابت سے ہے۔ مثلاً دو رکعت پڑھی ہیں یا تین؟ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار؟ سجدہ ایک کیا یا دو؟ قعدہ کیا ہے یا نہیں؟ یہ سب اس شک کے عارض ہونے کا حکم ہے' جو نماز کے اجزائے فعلیہ سے ہیں۔ قولیہ کی بابت کوئی حکم وارد نہیں۔

اگر کسی کو شک ہو کہ سبحانک اللھم پڑھا ہے کہ نہیں؟ سجدہ میں تسبیح پڑھی ہے یا کوئی اور کلمہ کہا ہے؟ دو سجدوں کے درمیان دعا پڑھی ہے یا نہیں؟ ربنا لک الحمد پڑھی یا نہیں؟ الغرض کسی جگہ نماز کے اجزائے قولیہ (قرآت وغیرہ) کی بابت سجدہ سہو کا حکم نہیں آیا اور نہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا' بلکہ اس کے برعکس اس حدیث کے راوی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بسم اللہ و تکبیرات میں سہو واقع ہوا' جو نماز کے بعد اہل مدینہ نے بتایا' تو آپ نے دوسرے وقت میں نماز پڑھائی تو بسم اللہ اور تکبیرات کو جہر سے پڑھا لیکن صورت اولیٰ میں سجدہ سہو نہیں کیا۔

جب اس حدیث کے راوی کا اس پر عمل نہ پایا گیا تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم فعلی نسیان کے بارے میں ہے' قولی نسیان کے بارے میں نہیں ہے۔ خود قاری صاحب نے اس حدیث کی وضاحت یوں کی ہے کہ (معلوم ہوا جو فعل مسنون ہو' نماز میں اس کے سہو سے سجدہ کرنا چاہئے) یہ تو کسی حد تک تسلیم ہے لیکن اس کے بعد جو یہ لکھ دیا ہے (خواہ ذکر الٰہی ہو یا قرآت) یہ اپنی طرف سے اختراع ہے۔ ذکر الٰہی اور قرآت انواع قولیہ ہیں' فعلیہ سے نہیں۔

قول اور فعل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قول زبان سے صادر ہوتا ہے' فعل باقی اعضاء بدن سے۔ اس لیئے امام الدنیائی فی الحدیث نے اپنی جامع صحیح میں ایمان کی تعریف قول و فعل سے کی ہے کہ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ حدیث ملبہ النزاع کا حکم نماز کے اجزاء فعلیہ کو شامل ہے' قولیہ کو نہیں' چنانچہ دیگر دلائل سے یہی ظاہر ہے۔

(۱) آنحضرت ﷺ نے قرآت میں کئی بار سہو کیا تو کسی بار آپ ﷺ سے سجدہ کرنا ثابت نہ ہوا۔ اگر ہوتا تو ضرور نقل ہوتا' لیکن منقول نہیں۔

(۲) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے قولی سہو ہوا تو سجدہ سہو آپ سے صادر نہ ہوا' حالانکہ آپ حدیث زیر بحث کے راوی تھے۔

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ نے سہو قولیہ میں سجدہ سہو نہیں کیا۔ چنانچہ تلخیص الحبیر بیان سجدہ سہو میں یہ روایت درج ہے' طبرانی نے کبیر میں نقل کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ظہر اور عصر میں قرآت بھول کر جہر پڑھی تو اس پر سجدہ سہو نہ کیا۔

پس ثابت ہوا کہ زبانی سہو صادر ہو تو اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہے۔ سجدہ سہو' فعلی سہو پر مشروع ہے۔ چنانچہ اس کی تائید مندرجہ ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔ جو تلخیص الحبیر کے باب سہو میں ہے' امام رافعی سے امام حافظ ابن حجر یہ حدیث نقل کرتے ہیں : روی انه صلی اللّٰه علیه وسلم قال لا سهو الا فی قیام عن جلوس وجلوس عن قیام۔ (رواہ الدار قطنی والامام البیهقی من حدیث ابن عمر رضی اللّٰه عنه) یعنی "جناب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجدہ سہو نماز میں کسی سہو پر لازم نہیں آتا' مگر ان صورتوں میں کہ بیٹھنے کی بجائے کھڑا ہو جائے اور کھڑا ہونے کی بجائے بیٹھ جائے تو پھر سجدہ سہو کرے۔"

حافظ ابن حجر نے اس روایت کی تضعیف تو بیان کر دی ہے' مگر اس کی تائید وشہادت دیگر روایتوں سے کر کے اس کی اصل شرعی کو ثابت رکھا ہے۔ اصل شرعی یہ کہ نماز کے اجزاء فعلیہ میں کمی بیشی سہواً ہو جائے تو اگر وہ رکن کے متعلق ہے تو اس کی قضا کر کے سجدہ سہو کرے' اگر رکن نہ ہو محض واجب یا مسنون ہو تو سجدہ سہو سے تلافی مافات ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے واقعات سہو سے یہ اصل ثابت ہے اور حدیث منقولہ لا سهو الا فی قیام عن جلوس سے اس کی مزید تاکید ہوتی ہے۔

باقی رہا نماز کے اجزاء قولیہ کا سہو مثلاً قرآت' تکبیر' تسبیح' درود اور تشہد وغیرہ میں سہو واقع ہو تو معاف ہے' کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس بارہ میں سجدہ سہو کرنا ثابت نہیں ہے۔

سجدہ سہو' انواع فعلیہ سے ہے' اس سے اجزائے فعلیہ کی ہی تلافی ہو سکتی ہے۔ اجزائے قولیہ کی نہیں' اگر شارع انواع قولیہ کی قسم کا کوئی طریقہ مقرر کر دیتے تو مناسب ہوتا' لیکن شارع نے اس سے سکوت کیا ہے تو یہ معافی کے دائرے میں داخل ہوا۔ حدیث میں آیا ہے : وما سکت عنه فهو عفو "جس چیز کے بیان سے شارع سکوت کر جائے تو وہ امت

کے لیے معاف ہے۔"

قاری صاحب نے جو حدیث بیان کی ہے وہ ضعیف ہے اور مخصوص البعض ہے تو امام رافعی کی پیش کردہ حدیث اس عام کی مخصص ہو جائے گی' ظنی دلیل کی ظنی دلیل سے تخصیص بلاتفاق جائز ہے۔ موطا امام مالک کی ایک روایت ہے (یعنی نماز میں میرے سہو کی حکمت الٰہی یہ ہے کہ امت کے سہو میں نمونہ بن جائے)۔ اس روایت کی رو سے ہم اسوہ حسنہ نبویہ میں غور و فکر کرتے ہیں' تو اجزائے فعلیہ کے سہو میں سجدہ سہو کا ثبوت ملتا ہے اور اجزائے قولیہ میں نہیں ملتا تو یہ سہو معاف ہے۔

وہ جو نماز میں زیادتی و نقصان اور شک و نسیان میں سجدہ سہو کا حکم آیا ہے' اس کے سیاق وسباق پر غور و تدبر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اجزائے فعلیہ سے مخصوص ہے۔ آیت اور حدیث کو ہمیشہ شان نزول اور مورد کے لحاظ سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ جب قرآن ایک ہے' سب کا نبی ایک ہے اور قبلہ ایک ہے تو پھر اس امت میں اختلافات وافتراق کیسے واقع ہو جائے گا؟ انہوں نے فرمایا کہ اے امیرالمومنین! ہمارے سامنے قرآن نازل ہوا' ہم اس کا شان نزول اور مورد جانتے ہیں اور اس کو اس کے مورد کے لحاظ سے سمجھتے ہیں' ہمارے بعد جو لوگ ہوں گے وہ آیتوں کے مورد سے ناواقف ہوں گے' اور آیت قرآنیہ کو اپنی رائے سے سمجھیں گے' جس سے ان میں مختلف آراء کی وجہ سے افتراق پیدا ہوگا۔

عہد فاروقی میں ایک عورت اپنے غلام سے مجامعت کرایا کرتی' جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا' تو انہوں نے اس عورت سے باز پرس کی۔ اس نے آیت وما ملکت ایمانکم پڑھ کر اس کے عموم سے اسی طرح استدلال کیا جس طرح ہمارے یہاں قاری صاحب نے کیا ہے۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو زجر کیا اور فرمایا "اس سے خاص لونڈیاں مراد ہیں' غلام وغیرہ ہر مملوک مراد نہیں ہے۔"

میاں قاری صاحب تو عموم کے قاعدہ سے شاید حیوانات (گدھی وغیرہ) بھی مراد لے سکتے ہیں' مگر عموم کی یہ مراد تفسیر بالرائے قرار پائے گی' کیونکہ یہ مطلب مورد کے خلاف ہے۔ ٹھیک اسی طرح حدیث کے عموم کو سمجھ لیں کہ یہ نماز کی جز فعلی پر جملہ بولا گیا تھا تو اس کا عموم اپنے انواع فعلیہ میں ہوگا' اجزائے قولیہ کو شامل نہیں کیونکہ اس پر عہد نبوی میں تعامل

نہیں ہوا۔ باوجود حاجت و ضرورت کے کسی چیز پر تعامل نہ ہو تو وہ بدعت ہوتی ہے' اس سے بچنا چاہئے۔ یا اگر حکم شرعی ہے تو اس کا ثبوت پیش کریں۔

اچھا اگر میاں قاری صاحب نے حدیث کا مدلل عام' ہر جزو نماز کے لئے قائم رکھنا ہے تو پھر وہ ہی بتائیں کہ مندرجہ ذیل صورتوں میں ناسی پر سہو ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل توجروا عنداللّٰہ الجلیل

(۱) رفع یدین سنت موکدہ ہے اور جلسہ استراحت اور تورک بھی سنت ہے' یہ اگر سہواً رہ جائے تو سجدہ سہو لازم ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہو تو عموم باطل ہوا اور اگر سجدہ سہو لازم کہو تو یہ اجماع کے خلاف ہے۔

(۲) اگر کسی نمازی نے آخری تشہد کے بعد درود نہ پڑھا یا جن چیزوں سے تعوذ کرنے کا حدیث میں حکم وارد ہے' جن کو پڑھنا امام ابن حزم واجب قرار دیتے ہیں' اس نے وہ اعوذ نہ پڑھا یا دعا اللّٰھم انی ظلمت نفسی نہ پڑھی یا سمع اللّٰہ کے بعد ربنا لک الحمد نہ پڑھا' یا دو سجدوں کے درمیان کی دعا نہ پڑھی تو اس پر سجدہ سہو لازم ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو عموم دلیل کا قائم نہ رہا اور اگر سجدہ سہو ہے تو یہ اجماع کے خلاف ہے۔

(۳) اگر کسی نے ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھی یا رکوع کے بعد قومہ میں ہاتھ باندھ لئے' یا سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی صورۃ ضم نہ کی یا ظہر میں قرأت جہر سے کر دی اور عشاء میں قرأت میں اخفاء کیا یا سلام دو کی بجائے ایک طرف پھیر دیا تو ان صورتوں میں سہو ہے یا نہیں؟

بندہ عارف حصاری گوجرانوالہ روڈ اور گوندانوالہ کی پوری پارٹی کو ڈنکے کی چوٹ چیلنج کرتا ہے کہ سب پارٹی کے علماء جمع ہو کر کوئی ایک مرفوع حدیث صحیح پیش کر دیں' جس سے یہ ثابت ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے محض قرأت یا کسی ذکر یا درود کے سہو پر سجدہ سہو کیا ہو۔ اگر پیش کر دیں گے تو ہم اپنا تعاقب واپس لے لیں گے اور قاری صاحب اور ان کے حواریوں کے علم کا اعتراف کر لیں گے' مگر انشاء اللہ ہرگز پیش نہ کر سکیں گے۔

قاری صاحب کا یہ کہنا کہ قعدہ میں تشہد پڑھا جاتا ہے تو یہ سجدہ سہو کا عدم قرأت کی وجہ سے ہوا' سراسر غلط ہے۔ حدیث کے الفاظ بندہ نقل کر چکا ہے کہ یہ سجدہ سہو جلوس کے نسیان کی وجہ سے ہوا۔ اس جلوس کو بعض نے واجب کہا ہے اور بعض نے مسنون۔ بہر صورت اس فعلی سہو پر سجدہ سہو ہوا ہے۔ یہ قعدہ ایک الگ فعل ہے اور تشہد پڑھنا الگ

نوع قول ہے۔ گو قعدہ تشہد کا ظرف ہے مگر مستقل ایک فعل ہے۔ گو اس میں قرأت پڑھی جاتی ہے۔ رکوع' الگ ایک فعل نماز کا ہے' اگرچہ تسبیح کا ظرف ہے۔ اسی طرح سجدہ مستقل نماز کے اجزاء فعلیہ سے ہے گو اس میں تسبیح پڑھی جاتی ہے۔

پس اس اجزاء فعلیہ سے جس میں نسیان واقع ہو گا' اسی پر حکم مرتب ہو گا۔ کسی فعلی سہو پر سجدہ سہو کا ہونا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ یہ قرأت یا ذکر الٰہی کے سہو پر سجدہ سہو لازم آیا ہے۔ ایسا سمجھنا علمائے گوجرنوالہ کی عدم فقاہت پر دلیل ہے۔ اچھا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قعدہ میں تشہد ہے۔ جب سہو ہوا تو دونوں کی وجہ سے ہوا' تو پھر اس مسئلہ کا دوسرا موضوع قائم ہو جائے گا اور یوں کہا جائے گا کہ جب کوئی قرأت یا ذکر الٰہی یا درود نماز کے کسی فعلی جز کے ساتھ ہی نسیان سے فوت ہو جائے تو اسی وقت سجدہ سہو کرنا چاہئے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اگر کسی فعلی جز میں نسیان واقع نہ ہو' بلکہ محض قرأت میں یا ذکر الٰہی میں یا درود شریف یا تشہد اول میں نسیان واقع ہو تو اس پر سجدہ سہو کا شارع سے ثابت نہیں ہے تو پھر قاری صاحب یا ان کے حواری حضرات کے پاس کون سی دلیل ہے' جس سے یہ مسئلہ ثابت ہو' اور نزاع اسی میں ہے اور یہی موضوع بحث بھی ہے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

اصل بنائے بحث جناب مولانا مفتی صاحب گوندلوی کا یہ فتویٰ کہ اگر قعدہ اولیٰ میں بھول کر درود پڑھا جائے تو اس پر سجدہ سہو کرنا چاہئے کیونکہ حدیث میں ہر کمی وبیشی پر سجدہ سہو کرنا لازم ہو گا۔

میرے اس تعاقب پر کوئی مولوی سیف اللہ صاحب حضرت مفتی صاحب کی وکالت کرنے لگے اور موضوع سے خارج بے محل دلیلیں لانے لگے۔ مسئلہ مابہ النزاع پر ان کی ایک دلیل بھی ناطق نہیں ہے' کیا خوب استدلال ہے کہ آنحضرت ﷺ قعدہ اولیٰ بھول گئے تو اس پر آپ نے سجدہ سہو کیا۔

بھلا اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ قعدہ اولیٰ میں درود پڑھا جائے تو سجدہ سہو کرنا چاہئے۔ دعویٰ یہ کہ بھول سے قعدہ اول میں درود پڑھا جائے تو سجدہ سہو کرو' اور دلیل یہ کہ محمد ﷺ قعدہ کرنا بھول گئے تھے تو آپ ﷺ نے سجدہ سہو کیا۔ یہ ایسا ہی جیسے کوئی کہے کہ زمین گول ہے' کیونکہ چاول سفید ہے۔

تعاقب قاری: حضرت عائشہ کی مرفوعاً حدیث بھی اس کی مورد ہے جس کو ابویعلی ابن عدی اور بیہقی نے روایت کیا: سجدتا السہو تجزیان من کل زیادۃ ونقصان۔

برہان حصاری: جناب قاری صاحب

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

جناب قاری صاحب کی تلوار بالکل کند ہو کر رہ گئی ہے' کیونکہ اس دلیل کا دعویٰ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حدیث پیش کردہ کے معنی یہ ہیں کہ سہو کے دو سجدے ہر زیادت ونقصان سے کفایت کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر نماز میں متعدد سہو واقع ہوں' کسی میں زیادت اور کسی میں نقصان ہو تو صرف دو سجدے سہو کے ہی کافی ہوں گے' ہر چیز کے سہو کے لئے الگ الگ دو دو سجدے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے آئندہ آنے والی روایت جو ثوبان سے مروی ہے' تردید ہو گئی اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ فلاں فلاں زیادت یا نقصان سے سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ اگر لفظ کل کے عموم سے سمجھا جائے تو غلط سمجھا ہے' کیونکہ ہر حدیث کا مطلب دیگر احادیث متعلقہ سے ملا کر مراد لینا چاہئے' ورنہ ظاہر حدیث کا تو یہ مطلب بھی بن سکتا ہے' کہ اگر نماز کی ایک یا دو رکعت بھول سے رہ جائیں تو بس دو سجدے سہو کے کر لو کافی ہیں' اس کا کوئی بھی قائل نہیں کیونکہ جو رکعت بھول سے رہ جائے پھر خبردار ہونے پر پوری کرنی پڑتی ہے۔ اصل مطلب ہر زیادت ونقصان سے' رکعتوں کا نقصان وزیادت مراد ہیں' تو یہ عموم نماز کے اجزائے فعلیہ کو محیط ہے اجزائے قولیہ کو نہیں' کیونکہ ان کی نوعیت فعلیہ سے الگ ہے۔ سجدہ سہو چونکہ خود انواع فعلیہ سے ہے اس لئے یہ بھی فعلیہ ہی کو شامل ہو گا۔

تعاقب قاری: ثوبان کی حدیث ہے' جس کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے: لکل سہو سجدتان اس کی شاہد ہے۔ یہ حدیث اگرچہ مختلف فیہ ہے لیکن بخاری کی نظر میں صحیح ہے' کیونکہ اسماعیل بن عیاش نے اس حدیث کو شامیوں سے روایت کیا ہے۔ جب وہ شامیوں سے روایت کرے اس وقت اس کی حدیث بخاری کے نزدیک صحیح ہے' جیسا کہ عون المعبود میں ہے کہ "یہ دونوں احادیث اپنے عموم سے ذکر الٰہی اور قرأت کو شامل ہے۔"

برہان حصاری : میاں قاری صاحب نے سابقہ روایت کا ماخذ بتایا اور نہ اسناد کی حالت بیان کی۔ لیکن اس حدیث کو اپنی قوی دلیل پیش کر کے اس پر جرح کا اعتراض رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ بے سود اور لغو ہے کیونکہ اس روایت کی نہ اسناد صحیح ہے اور نہ متن کی روایت درست ہے۔ مسائل کی تحقیق میں علم کامل اور مہارت تامہ اور فقاہت شرط ہے۔ مقولہ ہے : "یک من علم را دو من عقل باید۔"

میاں قاری صاحب اس معاملہ میں بالکل صفر ہیں۔ ابوداؤد کی حدیث جو نہی عن اکل الضب میں وارد ہے' اس میں اسماعیل بن عیاش ہے جو شامیوں سے روایت کرتا ہے۔ عون المعبود میں اسماعیل کی تضعیف کی گئی ہے۔ حافظ ابن حجر جو فن جرح میں بڑے ماہر اور مسلم ہیں' وہ بلوغ المرام میں اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں : بسند ضعیف "کہ ابوداؤد اور ابن ماجہ کی اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔"

امام ذہبی نے میزان میں اسماعیل کے بارہ میں سب اقوال محدثین نقل کر کے ابوداؤد کی روایت نقل کر کے جس میں نہی عن اکل الضب کا ذکر ہے' درج کی ہے اس پر یہ لکھا ہے : ھذا منکر "یہ حدیث منکر ہے" حالانکہ اس میں اسماعیل بن عیاش راوی ہے جو شامیوں سے روایت کرتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ جب راوی مجروح ہو اور اس کو بعض محدثین نے کسی صورت میں قابل قبول ٹھہرایا ہو لیکن اس کی بیان کردہ حدیث میں نقص ہو تو وہ ضعیف ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میاں قاری صاحب کی پیش کردہ حدیث کا بھی یہی حال ہے کہ کچھ راوی میں نقص ہے۔ جب دو نقص موجود ہیں تو روایت کے ضعیف ہونے میں شبہ نہ رہا' تو اس کو شاہد بنا کر پیش کرنا عبث ہے' العبث حرام۔

اب اس کی تفصیل ملاحظہ ہو' اور پھر اپنے مفتی صاحب کے پاس بیٹھ کر مزید تحقیق کیجئے۔

اسماعیل بن عیاش کو اگرچہ بعض محدثین امام بخاری وغیرہ نے شامیوں سے روایت کرنے پر اس کی روایت کو صحیح اور اس کو ثقہ کہا ہے۔ مگر دیگر محدثین نے علی الاطلاق مجروح قرار دیا ہے۔ میزان میں ہے : قال ابن خزیمہ لا یحتج بہ۔ "امام ابن خزیمہ نے کہا ہے کہ اسماعیل قابل حجت نہیں۔"

حافظ ابن حجر نے تخریج ہدایہ باب سجود السھو میں حدیث ثوبان پر لکھا ہے: وفی اسنادہ اختلاف "کہ اس راوی کی اسناد میں ائمہ کا اختلاف ہے" اور اختلاف کو خود قاری صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے۔ تو پھر ایسی مخدوش اسناد پر حکم مرتب کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

سبل السلام میں ہے: فیہ اسماعیل بن عیاش وفیہ مقال وخلاف۔ "امام ابن حجر نے کہا ہے کہ اس سند میں اسماعیل ہے اور اس میں جرح ہے اور اختلاف ہے۔" میزان میں ایک روایت نقل کی ہے جو اسماعیل سے ہے' اس پر لکھا ہے: وقال ابن حبان ھذا باطل۔ "اسماعیل کی یہ روایت باطل ہے۔" اس سے ظاہر ہے کہ یہ راوی باطل روایتیں بھی کیا کرتا تھا۔

میزان میں ہے: قال ابن حبان کثیر الخطاء فی حدیثہ فخرج عن حد الاحتجاج بہ۔ "امام ابن حبان نے کہا کہ اسماعیل حدیث میں بہت خطا کرتا ہے یہ احتجاج کی حد سے خارج ہوا۔" نیز میزان میں ہے کہ ابو صالح فراء نے کہا ہے کہ میں نے ابو اسحاق فزاری سے کہا کہ میں نے مکہ کی طرف جانے کا ارادہ کیا اور اثنائے سفر میں اسماعیل سے ملنے کا ارادہ کیا تاکہ ان سے کوئی حدیث سنوں۔ ابو اسحاق نے کہا کہ ذاک رجل لا یدری ما یخرج من رأسہ "وہ ایسا شخص ہے جسے یہ علم نہیں کہ میرے دماغ سے کیا نکل رہا ہے؟

عبداللہ بن احمد نے اپنے باپ سے اسماعیل کی یہ حدیث پیش کر کے سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: ھذا باطل "یہ روایت باطل ہے۔"

امام ابو اسحاق نے کہا ہے کہ لا تکتبوا عن اسماعیل بن عیاش عمن یعرف ولا عن من لا یعرف۔ "اسماعیل سے سن کر کوئی حدیث نہ لکھو' خواہ وہ معروف شخص سے بیان کرے یا غیر معروف سے۔"

الحاصل اسماعیل ضعیف ہے اور اس کی ایسی حدیث جس کا متن روایت کی رو سے صحیح نہ ہو' قابل قبول نہیں ہے۔ چنانچہ اسماعیل مخدوش راوی کی اس روایت کا بھی یہی حال ہے۔ کیونکہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر سہو کے لئے دو سجدے کرنے چاہئیں۔ مثلاً کسی نماز میں نمازی سے متعدد سہو واقع ہوئے تو نمازی ہر سہو کے بدلے میں دو دو سجدے حساب سے کرے۔ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور یہ کلمہ دیگر صحیح روایتوں کے خلاف ہے۔ چنانچہ واقعہ حدیث ذوالیدین میں آنحضرت ﷺ نے صرف دو سجدے کئے۔ یہ حدیث ثوبان کی ہر سہو کے لئے دو سجدے کرنے کا حکم دے رہی ہے۔ تو یہ اسماعیل راوی کی روایت منکر

ہے

چنانچہ فتح الربانی شرح مسند احمد میں امام بیہقی سے منقول ہے: قال البیهقی فیه اسماعیل فیه ضعف وحدیث ابی هریرة وعمران وغیرهما فی اجتماع علد سهو عن النبی صلی الله علیه وسلم اقتصارا علی السجدتین یخالف هذا۔ "حدیث ابوہریرہ وعمران وغیرہ میں جو نبی کریم ﷺ سے سہو کے بارے میں مروی ہیں' ان میں کئی سہو جمع ہونے کا ذکر ہے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے ان حالتوں میں صرف دو سجدوں پر اکتفا کیا۔" تو یہ روایت اسماعیل کی ان جمیع حدیث کے خلاف ہے۔ تفرد اسماعیل بن عیاش ولیس بالقوی وهذه علة ضعیفة جملة اوجه۔ "اس حدیث کے بیان کرنے میں اسماعیل بن عیاش متفرد ہے اور وہ حدیث میں قوی نہیں ہے۔" اور بڑی وجہ اس جملہ کے ضعیف ہونے کی یہی علت ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اس دلیل کے کئی جواب ہیں: اول' یہ کہ اسماعیل ضعیف ہے اور حدیث میں قوی نہیں' بلکہ باطل روایتیں بیان کرتا ہے۔

دوم' یہ کہ اس جملہ کے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ ضعیف راوی جب کسی روایت کے بیان کرنے میں منفرد ہو تو وہ روایت منکر ہو جاتی ہے۔ جیسے نهی عن اکل الضب کی روایت منکر ہے' وہ بھی اسماعیل کی ہی ہے۔

سوم' یہ کہ اس روایت کا متن صحیح نہیں ہے' کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور عمران وغیرہ کی صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ متعدد سہو ہوں تو دو سجدے سہو کے کافی ہیں۔ پھر ہر سہو کے دو دو سجدے کرنے خلاف شرع ہیں۔

چہارم' یہ کہ یہ حدیث پہلی حدیث سے متعارض ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر سہو کے لئے دو سجدے ہیں۔ مثلاً ایک نمازی نے قعدہ اولیٰ نہ کیا اور پھر بھول کر کسی رکعت میں تین سجدے کر لے تو اس حدیث کی رو سے چار سجدے کرے اور پہلی حدیث جو ابو یعلی وغیرہ سے نقل کی ہے جو اس سے پہلے گزری ہے' اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر سہو کے لئے دو سجدے کفایت کرتے ہیں۔ پس دونوں روایتوں میں تعارض ہوا۔ اور قانون یہ ہے: اذا تعارضا تساقطا "دو دلیلیں متعارض ہوں تو وہ ساقط ہو جاتی ہیں۔" لہٰذا یہ دونوں دلیلیں ساقط ہو گئیں۔

میاں قاری صاحب تو یہ کہتے تھے کہ ہر دو احادیث کے عموم سے ہمارا مدعا ثابت ہوا' لیکن اصل میں دونوں دلیلیں باہم مخالف ہو کر گر گئیں۔ "نہ بانس رہا نہ بانسری۔" تو اب دعویٰ خارج ہوا اور وکالت باطل ہو گئی۔

پنجم' یہ کہ سبل السلام میں لکھا ہے کہ اس روایت سے متعدد سہو ہونے پر سجدہ سہو بھی متعدد کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ان صحیح روایتوں کے خلاف ہے' جو ذوالیدین وغیرہ کے حصہ میں وارد ہیں۔ اصل حکم یہ ہے کہ سجدہ سہو انہی مواضع نماز میں کرنا چاہئے' جن میں آنحضرت ﷺ نے کیا ہے اور کئی دفعہ نماز میں نسیان ہو تو صرف دو سجدے کافی ہیں۔

ششم' یہ کہ جواب یہ ہے کہ ہم اس دلیل پر چند صورتیں پیش کر کے نقض کرتے ہیں کہ ہر سہو پر دو سجدے سہو کے نہیں کرنے چاہئیں۔

اول' یہ کہ اگر قاری نماز میں قرآت کرے اور اثنائے قرآت میں کوئی آیت سہواً چھوٹ جائے تو اس پر سجدہ سہو نہیں ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل احادیث دلالت کرتی ہیں :

(ا) مسند احمد (مع شرح) کے باب الفتح علی الامام میں حدیث مذکور ہے' جو عبدالرحمٰن بن ابزیٰ نے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فجر کی نماز پڑھی : فترک آیة فلما صلی قال افی القوم ابی بن کعب؟ قال ابی یا رسول اللّٰه انسخت آیة کذا او نسیتها قال نسیتها۔ "آنحضرت ﷺ قرآت کرتے ہوئے ایک آیت بھول گئے' جب نماز پڑھ چکے تو فرمایا کہ قوم میں سے ابی بن کعب موجود ہے۔ تب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا' اے اللہ کے رسول! آپ فلاں آیت چھوڑ گئے تھے' وہ منسوخ ہو گئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ آیت بھول گیا تھا۔"

اگر ہر بھول پر سجدہ سہو لازم ہوتا تو آپ اور دیگر صحابہ جو مقتدی تھے سب سجدہ سہو کرتے اور عبدالرحمٰن جو قصہ کا راوی ہے ضرور اس کو بیان کرتے لیکن اس نے ذکر تک نہ کیا تو حدیث کے مفہوم سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے سجدہ نہ کیا اور اس پر آئندہ کے لئے یہ مسئلہ بتایا کہ اگر کوئی قرآت میں آیت چھوڑ جائے تو سجدہ سہو کرے۔ اہل علم کا قانون ہے کہ تاخیر البیان عند الحاجة لا یجوز "جب حاجت درپیش ہو' تو پھر اس مسئلہ کے بیان میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے۔" اگر آیت کے بھولنے پر سجدہ لازم ہوتا تو آپ قولاً یا فعلاً اس کا بیان فرما دیتے۔ اچھا اگر اس وقت بیان نہ کیا تو کسی دوسرے وقت ہی اس کا حکم

ظاہر کر دیتے۔ لیکن سرے سے اس کی بابت کوئی حکم منقول ہی نہیں ہے تو یہ سہو معاف ہے۔

اس سے یہ اصول لیا گیا ہے کہ نماز کے اجزا قولیہ میں سے کسی جز میں نسیان واقع ہو تو اس میں سجدہ سہو نہیں ہے۔ لانہ لم ینقل۔ اس حدیث کے مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کو آیت کا ترک ہونا محسوس ہو گیا تھا۔ جب محسوس ہو گیا تھا تو سجدہ سہو کلام سے پہلے کرنا چاہئے تھا' اگر محسوس نہ تھا تو سوال کیوں کیا؟

یہ سوال وجواب اسی وجہ سے تھے کہ سجدہ سہو آنحضرت ﷺ کے ذمہ نہ تھا۔ ورنہ قبل از سلام یا شبہ پر بعد از تصدیق علم ہونے پر سجدہ سہو ضرور کرتے' اذ لیس فلیس۔

(۲) دوسری روایت عبداللہ بن سائب سے آئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یوم فتح مکہ میں صبح کی نماز شروع کی فقرأ سورة المؤمنین' فلما بلغ ذکر موسٰی وھارون فاصابة سعلة فترک۔ "نبی کریم ﷺ نے سورہ مومنون پڑھنی شروع کی' جب ذکر موسیٰ اور ہارون پر پہنچے تو کھانسی شروع ہو گئی' تب آپ ﷺ نے قرأت ترک کر دی۔"

اس باب میں اس کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پوری سورت پڑھنے کا ارادہ ہو اور پھر کسی عارضہ کے سبب سے قرأت چھوڑ دے تو اس پر سجدہ سہو نہیں ہے' فتفکر۔

(۳) تیسری روایت مسند احمد میں ہے کہ مسورہ بن یزید سے روایت ہے کہ صلّٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وترک آیة فقال لہ رجل یا رسول اللہ اترکت آیة کذا وکذا قال فھلا ذکرتنیھا۔ "رسول اللہ ﷺ نماز میں ایک آیت چھوڑ گئے' آپ ﷺ سے ایک شخص نے کہا' آپ فلاں فلاں آیت قرأت میں چھوڑ گئے ہیں' اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا' پھر تم نے مجھے کیوں نہ یاد دلائی؟"

پہلی حدیث اور اس حدیث سے ایک تو یہ ظاہر ہوا کہ نبی کریم ﷺ غیب داں نہ تھے' اس لئے بھول گئے' عمداً چھوڑنا جائز نہ تھا۔ دوسرا یہ مسئلہ ظاہر ہوا کہ قرأت بھول جائے تو اس پر سجدہ سہو نہیں ہے' ورنہ یاد دلانے پر آپ فوراً سجدہ سہو کرتے اور کلام نہ کرتے۔

راوی نے آپ کے کلام کو نقل کر دیا' سجدہ سہو نقل نہ کیا۔ کیونکہ وہ پایا نہ گیا اور نہ آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر سجدہ سہو کا حکم فرمایا۔ جس سے ثابت ہوا کہ اذکار کے سہو میں سجدہ سہو نہیں ہے۔ امام ابن حزم نے احکام الاحکام ص۷۵' ج۱ میں یہ لکھا ہے: ان

تاخیر البیان عن وقت العمل البتة ولا یجوز ان یوخرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم دروده علیہ طرفة عین ولسنا نقول لهذا لان النقل یمنع من ذالک۔ "جب عمل کے ایجاب کا وقت ہو تو نبی کریم ﷺ پر تاخیر بیان جائز نہیں ہے' جبکہ آپ ﷺ پر ہر ضرورت کے وقت وحی نازل ہوتی تھی اور ہم ایسی بات کے قائل ہیں کہ عمل کے واجب ہونے کا وقت اور نبی ﷺ اس کے بیان میں تاخیر فرمائیں اور نہ عقل ہی اس کو تسلیم کرتی ہے۔"

یہاں یہ قاعدہ نہیں چل سکتا ہے کہ عدم ذکر نفی کو مستلزم نہیں ہے بلکہ یہ قاعدہ چلے گا کہ جب ایک چیز کے بیان کا موقع تھا اور اس کے ذکر کی حاجت تھی پھر اس سے سکوت اور تاخیر جائز نہ تھا۔ یہ عدم ذکر اس بات کو مستلزم ہے کہ ایسی بھول معاف ہے' اس بھول پر سجدہ سہو نہیں ہے۔ ارشاد الفحول میں ہے کہ "جب کوئی فعل مسترد ہو تو اس میں بیان کی تاخیر جائز نہیں ہے۔" جب آیت کی بھول پر سجدہ سہو کیا یا نہیں اور کرنا چاہئے یا نہیں؟ تو اس تردد کا رفع ضروری تھا۔ جب شارع نے سکوت کیا' تو یہ قانون جاری ہوا۔ وما سکت عنہ فهو معفوا۔ "جس چیز سے شارع سکوت کرے وہ معاف ہے۔" پس یہاں سجدہ سہو معاف تھا۔

(۴) "مدونہ" امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نماز میں بھول کر قرأت چھوڑ دی' بعد نماز کے مقتدیوں نے یاد دلایا تو اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ رکوع سجود کیسے ہوئے؟ تب آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

یہ بظاہر اثر ہے اور مرفوع کا حکم رکھتا ہے کہ عبادات میں قیاس کو دخل نہیں ہے۔ اس سے پچھلی دونوں روایتوں کی بھی صراحت ہو گئی کہ آنحضرت ﷺ نے قرأت کی بھول میں اس لئے سجدہ سہو نہ کیا کہ ایسی بھول میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو عموماً نماز باجماعت کے پابند تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے بھول کے واقعہ سے ہی یہ سبق حاصل کیا کہ قرأت کی بھول سے کچھ حرج واقع نہیں ہوتا' کیونکہ یہ بھول نماز کے انواع فعلیہ میں سے نہیں ہے۔

(۵) تلخیص الحبیر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا گیا ہے: ان انسا جهر فی الظهر والعصر فلم یسجد۔ "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ظہر اور عصر میں جہر سے قرأت کی' تو سجدہ سہو نہ کیا۔" اس سے ظاہر ہے کہ قولی سہو میں سجدہ نہیں ہے۔

(۶) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ سہو صرف جلوس کے قیام یا مقام سے جلوس سرزد ہونے پر ہے ورنہ کسی سہو پر سجدہ نہیں ہے۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ سجدہ اجزا فعلیہ ہے قولیہ میں نہیں ہے۔ اگر کوئی کہے کہ پھر رکوع اور سجدہ میں سہو ہو تو سجدہ سہو نہ کرنا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رکوع قیام سے ملحق ہے اور سجدہ جلوس سے اس لئے یہ اجزا فعلیہ سے ہیں' ان کے سہو پر سجدہ ہے۔ نیز جب سجدہ میں سہو یا رکوع میں سہو ہو تو پھر اعادہ کرنا ہو گا۔ اعادہ میں قیام اور رکوع اور جلسہ میں زیادتی ہو گئی تو سجدہ قیام اور جلوس سے ہونا لازم آگیا' فتذکروا۔

(۷) نیز تلخیص باب سجود سہو میں ہے : انه صلی اللّٰه علیه وسلم فعل الفعل القلیل فی الصلوة ورخص فیه ولم یسجد علیه للسهو لا امربه وفی الباب قبله عدة الاحادیث تشهد لذلک "نبی کریم ﷺ نے نماز میں بھول سے فعل قلیل کیا' تو اس میں رخصت دی اور سجدہ سہو نہ کیا اور نہ سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اس بارہ میں بہت احادیث وارد ہیں' جو اس بات پر شاہد ہیں کہ فعل یسیر پر بھی سجدہ سہو نہیں ہے۔"

مثلاً قعدہ اولیٰ میں کچھ کھڑا ہوا' پھر کسی نے سبحان اللہ کہا اور وہ بیٹھنے کے قریب تھا' پھر بیٹھ گیا تو حدیث میں ہے کہ اس پر سجدہ سہو نہیں ہے۔ یہ فعل قلیل ہے' پس کلیہ حدیث ثوبان کا باطل ہوا۔

(۸) نیل الاوطار جلد ثانی' ص ۲۰۰ میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں لوگوں کو نماز پڑھائی جس میں قرآت بالجھر کی تو بسم اللہ نہ پڑھی اور نہ نیچے جاتے وقت اور نہ اٹھتے وقت تکبیریں کہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے' تو انصار اور مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پکار کر کہا کہ آپ نے نماز کو ناقص کر دیا۔ بسم اللہ اور تکبیریں کہاں گئیں؟ پھر اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کو نماز پڑھاتے تو بسم اللہ بھی پڑھتے اور تکبیریں بھی کہتے رہتے تھے۔ (اخرجه الحاکم فی المستدرک وقال صحیح علی شرط مسلم)

اس روایت سے ثابت ہوا کہ ذکر اور قرآت کی کمی بیشی بھول سے ہو اور پھر ظاہر ہو تو اس پر سجدہ نہیں ہے۔ اگر سجدہ سہو کیا ہوتا' تو حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی حدیث اسے ضرور بیان کرتے۔ کیونکہ کسی فعل میں تردد ہو' تو تاخیر بیان جائز نہیں ہے۔ یہ موقع سجدہ کا ہوتا' تو

حضرت انس رضی اللہ عنہ اس کو ضرور ظاہر کرتے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کا خود عمل کہ ظہر' عصر میں قرآت جہر سے کی تو سجدہ سہو نہ کیا۔ یہ اس بات پر شاہد ہے کہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قولی سہو پر سجدہ سہو نہیں کرتے تھے۔

(۹) تلخیص میں ہے : وفیه ایضا حدیث معاویة بن الحکم فی ضرب الافخاذ فی الصلوة یسکت۔ "اس بارہ میں حدیث معاویہ بن الحکم وارد ہے کہ انہوں نے نماز میں اپنی رانوں پر ہاتھ مارے' تاکہ وہ کلام کرنے والوں کو خاموش کرائیں۔" ان پر سجدہ سہو لازم نہ آیا' کیونکہ یہ فعل یسیر تھا۔ پس کلیہ حدیث ثعبان کا بیکار ہوا۔

(۱۰) تلخیص میں منقول ہے کہ جهر فی العصر ولم یعدها ولم یسجد للسهو ولم ینکر عمله "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نماز عصر کی قرآت جہر سے کی تو پھر نہ اس نماز کا اعادہ کیا اور نہ سجدہ سہو کیا اور نہ اس پر کسی نے انکار کیا۔"

(۱۱) وتر میں دعا قنوت پڑھنا اکثر کا معمول بہ ہے اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دعائے قنوت سکھائی تھی کہ اس کو وتر کے آخر میں پڑھا کرو۔ چنانچہ یہ اکثر اہلحدیث کا معمول ہے کہ وہ وتروں میں پڑھتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بھول جائے تو کسی عامل بالحدیث کے نزدیک اس پر سجدہ سہو نہیں ہے' من ادعی فعلیه البیان۔

اہلحدیث کے نزدیک یہ مسئلہ مسلم ہے کہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں پہلی رکعت میں سورہ "سجدہ" اور دوسری میں "دہر" پڑھنی سنت ہے۔

بلوغ المرام میں طبرانی کی روایت سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں : یدیم علی ذلک۔ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ہمیشگی کرتے تھے۔" تو اب جو شخص صبح کی نماز میں جماعت کراتے وقت یہ سورتیں بھول جائے اور کوئی دوسری سورتیں پڑھ لے تو کیا اس پر سجدہ سہو ہے؟ اگر نہیں تو کلیہ باطل ہوا۔ اگر سجدہ سہو ہے تو یہ اجماع امت کے خلاف ہے' ولم یقل به احد۔

میاں قاری نے میرے پیش کردہ دلائل پر ایک بے محل قاعدہ استعمال کیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ بندہ نے اپنے تعاقب میں جو یہ دلیلیں پیش کی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآت بھول گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ سہو نہ کیا اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اذکار کے سہو میں سجدہ سہو کیا' تو اس پر قاری صاحب نے یہ اصول پیش کیا کہ عدم ذکر نفی کو مستلزم نہیں ہوتا' احتمال ہے کہ سجدہ سہو کیا ہو اور اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو لہٰذا استدلال ساقط ہے۔

میاں قاری صاحب کی اس نادانی کا جواب سنئے۔ مخفی نہ رہے کہ فرقہ اہل بدعت اپنی بدعات کے ثبوت میں یہ کہا کرتے ہیں کہ دلائل عامہ کی رو سے ہم کار خیر کرتے ہیں۔ قرآن وحدیث تعامل سلف صالح میں گو ان ناموں سے ان چیزوں کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن عدم ذکر سے ان چیزوں کی نفی لازم نہیں آتی ہے۔ ممکن ہے یہ کام ہوتے ہوں مگر ان کا ذکر نہ کیا گیا ہو' ہر چیز کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

مولانا مفتی گوندلوی صاحب نے ایک رسالہ بنام "الاصلاح" بدعات کی تردید میں شائع کیا ہے۔ اس میں شرعی بدعت کی تعریف پر بحث کرتے ہوئے سنت ترکیہ کا ذکر کرتے ہیں' اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں :

<u>قاعدہ عدم ذکر وسنت ترکیہ کی وضاحت :</u> ہر بدعت سنت ترکیہ کے خلاف ہوتی ہے۔ سنت ترکیہ کا مطلب یہ ہے کہ قرون اولیٰ میں کسی کام کے کرنے کا سبب موجود ہو اور اس کے کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو' اور بعد میں کوئی سبب پیدا ہو' جو اس کام کے کرنے کا مقتضی ہو۔ باوجود اس کے آنحضرت ﷺ کے عہد میں وہ فعل ثابت نہ ہو یعنی شریعت میں اس کے جواز پر قول و فعل یا تقریر سے کوئی دلیل قائم نہ ہو تو ایسے فعل کو ترک کرنا سنت ترکیہ کہلاتا ہے۔ جیسے عید میں اذان' آنحضرت ﷺ کے عہد میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ حالانکہ اذان کہنے کا سبب لوگوں کو آگاہ کرنا' اس وقت موجود تھا اور اذان کہنے کا سبب لوگوں کو آگاہ کرنا تھا اور اذان کہنے کا امر مانع بھی نہ تھا اور آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نیا سبب اذان کہنے کا پیدا بھی نہیں ہوا۔ اب اس صورت میں عید میں اذان کہنا سنت ترکیہ کے خلاف ہو گا۔

یہاں یہ قاعدہ نہیں چل سکتا کہ عدم نقل عدم واقعہ کو مستلزم نہیں ہے۔ یعنی یہاں نہیں کہا جا سکتا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے زمانہ میں ہر نماز کے ساتھ غسل ہوتا ہو' یا آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مردوں کی نفع رسانی کے لئے' قرآن خوانی ہوتی ہو' مگر نقل نہ ہوئی ہو۔

(۱) کیونکہ شریعت کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جو فعل جزو دین ہو وہ ہم تک نہ پہنچے۔

(۲) شرعی امور کے نقل کے اسباب اس قدر وافر ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی جزو

دین کا نقل سے اوجھل ہو جانا ممکن نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ظہر کی نماز کے لئے تین اذانیں مستحب ہیں' ہو سکتا ہے کہ پہلے زمانہ میں ان کا رواج ہو تو ہم قطعاً اس کو ہدایت عقل کے خلاف سمجھتے ہوئے بدعت کہیں گے۔ اور یہاں یہ بات کہ "عدم نقل عدم ذکر کو مستلزم نہیں" نہیں لکھی جا سکتی بلکہ کہنے والا بھی شرماتا ہے۔

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں : وترکہ صلی اللہ علیہ وسلم سنۃ کما ان فعلہ سنۃ فلیس لنا ان نسوی بین فعلہ وترکہ نناتی من الفعل فی الموضع الذی ترکہ بنظیر ما اتی بہ فی الموضع الذی فعلہ۔ "آنحضرت ﷺ کا کسی فعل کو چھوڑنا بھی سنت ہے جیسے اس کا کرنا سنت ہے۔ ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے فعل اور ترک کو برابر کر دیں۔ آپ ﷺ نے جہاں کوئی فعل چھوڑا ہے وہاں بھی اسی طرح کرنے لگیں جیسے کرنے کی جگہ ثابت ہے۔"

نیز یہ لکھا ہے کہ بدعات کیوں عام یا مطلق کے نیچے داخل نہیں یا کس طرح مستثنیٰ ہیں اور یہ عنوان قائم کر کے پھر اس پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ "نیا کام سرے سے عام یا مطلق کے نیچے داخل ہی نہیں ہوتا یا مستثنیٰ ہوتا ہے۔ عام یا مطلق کے نیچے نہ داخل ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدعتی ایک مباح کو سنت فرض یا واجب قرار دیتا ہے' اگر مباح کو مباح سمجھ کر کیا جائے تو وہ اباحت کی عام یا مطلق ادلہ کے نیچے درج ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو سنت یا واجب یا فرض سمجھ کر کیا جائے تو اس صورت میں وہ اباحت کی عام یا مطلق ادلہ سے خارج ہو جاتا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ جناب شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اپنی کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" میں فرماتے ہیں : ان کل ما یبدی المحدث لھذا من المصلحۃ او یستدل بہ من الادلۃ قد کان ثبت علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومع ھذا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فھذا الترک سنۃ خاصۃ مقدمۃ علی کل عموم وقیاس۔

اس عبارت کا خلاصہ بھی وہی ہے جو اوپر لکھا گیا ہے کہ اہل بدعت جو کسی مصلحت کی بنا پر یا کسی عام دلیل سے استدلال کر کے بدعات کا رواج دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ عہد نبوی میں وہ مصلحت اور دلیل موجود نہ تھی۔ بایں وجہ جناب رسول اللہ ﷺ نے وہ امور بدعیہ نہ کئے جو اہل بدعت التزام کے ساتھ کر رہے ہیں۔ تو ان بدعی کاموں کا ترک کرنا سنت ہے۔

خاصہ ہے جو عام دلیل اور قیاس پر مقدم ہے۔ پس اسی اصول کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ قرآت اور اذکار کے نسیان پر سجدہ سہو کرنا باوجود مقتضی ہونے اور دلیل عام پائی جانے کے آنحضرت ﷺ اور صحابہ نے نہ کیا تو یہ سنت ترکیہ ہے' جو دلیل عام اور قیاس پر مقدم ہے۔

پس اب جو لوگ اذکار مسنونہ یا قرآت مسنونہ کے بھولنے پر سجدہ سہو کریں گے وہ سنت کے تارک اور بدعتی متصور ہوں گے' کیونکہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے اور اس سنت ترکیہ کے مقابلہ میں قاعدہ عدم ذکر عدم وقوع کو مستلزم نہیں ہو گا۔

کشف الغمہ ص ۱۲۵ میں ہے : وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یترک تکبیرات الانتقالات فی بعض الاحیان ولم یکن یسجد التزامًا۔ "آنحضرت ﷺ بعض اوقات تکبیرات انتقال بھول کر چھوڑ جاتے' تو اس پر سجدہ سہو نہیں کیا کرتے تھے۔" اس حدیث سے حدیث ثعبان کا کلیہ غلط ہو گیا' پس یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو انتقالات کی تکبیریں بھول کر ترک کیں اور پھر سجدہ سہو نہ کیا تو انہوں نے بھی آنحضرت ﷺ کے اسی اسوہ حسنہ پر عمل کیا تھا' اہلحدیث کا بھی یہی مسلک ہے۔

نیز کشف الغمہ میں ہے : وکان الصحابة رضی اللہ عنہم لا یسجدون بترک سورة غیر الفاتحة ولا بجھر فی وقت الاسرار وعکسہ۔ "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فاتحہ کے سوا اگر قراۃ میں کوئی سورۃ پڑھنی بھول جاتے تو سجدہ سہو نہیں کرتے تھے اور سری نماز میں قرآت کرنے پر سجدہ سہو کیا کرتے تھے۔"

پس یہی ہمارا مسلک ہے' مگر حضرت حافظ صاحب اہل الرائے کی تائید کر رہے ہیں۔

نانڈلیانوالہ کے جلسے میں مفتی صاحب موصوف سے ملاقات ہوئی تو میں نے جناب سے دریافت کیا کہ رکوع کے بعد قومہ میں دونوں ہاتھ باندھنے کی بابت آپ کی کیا تحقیق ہے؟ تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ مسئلہ دونوں طرح ہی ٹھیک ہے۔ صریح دلیل نہ اس طرف ہے اور نہ اس طرف' جس طرح چاہے کوئی عمل کرے۔

بہت خوب! حالانکہ رکوع کے بعد قومہ میں ہاتھ باندھنے بدعت ہیں' کیونکہ آنحضرت

ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے اس کا ثبوت نہیں پایا گیا اور نہ اس پر سلف کا تعامل تھا اور نہ محدثین ہی نے کہیں حدیث کتب میں اس پر کوئی باب ہی باندھا اور نہ کوئی حدیث ذکر کی' یہ تو سنت ترکیہ کے قبیل سے ہے۔

مگر افسوس ہے کہ سندھ کے بعض اہلحدیث اس سنت ترکیہ کے تارک اور رکوع کے بعد وضع الیدین علی الصدر کی بدعت کے قائل وفاعل بن گئے ہیں۔ الحاصل نماز کی ہر بھول میں سجدہ سہو تعامل نبوی ﷺ وصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے ثابت نہیں ہے۔

"کشف الغمہ" میں ہے: وجهر سعيد بن العاص في صلوة الظهر وسبح الناس فمطٰى فلما قطٰى قال ان في كل صلوة قرأة فما حملني علٰى ذلك فيعرف السنة ولكني قرأت ناسيا فكرهت ان اقطع قرأة "حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک بار قرآت شروع کر دی تو اس پر مقتدیوں نے "سبحان اللہ" کہنا شروع کر دیا۔ مگر حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے اپنا عمل بدستور جاری رکھا۔ جب نماز پوری ادا کر لی تو لوگوں سے یہ کہا کہ تحقیق ہر نماز میں قراۃ ہے اور یہ سنت معروف ہے جو معلوم ہے کہ ظہر میں قرآت اسرار سے ہوتی ہے۔ پھر مجھے تجھے کس چیز نے جرأت دلائی کہ قرآت پھر سے کرنے لگوں۔ سو بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے بھول کے جہر سے قرآت شروع کر دی۔ پھر جب آگاہ ہوا تو میں نے قراۃ کا سلسلہ قطع کرنا مکروہ سمجھا۔" (کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا' اب قرآت پوری کر دوں۔)

میں کہتا ہوں کہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے اس نسیان پر سجدہ سہو نہیں کیا۔ سیاق کلام اسی پر دلیل ہے اور علامہ شعرانی نے یہی سمجھ کر ان کا ذکر کیا ہے۔

یہ موقع بیان کا تھا' راوی نے سجدہ سہو کا ذکر نہیں کیا' کیونکہ سجدہ سہو پایا نہیں گیا ورنہ راوی بیان ضرور کرتا۔ تو یہ سنت ترکیہ صحابہ ودیگر سلف میں رائج تھی کہ وہ اذکار وقرأت کی بھول میں سجدہ سہو نہ کرتے تھے۔

پھر امام شعرانی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ وابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ظہر وعصر میں بھول کر جہر سے قرآت کی' تو سجدہ سہو نہ کیا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ صحابہ نماز میں التفات کرنے' یا اپنے دل میں بات کرنے یا اذکار الٰہی میں سلسلہ درہم برہم ہونے پر سجدہ سہو نہ کیا کرتے تھے۔ ہاں البتہ ایک اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے پہلی رکعت میں مطلقاً قرآت نہ کی اور دوسری میں کی تو سجدہ سہو

کیا۔ مگر یہ روایت مرجوح ہے۔ امام مالک نے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نقل کیا وہ قرأت بھول گئے' تو اس پر انہوں نے فرمایا کہ جب رکوع' ٹھیک ہیں تو قرأت کا کوئی حرج نہیں یعنی جب کہ بھول سے ہو۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر سہو پر سجدہ کا سلف میں تعامل نہ تھا' تو یہ نسیان قولیہ کا معافی کے دائرہ میں داخل ہے' فتذکروا۔

اس بحث سے یہ امر اظہر من الشمس ہوا کہ تشہد اولیٰ کے بعد اگر درود بھول سے پڑھا گیا' تو اس پر سجدہ سہو لازم نہیں آتا' بلکہ اسم گرامی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا مشروع ہے۔ امام المحدثین امام شافعی تشہد اولیٰ میں اس کو کتاب الام میں مستحب فرماتے ہیں۔ ان کے مسلک کی تائید ظاہر قرآن سے ہوتی ہے کہ درود اور سلام کا معاً حکم وارد ہے۔ چنانچہ جس موقع پر سلام کا پڑھنا مشروع ہے' وہاں درود کا پڑھنا بھی مشروع ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب آپ سے عرض کیا کہ سلام کی کیفیت تو ہمیں معلوم ہے' لیکن درود آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح پڑھیں؟

اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ' سلام کے ساتھ مقرون ہے۔ جب وہ مقرون ہے تو اس کے ہی ساتھ ہونا چاہئے۔ دوسرا یہ کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو وہاں صلوٰۃ ضروری ہے۔ اس کی تائید مندرجہ ذیل روایتوں سے ہوتی ہے' جن کو حضرت امام ابن قیم نے "جلاء الافہام" میں ذکر کیا ہے۔ جن کا ترجمہ یہ ہے کہ "حضرت بریدہ کے بیٹے اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں' کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' اے بریدہ! جب تو نماز پڑھے تو تشہد اور درود کبھی ترک نہ کرنا' اس لئے کہ مجھ پر درود پڑھنا نماز کی زکوٰۃ ہے اور تمام انبیاء اور مرسلین اور عباد صالحین پر سلام۔

دوسری حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو یہ تشہد تعلیم فرماتے تھے۔ پھر اپنے آپ پر درود پڑھتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں : قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلمنا التشہد التحیات الحدیث ثم یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ "ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہم کو تشہد سکھلاتے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتے۔" اس سے ثابت ہوا کہ جب نمازی تشہد پڑھے تو ساتھ درود بھی پڑھے۔

بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اذا صلیت فی صلوتک فلا

ترکن التشهد والصلوۃ علی۔ یہ الفاظ عام ہیں جو ہر تشہد کو شامل ہیں۔ جس سے ثابت ہوا کہ پہلے تشہد میں درود پڑھنا مشروع ہے۔ اور دیگر حدیث محمد بن اسحاق سے ہے' بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا : کیف نصلی علیک اذ نحن صلینا فی صلوتنا "ہم جب نماز پڑھیں اور قعدہ کریں تو آپ ﷺ پر درود کس طرح پڑھیں؟" یہ حدیث عام ہے جو ہر قعدہ کو شامل ہے تو پہلے قعدہ میں درود پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح بعض اور روایتیں ہیں جو اس مسلک کی تائید کرتی ہیں۔ پس قعدہ اولیٰ میں درود پڑھنے کو غلط قرار دینا یا بھول کر پڑھنے سے سجدہ سہو بتانا بالکل غلط ہے۔ اس پر کوئی دلیل ناطق نہیں۔

قاری جی صاحب نے جو امام غزالی اور مولانا وحید الزمان وغیرہ کے اقوال کا سہارا لیا وہ ان روایتوں کے مقابلے میں اور سلف صالحین کے دلائل کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں' اور اصول یہ ہے کہ اختلاف کے وقت کتاب وسنت پر دارومدار رکھا جائے۔ (قاری) فیض الباری میں ہے کہ رسول ﷺ کسی سورت میں بھول گئے تو آپ نے سجدہ سہو کیا۔

برہان حصاری : یہ دلیل بے سند اور لا پتہ ہے۔ کتاب فیض الباری اہل الرائے کی ایک کتاب مشہور ہے جو میرے پاس نہیں ہے۔ قاری جی نے علم سے کام لیا ہے اور نہ اس روایت کی سند ذکر کی ہے اور نہ ہی اس کے الفاظ لکھے ہیں اور نہ اس روایت کا ماخذ بتایا ہے۔ اہل الرائے کی یہ پرانی عادت ہے کہ لقولہ علیہ السلام لکھ کر روایت نقل کرتے ہیں جو بعض ضعیف اور بعض موضوع ہوتی ہیں۔ لہٰذا اہل الرائے کی نقل کردہ روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ قاری جی کو روایت مذکورہ بحوالہ کتاب و بمع سند ومتن پیش کرنی چاہیے۔

بیان قاری : حضرت شاہ ولی اللہ نے مصفیٰ ص۔۱۲۱ میں لکھا ہے البلاغ المبین سے نبی کریم ﷺ درود ودعا نہ پڑھتے تھے' التحیات پڑھتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ جیسا کہ کوئی گرم پتھر پر زیادہ دیر نہ بیٹھ سکتا اور احادیث سے ہی غیر مشروع ہونا ثابت ہے' اس پر سجدہ سہو کرنا چاہیے۔

برہان حصاری : بندہ حصاری نے گوجرانوالہ کے ایک قاری کے جواب میں کہ انہوں نے علم تجوید سیکھنا واجب قرار دیا تھا کہ یہ مروجہ تجوید بدعت ہے۔ اس پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا فتویٰ پیش کیا تھا کہ انہوں نے شرح موطا فارسی میں لکھا ہے :

"ہیچ جا ثابت نہ شدہ است کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ ضبط مخارج وغیرآں کردہ باشد باوجود دخول عجمیان واعراب دراسلام۔" لیکن گوجرنوالہ کے قراء وعلماء نے شاہ صاحب موصوف کا فتویٰ تسلیم نہ کیا اور قاری جی امر محدث کے مرتکب ہو کر آج ہمارے ہی سامنے حضرت شاہ صاحب کا فتویٰ پیش کر کے منوانا چاہتے ہیں' کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون۔

اچھا اب اس کا جواب سنئے : شاہ صاحب کا فیصلہ ماننے سے ہمیں انکار نہ تھا مگر ان کا یہ فرمان جس حدیث کی بنا پر صادر ہوا ہے' وہ حدیث ضعیف ہے جواز قسم مردود ہے۔ چنانچہ "تنقیح الرواۃ تخریج مشکوۃ" میں یہ لکھا ہے : قال الترمزی ھذا حدیث حسن و ابو عبیدہ وھو عامر بن عبد اللہ بن مسعود لم یسمع من ابیہ "یعنی حدیث تو حسن ہے لیکن اس کی سند میں جو راوی ہے وہ عبداللہ کا بیٹا ہے اور اس کا نام عامر ہے' اس نے باپ سے سنا نہیں۔" یعنی ابو عبیدہ کو اپنے باپ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی حدیث کا سماع حاصل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ایسی روایت جس میں تابعی کو صحابی سے سماع حاصل نہ ہو' منقطع ہوتی ہے۔ چنانچہ تلخیص الحبیر میں اس روایت پر یہ لکھا ہے : ھو منقطع لان ابا عبیدہ لم یسمع من ابیہ قال شعبۃ عن عمر بن مرۃ سالت عبیدۃ ھل تذکر من عبد اللہ شیئا قال لا۔ "یہ حدیث منقطع ہے' کیونکہ ابوعبیدہ نے اپنے باپ سے کوئی چیز نہیں سنی ہے۔ امام شعبہ کا بیان ہے کہ عمر بن مرہ نے ابوعبیدہ سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے باپ سے کوئی حدیث سنی ہے اور لوگوں سے ذکر کیا ہے؟ انہوں نے کہا میں نے کوئی حدیث ذکر نہیں کی۔"

اس سے ثابت ہوا کہ حدیث گرم پتھر والی ضعیف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہ فرمایا اور نہ کیا۔ پس امام ترمذی کی تحسین و تصحیح پر اعتماد نہیں ہے۔ ان کے ساتھ دیگر محدثین کی تصدیق ضروری ہے۔ امام ترمزی کا تساہل مشہور ہے۔

اچھا اس حدیث میں گرم پتھر کا ذکر بطور کنایہ ہے' مطلب اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ نسبت دوسرے قعدے کے پہلے قعدہ میں کم بیٹھتے تھے۔ یہ دوسرے قعدہ کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ پہلے میں تخفیف ہوتی ہے۔ اس سے درود پڑھنے کی نفی نہیں ہوتی' درود اسم گرامی بولنے پر پڑھ سکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الام" میں اور امام نووی نے "اذکار" میں اور امام غزالی نے "کیمیائے سعادت" میں اس کی صراحت کی ہے' وہ شاہ ولی

اللہ وغیرہ سے علم میں فوقیت رکھتے تھے۔

آیت درود اور احادیث عامہ کا اقتضا یہ ہے کہ درود پڑھا جائے۔ اچھا اگر کوئی اس کا قائل نہیں ہے۔ وہ اگر بھول سے پڑھ لے تو اس پر سجدہ سہو لازم صریح غلط اور بے دلیل ہے۔ علمائے اہلحدیث اس کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت الافاضل مولانا عبیداللہ صاحب محدث مبارک پوری نے کتاب مرعاۃ المفاتیح مشکوۃ پر لکھتے ہیں : قلت الظاهر ان لا يزيد على التشهد لكن ان زاد لا يجب عليه سجدة السهو لانه ليس دليل شرعي على وجوب سجدة السهو على من زاد على التشهد في القعدة الاولى فالحديث منقطع۔ یعنی "میں کہتا ہوں کہ ظاہریات تو یہی ہے کہ تشہد اولیٰ میں کوئی چیز زیادہ نہ کی جائے۔ لیکن اگر کسی نے زیادہ کر دی تو اس پر سجدہ سہو کرنا لازم نہیں ہے' کیونکہ سجدہ سہو واجب ہونے پر کوئی دلیل شرعی ناطق نہیں ہے۔ حدیث مذکورہ منقطع ہے۔"

علمائے مبارکپور جو علم حدیث میں مبارک نامہ رکھتے تھے' وہ تو ایسی شرعی دلیل سے واقف نہ ہوئے جو قعدہ اولیٰ میں درود سہواً پڑھنے پر دلالت کرتی ہو۔ مگر گوجرانوالہ کے مفتی صاحبان درود پر سجدہ سہو واجب کر رہے ہیں۔ خدا جانے ان کے پاس دلیل کون سی ہے۔ اگر صرف شاہ ولی اللہ پر اعتماد ہے تو ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی طرح ان کا فہم بھی ہم پر حجت نہیں ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ان سے ایک غلطی یہ سرزد ہوئی ہے' جو فقہ عمر کتاب کے ص۔۵۸ سے نقل کی جاتی ہے۔ (سہو قرآت) بروایت شافعی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ امامت صلوۃ میں قرآت قرآن بھول گئے اور بغیر سجدہ سہو کے سلام پھیر دیا۔ سلام کے بعد لوگوں سے دریافت کیا کہ رکوع' سجود میں تو کوئی کمی نہیں رہی؟ عرض کیا گیا وہ سب ٹھیک تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تب اگر قرآت رہ گئی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

جو روایت امام ابوحنیفہ سے ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مغرب کی نماز میں قرآت بھول گئے۔ بعد میں معلوم ہوا' تو پوری نماز کا اعادہ فرمایا۔ (اس کی شرح میں یہ لکھا ہے) شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں قول قدیم امام شافعی کا یہ تھا کہ نماز میں قرآت سنت ہے۔ مگر بعد کے قول میں اس سے رجوع کر کے اسے فرض قرار دیا اور امام شافعی نے اپنی مندرجہ روایت ص۔۳۹ کو اس پر محمول فرمایا کہ حضرت عمر سے قرآت سورہ فاتحہ کی بجائے سورت ترک ہو گئی تھی' اس لئے نہ تو آپ نے اعادہ کیا نہ سجدہ سہو ضروری سمجھا۔ تخلی نہ رہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ

فاروق سے پہلا فعل جو منقول ہے' یہ وہی ہے جو ہم مدونہ امام مالک سے نقل کر چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر نے سورۃ فاتحہ کے بعد کسی دیگر سورۃ کی قرآت سہواً ترک کر دی' کیونکہ سورہ فاتحہ کا ترک کرنا احتمال بعید ہے' متبادر الی الذہن نہیں ہے۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ فاتحہ کے بعد دیگر سورت نہ پڑھی اور رکوع میں چلے گئے ہوں۔ سورہ فاتحہ کے بغیر امام اور منفرد دونوں کی نماز باتفاق صحابہ کرام صحیح نہیں ہوتی۔ فاتحہ کی فرضیت احادیث متواترہ سے ثابت ہے اور اس کی مدینہ میں منادی ہو چکی تھی۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاتحہ بالکل نہ پڑھتے تو نہ حضرت عمر ہی اس نماز کو صحیح سمجھتے اور نہ دیگر صحابہ بلکہ سب ہی اس نماز کو باطل خیال کر کے اس کا اعادہ کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز صحیح نہیں ہے' امام ہو یا مقتدی سب کو پڑھنی واجب ہے امام اور منفرد کے لئے بھی۔

امام شافعی کا بھی مذہب یہی ہے کہ فاتحہ پڑھنی فرض ہے' کیونکہ سورہ فاتحہ کے وجوب کا مسئلہ سب محدثین کا مسلمہ مسئلہ ہے۔ دوسرے فعل فاروقی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فاتحہ پڑھنی فرض ہے کہ آپ سورہ فاتحہ بھول گئے تھے اور آگے دوسری سورۃ پڑھ دی۔ تب نماز کے بعد علم ہونے پر اس نماز کا اعادہ کیا۔ سورہ فاتحہ کے ساتھ دیگر سورہ ضم کرنا بھول جانا اور صرف دعائے افتتاح پر کفایت کرنا بہت بعید احتمال ہے اور اگر سورہ فاتحہ کے علاوہ دیگر سورۃ ترک کر دینا مراد ہو' تو پھر نماز کا اعادہ کرنا غلط ہو جاتا ہے' کیونکہ فاتحہ کے ساتھ دیگر سورتوں کا ضم کرنا واجب نہیں۔ اس کے ترک سے اعادہ واجب نہیں ہے۔ نیز اس صورت میں عمر رضی اللہ عنہ کے ہر دو عملوں میں تضاد لازم آتا ہے۔ جو حضرت عمر کے علم وشان کے منافی ہے۔

اس لئے میں نے جو توجیح ذکر کی ہے وہ ٹھیک ہے اور اس توجیح سے عمر رضی اللہ عنہ کے دونوں قولوں میں موافقت ہو جاتی ہے اور شاہ صاحب کا فرمان جو امام شافعی کے متعلق ہے کہ وہ قرآت کو پہلے سنت اور پھر فرض جاننے لگے۔ حضرت امام شافعی کی علمی شان کے خلاف ہے کیونکہ موصوف بچپن ہی سے کتاب وسنت کے مسائل سے واقف ہو گئے تھے۔ وہ اس بدیہی مسئلہ سے کہ فاتحہ نماز میں فرض ہے' کس طرح غافل رہ سکتے تھے۔

اگر اس سے مطلق قرآت مراد ہو' تب بھی صحیح نہیں' کیونکہ مطلق بھی فرض سمجھی گئی ہے۔ کیونکہ فاتحہ مطلق کا ایک فرد ہے جس سے مطلق قرآت کی فرضیت ادا ہو جاتی ہے۔

اگر فاتحہ کے ساتھ دیگر سورہ کی قرآت کا حکم فرض ہے تو اس کا کوئی بھی امام قائل نہیں۔ اگر فاتحہ کے ہمراہ دیگر سورہ کی قرآت فرض ہوتی تو پھر مقتدی سے یہ فرض ساقط نہ ہوتا' کیونکہ وہ امام کے فرض قطعی کا حامل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ امام بخاری نے جزء القراۃ میں اس کی صراحت کی ہے۔ حالانکہ امام شافعی کے نزدیک مقتدی کے لئے فاتحہ کے بغیر دیگر قرآت سے خاموشی کا حکم ہے۔ بہرحال مجھے شاہ صاحب کی یہ توجیح پسند نہیں ہے۔ اگر کسی اہل علم کو پسند ہے تو پھر حضرت عمر اور امام شافعی کے علمی درجات کو پیش نظر رکھ کر یہ معمہ حل کریں' شکریہ سے قبول کیا جائے گا۔

بیان قاری : اور احادیث سے بھی غیر مشروع ہونا ثابت ہوتا ہے تو جب قعدہ اولیٰ میں درود شریف غیر مشروع ہونا ثابت ہوا تو اس کے پڑھنے پر سجدہ سہو کرنا چاہئے۔ جیسا کہ ہدایتہ المہدی ص۔۱۴۴ میں ہے : من زاد فی شیئی منها ما نص مشروعا فیه سهوا استحب له السجود۔ امام غزالی وجیز میں فرماتے ہیں ......الخ

برہان حصاری : تشہد میں جہاں سلام اور اسم محمد ﷺ ہے اور وہ زبان سے بولا جاتا ہے' درود شریف پڑھنا ضروری ہے۔ ورنہ وہ بخیل تصور ہوگا۔ عموم ادلہ اس پر ناطق ہیں۔ آیت درود اور اسکی تفسیر اور حکم کی تعبیر' جو حدیث میں آئی ہے وہ اس موقعہ کو شامل ہے اور قرآن میں جو حکم اقیموا الصلوۃ کا وارد ہے کہ صلوۃ قائم کرو' یہ صلوۃ دو قسم ہے : (۱) قولی' یہ تو فاتحہ اور درود ہیں۔ (۲) فعلی' نماز کے اجزاء فعلیہ' قیام اور رکوع' سجدہ اور قعدہ وغیرہ ہیں۔

یہ کلمہ ہر دو قسم صلوۃ کو شامل ہے اور نماز شرعی' قولی و فعلی صلوۃ کے مجموعہ کا نام ہے اور قولی صلوۃ کے مقام احادیث سے متعین ہو چکے ہیں۔ فاتحہ کا مقام قیام ہے اور درود کا مقام تشہد کے بعد اسم گرامی محمد کے بعد ہے۔ پس جو شخص ان احکامات کو نماز میں چھوڑ گیا' اس کی نماز قبول نہ ہو گی۔ دونوں حکم اقیموا کے مامور بہ ہیں۔ جس نے اس کے پڑھنے سے غفلت کی' اس نے طریق جنت پر چلنے میں خطا کی۔

الرحمتہ المہداۃ میں یہ روایتیں ہیں : عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من نسی صلوۃ علی اخطی طریق الجنة' رواہ ابن ماجہ۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر درود پڑھنا بھول گیا' اس نے راستہ جنت پر چلنے میں خطا

کی۔" دیگر حدیث میں ہے : لا صلوۃ لمن لم یصل علی "جس نے نماز میں مجھ پر درود نہ پڑھا اس کی نماز نہیں ہے۔"

دیگر حدیث میں ہے : من صلی صلوۃ لم یصل فیھا علی ولا علی اھل بیتی لم یتقبل منہ۔ (دار قطنی) "جس شخص نے نماز میں مجھ پر اور میری آل پر درود نہ پڑھا تو اس کی نماز قبول نہ ہوگی۔" پس نماز کے ہر تشہد اور اسم گرامی ﷺ درود کو غیر مشروع کہنے والا خاطی و مخطی ہے اور بخیل ہے۔ درود نماز کا قولی جز ہے' غیر مشروع کیسے ہو سکتا ہے؟ امام غزالی نے کیمیائے سعادت میں اس کا مشروع ہونا ذکر کیا ہے۔

علامہ وحید الزماں نے درود کی بابت سجدہ سہو نہیں لکھا یہ مغالطہ ہی ہے۔ انہوں نے اس چیز پر سجدہ سہو لکھا ہے' جو نماز سے نہ ہو اور اس کا کرنا غیر مشروع ہو۔

درود نماز کے اجزا قولیہ میں سے ہے اور مشروع ہے۔ یہ اس کا حکم مصداق نہیں۔ سجدہ کسی قول سہو پر نہیں ہے' فعلی پر ہے۔ جیسا کہ میں اس کی تفصیل کر چکا ہوں۔ نیز یہ قول کشف الغمہ ص۔۲۵ میں درج ہے : وکان عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ اذا سئل عن السھو یقول ھو ان تقوم موضع الجلوس او تقعد موضع القیام او تسلم من رکعتین۔ یعنی "جب ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا جاتا کہ سجدہ سہو کب واجب ہوتا ہے۔ تو وہ فرمایا کرتے تھے کہ سہو اس موقعہ پر ہے کہ تم بیٹھنے کی بجائے کھڑے ہو جاؤ یا رکعتیں باقی ہوں اور تم بھول کر سلام پھیر دو۔" اس معنی میں بحوالہ تلخیص ایک حدیث پہلے گزر چکی ہے' اس سے اس کی تائید ہو گئی۔

پس ثابت ہوا کہ فعلی سہو اور کام غیر مشروع پر سجدہ سہو ہے' درود غیر مشروع نہیں اور نہ فعلی سہو میں سے ہے۔ لہٰذا اس پر سہو کا سجدہ لازم کہنا دوہری غلطی ہے اور بندہ اس بارہ میں منفرد نہیں ہے بلکہ امام المحدثین امام شافعی ہمارے ساتھ ہیں۔

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست
کہ سلطان حدیث بلا است امروز

مولانا وحید الزماں صاحب زندہ ہوتے تو ہم ان سے پوچھتے کہ جناب آپ نے یہ جو قاعدہ کلیہ ٹھہرایا ہے کہ جب نماز میں کوئی کام غیر مشروع کر لے تو وہ سجدہ سہو کرے۔ اب آپ یہ بتاؤ کہ اگر کوئی نماز میں ادھر ادھر التفات کر بیٹھے تو اس پر سہو ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی

میں ہو تو آپ کا کلیہ غلط۔ اگر کہو کہ اس پر سہو ہے تو وہ یہ بات ہے کہ جس کا کوئی ثبوت نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے گزر چکا ہے کہ التفات پر سہو نہیں ہے اور یہ حدیث کے بغیر قیام عن الجلوس یا جلوس عن القیام کے سہو نہیں ہے' پہلے ذکر ہو چکی ہے۔ اسی طرح کسی نے محمد ﷺ کا اسم گرامی نماز میں سنا تو وہ درود پڑھے یا نہ؟ اگر نفی سے جواب ہو تو وہ بخیل ہوا اگر پڑھا تو نماز میں زیادتی پائی گئی۔ پھر سجدہ سہو کرنا چاہئے یا نہیں؟ اگر نفی میں جواب ہو تو ہماری تصدیق ہو گئی اور سجدہ سہو کرے تو یہ مشروع اور معمور بہ پر سجدہ کرنا لازم آگیا جو جائز نہیں ہے۔

بیان قاری : امام شافعی کوئی شارع نہیں ہیں اور نہ ہی ہم ان کے مقلد ہیں۔

برہان حصاری : اس سے ظاہر ہوا کہ جن علمائے کرام کا آپ نے حوالہ دیا ہے مثلاً غزالی' شاہ ولی اللہ اور وحید الزمان وغیرہ آپ ان کو شارع تصور کرتے ہیں' اس لئے ان کی تقلید میں سرشار ہیں۔ یہ کفر ہے۔

ایں گنا ہیست کہ در شہر شما ہی کنند

امام شافعی شارع نہیں' مگر شارع کے احکام سمجھنے والے تو ہیں۔ اگر محدثین احادیث پر تبویب کرتے ہیں اور احادیث سے مسائل اخذ کرتے ہیں تو وہ ہمارے لئے واسطہ فی التفہیم ہیں' جیسا کہ شاگردوں کے لئے استاد ہوتا ہے۔ آپ جب آزاد اور خود رائے ہیں' تو غلطیوں میں مبتلا ہیں' اگر آپ احادیث کو محدثین کی روشنی میں سمجھتے اور اہل الرائے اور عہد حاضرہ کے ذوالوجہین مفتیوں کا شکار نہ ہوتے تو ایسے معمولی مسائل میں بظاہر خطا نہ کرتے۔

اب بھی ہماری آپ کو نصیحت ہے کہ آپ اہل رائے کی فضیحت سے اجتناب کریں۔ آپ امام شافعی کے مناقب کا مطالعہ کریں' تاکہ آپ کی بدگمانی دور ہو۔

نہایت کشمکش میں آج بیمار محبت ہے
قضا کچھ اور کہتی ہے' شفا کچھ اور کہتی ہے
اُدھر بعد میں واعظ کہہ رہا ہے مے سے توبہ کر
اِدھر مخمور ساون کی گھٹا کچھ اور کہتی ہے

بیان قاری : بلکہ اہل حدیثوں کا بھی یہی مذہب ہے' لعموم الحدیث۔

برہان حصاری : آپ کی بات قابل اعتبار نہیں ہے۔ آپ دو چار ائمہ اہل حدیث کا نام لے کر ان کے اقوال پیش کرتے۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود پڑھنے پر سجدہ لازم قرار دیتے ہیں۔ ورنہ یہ علمائے اہلحدیث پر الزام باطل ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ تشہد اول کے بعد درود شریف پڑھنے کے قائل نہیں ہیں۔ ہم کو تو اہل الرائے کے سوا کوئی بھی معلوم نہیں ہو سکا۔

بیان قاری : حافظ عنایت اللہ گجراتی اور غزالی اور نووی بھی اور ائمہ اربعہ میں سے کوئی دلیل ہے جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔

برہان حصاری : قرآن مجید میں ہے کہ کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون۔ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک' غضب کے مستحق وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں وہ چیز خود کرتے نہیں۔" اگر ہمارے پیش کردہ علماء کے اقوال ادلہ میں سے کوئی دلیل نہیں تو آپ کے پیش کردہ علماء شاہ ولی اللہ' وحید الزمان' پیر جیلانی اور غزالی وغیرہ کے اقوال بھی اور اربعہ میں سے کوئی دلیل نہیں ہیں' آپ نے بیکار خامہ فرسائی کیوں کی؟ ما ھو جوابکم فھو جوابنا۔ آپ کی پیش کردہ حدیث ضعیف ہے' لہذا دعویٰ باطل ہوا۔

بیان قاری : فردوہ الی اللہ والرسول پر عمل کرنا چاہیے۔

برہان حصاری : تنازعات میں یہ اصول قرآنی ہم کو مسلم ہے اور الحمد للہ اس اصول کی رو سے آپ کا دعویٰ باطل ہوا' کیونکہ آپ نے اس دعویٰ خاص پر کوئی دلیل خاص پیش نہیں کی اور نہ آپ قیامت تک پیش کر سکیں گے اور عام ادلہ جو پیش کی ہیں۔ وہ اول تو ضعیف اور باطل ہیں۔ دوم' ان میں کسی قولی جز نماز کی بھول پر سجدہ سہو کا ثبوت نہیں' جب اس پر کوئی دلیل شرعی ثابت قائم نہیں اور اس کا تعامل صحابہ میں نہ پایا گیا' تو یہ امر ناقابل قبول ہے۔

ہمارے نزدیک آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام ﷺ کا طریقہ عمل ہی دلیل ہے کہ انہوں نے نماز کے اجزائے قولیہ میں بھول واقع ہونے پر کوئی سجدہ نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو منقول ہوتا۔ جب نماز کے اجزائے فعلیہ کے نسیان پر سجدہ سہو منقول ہے تو اجزائے قولیہ کے سہو پر بھی سجدہ سہو منقول ہونا چاہیے تھا۔ اجزائے فعلیہ کی بھول منقول ہے' سجدہ سہو بھی منقول ہے۔ اجزاء قولیہ کی بھول منقول ہے' سجدہ منقول نہیں ہے۔ نہ آنحضرت ﷺ سے نہ صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم سے۔ تو یہ سنت تقریریہ ہے۔ جس پر ہمارا عمل ہے' تمہارا قیاس پر عمل ہے کہ اجزائے فعلیہ پر اجزائے قولیہ کو قیاس کرتے ہو۔ یہ قیاس مع الفارق ہے جو حجت نہیں ہے۔ آیت فردوہ الی اللّٰہ والرسول کو پیش کرنا اور کام قیاس سے لینا آیت کبر مقتا عند اللّٰہ کا مصداق ہے۔ ہم اب بھی کہتے ہیں' ھا تو برھانکم ان کنتم صادقین۔

آپ مدعی ہیں' آپ کے ذمہ دلیل ہے' ہم نافی ہیں ہمارے ذمہ دلیل نہیں ہے۔ صرف سکوت شارع ہی کافی ہے۔ حدیث میں ہے :وما سکت عنه فهو عفو۔

بیان قاری : قرآن مجید میں ہے : ان اللّٰہ وملائکة یصلون علی النبی۔ یعنی صلوۃ کے ساتھ سلام کو نہیں جوڑا گیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی پہلے صرف سلام ہی پڑھتے تھے۔

برہان حصاری : ایں چہ ابو العجبی است۔ اللّٰہ تعالیٰ اور ملائکہ کی طرف صلوۃ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے سلام قبل از حکم صلوۃ کے پیش نظر یہ مسئلہ بنا لیا کہ تشہد اولیٰ میں صرف سلام پڑھنا کافی ہے۔ جب اہل ایمان کو حکم صلوۃ وسلام اکٹھا وارد ہے تو اہل ایمان کو اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ آیت میں درود کا حکم مع سلام وارد ہے اور صحابہ نے تشہد کے سلام کو جان کر یہ کہا کہ کیف نصلی فی صلوتنا اور یہ کہا کہ کیف نصلی اذا جلسنا تو صلوۃ اور سلام کا تشہد میں اکٹھا پڑھنا ثابت ہو گیا پس جب تشہد پڑھے گا' تو درود بھی پڑھنا پڑے گا۔ دوسرے تشہد میں درود جس بنا پر ہے اسی بنا پر پہلے تشہد میں بھی ہے کہ دونوں جگہ اسم گرامی موجود ہے۔ اسم گرامی اگر قیام میں بھی لیا جا سکتا' تو درود پڑھنا لازم ہوتا۔

بیان قاری : آپ نے درود شریف پڑھنے پر جو دلیلیں پیش کی ہیں۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر درود شریف پڑھنا' یا قعدہ ثانیہ میں دعا کا پڑھنا' یا قعدہ اولیٰ میں' جیسا کہ آپ نے لکھا ہے یہ قیاس مع الفارق ہے۔ کیونکہ آپ کا نام مبارک سن کر درود پڑھنا' نماز میں یا غیر نماز میں مشروع ہے' لہٰذا تشہد اولیٰ میں درود شریف پڑھنے پر سجدہ نہ کرنا اختراع اور بڑی غلطی ہے۔ پس الاعتصام کے مفتی حضرت حافظ صاحب کا فتویٰ بلادلیل ہونے کی وجہ سے قابل قبول ہے۔

برہان حصاری :

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

قاری صاحب نے اپنے تعاقب میں جو علمی غلول سے کام لے کر حق سے عدول کیا تھا' وہ بندہ نے پوری طرح آشکارا کر کے' ان کا یہ دعویٰ باطل کر دیا کہ "تشہد اولیٰ میں درود پڑھنے سے سجدہ لازم آتا ہے۔"

بندہ حصاری نے بھی ظاہر کر دیا ہے کہ خود ان کے اور ان کے مفتی صاحب کے پاس دعویٰ خاص پر کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے' یہ اہل رائے کا مسلک ہے جو باطل ہے اہل حدیث اور محدثین کا یہ مسلک نہیں' بلکہ امام شافعی کا یہ مسلک ہے کہ تشہد اولیٰ میں درود شریف پڑھنا چاہئے' یہ مشروع ہے۔ اب ان کے مقابلے میں قاری صاحب اور مفتی صاحب بیچارے اپنے علم و عمل کے اعتبار سے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ بندہ نے اپنے تعاقب میں جو دلائل دیئے ہیں وہ عبارۃ النص ہیں کہ :

(۱) نماز میں درود شریف پڑھنا چاہئے (۲) کلمہ شہادت میں اسم گرامی کے بعد درود شریف پڑھا جائے۔

الحمدللہ! قاری صاحب نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ آپ کا نام مبارک سن کر درود شریف پڑھنا (نماز میں اور غیر نماز میں) مشروع ہے' جیسا کہ دلیل الطالب میں ہے۔

راہ پر لے تو انہیں آئے ہیں ہم باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

جب نام نبوی ﷺ سن کر درود شریف پڑھنا شرط ہے' خواہ نماز میں' خواہ قیام میں' خواہ رکوع یا سجدہ میں یا جلسہ یا قومہ میں' تو پھر قعدہ اولیٰ میں بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا' کہ جب حضور اکرم ﷺ کا اسم گرامی سن لے تب بھی درود پڑھے' لعموم الحدیث۔

اگر اس حالت کو خاص کرے گا تو اس سے تخصیص بلا مخصص لازم آئے گی' جو جائز نہیں ہے۔ جب قعدہ اولیٰ میں نام نبوی ﷺ سن کر درود پڑھنا مشروع ثابت ہو گیا تو کلمہ شریف میں بھی نام مبارک ﷺ پڑھ کر درود پڑھنا لازم آئے گا۔ کیونکہ اس وقت بھی نام نبوی ﷺ سنا جاتا ہے۔

جب نمازی اور قاری خود کوئی چیز پڑھتا ہے تو وہ سنتا بھی ہے' سننے کو پڑھنا لازم نہیں' پڑھنے کو سننا لازم ہے۔ کیونکہ جب کوئی اپنے پڑھنے کو خود نہ سنے' تو وہ پڑھنا لازم نہیں۔ حدیث النفس میں ہے کہ جب تشہد میں نام مبارک ﷺ پڑھا اور سنا تو درود کا پڑھنا واجب

ہو گیا اور یہ مشروع ہوا تو سجدہ سہو لازم نہ آیا۔ اسی اعتراض نامہ سے الاعتصام کا فتویٰ غلط ہو گیا اور قدرت الٰہی نے اور مفتی صاحب کے وکیل نے عارف حصاری کے حق میں ڈگری دے دی' الحمد للہ علی ذلک۔ اس سے ظاہر ہوا کہ میرے دلائل نص تھے' قیاسی نہ تھے۔

اس فیصلہ کے بعد میاں قاری صاحب نے یوں غبار جھاڑا کہ قعدہ اولیٰ میں درود پڑھنا غیر مشروع ہے' یہ تخصیص بلا مخصص ہے جو باطل ہے' کیونکہ کسی دلیل شرعی سے اس موقعہ پر درود پڑھنا غیر مشروع ثابت نہیں ہوا۔ عموم حدیث جس سے نماز یا غیر نماز میں نام نبوی ﷺ سن کر درود پڑھنا ثابت ہے' قعدہ اولیٰ کو بھی شامل ہے' ورنہ کسی دلیل سے اس مقام کا استثنا ثابت کریں۔

تشہد اول پڑھ کر جلدی اٹھنے کی روایت سے دھوکہ نہ کھائیں' کیونکہ اول تو وہ ضعیف ہے۔ دوم' درود اس تشہد سے ملحق ہے۔ اس کے پڑھنے سے جلدی اٹھنے کی نفی نہیں ہوتی' إلا اس صورت میں کسی دلیل صحیح سے درود پڑھنے کی ممانعت ثابت ہو جائے۔ مگر ممانعت ثابت نہیں ہے۔ تو نام مبارک پر آیت کے اطلاق اور احادیث کے عموم سے قعدہ اولیٰ میں درود شریف ثابت رہے گا۔ یہ ایک مسئلہ طے ہوا۔

دوسرا دعویٰ سہو سے پڑھے جانے کا ہے کہ اس پر سجدہ سہو ہے۔ یہ دعویٰ باطل ہو چکا ہے۔ اول تو درود مشروع ہے اور مشروع پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوا کرتا۔ دوم' اذکار اور ادعیہ کے نسیان پر سہو کرنا شارع سے ثابت نہیں بلکہ ترک سہو' سنت ترکیہ ہے۔ (فقط)

از ابو الشکور عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور' جلد۔۲۳' شمارہ۔۴' ۵' ۶' ۸' ۱۲' ۱۳' ۱۴' ۱۵' ۱۷' ۱۸' ۱۹' ۲۰' ۲۱' ۲۲' ۲۳' ۲۴' ۲۵' ۲۶

مورخہ از ۳/ اپریل سنہ۔۱۹۷۰ء تا ۲۸/ ستمبر سنہ۔۱۹۷۰ء

مسائل ثلاثہ کی تحقیق

(غیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کے متعلق زید اور محمود کا مکالمہ)

زید: جناب حضرات علماء کرام! دیگر مسائل مختلفہ کی طرح اس مسئلہ میں بھی اختلاف کرتے ہیں کہ غیر انبیاء پر درود پڑھنا یا لکھنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض علماء سخت منع کرتے ہیں یہاں تک کہ متاخرین بالاجماع اس سے منع کرتے ہیں۔ جو شخص کسی غیر نبی پر درود پڑھ دے یا لکھ دے تو کہتے ہیں کہ تو نے اس شخص کو نبی مان لیا ہے یہ کیا ہے وہ کیا ہے سو عرض ہے کہ اس مسئلہ میں دلائل شرعیہ کی رو سے آپ کی تحقیق کیا ہے؟ قرآن وحدیث سے ثبوت دیا جائے۔

محمود: واضح ہو کہ مسائل دو قسم کے ہیں ایک شرعیہ منصوصہ دوم اصطلاحیہ عرفیہ۔ شرعیہ منصوصہ تو وہ مسائل ہیں جو شریعت میں صاف نص سے ثابت یا ممنوع ہیں۔ اگر جائز ہیں تو ان کا جواز نص سے ثابت ہے۔ اور اگر منع ہیں تو ان کی ممانعت نص سے ثابت ہے۔ اور نصوص شرعیہ سے مراد آیات محکمات اور احادیث صحیحہ ہیں۔

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفےٰ بر جاں مسلم داشتن

اور اصطلاحیہ عرفیہ وہ مسائل ہیں جن کا جواز یا عدم جواز نص سے تو ثابت نہ ہو۔ صرف عرف عام میں ان کا جواز یا عدم جواز کسی وجہ سے مشہور ہو جائے اور ایک قوم ان پر اتفاق کر لے۔ اور عام بول چال میں ان پر عادت ٹھیرا لے۔ پس دونوں قسموں کے مسائل کا ایک الگ حکم ہے۔ جن کو یہاں تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

☆غیر نبی پر استقلالی درود☆

میری تحقیق یہ ہے: کہ غیر انبیاء پر درود پڑھنا اور لکھنا بطور دعا حصول برکت ورحمت جائز ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی جامع صحیح میں یوں باب منعقد کیا ہے۔ باب ھل یصلی علی غیر النبی ﷺ یعنی کیا غیر نبی ﷺ پر درود پڑھنا جائز ہے؟ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اس کے تحت لکھا ہے ای استقلالا او تبعا یعنی مستقل

طور پر غیر نبی پر درود پڑھنا جائز ہے یا تبعًا جائز ہے۔ پھر لکھا "ویدخل فی الغیر الانبیاء والملئکۃ والمؤمنون" ۔یعنے لفظ غیر میں دیگر انبیاء جو ہمارے نبی ﷺ کے علاوہ ہیں' سب داخل ہیں اور فرشتے اور مؤمنین بھی داخل ہیں۔ یعنی کیا ہمارے نبی کے علاوہ دیگر انبیاء اور ملائکہ اور مؤمنین پر درود بھیجا جاسکتا ہے ؟

پھر امام الدنیا فی الحدیثؒ نے آیت قرآن اور ایک دو حدیثیں لاکر غیر نبی پر درود پڑھنے کا جواز ثابت کیا ہے۔ چنانچہ آیت سورۃ توبہ پارہ ۱۱ کی یہ پیش کی ہے" وصل علیہم ان صلاتک سکن لہم" یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ سے فرمایا (مالداروں سے زکوٰۃ لے کر) ان پر دعاء رحمت کر کیونکہ تیری دعاء ان کے لئے تسلی کا مؤجب ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ غیر نبی پر درود' دعاء رحمت کرنا جائز ہے۔ جو حکم قرآن میں ہمارے نبی ﷺ کو ہے' اس میں امت بھی شامل ہے۔ ارشاد ہے: وربك فكبر ☆ وثيابك فطهر ☆ یعنی اپنے رب کی بڑائی بیان کر اور اپنے کپڑے پاک کر۔ تو اب یہی حکم امت کو ہے۔ کہ اپنے رب کی بڑائی بھی بیان کرے اور کپڑے بھی پاک کرے اسیطرح جب کسی مالدار سے کوئی امام' امیر یا عامل زکوٰۃ وصول کرے تو اس کے حق میں دعاء رحمت کرے۔ پھر امام المحدثینؒ نے یہ حدیث ذکر فرمائی ہے کہ "عن ابن ابی اوفی قال کان ازا اتی رجل النبی ﷺ بصدقتہ قال اللھم صل علیہ فاتاہ ابی بصدقتہ فقال اللھم صل علی ال ابی اوفی " یعنی عبداللہ بن ابی اوفیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس جب کوئی مرد زکوٰۃ لے کر آتا تو آپ یوں فرماتے !"اللھم صل علیہ (اے اللہ اس پر رحمت کر)" چنانچہ میرا باپ ابو اوفی' جب آپ کے پاس اپنی زکوٰۃ لے کر آیا تو آپ نے یوں فرمایا کہ !"اللھم صل علی ال ابی اوفی" کہ اے اللہ آل ابی اوفی پر رحمت نازل فرما۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ لفظِ صلوٰۃ کے ساتھ غیر نبی پر دعا کرنا جائز اور درست ہے۔ پہلے قرآن سے ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو غیر نبی کے حق میں دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور وہ حکم لفظِ صلوٰۃ سے صادر فرمایا ہے۔ یعنی صَلِّ کہا جس سے لفظِ صلوٰۃ سے دعا کرنا مراد ہے۔ پھر حدیث سے ثابت کیا کہ غیر نبی پر خود نبی ﷺ نے لفظِ

صلوٰۃ سے دعا کی۔ پس آیت اور حدیث دونوں سے یہ ثابت ہوا کہ غیر نبی پر بالا ستقلال درود پڑھنا جائز ہے۔ رہا تبعاً اور ضمناً یعنی نبی کے ہمراہ غیر نبی کا نام لے کر درود پڑھنا سو یہ بالاولیٰ جائز اور درست ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت دوسری حدیث سے امام بخاری نے دیا جو یہ ہے کہ "قالوا یا رسول اللہ کیف نصلی علیک قال قولو االلھم صل علی محمدواز واجه وذریته" یعنی صحابہ کرامؓ نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا کہ ہم آپ پر کیونکر درود بھیجیں؟ (اس کا طریقہ بتلا دیجئے) تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ یوں کہا کرو! "اللھم صل علی محمد واز واجه وذریة"۔

اس حدیث میں نبی ﷺ کے نام مبارک کے بعد ازواج اور ذریت کا ذکر ہے ۔ جو غیر نبی ہیں۔ پس نبی کے ساتھ ان پر تبعاً درود ہو گیا۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ غیر نبی پر استقلالاً اور تبعاً ہر دو طریق سے صلوٰۃ کہنا جائز ہے۔ فھو المطلوب۔

اس پر فتح الباری میں لکھا ہے کہ" وقالت طائفة تجوز مطلقا وھو مقتضی صنیع البخاری فانه صدر بالایة وھی قوله تعالیٰ وَصَلِّ عَلَيهِم ثُمَّ علق الحدیث الدال علی الجواز مطلقا وعقبه بالحدیث الدال علی الجواز تبعاً"۔ یعنی ایک گروہ علماء کا لفظِ صلوٰۃ سے غیر نبی پر دعا کرنا مطلق جائز کہتا ہے خواہ استقلالاً ہو یا تبعاً یہی امام بخاریؒ کا صنیع چاہتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اول آیت "وَصَلِّ عَلَيهِم" ذکر کی ہے جو مطلق جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس کے بعد وہ حدیث ذکر کی ہے جو جواز پر تبعاً دلالت کرتی ہے۔ چونکہ اس حدیث کی مخالفت پر کوئی آیت اور حدیث نہ تھی اس لئے امام بخاری نے کوئی دلیل ممانعت کی ذکر نہ کی ۔ اسی طرح امام ابو داؤدؒ نے سنن ابو داؤد میں یوں باب باندھا ہے "باب الصلوٰۃعلی غیرالنبی صلی اللہ علیه وسلم" یعنی یہ باب غیر نبی پر درود پڑھنے کے بیان میں ہے پھر اس باب کے دعویٰ کو مندرجہ ذیل دلیل سے ثابت کیا ہے۔

"عن جابر بن عبداللہ ان امراۃقالت للنبی صلی اللہ علیه وسلم صَلِّ علیَّ وعلی زوجی فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم صلی اللہ علیك وعلی ذوجك" یعنی جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی ﷺ سے یہ عرض کی کہ آپ مجھ پر اور میرے خاوند پر رحمت کی دعا کریں آپ نے فرمایا

کہ "صلى الله عليك وعلى زوجك" یعنی اللہ تیرے اور تیرے خاوند پر رحمت کرے۔اس حدیث میں بھی لفظِ صلوٰۃ سے غیر نبی پر دعا کی گئی ہے۔ یہی ہمارا دعویٰ تھا جو بفضلہ قرآن وحدیث سے ثابت ہو گیا ہے۔

عون المعبود شرح ابوداؤد جزء اول ص ۵۶۳ میں ہے کہ "قال ابن الملك الصلوٰة بمعنى الدعاء والتبرك قيل يجوز على غير النبى قال الله تعالىٰ فى معطى الزكوٰة وَ صَلِّ عَلَيهِم وأما الصلوٰة التى لرسول الله ﷺ فانها بمعنى التعظيم و التكريم فهى خاصة له انتهى" یعنی ابن الملک نے کہا ہے کہ صلوٰۃ دعاء اور تبرک کے معنی میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ غیر نبی پر صلوٰۃ جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ دینے والے کے حق میں "وَصَلِّ عَلَيهِم" حکم صادر فرمایا ہے اور وہ صلوٰۃ جو نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہے وہ صلوٰۃ ہے جو تعظیم اور تکریم کے معنی میں ہے۔ پھر مؤلف عون المعبود نے کہا ہے کہ قاضی عیاض نے شفاء میں اور خفاجی نے اس کی شرح میں بہت لمبی بحث کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسی قیل و قال اور بحث وجدال سے اہلحدیثوں کو کچھ سروکار نہیں ہے۔ ہمیں تو ظاہر قرآن وحدیث کو دیکھنا چاہیے سو وہ ہمارے ساتھ ہے۔

امام ابن ماجہ نے باب باندھا ہے "باب مايقال عند اخراج الزكوٰة" یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ زکوٰۃ لینے کے وقت کیا کہا جاوے۔

امام نسائی نے یوں باب باندھا ہے کہ "باب صلوٰة الامام على صاحب الصدقة" یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ امام المسلمین صدقہ دینے والے پر صلوٰۃ یعنی درود کہے۔ پھر دونوں اماموں نے اپنے اپنے بابوں کے تحت میں وہی حدیث ذکر کی ہے جو امام بخاریؒ نے ابن ابی اوفیٰؓ سے ذکر کی تھی جس میں "اللهم صل على ال ابى اوفى" وارد ہے۔ اس سے مقصد ان تمام ائمہ دین کا یہ ہے کہ غیر نبی پر لفظِ صلوٰۃ سے دعا کرنا جائز ہے اور اب بھی امام 'امیر زکوٰۃ دینے والوں پر اس طرح دعا کر سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ائمہ محدثین خصوصاً ائمہ صحاح ستہ غیر نبی پر لفظِ صلوٰۃ سے دعا کرنا جائز جانتے ہیں اور اختلاف علماء کے وقت صحاح ستہ کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔ کیونکہ اہل حق کا ان کے مستند اور متداول ہونے پر اتفاق ہے اور ان کی

تبویب اور دلائل حدیثیہ معتبر ہیں سوائے اہل بدعت کے ان پر کوئی معترض نہیں ہو سکتا۔ تمام مدارسِ اسلامیہ میں یہی کتابیں صحاح کی قدیم سے رائج ہیں۔

زید: آپ نے ظاہر قرآن وحدیث سے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "لفظِ صلوٰۃ" سے غیر نبی پر درود پڑھنا اور دعا کرنا جائز ہے۔ لیکن ائمہ سلف کے اقوال سے ثابت کیجئے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ ان دلائل سے انہوں نے بھی استدلال کیا ہے۔ اور لفظِ صلوٰۃ کو آنحضرت ﷺ سے مخصوص نہیں سمجھا، کیونکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لفظِ "صلوٰۃ" سے دعا نبیؐ کے ساتھ خاص ہے۔

محمود: قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے اقوال غیر کی طرف رجوع کرنا اور ان پر بھروسہ کرنا یہ اہل حدیث کی شان نہیں ہے۔ پہلی امتیں اسی سبب سے گمراہ ہوئی تھیں کہ انہوں نے حکمِ الٰہی اور فرمانِ نبویؐ کے ہوتے ہوئے احبار ورہبان کے اقوال پر اعتماد کیا اور ان کو مستند جان کر استدلال میں پیش کیا۔ اس امت میں بھی یہ مرض عرصہ سے پھیل چکا ہے کہ قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے اقوال علماء پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور ان کو مستند جان کر ان کی اقتداء کرتے ہیں۔ قرآن وحدیث کا خلاف ہو جائے کوئی بات نہیں، علماء کے اقوال اور ان کے مذہب کا خلاف نہ ہو۔ حالانکہ یہ حرام ہے اور ایسے لوگ قطعاً اہل حدیث اور اہل سنت کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ ہاں میں اپنے استدلال کی تائید کے لئے علماءِ سلف کے اقوال پیش کرتا ہوں۔ سو واضح ہو کہ اول تو ائمہ صحاح کی تبویب سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ غیر نبی پر لفظِ "صلوٰۃ" کا استعمال جائز جانتے ہیں۔ کما رآیتھا

اور یہ بھی فتح الباری کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ ایک طائفہ علماء اس کے جواز کا مطلقاً قائل ہے۔ مزید اور عرض کرتا ہوں کہ فتح الباری پارہ ۲۶ ص ۵۸ میں ہے کہ "قال عیاض عامة اهل العلم علی الجواز" یعنی عام اہل علم اس کو جائز کہتے ہیں۔ پھر امام مالک وغیرہ سے اس کی کراہت نقل کی ہے اور پھر لکھا ہے۔ "و خالفه یحییٰ بن یحییٰ فقال لا بأس به و احتج بان الصلوة دعاً بالرحمة لا یمنع الا بنص او اجماع" یعنی امام یحیٰی نے مالکی وغیرہ علماء کی مخالفت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ

لفظِ "صلوٰۃ" سے غیر نبی کے حق میں دعا کرنا جائز ہے کچھ ڈر نہیں۔ کیونکہ دعاء دعاء بالرحمۃ ہے جو بغیر نص شرعی یا اجماع امت کے ممنوع نہیں ہو سکتی۔

فرشتوں کا غیر نبی پر درود بھیجنا: پھر حافظ ابن حجرؒ نے اقوال علماء مانعین و قائلین کے لکھتے ہوئے مجوزین کی بابت لکھا ہے کہ " وهذا القول جاء عن الحسن ومجاهدو نص عليه احمدفي روايت ابي دائود وبه قال اسحاق وابو ثور و دائود والطبرا ني واحتجّ بقوله تعالىٰ هو الذى يصلي عليكم و ملائكته و في صحيح مسلم من حديث ابى هريرة مرفوعا ان الملائكة تقول لروح المومن صلى الله عليك وعلى جسدك انتهٰى" یعنی لفظِ صلوٰۃ سے غیر نبی پر دعا کرنے کا مسئلہ امام حسن بصری اور مجاہد سے آیا ہے اور امام احمد نے اس پر تصریح کی ہے۔ اور یہی مذہب امام اسحٰق اور ابو ثور اور داوٗد اور طبرانی کا ہے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل پکڑی ہے کہ "هو الذى يصلي عليكم و ملائكته" یعنی اللہ وہ ذات ہے جو تمہارے پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے لفظِ صلوٰۃ کا استعمال غیر نبی پر کیا ہے اور صحیح مسلم کی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دلیل لی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے روح مومن کو کہتے ہیں کہ " صلى الله عليك وعلى جسدك " کہ اللہ تیرے پر اور تیرے جسم پر رحمت کرے ۔اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فرشتے غیر نبی پر درود پڑھتے ہیں جس سے جواز ثابت ہوا۔ ان ائمہ دین نے ان شرعی دلیلوں سے استدلال کر کے غیر نبی پر لفظ صلوٰۃ سے دعاء کرنا جائز رکھا ہے۔

زید : فتح الباری وغیرہ میں مرقوم ہے کہ امام مالکؒ اور سفیانؒ نے غیر نبی پر لفظِ صلوٰۃ کا استعمال ناجائز قرار دیا ہے اور قاضی عیاضؒ نے کہا ہے کہ "والذى اميل اليه قول مالك و سفيان وهو قول المحققين من المتكلمين و الفقهاء قالوا يذكر غير الانبياء بالرضاء و الغفران و الصلوٰة على غير الانبياء يعنى استقلالا لم تكن من الامر المعروف و انما احدثت في دولة بني هاشم ،انتهٰى" یعنی جس طرف میں مائل ہوں وہ قول مالکؒ اور سفیانؒ کا ہے اور یہی قول متکلمین میں سے محققین کا ہے

اور یہی قول بعض فقہاء کا ہے انہوں نے کہا ہے کہ غیر انبیاء کا رضاء اور غفران سے ذکر کیا جائے یعنی رضی اللہ عنہ اور غفر اللہ لہ کہا جائے اور صلوٰۃ غیر انبیاء پر استقلالاً امر معروف میں سے نہیں ہے یہ تو بنی ہاشم کی حکومت کے وقت حادث ہوئی ہے۔

محمود : مذہب اہل حق کا مسئلہ مسلمہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سے قولاً یا فعلاً یا استقراراً کوئی چیز ثابت ہو جائے اور کسی چیز کا جواز یا عدم جواز معلوم ہو جائے تو پھر قول غیر نبی کی تقلید کرنا شرک ہے اور آیت "اتخذوا احبار ھم ورھبانھم ارباباًمن دون اللہ "یعنی اہل کتاب نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب ٹھہرا لیا ہے۔ سو رب ٹھہرانا یہی ہے۔ دلیل شرعی کے مقابلہ میں غیر کے قول پیش کرنا اور اس کی اتباع بلا دلیل کرنی۔ چنانچہ فتاویٰ نذیریہ جلد ا ص ۹۶ میں مسلم الثبوت سے منقول ہے کہ "عن ائمتنا لا یحل لاحد ان یفتی بقولنا مالم یعلم من این قلنا" ہمارے اماموں سے یہ مروی ہے کہ کسی شخص کو یہ حلال نہیں ہے کہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک یہ نہ جان لے کہ ہم نے کس دلیل سے وہ بات لکھی ہے۔

پس آپ کے ذمہ ہے کہ آیت یا حدیث پیش کریں جس سے ان ائمہ نے ممانعت کا استدلال کیا ہے۔ بغیر اس کے ان کے قول سے استدلال کرنا حرام ہے باقی یہ کہنا کہ غیر انبیاء پر صلوٰۃ کہنا دولت بنی ہاشم میں حادث ہوا ہے سراسر باطل ہے ہم احادیث نبویہ سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ عہد نبوی ﷺ سے یہ جاری ہوا ہے اور خود نبی ﷺ نے اس پر عمل کیا ہے۔

فتح الباری پارہ ۲۶ ص ۵۸ میں ہے "وقع مثلہ عن قیس بن سعد بن عبادۃ ان النبی ﷺ رفع یدیہ وھو یقول اللھم اجعل صلوٰتک و رحمتک علی ال سعد بن عبادۃ اخرجہ ابو داود و النسائی و سندہ جید" یعنی اسی طرح قیس بن سعد بن عبادہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا فرمائی کہ "اللھم اجعل صلوٰتک و رحمتک علی ال سعد بن عبادۃ" یعنی اے اللہ تیری صلوٰۃ اور رحمت ال سعد پر ہو۔

اس حدیث فعلی سے صلوٰۃ کا استعمال غیر نبی پر جائز ثابت ہو گیا۔ پس تحکم لقد

کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ کہ تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ نہایت اچھا نمونہ ہیں۔ ہر دینی کام میں آپ کے قول و فعل کو دیکھ کر کام کرنا چاہئے۔ پس ہمارے پاس یہ فعلی حدیثیں بطور دلیل موجود ہیں کہ یہ جائز ہے اور عہد نبویؐ سے رائج ہے۔ آپ اس کے مقابلہ میں ممانعت کی دلیل پیش کریں۔ میں حدیث نبویؐ کے مقابلہ میں کسی کے قول کو پیش کرنا توہینِ رسولؐ جانتا ہوں۔ اور یہ شرک فی الرسالت ہے۔ افعال نبوی شرعی اور تعبدی ہوتے ہیں۔ جبکہ ان میں لغزش، سہو، طبعی اور خصوصی ہونے کا یقین نہ ہو۔ جو دلائل فعلی پیش کئے ہیں ان میں نہ لغزش کا احتمال ہے اور نہ سہو کا نہ طبعی ہونے کا۔ اور نہ مخصوص ہونے کا۔ پس یہ شرعی تعبدی افعال سے ہے جس میں ہم کو اقتداء کرنی جائز بلکہ ضروری ہے۔ نور الانوار ص ۲۱۴۔ میں ہے۔ والصحیح عندنا ان ما علمنامن افعالہ صلعم واقعا علی جھۃ من الوجوب لہ او الندب اوالا باحۃ تقتدی بہ ایقاعہ علی تلک الجھۃ حتٰی یقوم دلیل الخصوص۔ یعنی ہمارے نزدیک صحیح یہ بات ہے کہ ہم نے جس طریقہ پر نبی صلعم کے افعال کو جان لیا ہم ان کی اقتداء کریں گے۔ اگر وجوب کے طریق پر جان لیا تو واجب جان کر اقتداء کریں گے۔ اگر مستحب یا مباح کے طریق پر ہوا تو اسی طریق سے اقتداء کریں گے۔ جب تک کہ خصوصیت کی دلیل قائم نہ ہو ہم افعال نبویہؐ کی اقتداء کریں گے۔ (مضمون ہذا کی صرف پانچ قسطیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ابراہیم خلیل)

از عبدالقادر عارف حصاریؒ

(ماہنامہ صحیفہ اہل حدیث دہلی جلد ۲۷ شمارہ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ بابت ماہ محرم، صفر، ربیع الاول وثانی وجمادی الاول ۱۳۴۴ھ)

نماز میں درود؟

یعنی امام کی قرات کے دوران حضور ﷺ کا نام آجائے تو مقتدی درود پڑھے یا نہ؟

واضح ہو کہ اخبار تنظیم ہمارا جماعتی اخبار ہے۔ اس لیے بندہ راقم السطور اس کو

بہت غور سے پڑھتا ہے۔ خصوصاً باب الاستفتاء والفتویٰ کو تو نہایت شوق سے دل کی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے۔ کیونکہ جناب مفتی اعظم حضرت العلام متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ کے تحقیقی فتوے بڑے قیمتی اور نہایت غنیمت ہیں' جن کو پڑھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔

چنانچہ تنظیم اہلحدیث مطبوعہ ۲۶ر فروری سنہ۔۱۹۶۰ء کے ص۔۵ کو ملاحظہ کیا تو کئی سوال و جواب میری نظر سے گزرے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کیا مقتدی نماز میں محمد (ﷺ) کا نام سن کر صلی اللہ علیہ وسلم کہہ سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے جواب سے جواز ظاہر ہوا۔ جو میری مسرت کا باعث تھا۔ کیونکہ اس پر کسی بزرگ عالم اہلحدیث یا حنفی وغیرہ کا عمل نہیں پایا گیا۔ بلکہ بعض مفسد نماز جانتے ہیں۔ یہ احقر خلیقہ اس کو نماز اور غیر نماز میں واجب سمجھتا ہے۔ اس لیے اس پر عامل ہے۔

الحمد للہ حضرت العلام مدظلہ العالی بھی اس طرح نماز میں درود پڑھنے کو مفسد نماز نہیں جانتے اور نام مبارک سن کر درود پڑھنے کے جو عام دلائل ہیں' ان کو نماز پر بھی شامل سمجھتے ہیں۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ جو لوگ اس کو کلام کے حکم میں سمجھ کر مفسد نماز کہتے ہیں' ان کا قول فاسد ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ کلام کے حکم میں نہیں ہے بلکہ "جنس صلوۃ" سے ہے۔ دوم فساد نماز پر کوئی دلیل ناطق نہیں۔ اور دعویٰ بلا دلیل باطل ہے۔

افسوس ہے کہ جو ظاہری طور پر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے عاشق بنتے ہیں اور نعرہ رسالت سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں' وہ بھی نماز کی تلاوت میں نام رسول (ﷺ) سن کر یا پڑھ کر درود نہیں بھیجتے۔ حالانکہ ایسے موقعہ پر درود پڑھنا واجب ہے۔ امام ابن حجر نے "الدر النضید" میں اس بارہ میں متعدد احادیث نقل کی ہیں' جن سے وجوب ظاہر ہوتا ہے اور تارک درود کے حق میں وعید وارد ہے۔ چنانچہ علامہ محمد معین السندی دراسات اللبیب ص۔۲۶۳ میں فرماتے ہیں: **فان لفظ الاحادیث من ذکر صلی اللہ علیہ وسلم عندہ وھو عام یشمل المصلی وغیرہ ظاھر ذلک الوجوب علیہ کغیرہ لعموم الوعید علی التارک۔** یعنی "ترک درود پر وعید کی احادیث کے الفاظ **من ذکر عندہ** عام ہیں۔ جو نمازی اور غیر نمازی کو شامل ہیں۔ نتیجہ صاف ہے کہ

نام مبارک پڑھنے سننے والے پر درود ہر حال میں واجب ہے۔ خواہ حالت نماز میں ہو یا کسی اور حال میں! اور اگر سستی کرے گا تو ہر حال میں گنہگار ٹھہرے گا۔ اور اسی کتاب کے ص-۲۴۲ پر فرماتے ہیں: **قلنا تارک الصلوٰة عند ذکر النبی صلی اللّٰه علیه وسلم وقع علیه الوعید الشدید بانحاء مختلفة فی الاحادیث الثابتة بطرق متعددة**۔ یعنی "ہم کہتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام نامی اسم گرامی سن کر درود کے تارک پر احادیث میں کئی وعید آئے ہیں اور یہ احادیث متعدد طرق سے ثابت ہیں۔ پھر علامہ سندی اپنے دعوے کے اثبات میں حسب ذیل حدیث لائے ہیں:

(۱) **من ذکر صلی اللّٰه علیه وسلم عنده فلم یصل علیه فکان شقیا**۔ یعنی جس شخص کے پاس نبی کریم ﷺ کا نام ذکر ہوا اور اس نے آپ پر درود نہ پڑھا وہ بدبخت ہے۔

(۲) **ان جبرئیل عرض لی فقال بعدا" لمن ذکرت عنده فلم یصل علیک فقلت آمین**۔ یعنی میرے سامنے جبرئیل علیہ السلام نے پیش ہو کر یہ دعا کی کہ جس شخص کے پاس آپ کا ذکر ہو اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے تو اس کے لیے رحمت الٰہی سے دوری ہو۔ میں نے اس پر آمین کہی۔

(۳) جبرئیل علیہ السلام نے پکارا **یامحمد**! آنحضرت ﷺ نے فرمایا **لبیک وسعدیک** کہ میں حاضر خدمت ہوں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا **من ذکرت عنده فلم یصل علیک فمات ولم یغفرله فدخل النار فابعده قل امین**۔ یعنی جس شخص کے پاس آپ کا ذکر ہوا اور اس نے آپ پر درود نہ پڑھا' پس مر گیا اور اس کے لیے بخشش نہ ہوئی اور وہ دوزخ میں داخل ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو رحمت سے دور رکھے۔ آپ اس پر آمین کہہ دیجئے۔

(۴) بعض روایتوں میں یہ الفاظ ہیں۔ حضور ﷺ کا نام سن کر درود نہ پڑھنے والا **ابخل الناس** سب سے زیادہ بخیل ہے۔

(۵) اور بعض میں یہ لفظ ہیں **فهو ملعون** کہ وہ ملعون ہے۔

(۶) بعض میں یہ لفظ ہیں **فقد اخطا طریق الجنة** کہ جس نے نبی ﷺ کا ذکر سن کر درود نہ پڑھا وہ جنت کے راستہ سے خطا کر گیا۔

ان روایتوں کے راوی بعض ثقہ ہیں' بعض روایتیں مرسل ہیں' بعض ضعیف ہیں۔ پھر فرمایا ہے لکن بتعدد الطرق بلغ درجة الحسن یعنی مجموعہ طرق سے یہ حدیث درجہ حسن کو پہنچ جاتی ہے جو حجت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان احادیث میں لفظ "من" وارد ہے۔ جس کی بابت علماء اصول نے لکھا ہے کہ یہ الفاظ عامہ سے ہے' جو سب کو شامل ہے۔ اس لیے اس میں نمازی (قاری ہو یا سامع) بھی داخل ہیں۔ ہاں خاص اس موضوع پر کہ نمازی اس وقت درود پڑھے کوئی دلیل وارد نہیں لیکن ابن حجر نے فرمایا ہے کہ ان حکم الشئی الخاص الذی لم یذکر فیه نص داخل تحت حکم دلیل اخر بطریق العموم۔ (فتاویٰ نذیریہ ج-۲' ص-۳۴۱ بحوالہ فتح الباری) "لیکن جب کسی خاص شے میں کوئی خاص حکم نہ ہو تو وہ شے حکم عام میں شامل ہو گی"

اس مسئلہ میں بھی یہی قاعدہ جاری ہو گا اور بموجب احادیث مذکور نمازی کو بھی نبی اکرم ﷺ کا نام مبارک سن کر درود پڑھنا چاہیے بلکہ بوجہ وعید شدید درود پڑھنا واجب ہے۔

رہا حضرت العلام کا یہ فرمانا کہ تلاوت نماز میں آنحضرت ﷺ کا نام پڑھنے سننے والا اگر درود نہ پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ اس پر کوئی دلیل وارد نہیں ہے اور حضرت العلام نے اس پر جو دلیل بیان فرمائی ہے وہ اس صورت کو ہرگز شامل نہیں ہے۔ کیونکہ اس دلیل کو آنجناب نے پورے الفاظ سے نقل نہیں فرمایا۔ ابوداؤد میں پورے الفاظ یہ ہیں کہ فلا تقرؤا بشئی من القران اذا جهرت الا بام القران۔ یعنی "جب میں قرات بالجہر کروں تو اس وقت تم قرآن میں سے ماسوا فاتحہ کے کچھ نہ پڑھو۔"

حدیث مذکور میں مطلق شے کی قرات سے منع نہیں کیا گیا بلکہ "من القرآن" کے الفاظ میں محض تلاوت قرآن سے روکا گیا ہے۔ باقی رہا درود تو اس کے وجوب پر دیگر عمومی دلائل قائم ہیں اور خاص حالت نماز میں درود پڑھنے کی ممانعت ثابت نہیں' لہٰذا نماز میں وجوب قائم رہا۔ دار قطنی مطبوعہ فاروقی دہلی ص-۱۲۱ میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بھی یہی الفاظ ہیں۔ فلا یقران احد منکم من القران شیئا اذا جهرت

بالقراۃ الا بام القران ھذا اسناد حسن ورجالہ ثقات کلھم۔ یعنی "جب میں قرات بلند آواز سے پڑھوں تو تم میں سے کوئی شخص قرآن میں سے کوئی چیز نہ پڑھے۔" اس میں بھی محض قرآن پڑھنے کی نفی ہو رہی ہے۔ درود کی نفی نہیں ہے۔ حافظ دار قطنی کے نزدیک اگرچہ یہ حدیث حسن ہے۔ مگر مولانا احمد علی سہارنپوری حنفی نے اپنی کتاب "دلیل قوی" میں یہ حدیث ذکر فرما کر لکھا ہے کہ "ایں روایت صحیح است"

اگر کوئی یہ کہے کہ اس دلیل سے تو درود پڑھنا ممنوع ظاہر نہیں ہوتا لیکن آیت کریمہ واذا قری القران کے مطابق قرآن کا استماع تو بہرحال فرض ہے۔ قرآن کی قرات کے وقت خاموشی واجب ہے۔ لہٰذا تلاوت قرآن کے دوران درود بھی نہ پڑھنا چاہیے تو اس کے بہت سے جواب ہیں۔ لیکن بندہ اپنے مضمون کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ اس لیے ایک ہی جواب عرض کرتا ہے جو اہل حدیث اور حنفی ہر شخص کو مسلم ہے اور وہ یہ ہے کہ جب واجب کا واجب سے مقابلہ ہو اور کسی ایک واجب کے ترک پر کوئی نص وارد نہ ہو تو دونوں پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے۔ اس کی نظیر اہلحدیث کے لیے سورہ فاتحہ کا پڑھنا اور قرآن کا سننا ہے۔ یعنی جب قرآن کی کوئی سورت پڑھ رہا ہو تو اہلحدیث کا مذہب یہ ہے کہ اس حال میں شامل ہونے والا مقتدی فاتحہ ضرور پڑھے اور جماعت اہلحدیث کا عمل یہی ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ جب سورہ فاتحہ سے استماع فوت نہیں ہوتا اور انصات واجب نہیں تو پھر درود کی ممانعت کس دلیل سے ہے اور اس کے قلیل لفظوں سے استماع کیسے فوت ہو سکتا ہے' فتذکروا۔

اور حنفیہ کے لیے اس کی نظیر جمعہ کا خطبہ اور درود والی آیت کے جواب میں درود پڑھنا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک جمعہ کا خطبہ سننا فرض ہے لیکن جب آیت یاایھا الذین آمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیما خطیب پڑھے تو سامعین پر درود پڑھنا بھی فرض ہے۔ اب دو فرضوں کا ایک وقت میں تعارض اور ٹکراؤ ہو گیا تو اب دونوں پر عمل ضروری ہے اور حنفیہ کا عمل بھی یہی ہے۔

چنانچہ شرح وقایہ ص-۱۷۵ میں ہے الا اذا قرا قولہ تعالیٰ "صلوا علیه" فیصلی سرا۔ یعنی جب خطیب آیت "صلوا علیه" پڑھے تو سامع (مقتدی) آہستہ درود پڑھے۔ (کذا فی الہدایہ) فتح القدیر جلد اول' ص-۲۶۵ میں ہے کہ امام ابو یوسف سے

مروی ہے کہ خطبہ سننے والے کو لائق ہے کہ درود آہستہ پڑھے۔ اس واسطے کہ آہستہ درود پڑھنے سے اس کے خطبہ سننے میں خلل واقع نہیں ہو گا۔ پس آہستہ درود پڑھنے میں دونوں فضیلتیں خطبہ سننے اور درود پڑھنے کی حاصل ہوں گی اور یہی حق اور ثواب ہے۔

اسی طرح نہایہ جلد اول' ص-۱۴۷ میں علامہ عینی فرماتے ہیں: **فان قلت توجه امران احدهما صلوا عليه وسلموا والامر الاخر قوله تعالٰى واذا قرى القران فاستمعوا له وانصتوا قال مجاهد نزلت فى الخطبة والاشتغال باحدهما يفوت الاخر قلت اذا صلى فى نفسه وانصت ويكون سكت اتيا بموجب الامرين انتهٰى۔** یعنی "اگر تو یہ کہے کہ اس سامع پر دو امر فرض ہوئے ایک "**صلوا عليه وسلموا**" اور دوسرا "**واذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا**" کیونکہ مجاہد تا.جی کہتے ہیں کہ یہ آیت خطبہ جمعہ میں نازل ہوئی ہے۔

اب اگر ایک میں مشغول ہو تو دوسرا فوت ہوتا ہے۔ تو میں کہوں گا کہ جب سامعین کلمات درود اور سلام آہستہ پڑھیں گے تو دونوں حکموں کی تعمیل ہو جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح نام نبوی سن کر آہستہ درود پڑھنے سے استماع فوت نہ ہو گا اور دونوں حکموں کی تعمیل ہو جائے گی۔

ہمارے امام حضرت علامہ ابن حزم محلی ج-۴' ص-۲۳۹ میں رقمطراز ہیں: **وتمام الاية حجة عليهم لان الله تعالٰى قال واذا قرى القران الاية واذكر ربك فى نفسك الايه قال على فان كان اول الايه فى الصلٰوة فاخرها فى الصلوة وان كان آخرها ليس فى الصلٰوة فاولها ليس فى الصلوة وليس فيها الا الامر بالذكر سرا وترك الجهر فقط۔** یعنی پوری آیت حنفیہ پر حجت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جیسے **واذا قرى القرآن** آیت فرمائی ہے' اسی طرح **واذكر ربك فى نفسك** آیت بھی فرمائی ہے۔ اگر پہلی آیت نماز کے بارے میں ہے تو دوسری آیت بھی نماز کے متعلق ہے۔ اگر دوسری نماز کے بارے میں نہیں تو پہلی بھی نہیں ہے۔ دوسری میں صرف یہ تشریع ہے کہ ذکر الٰہی آہستہ کرے اور بلند آواز سے نہ کرے' اسی کے ہم قائل ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جب نام محمد (ﷺ) آئے گا تو قاری بھی درود پڑھے گا۔ کیونکہ

اس پر بھی بعموم حدیث درود واجب ہے۔ جب وہ پڑھے گا تو قرات منقطع کرے گا۔ اس وقت سامع بھی پڑھ لے گا اور آیت کا خلاف نہ ہو گا۔ **ھذا ماظھر لی واللّٰہ اعلم بالصواب۔**

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد۔۱۲' شمارہ۔۳۲ مورخہ ۲۵ر مارچ سنہ۔۱۹۶۰ء

دفع مصیبت و حصول ثواب کی غرض سے کچھ دیگر لوگوں سے درود شریف پڑھوانا کیسا ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب لوگ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں یا ان پر حق یا ناحق کوئی مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ نیز ثواب حاصل کرنے کے لیے چند آدمیوں کو بلا کر دوپہر تک درود شریف پڑھاتے رہتے ہیں۔ بعد ازاں درود شریف پڑھنے والوں کو روٹی کھلا کر چار چار آنے آٹھ آٹھ آنے دے کر رخصت کر دیتے ہیں اور اس طریقہ کو ہمارے ہاں "لکھ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور "لکھ" لوگوں میں اتنی اہمیت حاصل کر چکا ہے کہ اگر کوئی آدمی اس میں داخل ہونے سے انکار کر دے تو اس کو لوگ ملامت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کو درود شریف کا منکر سمجھتے ہیں۔ اب قابل توضیح بات یہ ہے کہ کیا یہ طریقہ ختم المرسلین ﷺ کے زمانہ میں یا زمانہ مشہولہ بالخیر میں پایا جاتا تھا یا نہیں؟ کیا بدعت تو نہیں ہے؟ اس سے اجتناب کیا جائے۔ **بینوا بالدلیل توجروا عند اللّٰہ الجلیل۔**

(ایک سائل)

جواب اس طرح درود شریف پڑھانا بدعت ہے۔ نہ اس ہیئت کذائیہ سے آنحضور ﷺ نے درود شریف پڑھا اور نہ پڑھنے کا حکم دیا اور نہ صحابہ کرام نے ایسا عمل کیا اور نہ تابعین نے اور نہ تبع تابعین نے اور نہ ائمہ اربعہ نے۔ قرون ثلاثہ سے

مستند اور صحیح درود وسلام کون سا ہے؟

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد۔۲۷' شمارہ۔۴'۵'۶ مورخہ ۱۱ و ۱۸ اپریل سنہ۔۱۹۷۵ء

مکرم ومحترم حضرت مولانا! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

عرض ہے کہ حسب ذیل مسئلہ کی تحقیق فرما کر مشکور فرمائیں۔

قرآن مجید میں ہے : ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔(پارہ۔۲۲) (ترجمہ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی) "تحقیق اللہ اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اوپر نبی کے' اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' درود بھیجو اُوپر اُس کے اور سلام بھیجو' سلام بھیجنا"

سوال نمبر۔۱ : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی ذات اطہر پر درود وسلام پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس کا صحیح مطلب اور مفہوم بیان فرمایا جائے اور درود شریف پڑھنے کی کیفیت کیا ہے؟

سوال نمبر۔۲ : کون سا درود شریف مستند اور صحیح ہے اور سلام کون سا مسنون ومستند ہے؟

سوال نمبر۔۳ : بریلوی حضرات جو درود وسلام پڑھتے ہیں وہ یہ ہے : الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ۔ وہ اپنی مساجد میں اذان سے پہلے مذکورہ بالا آیت پڑھ کر یہی درود وسلام پڑھتے ہیں پھر اذان کہتے ہیں۔ کیا شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے اور کسی حدیث میں اس کا ثبوت ہے؟

کیا زمانہ نبوی یا زمانہ صحابہ کرام میں یہ درود پڑھا جاتا تھا؟ اگر نہیں تو پھر یہ خود ساختہ بناوٹی درود کب ایجاد ہوا' اس کا موجد کون ہے؟

بریلوی دوست ابراہیمی درود شریف صرف نماز میں پڑھتے ہیں۔ چنانچہ مفتی احمد یار گجراتی اپنی شرح مشکوٰۃ جلد دوم باب الصلوٰۃ علی النبی میں ابراہیمی درود کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ درود شریف ابراہیمی صرف نماز کے لیے ہے' نماز کے علاوہ نہیں۔

ہمارے خیال میں مفتی صاحب کی یہ بات بلا دلیل اور خود ساختہ ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ ابراہیمی درود شریف سب درودوں سے زیادہ بہتر افضل اور مستند ہے۔

آنجناب سے درخواست ہے کہ اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے کہ کون سا درود مستند'

صحیح اور افضل ہے اور سلام کون سا صحیح ہے۔ قرآن وحدیث سے ثبوت باحوالہ ہو۔ صرف صفحہ نہیں بلکہ باب اور فصل کا حوالہ بھی لکھیں کیونکہ مطبوعات مختلف ہونے کی وجہ سے بعض دفعہ صفحات مختلف ہو جاتے ہیں اور حوالہ نہیں ملتا۔ (عبدالحمید سنگت پورہ لاہور)

الجواب بعون الوهاب

جواب نمبر۔۱ : الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین' اما بعد! واضح ہو کہ مولوی عبدالحمید صاحب سنگت پوری کے سوالات بابت درود شریف موصول ہوئے۔ ان کے جوابات نمبروار درج ذیل ہیں۔ قارئین کرام! خوب غور سے پڑھ کر حکم شرعی وبدعی معلوم کریں۔

اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ یاایھا الذین امنوا صلوا علیه وسلموا تسلیماo میں حکم دیا ہے کہ "اے ایمان والو! تم نبی اکرم ﷺ پر درود پڑھو اور سلام کہو۔" لیکن خوب یاد رکھئے کہ جیسے سرور کائنات ﷺ نے نماز اور اس کے ارکان واذکار کی تعلیم دی ہے' ایسے ہی حضور ﷺ نے درود پڑھنا بھی سکھایا ہے۔ لوگوں کی رائے اور خواہش پر نہیں چھوڑا کہ وہ جس طرح چاہیں' درود کے الفاظ اختراع کر لیں۔

آیت کریمہ ان اللّٰہ وملائکته (الآیة) کا مطلب اور اس کی تفسیر حدیث سے واضح ہے۔ چنانچہ بخاری شریف جلد۔۲' ص۔۹۴۰ میں حدیث ہے : عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے بیان کیا کہ مجھ سے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے ملاقات کی اور فرمایا' کیا میں تجھے ایک تحفہ پیش نہ کر دوں (جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا ہے) وہ یہ ہے کہ جناب سید الانبیاء ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے' ہم (حاضرین) نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ آپ پر سلام کن لفظوں سے پڑھنا چاہیے۔ (چنانچہ تشہد میں پڑھا جاتا ہے : التحیات للّٰہ والصلوات والطیبات السلام علیک ایھا النبی ورحمته اللّٰہ وبرکاته) اب یہ فرمایئے کہ ہم آپ پر درود کن لفظوں سے پڑھا کریں؟ سید الکونین رہبر کائنات ﷺ نے فرمایا تم یوں پڑھا کرو : اللّٰھم صلی علی محمد وعلی اٰل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انک حمید مجیدo اللّٰھم بارک علی محمد وعلی اٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انک حمید مجیدo

اور یہ حدیث مطلق ہے کہ جب آنحضور ﷺ کا نام لیا جائے یا نام سنا جائے یا نماز میں تشہد پڑھا جائے اور آپ کا نام مبارک آجائے یا قرأت نماز میں آپ کا نام آجائے یا دعا کی جائے اور اس میں درود پڑھا جائے یا دیگر مقامات درود پر اس طرح کے لفظوں سے درود پڑھنا چاہیے یا دیگر احادیث میں وارد شدہ ان الفاظ سے جو رہبر کونین ﷺ سے ثابت ہوں یا اُن لفظوں سے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہوں، جنہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے براہ راست تعلیم حاصل کی ہے اور بالمشافہ الفاظ سیکھے ہیں، جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بروایت ابن ماجہ الرحمۃ المھداۃ فصل رابع مشکوٰۃ کے ص-۴۷ میں یہ قول مذکور ہے :

عن عبداللّٰہ بن مسعود قال اذا صلیتم علیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاحسنوا الصلٰوۃ علیہ فانکم لا تدرون لعل ذالک یعرض علیہ فقالوا فعلمنا قال قولوا اللّٰھم اجعل صلواتک ورحمتک وبرکاتک علیٰ سید المسلمین وامام المتقین وخاتم النبیین محمد عبدک ورسولک امام الخیر وقائد الخیر ورسول الرحمۃ اللّٰھم ابعثہ مقاما محمودا یغبطہ الاولون والاخرون اللّٰھم صل علیٰ محمد وعلیٰ اٰل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم انک حمید مجید۔ اللّٰھم بارک علیٰ محمد وعلیٰ اٰل محمد کما بارکت علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم انک حمید مجید۔ یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب تم رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھو تو بہتر صورت اور اچھے لفظوں سے درود پڑھا کرو، تمہیں نہیں معلوم کہ شاید یہ درود آنجناب پر پیش کیا جاتا ہو۔ لوگوں نے کہا کہ آپ ہم کو سکھا دیں کہ ہم کس طرح اور کن الفاظ سے درود پڑھا کریں۔ تب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا درود لوگوں کو سکھا دیا کہ یوں پڑھا کرو۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جن کی بابت حنفیہ کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کی تخم ریزی انہوں نے کی ہے تو اپنے اختراعی درود چھوڑ کر ان کا تعلیم کردہ درود پڑھنا چاہیے۔ لیکن افسوس ہے کہ حنفی کہلانے والوں نے من گھڑت اختراعی درود اور ان کے جھوٹے اختراعی فضائل مسلمانوں میں جاری کر دیئے ہیں۔ چنانچہ ان کی کتابوں میں درود لکھی، درود تاج، درود ناری، درود ہزارہ وغیرہ ناموں سے درج ہیں۔ اگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا تعلیم کردہ درود عوام

کو سیکھنا دشوار ہو تو مندرجہ ذیل مختصر درود سیکھ کر پڑھ لیں جو الرحمة المهداة کے اسی صفحہ پر درج ہے۔ چنانچہ حدیث یہ ہے : عن زيد بن خارجة قال سالت رسول الله صلى الله عليه وسلم قال صلوا على واجتهدوا فى الدعاء وقولوا اللّٰهم صلى على محمد وعلى آل محمد۔ (رواه النسائى) یعنی "زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے درود کی بابت سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم مجھ پر درود پڑھو اور دعا کرنے میں کوشش کرو اور یوں درود پڑھا کرو' اللّٰهم صل على محمد وعلى آل محمد۔"

تمام درودوں میں آنحضور ﷺ کے اہل بیت پر درود پڑھنے کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ یہ حدیث مذکور سنن نسائی جلد اول صفحہ ۱۵۲ میں موجود ہے اور اس حدیث کے راوی زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ عظیم المرتبت صحابی ہیں۔

مسند احمد میں بھی یہ حدیث ہے' اس میں درود کے الفاظ یہ ہیں : اللّٰهم بارک على محمد وعلى آل محمد كما باركت على آل ابراهيم انك حميد مجيد۔ یہ درود بھی مختصر ہے' جو عوام کے لیے آسان ہے۔ بہرحال ہر درود میں جناب سرور کائنات ﷺ کے ساتھ آل شامل ہے اور اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ "جب رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھا جائے تو آپ کی آل پر ضرور پڑھا جائے ورنہ قبول نہ ہو گا"

چنانچہ دار قطنی ص۔۱۳۶ میں حدیث ہے : عن ابى مسعود الانصارى قال قال رسول الله من صلى صلٰوة لم يصل فيها على ولا على اهل بيتى لم تقبل منه۔ یعنی "ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کوئی نماز پڑھی' اس میں مجھ پر اور میری آل پر درود نہ پڑھا تو اس کی وہ نماز قبول نہ کی جائے گی۔"

گو یہ حدیث ضعیف ہے مگر تائیداً پیش ہو سکتی ہے۔ اس لیے درود میں حضور ﷺ کی آل ضرور شامل ہونی چاہیے۔ ابو مسعود صحابی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہے' وہ فرماتے ہیں : لو صليت صلوة لا اصلى فيها على آل محمد ما رأيت ان صلواتى تتم۔ "اگر میں ایسی نماز پڑھوں جس میں آل محمد پر درود نہ بھیجوں تو میری نماز پوری نہیں ہو گی۔"

اہل بدعت کا وہ لنڈا دم بریدہ درود جس میں آل محمد شامل نہیں' وہ نامقبول ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جناب سید الکونین ﷺ پر وہی درود وہی سلام پڑھنا چاہیے جو آپ نے خود اپنی امت کو تعلیم فرمایا۔ ہمارا مسلک یہ ہے اور ہم اسی کو حق سمجھتے ہیں کہ نماز اور دیگر مواقع حاجات یا امور دنیا کی کامیابی کے لیے درود پڑھا جائے تو انہی الفاظ سے پڑھنا چاہیے جو احادیث میں وارد ہیں۔ اگر کسی محدث' امام یا عالم مجتہد نے اپنے الفاظ سے درود کی ایسی عبارت لکھی ہو جس کی بنیاد اللھم صلی علی محمد وعلی آل محمد پر ہو تو اس سے مفہوم صلوٰۃ بیشک ادا ہو جائے گا لیکن جو اثر اور نورانیت زبان نبوت کے تعلیم فرمودہ درودوں میں یا حضور ﷺ کے کسی جلیل القدر صحابی کے فرمودہ میں ہے' وہ کسی دوسرے کے الفاظ میں ہرگز نہیں پائی جا سکتی۔

یہ اسی زبان پاک کی شان تھی کہ اس کے لعاب دہن سے کڑوے پانی شیریں ہو جاتے' سانپ کا زہر رفع ہو جاتا اور چند انسانوں کا کھانا ہزاروں کے لیے کافی ہو جاتا تھا۔ اسی لیے بعض علماء مالکیہ کا خیال ہے کہ دوسرے لوگوں کے جملے اور درود کی عبارتیں صلوٰۃ شرعیہ کے قائم مقام نہیں ہو سکتیں' لہٰذا درود ماثورہ ہی پڑھنا واجب ہے۔

چنانچہ ابن کثیر میں زیر آیت صلوا علیہ وسلموا تسلیما یہ صراحت موجود ہے۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو فصیح اللسان عربی میں تھے' انہوں نے اپنی زبان سے صلوٰۃ وسلام کی عبارتیں نہ بنائیں بلکہ آنحضرت ﷺ سے درخواست کی یارسول اللہ کیف نصلی علیک۔ "اللہ کے رسول! ہم آپ پر کن الفاظ سے درود پڑھیں؟" آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ نہیں —— فرمایا کہ تم اپنی رضا سے درود وسلام ایجاد کر لو بلکہ جیسے قرآن مجید اور ادعیہ' اذکار' تسبیحات' کلمات طیبات' تشہد کی تعلیم دی' اسی طرح درود وسلام کے الفاظ بھی خود سکھائے۔ پس درود ماثورہ ماثور بہا ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی کا اپنا بنایا ہوا درود اس درود کا قائم مقام یا اجروثواب میں اس درود کے برابر ہو سکے جو اللہ کے پیارے نبی ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا۔

ہمیں کیا ضرورت ہے کہ افضل اور مسنون درود چھوڑ کر لوگوں کے مفضول اور غیر شرعی صلوٰۃ وسلام اختیار کریں۔ اگر کسی کو ہمارے اس مسلک اور عقیدے سے اختلاف ہو اور وہ ہمیں منکر درود کہتا ہے تو وہ اپنا موقف قرآن وسنت سے ثابت کرے ورنہ ہم منکر نہ ہوئے وہ منکر ہوا۔

سوال ۲ : سلام کون سا مستند اور مسنون ہے؟

جواب یہ ہے کہ جو سلام نماز میں پڑھا جاتا ہے اس کا بیان گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے : السلام علیک ایھا النبی ورحمة اللّٰہ اس کے علاوہ یوں بھی مسنون ہے : السلام علی النبی ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ۔ موطا امام مالک ص۔۴۱ میں ہے' حضرت نافع تابعی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (جو رسول اللہ ﷺ کے ملازم الصحبت تھے) جب تشہد پڑھتے تو یہ کہتے : السلام علی النبی ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ۔ تشہد ختم کرنے کے بعد ارادہ سلام پھیرنے کا کرتے تو یہ کہتے : السلام علی النبی ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ۔

فتح الباری پارہ نمبر۔۴' ص۔۲۰۳ میں ہے : قال عبدالرزاق اخبرنا ابن جریج اخبرنی عطاء ان الصحابة کانوا یقولون والنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم حی السلام علیک ایھا النبی فلما مات قالوا السلام علی النبی وھذا اسناد صحیح۔ یعنی "عبدالرزاق نے کہا کہ ہم کو ابن جریج نے خبردی' انہوں نے کہا مجھے عطاء تابعی نے خبردی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی زندگی میں تشہد میں السلام علیک ایھا النبی پڑھا کرتے تھے۔"

میں کہتا ہوں بخاری شریف پارہ نمبر۔۲۰ کے آخری باب میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حیات مبارک میں ہم السلام علیک ایھا النبی پڑھا کرتے تھے۔ فلما قبض قلنا السلام علی انبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ جب آپ وفات پا گئے تو ہم (صحابہ) السلام علی النبی پڑھا کرتے تھے۔

فرقہ بریلویہ کی مسلمہ کتاب شفا قاضی عیاض کے ص۔۲۲۸ میں ہے : وفی تشھد علی رضی اللّٰہ عنہ السلام علی نبی اللّٰہ السلام علی انبیاء اللّٰہ ورسلہ السلام علی رسول اللّٰہ السلام علی محمد بن عبداللّٰہ "کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تشہد میں السلام علی النبی آخر تک مروی ہے۔"

بریلوی فرقہ کی مستند کتاب مدارج النبوۃ جلد۔۱' ص۔۸۴ میں ہے : ودر کرمانی شرح بخاری گفتہ است کہ صحابہ بعد از فوت حضرت السلام علی النبی ے گفتند نہ بصیغہ خطاب۔ یعنی کرمانی شرح بخاری میں ہے کہ صحابہ بعد وفات آنحضرت ﷺ السلام علی النبی کہا کرتے

تھے لفظ خطاب سے نہ کہتے تھے۔

فتح الباری شرح صحیح بخاری ج۔۵' ص۔۶۵۸ میں ہے : فظاهرها انهم كانوا يقولون السلام عليك ايها النبی صلی الله عليه وسلم بكاف الخطاب فی حياة النبی صلی الله عليه وسلم فلما مات النبی صلی الله عليه وسلم تركوا الخطاب وذكروه بلفظ الغيبة فصاروا يقولون السلام علی النبی۔ یعنی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی حیات میں کاف خطاب کے ساتھ السلام علیک ایھا النبی پڑھا کرتے تھے۔ پس جب نبی کریم ﷺ وفات پا گئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لفظ خطاب کو چھوڑ دیا اور لفظ غائب کے ساتھ السلام علی النبی پڑھنے لگے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس تعامل سے یہ ظاہر ہوا کہ لفظ خطاب سے سلام پڑھنا حیات نبوی تک مخصوص تھا ورنہ صحابہ کرام کی یہ شان نہ تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے تعلیم کردہ الفاظ کو بدل دیتے۔

اس میں غیر اللہ کو جو غائب لفظ خطاب سے پکارنا' ندا لغیر اللہ شرکیہ کا شبہ ڈالتا ہے جیسے آج کل مشرکین غیر اللہ کو استمداد اور استغاثہ کے لیے پکارتے ہیں جو فوت ہو چکے ہیں وہ اسی سلام بالخطاب سے دلیل پکڑتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے اس استدلال کو باطل کر دیا کہ یہ آنحضرت ﷺ کے خصائص سے تھا ورنہ نماز میں کسی کو خطاب کرنا جائز نہیں اور یہ صرف زندگی تک محدود تھا اور جو علماء اس تشہد میں کاف خطاب سے السلام علیک ایھا النبی پڑھتے ہیں وہ آنحضرت ﷺ کو حاضر ناظر جان کر خطاب نہیں کرتے بلکہ حکایت کے طور پر یہ سلام پڑھتے ہیں۔ جیسے قرآن میں یاایھا النبی لما تحرم ما احل اللہ لک --- آیت پڑھی جاتی ہے۔ اگر کوئی بدعتی اس آیت کو پڑھنے کے وقت آنحضور ﷺ کو حاضر ناظر جان کر قصداً خطاب کر کے یہ کہے گا تو وہ بے ادب اور گستاخ متصور ہو گا۔ بس سلام نبوی میں تشہد کے وقت خطاب حکایۃ ہے کہ یہ سلام اللہ تعالیٰ نے معراج کے وقت کہا تو اس کو حکایتا پڑھا گیا۔ چنانچہ مدارج النبوۃ ج۔۱' ص۔۴۱۰ میں لکھا ہے کہ خطاب کرنا بشر کو نماز میں منع اور مفسد نماز ہے' یہ سلام خصائص نبویہ سے ہے۔

چونکہ دراصل در قصہ معراج ایں چنیں واقع است ہم چنیں نگہداشتہ شد۔ یعنی دراصل کہ قصہ معراج میں اسی طرح واقعہ ہوا تو پھر نماز میں اسی طرح قائم رکھا گیا۔ میں کہتا ہوں

کہ فلا تدعوا مع اللہ احدا "کہ مت پکارو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی غیر کو۔" نماز میں لفظ خطاب سے کسی بشر کو پکارنا' بروئے اس آیت کے شرک ہے لیکن یہ سلام بطور حکایت عہد نبوی میں پڑھا گیا' بعد وفات صحابہ نے بدل دیا اور یوں کہا السلام علی النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بریلوی فرقہ کے مفتی احمد یار خان بدایونی نے اپنی کتاب جاء الحق کے ص-۱۸۹ میں لکھا ہے : "بعض صحابہ کرام نے اپنے اجتہاد سے التحیات کو بدلا اور حدیث مرفوع کے مقابل اجتہاد صحابی قبول نہیں۔" اس جاہل مفتی کو اپنے گھر کے اصول کا بھی پتہ نہیں۔ مولوی نعیم الدین جنہوں نے کتاب اطیب البیان لکھی ہے وہ فوائد النور ص-۲۴۶ میں لکھتے ہیں کہ اصول حنفیہ میں مقرر ہو چکا ہے کہ تاویل صحابی تمام تاویلات پر مرجح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ خلاف مرفوع حدیث کے صحابہ کے اجتہاد کو تسلیم کرنا خود حنفیہ کا عمل ہے۔ چنانچہ عہد نبوی میں آنحضرت ﷺ نے تین دن تراویح پڑھا کر پھر یہ فرمایا تھا کہ فصلوا ایھا الناس فی بیوتکم فان افضل الحدیث۔ "کہ لوگو اس نماز کو اپنے گھروں میں پڑھا کرو۔" امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں لکھا ہے کہ تراویح گھر میں پڑھنا افضل اور مسنون ہیں مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کو لے کر سب حنفیہ تراویح کی نماز مسجدوں میں پڑھتے ہیں حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو بدعت حسنہ قرار دیا تھا۔

اسی طرح عہد نبوی میں ایک مجلس کی تین طلاق ایک شمار ہوتی تھیں لیکن مقلدین حنفیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سیاسی اجتہاد کو لے کر تین طلاق نافذ کر دی ہیں۔ اسی طرح عہد نبوی میں باوجود شہر مدینہ میں نو مسجدیں تھیں جمعہ کی ایک ہی اذان تھی لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کو لے کر جمعہ کی ایک اذان اور شروع کر لی۔ عبدالقادر عارف حصاری

سہو کے سجدے کب کئے جائیں

سوال : کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ اگر نماز میں سہو اور بھول ہو جائے تو سجدہ سہو کرنا پڑتا ہے' لیکن یہ دو سجدے سہو کے آخری تشہد پڑھ کر سلام پھیرنے سے پہلے کرنے سنت ہیں یا سلام پھیر کر پھر دو سجدے کرے اور تشہد پڑھ کر سلام پھیرے اور سلام ایک طرف پھیر کر دو سجدے کرنا چاہئے یا حسب دستور دو سلام کے بعد سجدے کر لے

بروئے صحیح حدیث جواب دیں۔

الجواب واللہ الموفق للصواب' الحمد للہ رب العالمین' امابعد! فاقول وباللہ التوفیق۔ واضح ہو کہ بعض شرعی کام ایک ہی طرح مشروع ہوتے ہیں۔ بعض دو طرح سے ہوتے ہیں۔ مثلاً سلام پھیر کر امام دائیں جانب پھر کر بیٹھے تب بھی جائز اور بائیں طرف پھر کر مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے تب بھی جائز ہے۔ لیکن جو کام دو طرح سے مشروع ہوں' تو ان دونوں پر گاہے بگاہے عمل کرنا چاہئے۔ اگر دو طریقوں میں سے ایک طریقہ کا تعین کر کے اس کو لازم کر لے گا' تو وہ بدعت ہو جائے گا۔ چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جو اکابر علماء دیوبند سے ہیں وہ اس اصول کو لکھتے ہیں۔ جو ان کی کتاب اصلاح الرسوم کے ص-۳۷ پر ہے۔ "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص کو لازم ہے کہ اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے' وہ یہ کہ نماز کے بعد داہنی طرف سے پھرنے کو ضروری سمجھنے لگے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بسا اوقات بائیں جانب سے پھرتے دیکھا ہے۔" روایت کیا اس کو بخاری اور مسلم نے۔

شارح مشکوۃ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ بات نکلی ہے کہ جو شخص کسی امر مستحب پر اصرار اور عزیمت اور ضروری قرار دے لے اور کبھی رخصت پر یعنی اس کی دوسری شق مقابل پر عمل نہ کرے تو ایسے شخص سے شیطان اپنا حصہ گمراہ کرنے کا حاصل کر لیتا ہے۔ اس اصول کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سجدہ سہو آخری تشہد کے بعد سلام سے پہلے بھی کرنا جائز اور مشروع ہے اور بعد از سلام بھی مشروع اور درست ہے۔ مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح جلد ثانی ص-۳۰ میں ہے : **وقد رجح البیھقی التخییر فی سجود السھو قبل السلام وبعدہ** "یعنی امام بیہقی نے دونوں قسم کی حدیثیں لا کر اس بات کو ترجیح دی ہے کہ نمازی کو اختیار ہے کہ سجدہ سہو سلام سے پہلے کر لے یا بعد میں کر لے دونوں طرح جائز ہے۔" پھر لکھا ہے : **ونقل الماوردی وغیرہ الاجماع علی الجواز۔** "یعنی ماوردی اور بعض دیگر علماء نے تو اس کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے۔"

علامہ ابن الھمام حنفی فتح القدیر ص-۳۲۲ میں اس بحث کو لکھ کر یہی فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کی عبارت کا مختصر اقتباس یہ ہے : **لو سجد قبل السلام عندنا بجوز والی آخر فیجوز کون الفعلین بیانا لجواز الامرین۔** "یعنی ہمارے نزدیک ایک سجدہ سہو قبل سلام

کر لے تو جائز ہے۔ آنحضرت ﷺ کے دو قسم کے فعل دونوں امروں کے جواز کے لئے ہیں۔" علامہ عینی شرح کنز ص۔۴۲ میں لکھتے ہیں : ولا خلاف فی الجواز قبله وبعده۔ "یعنی سجدہ سہو سلام سے پہلے کرے یا بعد سلام کے دونوں طرح جائز ہے' اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔" وفی الحموی علی الاشباہ ص۔۳۸۹ میں ہے : السجدة قبل السلام اجزاه عندنا فی روایة الاصول۔ "یعنی سجدہ سہو سلام سے پہلے کر لیا تو ہمارے حنفیہ کے نزدیک کفایت کر جائے گا" علامہ حازمی نے کتاب الاعتبار میں لکھا ہے : والاشبه حمل الاحادیث علی التوسع وجواز الامرین۔ یعنی اشبہ یہ ہے کہ تمام احادیث کو اس بات پر محمول کریں کہ اس میں فراخی اور وسعت ہے' سب جائز ہے۔ کوئی جس طرح چاہے عمل کرے۔

علامہ ابن القیم نے زاد لمعاد میں یہی فیصلہ کیا ہے۔ اب یہاں ایک اور حدیث قبل از سلام سجدہ سہو تحریر کرتا ہوں۔ بخاری شریف جلد۔۱' ص۔۱۶۳ باب ماجاء فی السھو میں ہے : عن عبداللہ بن بحینة انه قال صلی لنا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم رکعتین من بعض الصلوات ثم قام فلم یجلس فقام الناس معه فلما قضی صلوته ونظرنا تسلیمه کبر قبل السلام فسجد سجدتین وهو جالس ثم سلم۔ "یعنی عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے بعض نمازوں میں سے ایک نماز پڑھائی تو آپ دو رکعت پڑھ کر کھڑے ہو گئے' قعدہ نہ کیا۔ پس آپ کے ساتھ لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپ نے نماز پوری کر لی' ہم سلام کے منتظر تھے کہ آپ نے تکبیر کہہ کر دو سجدے سہو کیے اور پھر سلام پھیرا۔" اس حدیث اور دیگر احادیث کے پیش نظر مولانا احمد علی سہارن پوری حنفی بخاری کے حاشیہ پر یوں لکھتے ہیں : قلت لاکلام فی جواز الامرین انما النزاع فی الافضل فقال الشافعی قبله افضل وقال ابوحنیفة بالعکس یعنی میں کہتا ہوں کہ دونوں امر جائز ہیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہے' صرف نزاع فضیلت کا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ قبل سلام سہو کا سجدہ کرنا افضل کہتے ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کے برعکس کہتے ہیں۔" میں کہتا ہوں کہ جب یہ مسئلہ مسلم ہوا کہ دونوں حدیثیں آتی ہیں اور دونوں طرح بالاجماع جائز ہے تو اب لاعلم مقلدین کا ایک شق کہ بعد از سلام سجدہ سہو کو لازم مذہب ٹھہرا لینا یہ نماز میں شیطان کا حصہ مقرر کر لینا ہے' ہمارا عمل

دونوں طرح ہے۔ پہلے اصول کی رد سے یہ عمل حنفیہ کا ناجائز ہے' اگر وہ اس غلط روی سے نکلنا چاہیں تو دونوں طرح عمل کیا کریں۔ گاہے چنیں گاہے چناں۔ اور یہ جو بعض لا علم کہتے ہیں سجدہ سہو قبل از سلام کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ جیسے بعض غیر معتبر کتب فقہ میں لکھا ہے' یہ سراسر باطل اور اختراع شرع کے خلاف ہے' کما تقدم۔ ایک حدیث کو ماننا جو امام کے قول کے مطابق ہو اور دوسری سے انکار کرنا یہ منکرین حدیث کی ایک قسم ہے' جو یہود کا شیوہ ہے۔ جس پر آیت افتؤمنون ببعض الکتٰب وتکفرون ببعض۔ "یعنی اے اہل کتاب یہ کیا تمہارا دین ہے کہ بعض احکام شرعیہ پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو۔" مثلاً مجمع الزوائد جلد۔۲' ص۔۱۵۱ میں ہے : عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی بھم صلوۃ العصر والظھر فقام فی رکعتین فسبحوا لہ فمضی فی الصلوۃ فلما قضی الصلوۃ سجد سجدتین ثم سلم۔ (رواہ البزار ورجالہ ثقات) "یعنی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز پڑھائی عصر کی یا ظہر کی تو دو رکعتوں میں بغیر قعدہ کیے کھڑے ہوگئے' لوگوں نے سبحان اللہ سبحان اللہ پکارا تو آپ نے اپنی نماز کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔ جب نماز پوری کرلی تو دو سجدے کرلئے پھر سلام پھیرا۔" یہ حدیث صریح ہے کہ سجدہ سہو قبل از سلام جائز ہے۔ بعض علماء نے ایک تیسری قسم حدیث پیش کی ہے۔ وہ دو طرح کے سجدہ سہو میں فرق کرتی ہے۔ وہ یہ ہے : عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سھا قبل التمام فسجد سجدتی السھو قبل ان یسلم وقال السھو بعد ان یسلم۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط) "یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پوری کرنے سے پہلے بھول گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام سے پہلے دو سجدے کیے اور فرمایا کہ جو شخص نماز پوری کرنے سے پہلے بھول جائے تو وہ قبل سلام دو سجدہ سہو کرلیا کرے اور جو نماز پوری کرنے کے بعد بھولے وہ سلام کے بعد سجدے سہو کرے۔" یہ حدیث ضعیف ہے اور دیگر واقعات سے منقوض ہے' ورنہ فیصلہ کن تھی۔ صحیح بات فقہا اور محدثین کی ہے کہ سجدہ سہو دونوں طرح جائز ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ سلام حسب دستور دو طرف دائیں جانب اور بائیں جانب پھیر کر سجدہ سہو کرے یا صرف ایک دائیں جانب سلام پھیرے' سو اس کا جواب یہ ہے کہ سجدہ سہو کے لئے ایک سلام کا مسئلہ اختراعی ہے۔ اس کا ثبوت نہیں ہے۔ حدیث میں مطلق سلام کا ذکر ہے۔ ایک کی تقیید ثابت نہیں قیاس ہے۔ مطلق سلام ایک کامل فرد کا مثبت

ہے' اصول یہ ہے : المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل۔ "کہ مطلق کا فرد کامل مراد ہوتا ہے۔" سلام کا کامل فرد نماز میں دو سلام کا ہے' ایک کا نہیں۔ لہذا ایک طرف سلام پھیرنا اور اس کو حکم شرعی سمجھنا خلاف حق ہے اور بدعت ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث کراچی

جلد۔۵۶' شمارہ۔۲۳ مورخہ یکم و ۱۶ ذوالحجہ سنہ۔۱۳۹۵ھ

بھول کر پانچ رکعت نماز پڑھنا

ہدایہ میں ہے کہ اگر بھول کر کسی نمازی نے فرضوں کی پانچ رکعت پڑھ لیں بجائے چار کے تو اس کے فرض باطل ہوئے۔ یعنی یہ نماز نفل بن گئی۔ فرض دوبارہ چار پڑھے۔ یہ مسئلہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مخالف ہے۔ وہ یہ حدیث بیان کرتے ہیں جو نسائی شریف کے باب التحری میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر کی پانچ رکعت بھول کر پڑھ لیں۔ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کیا نماز اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑھ گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیسے؟ لوگوں نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی پانچ رکعت پڑھی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بشر ہوں' جیسے تم بھول جاتے ہو اسی طرح بشر ہونے کی حیثیت سے میں بھی بھول جاتا ہوں۔ پھر یاد کرتا ہوں' جس طرح تم یاد کرتے ہو۔ پھر آپ نے دو سجدے سہو کیے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس حدیث سے حنفیہ کی ابن مسعود رضی اللہ عنہ صحابی سے مخالفت ثابت ہوئی۔ جس سے ظاہر ہوا کہ فقہ حنفیہ کی تخم ریزی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ہرگز نہیں کی۔ جیسا کہ درمختار میں لکھا ہے' بلکہ وہ اہلحدیث تھے اور اس حدیث سے بریلوی مکتب فکر کے دو مسئلے غلط ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے اور بشر کی طرح بھول جایا کرتے تھے۔ جب کوئی یاد دلاتا تو یاد کر لیتے تھے اور دوسرا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب نہ تھا' ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات ہرگز نہ بھولا کرتے۔ جیسے اللہ تعالیٰ عالم الغیب کا خاصہ ہے کہ وہ ہرگز کوئی بات نہیں بھولتا۔ جیسے قرآن کی سورہ مریم میں ہے وما کان ربک نسیا یعنی تیرا رب بھولا نہیں کرتا۔ پس اپنا مذہب کتاب

وسنت پر قائم رکھنا چاہئے۔

مشکوٰۃ باب السہو میں یہ حدیث ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھی تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا نماز بڑھا دی گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا بات ہے۔ حاضرین نے کہا کہ آنجناب نے فرضوں کی پانچ رکعت پڑھی ہیں۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سجدے سہو کر لئے۔ ہدایہ وغیرہ میں ہے کہ فرض تو باطل ہوئے اب کھڑے ہو کر ایک رکعت پڑھے' تاکہ یہ چھ رکعت نفل ہو جائیں اور فرضوں کا اعادہ کرے۔ یہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سراسر خلاف ہے۔ ہمارا اور شافعی رحمہ اللہ کا عمل اور مسلک حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مطابق ہے' تو ابن مسعود اور امام شافعی اہلحدیث ہیں۔ یہی ہمارا مذہب ہے' تو اب خوب سمجھ لو کہ مذہب اہلحدیث حق اور صواب ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری صاحب

الاسلام لاہور جلد۔ ۳' شمارہ۔ ۴' مورخہ۔ ۲۵ مارچ سنہ۔ ۱۹۷۷ء

کیا قعدہ اولیٰ میں بھول کر حرکت کرنے سے سجدہ سہو لازم ہے

اخبار تنظیم لاہور مطبوعہ ۱۴ اگست سنہ۔ ۱۹۷۰ء جلد۔ ۲۳' شمارہ۔ ۲۳-۲۴ میں یہ فتویٰ شائع ہوا کہ پہلے تشہد میں غلطی سے تھوڑا سا کھڑا ہو کر بیٹھ جائے تو اس پر سجدہ سہو ہے۔ اگر غلط ہے تو آپ نے اس پر تعاقب کیوں نہیں کیا؟ اس سے مترشح ہے کہ آپ بھی لحاظ داری یا کتمان حق بھی کرتے ہیں۔ اگر صحیح ہے تو کسی دلیل تسلی بخش سے اس کی تائید فرمائیں۔

(السائل معسود فی الذہن)

الجواب واللہ الموافق للصواب' الحمد للہ رب العالمین' امابعد! پس واضح ہو کہ مسئلہ مذکورہ میں علماء متقدمین کا اختلاف ہے۔ اس لئے متاخرین میں بھی اختلاف ہے۔ لیکن اختلاف تو اکثر مسائل میں جاری ہے۔ اختلاف کو بھی اپنے حال پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس میں بھی قرائن اور دلائل سے کسی ایک جانب کو ترجیح دی جائے گی۔ جو چیز دلائل اور قرائن سے صحیح ثابت ہو اس کو اپنا مسلک ٹھہرا کر معمول بہ بنانا چاہئے۔ اب اس مسئلہ کو تفصیل

سے سنئے۔ حضرت العلام محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ شہرہ آفاق محقق اور نہایت مدقق تھے۔ مرحوم شیخ الحدیث ہونے کے علاوہ بڑے عظیم الشان مدرسہ رحمانیہ دہلی کے ممتحن بھی تھے۔ جس درس گاہ کے مدرسین بڑے بڑے محدث اور علامہ مقرر ہوئے تھے۔ مثلاً مولانا احمداللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت العلامہ مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی محدث مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ

بندہ اپنے آپ کو ان بزرگان دین سے کم درجہ سمجھتا ہے' لیکن راقم الحروف عارف حصاری کی ایک عادت تو یہ ہے کہ بغیر دلیل صحیح قابل قبول کے کسی امام یا محقق عالم کی تقلید اور محض حسن ظن سے اتباع نہیں کرتا' ہمیشہ دلیل صحیح اور صواب کا متلاشی رہتا ہے۔ لیکن مقلدین کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی تقلید بغیر دلیل کے حسن ظن سے کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی اشرف علی تھانوی جن کو حکیم الامتہ اور مجدد الملۃ ایسے القاب سے ملقب کیا جاتا ہے۔ اپنے ایک رسالہ میں جو "شکر النعمہ وبذکر رحمۃ الامۃ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے صفحہ۔۶۵ میں رقم طراز ہیں۔ باقی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت مجھے کسی حدیث سے تو معلوم نہیں ہوئی۔ مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اشعۃ اللمعات میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دس طرح کی ہوگی' ان میں ایک شفاعت یہ بھی ہوگی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے لئے شفاعت فرمائیں گے کہ یہ لوگ جس سخت عذاب کے مستحق ہیں۔ اس میں کچھ کمی کر دی جائے۔ چنانچہ آپ کی برکت سے ان کے عذاب میں کمی کر دی جائے گی۔ (تا آخر کلام) چونکہ شیخ عبدالحق بڑے محدث ہیں اس لئے انہوں نے جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں' کسی حدیث ہی سے معلوم کر کے لکھی ہوں گی۔ گو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی' مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت وسیع تھی' اس لئے ان کا یہ قول قابل تسلیم ہے۔ یہی عادت بعض علماء اہلحدیث کی بھی ہے۔ چنانچہ سورہ کہف کی تفسیر کے مقدمے میں مولانا ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی نے تعویذ اسماء اصحاب کہف کو جس میں غیراللہ کا توسل ہے' مولانا حافظ محمد صاحب لکھوی کی تقلید سے جائز قرار دے کر اس کو اپنی سیالکوٹی جماعت میں معمول بہ بنایا جو اب تک یہ طریقہ بدعیہ چلا آرہا ہے۔ ایسا ہی قدرے عمل روپڑی خاندان میں ہے۔ بندہ ایسی حسن ظن بلا دلیل سے بالکل بری ہے۔ دوسری میری عادت یہ ہے کہ علماء متقدمین کی تحقیقات کو دیگر علماء حاضرہ کی تحقیق سے فائق سمجھتا ہوں اس لئے اس کو دیگر علماء کی تحقیق

پر راجح قرار دیتا ہوں۔ تیسری علامت یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ یا فتویٰ کو دلیل شرعی کے خلاف پاتا ہوں تو پھر کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ حتی الوسع اپنی علمی بضاعت سے کام لے کر اس کی اصلاح کر دیتا ہوں۔ گو احباب اہل علم اس کو میری گستاخی تصور کریں۔ لیکن بروئے حدیث الاعمال بالنیات میری نیت خیر اور بروئے حدیث من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ اس کی اصلاح کی جاتی ہے۔

حضرت علامہ مرحوم کے اکثر مسائل اصولی و فروعی سے اور جملہ اعتقادات شرعیہ سے بندہ متفق ہے' لیکن ان کو معصوم تصور نہیں کرتا۔ بعض مسائل میں ان سے غلطی ممکن ہے کہ المجتهد قد یخطی ویصیب ان میں ایک مسئلہ درج ذیل ہے۔ جس کی تحقیق بھی ذیل میں ہے۔

تحقیق مسئلہ: حضرت علام محدث روپڑی نے اس مسئلہ کے اثبات میں اول حدیث مغیرہ بن شعبہ پیش کی ہے۔ جس کو ضعیف قرار دیا ہے' کیونکہ اس کی اسناد میں جابر جعفی واقع ہے۔ جس کا ضعیف ہونا مشہور ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بعض راوی مختلف فیہ ہوتے ہیں اور بعض راوی بعض صورتوں میں ضعیف ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں نہیں۔ مثلاً کوئی راوی مدلس ہو اور بصیغہ عن روایت کرے تو وہ روایت ضعیف ہوتی ہے اور اگر صیغہ تحدیث سے کرے تو وہ روایت صحیح ہو گی۔ جیسے راوی محمد بن اسحاق کا حال ہے کہ یہ متکلم فیہ ہے۔ مگر راجح یہ ہے کہ یہ ثقہ ہے' لیکن مدلس ہے۔ حدیث فاتحہ خلف الامام میں اس نے اپنی روایت صیغہ تحدیث سے کی ہے اس لئے وہ صحیح ہے۔ ٹھیک اسی طرح جابر جعفی کا حال ہے۔

تنقیح الرواۃ تخریج مشکوٰۃ جلد۱ ص۱۸۷ میں ہے: ومدارہ علی جابر الجعفی وھو ضعیف جدا لکن قال شعبۃ اذا قال جابر الجعفی حدثنا فھو اوثق الناس وفی ھذا السند عند ابی داؤد وکذلک لانہ قال حدثنا المغیرۃ بن شبل۔ "یعنی مغیرہ بن شعبہ کی روایت کا دارومدار جابر جعفی پر ہے۔ وہ نہایت درجہ کا ضعیف ہے' لیکن امیرالمحدثین حضرت شعبہ کا یہ فیصلہ ہے کہ جب جابر جعفی لفظ حدثنا کے ساتھ کوئی حدیث بیان کرے تو وہ سب لوگوں سے زیادہ ثقہ ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں جابر نے لفظ حدثنا سے حدیث بیان کی ہے۔ لہذا یہ حدیث حسن ہے ضعیف نہیں ہے۔" علاوہ ازیں مسند احمد کی شرح

بلوغ الامانی میں مغیرہ کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سب سے جھوٹا قرار دیا ہے۔ لیکن دیگر محدثین سے یہ نقل کیا ہے : قال سفیان مارایت اورع منه فی الحدیث۔ "یعنی امام سفیان نے کہا کہ میں نے علم حدیث میں جابر جعفی سے زیادہ کوئی پرہیزگار نہیں دیکھا۔" وقال شعبة صدوق فی الحدیث یعنی امام شعبہ نے کہا کہ جابر حدیث میں سچا ہے۔ امام شعبہ وہ عادل گواہ ہیں جن کی شہادت سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن اسحاق کی ثقاہت ثابت کی ہے۔ پھر امام سفیان امام ابوحنیفہ سے کم نہیں' بلکہ علم حدیث میں امام سفیان کا درجہ فائق ہے اور امام ابوحنیفہ فقیہ صوفی آدمی تھے' ان کو آئمہ جارحین میں شمار نہیں کیا گیا۔ اچھا امام وکیع کی شہادت سنئے وقال وکیع مهما شککتم فی شیی فلا تشکوا فی ان جابرا ثقة۔ "یعنی امام وکیع نے کہا کہ جب تم کسی کے بارے میں شک کرو' تو جابر کے بارے میں شک نہ کرنا' وہ ثقہ ہے۔"

ہم زیادہ اس راوی کے متعلق یہاں بحث نہیں کرنا چاہتے' کیونکہ حضرت العلام نے اس حدیث کو معرض استدلال میں پیش کر کے وقتی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ اب حدیث کی درائت پر غور کرنا چاہئے کہ حضرت العلام نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت سے اٹھا لیکن پورا کھڑا نہیں ہوا تو وہ بیٹھ جائے اور التحیات پڑھ لے اور جو پورا کھڑا ہو گیا وہ نہ بیٹھے اور آخر میں سجدہ سہو کر لے۔" اب اس حدیث میں انصاف سے غور کیا جائے تو ہمارا مسلک ثابت ہو گیا کہ جو شخص قعدئہ اولیٰ سے حرکت کر کے کھڑا ہونے کو ہو' لیکن پورا کھڑا نہ ہوا ہو اور ہٹ کر بیٹھ جائے اور تشہد پڑھ لے' تو اس پر سجدہ سہو نہیں ہے۔

سبل السلام جلد۔۱' ص۔۲۰۶ میں ہے : وفی الحدیث دلالة علی انه لا یسجد للسهو الالفوات التشهد الاول لا لفعل القیام لقوله لا سهو علیه وقد ذهب الی هذا جماعة۔ "یعنی اس حدیث میں اس مسئلہ پر دلالت ہے کہ سجدہ سہو صرف پہلا تشہد فوت ہونے کے سبب سے ہے۔ قیام کی طرف اٹھنے کی وجہ سے نہیں ہے' کیونکہ دیگر روایت میں اس صورت پر یہ جملہ آیا ہے کہ اس نمازی محرک پر سہو کا سجدہ نہیں ہے۔" ایک جماعت محدثین کا یہی مذہب ہے۔ ابوداؤد' ابن ماجہ اور دار قطنی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں : لا سهو علیه۔ حضرت العلام نے جو منتقی کے حوالہ سے مغیرہ کی روایت نقل کی ہے وہ مختصر

اور ناقص ہے۔ ابوداؤد وغیرہ کی روایت پوری ہے۔ اس میں صورت اولیٰ میں سجدہ سہو کی نفی ثابت ہو گئی۔ پھر علامہ امیر صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بروایت بیہقی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت آئی ہے کہ انہوں نے بھول کر قعدہ سے قیام کی طرف حرکت کی تو اس پر سجدہ سہو کیا۔ کہ یہ حدیث موقوف ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا فعل ہے' لیکن بعض طرق میں ھذہ السنۃ مروی ہے کہ یہ طریقہ سنت ہے۔

پھر علامہ صنعانی اس کا جواب دیتے ہیں۔ وقد رجح حدیث المغیرۃ علیہ لکونہ مرفوعا ولانہ یویدہ حدیث ابن عمر لا سھو الا فی قیام عن جلوس او جلوس عن قیام اخرجہ الدارقطنی والحاکم والبیھقی وفیہ ضعف۔ "یعنی اس کی روایت پر مغیرہ کی روایت کو ترجیح دی ہے' کیونکہ وہ حقیقی مرفوع ہے اور انس کی روایت موقوف ہے۔ (جو حجت نہیں ہے۔ کما تقرر فی علم الاصول۔ اور جو سنت کے لفظ والی ہے وہ حکمی مرفوع ہے۔ جس پر حقیقی مقدم ہے۔) اور حدیث مغیرہ کی تائید حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ہوتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سجدہ سہو نہیں لازم ہوتا' مگر اس صورت میں کہ بیٹھنے کی بجائے کھڑا ہو جائے' یا کھڑا ہونے کی بجائے بیٹھ جائے۔ اس روایت میں بھی ضعف ہے لیکن اس بارہ میں دیگر بہت سی حدیثیں وارد ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قلیل افعال کئے۔ لیکن ان میں سجدہ نہ کیا کہ فعل قلیل معاف ہے۔ وافعال صدرت منہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن غیرہ مع علمہ بذالک ولم یامر فیھا بسجودالسھو ولا سجد لما صدر منہ۔ "یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر لوگوں سے جو افعال قلیل صادر ہوئے ان میں سے کسی فعل پر سجدہ سہو نہ کیا اور نہ کرنے کا حکم دیا۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ حدیث انس رضی اللہ عنہ دیگر روایات کے خلاف ہے' لہٰذا قابل حجت نہیں ہے۔ پھر امیر صنعانی نے ابن بحینہ اور زیادہ بن علاقہ کی روایتیں نقل کی ہیں' جن کو حضرت العلام نے بھی پیش کیا ہے۔ ان میں یہ ذکر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعت میں کھڑے ہو گئے' لوگوں نے سبحان اللہ کہا آپ پھر بھی نہ لوٹے پھر فارغ ہو کر سجدہ سہو کیا۔ ان روایتوں سے بھی امیر صنعانی وحافظ ابن حجر وغیرہ نے حدیث مغیرہ کی تائید ظاہر کی ہے کہ سجدہ سہو ترک جلوس وترک تشہد کی بنا پر ہے۔ جب کوئی چیز ترک ہی نہیں ہوئی معمولی قیام کی طرف حرکت کی ہے جو فعل قلیل ہے اس پر سجدہ سہو کیا ہونا تھا۔ یہ روایت انس کی

خلاف اصول سہو و عمد کے ہے۔ اس لئے قابل استدلال نہیں ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ذرا کوئی جلوس میں قیام یا سجدہ کی طرف حرکت کرے تو وہ بھی سجدہ کرے' یہ سراسر اصول کے خلاف ہے۔ اس لئے محققین نے اس روایت کو قبول نہیں کیا۔ کوئی روایت محض راویوں کے ثقہ ہونے سے صحیح نہیں ہوا کرتی' جب تک اس کا متن اور درایت صحیح ثابت نہ ہو۔ چنانچہ روایت انس کی درایت کی رو سے صحیح نہیں ہے' اگر صحیح ہوتی تو خود حافظ ابن حجر جو حافظ عبداللہ صاحب روپڑی سے ہزار درجہ علم حدیث میں زیادہ ماہر تھے روایت انس رضی اللہ عنہ کو اس کے رواۃ کو ثقہ کہہ کر مسترد نہ کرتے۔

چنانچہ مرعاۃ المفاتیح جلد۔۲ ص۔۴۰ میں ہے : وقال ابن حجر وظاهرالحديث ان قوله الاتي ويسجد سجدتي السهو خاص بالقسم الثاني فلا يسجد هنا للسهو وان كان الى القيام اقرب وهوالاصح عند جمهور اصحابنا وصححه النووى فى عدة من كتبه۔ "یعنی حدیث مغیرہ کے ظاہر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں سجدہ سہو بھول کی دوسری قسم کے ساتھ خاص ہے کہ جب قیام میں چلا جائے اور نہ بیٹھے تب سجدہ سہو کرے اور اگر قیام کی طرف حرکت کر کے بیٹھ جائے تو پھر سجدہ سہو نہ کرے اور ہمارے جمہور اصحاب کے نزدیک بھی یہی بات بہت صحیح ہے۔ امام نووی نے اپنی متعدد کتابوں میں اس مسلک کو صحیح قرار دیا ہے۔"

تلخیص الحبیر ص۔۱۱۲ میں لکھتے ہیں : حديث انه صلى الله عليه وسلم فعل الفعل القليل فى الصلوة ورخص فيه ولم يسجد للسهو ولا امر به قد تقدم فى الباب الذى قبله عدة احاديث تشهد له۔ "یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں فعل قلیل کیا تو اس میں معافی دی کہ نہ خود سجدہ سہو کیا اور نہ کسی کو سجدہ سہو کرنے کا حکم دیا اور پہلے باب میں متعدد حدیثیں گزر چکی ہیں جو اس مسئلہ پر شاہد ہیں۔" پھر حافظ ابن حجر نے اختصار کے طور پر بعض کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ جس ابن حجر سے روایت انس کے راویوں کی ثقاہت نقل کی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر نے درایت کی رو سے روایت انس کو مسترد کر دیا ہے اور اہم مسلک یہ ٹھہرایا ہے کہ فعل قلیل سے جس سے کوئی فعل نماز کا ترک نہ ہو سجدہ سہو نہیں ہے۔ جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سہو کا ذکر ہے کہ وہ دو رکعت کے بعد نہ بیٹھے اور کھڑے ہو گئے' پھر سجدہ سہو کیا۔ تو یہ فرمایا : انى سمعت رسول الله صلى الله

علیه وسلم یقول من نسی شیئا من صلوته فلیسجد مثل هاتین السجدتین۔ "یعنی میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ جو شخص اپنی نماز میں سے کوئی کام بھول جائے تو وہ میری طرح دو سجدے سہو کرے۔" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھول گئے تھے۔ اس لئے ترک جلوس پر سجدہ سہو کیا تاکہ جلوس کا تدارک ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اگر جلوس نہ ترک کیا ہو تو سجدہ سہو نہیں ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ آنحضرت ﷺ سے نقل کرکے یہ فرماتے ہیں: فاخذ من هذا قاعدة ان من ترک شیئا من اجزاء الصلوة التی لیست برکن سهوا سجدله قبل السلام۔ یعنی فعل نبوی سے یہ قاعدہ ماخوذ ہوا کہ اگر کوئی شخص نماز کے اجزاء فعلیہ سے کوئی جز ترک کر دے بشرطیکہ وہ رکن نہ ہو کہ رکن نماز کا ترک ہو جائے تو پھر اس کا اعادہ کرنا پڑتا ہے' پھر بعد میں سجدہ سہو کا کرے یا رکعت کا ہی اعادہ کرے اور پھر سجدہ سہو کرے۔ بہرحال سجدہ سہو متروکہ چیز کا نقصان پورا کرنے کے لئے ہے۔ یا کسی رکعت یا رکن کے زاید ہو جانے پر ہے۔ معمولی حرکت پر سجدہ سہو نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ ذرا چوتڑ ہلانے پر کرتے ہیں۔ یہ قاعدہ ماخوذ مندرجہ زادالمعاد کے سراسر خلاف ہے۔ حدیث ابن بحینہ سے یہ قاعدہ ثابت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: نسی الجلوس سجد سجدتین "کہ رسول اللہ ﷺ دو رکعتوں کا درمیانی جلوس بھولے اور قیام میں گئے' تو دو سجدے سہو کے کئے۔" یہ حدیث صحیح ہے اور دیگر روایات کی جو قدرے کمزور ہیں ان کی مصدق اور موید ہے اور وہ روایات بھی مجموعی طور پر روایت انس سے راجح ہیں' کیونکہ قاعدہ کے موافق ہیں اور صریح مرفوع ہیں۔

مولف بلوغ الامانی شرح مسند احمد بن حنبل رحمہ اللہ جلد۔۴' ص۔۱۵۲ میں روایت جابر جعفی لا سهو علیه پر بحث کرنے کے بعد یہ لکھتے ہیں: وهو وان قیل فیه ما قیل فان حدیثی ابن بحینة ومعاویة یعضدانه۔ یعنی گو روایت میں گفتگو اور کلام ہے' مگر حدیث ابن بحینہ اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس کو مضبوط بنا رہی ہیں کہ ان میں جلوس ہے۔ تشهد سهوا متروک ہونے پر سجدہ سہو مذکور ہے۔ جب متروک نہ ہو پھر سجدہ سہو کیسا؟ بعض نے کہا کہ قعدہ اولیٰ سے قیام کی طرف اٹھنے سے سجدہ سہو نہیں ہے بلکہ تشہد اولیٰ کے فوت ہونے کی وجہ سے ہے۔ بلوغ الامانی میں ہے: والی ذالک ذهب النخعی وعلقمة والا سود والشافعی فی احد قولیه۔ یعنی یہ مذہب ہے امام نخعی وعلقمہ واسود اور

امام شافعی کا ایک قول میں' جب ذرا حرکت کی اور قیام میں نہ گیا اور تشہد پڑھ لیا تو ان کے نزدیک سجدہ سہو نہ ہوا۔ نیز یہ لکھا ہے : وقالت المالکیۃ یرجع مالم یفارق الارض بیدیہ ورکبتیہ ولا سجود علیہ۔ یعنی علماء مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ جب قعدہ اولیٰ میں قیام کی طرف حرکت کی اور وہ اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے ساتھ زمین سے جدا نہ ہوا ہو تو واپس لوٹ کر بیٹھ جائے' اس پر سجدہ سہو نہیں ہے اور فقہا حنفیہ میں بھی اختلاف ہے۔ لیکن اصح یہ ہے کہ سجدہ سہو نہیں ہے۔

مرعاۃ المفاتیح میں ہے : واختلف فیہ فقھا الحنفیۃ ایضا والاصح عدم وجوب السھو لان فعلہ لم یعد قیاما فکان قعودا کذا فی شرح المنیۃ۔ یعنی فقہاء حنفیہ میں بھی اختلاف ہے' لیکن ان کے مذہب میں بھی قعود سے قیام کی طرف حرکت کرنے سے اصح مسلک یہ ہے کہ سجدہ سہو نہیں ہے' کیونکہ قدر حرکت کرنے سے قیام شمار نہیں ہوتا' وہ قعود ہی متصور ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ فقہاء حنفیہ کی یہ بات نہایت منصفانہ ہے جو قاعدہ اور قیاس کے مطابق ہے۔ علامہ عبیداللہ صاحب محدث مبارکپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں : وقد رجح حدیث المغیرۃ لکونہ مرفوعا۔ "یعنی روایت انس پر حدیث مغیرہ کو ترجیح ہے' کیونکہ وہ مرفوع ہے۔" دیگر یہ کہ ترمذی میں یہ حدیث ہے : وسجدھا الناس معہ مکان مانسی من الجلوس۔ "یعنی آپ اپنا قعدہ اولیٰ بھول گئے تھے اور آپ کے ذمے جلوس تھا۔" جیسے یہ الفاظ ہیں : وعلیہ الجلوس آپ نے اس جلوس کے تدارک کے لئے دو سجدے کئے' تو لوگوں نے جلوس کے عوض میں آپ کے ساتھ دو سجدے کئے۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ جو شخص قعدہ اولیٰ کو ترک کر کے کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے ذمہ یہ قعدہ ہوتا ہے' تو اس کو سجدہ سہو کرنا اس قعدہ کے قائم مقام لازم ہوتا ہے اور جو قیام میں نہ گیا ہو اور کچھ حرکت کر کے ٹھہر گیا اور اس نے قعدہ ادا کر لیا اس کے ذمے کوئی چیز نہ رہی' تو اس کے ذمے کوئی سہو نہیں ہے۔ یہ مسلک قاعدہ کے مطابق ہے اور روایت انس رضی اللہ عنہ موقوف ہے اور جس میں سنت کا لفظ ہے' اس کی سند ہمارے سامنے نہیں ہے' لہٰذا وہ قابل استدلال نہیں ہے۔ والسلام

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث کراچی' جلد۔۵۱' شمارہ۔۲۱ مورخہ یکم ذوالقعدۃ سنہ۔۱۳۹۰ھ

فرض نمازوں کے بعد بالالتزام ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟

سوال : پنجگانہ فرائض اور جمعہ کے بعد امام اور مقتدیوں کا مل کر ہاتھ اٹھا کر بالالتزام دعا مانگنا کیسا ہے؟ کیا یہ مخصوص طریقہ حضور ﷺ سے قولاً یا فعلاً یا تقریراً ثابت ہے۔ اگر نہیں تو اس کا اتنا التزام کیوں کیا جاتا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا نہ مانگنے والے کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید وحدیث شریف کی روشنی میں واضح فرما کر ہماری پوری رہنمائی فرمائی جائے۔ (ایک سائل)

جواب : فرض نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا جائز ہے' ضروری بھی نہیں ہے مستحب ہے۔ امام سیوطی نے اس پر ایک رسالہ لکھا ہے اس کا نام ہے فض الوعاء فی رفع الیدین فی الدعاء' اس میں احادیث سے فرضوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت کیا ہے۔ فتاویٰ نذیریہ میں بھی اس کو جائز قرار دے کر احادیث سے مدلل بیان کیا ہے۔ یہاں صرف ایک حدیث درج کی جاتی ہے : عن محمد بن یحی الاسلمی قال رایت عبد اللّٰہ بن الزبیر ورای رجلا رافعا یدیه قبل ان یفرغ من صلوته فلما فرغ منها قال ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لم یکن یرفع یدیه حتّٰی یفرغ من صلوته رواه الطبرانی ورجاله ثقات۔ یہ حدیث مجمع الزوائد میں بھی ہے یعنی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے دعا کر رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ تو نماز سے فارغ ہو کر ہاتھ اُٹھا کر دعا کیا کرتے تھے۔ اس سے دعا کا جواز ثابت ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ سلام پھیر کر چلے تو اس سے ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم

نماز کے بعد دعا

رسالہ الارشاد مطبوعہ ۱۶ر نومبر سنہ ۱۹۵۸ء میں ایک مضمون بعنوان "الدعاء وبر الصلوٰۃ" شائع ہوا ہے، جس میں کچھ تعدی سے کام لیا گیا ہے۔ اسلام میں اعتقادی' اصولی اختلاف اور ایسا مذہبی افتراق کہ فرقہ بندی کا موجب ہو' بلاشبہ جرم عظیم اور باعث عذاب ہے۔ لیکن ایک ہی مذہب میں فروعی اختلاف بوجہ تعارض دلائل یا کسی دلیل کے فہم سے اختلاف ہو جانا تو لابدی امر ہے۔ جس سے نہ صحابہ کرام بچ سکے اور نہ تابعین اور نہ تبع تابعین' بلکہ ائمہ مجتہدین سے لے کر آج تک خاص مذہب اہلحدیث میں بھی علماء کا باہمی اختلاف چلا آرہا ہے۔ پھر ہر اختلاف پر وہ آیات پڑھنا' لکھنا جو اختلاف دین یا اختلاف مذہب یا اختلاف ضد و تعصب کی تردید میں وارد ہوں' بالکل نامناسب ہے۔

مولانا الخیری نے مبہم سا مسئلہ لکھ دیا کہ پنجاب کے طلبا نماز کے بعد دعا کی

مداومت کرنے کو بدعت کہتے ہیں۔ حالانکہ اس سے مطلقاً انکار کوئی نہیں کرتا کہ نماز کے بعد کوئی دعا نہ پڑھنی چاہیے۔ جس پر آپ نے حدیث پیش کر دی کہ فلا تدع ان تقول فی دبر کل صلوٰۃ رب اعنی علی ذکرک' الخ۔ اصل نزاع یہ ہے کہ ہر فرضی نماز کے بعد فوراً یا کچھ ذکر اذکار پڑھ کر پھر امام کا مقتدیوں کی طرف منہ پھیر کر بیٹھنا اور پھر ہاتھ اٹھا کر امام اور مقتدیوں کا دعا مانگنا اور اس کا ایسا التزام کرنا کہ جو شخص اس طرح حالت اجتماعی سے دعا نہ مانگے اس پر طعن و تشنیع اور بازپرس کرنا اور اس کو نماز یا دین میں نقصان سمجھنا یہ بدعت ہے یا سنت؟

اس دعویٰ کے زیر خطوط کلموں کو مدنظر رکھ کر تحقیق فرمایئے کہ اس کا ثبوت اسوہ حسنہ سے ہے یا نہیں؟ اس ہیئت اجتماعی مخصوصہ کو اکثر علماء اہلحدیث بدعت قرار دیتے ہیں۔ بلکہ دیگر علماء اہل مذہب حنفی' حنبلی وغیرہ جو اپنے مذہب میں محقق سمجھے جاتے ہیں' ایسی مروجہ دعا کو بدعت ٹھہراتے ہیں۔ کیونکہ اسوہ حسنہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اب اگر اس کا ثبوت علامہ الخیری پیش کر دیں' اس شرط سے جو انہوں نے تحریر فرمائی ہے کہ دلائل قوی المتن اور قوی السند ہوں تو منظور ہے۔

میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ اس موضوع مسئلہ پر ایک دلیل بھی پیش نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا وجود کتب حدیث اور اسوہ حسنہ میں نہیں ہے۔ جب دلیل نہ ہوئی تو دعویٰ خارج ہوا' اور بے ثبوت چیز کا التزام آپ کو بھی مسلم ہے کہ بدعت ہے۔ پس نزاع ختم ہو جائے گا۔ آنجناب ﷺ نے فرضوں کے بعد ادعیہ اور اذکار پڑھنے پر جو دلائل لکھے ہیں اور دلائل عامہ کہ الدعا مخ العبادۃ" ادعونی استجب لکم وغیرہ جو پیش کئے ہیں' ان کو مسئلہ ما بہ النزاع سے پورا تعلق اور مطابقت نہیں ہے۔ کیونکہ ان دلائل میں نہ ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے اور نہ ہیئت اجتماعی کا بیان ہے اور نہ التزام رکھنا مذکور ہے اور اسوہ حسنہ (تعامل نبوی) سے ہر دعا پر ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں ہے۔ مثلاً فاتحہ دعا ہے' اس کو پڑھا جاتا ہے اور ہاتھ معروف طریقہ سے اٹھائے نہیں جاتے۔

کابین سجدتین اللّٰھم اغفرلی' یا رب اغفرلی دعا پڑھی جاتی ہے تو ہاتھ اٹھائے نہیں جاتے۔ سجدہ' رکوع میں کئی دعائیں ثابت ہیں' مگر ان میں رفع یدین نہیں' مسجد کے داخل خارج ہونے کے وقت دعا ثابت ہے' مگر رفع یدین کا کوئی قائل نہیں۔

قضائے حاجت میں بیٹھنے سے پہلے اور اس سے فارغ ہو کر اٹھنے کے بعد دعا ہے' مگر رفع یدین نہیں- بیوی سے جماع کے وقت اور بعد فراغت کے دعا ہے' مگر رفع یدین نہیں- افطار صوم کے بعد دعا ہے مگر رفع یدین نہیں- کھانا کھانے کے بعد اور پانی پینے کے وقت اوز دودھ نوش کرنے کی دعا ہے' مگر رفع یدین نہیں- نئے کپڑے پہننے کی دعا ہے' مرغ بولنے پر دعا ہے' اذان کے بعد دعا ہے' وغیر ذلک لیکن ان مواضع میں رفع یدین نہیں ہے- جس سے یہ ظاہر ہوا کہ ہر دعا کو رفع یدین لازم نہیں- اس لیے خادم رسول اللہ ﷺ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ بیان ہے کہ **کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یرفع یدیہ فی شئی من دعائہ الا فی الاستسقا** یعنی آنحضور ﷺ سوائے استسقاء کے کسی شے میں دعا کرتے وقت ہاتھ نہ اٹھاتے تھے-

لیجئے جناب بندہ خادم العلماء نے قوی المتن اور قوی السند دلیل عدم رفع یدین پر پیش کر دی- اب آپ ہر دعا کے لیے رفع یدین کی دلیل قوی المتن اور قوی السند پیش کر دیں تو آپ کا شکریہ ادا کیا جائے گا' ورنہ کسی پر حملہ کرنا چھوڑ دیں-

ہاں حدیث انس رضی اللہ عنہ کی رو سے میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ علاوہ بموقعہ استسقاء دیگر کسی دعا میں بھی اسوہ حسنہ سے رفع یدین فی الدعا ثابت ہی نہیں ہے- ثابت ضرور ہے اور وہ مواضع اس نفی کلی سے مستثنیٰ ہیں مگر آپ کا فرض یہ ہے کہ صلوات خمسہ کے بعد **رفع یدین فی الدعا علی الدوام** ثابت کریں ورنہ یہ نفی آپ کے مقابلہ میں کافی رہے گی-

آپ نے اپنے مضمون میں ایک حدیث ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی پیش کی ہے- یہ آپ کی شرط کے خلاف ہے- کیونکہ یہ ضعیف ہے- صیانۃ الانسان ص-۸۶ میں ہے' **قال الحافظ فی شرح الاذکار قال الترمذی ھذا حدیث حسن غریب و فیما قالہ نظر لان فیہ عللا** - یعنی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شرح اذکار میں حدیث ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو ترمذی کے حسن لکھنے پر یہ فرمایا ہے کہ اس پر اعتراض ہے- کیونکہ اس روایت میں کئی کمزوریاں ہیں- پھر حافظ نے وہ بیان کر کے اس حدیث کا ضعف ظاہر کیا ہے- پھر اس حدیث میں صرف ترغیب ہے' نہ دوام ثابت ہے نہ التزام- **ھذا خلاف الدعوی**- پھر ہر دعا کے لیے رفع یدین ضروری نہیں- صرف زبان سے پڑھ لینا بھی کافی ہے- دیگر یہ

کہ ہم کہتے ہیں کہ صحیح حدیث میں ہے کہ۔ **کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا اسلم لم یقعد الا مقدار ما یقول اللّٰھم انت السلام ومنک السلام** الخ۔ یعنی آنحضور ﷺ جب سلام پھیرتے تو نہ بیٹھتے مگر ان دعا کے پڑھنے کے اندازہ پر **اللّٰھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذالجلال والاکرام**۔ (احمد، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ) اس کی موید یہ روایتیں ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **صلیت وراء النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فکان ساعۃ یسلم یقوم ثم صلیت وراء ابی بکر فکان اذا سلم وثب فکانما یقوم عن رضفۃ** یعنی میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے جس گھڑی سلام پھیرا کھڑے ہو گئے، پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو سلام پھیرتے ہی وہ اتنی جلدی کھڑے ہو جاتے کہ گویا گرم پتھر سے اٹھے ہیں۔ (اخرجہ عبدالرزاق بحوالہ نیل الاوطار جزء۔۲، ص۔۳۰۳)

منتقی باب "**لبث الامام قلیلا**" میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ سلام پھیر کر آنحضور ﷺ معمولی دیر ٹھہر کر پھر کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ کیوں ٹھہرتے؟ **لکی ینصرف النساء قبل ان یدرکھن الرجال**، یعنی تاکہ عورتیں مردوں سے پہلے نکل جائیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر دعا مروجہ پر دوام تھا تو وہ کب بحالت اجتماعی مانگتے تھے؟ بتایا جائے۔

پھر یہ گذارش ہے کہ فرضی نمازوں کے بعد تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر، آیۃ الکرسی، معوذتین وغیرہ آیات قرآنیہ کا پڑھنا بھی ثابت ہے اور دیگر اذکار کا بھی ثبوت ہے۔ وہ ہاتھ اٹھا کر پڑھتے تھے یا بغیر اس کے؟ اگر شق اول ہے تو ثبوت درکار ہے اور اگر شق دوم ہے تو دعا مروجہ کس وقت مانگتے تھے اور اس میں کیا پڑھتے تھے پھر دعا بحالت اجتماعی اس ہیئت کذائی مروجہ کے مطابق مانگتے تھے یا انفرادی طور پر؟ اگر اجتماعی تھی تو ثبوت درکار ہے اور وہ اس طرح ہونا چاہیے کہ آپ نے بارش کے لیے دعا کی تو حدیث میں یوں آیا ہے **فرفع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یدیہ یدعو ورفع الناس ایدیھم معہ یدعون** (منتقی) یعنی رسول اللہ ﷺ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور لوگ بھی آپ کے ساتھ اپنے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے۔ یہ حدیث قوی المتن اور صحیح السند ہے جو دعا **عند الاستسقاء برفع الا یدی** پر **بعبارۃ النص** ناطق ہے۔

آج جو طریقہ نمازوں کے بعد مروج ہے' یہ اس طرح ثابت نہیں ہے۔ بعض لوگ فرض نماز کے پیچھے فوراً ہی سلام کے بعد ہاتھ اٹھا کر امام اور مقتدی اجتماعی صورت میں دعا کرنے لگ جاتے ہیں۔ بعض کچھ اذکار ادعیہ مسنونہ پڑھ کر اس طرح دعا مانگتے ہیں اور بعض فرضوں کے بعد تین بار ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں اور بعض فرضوں کے بعد بھی اور سنتوں' نفلوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہیئت اجتماعی دعا مانگتے ہیں اور جب تک امام دعا نہ مانگے تب تک نہ جاتے ہیں' نہ سنت نفل پڑھتے ہیں' امام کے ساتھ ضرور دعا مانگتے ہیں۔ اگر ضروری کام ہو تو امام سے کہہ کر دعا منگواتے ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ سب اپنے اپنے دلائل پیش کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک بدعتی مولوی جو فرض نماز کے بعد لگاتار تین بار ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا تھا' اس سے میں نے اس کا ثبوت طلب کیا تو مولوی الخیری کی طرح اس نے دعاء مطلق کے دلائل پیش کر کے مسلم شریف کی یہ حدیث تین بار دعا مانگنے کے ثبوت میں پیش کی کہ آنحضور ﷺ جنت البقیع کی طرف گئے **فاطال القيام ثم رفع يديه ثلاث مرات** یعنی آپ بقیع میں بہت دیر تک کھڑے رہے اور پھر تین بار ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ اس پر شرح مسلم میں لکھا ہے' **فيه استحباب اطالة الدعاء وتكريره ورفع اليدين فيه**۔ یعنی اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ دعا لمبی مانگنی چاہیے اور رفع یدین بھی اس میں ہو اور تکرار بھی مستحب ہے۔

میں نے کہا کہ ؎

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا
بھان متی نے کنبہ جوڑا

یہ تو خاص واقعہ کا ذکر ہے اور قبرستان کا موقعہ ہے۔ جرائیل کے کہنے پر آپ اہل البقیع کے حق میں دعا کرنے کے لیے گئے تھے۔ **وقائع الاعيان لا عموم لها**۔ اس سے نمازوں کے بعد تین مدفعہ دعا مانگنے کا ثبوت کیسے ہو گیا؟ پھر اگر اس پر عمل کرنا ہے تو سب لمبا قیام کر کے اس طرح دعائیں مانگا کرو۔ شرح میں یہ بھی ہے کہ **وفيه ان دعاء القائم اكمل من دعاء الجالس فى القبور**۔ یعنی قبروں میں قائم کی دعا جالس کی دعا سے زیادہ کامل ہے۔ اب تمام اہل بدعت کو رات کے وقت قبرستان میں جا کر

اس طرح کرنا چاہیے۔ کیونکہ مسجد میں ثابت نہیں ہے' فتدبر۔

پھر اس نے یہ حدیث پیش کی کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یعجبه ان یدعو ثلاثا یعنی نبی کریم ﷺ کو تین بار دعا کرنا خوش اور پسند تھا۔ میں نے کہا کہ اس سے تین بار ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے تو تین بار کلمہ دعائیہ کا دہرانا مراد ہے۔ جیسے یوں کہے رب اغفرلی' رب اغفرلی' رب اغفرلی۔ چنانچہ بین السجدتین جلسہ میں اس کا تین بار پڑھنا اور رکوع' سجود میں تسبیح کا تین بار پڑھنا ثابت ہے۔ مگر تین میں حصر نہیں۔ بعض دعائیہ کلمات سات بار جیسے اللھم اجرنی من النار اور بعض تسبیح دس بار پڑھنا بھی ثابت ہے۔

الغرض ہر فریق اپنے معمول بہا طریقہ کا ثبوت تیار کر رہا ہے' جس کا وہ التزام کئے ہوئے ہے۔ مگر اسوہ حسنہ سے ایسی ہیئت اجتماعیہ مخصوصہ سے کوئی فریق ثابت نہیں کر سکتا۔ جو دلیل پیش کرتے ہیں' وہ دعویٰ کے مطابق نہیں ہوتی۔ مثلاً یدعوا ثلاثا سے اگر تین بار ہاتھ اٹھانا مراد ہو تو پھر اسی حدیث میں دوسرا جملہ یہ ہے کہ ویستغفر ثلاثا تو اس سے تین بار ہاتھ اٹھا کر استغفار کرنا مراد ہو گا۔ تو یہ چھ بار بن جائے گا۔ اس کے اہل بدعت بھی قائل نہیں ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد اختلاف کثیر واقع ہو گا۔ فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین۔ تب میرے اور میرے خلفاء کے طریقہ مشروعہ کو لازم پکڑنا ہو گا۔ سو اس اسوہ حسنہ میں یہ طریقے مروجہ نہیں پائے گئے۔ اگر کسی امر شرعی میں ذرا تبدل و تغیر ہو کر اس کی ہیئت اصلیہ قائم نہ رہے تو وہ امر شرعی نہیں رہتا بلکہ بدعت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان رفعکم ایدیکم بدعة مازاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ھذا علی الصدر۔ یعنی تمہارا رواجی طریقہ ہاتھ اٹھانے کا بدعت ہے۔ رسول اللہ ﷺ سینہ تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔ زہری کہتے ہیں کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرفع یدیه عند صدره فی الدعا ثم یمسح بھما وجھه یعنی آنحضور ﷺ سینہ تک اپنے ہاتھ اٹھاتے تھے' پھر اپنے ہاتھوں کو منہ پر مل لیتے تھے۔ غور فرمایئے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے عام رواج کو اسوہ حسنہ کے خلاف جان کر بدعت قرار دے دیا تھا۔ اب یہاں دیگر علماء کرام کے مقالات پیش کئے جاتے ہیں' ان

کو غور سے پڑھیئے۔

سبل السلام ربع چہارم' ص-۲۹۶ میں علامہ محدث امیر یمنی فرماتے ہیں کہ اما هذه الهيئة التي يفعلها الناس في الدعاء بعد السلام من الصلوٰة بان يبقى الامام مستقبل القبلة والمؤتمون خلفه يدعو ويدعون فقال ابن القيم لم يكن ذلك من هدى النبي صلى الله عليه وسلم ولا مروى عنه في حديث صحيح ولا حسن' انتهٰى كذا في زاد المعاد۔ یعنی جس ہیئت مخصوصہ سے سلام پھیرنے کے بعد آج کل رواج دعا مانگنے کا ہے کہ امام رو بقبلہ ہو کر بیٹھا رہتا ہے پھر امام اور مقتدی سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کا نہ تھا' نہ یہ کسی حدیث صحیح سے ثابت ہے اور نہ حسن سے۔ علامہ ابن القیم نے بھی زاد المعاد میں اسی طرح لکھا ہے۔

علامہ عبداللہ بن سعدی عبدلی غامدی اپنے رسالہ منح المنعم علیم ص-۲۱ میں فرماتے ہیں کہ ولم يكن من سنته الدعاء بعد الصبح والعصر كما انه لم يكن من سنته الدعاء بعد الفرائض بهيئة الاجتماع والجماعة يؤمنون ولم يكن من هديه قراة الفاتحة بعد الدعاء واهداء ثوابها ولم يفعل ذالک هو ولا احد من الخلفاء الراشدين المهديين ولا احد من الصحابة ولا فعله احد من الائمة الاربعة ابى حنيفة ومالک والشافعي واحمد بن حنبل رحمهم الله ولا استحبه احد من السلف ولا من الخلف بل ان ذلک بدعة منكرة حدثت فى القرن الخامس او السادس او نحو ذالک وانما كان هدى المصطفٰى صلى الله عليه وسلم الدعاء فى الصلوٰة قبل السلام منها كما تقدم او الذكر سرا وهو منفردو من اراد الوقوف على الحقيقة فعليه بمراجعة كتاب الاعتصام للشاطبى وزاد المعاد لابن القيم ومجموعة الاحاديث وسبل السلام وكتاب السنن۔

(ترجمہ) اس ہیئت اجتماعی سے فرضوں کے بعد دعا مانگنا کہ امام دعا کرے اور مقتدی کہیں' سنت نبوی سے ثابت نہیں۔ اسی طرح دعا کے بعد فاتحہ خوانی کر کے اموات کو ایصال ثواب کرنا بھی طریقہ نبوی نہیں ہے۔ نہ نبی کریم ﷺ نے یہ کام اس ہیئت سے کئے' نہ خلفاء راشدین اور صحابہ کرام اور ائمہ اربعہ نے کئے تھے۔ آنحضور ﷺ کا طریقہ نماز میں دعا کرنا تھا' یا نماز کے بعد ذکر کرنا تھا' جس کی تفصیل ہو چکی ہے۔

مزید تفصیل اس کی زاد المعاد وغیرہ میں ہے۔

مولانا انور شاہ صاحب شیخ الحدیث دیوبندی نے اپنی کتاب العرف الشذی شرح ترمذی ص-۲۴۹ میں فرمایا ہے کہ ویعلم ان الدعاء المعمول فی زماننا من الدعاء بعد الفریضة رافعین ایدیہم علی الھیئاة الکذائیة لم تکن المواظبة علیه فی عہده علیه السلام' نعم الادعیة بعد الفریضة ثابتة کثیرا بلا رفع الیدین وبدون الاجتماع وثبوتها متواتر. وثبت الدعاء مجتمعا مع رفع الیدین بعد النافلة فی الوقعتین احدهما فی ام سلیم حین صلی النبی صلی الله علیه وسلم السجد و دعا لانس واما ما فی کتاب اعتصام والسنة للشاطبی عن مالک انه بدعة فمراده انه لم یستمر هذاالعمل فی العهد المبارک ولیس غرضه حکم عدم الجواز علیه وقال بعض الاحناف من اهل العصر ان رفع الیدین لما ثبت فی المواضع الآخر بعدی الی الدعاء بعد المکتوبة ایضا" واستدلال بالعموم اقول لا ریب فی ثبوت رفع الیدین فی الادعیة فی غیر المکتوبة لکن الاحتجاج بالعموم والاطلاق انما یکون فیما لم یرد حکمه الخاص' وقال ابن القیم فی الزاد هذا بدعة وقوم قش۔

(ترجمہ) فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر جو خاص ہیئت سے دعا مانگنا ہمارے زمانہ میں مروج ہے' عہد نبوی میں یہ نہ تھا۔ ہاں فرضوں کے بعد بغیر رفع یدین اور حالت اجتماعی کے ادعیہ پڑھنا ثابت ہے' جس کا ثبوت متواتر ہے۔ نفل نماز کے بعد ثبوت دو واقعہ میں ہے۔ ایک ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر میں انس رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کی گئی تھی۔ دوسری دعا انس رضی اللہ عنہ کتاب الاعتصام میں ہے کہ یہ دعا مروجہ بدعت ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ عہد مبارک میں اس پر استمرار نہیں ہوا تھا۔ عدم جواز کی غرض علی الاطلاق نہیں ہے۔ ہمارے بعض حنفیوں نے یہ کہا ہے کہ رفع یدین دیگر مواضع کی دعاؤں میں ثابت ہے۔ جس کا حکم اس دعا کی طرف بھی متعدی ہو سکتا ہے۔ یہ استدلال عموم ادلہ سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دیگر ادعیہ میں ثبوت کا تو شبہ نہیں لیکن عام اور مطلق ادلہ سے استدلال ان مسائل میں ہوتا ہے' جہاں کوئی خاص حکم وارد نہ ہو۔ (ورنہ عام دلیل سے دعویٰ خاص ثابت نہیں) علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ یہ بدعت ہے۔

پس راقم کہتا ہے کہ اس بارہ میں بعض ضعیف روایات بھی وارد ہیں' جن سے صرف جواز کا استدلال ہو سکتا ہے' مداومت اور التزام کا نہیں۔ هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

ماہنامہ قوانین فطرت سوہدرہ جلد-۶' شمارہ-۱۱ بابت ماہ نومبر سنہ-۱۹۵۹ء

تسبیح مروجہ پر ذکر اللہ کرنے کا جواز

الارشاد مطبوعہ ۱۹/ اکتوبر سنہ ۶۰ء کے ص۔ ۲۴ عنوان فتاوٰی کے تحت یہ سوال ہوا ہے کہ تسبیح مروجہ پر ذکر الٰہی اور وظائف کرنے کا کیا حکم ہے؟ بعض اس کو بدعت کہتے ہیں' کیا عہد نبوی اور صحابہ میں اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟ صحیح مسلک اس بارہ میں کیا ہے؟ اس کا جواب مختصر طور پر حضرت مولانا محمد یونس صاحب قریشی مفتی مدظلہ نے دیا ہے چونکہ اس پر بعض جگہ نزاع ہوا ہے اور بعض جگہ اس کے بدعت ہونے پر زور دیا گیا ہے اور اکثر یہ مسئلہ دریافت کیا جاتا ہے' اس لیے یہ مسئلہ کچھ تفصیل طلب ہے۔

حضرت مولانا المفتی صاحب نے صحیح بخاری کے حوالہ سے یہ فرمایا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کھجور کی گٹھلیوں پر ذکر اللہ پڑھتے تھے" میرے علم میں یہ حوالہ بنام بخاری صحیح نہیں ہے کیونکہ باوجود تلاش اور تحقیق کے مجھے اس حوالہ سے یہ واقعہ نہیں ملا۔ اگر حضرت ممدوح باب اور حدیث صفحہ کے حوالہ سے لکھ دیں تو ان کا شکریہ ادا کیا جائے گا۔ ہاں میری تحقیق اس مسئلہ میں یہ ہے کہ مسائل کا نصوص سے ثبوت کئی طرح سے ہوتا ہے۔ عین عبارت سے یا دلالت سے یا اشارت سے یا اقتضاء سے" سو تسبیح مروجہ جس ہیئت کذائیہ سے اب موجود ہے یہ عہد نبوی اور قرون ثلاثہ میں نہ تھی۔ البتہ دلائل ایسے پائے جاتے ہیں جن کی دلالت یا اشارت یا اقتضاء سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس کو ضروری یا مقصود بالذات بشکل موجودہ نہ سمجھا جائے بلکہ سہولت کی غرض سے اس کو رکھنا اور حساب اور شمار کرنے کا ارادہ ہو تو یہ جائز ہے اور اس کے جواز پر قریباً اجماع ہے' اب اس کے دلائل سنئے :

(ا) ابوداؤد باب التسبیح بالحصی میں یہ حدیث ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں ایک عورت کے پاس پہنچا (تو یہ دیکھا کہ) اس کے سامنے کھجور کی گٹھلیاں یا کنکریاں (شک راوی ہے) پڑی ہیں اور وہ ان پر تسبیح پڑھ رہی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے یہ فرمایا کہ میں تجھے اس سے آسان اور افضل طریقہ بتاتا ہوں کہ تو اس طرح کہا کر : سبحان اللہ عدد ما خلق فی السماء وسبحان اللہ عدد ما خلق فی الارض وسبحان اللہ عدد ما بین ذالک وسبحان اللہ عدد ما ھو خالق۔

اسی طرح الحمد للہ اور اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ' لا حول ولا قوۃ الا باللہ کے ساتھ یہ کلمے شمار کر کے ملا کر پڑھو۔ اس شمار کا مطلب یہ ہے کہ میں سبحان اللہ کو اتنی بار کہتا ہوں کہ جتنی اللہ کی مخلوق آسمان میں ہے اور اس شمار سے کہتا ہوں کہ جس قدر اس نے زمین میں خلقت پیدا کی ہے اور اس حساب سے یہ تسبیح کہتا ہوں کہ جتنی اللہ کی مخلوق زمین آسمان کے مابین ہے اور اس اندازہ سے کہتا ہوں کہ جس قدر وہ خالق آئندہ خلقت پیدا کرنے والا ہے۔ اسی طرح الحمد للہ اور دیگر کلمات مذکور کے ساتھ یہ عدد ماثورہ ملا کر کہے تو اس کے یہ کلمے اسی حساب سے شمار کر کے لکھے جائیں گے اور تمام مخلوقات کی تعداد کے موافق یہ کلمات کہے ہوئے قرار دیئے جائیں گے۔ اگرچہ یہ کلمے ایک بار اس طرح کہہ دے تب بھی مخلوقات کی گنتی برابر اجر حاصل ہو گا گو اس نے دن رات مشقت کر کے تمام کائنات کی گنتی کے حساب سے تکرار سے یہ کلمے نہ کہے ہوں۔

پس اس لحاظ سے یہ شمار ان گٹھلیوں سے فائق بھی ہو گیا اور آسان بھی ہوا کیونکہ پہروں' مہینوں' سالوں کا کام ایک منٹ میں ہو گیا لیکن صورت سابقہ جو اس عورت کی معمول بہا تھی' اس پر بھی انکار نہیں کیا گیا بلکہ اس کو مفضل علیہ ٹھہرا کر دوسرے عمل کو جو مفضل ہے بیان کر دیا گیا ہے' جس سے مفضل علیہ کا جواز لازم آگیا۔ جب گٹھلیوں پر شمار جائز ہوا تو کنکریوں' چنوں' دانوں' منکوں پر بھی جائز ہوا۔ کیونکہ مقصود وہ معدود بہ نہیں ہے بلکہ عدد اور وہ کلمہ ہے جو معدود ہے۔ پھر ان دانوں' منکوں کو بغیر پرونے کے رکھنا مشکل ہوا کہ ان کے گرنے اور منتشر ہونے کا اندیشہ تھا' اس لیے ان کو دھاگہ میں پرو لیا گیا اور اس کا نام عربی میں سبحہ ہوا اور مِذْکِرْ بھی کہتے ہیں کہ یہ آلہ ذکر الٰہی ہے کہ اس پر ذکر کیا جاتا ہے' فتذکروا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ پھر اہل بدعت کی مسجدوں میں جو زنبیلوں کو گٹھلیوں سے بھر کر رکھا ہوا ہے اور وہ صبح و شام نمازیوں کے سامنے کپڑا بچھا کر ڈال دیتے ہیں پھر اس پر سب نمازی مل کر ذکر کرتے ہیں یہ بھی جائز ہے حالانکہ اہلحدیث اس کو بدعت کہتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل بدعت کا یہ تعامل کئی وجہ سے بدعت ہے۔ اول یہ کہ وہ حالت اجتماعی سے پڑھتے ہیں۔ دوم انہوں نے اس کا التزام واہتمام کر رکھا ہے جو نہ کرے' اس پر طعن ہے۔ سوم ہر شخص کو کوئی خاص شمار ملحوظ نہیں ہے بلکہ جو اس کے سامنے ڈال دی گئی ہیں' ان کو

ختم کرنا ہے اور اس طرح سب کا اجتماعی طور پر ان سب گٹھلیوں کو ختم کرنا ضروری ہے جو زنبیلوں سے نکلی ہیں۔ چہارم مسجد مخصوص ہے' گھروں میں اس طرح نہیں ہے۔ یہ ہیئت کذائیہ بدعت ہے کہ مجموعہ امور کا مقصود ہے لیکن تسبیح پر جو ذکر ہوتا ہے اس میں وہ ذکر الٰہی کو مقصود جانتے ہیں اور اس تعداد کو پورا کرتے ہیں۔ تسبیح مخصوصہ کو شرعاً مقصود نہیں جانتے اور نہ کرنے والے پر کوئی طعن نہیں ہے بلکہ یہ محض اپنا ذاتی التزام ہے' دوسرا کوئی کرے یا نہ کرے یہ ذکر انفرادی طور پر ہوتا ہے۔

(۲) عن صفية تقول دخل علي رسول الله صلى الله عليه وسلم وبين يدي اربعة الاف نواة اسبح بها قال لقد سبحت بهذه الا اعلمك باكثر مما سبحت به فقلت بلى علمني فقال قولي سبحان الله عدد خلقه۔ (الترمذی) یعنی "حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ میرے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے' اس وقت میرے سامنے چار ہزار گٹھلیاں تھیں جن پر میں تسبیح پڑ رہی تھی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تو ان گٹھلیوں کے حساب سے تسبیح پڑھ رہی ہے' کیا میں ان سے زیادہ گنتی سے تسبیح پڑھنے کا طریقہ سکھلاؤں؟ میں نے کہا کہ ہاں آپ مجھے سکھلا دیجئے پھر آپ نے فرمایا کہ اس طرح کہا کرو سبحان الله عدد خلقه یعنی اللہ کو میں پاک کہتی ہوں ساتھ مقدار خلقت اس کی کے۔" اس حدیث کو امام سیوطی نے صحیح کہا ہے اور امام حاکم نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

اس سے تین مسائل ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ گنتی کے لیے کوئی چیز رکھنی جائز ہے۔ دوم خاص گنتی سے کسی ورد کا التزام جائز ہے مگر ذاتی اور انفرادی طور سے۔ سوم بلا تکرار ایک بار کہنے سے مخلوقات کی مقدار پر تسبیح کا ہو جانا مگر اسی تسبیح اور کلمے کا ہو گا جس کو شارع علیہ السلام نے سکھلایا ہے کیونکہ اذکار وادعیہ ماثورہ توقیفی ہیں' ان میں قیاس کو دخل نہیں ہے۔

ان احادیث کو تحفۃ الاحوذی ج۔۴' ص۔۳۵۲ میں علامہ ومحدث مبارک پوری رحمہ اللہ نقل کر کے پھر نیل الاوطار سے امام ربانی علامہ شوکانی رحمہ اللہ کا فیصلہ ذکر فرماتے ہیں جو یہ ہے: هذان الحديثان يدلان على جواز عد التسبيح بالنوى والحصى وكذا بالسبحة لعدم الفارق لتقريره صلى الله عليه وسلم للمراتين على ذالك وعدم انكاره والارشاد الى ما هو الافضل لاينا في الجواز۔ یعنی یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ گٹھلیوں اور کنکریوں پر تسبیح حساب سے پڑھنا جائز ہے' اسی طرح تسبیح مروجہ پر بھی جائز

ہے کیونکہ مقصد ایک ہے' ان میں اصل شمار کے لحاظ سے کچھ فرق نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس شمار پر انکار نہیں فرمایا بلکہ اس کو برقرار رکھ کر اس سے افضل دوسرا عمل اور طریقہ بتا دیا۔ افضل کی طرف ارشاد کرنا غیر افضل کے جواز کی نفی نہیں کرتا۔

پھر ذکر کیا ہے کہ امام سیوطی نے اس تسبیح مروجہ کے ثبوت جواز کے لیے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام یہ ہے "المنحه في السبحه" جس میں تسبیح معروفہ کے جواز پر دلائل لکھ کر پھر یہ لکھا ہے کہ لم ینقل عن احد من السلف ولا من الخلف المنع من جواز عد الذکر بالسبحة بل کان اکثرهم یعدونه بها ولا یرون ذالک مکروها الخ۔ یعنی تسبیح معروفہ پر ذکر کرنا علماء سلف وخلف میں سے کسی عالم سے بھی ممنوع اور ناجائز ہونا منقول نہیں ہے بلکہ اکثر اس پر عمل کرتے تھے اور اس کو مکروہ نہیں جانتے تھے۔ (یعنی اس پر قریباً اجماع امت ہے)

پھر امام سیوطی نے تسبیح معروفہ کے ثابت کرنے کے لیے سلف صالحین سے کئی آثار ذکر کئے ہیں جن میں سے بعض نیل الاوطار اور تحفۃ الاحوذی میں منقول ہیں۔

(۳) عن فاطمة بنت الحسین بن علی ابن ابی طالب انها کانت تسبح بخیط معقود فیها۔ یعنی حضرت فاطمہ بنت حسین ایک دھاگہ پر تسبیح پڑھتی تھیں جس میں گرہیں دی ہوئی تھیں یعنی دھاگہ میں جس حساب سے گرہیں دی گئی تھیں' اسی حساب سے ان پر تسبیح پڑھتی تھیں۔ تسبیح معروفہ اسی کی نظیر ہے' فرق گرہ اور منکوں کا ہے مگر مقصود ایک ہے۔

(۴) عن ابی هریرة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه انه کان له خیط فیه الفا عقدة فلا ینام حتّٰی یسبح۔ یعنی "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک دھاگہ بنا رکھا تھا جس میں دو ہزار گرہیں تھیں' وہ رات کو تسبیح پڑھتے تو ان کو پورا کئے بغیر نہ سوتے تھے۔" تسبیح بھی اسی کی مثل ہے۔

(۵) قاسم بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ کان لابی الدرداء نوی من العجوة فی کیس فکان اذا صلی الغداة اخرجها واحدة یسبح بهن حتّٰی ینفدهن۔ یعنی "حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے عجوہ کھجور کی گٹھلیاں کیسہ میں ڈال رکھی تھیں، جب صبح کی نماز پڑھتے تو ایک ایک کو نکال کر ان پر تسبیح پڑھتے رہتے یہاں تک کہ تمام ختم کر دیتے تھے۔" مقصد خاص حساب سے تسبیح پڑھنا ہے خواہ کنکریاں ہوں یا گٹھلیاں ہوں یا دھاگہ میں گرہ ہوں یا منکے ہوں۔

(۶) عن ابی هریرة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه انه کان یسبح بالنوی المجموع۔ (اخرجه

ابن سعد) یعنی "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ گٹھلیوں پر تسبیح پڑھتے تھے جو (کسی دھاگہ میں پرو کر یا کیسہ میں) جمع کی گئی تھیں۔" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا معمول کبھی دھاگہ پر اور کبھی گٹھلیوں پر تھا۔ جس چیز میں سہولت دیکھی عمل کر لیا' مقصود خاص حساب کی رو سے تسبیح پڑھنا تھا۔ اسی طرح تسبیح معروف کا مقصد ہے' اس لیے یہ بھی جائز ہے۔

(۷) عن علی رضی اللہ تعالٰی عنہ مرفوعًا نعم المذکر السبحۃ (اخرجہ الدیلمی فی مسندہ الفردوس) یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تسبیح ذکر الٰہی کرنے کا اچھا آلہ ہے۔ یہ روایت تسبیح معروفہ کو بھی شامل ہے۔ پس ان مجموعہ دلائل سے ثابت ہوا کہ تسبیح معروفہ پر نمازیوں کا ذکر الٰہی کرنا درست ہے' بدعت نہیں ہے اور اس کی اباحت پر علماء امت کا اجماع ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انگلیوں پر ذکر الٰہی کرنا افضل اور مسنون ہے اور تسبیح پر زیادہ ذکر کرتا ہو تو جائز ہے اور اس عہد میں یہ نمازیوں کا لائسنس نماز ہے کہ بے نماز تسبیح نہیں رکھتے۔ عموماً نمازی لوگ ہی رکھتے ہیں۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاروی

الارشاد جدید کراچی جلد۔۔۔' شمارہ۔۔۔ بمطابق یکم دسمبر سنہ ۱۹۹۰ء

رکعات نماز پنجگانہ' قبل وبعد کی سنتوں' حدیث جمعۃ المبارک' وتر' شرکیہ الفاظ سے دم کرنے' بغیر بیعت کے موت جاہلیت وغیرہ کے بارے میں سوالات

سوال : (۱) نماز پنجگانہ کی رکعات تفصیل سے لکھیں کہ کس قدر ہیں یعنی ہر نماز کی رکعات سے مطلع فرمائیں اور سنتیں قبل وبعد کی آپ ادا کرتے ہیں یا نہیں؟

(۲) کیا جو حدیث جمعۃ المبارک کے حق میں آئی ہے' اس کو عید الاضحیٰ پر چسپاں فرماتے ہیں اور قربانی ایک انڈا' پاؤ بھر گوشت' ایک مرغ پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایک گائے کی قربانی میں کتنے کی شرکت خیال کرتے ہیں؟

(۳) خصوصاً وتر اور صبح کی سنتیں آپ ادا کرتے ہیں یا نہیں؟

(۴) بارہ رکعت مؤکدات (پانچ نمازوں میں) آپ ادا کرتے ہیں یا نہیں؟
(۵) بوقت مرض شرکیہ الفاظ کا دم کرنا جائز ہے؟
(۶) کیا صدقات فرضیہ وغیرہ آپ کی اجازت کے بغیر تقسیم ہو سکتے ہیں؟
(۷) جو آپ یا کسی دوسرے شخص کی بیعت نہ کرے' کیا وہ جہالت کی موت مرے گا؟
(۸) آپ کی امامت صغریٰ ہے یا کبریٰ؟
(۹) نیز آپ کی اس مروجہ امارت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟
(۱۰) سیٹھ حمید اللہ صاحب اور مولانا محمد صاحب جونا گڑھی رحمۃ اللہ علیہ دونوں کو آپ مسلمان سمجھتے ہیں یا اس کے برعکس' کیونکہ آپ کا ایک مرید مولوی محمد عرف بڑکو دونوں مذکور ہستیوں کو غیر مناسب الفاظ سے یاد فرماتے تھے۔ فقط والسلام

(مخلص خیر اندیش ریاض احمد خائف وزیر آباد)

جواب: (۱) پانچ نمازوں کے فرضوں کی رکعات اس حساب سے ہیں۔ دو صبح' چار ظہر' چار عصر' تین مغرب اور چار عشاء۔ ہم سنت رواتب ادا کرتے ہیں اور ادا کرنا بڑا ثواب جانتے ہیں۔

(۲) ہم انڈا وغیرہ دے کر قربانی سے سبکدوش نہیں ہوتے بلکہ دنبہ' بکرا' گائے' اونٹ وغیرہ حیوانات سے جو میسر ہو قربانی کرتے ہیں۔

(۳) ایک گائے میں شریک ہونا چاہیں تو سات اشخاص ہو سکتے ہیں مگر ایک شخص سالم گائے کر دے تو اس کو زیادہ ثواب ہے۔

(۴) ہم وتر اور صبح کی سنتیں ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

(۵) ہم بارہ سنتیں پڑھنا بھی مسنون جانتے ہیں اور پڑھتے ہیں مگر اُن کو فرضوں کی طرح نہیں جانتے۔ سنن ونوافل کے تارک کو ثواب سے محروم اور انکاری کو کافر جانتے ہیں۔

(۶) مرض کے وقت آیات قرآنی اور ادعیہ مسنونہ سے اور ادویہ طبی حلال سے علاج کرنا مسنون جانتے ہیں۔ شرکیہ جادو ومنتر سے کرنا شرک اور کفر جانتے ہیں۔

(۷) جس نے اپنے امام کی بیعت کی ہے' اس کو چاہیے کہ صدقات زکوۃ بیت المال میں دے۔ یہ طریقہ معمول بہا عہد نبوی اور خلفاء میں تھا یا امام سے اجازت لے کر جہاں شرعی حکم ہو صرف کر دے۔

(۸) بیعت کرنا ضروری ہے' سفر و حضر میں امیر بنا کر منظم رہنے کا حکم ہے۔ اگر آزاد ہو کر اپنی خواہشات کا تابع ہو گا تو خود جاہلیت کی موت مرے گا۔

(۹) صغریٰ کبریٰ علماء کی اصطلاحات ہیں' امیر بنا کر اس کے ماتحت رہنا ضروری ہے۔

(۱۰) شرعی حیثیت یہ ہے کہ لوگوں نے انتخاب کیا کہ مولانا عبدالستار صاحب ہمارے امام ہیں' اسی سے جماعت قائم ہو گئی' آپ ان کے امام ہیں۔

(۱۱) سیٹھ حمید اللہ اور مولانا محمد جونا گڑھی اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گئے۔ تلک امة قد خلت لها ما کسبت ولکم ما کسبتم ہم کیا حکم لگا سکتے ہیں۔

(۱۲) مولوی محمد بھی رخصت ہوئے' ان کا معاملہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ ہم کسی کو برا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ حدیث میں ہے : لا تسبوا الاموات فانهم قد افضوا الی ما قدموا۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص ۳۵

کیا مغرب کی دو سنتیں مسجد میں پڑھنی جائز ہیں؟

احیاء سنت کی فضیلت: اگرچہ اس پر آشوب دور اور پرفتن زمانہ میں جب کہ اصول اسلام اور ارکان دین ہی چکنا چور وملیامیٹ ہو رہے ہیں' کسی فروعی مسئلہ کی بحث لکھنے سے شرم آتی ہے۔ لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوئی سنت مردہ ہو چکی ہو' بلکہ وہ انکار کی حد میں داخل ہو' تو اس وقت اس کے احیاء کی طرف متوجہ ہونا سچے پکے اہلسنت والجماعت (اہلحدیث) پر فرض ہو جاتا ہے' کیونکہ اہل سنت والجماعت کی تعریف کی ماہیت میں تمسک بالسنہ داخل ہے اور اس کو ہی ایک شہید کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ حدیث میں وارد ہے : من احیٰی سنتی فقد احیانی ومن احیانی کان معی فی الجنة (ترمذی) "یعنی جس شخص نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کیا اور جس نے مجھے زندہ کیا' وہ میرے ہمراہ جنت میں ہو گا۔"

جب محی السنہ (سنت کے زندہ کرنے والے) کو آنحضور ﷺ کی معیت متقاربہ حاصل ہو جاتی ہے' تو اہلحدیث' اہل سنت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ مردہ متروکہ سنت کو زندہ کر کے

آنحضرت ﷺ کی رفاقت کا شرف حاصل کرے۔ ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا : من احیی سنة من سنتی امیت بعدی فان له من الاجر مثل اجور من عمل بھا من غیر ان ینقص من اجورھم شیئا۔ (مشکوٰۃ) "جس شخص نے میری سنت کو زندہ کیا' جو میرے بعد مردہ ہو چکی تھی' تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس پر عمل کرنے والوں کو ملے گا' ان کے اجور میں بھی کمی نہیں ہو گی۔"

غرباء اہلحدیث کی تعریف : جن غرباء اہلحدیث کو آنحضور ﷺ نے مبارک باد دی ہے' ان کی تعریف بھی یہ بیان فرمائی ہے : وھم الذین یصلحون ما افسد الناس من بعدی من سنتی۔ (مشکوٰۃ) "غرباء وہ لوگ ہیں جو میری اس سنت کی اصلاح کریں گے' جس کو میرے بعد لوگ بگاڑ دیں گے۔" یہی غرباء ہی فرقہ ناجیہ میں شمار ہیں' کیونکہ فرقہ ناجیہ کی تعریف میں جو حدیث ما انا علیه واصحابی وارد ہوئی ہے۔ اس کے صحیح مصداق یہی لوگ ہیں۔ حدیث مذکورہ کی تشریح یوں کی گئی ہے : من کان علی ماانا علیه واصحابی من الاعتقاد والقول والعمل۔ "یعنی امت محمدیہ کے سب فرقے جہنم میں جائیں گے' مگر وہ جماعت جو اپنے عقائد اور اقوال وافعال کے لحاظ سے اس طریقہ پر قائم ہے جس پر نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام قائم تھے۔"

کتب اصول مثلاً "توضیح تلویح" وغیرہ میں بھی اہل سنت والجماعت کی تعریف یوں مرقوم ہے : اھل السنة والجماعة ھم الذین طریقتھم طریقة الرسول واصحابه دون اھل البدع۔ "اہل سنت والجماعۃ بدعتیوں کے علاوہ وہ لوگ ہیں جن کا طریقہ وعمل وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام ؓ کا طریقہ تھا۔"

مذاہب اربعہ کا کوئی حکم نہیں : برادران احناف میں جناب ملا علی قاری صاحب نہایت مسلم بزرگ ہوئے ہیں۔ کتاب مرقات شرح مشکوٰۃ آپ ہی کی شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ آپ شرح عین العلمؔ مطبوعہ عامرہ استنبول کے ص ۳۲۶ میں فرماتے ہیں : یہ شریعت میں جانی ہوئی اور مانی ہوئی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی بننے کا حکم نہیں دیا : بل کلفھم ان یعملوا بالسنة "بلکہ سب کو اس بات کا مکلف (پابند) کیا ہے کہ وہ سنت نبوی پر عمل کریں۔"

شفا قاضی عیاض ص ۱۶۸ میں ہے : عن علی قال الا انی لست بنبی ولا یوحی الی

ولکنی اعمل بکتاب اللّٰہ وسنۃ نبیہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما استطعت۔ "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہ میں نبی ہوں اور نہ ہی میری طرف وحی آتی ہے' لیکن میں تو حتی الوسع کتاب اللہ اور سنت نبوی کا پابند ہوں۔"

یہ میرے موضوع کی تمہید ہے' اب اصل موضوع سنئے۔

گھر میں سنتیں: مغرب کی دو سنت گھر میں پڑھنا سنت ہیں۔ چنانچہ زادالمعاد جلد۔۱' ص۔۸۱ میں ہے: والسنۃ الثانیۃ ان تفعل فی البیت۔ "مغرب کی دو رکعت کے بارے میں دو باتیں سنت ہیں۔ (۱) فرضوں کے بعد بات چیت کئے بغیر پڑھی جائیں۔ (۲) ان کو گھر میں پڑھا جائے۔

قولی حدیث سے ثبوت: کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت ہے۔ جس کو نسائی' ابوداؤد' ترمذی نے بیان کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ عبدالاشہل کی مسجد میں تشریف آور ہوئے اور وہاں مغرب کی نماز پڑھی' جب لوگوں نے فرض نماز ادا کر لی' تو وہ سنت پڑھنے لگے۔ آپ نے ان کو دیکھا تو یہ فرمایا: ھذہ صلوۃ البیوت "یہ نماز گھر کی ہے۔" ابن ماجہ کی روایت میں یوں ارشاد ہے: ارکعوا ھاتین الرکعتین فی بیوتکم۔ "تم ان دو رکعتوں کو اپنے گھروں میں جا کر پڑھو۔" ایک روایت میں یوں آیا ہے: علیکم بھذہ الصلوۃ فی البیوت۔ "اس نماز کو تم اپنے گھروں میں لازم کر لو۔" اس قولی حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ یہ نماز گھر کی ہے' مسجدوں کی نہیں ہے۔ لہٰذا سب پر لازم ہے کہ اس کو گھروں پر جا کر پڑھیں۔

خصوصی نماز: بعض نماز کو بعض جگہ سے خصوصیت ہوتی ہے' وہ وہاں ہی پڑھنی لازم ہوتی ہے۔ مثلاً نماز تحیۃ المسجد کی مسجد سے خصوصیت ہے۔ نماز عید کی صحراء سے خصوصیت ہے۔ طواف کی دو رکعت کی مقام ابراہیم سے خصوصیت ہے۔ اسی طرح سنت مغرب کی گھر سے خصوصیت ہے۔ علامہ سندی حاشیہ نسائی میں حدیث علیکم بھذہ الصلوۃ فی البیوت پر یوں ریمارک کرتے ہیں: یلزم منہ ان یکون للصلوۃ التی بعدالمغرب زیادۃ اختصاص بالبیت فوق اختصاص مطلق النافلۃ "یعنی اس حدیث سے یہ لازم آیا کہ مغرب کے بعد نماز کو گھر کے ساتھ بہ نسبت دیگر نوافل وسنن کے زیادہ خصوصیت حاصل ہے۔" میں کہتا ہوں اس لئے اس کو گھر میں ہی پڑھنا سنت ہے۔

فعلی حدیث سے ثبوت: مسند احمد بمع شرح جلد۔۴' ص۔۱۹۸ میں ہے۔ حضرت عائشہ سنن اربعہ کا شمار کرتی ہوئی فرماتی ہیں : کان یصلی بالناس المغرب ثم یرجع الی بیته فیصلی رکعتین۔ "آنحضور ﷺ لوگوں کو مغرب کی نماز پڑھا کر پھر اپنے گھر آ کر مغرب کی دو رکعت پڑھتے تھے۔" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سنن اربعہ کا شمار کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں : رکعتین بعد المغرب فی بیته "فرض نماز مغرب کے بعد دو سنتیں گھر میں ہیں۔"

مسند احمد جلد۔۲' ص۔۲۴۳ میں ہے : ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کان یصلی رکعتین بعد المغرب فی بیته۔ "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مغرب کی دو رکعتوں کو اپنے گھر میں پڑھا کرتے تھے۔" اس حدیث میں الفاظ کان یصلی ماضی استمراری واقع ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ آنحضور ﷺ ان سنتوں کو ہمیشہ گھر میں پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ اس مفہوم کی تائید مندرجہ ذیل حدیث سے بھی ثابت ہے : کان یرفع یدیه عند تکبیرة الاحرام "آنحضرت ﷺ تکبیر تحریمہ کے وقت دونوں ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔"

عون المعبود میں ہے : کان یفید الدوام والاستمرار۔ لفظ کان دوام واستمرار پر دال ہے۔ جلد۔۱' ص۔۲۷۴ نیل الاوطار ج ۲' ص۔۲۳۲ میں ہے : قد تقرر فی الاصول ان کان یفید الاستمرار وعموم الازمان۔ لفظ کان عام زمانوں اور استمرار پر دال ہے جیسا کہ علم اصول میں یہ قاعدہ مقرر ہے۔

فتح الباری میں ہے : وفی حدیث ابن عمر ما یدل علی المداومة وهو قوله بعد ذکر الحربة کان یفعل ذالک فی السفر۔ یعنی حدیث ابن عمر میں لفظ کان یفعل ہمیشگی پر دال ہے۔ علامہ سندھی رحمہ اللہ نماز جمعہ کے ذکر میں بعد الزوال پر رقمطراز ہیں : وصیغة المضارع تدل علی الاعتیاد والاستمرار بعد کان مضارع کا صیغہ کان کے بعد واقع ہو تو یہ ہمیشگی اور دائمی عادت پر دال ہے۔ اسی طرح مرقاة شرح مشکوٰة میں ہے۔ مقلدین حنفیہ جب اہلحدیث سے نماز میں ہمیشہ رفع یدین کرنے کا ثبوت طلب کرتے ہیں تو علماء اہلحدیث کان یرفع یدیه کی حدیث پیش کر کے اسی قاعدہ سے رفع یدین کا استمراری سنت ہو جانا ثابت کرتے ہیں۔

تو اب علماء اہلحدیث کو اسی قاعدہ کی بنا پر تسلیم کر لینا چاہئے کہ آنحضور ﷺ مغرب کی سنت

گھر میں پڑھا کرتے تھے' جب یہ مان لیا تو ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ مسجد میں ان کو پڑھنا سنت کے خلاف ہے۔ احادیث قولیہ اور فعلیہ سے سنت مغرب کا گھر میں پڑھنا ثابت ہے۔

اب جو شخص مسجد میں بلا غور جائز کہے اور اس پر صریح حدیث پیش کرے تو ہم مسجد میں ان کا جواز مان سکتے ہیں' ورنہ مسجد میں پڑھنے والے کے حق میں یہ کہیں گے کہ اس نے خلاف سنت یہ نماز پڑھی ہے۔ اس کی نماز اس کو کفایت نہ کرے گی۔

مسجد کی سنت مغرب : مسند احمد جلد۔۴ ص۔۴۲۷ میں ہے۔ محمود بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ بنی عبدالاشہل کے پاس تشریف لائے تو ان کو نماز مغرب پڑھائی۔ جب سلام پھیرا تو لوگوں کو یہ ارشاد فرمایا : ارکعوا هاتين الركعتين في بيوتكم۔ "تم ان دونوں رکعتوں کو اپنے گھروں میں جا کر پڑھو۔"

امام عبداللہ ابن امام احمد رحمہ اللہ نے اپنے والد مرحوم سے استفسار کیا کہ ایک شخص یہ فتویٰ دیتا ہے : من صلی رکعتین بعد المغرب فی المسجد لم تجزه الا ان یصلیهما فی بیته۔ "جس شخص نے مغرب کے بعد دو رکعتیں مسجد میں پڑھیں وہ اس کو کفایت نہ کریں گی' تاوقتیکہ وہ اپنے گھر میں جا کر ان کو نہ پڑھے گا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے دریافت کیا کہ ایسا فتویٰ دینے والا کون شخص ہے؟ امام عبداللہ نے فرمایا وہ محمد بن عبدالرحمٰن یعنی امام ابن ابی لیلیٰ ہیں۔ احمد نے یہ سن کر فرمایا : ما احسن ما قال یہ ابن ابی لیلیٰ نے کیا ہی اچھا کہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن ابی لیلیٰ بہت مشہور امام اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہم پلہ فقیہہ ہیں' بلکہ ان کو کوفہ میں افقہ اہل دنیا کہا گیا ہے۔ گو امام ابوحنیفہ کی طرح ان کو روایت میں ضعیف کہا گیا ہے' مگر ان کی درایت اور فقاہت مسلم ہے۔ اس مسئلہ میں ان کی فقاہت کی تصدیق امام الائمہ رئیس الفقہا حضرت احمد رحمہ اللہ نے فرما دی ہے۔ لہٰذا بندہ کو یہ مسلک پسند آیا ہے۔ امام ابن ابی لیلیٰ اس میں منفرد نہیں ہیں' بلکہ بعض دیگر ائمہ بھی ان کی تائید فرماتے ہیں۔

چنانچہ زادالمعاد ج۔۱' ص۔۸۰ میں ہے۔ امام مروزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : من صلی رکعتین بعدالمغرب فی المسجد یکون عاصیا۔ "جس شخص نے مغرب کے بعد دو رکعتیں مسجد میں پڑھیں وہ گنہگار ہوا۔" کیونکہ اس نے حکم نبوی کی نافرمانی کی ہے۔ نیز لکھا ہے : یحکے عن ابی ثور انه قال هو عاص۔ "یعنی امام ابوثور رحمہ اللہ سے بھی یہ نقل کیا گیا

ہے کہ وہ عاصی ہے۔" میں کہتا ہوں کہ ان اماموں کا یہ مسلک سولہ(۱۶) آنے صحیح ہے' کیونکہ آنحضور ﷺ نے یہ فرما دیا ہے: علیکم بھذہ الصلوۃ فی البیوت۔ "اس نماز کو اپنے گھروں میں لازم کرلو۔" اس لئے کہ ھذہ صلوۃ البیوت۔ "یہ نماز گھر کی ہے (مسجد کی نہیں ہے۔) بنی عبدالاشہل کی مسجد میں لوگ اس نماز کو مسجد میں پڑھنے لگے' تو آنحضور ﷺ نے ان کو دیکھ کر یوں فرمایا تھا: ھذہ صلوۃ البیوت۔ اس فرمان نبوی ﷺ کے بعد صحابہ کرام نے اس نماز کو مسجد میں نہیں پڑھا۔ من ادعٰی فعلیہ البیان بالبرھان الصحیح الصریح۔ "اور نہ آنحضرت ﷺ سے کسی صحیح اور صریح حدیث سے مغرب کی سنتوں کا مسجد میں پڑھنا ثابت ہوا ہے۔"

زادالمعاد میں ہے: لا سیما سنۃ المغرب فانہ لم ینقل عنہ انہ فعلھا فی المسجد البتۃ "خصوصاً سنت مغرب تو آنحضور ﷺ اپنے گھر میں پڑھا کرتے تھے۔"

کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ آپ نے ان سنتوں کو مسجد میں پڑھا ہو' اگر پڑھا ہے تو اہل علم اس حدیث فعلی کو پیش کریں۔

عہد خلفاء کا تعامل: حضرات مقلدین حنفیہ ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا کرتے ہیں کہ ماہ رمضان المبارک میں بعہد خلفاء راشدین بیس عدد تراویح پڑھی گئی تھیں' مگر سند کے لحاظ سے ان کا ثبوت تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہوتا ہے۔ مرفوع کے لحاظ سے تو ان کا ثبوت درجہ صفر میں ہے' لیکن ہمارا ثبوت ایسا مضبوط ہے کہ اس کو تمام حنفی دنیا مل کر گرائے تو گرا نہیں سکتی۔ چنانچہ قولی اور فعلی حدیثوں سے ہم نے اس کا ثبوت دے دیا ہے' اب خلفاء راشدین کے زمانے کا ثبوت ملاحظہ ہو۔ زادالمعاد جلد اول ص-۸۰ میں ہے: قال الامام احمد فی روایۃ حنبل السنۃ ان یصلی الرجل الرکعتین بعدالمغرب فی بیتہ کذا روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ قال السائب بن یزید لقد رایت الناس فی زمن عمر بن الخطاب اذا انصرفوا من المغرب انصرفوا جمیعا حتی لا یبقی فی المسجد احد کانھم لا یصلون بعد المغرب حتی یصیروا الی اھلیھم۔ "یعنی امام احمد نے فرمایا کہ سنت یہ بات ہے کہ مغرب کی دو رکعت گھر میں پڑھے۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام سے اسی طرح مروی ہے۔ چنانچہ سائب بن یزید نے بیان کیا کہ زمانہ فاروقی رضی اللہ عنہ میں میں نے لوگوں کا یہ حال دیکھا کہ مغرب کی فرضی نماز پڑھ کر سب چلے جاتے تھے۔

مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد کوئی نماز نہ پڑھتے' یہاں تک کہ اپنے گھروں میں جا کر پڑھتے تھے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل بھی اسی طرح تھا۔ چنانچہ قیام اللیل ص۔۳۰ میں امام مروزی نقل کرتے ہیں کہ نوفل بن مساحق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو مغرب کی نماز پڑھا کر نکلے' میں ان کے پیچھے ہو لیا' فدخل منزله فصلى ركعتين۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں داخل ہوئے اور دو رکعتیں سنت مغرب کی پڑھیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا بھی یہی تعامل تھا۔ چنانچہ قیام اللیل میں عباس بن سہل بن سعد ساعدی سے مروی ہے : لقد ادركت الناس زمان عثمان ابن عفان وانه ليسلم من المغرب فلا ارى رجلا يصليهما في المسجد يبتدرون ابواب المسجد يخرجون حتى يصلوهما في بيوتهم۔ "یعنی میں نے لوگوں کو عہد عثمانی میں دیکھا کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مغرب کی نماز کا سلام پھیرتے تو وہ مسجد کے دروازوں کی طرف دوڑتے اور مسجد سے نکل کر گھروں میں سنت مغرب پڑھتے تھے۔ مسجد میں کسی کو میں نے سنت پڑھتے نہیں دیکھا۔"

نیز قیام اللیل میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ لوگ نماز فرض کے بعد مسجد میں سنت پڑھتے ہیں۔ کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں تو اس کو برا سمجھتا ہوں' پھر لوگ گھروں کو منتشر ہو گئے۔

جب حدیث قولی اور فعلی اور تعامل صحابہ سے یہ ثابت ہوا کہ سنت مغرب گھر میں پڑھنا سنت ہے' تو پھر خلاف سنت مسجد میں ہمیشہ پڑھنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ یا پھر اس کا صریح ثبوت پیش کرنا چاہیے۔

اقسام بدعت : ہمیشہ بلا عذر مسجد میں سنت مغرب کا پڑھنا بدعت ہے اور بدعت یعنی احداث فی الدین شرعاً دو قسم پر ہے۔ ایک ذاتی دوم وصفی۔ مثلاً بڑے پیر کی گیارہویں' آپ کے نام کا وظیفہ یاعلی' یاحسین کی ندا وغیرہ احداث فی الدین ذاتی ہے کہ ان کا وجود ہی شرع میں نہیں ہے۔ احداث وصفی یہ کہ چیز کا وجود شرع میں ہو' مگر اس کی ہیئت تبدیل ہونے اور اس میں قیود بڑھ جانے سے محدث ہو گیا ہو۔ جیسے صلوۃ ضحی کا وجود شرع میں ہے' لیکن بحالت اجتماعی لوگ اس کو مسجد میں پڑھیں تو یہ بدعت ہے۔

چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے صلوۃ ضحیٰ کی بابت فرمایا: بدعة "کہ یہ بدعت ہے۔" امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں: مراده ان اظهارها في المسجد الاجتماع لها بدعة لا ان اصل صلاة الضحى بدعة "یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مراد یہ ہے کہ اس کا اظہار اور اس کے لئے لوگوں کا جمع ہو کر پڑھنا بدعت ہے۔ اصل نماز ضحیٰ بدعت نہیں۔" کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی روایت آئی ہے۔

اسی طرح مصافحہ کا اصل وجود شرع میں ہے' لیکن نماز کے بعد ایک دوسرے سے مصافحہ کرنا بدعت ہے۔ چنانچہ بندہ جب اسال حج کرنے گیا' تو حرمین شریفین میں اکثر لوگوں کا یہ عمل دیکھا کہ وہ نماز کے بعد ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے تھے۔ مجھ سے بھی بعض عرب لوگ مصافحہ کرنے لگے۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ المصافحة بعد الصلوة بدعة لان النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه ما صفحوا بعدالصلوة من ادعى ذالك فعليه البرهان۔ "نماز کے بعد مصافحہ کرنا بدعت ہے' اس لئے کہ نبی علیہ السلام اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے نماز کے بعد مصافحہ نہیں کیا۔ جو شخص اس کے جواز کا دعویٰ کرے وہ اس کی دلیل پیش کرے۔" لیکن کسی عربی عالم نے دلیل پیش نہ کی اور وہ خاموش ہو گئے۔ اسی طرح تسبیح و تہلیل کا وجود شرع میں ہے' لیکن بہیئت اجتماعی خاص تعداد سے پڑھنا پڑھانا بدعت ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک گروہ کو جو اجتماعی صورت میں تکبیر' تسبیح اور کلمہ پڑھ رہے تھے فرمایا تھا: لقد جئتم ببدعة عظمى۔ (سنن دارمی مجمع الزوائد' احکام الاحکام) "تم ایک بہت بڑی بدعت کے مرتکب ہوئے ہو۔"

اسی طرح مولانا عبدالسمیع صاحب رام پوری نے اپنی کتاب انوار ساطعہ ص ۳۸ میں کتب فقہ سے یہ روایت نقل کی ہے: في فتاوى القاضي الجهر بالذكر حرام وقد صح عن ابي مسعود رضي الله عنه ان قوما اجتمعوا في المسجد يهللون يصلون عليه الصلوة والسلام جهرا فراح اليهم وقال ما عهدوا ذالك على عهده عليه الصلوة والسلام وما اراكم الا مبتدعين فما زال يكرر ذالك حتى اخرجهم من المسجد۔ "فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ جہر سے ذکر کرنا حرام ہے' کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے چند لوگوں کو مسجد سے اس لئے نکال دیا تھا کہ وہ بلند آواز سے کلمہ لا الہ الا اللہ اور درود وسلام پڑھتے تھے۔ حضرت

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تم کو بدعتی خیال کرتا ہوں۔ مکرر سہ کرر یہی فرماتے رہے۔ یہاں تک ان کو مسجد سے نکال دیا۔"

کلمہ لا الہ الا اللہ اور درود شریف وسلام کا وجود تو ثابت ہے' مگر ہیئت جدیدہ سے جو احداث کا وصف اس میں پیدا ہوا تو اس وقت یہ ذکر حرام اور بدعت ہوا۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم میں ہر شخص کو لازم ہے کہ اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کر لے وہ یہ کہ نماز میں داہنی طرف پھرنے کو ضروری سمجھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بسا اوقات بائیں طرف سے بھی پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔

اس حدیث سے یہ قاعدہ مستنبط ہوا کہ جو شخص کسی ایک شق جائز یا مستحب پر عمل کرے اور اصرار سے اسی کو ضروری قرار دے لے اور اس کے مقابل دوسری شق جو جائز اور مستحب ہے' اس پر عمل ترک کر دے تو ایسے شخص سے شیطان اپنا حصہ گمراہ کرنے کا حاصل کر لیتا ہے' بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر امر مندوب بھی اپنے رتبہ سے بڑھ جائے تو وہ بھی ناجائز ہو جاتا ہے۔ پس ان احادیث کے پیش نظر میرا مسلک یہ ہے کہ مغرب کی دو رکعت مسجد میں ہمیشہ پڑھنا اور جماعت فرض کے بعد سب کا بہیئت اجتماعی مسجد ہی میں پڑھنا بدعت ہے' کیونکہ مسجد میں ان سنتوں کے پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

چنانچہ زادالمعاد میں ہے : فانه لم ينقل عنه صلى الله عليه وسلم انه فعلها في المسجد البتة "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد میں ان سنتوں کا پڑھنا ثابت نہیں ہوا۔" پھر لکھا ہے : سنت یہ ہے کہ گھر میں پڑھے۔ اور یہ اس لئے کہ كذا روى عن النبي واصحابه "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے اسی طرح مروی ہے۔"

اس کا ثبوت مندرجہ بالا تحریر میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اب یا تو اہلحدیث اور حنفی علماء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے کوئی صریح دلیل پیش کر کے یہ ثبوت دیں کہ انہوں نے ان سنتوں کو مسجدوں میں پڑھا ہے یا پھر میرا مسلک اختیار کریں کہ ان سنتوں کو اپنے گھروں میں پڑھنا شروع کر دیں اور مسجدوں میں بند کر دیں۔ یہ احیاء سنت ہے۔ جس سے ایک شہید کا ثواب حاصل ہو گا۔ نیز اگر کوئی صریح حدیث نہ ملے اور کسی مجمل حدیث سے ایک بار کا عمل ثابت کریں' تو بھی مسجد میں ان کا ہمیشہ پڑھنا اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر کرتا ہے۔

دلیل پر تبصرہ: جو علماء حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ مسجد میں سنت مغرب پڑھنا جائز ہے وہ اس پر مندرجہ ذیل حدیث پیش کرتے ہیں' جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے : کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یطیل القراۃ فی الرکعتین بعد المغرب حتی یتفرق اھل المسجد (ابوداؤد) "رسول اللہ ﷺ مغرب کے بعد دو رکعتوں میں قراۃ اس قدر لمبی کرتے تھے کہ مسجد والے لوگ متفرق ہو جاتے تھے۔" اس حدیث سے مسجد میں سنت مغرب پڑھنے پر استدلال کرنا کئی وجہ سے درست نہیں۔

(۱) یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس لئے اس کی سند میں ایک راوی یعقوب بن عبداللہ قمی ہے۔ جس کے متعلق امام دارقطنی جو اہل جرح سے ہیں' یہ فرماتے ہیں : لیس بالقوی "یہ علم روایت میں قوی نہیں ضعیف ہے۔" تقریب میں لکھا ہے : صدوق یھم "یعنی سچا ہے مگر وہمی ہے۔"

(۲) اس حدیث میں مسجد میں پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حجرہ میں آپ نے مغرب کی سنتیں پڑھی ہوں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مسجد سے معلوم کر لیا ہو۔ چنانچہ مرعات المفاتیح میں ہے : قیل یحتمل انه کان یفعلھما فی البیت وان ابن عباس علم بذالک لان بیته صلی اللہ علیه وسلم کان متصلا بالمسجد ولم یکن بینھما الا جدار وکان فی الجدار باب الی المسجد۔ "اس میں احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سنتوں کو اپنے گھر میں پڑھا ہو اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کا حال معلوم کر لیا ہو۔ کیونکہ گھر آپ کا مسجد کے متصل ہی تھا۔ درمیان میں صرف ایک دیوار ہے' جس میں مسجد کی طرف دروازہ ہے۔"

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حالت عذر سے ہو۔ مثلاً یہ کہ آپ اعتکاف میں ہوں۔ اس وقت آپ نے ان سنتوں کو مسجد میں پڑھا ہو' اس لئے کہ گھر نہیں جا سکتے تھے۔ معتکف کے لئے سنت مسجد میں پڑھنا ضروری ہے۔ چنانچہ مرعاۃ میں ہے : وقیل یحمل علی وقت الاعتکاف۔ یہ احتمال بھی ہے کہ گھر میں پڑھنے کا کوئی عذر ہو' تب کبھی مسجد میں پڑھی ہوں گی۔ جیسا کہ مرعاۃ میں ہے : فیحمل علی ان فعلھما لعذر منعه من دخول البیت۔

(۳) یہ حدیث مجمل ہے اور ہماری دلیل مفسر ہے۔ امام ابن القیم تحفۃ الودود ص ۳۶ میں

فرماتے ہیں : والمفسر اولی من المجمل "دلیل مفسر مجمل سے اولیٰ ہوتی ہے۔" اس لئے مجمل کی ایسی توجیہ کی جائے کہ وہ مفسر کے ساتھ متفق ہو جائے۔ سو وہ توجیہات اوپر بیان ہو چکی ہیں۔

(۴) یہ حدیث قرات کی طوالت پر تو نص ہے، مگر مسجد میں سنت پڑھنے پر نص نہیں ہے۔ دلالت النص یا اشارۃ النص ہو سکتی ہے، تو پھر ہماری دلیل عبارۃ النص اس پر مقدم ہے۔ لہٰذا اس پر عمل کیا جائے کہ اس کو اس پر ترجیح ہے۔

(۵) اس حدیث میں قرات کے بارے میں یہ ذکر ہے کہ وہ طویل تھی، لیکن اس میں اندازہ کا ذکر نہیں اور نہ کسی سورت کا نام ذکر ہے۔ صرف یہ ذکر ہے کہ آپ ﷺ کی قرات اتنی لمبی تھی کہ مسجد کے لوگ گھروں کو چلے جاتے تھے۔ اب دیگر احادیث سے پتہ لگانا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ ان دو رکعتوں میں کون سی سورتیں پڑھتے تھے اور لوگوں کا کیا معمول تھا کہ وہ کب چلے جاتے تھے۔ سو اس کی بابت قیام اللیل کا ص۔۳۱ ملاحظہ فرمایئے۔
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے بے شمار مرتبہ یہ سنا کہ آنحضرت ﷺ فجر اور مغرب کی دو رکعتوں میں قل یاایہا الکافرون اور قل ھواللہ احد پڑھا کرتے تھے۔

ان حدیثوں سے آپ ﷺ کی قرات کا اندازہ ہو گیا کہ اس قدر لمبی تھی۔ دیگر یہ کہ لوگ مغرب کے فرض اور ورد، وظائف مسنونہ سے فارغ ہو کر چلے جائیں، کیونکہ ان کو حکم ہے : علیکم بھذہ الصلوۃ فی البیوت۔ "اس نماز کو گھروں میں لازم کر لو۔" لوگ اس حکم کی بنا پر فرضوں کے بعد ہی متفرق ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ عہد فاروقی رضی اللہ عنہ اور عہد عثمانی رضی اللہ عنہ کے لوگوں کا تعامل شاہد ہے۔ پس آنحضور ﷺ حجرہ شریف میں سنت مغرب شروع کرتے، مذکورہ بالا سورتوں کو پڑھتے اور لوگ مسجد والے چلے جاتے، یہ ایسا معنے اور ایسی صورت ہے کہ اس سے سب حدیثیں متفق ہو جاتی ہیں۔ قول، فعل میں تضاد اور تخالف پیدا نہیں ہوتا اور اگر ضرور قرات کو طویل بنانا ہے اور مسجد میں یہ سنتیں قائم کرنی ہیں تو پھر حالت اعتکاف پر محمول کر لیں کہ طویل قرات اعتکاف کے دنوں میں کرتے ہوں گے، کیونکہ ان دنوں خانگی امور سے فارغ البال ہوتے تھے۔ دیگر دنوں میں سنت گھر میں پڑھتے تھے تو قرات مختصر کرتے تھے، تاکہ امور خانگی کو سرانجام دیں۔ پھر یہ مطلب بھی ٹھیک ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ قیام اللیل میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی دو رکعت پڑھتے تو قرات اتنی لمبی کرتے تھے کہ سب سے آخر میں مسجد سے نکلتے تھے۔ اس سے صریح ثابت ہے کہ آپ کبھی مسجد میں بھی سنتیں پڑھتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی قیام اللیل میں ہے : هذا منقطع والاحاديث الاخر كان يصلي بعدالمغرب في بيته اثبت من هذا۔ یہ حدیث منقطع ہے یعنی مرسل ہے اور دیگر احادیث اس سے زیادہ صحیح ہیں۔ (جن میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں ان رکعتوں کو پڑھتے تھے۔)

نیز میں کہتا ہوں کہ قیام اللیل کی یہ روایت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ والی ناقابل احتجاج ہے۔ اس میں ایک راوی جعفر بن ابو مغیرہ جس کو "تقریب" میں وہمی لکھا ہے اور "میزان" میں ہے : قال ابن منده ليس هو بالقوى في سعيد بن جبير۔ "ابن منده نے کہا ہے کہ جعفر راوی سعید بن جبیر سے روایت کرنے میں ضعیف ہے۔" پس اس حدیث میں مذکورہ بالا دو نقص ہو گئے تو یہ قابل احتجاج نہ رہی اور دیگر کوئی حدیث موجود نہیں' تو بنا بریں گھر میں سنت مغرب پڑھنا سنت اور مسجد میں ہمیشہ پڑھنا بدعت ہوا۔ (فتذکر)

ترک سنت : اگر یہ کہا جائے گا کہ گھروں میں پڑھنا سنت اور مسجد میں پڑھنا جائز ہے' بدعت نہیں ہے' تو عرض یہ ہے کہ جب گھروں میں ان سنتوں کا پڑھنا سنت ہوا' تو پھر مسجد میں جائز کس دلیل سے ہوا۔ هاتوا برهانكم ان كنتم صادقين۔ ہاں جب یہ تسلیم ہے کہ ان سنتوں کا گھر میں پڑھنا سنت ہے تو پھر ان کا ترک موجب وعید ہے۔ حدیث میں چھ شخصوں پر لعنت آئی ہے۔ ان میں چھٹا یہ ہے : والتارک لسنتي۔ (مشکوٰۃ) یعنی جو میری سنت کا تارک ہے' وہ ملعون ہے۔ اور ابن ماجہ میں ہے : من لم يعمل بسنتي فليس مني۔ "جو میری سنت پر عمل نہ کرے وہ میری جماعت سے خارج ہے۔" تلویح میں ہے : ترک السنة المؤكدة قريب من الحرام يستحق حرمان الشفاعة "موکدہ سنت کا ترک حرام کے قریب ہے اور تارک شفاعت نبوی سے محروم ہے۔" جامع العلوم والحکم ص۔۲۴۳ میں یہ حدیث ہے' جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے : سيلي اموركم بعدي رجال يطفون السنة بالبدعة (ابن ماجه) میرے بعد تمہارے امور کے ایسے مرد سرپرست بنیں گے جو سنت کو بسبب بدعت کے مٹائیں گے۔ یعنی جو لوگ بجائے گھر میں سنت مغرب

پڑھانے کے مسجدوں میں پڑھائیں گے۔ وہ ان مردوں کے زمرہ میں شامل ہوں گے' فتفکروا' والسلام۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث جلد۔۴۶' شمارہ۔۱۰' ۱۱' ۱۲ مورخہ ۲۹ جمادی الاول و یکم و ۱۶ رجب سنہ ۱۳۸۵ھ

نماز عشاء سے پہلے چار رکعت سنت ثابت نہیں

حضرات حنفیہ میں یہ عام رواج ہے کہ وہ عشاء سے پہلے چار رکعت سنت پڑھتے ہیں اور کتب فقہ میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔ چنانچہ ہدایہ جلد۔۱' ص۔۱۲۶ میں لکھا ہے : والاربع قبل العشاء یعنی چار رکعت عشاء سے پہلے سنت ہیں۔ یہ متن قدوری کا ہے' شرح میں ہے : ولھذا کان مستحبا لعدم المواظبۃ۔ یعنی یہ چار رکعت پڑھنا مستحب ہے کہ ان پر نبی اکرم ﷺ نے مواظبت نہیں فرمائی۔

میں کہتا ہوں کہ جیسے کتب فقہ میں بہت سی باتیں بے ثبوت درج ہیں' ایسے ہی یہ مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے سنت اور مستحب ہونے کا ثبوت کسی حدیث صحیح میں نہیں پایا گیا ہے۔ کتب متداولہ میں سب مسنون اور مشروع نمازوں کا ذکر اور ثبوت ہے لیکن ان چار رکعتوں کا ذکر کہیں میری نظر سے نہیں گذرا۔ (مغرب اور عشاء کے مابین غیر معین نفلوں کا ثبوت ہے) ہاں مظاہر حق شرح مشکوۃ میں نواب قطب الدین مرحوم نے سعید بن منصور کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی ہے لیکن سنن سعید بن منصور طبقہ ثالثہ کی کتاب ہے جس کے متعلق عجالہ نافعہ وغیرہ میں یہ لکھا ہے کہ "اکثر آں حدیث معمول بہ نزدیک فقہاء (محدثین) شدہ اند بلکہ اجماع بخلاف آنہا منعقد گشتہ۔ (تاریخ الحدیث ص۔۱۳۵) یعنی تیسرے طبقہ کی کتابوں کی احادیث فقہاء ومحدثین کے نزدیک معمول بہا نہ ہوئیں بلکہ اجماع ان کے خلاف منعقد ہے۔ لیکن روایت سعید بن منصور کو ص۔۱۹ میں نقل کر کے حافظ ابن حجر نے اس پر جرح نہیں کی۔

علامہ ملا علی قاری اپنی کتاب موضوعات کبیر ص۔۸۷ میں رقمطراز ہیں : قلت من القواعد الکلیۃ ان نقل الاحادیث النبویۃ والمسائل الفقھیۃ والتفاسیر القرآنیہ لا یجوز الا من الکتب المتداولۃ لعدم الاعتماد علی غیرھا من وضع الزنادقہ والحاق

الملاحدة بخلاف کتب المحفوظة فان نسخها صحیحة متعددہ۔ یعنی "میں کہتا ہوں کہ قواعد کلیہ سے ایک قاعدہ یہ ہے کہ احادیث نبویہ اور مسائل فقہیہ اور تفاسیر قرآنیہ ان کتب شرعیہ سے لینے چاہئیں جو اہل علم میں مروج اور دست بدست چلی آرہی ہیں۔ ان کے سوا دیگر غیر مروج کتابوں سے احادیث اور مسائل وغیرہا نہ لینے چاہئیں کہ ان پر اعتماد نہیں رہا۔ کیونکہ کئی ایک احادیث اور مسائل اور قرآن کی تفسیریں زندیق اور ملحد لوگوں نے اختراع کرکے ان کتابوں میں ملا دی ہیں جن کا امتیاز عوام پر مشکل ہے۔ ان کے برعکس کتب محفوظہ کے متعدد نسخے ملکوں میں علمائے اسلام کے ہاتھوں اور درس گاہوں میں نہایت حفاظت کے ساتھ مروج ہیں جن پر پورا اعتماد حاصل ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ وہ کتب صحاح ستہ اور وما وافق بہا اور ان کی معتبر شروح مثل فتح الباری وغیرہ ہیں' ان سے مسائل اخذ کرنے چاہئیں۔ سو روایت چار سنت عشاء کی کتب متداولہ میں نابود ہے۔ اس لیے ان کے استحباب کا دعوئی بے سود ہے۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ کسی ضعیف روایت میں اس کا ذکر ہے تو پھر ان کا کبھی کبھی پڑھنا جواز کی حد میں آسکتا ہے لیکن ان کو سنت اور مستحب جان کر ان پر مداومت کرنا اور نہ پڑھنے والوں پر طعن کرنا بدعت کی طرف منجر ہو جائے گا۔

چنانچہ علامہ شاطبی کتاب الاعتصام ج۱' ص۳۴۸ میں امور مباحہ ومندوبہ پر یہ لکھتے ہیں :

لان اتخاذها سنة انما هو بان يواظب الناس عليها مظهرين بها وهذا شان السنة واذ اجرت مجرى السنن صارت من البدع بلا شک۔ "کیونکہ لوگ ان کو سنت اعتقاد کر لیتے ہیں' بایں طور کہ صاف ظاہر باہر ان پر ہمیشگی کرتے ہیں۔ یہ شان سنت کا ہے جب امور مباحہ اور مندوبہ سنن کی طرح جاری وساری ہو جائیں تو وہ بلاشبہ بدعات میں شمار ہو جاتے ہیں۔"

نیز ج۱' ص۳۴۶ میں یہ لکھا ہے : ثم یلزم من ذلک اعتقاد العوام فيها ومن لا علم عنده انها سنة وهذا فساد عظیم لان اعتقاد ما ليس بسنة والعمل بها على حد العمل بالسنة نحو من تبديل الشريعة۔ یعنی "جب امور مباحہ اور مندوبہ کو ہمیشہ لازم ٹھہرایا جائے تو عوام اور جن کو علم نہیں ہے' وہ ان کو سنت مؤکدہ اعتقاد کر لیتے ہیں اور یہ بڑے فساد کی بات ہے کیونکہ جو چیز سنت نہیں اس کو سنت اعتقاد کر کے سنت کی حد تک عمل کرنا شریعت محمدیہ کے تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ آنحضور ﷺ نے مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت مندوب ٹھہرائی ہیں اور حکم فرمایا ہے : صلوا قبل المغرب رکعتین صلوا قبل المغرب رکعتین صلوا قبل المغرب رکعتین لمن شاء خشیة ان یتخذھا الناس سنة۔ یعنی "مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھو، مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھو، مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھو جس کا جی چاہے یہ اس لیے فرمایا کہ لوگ اس کو سنت نہ سمجھ بیٹھیں۔" یہ حکم اس کے لیے ہے جو ثواب حاصل کرنا چاہے۔ یہ آخری جملہ اس لیے ارشاد فرمایا کہ لوگ اس نماز نفلی کو سنت مؤکدہ قرار نہ دے دیں۔

یہ نماز آنحضرت ﷺ سے فعلاً بھی ثابت ہے۔ چنانچہ قیام اللیل ص ۲۸ میں ہے : ان النبی صلی اللہ علیه وسلم صلّٰی رکعتین قبل المغرب۔ "کہ آنحضور ﷺ نے نماز مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھیں۔" اور صحابہ کا بھی اس پر تعامل رہا کہ وہ مغرب سے پہلے ان رکعتوں کو پڑھتے رہے۔

باوجود اس قدر قوی ثبوت ہونے کے مقلدین ان کو مغرب سے پہلے پڑھنا سخت برا جانتے ہیں۔ (قدوری میں ہے : ولا یتنفل قبل المغرب یعنی مغرب کی نماز سے پہلے کوئی نفل نہ پڑھے) اور عشاء سے پہلے چار رکعت جن کا کوئی ثبوت نہیں ہے، ان کو ہمیشہ پڑھتے ہیں اور ان کو سنت قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس عقیدہ سے یہ بدعت ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے آنحضور ﷺ نے دو رکعت قبل المغرب کی بابت فرمایا لمن شاء کہ جو چاہے پڑھے، یہ اس خوف سے فرمایا کہ لوگ اس کو سنت نہ ٹھہرالیں۔ جب یہ سنت نہیں تو جو شخص ان کو سنت قرار دے تو وہ شرع تبدیل کرتا ہے۔ پس اسی طرح عشاء سے پہلے چار رکعت پڑھنے والے اور ان کو سنت ٹھہرانے والے شرع محمدی کو تبدیل کرتے ہیں۔ صحابہ نے اس تغیر شرع کی وجہ سے کئی امور ترک کئے خواہ وہ مندوب تھے۔ مثلاً نماز میں سر ڈھانکنا مندوب اور پاؤں ڈھانکنا مسنون ہے۔ صحابہ نے جب دیکھا کہ نماز میں دو تین کپڑے پہننے ضروری سمجھ لیے گئے ہیں تو انہوں نے کپڑے اتار کر صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھی۔ جب ان سے پوچھا گیا تو بتلایا کہ یہ اس لیے کیا کہ جاہل لوگ سمجھ لیں کہ اس طرح ایک کپڑے میں بھی نماز درست ہے۔ دو یا تین کپڑوں کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح قربانی کرنا سنت ہے لیکن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے دیکھا

کہ لوگ اس کو فرض اختیار کر رہے ہیں تو انہوں نے باوجود وسعت کے قربانی نہ کی۔ سنن بیہقی میں ہے : عن ابی بکر وعمر انهما کانا لا یضحیان کراهیه ان یظن من راهما انها واجبة (مرعاۃ المفاتیح جلد۔۲' ص۔۳۵۰) یعنی "حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما قربانی نہ کرتے تھے' اس کراہت کی وجہ سے کہ لوگ اس کو فرض نہ ٹھہرالیں۔"

ان واقعات سے ظاہر ہوا کہ شرع کا ہر کام اپنی حد کے اندر رہنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ فرض چیز کو فرض جانو اور سنت کو سنت اور مستحب کو مستحب اور مباح کو مباح جانو۔ اب جو شخص فرض کو سنت اور سنت کو فرض اور مستحب کو سنت اور مباح کو مستحب قرار دے تو یہ تغییر شرع ہے جو بدعت اور دین میں الحاد ہے۔

پس نماز تراویح بیس رکعت کو سنت نبوی اعتقاد کر کے پڑھنا اور عشاء سے پہلے چار رکعت سنت جان کر ادا کرنا بدعت ہے کہ ان کا سنت نبوی ہونا ثابت نہیں ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ الاعتصام لاہور

جلد۔۱۹' شمارہ۔۱۸ مورخہ یکم دسمبر سنہ۔۱۹۶۷ء

ہر فرض نماز کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھنا کیسا ہے؟

حضرت مولانا! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

ایک مسئلہ پیش خدمت ہے' جواب تحریر فرما کر شکریہ کا موقعہ بخشیں۔

عام طور پر نمازی لوگ ظہر' مغرب اور عشاء کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے ہیں' خاص کر مقلدین احناف کا تو عام تعامل ہے کہ دو سنت موکدہ کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ جوان ہوں یا ضعیف' مرد ہوں یا عورت سب کا عمل ہے اور اس طرح پڑھنے کو شرعی حکم سمجھتے ہیں۔ اس کا ثبوت تعامل نبوی اور تعامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پایا جاتا ہے یا نہیں؟

(السائل عبداللہ عفی عنہ)

الجواب : تعامل نبوی اور تعامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس طرح دو نفل بیٹھ کر پڑھنے کا ثبوت نہیں پایا گیا۔ عبادات میں یہ اصول ہے کہ جس کا ثبوت نہ پایا جائے اور اس کو حکم شرعی سمجھ کر کیا جائے تو وہ بدعت ہوتا ہے اور وہ شر الامور میں داخل اور ضلالت میں شمار ہے۔

مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی کو حنفیہ بڑے جید عالم اور محقق تسلیم کرتے ہیں' وہ حنفی ہو کر ان کو جائز تو تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ اقرار کرتے ہیں کہ بعد دو رکعت سنت ظہر' مغرب اور عشاء آنحضرت ﷺ کا دو رکعت نفل پڑھنا اب تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ جب اس کا ثبوت عہد نبوی میں موجود نہیں تو یہ بدعت ہے۔

چنانچہ علامہ ابن حزم مجدد اندلس اپنی بے نظیر کتاب محلّٰی میں فرماتے ہیں : فكل ما احدث بعده عليه السلام مما لم يكن في عهده وعهد الخلفاء الراشدين فبدعة وضلالة۔ یعنی "ہر وہ چیز جو عہد نبوی اور عہد خلفاء راشدین میں معمول بہ نہ ہوئی اور وہ بعد میں پیدا ہوئی تو وہ بدعت اور گمراہی ہے۔"

شرح مقاصد میں ہے : ان البدعة المذمومة هو المحدث في الدين من غير ان يكون في عهد الصحابة والتابعين ولا دل عليه الدليل الشرعي۔ یعنی "بدعت یہ وہ ہے جو دین میں نئی پیدا کی گئی ہو اور اس پر کوئی شرعی دلیل ناطق نہ ہو اور اس کا وجود عہد صحابہ کرام اور تابعین میں نہ پایا گیا ہو تو وہ بدعت ہے۔"

مثلاً مصافحہ کرنا سنت اور ثواب ہے لیکن نماز فجر اور عصر کے بعد اس کا عمل ٹھہرائے اور ہمیشہ اس طرح کرے تو یہ بدعت ہے۔ حدیث میں ہے کہ "ایک شخص نے چھینک ماری تو کہا الحمد للہ السلام علیکم تو سالم صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا علیک وعلی اُمک "کہ ہم تو یہ سلام قبول نہیں کرتے تجھ پر اور تیری ماں پر ہو۔" وہ شخص خفا ہوا' سالم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بھائی خفا کیوں ہوتے ہو' جناب نبی کریم ﷺ کے سامنے بھی اس طرح واقع ہوا تھا۔

شرح مجمع البحرین کتاب حنفیہ کی ہے' اس کے حوالہ سے "راہ سنت" کے ص۔ ۲۳۳ پر لکھا ہے کہ "ایک شخص نے عید کے دن نماز عید سے پہلے نفل نماز پڑھنی چاہی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منع کیا۔ اس نے کہا اے امیرالمومنین! میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پر سزا نہ دے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا' میں بالیقین جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب نہ دے گا جب تک کہ اس فعل کو رسول اللہ ﷺ نے کیا نہ ہو یا اس کی ترغیب نہ دی ہو' پس تیری یہ نماز فعل عبث ہوگی اور فعل عبث حرام ہے اور شاید کہ تجھے اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مخالفت کی وجہ سے سزا دے۔" (کذا فی الجنة ص۔ ۱۴۰ ونظم البیان ص۔ ۷۳)

اسی طرح نماز میں قرآت قرآن مجید مشروع ہے لیکن عہد حاضر کے قاریوں نے جو علم

تجوید ایجاد کیا ہے اور اس کی رُو سے قرآت کے وقت نہایت تکلف سے مخارج سے حروف نکالتے ہیں' یہ بدعت ہے۔

چنانچہ کتاب "السنن والمبتدعات المتعلقة بالاذكار والصلوات" کے ص۔۳۴ میں ہے : والتشديد في مخارج الحروف في القرآت وترديد الكلمة وسوسة مذمومة وخروج عن قانون الصلوٰة ومفسدلها۔ یعنی "قرآت کے وقت حروف کو مخرجوں سے نکالنے پر جو سختی کی جاتی ہے کہ کلمہ کو لوٹا لوٹا کر پڑھا جاتا ہے تاکہ خوب ادا ہو' یہ وسوسہ مذمومہ ہے' جو نماز کے قانون سے خارج کر کے اس کو فاسد کر دیتا ہے۔"

عہد نبوی میں عرب و عجم میں قرآن سادگی سے پڑھا جاتا تھا جیسا کہ عام طور پر ہر اہل زبان اپنی زبان میں فطری اور طبعی طور اور انداز سے بولتا اور کلام کرتا ہے۔ ترکی' فارسی' اُردو' پنجابی اور ہندی وغیرہ کو ہر شخص صاف سیدھی سادھی زبان سے ادا کرتا ہے۔ کلام کرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتا' متکلم اور سامع سب اس کلام کو سمجھتے ہیں حلانکہ کئی حروف متبائن الصوت ہوتے ہیں اور کئی مشتبہ الصوت' لیکن سب سمجھتے ہیں' بس یہی حال عربی زبان کا ہے کہ اس میں بھی مخارج سے حروف تکلف سے نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس کو اہل اسلام پر لازم کر دیا گیا تو عوام تلاوت ترک کرنے کے علاوہ نماز میں بھی قرآت نہ کریں گے۔ اسی طرح کئی بدعتیں رائج ہوئی ہیں' ان میں سے بیٹھ کر دو دو نفل نماز پڑھنا بھی ہے کہ یہ بدعت ہے' کھڑے ہو کر پڑھنا چاہیے۔ ہاں اگر علی الاطلاق نفلی نماز بیٹھ کر پڑھی جائے تو اس کا آدھا ثواب ملے گا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لیکن سنتوں کے بعد خاص طور پر جو دو دو نفل بیٹھ کر لوگوں نے اختیار کئے ہیں' یہ بدعت ہیں کہ اس صورت مخصوصہ کا ثبوت شرع میں نہیں ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے : اياكم ومحدثات الامور فان كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة "کہ دین میں نئے کاموں کے کرنے سے بچو کہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" هذا ما عندي والله اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث

جلد۔۲۶' شمارہ۔۲۸' مورخہ ۱۳ دسمبر سنہ۔۷۴ء

ابن مسعود اور حنفیہ کا تقابل

مسائل نماز

قدوری ھدایہ وغیرہ کتب فقہ حنفیہ میں یہ لکھا ہے کہ نماز میں چھ فرض ہیں

1 تکبیر تحریمہ 2 قیام 3 مطلق قرآۃ 4 رکوع

5 سجود 6 قعدہ اخیرہ بقدر تشہد

یہ چھ فرض شمار کر کے پھر یہ لکھا ہے "وماسوی ذالك فهو سنة" یعنی ان چھ فرضوں کے سوا باقی سب اقوال وافعال نماز میں سنت ہیں مثلاً اگر کسی حنفی نے نماز کے چھ فرض پورے کر لئے تو اس کی نماز پوری ہوگئی لیکن ابن مسعودؓ حنفیہ کے خلاف ہیں وہ فرماتے ہیں "لا صلوٰة الا بتشهد" (طحاوی صفحہ۱۶۲) یعنی تشہد پڑھنے کے بغیر نماز صحیح نہ ہوگی۔ پس حنفیہ کا یہ کہنا کہ ہمارے مذہب کی بنیاد ابن مسعودؓ کے مذہب پر ہے بالکل غلط ہے۔

نماز جمعہ کے وقت میں اختلاف: ہدایہ جلد اول صفحہ ۱۶۸ میں ہے "ومن شرائطها الوقت فتصح فی وقت الظهر ولا تصح بعده" یعنی جمعہ کی شرائط میں سے ایک شرط وقت کی ہے کہ جمعہ ظہر کے وقت میں پڑھنا صحیح ہے اس کے بعد صحیح نہ ہوگا۔ پھر اس کے ثبوت میں ایک حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب سورج ڈھل جائے اور جھک جائے تو لوگوں کو جمعہ پڑھاوے، یہ حدیث جعلی ہے۔

جناب رئیس الناقدین حافظ ابن حجرؒ اس روایت کی تغلیط کرتے ہوئے اپنی کتاب درایہ تخریج ہدایہ میں فرماتے ہیں "لم اجده" کہ میں نے اس روایت کا وجود کتب حدیث میں نہیں پایا۔ اسی وجہ سے محدّثین نے یہ فرمایا ہے کہ حنفیہ کی کتب فقہ ہدایہ شرح وقایہ نہایہ وغیرہ کی حدیثوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ دراصل حنفی مذہب کے اکثر مسائل احادیث نبویہ کے خلاف ہوتے ہیں پھر یہ لوگ موہوم یا ضعیف روایتوں کا سہارا لے کر اپنے مسائل مخصوصہ کو ثابت کیا کرتے ہیں اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تب بھی جمعہ کیوقت کے اثبات کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ حنفیہ کا اصول یہ ہے شرط الفرض لایکون الافرضا کہ فرض کی شرط بھی فرض ہوتی ہے اور فرض بغیر قطعی دلیل کے ثابت نہیں ہوتا۔ روایت مذکورہ خبر واحد ہے جو ظنی ہے اور ظنی دلیل سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی۔

نورالانوار وغیرہ کتب اصول فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے کما لا یخفیٰ علی اہل العلم دیگر احادیث سے یہ ثابت ہے کہ جمعہ کا وقت ممتد ہے۔ ظہر کی نماز کی طرح زوال شمس سے مخصوص نہیں لیکن یہاں اس مسئلہ پر مفصل بحث مقصود نہیں ہے کہ مسئلہ اختلافی ہے۔ یہاں ابن مسعودؓ اور حنفیہ کا مقابلہ دکھانا مقصود ہے۔ اب حضرت ابن مسعودؓ کا مسلک ملاحظہ فرمایئے۔ تعلیق مغنی شرح دار قطنی صفحہ ۱۷ میں ہے۔ عبداللہ بن سلمہ کا بیان ہے۔ کہ ہم کو عبداللہ بن مسعودؓ نے سویرے چاشت کے وقت جمعہ کی نماز پڑھا دی اور یہ فرمایا کہ میں نے تمہارے پر گرمی کے وقت کا اندیشہ کیا کہ زوال کے وقت گرمی اور تپش بڑھ جاتی ہے نیز یہ لکھا ہے "کذالک روی عن ابن مسعود و جابر و سعید و معاویۃ انہم صلوھا قبل الزوال" یعنی اسی طرح ابن مسعود، جابر، سعید، معاویہ صحابہ کرامؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے جمعہ قبل زوال پڑھایا تھا۔ امام احمد وغیرہ بعض ائمہ کا یہ مسلک ہے نماز جمعہ قبل زوال عید کے وقت پڑھنی جائز ہے۔ نماز جمعہ کا وقت ممتد ہے کہ نماز عید کے وقت سے لے کر عصر تک نماز جمعہ کا وقت ہے۔ جس وقت چاہے پڑھ لے۔ حدیث کی کتاب منتقی الاخبار میں یوں باب منعقد کیا گیا ہے "باب ماجاء فی الجمعۃ قبل الزوال و بعدہ" یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ جمعہ پڑھنا قبل زوال اور بعد الزوال جائز ہے۔ پھر احادیث دونوں قسم کی ذکر کر کے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے۔ علامہ شوکانی نے بھی نیل الاوطار میں اس مسلک کو تسلیم کیا ہے۔ الروضۃ الندیۃ بشرح درر بھیۃ" میں علامہ شوکانی فرماتے ہیں "وقد ذھب الی ذالک احمد بن حنبل و ھو الحق" یعنی جمعہ قبل زوال کا مذہب امام احمدؒ کا ہے اور یہی مذہب حق ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ حنفیہ نے حضرت ابن مسعودؓ کے خلاف کیا ہے۔ ان کے فضائل اور مناقب بیان کر کے پھر ان سے بے وفائی کی ہے کہ ابن مسعود کے مقابلہ میں آ کر اپنے امام ابوحنیفہ کا ساتھ دیا ہے اور ان کی تقلید پر جامد رہے اور ابن مسعودؓ کو چھوڑ گئے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ مقلدین کا اصلی نصب العین اپنے امام ابوحنیفہ کی تقلید جامد ہے۔ ان کے قول کے موافق اگر کوئی روایت آ جائے اگرچہ ضعیف بلکہ موضوع ہو تب بھی اس راوی کی بڑی تعریف اور مدح سرائی کریں گے اور حدیث کو بڑی اہمیت دیں گے اور اگر قول صحابی امام کی رائے کے مطابق مل گیا تو اس صحابی کے بڑے مناقب

اور فضائل بیان کریں گے اور جو حدیث نبوی امام کے قول کے خلاف آجائے تو کئی حیلے بہانے بنا کر اس کی تکذیب کریں گے یعنی قرآن کے خلاف کہیں گے کبھی منسوخ کہیں گے وغیرہ۔اور اگر صحابی کا قول مخالف امام کے آگیا تو اس صحابی میں کئی نقائص بیان کریں گے۔

کشف الغمہ صفحہ ۱۴۶ میں امام شعرانی نے ابن مسعود وغیرہ صحابہ سے قبل زوال جمعہ پڑھنا نقل کیا ہے اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ خلفاء راشدین ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ نے بھی قبل زوال جمعہ پڑھا ہے۔عبداللہ بن سلمی لکھتے ہیں "فمارائت احداعاب ذالك ولاانکره" یعنی ان خلفاء کے قبل زوال جمعہ پڑھنے پر کسی نے کوئی اعتراض اور انکار نہیں کیا۔امام شعرانی نے یہ بھی روایت نقل کی ہے "فکان ﷺ یصلی الجمعة فی اکثراوقاته بعدالزوال وفی بعض الوقت قبل الزوال" یعنی رسول اللہ ﷺ نے اکثر جمعہ بعد الزوال پڑھا ہے اور کبھی کبھی قبل زوال بھی پڑھا ہے۔اس سے ظاہر ہوا کہ جمعہ قبل زوال بھی جائز ہے۔اگر آنحضرت ﷺ نے قبل زوال جمعہ کبھی نہ پڑھا ہوتا تو جلیل القدر صحابہ کرامؓ قبل زوال کبھی نہ پڑھتے خصوصاً ابن مسعود جو مدامت صحبت رکھتے تھے۔

مسئلہ اقامت جمعہ فی القریٰ

کشف الغمہ جلد ا صفحہ ۱۴۱ میں ہے "کان ابن مسعود یقول سمعت رسول اللہ ﷺ یقول الجمعة واجبة علی کل قریه وان لم یکن فیها الا اربعة" یعنی ابن مسعود نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنا ہے آپ یہ فرماتے تھے کہ جمعہ ہر بستی والوں پر واجب ہے اگر چہ اس میں چار ہی آدمی رہتے ہوں۔پس حنفیہ جو جمعہ وعید کیلئے جامع کی شرط مقرر کرتے ہیں۔یہ قرآن وحدیث ومذہب ابن مسعود کے سراسر خلاف ہے۔امام شعرانی کشف الغمہ کے اسی صفحہ پر یہ نقل کرتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ سفیان ثوریؒ کا مذہب یہ تھا کہ جمعہ چار شخصوں کے ساتھ منعقد ہو جاے گا جبکہ ایک امام ان میں جمعہ پڑھانے والا ہو اور امام ابو یوسف' امام محمد امام لیث بن سعد نے نقل کیا ہے کہ جمعہ دو شخصوں کے ساتھ بھی صحیح ہے جبکہ دوسرا امام جمعہ پڑھانے والا ہو اور صفحہ ۱۴۴ میں یہ ہے ابن عباسؓ سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنے باغ میں جمعہ اکیلا ہی پڑھ لے تو کیا حکم ہے۔انہوں نے جواب دیا کہ کوئی حرج نہیں جبکہ اس کے بغیر کسی جگہ جمعہ شعار قائم

ہو۔ یہ سب اقوال لکھ کر امام شعرانی یہ فیصلہ لکھتے ہیں کہ جو شخص ادلہ شریعہ کے پیش نظر یہ غور کرے گا کہ جمعہ ایسی جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے خواہ شہر ہو یا قصبہ یا گاؤں جس میں جمعہ کا شعار اسلام ہونا ظاہر ہو جائے۔ اس میں عدد کہ چالیس یا پچاس یا زیادہ یا کم میں نہیں صرف شعار جمعہ کا ظاہر ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں مسجدیں ہیں۔ اذان و جماعت کا انتظام قائم ہو۔ جمعہ' عید کا خطبہ پڑھنے والا امام ہے وہاں شعار اسلام قائم رہے تو جمعہ جائز ہے کیونکہ اذان شعار اسلام ہے۔ جماعت شعار اسلام ہے۔ مسجد شعار اسلام ہے پس وہاں جمعہ کا ہونا بھی شعار اسلام ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاسلام لاہور

جلد ۲ شمارہ ۴۹ مورخہ ۴ فروری ۱۹۷۷ء۔

اہل دیہات پر جمعہ

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ نماز جمعہ دیہات والوں پر فرض ہے یانہیں؟ مثلاً ایک بستی کی آبادی چھ سوافراد پر مشتمل ۔اور دو پرائمری سکول بھی ہیں اور شہر سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہوں ۔اس میں نماز جمعہ پڑھنا جائز ہے یانہیں نیز نماز جمعہ فرض ہے یا سنت یا واجب؟ بعض لوگ کہتے ہیں نماز جمعہ فرض تو ہے لیکن وذرواالبیع کے تحت شہروں میں ہی فرض ہے۔مدلل ومفصل جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

دستخط بحروف اردو

سائل یار محمد موضع اٹاری اجیت سنگھ

ڈاکخانہ کوٹ رادھا کشن تحصیل قصور لاہور

اس کاغذ پر اس کے تحت سوال مذکورہ کا کوئی جواب درج نہیں۔

دیگر نقل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ ......کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ قریہ صغیرہ میں عندالاحناف جمعہ جائز نہیں ہے۔لیکن جس قریہ صغیرہ میں جمعہ بیس سال سے جاری ہے۔کیا قریہ مذکورہ میں جمعہ جاری رکھا جائے یا بند کردیا جائے؟(جواب) مکروہ تحریمی ہے (شامی) لہٰذا بند کیا جائے نہ کرسکیں تو خود چھوڑ دیں۔

گاؤں مذکورہ میں غیر مقلد بھی ہیں وہ کہتے ہیں کہ حنفی جمعہ نہ پڑھیں گے تو ہم اس مسجد میں جمعہ جاری رکھیں گے۔

(جواب) وہ جانیں۔آیات کے اشارات وحدیث سے شہر ہونا شرط ہے۔

جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

دستخط بحروف اردو

۲۳ اپریل ۱۹۷۰ء محمد صدیق ولد فرزند علی۔اٹاری اجیت سنگھ تحصیل قصور ضلع لاہور۔

(جواب مفتی حنفی صاحب)

(دیگر جواب) اب کہ لفظ وذروا البیع اور واذار أو تجارۃ اولھوا کے اشارات حدیث لا جمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع سوائے شہر کے کہیں جائز نہیں۔

مکروہ تحریمی ہے۔اس پر بزرگوں کے رسالے طبع شدہ ہیں۔حضرت گنگوہی کا اوثق العصر۔اس پر ان کے اعتراض‘جواب حضرت شیخ الھند نے احسن القریٰ میں ہر ایک کا دیا ہے۔حضرت تھانوی کا القول البدیع مفتی محمد شفیع کا الا عجوبہ ہے۔بڑا گاؤں شہر کے حکم میں ہے اس لئے جائز ہے۔

دستخط بحروف اردو
جمیل احمد تھانوی مفتی جامع اشرفیہ مسلم
ٹاؤن ۷ شوال ۸۹ھ لاہور۔

الجواب بعون الوھاب

الحمدللہ رب العالمین امابعدفاقول و باللہ التوفیق۔واضح ہو کہ سوال میں جمعہ کا واقعہ مذکورہ اور اس پر مقلدین کا فتویٰ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کہ مسلمانوں کی کثیر آبادی کو جمعہ جیسی نعمت عظمیٰ سے محروم کیا جارہا ہے۔یہ لوگ پہلی امتوں کی مثل ہیں جن کو یہ نعمت عظمیٰ دی گئی۔تو انہوں نے اس کی قدر نہ کی۔تب اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت ان سے چھین لی تھی۔چنانچہ مسلم شریف میں یہ حدیث ہے کہ جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہم سے پہلے جو یہود و نصاریٰ تھے ان سے جمعہ چھین لیا اللہ تعالیٰ نے یہود کو ہفتہ وار اور نصاریٰ کو اتوار کا دن دے دیا۔فجاء اللہ بنافھدانااللہ لیوم الجمعة پس لایا اللہ تعالیٰ ہمارے لئے یہ نعمت تو ہم مسلمانوں کیلئے اس دن کی طرف رہنمائی فرمائی۔اس حدیث میں نا ضمیر جمع سے سب امت محمدیہ کو آپ نے شامل کرلیا۔تو یہ نعمت جمعہ کی سب مسلمانوں کیلئے ہے خواہ وہ شہروں میں سکونت رکھتے ہوں یا دیہات میں۔طبرانی میں ایک حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول خدا ﷺ پر جمعہ کا دن پیش کیا گیا تو آپ نے جبرائیل سے دریافت کیا کہ اے جبرائیل یہ کیا ہے تو انہوں نے یہ ارشاد فرمایا ھذہ الجمعة یعرض علیك ربك لتکون لك عیدا و لقومك من بعدك یعنی یہ جمعہ کا دن ہے جس کو آپ کا پروردگار آپ پر اس لئے پیش کرتا ہے کہ یہ آپ کیلئے اور آپ کی امت کیلئے عید اور خوشی کا دن بن جائے۔

ابن ماجہ میں یوں حدیث وارد ہے کہ جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہی عزت اور بزرگی والا ہے اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ سے بھی زیادہ

عظمت رکھتا ہے۔اور دیگر حدیث میں اس کو عید المسلمین فرمایا گیا ہے۔اس لئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جملہ اہل ایمان کو یہ خطاب فرمایا ہے "یاایھاالذین امنو اذانودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکراللہ وذروا البیع الایۃ" یعنی اے ایمان والو! جب دن جمعہ کی نماز کیلئے اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر (خطبہ) کی طرف چل دو۔اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔اس آیت میں ہر مقام کے مومنوں کیلئے حکم وارد ہوا ہے کہ وہ جمعہ کیلئے حاضر ہوں۔چنانچہ ملا علی قاری حنفی مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں "دلیل الافتراض من کلام اللہ تعالیٰ علی العموم فی الامکنۃ" یعنی قرآن کی یہ آیت عام طور پر تمام اہل ایمان پر جو کسی بھی جگہ رہتے ہوں ان پر جمعہ کی نماز فرض ہونے کی دلیل ہے۔اس آیت میں لفظ وذروا البیع' البیع سے شہر کا شرط ہونا ثابت کرنا بڑی جہالت ہے۔کیونکہ اس طرح تو یہ لازم آئے گا کہ جمعہ کی نماز صرف ان لوگوں پر فرض ہے جو جمعہ کے دن بائع اور مشتری ہوں اور آپس میں بیع (خرید و فروخت) کر رہے ہوں۔علماء 'فقراء' صوفیاء' طلباء اور دیگر کسب داروں اور زمینداروں وغیرہ لوگوں پر فرض نہ ہونا چاہیئے۔ولم یقل بہ احد لفظ بیع مورد کے لحاظ سے لیا گیا ہے اصل مقصود محض بیع نہیں۔بلکہ ہر کام جو نماز جمعہ سے غافل کر دے' مراد ہے۔تفسیر فتح البیان میں ہے "المراد بالآیۃ ترک مایذھل عن ذکراللہ من مشاغل الدنیا" یعنی آیت میں مراد چھوڑنا تمام کاموں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے غافل کر دے۔لفظ بیع شان نزول کی وجہ سے ہے کہ جناب سید الانبیاء جمعہ کے دن خطبہ فرما رہے تھے کہ اس وقت ایک قافلہ شہر میں آیا تو مسلمان اس قافلہ کی طرف چلے گئے تھے۔قرآن میں ہے "یاایھاالذین امنوا لاتاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ" یعنی اے ایمان والو تم مت کھاؤ سود دوگنا سہ گنا۔

فتح القدیر جلد اول صفحہ ۳۲۸ میں علامہ شوکانی رئیس المحققین رقم طراز ہیں "لیس التقییدبالنھی لماھومعلوم من تحریم الربوٰعلی کل حال ولکنہ جیئی بہ باعتبار ماکانوا علیہ من العادۃ التی یعتادو تھا" یعنی اس آیت میں دونا تکنا بیاج کی قید سود کے حرام ہونے کیلئے مقصود نہیں ہے۔کیونکہ بیاج تو ہر حال میں حرام ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر ہو۔یہ لفظ تو اس وقت کے عام لوگوں کی عادت کی بنا پر لایا گیا ہے کہ وہ بیاج کا حساب کر کے اس کو دوگنا کیا کرتے تھے۔ایسا ہی قرآن میں ہے "لاتقتلوا اولادکم

من املاق " کہ تنگدستی اور افلاس کے ڈر سے تم اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ اس میں لفظ املاق بطور قید شرط نہیں آیا۔ بلکہ اس وقت کے لوگوں کی عادت کی رو سے آیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح بیع کا لفظ بھی عادت کے لحاظ سے آیا ہے۔ بطور قید اور شرط نہیں آیا۔ کہ جہاں بیع ہو وہاں جمعہ فرض ہے بلکہ تمام شواغل دنیا اور معاملات و مکاسب کا ترک ہونا مقصود ہے جو نماز سے غافل کرے۔ چنانچہ تفسیر مدارک میں علامہ نسفی فرماتے ہیں "الامر تبرك مایذھل عن ذکراللہ من شواغل الدنیا" یعنی مراد اس حکم سے ہے کہ تمام مشاغل اور معاملات دنیا کے جو ذکر الٰہی سے غافل کریں ترک کر دیئے جائیں۔ جب لفظ بیع مقصود نہ رہا تو یہ قید ایسے لوگوں کیلئے حجت نہ رہی جو مشتری اور بائع ہیں یا ایسے مقامات کیلئے جہاں بیع ہوتی ہے۔ قرآن میں ایک مقام پر یوں ارشاد ہے "رجال لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکراللہ و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ الایۃ" یعنی ایسے لوگ نمازوں میں اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں جن کو اللہ کے ذکر کرنے سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے بیع اور تجارت غافل نہیں کر سکتی۔ قرآن مکہ و مدینہ میں نازل ہوا اور وہی لوگ ان احکام کے مخاطب تھے تو ان کے حال کے مطابق قرآنی الفاظ وارد ہوئے۔ مگر مراد عام ہے اگر خطاب خاص الفاظ جو ان شہریوں کے حق میں موقع محل کی مناسبت سے استعمال ہوئے۔ شرط قرار دیئے جائیں تو تمام قرآن کے احکام شہریوں کیلئے مخصوص ہو جائیں گے۔ مثلاً آیت مذکورہ سورہ میں ذکر الٰہی اور نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ لفظ بیع اور تجارت کا ذکر آیا ہے۔ تو پھر چاہیئے شہر والے ہی جو تاجر اور دوکاندار لوگ ہیں ذکر الٰہی کریں۔ اور نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ دیہات والوں کو سب کچھ معاف ہے سو یہ بات ایسے لاعلم لوگ ہی پسند کر سکتے ہیں جو ایسی نعمتوں سے محروم رہنا اور لوگوں کو محروم کرنا چاہتے ہیں۔ پس جو لوگ دیہات میں سے جمعہ کو روکتے ہیں وہ اصل میں ایمان اور امت محمدیہ سے خارج ہونا چاہتے ہیں۔ ملا علی قاری نے یہ علمی اور اصولی بات لکھی ہے کہ آیت میں فرضیت تمام امکنہ کے لوگوں کیلئے عام ہے۔ جس سے جمعہ کا فرض عین ہونا ثابت ہے۔ پس جمعہ سب مسلمان شہریوں اور دیہاتیوں پر فرض ہے۔ جس کا منکر کافر اور تارک منافق ہے۔ ہاں معذور لوگوں کو خود شارع نے ہی مستثنیٰ کر دیا ہے کہ غلام' عورت' لڑکا' بیمار' مسافر نہ پڑھیں۔ تو ان پر کوئی جرم نہیں۔ مگر پڑھ لیں گے تو جمعہ سے نماز کا فرض ادا ہو جائے

گا۔اوراجر کثیر حاصل ہوگا۔منع کسی کے لئے بھی نہیں ہے۔دیہات میں جمعہ پڑھنے کو منع تحریمی کہنا سراسر باطل اورگھر کی شرع ہے۔امام الدنیا فی الحدیث امام بخاریؒ نے اپنی جامع صحیح بخاری میں ایک باب یوں منعقد کیا ہے"باب الجمعة فی القریٰ والمدن" یعنی یہ باب ہے دیہات اورشہروں میں جمعہ پڑھنے کے بیان میں۔پھراس کے ثبوت میں ابن عباس کی روایت پیش فرمائی ہے کہ مسجد کے بعد پہلا جمعہ (عہد نبویؐ میں) جواثی میں قائم ہوا۔جو بحرین کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے۔امام بخاری جن کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں ایک شہرہ آفاق محدث اور مجتہد تھے۔جو کتاب اور سنت میں فقاہت تامہ رکھتے تھے۔جن کے برابر علم شریعت کا۔مقلدین کے فقہاء اولین اور آخرین کو بھی نصیب نہ ہوا۔وہ نماز جمعہ دیہات میں ادا کرنا فرض ثابت کرتے ہیں۔اسی طرح امام ابوداؤد جو مشہور امام اور محدث تھے انہوں نے سنن ابوداؤد میں یوں باب منعقد کیا ہے"باب الجمعة فی القریٰ"یعنی یہ باب اس حکم کے بیان میں ہے کہ جمعہ بستیوں میں ادا کرنا بھی صحیح ہے۔پھراس کے ثبوت میں حضرت ابن عباس کی حدیث پیش کی ہے کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ عہد نبویؐ میں جواثی میں قائم ہوا جو بحرین کے دیہاتوں میں ایک گاؤں تھا۔اس سے ثابت ہوا کہ آنحضرت کے زمانہ میں مبارک گاؤں میں جمعہ پڑھا گیا۔پس مصر جامع کی شرط باطل ہے۔اورلفظ بیع سے شہر مراد لینا سراسر حماقت ہے۔فتح الباری شرح صحیح بخاری اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے جو بحرین کے علاقہ میں تھے۔حضرت عمر فاروقؓ خلیفة المسلمین کی طرف ایک خط لکھا کہ ہم یہاں پر جمعہ پڑھیں یا نہیں تو حضرت فاروق اعظم نے یہ عام حکم صادر فرمایا جمعوا حیث ما کنتم کہ تم جس جگہ بھی مقیم ہو وہاں ہی جمعہ پڑھو۔اس حکم میں لفظ حیث ظرف مکان ہے۔جو کہ تمام اماکن دیہات اور شہروں کو شامل ہے۔پس جمعہ سب باشندوں پر فرض ہے۔اور حضرت فاروق کا یہ شاہانہ حکم قرآن کے عموم اور اطلاق کے صاف مطابق ہے۔اور یہ حکم قول علیؓ کا واضح ہے جس سے شہر کی شرط ثابت کرتے ہیں۔حضرت فاروقؓ کی خلافت اوران کا درجہ خلافت علیؓ اوران کے درجہ پر فائق ہے۔لہٰذا ان کے حکم کو ترجیح اور تقدم حاصل ہے۔فتح الباری میں مسند عبدالرزاق میں حضرت ابن عمر سے منقول ہے کہ"انه کان یری اھل المیاہ بین مکة والمدینة یجمعون فلایعیب علیھم"یعنی حضرت عبداللہ ابن عمرؓ مکہ

اور مدینہ کے درمیان پانیوں کے مقامات پر رہنے والے لوگوں کو جمعہ ادا کرتے ہوئے دیکھتے تو ان پر کوئی عیب نہ لگاتے تھے۔ اس عبارت میں ''کان یریٰ'' صیغہ ماضی استمراری کا ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ حضرت عبداللہؓ اکثر ان کو جمعہ پڑھتے ہوئے دیکھتے تو منع نہ کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا جمعہ صحیح تھا۔ اگر شہر کے بغیر جمعہ صحیح نہ ہوتا تو حضرت ابن عمر خود منع کر دیتے۔ کیونکہ نہی عن المنکر کرنا فرض ہے۔ حدیث میں ہے ''من رای منکم منکرا فلیغیره بیده وان لم یستطع فبلسانه'' یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کوئی برا کام ہوتا دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے دور کرے اور اگر ہاتھ سے دفع کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو پھر زبان سے اس ناجائز کو روکے۔ پس اگر شہر کے علاوہ دیہات بستیوں ڈیروں میں جمعہ ادا کرنا حرام یا مکروہ ہوتا جیسے بعض نادان مقلد یاوہ گوئی کرتے ہیں تو حضرت ابن عمر بھی خاموش نہ رہتے۔ ضرور ان لوگوں کو منع کر دیتے۔ علاوہ ازیں فتح الباری اور بیہقی میں ولید بن سلم سے منقول ہے کہ حضرت لیث بن سعد جو کہ تبع تابعینؒ میں بہت عظیم الشان عالم ہیں۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ جمعہ کا کیا حکم ہے تو انہوں نے فرمایا ''کل مدینة او قریة فیها جماعة امروا بالجمعة فان اهل مصر و سواحلها کانوا یجمعون الجمعة'' یعنی ہر شہر اور گاؤں کے مسلمانوں کو جمعہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ عہد فاروقی اور عثمانؓ میں شہر اور ارد گرد کے دیہات میں صحابہ کرام میں سے بھی آدمی ہوا کرتے تھے (کسی نے انکار نہ کیا) اس سے بھی ظاہر ہوا کہ دیہات میں جمعہ کو مکروہ تحریمی بتانا سراسر باطل ہے۔ اس کے علاوہ بخاری شریف میں ہے کہ یونس بیان کرتے ہیں کہ زریق بن حکم نے جو تبع تابعین سے ہیں، ابن شہاب مشہور تابعی کی طرف لکھا اور میں اس وقت وادی قریٰ میں ابن شہاب کے پاس تھا کہ کیا میں یہاں جمعہ پڑھ سکتا ہوں اور زریق اس وقت زمین پر عامل تھا اور اس میں کاروبار کرتا تھا اور وہاں پر حبشیوں کی ایک جماعت رہتی تھی تو ابن عباس نے ان کو جمعہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ چھوٹی بستی میں بھی جہاں مختصر سی جماعت ہو جمعہ ادا کرنا صحیح ہے اور مکروہ ہونے کا مذہب باطل ہے۔ امام بخاری نے اس تعامل سلف سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ جمعہ دیہات میں درست ہے۔ کبیری شرح منیة المصلی فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے صفحہ ۵۱۲ میں یہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ربذہ ایک ایسی بستی تھی جہاں کی آبادی میں تقریباً بارہ

مرد رہتے تھے وہاں حضرت عثمان کی طرف سے ایک حبشی غلام مجاشع تابعی مقرر تھے تمام دنیوی اموراور جمعہ جماعت وغیرہ دینی اموران کے سپرد تھے۔نماز جمعہ ربذہ میں پڑھی جاتی تھی یہ بستی مدینہ کے قریب تین میل پر واقع تھی۔مجمع البحرین میں ہے کہ مدینہ سے تین میل پر یہ بستی تھی جوکہ شروع زمانہ اسلام میں آباد تھی۔اب بالکل مٹ گئی ہے اس میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی قبر ہے۔

امام ابن حزم محلیٰ میں فرماتے ہیں کہ صحیح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوذر غفاری صحابی اور دیگر دس صحابہ اس سیاہ فام غلام کے پیچھے نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے اس سے شہریت کی شرط باطل ہوئی۔اور مشکوۃ میں یہ روایت ہے جس کو دارقطنی نے ذکر کیا ہے کہ آنجنابؐ نے فرمایا"من کان یومن باللہ والیوم الاٰخرفعلیہ الجمعۃ یوم الجمعۃ الامریض اومسافراوامرء اۃ اوصبی اومملوک فمن استغنیٰ بلھو اوتجارۃ استغنی اللہ عنہ واللہ غنی حمید"یعنی جوشخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس پر نماز جمعہ فرض ہے مگر بیمار' مسافر' غلام' عورت' بچہ کے ذمہ فرض نہیں۔پس جوشخص کھیل تماشااور تجارت کی وجہ سے جمعہ پڑھنے میں لاپرواہی کرے گا تو اللہ بے نیاز ومحمود ہے۔وہ اس سے بے پروائی کرے گا۔

نیز دارقطنی میں حدیث ہے کہ جناب رسول اللہﷺ نے فرمایا"الجمعۃ واجبۃ علی کل قریۃ فیھاامام وان لم یکونواالاا ربعۃ"یعنی ہر ایسے گاؤں والوں پر جمعہ واجب ہے جس میں امام جمعہ پڑھانے والا ہو اگرچہ وہاں چارہی آدمی ہوں۔مقلدین جمعہ کے لئے تین آدمیوں کی شرط ذکر کرتے ہیں۔چنانچہ بہشتی زیور حصہ ۱۱ صفحہ ۷۷ میں جمعہ کے صحیح ہونے کی شرطوں میں لکھا ہے۔جماعت یعنی امام کے سوا کم سے کم تین آدمیوں کا شروع خطبہ سے نماز ہونے تک موجود رہنا۔اس سے بھی شہر کی شرط لغو ہوگئی۔کیونکہ جمعہ کے لئے جماعت کثیرہ وعظیمہ ہونا شرط نہیں ہے بلکہ مع امام چار آدمی ہوں تو جمعہ صحیح ادا ہو جاتا ہے پس جس بستی میں چھ سو آدمی آباد ہوں ان کے لئے جمعہ کیونکر مکروہ ہو سکتا ہے۔جمعہ مسلمانوں پر فرض ہے۔درودیوار محلوں' مکانوں اور دوکانوں پر فرض نہیں ہے۔اس لئے درالمختار جلد اول صفحہ ۵۴۳ میں لکھا ہے"اذابنی مسجد فی الرستاق بامرالامام فھو امر بالجمعۃ اتفاقا"جب گاؤں میں امام کے حکم سے مسجد بنائی گئی ہوتو وہاں باتفاق علماء

حنفیہ جمعہ صحیح ہے۔اس سے شہر کی شرط کالعدم ہوگئی۔اور آیت میں جو بیع سے شرط کا ثبوت لیتے تھے سب بیکار ہوگیا۔اور یہ کہنا بھی لغو ہوگیا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مصر جامع کے بغیر جمعہ صحیح نہیں ہے۔میں کہتا ہوں کہ جمعہ فرض ہے جس کا ثبوت قرآن کی آیت قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے کہ تمام اہل ایمان جو شہروں اور دیہاتوں اور بستیوں میں رہتے ہیں جمعہ کے دن جمعہ کے لئے حاضر ہوں۔آیت میں دو عموم ہیں۔ایک عموم تمام افراد اہل ایمان کو شامل ہے۔اور دوسرا عموم امکنہ ہے۔جو تمام شہروں اور دیہات کو شامل ہے۔پس جو شخص ادا جمعہ کیلئے شہر کی شرط بیان کرتا ہے اس کے ذمہ یہ لازم ہے کہ کوئی قطعی دلیل پیش کرے کیونکہ اصول کی رو سے فرض کی شرط فرض ہوتی ہے اور فرض دلیل قطعی سے ثابت ہوا کرتا ہے۔دلیل ظنی سے نہیں۔لہذا قول علیؓ جو ظنی ہے اس شرط کا مثبت نہیں ہوسکتا۔اس گرفت سے کوئی حنفی نہیں بچ سکتا۔سب اصول شکنجہ میں جکڑے ہوئے ہیں جس سے ان کا مذہب اصولی طور پر باطل ہوا۔چنانچہ مجمع الانہار جلد ا صفحہ ۱۰۹ میں اس کا مؤلف اس شکنجہ میں آکر یوں چیختا ہے حضرت علیؓ کا اثر پیش کر کے یہ کہتا ہے "لکن هذا مشکل جدا لان الشرط الذی هو فرض لاتثبت الا بقطعی "ہم کو قول علیؓ سے شہر کی شرط ثابت کرنے میں نہایت مشکل پیش ہے۔وہ یہ کہ جمعہ فرض ہے تو اس کی شرط شہر والی بھی فرض ہے اور فرض بغیر دلیل قطعی کے ثابت نہیں ہوسکتا اور دلیل قطعی میسر نہیں ہوتی۔صرف قول علیؓ ہے۔جو ظنی ہے اور ظنی دلیل سے شرط فرض کی ثابت نہیں ہوسکتی۔پس دعویٰ شرط شہر کا باطل ہے۔اس لیئے ائمہ محدثین شافعی احمد' مالک' امام بخاری' ابوداؤد' امام ابن حزم' اور بیہقی وغیرہم کا مسلک صحیح ہے کہ شہر کا ہونا شرط نہیں ہے۔جمعہ مدائن اور دیہات سب مقامات میں پڑھنا صحیح ہے۔حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے شرائط دو قسم کے ہیں۔ایک شرائط وجوب۔دوم شرائط ادا شہر کی شرط کو شرط ادا قرار دیا ہے۔اگر لفظ بیع اور تجارت سے اس شرط کا اثبات کیا تو پھر یہ شرط ادا نہ رہے گی۔بلکہ شرط وجوب ہو جائے گی اور بائع و مشتری جہاں ہوں گے وہاں ان پر جمعہ فرض ہوگا۔مثلاً میلہ' منڈیوں وغیرہ میں خواہ جنگل میں ہوں تو یہ باطل ہے اس لئے متقدمین میں حنفیہ نے شرط شہر کے اثبات کیلئے قرآن سے استدلال نہیں کیا۔وہ اثر حضرت علی سے دلیل پکڑتے ہیں مگر یہ خود ان کے اصول کے خلاف ہے۔چنانچہ اصول شاشی میں یہ لکھا ہے "شرط العمل بخبر الواحد ان لا یکون مخالفا للکتاب

والسنة المشهورة" خبر واحد پر عمل کرنے کیلئے یہ شرط ہے کہ وہ قرآن اور سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔ چونکہ قرآن میں جمعہ کا حکم عموم امکنہ پر ناطق ہے جیسا کہ مرقاۃ میں ہے دلیل الافتراض من کلام اللہ علی العموم فی الامکنة یعنی فرضیت جمعہ کی دلیل عموم اماکن پر ناممکن ہے تو قول حضرت علیؓ جو خبر واحد ہے جس سے شہر میں جمعہ کا حکم محدود ظاہر ہوتا ہے خلاف قرآن ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ یا اس کی تاویل کی جاوے گی کہ اثر علیؓ لا جمعة میں لفظ لا نفی کمال کا ہے۔ یعنی شہر میں جمعہ کامل ہوتا ہے کیونکہ وہاں جماعت عظیمہ ہوتی ہے۔ اور جس قدر جماعت بڑی ہوگی اسی قدر ثواب اور اجر زیادہ ملے گا۔ یا یہ حکم سیاسی اور تنظیمی ہوگا کیونکہ خلافت علیؓ میں سخت انقلاب برپا تھا کہ پہلے حضرت معاویہ وغیرہ سے جنگ ہوئی پھر خارجیوں نے بغاوت کی۔ تو ان سے جنگ ہوئی۔ بنابریں یہ حیدری حکم نافذ ہوا کہ شہروں کے بغیر جمعہ نہ پڑھا جائے تاکہ دیہات میں بغاوت نہ پھیلے اور شہر میں حکام نظام قائم رکھتے ہیں۔ فتفکروا۔۔۔ چونکہ آیت قرآن کی محکم اور قطعی ہے اور قول علی ظنی ہے اس لئے تاویل کمزور جانب میں کی جاوے گی۔ اس قول پر عمر فاروق کا حکم رائج ہوگا کہ جہاں اور جس جگہ بھی ہو جمعہ ادا کرو۔ کیونکہ یہ عام حکم قرآن کے عین موافق ہے اور دیگر علماء سلف کا تعامل بھی قول فاروقی کا مؤید ہے اور حدیث نبوی بھی اس کی مؤید ہے جو حضرت حفصہؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔ علی کل محتلم رواح الجمعة وعلی کل من راح الجمعة الغسل رواہ ابوداؤد باسناد صحیح، یعنی ہر بالغ شخص پر جمعہ کی طرف جانا واجب ہے اور ہر وہ شخص جو جمعہ کی طرف جائے اس کیلئے غسل کرنا ہے۔ اور دیگر حدیث جو ابوداؤد میں ہے اس کی تائید کرتی ہے کہ الجمعة حق واجب علی کل مسلم فی جماعة الاعلی اربعة عبد مملوك او امراۃ او صبی او مریض یعنی جمعہ تمام مسلمانوں پر جماعت میں واجب اور پڑھنا حق ہے۔ مگر ان معذور شخصوں کو معاف ہے ایک غلام جو دوسرے کے قبضہ میں ہے کہ سعیی الی الجمعه اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اور عورت جو گھر میں محبوس ہے سعیی سے معذور ہے۔ اور بیمار جو سعیی الی الجمعه سے معذور ہے اور لڑکا نابالغ جو ہنوز احکام الٰہی کا مکلف ہی نہیں ہے یہ چاروں حکم الٰہی فاسعوا سے مستثنیٰ کئے گئے ہیں۔ کیونکہ معذور ہیں۔ اور مسافر بھی معذور ہے کہ اس پر پہلے ہی نماز قضا کا حکم عائد ہو چکا ہے۔ باقی ان کے علاوہ سب مسلمان

اس حکم جمعہ میں داخل ہیں۔ اگر دیہات والے بھی مستثنیٰ ہوتے تو شارع ان کا ذکر بھی کر دیتے۔ اذ لیس فلیس۔ صرف حضرت علیؓ کا قول ہے جو عموم قرآن اور اطلاق حکم کو بھی مقید نہیں کر سکتا۔ اصول کی کتاب تلویح بڑی مشہور و حنفیہ کی درسی نصاب میں شامل ہے۔ اس میں یہ لکھا ہے "لایجوز تخصیص الکتاب بخبرالواحد دون الکتاب لانہ ظنی والکتاب قطعی فلایجوز تخصیصہ" یعنی قرآن کے عام حکم کی تخصیص خبر واحد سے کرنا جائز نہیں کیونکہ خبر واحد ظنی ہے۔ اور قرآن سے کم درجہ رکھتی ہے قول علی بلاشبہ خبر واحد ہے۔ متواتر اور مشہور روایت نہیں ہے تو یہ مخصص قرآن کا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مرسل ہوگا۔ اور تاویل ہی ٹھیک ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ حضرت امام ابن حزم نے یہ فرمایا ہے "ومن اعظم البرھان علی صحتھافی القریٰ ان النبی ﷺ اتی المدینۃ وانما ھیی قریٰ صغار متفرقۃ فبنیٰ مسجدہ فی بنی مالک بن نجار وجمع فیہ فی قریۃ ولیست بالکبیرۃ ولا مصرھنا لک اعون المعبود" جلد ا صفحہ ۴۱۴ بحوالہ محلی۔

یعنی گاؤں میں جمعہ پڑھنے کی سب سے بڑی دلیل تعامل نبوی کی رو سے یہ ہے کہ نبی کریمؐ جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اس وقت مدینہ کی چھوٹی بستیاں الگ الگ تھیں تب رسول اللہ نے بنی مالک بن نجار کی بستی میں مسجد بنائی اور اس بستی میں جمعہ ادا کیا۔ یہ نہ تو شہر تھا نہ بڑا گاؤں تھا۔ صرف چھوٹی سی بستی تھی۔ پانچ چھ سو افراد بالکل نہ تھے۔ پھر مہاجرین آتے گئے اور آبادی بڑھتی گئی۔ پہلے اس کا نام یثرب تھا پھر مدینہ ہوگیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ بستی اور گاؤں میں جمعہ صحیح ہے۔

جناب حافظ ابن حجر تلخیص الحبیر کے صفحہ ۱۳۱ میں بیہقی کی معرفت سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ہجرت کے وقت رسول اللہ ﷺ جس وقت بنی عمر بن عوف قباء سے سوار ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو بنی سالم کے پاس سے آپ کا گزر ہوا۔ یہ قباء اور مدینہ کے درمیان ایک بستی ہے اس جگہ پر جمعہ ہوگیا اور اس کا وقت ہوگیا۔ تو آنجناب نے اس بستی کے مسلمانوں کو جمعہ پڑھا دیا۔ مدینہ تشریف لانے کے وقت سب سے پہلا یہی جمعہ آپ نے پڑھایا۔ سیرۃ ابن ہشام اور خلاصۃ الوفا میں بھی یہی لکھا ہے پس ایسی روایتوں سے دیہات میں جمعہ پڑھنا صحیح ثابت ہوگیا اور شرط شہر کی بے کار ثابت ہوئی۔ نادان لوگوں نے جمعہ کیلئے مصر جامع کی شرط تو لکھ دی مگر یہ نہ بتا سکے کہ مصر کی تعریف

کیا ہے۔کسی نے کچھ لکھا اور کسی نے کچھ تیرہ قول سے زیادہ مروی ہیں۔جس میں بعض ایسے ہیں کہ ان کی بناء پر بمبئی' دہلی' کراچی' لاہور ایسے شہروں میں بھی جمعہ جائز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہ مصر سے مراد وہ شہر ہے جہاں امیر اور قاضی ہوں جو حدود جاری کریں۔اور ظالم ومظلوم کے فیصلہ کر سکیں۔کوئی کہتا ہے جہاں پانچ سو آدمی ہوں وہ شہر ہے اور بعض نے کہا جس میں سو گھر ہوں۔اور بعض نے کہا جس میں تین گھر ہوں وہ شہر ہے۔تو اس لحاظ سے تمام دیہات شہر میں شمار ہیں۔اور اگر لفظ بیع سے شہر ثابت کرنا ہے تب بھی تمام دیہات شہر ہیں۔کیونکہ لفظ بیع مطلق ہے قلیل ہو یا کثیر بیع تمام دیہات میں ہو رہی ہے۔کئی کئی دوکانیں ہیں بلکہ شہر کے بیوپاری بھی خرید وفروخت کیلئے آتے ہیں اور بیع کے معاملات ہوتے ہیں اگر قول علیؓ میں مصر جامع سے مراد بڑا شہر ہے تو قصبات میں حنفیہ کا جمعہ جائز قرار دینا باطل ہے۔ھدایہ وغیرہ کتب فقہ میں مصر جامع کی تعریف بھی کی گئی ہے کہ مصر سے مراد وہ آبادی ہے جس میں اتنے بالغ آدمیوں کی سکونت ہو کہ وہاں کی بڑی مسجد میں ان کو اگر جمع کیا جائے تو وہ نہ سما سکیں۔اس پر حاشیہ طحطاوی کتاب حنفیہ میں لکھا ہے کہ ھذا یصدق علی کثیر من القریٰ یعنی یہ تعریف بہت سے گاؤں پر صادق آجاتی ہے۔میں کہتا ہوں کہ مقلدین حنفیہ کے جمعہ کے بارہ میں تین گروہ ہوگئے ہیں ایک وہ جو شہر اور دیہات سب جگہ فرض جمعہ پڑھ کر کتب فقہ کو ٹھکرا چکے ہیں انہوں نے امام شعرانی کے فیصلہ پر عمل کیا ہے۔دوسرا گروہ جمعہ اور عید دیہات میں نہیں پڑھتا۔ان کا تقلید پر جمود ہے اور یہ مذہب باطل ہے۔تیسرا گروہ جمعہ اور عید دیہات میں پڑھ لیتا ہے مگر جمعہ کے ساتھ ظہر بھی پڑھ لیتا ہے۔ان میں سے پہلا گروہ حق پر ہے۔اللہ تعالیٰ سب کو حق قبول کرنے کی توفیق بخشے آمین۔آخر فتویٰ میں مفتی صاحب نے تسلیم کر لیا کہ بڑا گاؤں شہر کے حکم میں ہے اس لئے جائز ہے۔اس سے مصر جامع کی شرط بیکار ہوگئی اور مدعا ہمارا ثابت ہوگیا۔فللہ الحمد۔

عبدالقادر حصاری

المرقوم یکم محرم ۱۳۹۰ھ

صحیفہ اہلحدیث جلد ۵۱ شمارہ ۴ = ۱۴ صفر ۱۳۹۰ھ۔

دیہات میں جمعہ کی فرضیت

ایک غلط فتویٰ اور اس پر تبصرہ

ایک بریلوی حنفی مولوی ابوالرضا عبدالعزیز مدرسہ غوثیہ حویلی لکھا ضلع ساہیوال کا لکھا ہوا فتویٰ باطلہ ۲۴ مارچ کو کسی دوست کی طرف سے بغرض جواب موصول ہوا باوجود عدم فرصت اپنے دوست کے حکم کی تعمیل میں فتویٰ باطلہ کی تردید ہدیہ ناظرین ہے۔

اس فتوے کی بنا یہ ہے کہ کسی پیر دنیا کے اسیر نے سوال کیا کہ دیہات میں جمعہ پڑھنا جائز ہے کہ نہیں؟ مولوی صاحب مذکور نے اس کا جواب لکھتے ہوئے سب سے پہلے اپنے عجز کا یوں اظہار کیا ہے۔ ''یہ اتنا بڑا بوجھ مسئلہ جمعہ کا تھا جو اٹھنا مشکل ہے'' مولوی صاحب کا یہ عجز درست ہے کیونکہ حنفی مذہب میں مسئلہ جمعہ نہایت مضطرب ہے۔ زمانہ حال میں پاک و ہند کے علاقوں کے دیہات پر طائرانہ نظر ڈالئے کہ بعض دیہات میں مقلدین حنفیہ جمعہ اور عید دونوں کو واجب جان کر پڑھتے ہیں بعض مقلدین جمعہ اور ظہر احتیاطی دونوں کو مشکوک اعتقاد سے پڑھتے ہیں اور بعض دیہات میں صرف عیدین کی نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ کے تارک ہیں اور بعض مقامات میں جمعہ اور عید دونوں کو طلاق بائنہ دے چکے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ یہ سب کے سب مقلدین حنفی المذہب ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ تقلید واجب بالغیر ہے عین واجب نہیں یعنی دنیا میں اہل اسلام اھل رائے اور اہل ہوئی ہو گئے اور اعتقادات اور عملیات میں اختلافات پیدا ہو گئے اس لئے تقلید شخصی لوگوں پر واجب ہے تاکہ ایک امام کے مقلد ہو کر باہم متفق رہیں۔ اختلاف اور تنازع نہ کریں لیکن مثل ''مشہور تیلی بھی کیا پھر کیا کھایا'' ان بے چاروں نے اختلاف سے بچنے کے لئے بڑی تدبیر نکالی تھی اس میں بھی فیل ہو گئے۔ جس قدر حنفی مذہب میں فرقے ہیں مثلاً مرجیہ، معتزلہ، دیوبندی حنفی، بریلوی حنفی، حلولی، اتحادی وغیرہ اتنے کسی مذہب میں نہیں ہیں۔ سب کے اعتقادات اور عملیات میں آسمان و زمین کا فرق ہے بایں ہمہ سب حنفی کہلاتے ہیں جیسے دین میں اختلاف بسیار ہیں ایسے ہی ان کے اماموں کے مسائل میں بھی اختلاف اور تضاد ہے۔ مثلاً بچہ کو دودھ پلانے کی مدت امام ابوحنیفہ اڑھائی سال لکھتے ہیں لیکن امام زفر تین سال لکھتے ہیں اور صاحبین قاضی ابو یوسف محمد دو سال کا مسلک رکھتے تھے۔ یہ سب حنفیوں کے کام ہیں۔ شخصی تقلید کے دعویدار جس کے قول کو پسند

کریں لے لیں۔ تقلید شخصی کو آنچ نہ آئے گی صرف ائمہ محدثین شافعیؒ، مالکؒ، احمدؒ وغیرہ سے دوری ہے بغیر سخت ضرورت کے ان کے پاس نہیں آتے تا کہ غیر مقلد نہ بن جائیں۔ مسئلہ جمعہ کے بارہ میں کتب فقہ میں بھی اختلاف ہے کہیں جمعہ دیہات میں جائز لکھا ہے اور کہیں منع ہے۔ کہیں جمعہ اور ظہر دونوں کا پڑھنا لکھا ہے۔ جو پھر شہر کی شرط کہتے ہیں تو شہر کی تعریف میں ایسا الجھاؤ ہے کہ تمام مقلدین مل کر اس کا تانا بانا سلجھا نہیں سکتے اس لئے بے چارے مفتی نے اپنا عجز ظاہر کیا کہ یہ مسئلہ حل کرنا مشکل ہے لیکن آخر اپنے پیر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اور بوجھ کو ہلکا کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اپنے امام اعظمؒ کے نزدیک ممنوع ہے مفتی صاحب نے دعائیہ جملہ میں لفظ "عنہ" نہیں لکھا کیونکہ دارالعلوم غوثیہ کے مہتمم ہیں ان کے حلوم میں ضمیر نہ لکھنے کا اہتمام ہے،

مفتی صاحب کو مسئلہ جمعہ در دیہات کی کوئی ذاتی تحقیق حاصل نہیں ہے۔ ورنہ علوم شرعیہ سے کوئی شرعی دلیل پیش کرتے صرف یہ لکھ دیا کہ امام اعظم کے نزدیک ممنوع ہے۔ امام صاحبؒ کا قول منع کا کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ امام صاحب شارع نہ تھے شارع تو وہ امام اعظم ﷺ ہیں جن کا کلمہ پڑھا جاتا ہے اور جس نے آسمان سے نازل شدہ شریعت کو نافذ کیا اور خود اس کا اتباع کیا جیسا کہ فرمان ہے" ان اتبع الا مایوحی الی " کہ میں صرف نازل شدہ وحی الٰہی کی اتباع کرتا ہوں اور ہم کو بھی شارع علیہ السلام خدا تعالیٰ کا پیغام دے گئے۔ "اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء" یعنی اے مومنو! تم بھی انہیں احکام شرعیہ کی پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیئے گئے ہیں اور اس کے سوا دیگر اولیاء کی پیروی نہ کرو اگر مفتی صاحب علوم شرعیہ سے واقف ہوتے تو اس نازل شدہ شریعت سے کوئی دلیل پیش کرتے لیکن وہ اس شریعت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے کوئی شرعی دلیل پیش نہ کر سکے اس کو مشکل تصور کیا۔

امام اعظم کون ہے؟

مفتی صاحب کو یہ بھی علم نہیں ہے کہ اصل امام اعظم کون ہے؟ سنیئے! ہم سے سنیئے! اصل امام اعظم وہ ہیں جن کا قول و فعل کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ ان کے مقابلہ میں تمام کائنات ہیچ ہے۔ اصل امام اعظم وہ ہیں جو تمام انبیاء اور ملائکہ اور اولیاء کے امام ہیں۔

اصل امام اعظم وہ ہیں جن کا کلمہ دنیا میں جاری ہے اصل امام اعظم وہ ہیں جن کی اطاعت پر خدا تعالیٰ کی اطاعت موقوف ہے۔

اصل امام اعظم وہ ہیں جن کی اطاعت کے بغیر کوئی اطاعت اور عبادت قبول نہیں ہے۔ اصل امام اعظم وہ ہیں جن کے تمام ائمہ دین خوشہ چین اور خدام ہیں۔ اصل امام اعظم وہ ہیں جن کی بابت قبر وحشر میں سوال وجواب ہوگا۔ اصل امام اعظم وہ ہیں جن کے جھنڈے تلے تمام انبیاء اولیاء صالحین حشر میں جمع ہوں گے۔ اصل امام اعظم وہ ہیں جن کو شفاعت کبرٰے وصغرٰے کا منصب حاصل ہے۔ اصل امام اعظم وہ ہیں جو گنہگاروں کے شافع ہونگے۔ اصل امام اعظم وہ ہیں جن کو مقام محمود میں خداوند کریم کا قرب حاصل ہوگا۔

اصل امام اعظم وہ ہیں جو تمام انسانوں سے پہلے پل صراط کا مشکل راستہ عبور کر کے امت کو ساتھ لے جائیں گے۔

اصل امام اعظم وہ ہیں جو جنت کا دروازہ سب سے پہلے کھولیں گے اور جنت کے دروازوں کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں ہوں گی۔ ان کے مقابلہ میں نام نہاد مفتی ایک ایسے امام اعظم کے قول کو پیش کر رہا ہے جس کو شارع ہونے کا منصب حاصل نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ کی وصیت

پھر جس امام کا قول پیش کیا جارہا ہے اس کی دو وصیتیں ہیں۔

ایک یہ کہ ”قال ابو حنیفۃ حرام علی من لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی“ (میزان شعرانی جلد ۱ صفحہ ۴۸) یعنی امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ جس کو میرے قول کی دلیل شرعی معلوم نہ ہو میرے قول پر اس کو فتویٰ دینا حرام ہے۔

دوسری وصیت یہ ہے ”اترکوا قولی بخبر الرسول“ (عقد الجید صفحہ ۴۵) اور ان کی یہ پیش گوئی ہے ”قال ابو حنیفہ لم یزل الناس فی صلاح مادام فیھم من یطلب الحدیث فاذا طلبوا العلم بلا حدیث فسدوا“ (میزان شعرانی جلد ۱ صفحہ ۱۵۴) یعنی امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ لوگ ہمیشہ صداقت پر رہیں گے جب تک ان میں حدیث نبویؐ کے طلبگار رہوں گے اور جب حدیث رسول چھوڑ کر اور علم طلب کریں گے تو وہ گمراہ ہو جائیں گے۔

چنانچہ امام محمد ان کے شاگرد نے اس وصیت پر عمل کیا۔ نصاب زکوٰۃ فی

الحبوب کے متعلق اپنی کتاب الحجج کے صفحہ ۱۲۶ میں امام صاحب کا قول نقل کر کے کہ تمام اناج زرعی کے قلیل اور کثیر میں زکوۃ عشر واجب ہیں۔ پھر امام محمد یہ کہتے ہیں "وانا لاناخذ بقول ابی حنیفة وابراهیم ولکننا ناخذ بما روی عن النبی ﷺ انه قول لیس فیما دون خمسة اوسق صدقة" یعنی ہم ابوحنیفہ کا قول نہیں لیتے اور نہ ابراہیم نخعی کا قول لیتے ہیں ہم تو حدیث نبی کریم ﷺ کی لیں گے کہ آنحضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ پانچ وسق سے کم میں صدقہ واجب نہیں ہے۔

پس اصل امام اعظم نبی کریم ﷺ ہیں جن کا فرمان کسی صورت نہیں چھوڑا جا سکتا یہ اہل حدیث کے امام اعظم ہیں۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۲۰۷ میں ہے "هذا اکبر الشرف لاهل الحدیث لان امام هم النبی ﷺ" یعنی دیگر فرقوں کے تو اپنے اپنے امام ہیں مذہب اہلحدیث کو سب سے بڑا شرف یہ حاصل ہے کہ ان کے امام نبی اکرم ﷺ ہیں۔ یہی امام اعظم ہیں۔

چنانچہ تفسیر ابن کثیر جلد ا صفحہ ۳۷۸ میں یہ لکھا ہے "فالرسول محمد خاتم الانبیاء صلوات الله وسلامه علیه دائما الی یوم الدین هوالامام الاعظم الذی لو وجد فی ای عصر وجد لکان هوالواجب الطاعة المقدم علی الانبیاء کلهم کذالك هوالشفیع فی المحشر اتیان فی الرب جل جلاله لفصل القضائبین عباده وهوالمقام المحـ د الذی لایلیق الاله والذی یحید عنه اولوالعزم من الانبیاء والمرسلین حتی تنتهی النوبة الیه فیکون هوالمخصوص به(صلوات الله وسلامه علیه)" یعنی حضرت رسول ﷺ خاتم الانبیاء جن پر درود وسلام ہمیشہ قیامت تک زمانہ میں آپ ہی واجب الطاعۃ ہیں سب انبیاء آپ کے ماتحت ہیں۔ (یہ صفت کسی اور نبی کو حاصل نہیں ہے) اسی واسطے آپ لیلۃ الاسراء میں جب معراج پر گئے تو بیت المقدس میں تمام انبیاء کا اجتماع تھا تو آپ ہی سب کے امام ہوئے اور نماز پڑھائی۔ اسی طرح روز محشر میں جب کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے بندوں کا فیصلہ کرنے کیلئے تشریف آور ہونگے تو اس وقت آپ ہی لوگوں کے شفیع ہوں گے اور مقام محمود پر فائز المرام ہوں گے کیونکہ یہ مقام آپ ہی کی ذات کے لائق ہے اور اس روز شفاعت کرنے کرانے سے تمام اولوالعزم انبیاء مرسلین بھاگ جائیں گے جواب دے دیں

گے۔آخر مخلوقات کی انتہا آپ پر ہوگی تو آپ ہی شفاعت کبریٰ کا بوجھ اٹھائیں گے اس لئے آپ امام اعظم ہیں۔

اگر مفتی مقلد کو ہمارے امام اعظم ﷺ سے پیار ہوتا تو مسئلہ جمعہ جس کو مشکل اور اہم قرار دے رہے ہیں آپؐ سے حل کرایا جاتا جب کہ قرآن میں یہ حکم ہے " فاذاتنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول "یعنی جب تمہارا آپس میں کسی مسئلہ پر جھگڑا اور اختلاف ہو جائے تو اس مسئلہ کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اور ان کی کلام سے فیصلہ کرلو۔اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس طرح عمل کرو۔

چونکہ مقلد مفتی کا اللہ اور آخرت پر پورا ایمان کماینبغی نہ تھا اس لئے انہوں نے اس مسئلہ کو غیر اللہ و غیر الرسول کی طرف لوٹا دیا ہے یہ جرم عظیم اور خدا اور رسول کی صریح نافرمانی ہے۔چنانچہ مفتی صاحب لکھتے ہیں۔فتاویٰ رضویہ جلد۳ صفحہ۱۰۷ میں عبارت ہے کہ دیہات میں جمعہ باتفاق ائمہ حنفیہ ممنوع و ناجائز ہے کہ جو نماز شرعاً صحیح نہیں اس لئے اشتغال روانہیں۔پھر لکھتے ہیں ''نمبر دو'' فتاویٰ رضویہ جلد۳ صفحہ۴۰۷،،دیہات میں جمعہ کرنا اور پڑھنا مذہب حنفی میں گناہ ہے نہ ایک گناہ بلکہ چند ایک گناہ ہیں۔

اس کے علاوہ فتاویٰ رضویہ جلد۳ صفحہ۱۰۷ میں ہے دیہات میں جمعہ نہ فرض نہ وہاں اس کی ادا جائز نہ صحیح۔اگر پڑھیں گے تو ظہر کا فرض سر سے نہ اترے گا پڑھنے والے متعدد گناہوں کے مرتکب ہوں گے۔

پھر فتاویٰ رضویہ کے مصنف کے شان کو ظاہر کیا ہے کہ فتاویٰ رضویہ کے مصنف امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا مولوی شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی جو کہ تمام پاکستان کے پیر و سجادہ نشین کے امام ہیں۔پہلے مفتی صاحب نے امام کوفی کا نام نامی نعمان کا مذہب بتایا کہ ان کے نزدیک منع ہے لیکن کسی کتاب کے حوالہ سے امام صاحب کا قول اسناد متصل سے پیش نہ کیا صرف ایک بریلوی امام کا فتویٰ پیش کر دیا کہ دیہات میں جمعہ پڑھنا گناہوں کا باعث ہے۔

یہ شرعی دلیل نہیں ہے تقلید در تقلید ہے۔دانشمندوں کا یہ قول ہے کہ گوہ کا گوہ مرغی کا گوہ ہے۔یہ تقلید در تقلید بھی گوہ کا گوہ ہے کہ پہلے بریلوی امام کی تقلید پھر ابو حنیفہ کی یہ عجیب گورکھ دھندہ ہے۔

اب اس کی تردید خود بریلوی امام کی کلام اور فتویٰ سے سنیئے ۔ احکام شریعت حصہ دوم ۲۵۲ میں ہے (عرض) دیہات میں جمعہ نہ پڑھنے کے مسائل ورسائل علماء نے لکھے ہیں اس سے اہل دیہات بہت پریشان ہیں ۔ (ارشاد) مذہب حنفی میں جمعہ وعیدین جائز نہیں لیکن جہاں قائم ہے وہاں منع نہ کیا جائے اور جہاں نہیں ہے وہاں قائم نہ کیا جائے آخر شافعی مذہب پر تو ہو ہی جاتا ہے ۔ اس صورت میں جہلا جمعہ تو جمعہ ظہر بھی چھوڑ دیں گے ۔ ارایت الذی ینھیٰ عبدا اذا صلیٰ سے خوف کرنا چاہیئے ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم سے منقول ہے کہ ایک شخص کو طلوع آفتاب کے وقت نفل پڑھتے ہوئے منع نہ فرمایا جب وہ پڑھ چکا تو مسئلہ تعلیم فرمادیا ۔ بریلویوں کے احمد خاں رضا کے اس فتوے سے ظاہر ہوا کہ جہاں اہل حدیث' حنفیوں نے جمعہ قائم کرر کھے ہیں ان کو منع نہ کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ آخر شافعی مذہب میں تو ہو ہی جاتا ہے ۔ اور جو منع کریگا وہ اس آیت کا مصدق ہے "ارایت الذی ینھی عبداً اذا صلی" یعنی اے ہمارے رسول ! کیا آپ نے دیکھا ہے اس شخص کو جو اللہ کے بندے کو نماز سے منع کرتا ہے ۔

مخفی نہ رہے کہ یہ آیت ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی ۔

چنانچہ ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۵۲۸ میں ہے "نزلت فی ابی جھل لعنه الله توعد النبی ﷺ علی الصلوٰۃ عندالبیت فوعظه تعالیٰ بالتی ھی احسن" یعنی یہ آیت ابوجہل کے بارہ میں نازل ہوئی جو اللہ کے بندے نبی کریم ﷺ کو بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے روکتا تھا اور ڈراتا دھمکاتا تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے ابوجہل علیہ اللعنۃ کو اچھے طریقے سے نصیحت فرمائی ۔

احمد رضا مفتی بریلوی کے اس فتوے سے ظاہر ہوا کہ دیہات میں جمعہ قطعاً گناہ نہیں ہے ۔ ورنہ قائم شدہ جمعہ کو بھی منع کیا جاتا کیونکہ دیہات میں جمعہ پڑھنا متعدد گناہوں کا باعث تھا جس سے روکنا بحدیث "من رائی منکم منکرا فلیغیرا بیده وان لم یستع بلسانه (الحدیث)" یعنی جو شخص تم میں سے کوئی برا کام ہوتا دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے مٹائے اگر یہ طاقت نہ ہو تا زبان سے روکے ۔

پس اگر احمد رضا صاحب کا پہلا فتویٰ صحیح ہے یعنی دیہات میں جمعہ پڑھنا گناہوں کا سبب ہوتا تو مفتی صاحب اس کو روکنے کا فتویٰ دیتے لیکن چونکہ امام شافعی وغیرہ کے

نزدیک جمعہ صحیح تھا اس لئے روکنے سے منع کر دیا۔ اب جو مقلدین قائم شدہ جمعوں سے لوگوں کو روکتے ہیں وہ اس آیت کے مصداق ہیں جو بریلوی مجدد احمد رضا نے پیش کی ہے۔ اور وہ ابوجہل کے بارہ میں نازل ہوئی تو یہ روکنے والے بھی ابوجہل کے ساتھی ہیں کیونکہ نماز سے روکنے میں دونوں فریق شریک ہیں۔

حدیث میں ہے "من تشبه بقوم فهو منهم" یعنی جو شخص کسی قوم کے مشابہ ہے وہ انہی میں شمار ہے۔ ہاں ناجائز نماز اور غیر شرعی سے روکنا جائز ہے چنانچہ حدیث میں ہے "عن ابن عباس قال اقيمت صلوٰة الصبح فقام رجل يصلي الركعتين فجذب رسول الله ﷺ بثوبه وقال اتصلي الصبح اربعا۔ رواه احمد ورجاله رجال الصبح (مجمع الزوائد جلد ۲ صفحه ۵)" یعنی ابن عباس نے بیان کیا کہ نماز صبح کی اقامت ہوگئی۔ دراں حالے ایک شخص دو رکعت نماز سنت صبح کی پڑھنے لگا تو آنحضرت ﷺ نے اس کا کپڑا پکڑ کر اس کو نماز سے کھینچ لیا اور فرمایا کیا صبح کی نماز چار رکعت پڑھتا ہے۔ کیونکہ اصول یہ ہے کہ اقامت کے بعد اسی نماز کا وقت ہے جس کیلئے اقامت ہوگی۔ دوسری پڑھے گا تو وہ حرام اور ناجائز اور گناہ ہے اس سے روکنا جائز ہے۔ مفتی بریلوی نے جوش میں آ کر دیہات میں جمعہ کو گناہ تو لکھ دیا لیکن پھر دل نے ملامت کی کہ گناہ کیسے ہوا امام شافعی وغیرہ دیہات میں جائز اور صحیح کہتے ہیں پھر وہ گنہگار ہوں گے تب کہہ دیا کہ قائم شدہ کو منع نہ کرو۔

آئندہ شمارہ میں نماز جمعہ اور شرط کی تعریف پر بحث کا بیان آئے گا۔ انشاءاللہ۔

مصر کی تعریف پر بحث نماز جمعہ کیلئے جامع شہر کی شرط اور شہر جامع کی تعریف میں علماء حنفیہ کی پریشانی واضطراب

علماء حنفیہ نے کتب فقہ میں نماز جمعہ اور نماز عیدین کیلئے مصر جامع کی شرط لکھی ہے اور اس کو قول علیؓ لا جمعة و لا تشريق الا في مصر جامع سے ثابت کیا ہے کہ جمعہ اور عیدین شہر جامع کے بغیر صحیح نہیں ہے اس کے ہم نے بیں جواب دے کر اس سے استدلال کرنے کو بے کار ثابت کر دیا ہے۔ یہاں ہم اس دلیل کو صحیح فرض کر کے حنفیہ سے دریافت کرتے ہیں کہ جب شریعت حنفیہ میں نماز جمعہ وعید کیلئے شہر جامع کی شرط لگائی گئی ہے تو اس کی تعریف اور پہچان کرائیں کہ شہر جامع کیا چیز ہے؟ اور کتنی آبادی کو کہتے ہیں؟ اگر یہ شرط لازمی اور وجوبی ہوتی تو شریعت محمدیہ میں ضرور اس کی تعریف کر کے نماز جمعہ وعید ایسے شعار اسلام کی ادائیگی کیلئے سہولت اور آسانی پیدا کی جاتی۔ لیکن یہ شرط شارع کی طرف سے کسی نص قطعی سے ثابت ہی نہیں ہے اس لئے شرع میں اس کی تعریف نہیں پائی گئی علماء حنفیہ نے اس فرض کی شرط فرض کو کمزور دلیلوں اور وہمی باتوں سے ثابت کرنے کی کوشش تو بہت کی لیکن اس کی تعریف میں ایسے پریشان ہوئے کہ جیسے مرزائی مرزا کی رسالت اور نبوت کو ثابت کرنے میں پریشان ہیں چنانچہ ذیل میں ان تعریفات کو کتب حنفیہ سے نقل کیا جاتا ہے ناظرین ان کو پڑھ کر خود بھی اندازہ کر لیں کہ حنفی مذہب کے علماء کو اس شرط پر عمل کرنے کیلئے کس قدر دقت پیش آئی ہے اور ان کے علماء کی آراء واقوال میں کس قدر اضطراب ہے کہ کوئی بھی قابلِ عمل نہیں ہے بروئے اس اصول کو اذا تعارضا تساقطا جب دو یا دو قولوں میں تعارض اور تخالف ہو تو دونوں ساقط الاعتبار ہو جاتے ہیں پھر تیسری چیز کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو ادائے فرض کیلئے آسان ہو۔

(تعریف نمبر ۱)۔ عینی حنفی اور ابن ہمام نے امام ابوحنیفہؒ سے یہ تعریف نقل کی ہے کہ مصر اس بڑے شہر کو کہتے ہیں جس میں کوچہ و بازار ہوں اور اس کے گردونواح گاؤں اور اس میں والی ہو جو ظالم اور مظلوم کے درمیان انصاف کرتا ہو۔ اور اس میں عالم ہو جس کی طرف حوادث میں لوگ رجوع کرتے ہوں (رسالہ اطفاء الشمہ صفحہ ۱۴۰ جلد ۲ بحوالہ نور الشمہ صفحہ ۳ ولامع الانوار) اب ابوحنیفہ کی دوسری تعریف پڑھئے۔

۲۔ علامہ عینی نے نہایہ صفحہ ۹۸۳ میں امام ابوحنیفہؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ لکھتے ہیں "فعن ابی

حنیفۃ ھوما یجتمع فیہ مرافق اھلہ دنیا ودینا" یعنی مصر وہ ہے جہاں کے رہنے والوں کی دینی اور دنیوی ضروریات جمع ہوں۔ پھر نہایہ میں حوائج الدین کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ وہاں قاضی مفتی سلطان ہو۔

۳۔ مولوی احمد علی بٹالوی نے اپنے رسالہ نور الشمعہ صفحہ ۴۵ میں بحوالہ کبیری لکھا ہے کہ، قاضی خاں نے کہا ہے کہ اعتماد اس تعریف پر ہے جو امام ابو حنیفہ صاحب سے مروی ہے کہ جس موضع کی آبادی منی کے اندازہ پر ہو اور اس میں مفتی اور قاضی بھی ہو جو حدود قائم کرتا ہو احکام جاری کرتا ہو تو وہ مصر جامع ہے اور مرغینانی میں ہے کہ یہ ظاہر روایت ہے" یہ تیسری تعریف ہے"۔

۴۔ چوتھی تعریف امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف دونوں سے یہ مروی ہے "وعن ابی یوسف کل موضع فیہ امیر وقاضی ینفذ الاحکام ویقیم الحدود ھکذا روی الحسن عن ابی حنیفۃ" یعنی امام ابو یوسف فرماتے ہیں جس موضع میں امیر اور قاضی ہوں جو حدود شرعیہ قائم کرتے ہوں اور قانون اور احکام اسلام نافذ کرتے ہوں وہ مصر ہے۔ (عمدۃ الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ صفحہ ۱۸۸)

امام ابو حنیفہ کی ان چار تعریفوں کو ملا کر مطلب اخذ کرلیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ ہندوستان کے شہروں میں جمعہ درست ہے نہ پاکستان کے شہروں میں کیونکہ کسی میں امیر اور قاضی شرعی نہیں ہے جو حدود شرعیہ قائم کرتا ہو۔ اور آئین واحکام اسلام جاری کرتا ہو بلکہ ملک پاکستان میں تو آئین اسلام نافذ کرنے سے صاف عملاً انکار کیا جا رہا ہے۔ پس جو دیوبندی اور بریلوی حنفیہ ملک پاک وہند میں جمعہ ادا کرتے ہیں ان کا جمعہ باطل ہے یا پھر یہ سب غیر مقلد ہیں جو اپنے امام کی تقلید توڑ کر اہلحدیث سے دامن جوڑ رہے ہیں۔

۵۔ شرح وقایہ میں ہے کہ جمعہ کیلئے مصر یا فنا مصر شرط ہے۔ مصر کی تعریف میں اختلاف ہے بعض حنفیہ کہتے ہیں مصر وہ موضع ہے جہاں امیر ہو اور قاضی بھی ہو جو حدود قائم کرے اور احکام شرعیہ نافذ کرے اور بعض حنفیہ کہتے ہیں کہ جس کے رہنے والے اتنے ہوں کہ وہاں کی بڑی مسجد میں نہ سما سکیں۔ مصنف وقایہ نے اس دوسری تعریف کو پسند کیا ہے پہلی کو پسند نہیں کیا کیونکہ احکام شرعیہ میں سستی پیدا ہوگئی ہے خصوصاً شہروں میں حدود قائم کرنے میں بہت غفلت ہے۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ یہاں شہر جامع کی تعریف بدل گئی اور اپنی طرف سے اور

گھڑلی۔اس تعریف کی رو سے قصبوں اور بڑے بڑے دیہات میں جمعہ درست ہے۔اور مصر جامع کی شرط لغو ہوگئی اور قول علی کو پس پشت ڈال دیا گیا۔درمختار میں اس تعریف اکبر المساجد کو لکھا ہے۔اس کے حاشیہ طحطاوی میں لکھا ہے "هذا يصدق على كثير من القرىٰ" یعنی یہ تعریف اتنی آسان ہے کہ بہت سے دیہات پر صادق آتی ہے۔

ہدایہ میں دونوں تعریفیں لکھ کر لکھا ہے کہ "والاول اختيار الكرخي وهو الظاهر والثاني اختيار الخلجي" یعنی پہلی تعریف کہ شہر وہ ہے جہاں امیر اور قاضی ہو جو حدود جاری کرے اور احکام نافذ کرے اس کو کرخی نے اختیار کیا ہے یہی ظاہر مذہب ہے اور دوسرا خلجی نے اختیار کیا ہے۔

اب ہندوپاک میں سب حنفی تلجی ہیں انہوں نے تفرقہ دین میں ڈال کر کیا تماشا بنا رکھا ہے۔کہیں حنفی،کہیں یوسفی،کہیں کرخی،کہیں خلجی۔

دین حق را چار مذہب ساختند

رخنہ دردین نبی انداختند!

بہر حال خلجی کے مذہب مصر جامع کی تعریف اور شرط بے کار ہوگئی۔ردالمختار میں ہے "وتقع فرضا في القصبات والقرى الكبيرة التي فيها اسواق" یعنی قصبوں اور بڑے دیہاتوں میں جمعہ فرض واقع ہو جائے گا جب کہ اس میں بازار ہوں اس سے ظاہر ہے کہ قصبوں اور بڑے دیہات میں جمعہ درست ہے۔

۶۔نور الشمہ صفحہ ۳۵ میں کبیری شرح منیہ سے منقول ہے "وعن محمد ان كل موضع مصره الامير فهو مصر حتى لو بعث الى قرية نائبالاقامة الحدود والقصاص تصير مصر افاذاعزله تلحق بالقرى" یعنی ہر وہ موضع جس کو امیر مصر بتاوے وہ مصر ہے یہاں تک کہ اگر کسی گاؤں میں حدود اور قصاص جاری کرنے کیلئے اپنا نائب بھیج دے تو وہ گاؤں مصر ہو جاوے گا۔

اور جب امیر اپنے نائب کو معزول کردے گا تو وہ پھر گاؤں ہو جاویگا۔پس بازار کوچہ کی تعریف باطل ہے۔

۷۔مولوی سید محمود صاحب حنفی نے ایک رسالہ تبصرۃ الجمعہ لکھا ہے اس کے صفحہ ۱۱۷ میں ہے جو مضمرات اور جامع الرموز وغیرہ سے نقل کیا ہے "منها مافيه خمس ماة رجل احرار

ولها رساتيق"یعنی مصر کی ایک تعریف یہ ہے کہ وہاں پانچ سو آزاد ہوں اور اس کے گردونواح میں گاؤں اور بھی ہوں۔پس یہ تعریف اکثر دیہات پر صادق ہے کہ ان میں پانسو سے بھی زیادہ آدمی احرار موجود ہیں۔اس

۸۔نیز بحوالہ تبصرۃ الجمعہ صفحہ ۱۱۸ کتب فقہ سے یہ تعریف منقول ہے"منها مالا يظهر فيه نقصان بموت وزيادة ولادة"یعنی مصر کی ایک تعریف علماء حنفیہ نے یہ بھی کی ہے کہ شہر وہ ہے کہ پیدائش اور موت سے جہاں زیادتی اور کمی نہ محسوس ہو۔یہ تعریف بھی اکثر دیہات اور قصبوں پر صادق آتی ہے۔

۹۔اور یہ اسی کتاب میں ہے"منها مايولد فيهاانسان ويمات في كل يوم"ایک تعریف ان میں سے حنفیہ نے یہ کی ہے کہ جہاں ہر روز کوئی انسان پیدا ہوتا ہو اور کوئی مرتا ہو۔یہ بھی دیہات کبریٰ اور قصبوں پر صادق ہے۔

۱۰۔ایک تعریف یہ لکھی ہے"ومنها مالا يعد اهله الا بمشقة"مصر وہ ہے جہاں کے رہنے والے بمشکل گنے جاویں۔یہ تعریف بھی دیہات کبریٰ اور قصبوں کو شامل ہے۔پس مصر جامع کی شرط لغو ہو گئی۔

۱۱۔"ومنها يمكنهم دفع عدو بلا استغاثة"یعنی مصر کی ایک تعریف یہ ہے کہ جہاں اتنی آبادی ہو کہ اگر دشمن حملہ کرے تو وہ کسی کی مدد کے محتاج نہ ہوں۔

یہ تعریف پاک و ہند کے تمام شہروں پر صادق نہیں آتی۔کیونکہ دونوں ملک باہم ایک دوسرے پر حملہ کریں تب بھی روس،امریکہ،چین وغیرہ کے محتاج ہیں۔اور اگر تیسرا ملک ان میں کسی پر حملہ کرے تب بھی دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں بلکہ ممالک اسلامیہ حجاز،یمن،عراق،شام،نجد،مصر،وغیرہ سب ہی محتاج ہیں تو جمعہ سب ملکوں میں ندارد۔تو پھر روس،چین اور امریکہ پر جمعہ فرض ہوا۔حنفیہ وہاں چلے جائیں۔

۱۲۔ایک تعریف یہ ہے"منها مافيه ماة الاف رجل"یعنی شہر وہ ہے جس میں ایک لاکھ آدمی ہوں۔

یہ تعریف بھی اکثر قصبوں اور منڈیوں پر صادق ہے لہٰذا مصر جامع کی تعریف بے کار گئی۔

۱۳۔ایک تعریف یہ ہے"منها مافيه عشرة الاف مسكونون فيه"یعنی شہر وہ ہے

جہاں جمعہ فرض ہے کہ جہاں دس ہزار کی آبادی ہو خواہ ان میں نابالغ بچے بھی شمار کیئے جاویں۔

یہ تعریف بھی بہت دیہات اور قصبوں اور منڈیوں پر صادق آرہی ہے جس کی بنا پر اکثر حنفیہ فرضی جمعہ اور واجبی عیدیں ادا کر رہے ہیں بلکہ اس سے کم آبادی میں بھی جمعہ پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ بہشتی زیور حصہ یازدہم کے صفحہ ۷۷ میں یہ عنوان قائم کیا ہے "جمعہ کے صحیح ہونے کی شرطیں" پھر لکھا ہے "مصر یا شہر یا قصبہ۔ پس گاؤں یا جنگل میں درست نہیں۔ البتہ جس گاؤں کی آبادی قصبے کے برابر ہو مثلاً تین چار ہزار آدمی ہوں وہاں جمعہ درست ہے"۔ پس اس سے کتب فقہ کی وہ تعریفیں لغو ہوگئیں جو مصر جامع کی تعریف میں اختراع کی تھیں مثلاً نور الایضاح کے صفحہ ۱۲۸ میں ہے "والمصر کل موضع له مفت وامیر وقاض ینفذ الاحکام ویقیم الحدود وبلغت ابنیة منی فی ظاهر الروایة" یعنی مصر وہ ہے جس جگہ مفتی، امیر، قاضی ہوں جو احکام شرعیہ نافذ کریں اور حدود شرعیہ قائم کریں اور وہاں اس قدر عمارتیں ہوں جس قدر موسم حج میں منیٰ میں ہوتی ہیں۔ ظاہر روایت یہی ہے پس بغیر اس تعریف شہر کے جمعہ صحیح نہ ہوگا۔ پس تمام دیوبندیوں کا جمعہ اور بریلویوں کا جمعہ مردود ہے اور ان کی تعریفیں ظاہر روایت کے خلاف ہیں جو مطرود ہیں۔

۱۴۔ ایک تعریف تبصرۃ الجمعہ میں یہ لکھی ہے کہ مصر وہ جہاں دس ہزار جنگی سپاہی رہتے ہوں۔

۱۵۔ ایک تعریف یہ ہے کہ مصر وہ موضع ہے جہاں ایک ہزار جنگی سپاہی موجود ہیں۔

ان دو تعریفوں کی رو سے دیہات کبریٰ، قصبات اور منڈیوں جمعہ جائز نہیں رہتا جن میں حنفیہ پڑھتے ہیں۔

۱۶۔ اور ایک تعریف یہ لکھی ہے "منها ما فيه مائة بيت ورئيس وعالم وان لم يكن فيه سلطان ونائبه" یعنی ایک تعریف حنفی عالموں نے یہ کی ہے کہ جہاں سو گھر ہوں اور ان میں کوئی سردار اور عالم بھی موجود ہو، اگرچہ بادشاہ اور اس کا نائب نہ ہو۔ اس تعریف کی رو سے اکثر دیہات اور بستیوں میں جمعہ درست ہے۔

۱۷۔ نیز تبصرہ کے صفحہ ۱۱۸ میں ہے "ومنها ما زاد على ثلاثين بيتا" کہ مصر وہ ہے جس میں تیس گھروں سے زیادہ گھر ہوں اس تعریف کی رو سے تو کوئی گاؤں ہی جمعہ سے محروم

رہے۔سب دیہات کے لئے جمعہ پڑھنا جائز ہوا۔پس صفحہ ۶ سے صفحہ ۷ اتک شہر کی تعریفوں میں بازاروں کا ہونا شرط نہ ہوا۔

۱۸۔عینی شرح بخاری سے یہ نقل کیا ہے''الثانی ان الامام ای موضع حل جمع''یعنی امام جہاں اتر پڑے وہاں ہی جمعہ پڑھ لے۔پس شہر کی شرط باطل ہوگئی امام کی رہ گئی۔کہیں امام کی شرط بے کار ہو جاتی ہے اور شہر کی رہ جاتی ہے۔یہ عجیب گورکھ دھندہ ہے کہ یہ سب تعریفیں ایک دوسرے کے مخالف ہیں کوئی بھی صحیح نہیں۔

۱۹۔ردالمختار جلد اول صفحہ ۵۳۷ میں ہے کہ جب گاؤں میں امام کے حکم سے مسجد بنائی جاوے تو وہاں باتفاق علماء حنفیہ جمعہ درست ہے۔اس صورت میں شہر کا ہونا اور بازاروں کا ہونا اڑا دیا گیا ہے کیا مذہبی تماشا ہے۔

۲۰۔ہم اپنے پہلے مضمون ابطال شرط مصر میں ردالمختار جلد اول صفحہ ۵۳۷ کے حوالہ سے یہ لکھ چکے ہیں کی جب گاؤں میں امام کے حکم سے مسجد بنائی جائے تو وہاں باتفاق ائمہ حنفیہ جمعہ کی نماز پڑھی جائے گی۔اس اتفاقیہ اصول سے سب تعریفیں باطل ہوگئیں صرف امام کے حکم سے دیہات میں مسجدیں تعمیر کرانے کا اصول باقی رہے گا۔چونکہ شہروں میں بھی سلطان اور اس کے نائب کی شرط کتب فقہ میں درج ہے تو اس کا تدارک یوں ہوسکتا ہے کہ بحرالعلوم کی ارکان اربعہ سے القول البدیع صفحہ ۸ میں منقول ہے کہ''یرجع المشائخ عن ھذا الشرط فیما تعذ دالاستیذان من الامام فاجمع الناس علی رجل یصلی بھم الجمعۃ کذافی العالمگیریہ فاقلاعن التھذیب''یعنی اگر امام سے تعذر ہو جائے تو مشائخ حنفیہ نے اس شرط سے رجوع کر کے استیذان سلطان کی یہ تجویز بنائی ہے کہ مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر ایک شخص کو اپنا امام بنالیں وہ لوگوں کو جمعہ پڑھا دیا کرے۔

الحمدللہ آخر عاجز ہو کر مذہب اہل حدیث کی طرف آگئے اور سب شرطوں پر پانی پھیر دیا۔اہل حدیث کا یہ مذہب ہے کہ جب خلیفہ اسلام نہ ہو تو ہر جگہ کے لوگوں کو اپنا ایک امیر تجویز کر کے منظم ہو جانا چاہیئے اور اپنے امیر کی ماتحتی میں احکام شرعیہ کو بجالانا چاہیئے۔حدیث میں ہے''اذا امکم فھو امیرکم۔رواہ البزار''جو شخص تمہاری نماز کا امام ہے وہی تمہارا امیر ہے پس بموجب تجویز فتاویٰ عالمگیری جس کو پانچ سو علماء حنفیہ نے مرتب کیا ہے۔جمعہ'شہروں اور دیہات'قصبات اور بستیوں میں درست ہوگیا کہ اس تجویز کردہ امیر

کے حکم سے سب دینی کام سرانجام پاسکیں گے حتیٰ کہ کسی جنگل میں بھی امام صاحب اتر پڑے یا جنگل کے خانہ بدوشوں نے اپنا امیر بنالیا تو وہاں بھی جمعہ درست ہوگا کیونکہ بحوالہ عینی شرح بخاری یہ گذر چکا ہے "ان الامام ای موضع حل جمع "کہ امام جہاں اتر پڑے وہاں ہی جمعہ پڑھ لے۔

اور یاد رہے کہ جو اصل امام المسلمین کا حکم ہے وہی اس تجویز کردہ امام کا حکم ہوگا ورنہ تجویز کرنے کا فائدہ کیا ہے اسی وجہ سے دیوبندیوں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو اپنا امیر شریعت بنایا تھا ان کو امیر ماننے والے ان کے حکم سے تمام امور شرعیہ وسیاسیہ بجالاتے تھے۔ دیوبندیوں نے فتاویٰ عالمگیری کی اس تجویز پر عمل کیا تھا جو یہ لکھا ہے "بلاد علیها ولاة کفار یجوز للمسلمین اقامة الجمعة والقاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویحب علیهم ان یلتمسوا والیا مسلما کذافی سراج الدرایه "یعنی ایسے شہر جہاں حاکم کافر ہوں تو جائز ہے مسلمان وہاں جمعہ پڑھیں اور ہووے ایک قاضی ساتھ تراضی مسلمانوں کو اور ان پر واجب ہے کہ وہ مسلمان حاکم حنفیہ کی تلاش میں رہیں۔ اور ردالمختار شامی میں لکھا ہے "وکذا لومات الوالی اولم یحضر بفتنة ولم یوجد احد ممن له حق اقامة الجمعة العامة خطیبا للضرورة کما سیاتی مع انه لا امیر ولا قاضی ثمه "یعنی اسی طرح صورت ہے کہ اگر ملک کا والی فوت ہوگیا یا وہ کسی فتنہ فساد کی وجہ سے جمعہ کے لیئے حاضر نہیں ہوسکتا اور کوئی شخص ایسا موجود نہیں جس کو جمعہ قائم کرنے حق حاصل ہو تو دریں صورت عام لوگوں کو چاہیئے کہ اس فرض کو ادا کرنے کی ضرورت کی بنا پر کسی عالم کو اپنا خطیب مقرر کرکے جمعہ پڑھ لیں (اس کو نہ چھوڑیں کہ یہ اسلام ہے) جیسے کہ ایسی صورت آجائے کہ نہ اس جگہ امیر ہو نہ قاضی ہو تو یہ تجویز کرلینی چاہیئے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ جمعہ رکن اعظم اسلام ہے اس سے شوکت اور رونق دین کی ہے اس کو کسی صورت چھوڑنے کا حکم نہیں ہے۔ بادشاہ اور مصر کو جمعہ کی شرط مقرر کی ہے لیکن سب کو گرادیا اور یہ تجویز ہوئی کہ کسی کو اپنا خطیب بنا کر جمعہ ادا کرتے رہیں یہی خطیب اور امام بمنزلہ امیر وحاکم ہے جو شہر و دیہات ہر جگہ جمعہ قائم کرسکتا ہے۔ جمعہ کی نماز دیگر نمازوں کی طرح ایک عبادت ہے اس کو ضائع نہ کرنا چاہیئے جب مسلمان کسی کو اپنا امیر بنائیں گے تو

وہ ہر جگہ کو شہر بنا سکتا ہے۔ بازاروں کی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ کبیری شرح منیہ میں ہے "کل موضع مصرہ الامیر فھو مصر" یعنی جس موضع کو امیر مصر قرار دے وہی مصر ہے پس دارومدار امیر امام پر ہے خواہ وہ تمام ملک کا ہو تو مقامی طور پر مسلمان تجویز کر کے بنالیں۔ اب بھی اسی طرح کرنا چاہیئے کیونکہ پاکستان میں سلطان اسلام نہیں ایسا ہی ہے' جیسا کہ مرزائیوں کا امام ہے نہ اس مرزائی امام کا شریعت میں اعتبار ہے نہ ملکی صدر کا ہے کہ وہ صرف ملکی ہے شرعی نہیں۔ اس لیئے نہ حدود شرعیہ جاری کرتا ہے اور نہ احکام شرعیہ نافذ کرتا ہے اس لیئے ہر مقام کے لوگوں کو اپنا امیر اور خطیب بنا کر تمام شعائر اسلام مثلاً مسجدیں بنانا' درسگاہیں قائم کرنا' کتاب وسنت کا علم پڑھانا' جمعہ وعیدین کا انتظام کرنا وغیرہ بجالانا چاہیئے۔ شہر اور گاؤں میں ہر جگہ یہ انتظام ہوسکتا ہے۔ شہر اور قصبہ کی سب شرطیں اٹکلیں اور رائے تھیں۔ کوئی شرعی تعریف اور شرط کسی نص قطعی سے ثابت نہیں ہے اس لیئے مولانا اشرف علی تھانوی قول بدیع کے صفحہ ۱۶ پر گھبرا کر یہ کہتے ہیں ہم کو اشتراط مصر کے لئے دلیل لانے کی حاجت نہیں۔ ان خدا کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ جب اشتراط مصر پر کوئی دلیل نہیں اور نہ ہی اس کے بیان کی کوئی حاجت ہے تو پھر خلق خدا کو اس عبادت سے کیوں روکتے ہو اور کیوں خواہ مخواہ اس آیت کے مصداق بنتے ہو "ارایت الذی ینھی عبدا اذا صلی" یعنی کیا دیکھا تو نے اس شخص کو جو بندہ کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے۔ یہی خصلت ان مقلدین نے اختیار کر رکھی ہے کہ دیہات میں نماز جمعہ سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز جمعہ کے لیے شہر کا ہونا ضروری ہے جب کہا جائے کہ اس کی دلیل لاؤ تو کہتے ہیں کہ اس کی حاجت نہیں ہے پھر کہا جائے کہ شہر اور جامع شہر کیا بلا ہے تو پھر جتنے حنفیوں کے منہ اتنی تعریفیں ہیں اور سب معارض ساقط ہوکر سنا کرنے کا حکم رکھتی ہیں سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے "لو کان من عند غیر اللہ لو جدوا فیہ اختلافا کثیرا" یعنی اگر قرآن غیر اللہ کی کلام ہوتی تو اس میں اختلاف بہت واقع ہوتا چونکہ جمعہ جیسی عبادت کے لئے اللہ تعالیٰ نے شہر مقرر نہیں کیا ورنہ اپنے نبی کی زبان پر اس کی تعریف فرما دیتے۔ غیر اللہ نے یہ شرط لگائی ہے اس لئے اس میں ان کو اختلاف کثیر کرنا پڑا۔ نہایہ میں ہے "اختلفوا فیہ" عینی شرح بخاری میں ہے "ثم اختلف اصحابنا فی المصر الذی یجوز فیہ الجمعۃ" ملا علی قاری مرقاۃ شرح مشکوۃ میں لکھتے ہیں "واختلفوا فی

حد المصر اختلافا کثیرا قل ما یتفق وقوعه فی بلد "یعنی مصر کی تعریف میں بہت اختلاف ہے بہت ہی کم کوئی تعریف شہر کی پائی جاتی ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ بعض تعریفیں شہروں پر بھی صادق نہیں اور بعض دیہات پر بھی صادق ہیں عجیب گورکھ دھندہ ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ سب تعریفیں حنفیوں کی ہیں جو ایک امام کے مقلد کہلاتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے القول البدیع میں ان مختلف طریقوں کی بابت یہ ریمارک کیا ہے کہ فقہاء نے اپنے اپنے زمانہ کے مطابق تعریفیں کی ہیں۔ کیا خوب جواب ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے تعریف کی گئی ہے یعنی جیسے زمانہ بدلتا گیا اور شہر بدلتے گئے ویسے ہی تعریفیں بدلتی گئیں۔ گویا نہ یہ شرط مصر کی شرعی تھی اور نہ تعریف شرعی تھی سب قیاسی کام تھا جو ہوتا رہا ہے یہ سب باطل ہے۔

حدیث میں ہے "کل شرط لیس فی کتاب الله فهو باطل "یعنی جو شرط کتاب اللہ میں نہ ہو وہ باطل ہے۔ (محلی ابن حزم جلد ۹ صفحہ ۵۱۵)

شہر کی شرط جمعہ کے لئے باطل ہونے کی کئی وجوہ ہیں اول یہ کہ کتاب وسنت سے جمعہ سب اہل ایمان پر فرض ہے بغیر معذورین' بیمار' غلام' بچہ' عورت وغیرہ اس لئے اس کو فرض عین کہا جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ جملہ علی الاطلاق سب امکنہ میں آیت سے ثابت ہے اس مطلق کو مقید کرنے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔

تیسری وجہ یہ کہ مصر کی جو شرط ہے وہ قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ مصر کی تعریف مخدوش ہے۔ جیسے حدیث میں آیا ہے "ان کان الماء قلتین لم یحمل الخبث "یعنی جب پانی دو قلے ہو تو وہ پلید نہیں ہوتا اس حدیث پر امام طحاوی لکھتے ہیں "خبر القلتین صحیح واسناده ثابت ولکن ترکناه لانا لانعلم ما القلتان "یعنی قلتین کی حدیث تو صحیح اور ثابت ہے لیکن ہم حنفیوں نے اسے چھوڑ دیا ہے کیونکہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ قلتان کیا چیز ہے۔ میں کہتا ہوں اس اصول کی بنا پر ہم مصر کی شرط کو تو رد کر دیں گے کہ مصر کی شرعی تعریف معلوم نہیں یہ متروک العمل ہے لیکن قلتین میں یہ عذر سراسر باطل ہے جو علم حدیث سے نادانی پر مبنی ہے چنانچہ ہمارے حضرت العلام محدث روپڑیؒ جو علماء حنفیہ کے جس قدر ہو چکے ہیں اور ہیں قدیم عہد اور جدید زمانہ میں علم حدیث اور فقاہت میں سب پر فوقیت رکھتے تھے جنہوں نے علم عربیت میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ مولانا انور شاہ صاحب دیوبندی

اور رشید احمد گنگوہی جو شہرہ ءآفاق ہستیوں میں شمار تھے ان کی عربی کی غلطیاں دو چار' دس بیس نہیں ایک صد ظاہر کر دیں تھیں اور عہد قدیم اور عہد جدید کے سب احناف کے اغلاط مسائل شرعیہ میں ظاہر کئے چنانچہ آنجناب محدث روپڑیؒ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے اطفاء الشمعہ جس کے چار حصے ہیں ان میں مسئلہ جمعہ کی اختراعی شرطوں پر بحث کر کے علماء حنفیہ کی تمام رسالوں اور کتابوں کا ایسا قلع قمع کیا ہے کہ روئے زمین کے احناف قیامت تک سر نہیں اٹھا سکتے اگر کوئی ڈھیٹ ہو کر جواب کے لئے سر اٹھائے گا تو بنی اسرائیل کی طرح چالیس سال تو تقلیدی جنگل میں سر مارتا پھرے گا آخر مر جائے گا اور جواب نہ دے سکے گا لیکن مولانا حضرت العلامؒ کی یہ کتاب مستطاب علماء فقہاء کے سمجھنے کے قابل ہے اس کتاب سے ان کے علمی سمندر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ ایک مسئلہ کے ذکر میں بیسیوں مسائل علمیہ حل کر جاتے ہیں حدیث قلتین کا حضرت العلام روپڑیؒ نے اطفاء الشمعہ حصہ دوم کے صفحہ ۱۳۱ کے حاشیہ میں صاف حل کر دیا ہے کہ اس سے مراد ہجر شہر کے مٹکے ہیں۔

امام طحاوی ایسوں کو قلال ہجر کی روایت سے نادانی رہی۔ لہٰذا حدیث قلتین کو ترک کر دینا سراسر گمراہی ہے اور قول علی "لا جمعة و لا تشريق الا فی مصر جامع" متروک ہے اس لئے نہ اس پر ائمہ محدثین نے عمل کیا اور نہ علماء حنفیہ نے کیونکہ مصر کی تعریف۔ کیا مصر جامع کی تعریف کسی کو معلوم نہ ہو سکی ہر شخص نے اپنے آپ تعریف اختیار کر لی۔

دیکھو مولوی اشرف علی تھانوی جو حنفی دیوبندی گروہ کے حکیم الامۃ ہیں وہ لکھتے ہیں کہ جس گاؤں کی آبادی قصبے کے برابر تین چار ہزار ہو وہاں جمعہ درست ہے حالانکہ یہ قول علیؓ کے سراسر خلاف ہے اور ہدایہ وغیرہ کتب فقہ کی تصریحات کے منافی ہے لیکن سب دیوبندی تقلید کا ہار توڑ کر مجتہد بنے بیٹھے ہیں اور دیہات اور قصبات میں جمعہ پڑھ رہے ہیں ۔جامع شہر کی شرط پر بھی لات ماردی اور بادشاہ کی شرط پر بھی۔ چنانچہ القول البدیع کے صفحہ ۳۰ پر لکھا ہے اگر امام نائب سے تعذر ہو تو مسلمین اپنا امام مقرر کر کے جمعہ ادا کریں اب وہ قاعدہ کہاں گیا "اذافات الشرط فات المشروط" کہ شرط فوت ہو جائے تو مشروط فوت ہو جاتا ہے۔ اگر جمعہ کے لئے بادشاہ یا اس کے نائب کی شرط تھی تو ظہر پڑھ لیتے جمعہ نہ پڑھتے اسی طرح بادشاہ ایسا شرط لکھا ہے کہ حدود جاری کرتا ہو اور احکام شرعیہ نافذ کرتا ہو تو

اس سے ملک پاک و ہند کے شہروں سے جمعہ کا نکل جانا اور تمام احناف جمعہ سے ہاتھ صاف کر کے بیٹھ جائیں لیکن انہوں نے اس شرط کا اور تعریف کا ابطال کیا اور نومسلم حکومتوں کو اپنا حاکم مان کر جمعہ پڑھتے رہے اور یہ تاویل یہودیوں کی طرح گھڑی کہ حدود جاری کرنا شرط نہیں قدرت شرط ہے کہ اسی طرح شہر کی شرط کو طرح طرح کے حیلوں، بہانوں سے توڑا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھتے رہے کہ ہمارے مذہب میں دیہات میں نہ جمعہ درست ہے اور نہ عیدین ۔اور یہ کہا کہ مصر شرط ادائے جمعہ است جائز نہ ۔لیکن اگر امام کے حکم سے مسجد بنائی گئی تو بالاتفاق اس گاؤں میں جمعہ جائز پس شہر کی شرط باطل ۔الغرض مذہب حنفی میں التباس حق بالباطل بہت مشہور ہے۔

مولوی احمد رضا خاں بریلوی جو اپنے گروہ کے ماسوا سب کا مکفر ہے' فتاویٰ افریقہ کے صفحہ ۴۶ پر جمعہ وعیدین کے لیے شہر کو شرط قرار دے کر یہ لکھتا ہے کہ شہر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ آبادی جس میں متعدد محلے اور دوامی بازار ہوں اور وہ ضلع یا پرگنہ ہو کہ اس کے متعلق دیہات ہوں اور اس میں کوئی حاکم با اختیار ایسا ہو کہ مظلوم کا انصاف ظالم سے لے سکے، اگرچہ نہ لے سکے۔کیسی بے ہودہ تعریف ہے کہ منیٰ پر صادق نہیں آتی کہ حج کے وہاں بازار نہیں رہتے اور ارد گرد دیہات نہیں ہیں لیکن ہدایہ میں ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہاں جمعہ جائز ہے حالانکہ دوامی بازار، وہاں نہیں پھر صفحہ ۴۷ پر جا کر اس تعریف کو قطع کر دیتے ہیں عبارت عربی کا حاشیہ میں ترجمہ یوں کیا ہے ''جب کسی بستی کی آبادی اتنی ہو جائے کہ ایک مسجد میں نہ سمائے تو سلطان اسلام کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک ان کے لیے جامع مسجد بنوائے اور ان کے لیے امام مقرر کر دے جو ان کو جمعہ پڑھائے''۔ یہ شہر کی شرط کی ابطال ہے۔اس سے بستی میں جمعہ پڑھنے کو جائز بتایا ہے۔دونوں جگہ بادشاہ اسلام پر دارومدار کہا ہے اور صفحہ ۴۷ پر لکھا ہے ''غیر اسلامی شہر محل جمعہ نہیں'' پس ہندوستان میں جمعہ حنفیوں کا نا جائز ہو، نیز لکھا ہے ''اسلامی بستی وہ ہے جس کی عام آبادی فی الحال مسلمان آزاد یا زیر سلطنت اسلامی ہے، اس سے بھی ظاہر ہے کہ ملک ہند میں حنفیوں کا جمعہ شہروں میں بھی ناجائز ہے'' پھر لکھا ہے ''اسلامی بستی اگر پرگنہ ہو اور اس میں ذی اختیار حاکم (مسلم خواہ غیر مسلم) ہو، وہیں جمعہ وعیدین فرض وواجب ہیں، ان کی ادا صحیح و جائز ورنہ نہیں۔ بہرحال ہندوستان میں نہ دیوبندیوں کے نزدیک جمعہ درست ہے اور نہ بریلویوں کے نزدیک،

کیونکہ سلطان اسلام وہاں نہیں ہے نہ پاکستان میں جائز۔ کیوں کہ حدود شرعیہ نافذ کرنے والا کوئی حاکم نہیں ہے پس یہ سب کوئی شریعت افترائی ہے، کتاب وسنت میں ان باتوں پر کوئی دلیل ناطق نہیں ہے۔

دیگر حدیث میں ہے "عن ابی سعید ان رسول اللہ ﷺ قال اذا خرج ثلاثة فی سفر فلیومروا علیہم احدھم" یعنی سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب تین شخص سفر میں نکلیں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔

اس لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا "لا اسلام الا بجماعة ولا جماعة الا بامارة ولا امارة الا بطاعة"۔ (رواہ الدارمی فی مسندہ) یعنی بغیر جماعت کے اسلام صحیح نہیں اور بغیر امیر کے جماعت نہیں اور امیر بغیر اطاعت کے نہیں ہوسکتا۔

ان احادیث اور دیگر احادیث متعلقہ امارت سے ہر جگہ کے مسلمانوں کو امیر بنانا واجب ہے۔ چونکہ حکومت پاکستان شرعی حکومت اور خلیفہ اسلام قائم کرنے سے گریز کرتی ہے اس لیے ہر مقام کے مسلمان باشندوں کو اپنا دینی امیر بنالینا چاہیے۔ جو شرعی احکام جمعہ، عیدین وغیرہ کو ادا کرسکیں۔

حدیث میں ہے "اذا امکم فهو امیر کم" (رواہ البزار) جب کوئی تمہاری نمازوں کی امامت کراتا ہے تو وہی تمہارا مقامی امیر ہے پس وہ جمعہ وعید ادا کرانے کا مجاز ہے۔ دار قطنی صفحہ ۱۲۶ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہر ایسے گاؤں والوں پر جس میں امام جمعہ پڑھانے والا ہو، اگرچہ وہاں چار آدمی ہوں ان پر جمعہ پڑھنا واجب ہے"۔ بخاری شریف میں ہے، "یونس کہتے ہیں کہ میں وادی القریٰ میں ابن شہاب زہری کے پاس تھا جب کہ زریق بن حکیم، ابن شہاب کے پاس لکھ کر لایا کیا آپ مجھے جمعہ پڑھنے کی رائے دیتے ہیں۔ حالانکہ زریق اپنی زمین میں کام کررہے تھے اس میں حبشی وغیرہ لوگوں کی ایک جماعت رہتی تھی اور اس زمانہ میں زریق ایکہ کے حاکم تھے۔ تو میں سن رہا تھا کہ ابن شہاب نے جواب میں ان کو جمعہ پڑھنے کا حکم دیا۔

چونکہ زریق جہاں کام کررہے تھے شہر نہ تھا اس لیے انہوں نے مسئلہ پوچھا تو جواب ملا کہ جمعہ پڑھو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جمعہ کے لیے شہر کی شرط باطل ہے اور جہاں حاکم یا امام ہو جمعہ ادا ہوسکتا ہے۔ تلخیص الحبیر میں ہے "ان عمر بن عبدالعزیز کان متبدیلا

بالسویدا فی امارته علی الحجاز فحضرت الجمعة فهیئوا له مجلساً من ابطیء ثم اذن بالصلوٰة فخرج فخطب وصلی رکعتین وجهر وقال الامام یجمع حیث کان "(صفحہ۲۲) یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ" ایک مرتبہ اپنی امارت میں جنگل بنام سویدا میں اترے ہوے تھے کہ جمعہ آگیا لوگوں نے آپ کیلیے بطحا وادی میں جگہ تیار کی پھر اذان ہوئی، پھر آپ نکلے اور خطبہ پڑھا اور دو رکعتیں بلند قرائت سے پڑھیں۔ پھر یہ فرمایا" امام جہاں ہو جمعہ پڑھ لو"۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ جمعہ کے لیے شہر شرط نہیں ہے۔ ہدایہ میں لکھا ہے "لا تصح الجمعة الا فی مصر جامع وفی مصلی للمصر ولا یجوز فی القریٰ" جمعہ بغیر شہر جامع یا عیدگاہ شہر اور مصر کے صحیح نہیں ہے۔ اور دیہات میں جائز نہیں ہے اور اس کے ثبوت میں یہ روایت پیش کی ہے۔ "لقوله علیه السلام لا جمعة ولا تشریق ولا فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جمعہ اور عید فطر اور عید قربانی اور تشریق یعنی تکبیر کہنا بغیر شہر جامع کے نہیں ہے۔

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔ یہ ہدایہ والے کی علم روایت اور علم حدیث سے ناواقفی کا نتیجہ ہے امام نووی نے لکھا ہے "حدیث علی متفق علیٰ ضعفه" کہ حضرت علیؓ کی اس روایت کے ضعیف ہونے پر تمام ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔ جب یہ حدیث ضعیف ہے تو قرآن حکیم کی آیت عام کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ پھر یہ خبر واحد ہے مرفوع ہو یا موقوف۔ اصول حنفیہ کی رو سے عموم، قرآن کی تخصیص نہیں کر سکتی۔ ہٹ دھرمی اور عناد کی انتہا ہے کہ یہ لوگ بد دیانتی سے کام لے کر اپنے اصولوں کو پس پشت ڈال دیا کرتے ہیں یہ حنفیہ کی عام عادت ہے۔

حضرت علیؓ کی مرفوع روایت ہدایہ والی کا راوی حارث اعور ہے اور حضرت علیؓ کے بارے میں محدثین نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے اس لیے یہ دلیل ہدایہ والے کی مردود ہے۔ مفتی بریلوی نے علامہ عینی حنفی کی کتاب عینی شرح بخاری کا حوالہ دے کر حضرت علیؓ کی موقوف روایت پیش کی ہے۔ "لا جمعه ولا تشریق الا فی مصر جامع" کہ جمعہ اور تشریق مصر جامع کے سوا کسی جگہ صحیح نہیں ہے۔

راقم السطور نے اپنے رسالہ کتاب الجمعة میں جمعہ اور دیہات کے ثبوت میں تیس

دلائل پیش کرنے کے بعد حنفیہ کی اس دلیل قول علیؓ کے پندرہ جواب لکھے ہیں جن کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔ میں نے لکھا تھا کہ ہدایہ والے کی نقل کردہ حدیث لا جمعة محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے اس کی سند محدثین کے نزدیک ضعیف نا قابل احتجاج ہے جس کی سند کچھ ٹھیک نہیں ہے وہ موقوف ہے، موقوف حجت نہیں ہے۔

مقدمہ اعلاء السنن دیوبندی کے صفحہ ۳۳ میں ہے "قول الصحابة المجتهد فيما لانص فيه حجة عندنا" قول صحابی اس وقت حجت ہے کہ جب اس مسئلہ میں کوئی اور نص موجود نہ ہو۔ مسئلہ جمعہ میں نصوص عامہ موجود ہیں للہذا یہ قول حجت نہیں ہے۔ ارشاد الفحول کے صفحہ ۸۳ میں ہے "وذهب الجمهور ايضاً الى ان اجماع الخلفاء الاربعة ليس بحجة لانهم بعض الامة" صحابہ کرام میں سے اگر خلفاء اربعہ کسی مسئلہ پر اجماع کرلیں تو وہ حجت نہیں ہے کیونکہ وہ تمام امت نہیں ہیں بعض امت ہیں۔ اجماع میں کل کی شمولیت شرط ہے دو چار، دس بیس کی نہیں۔

فتح القدیر شرح ہدایہ میں ہے کہ "قول الصحابی حجة عندنا مالم ينفه شيى آخر من السنة" قول صحابیؓ ہمارے نزدیک حجت ہے جب تک حدیث نبویؐ کے مخالف نہ ہو۔ یہاں مخالفت ظاہر ہے کیونکہ، عون المعبود شرح ابوداؤد جلد ا صفحہ ۴۱۴ میں ہے کہ محلی ابن حزم میں لکھا ہے "امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ دیہات میں جمعہ پڑھنے کے صحیح ہونے پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو اس وقت مدینہ کے الگ الگ گاؤں یعنی بستیوں میں لوگ بسے ہوئے تھے۔ بعد میں آبادی بڑھی تو پھر بستیاں مل کر شہر بن گیا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے مالک بن نجار کی بستی میں مسجد بنائی اور اسی گاؤں میں جمعہ پڑھا اس وقت شہر نہ تھا اور نہ قصبہ تھا صرف گاؤں تھا"۔

اس سے ثابت ہوا کہ ہر آبادی میں جمعہ درست ہے کسی حدیث سے منع ظاہر نہیں ہوتا۔ امام ابن حزم نے فرمایا "فبطل قول من ادعىٰ لا جمعة الا فى مصر" یعنی اس دلیل قوی سے اس شخص کا قول باطل ہوا جو یہ کہتا ہے کہ شہر کے بغیر جمعہ کسی جگہ صحیح نہیں۔ تلخیص الحبیر صفحہ ۱۳۲ میں ہے، "امام بیہقیؒ نے المعرفۃ میں ابن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے روایت کیا ہے کہ" ہجرت کے وقت رسول اللہ ﷺ جس وقت بنی عمرو بن عوف (قبا) سے روانہ ہو کر وادی رینا کی طرف روانہ ہوئے تو نبی اکرم ﷺ بنی سالم کے پاس

سے گزرے جو قبا اور مدینہ کے درمیان ایک بستی ہے، اس جگہ آپ کو جمعہ نے پالیا تو سب کے ساتھ مل کر جمعہ پڑھا۔

خلاصہ الوفا صفحہ ۱۹۹ میں ہے کہ بنی سالم کی وادی جواثا کی مسجد میں آپؐ نے جمعہ کی نماز پڑھی۔ آں حضرت ﷺ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مدینہ کے قریب ایک بستی میں (جس کو قبا کہتے ہیں) بنی عمرو بن عوف کے قبیلہ میں اترے، وہاں مسجد قبا کی بنیاد رکھی اور چودہ یوم قیام کیا اور مسجد قبا میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ وفاء الوفاء جلد ۱ صفحہ ۱۸۳ میں ہے "انہ کان یصلی الجمعۃ فی مسجد قبا فی اقامتہ ھناك" مسجد قبا میں آپؐ نے تعمیر سے فراغت پا کر نماز جمعہ پڑھی۔ ان واقعات سے ظاہر ہوا کہ جمعہ پہلے بستیوں میں شروع ہوا اور بعد میں شہروں میں شروع ہوا۔ بخاری شریف میں ہے کہ مدینہ کے بعد جو جمعہ پڑھا گیا وہ جواثا بستی میں پڑھا گیا۔ (جواثا ایک گاؤں کا نام ہے جو بحرین کے دیہات میں ہے) ملاحظہ ہو بخاری وابوداؤد۔

تیسرا جواب یہ کہ جمعہ کی فرضیت سورہ جمعہ میں نص قطعی سے ثابت ہے جس کا ثبوت بھی ہے۔ اور دلالت بھی قطعی ہے۔ اسی وجہ سے جمعہ کا فرض عین ہونا اس سے ثابت ہے۔ اگر یہ دلیل قطعی نہ ہوتی تو جمعہ کی فرضیت اس سے ثابت نہ ہوتی۔ جب جمعہ کا فرض عین اسی سے ثابت ہوا تو اس کے شرائط بھی ایسے دلائل سے ثابت ہونے ضروری ہیں جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہوں کیونکہ اصول فقہ کا یہ ہے کہ "شرط الفرض لایکون الا فرضا" یعنی فرض کی شرط بھی فرض ہوتی ہے۔

مثلاً وضو نماز کے لیے شرط ہے تو وضو کا ثبوت بھی دلیل قطعی سے ہوگا۔ فرض کی کوئی شرط ظنی دلیل سے ثابت نہ ہوگی۔ اس لیے قول علی میں کئی کمزوریاں ہیں، جس کی وجہ سے یہ حجت نہیں ہے۔

اول یہ حدیث نبوی نہیں ہے بلکہ موقوف روایت ہے یعنی قول علیؓ ہے۔ موقوف سے شرطیت ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ ظنی ہے اور قول ہے۔ مجمع الانھارج جلد ۱ صفحہ ۱۰۹ حنفیہ کی معتبر کتاب میں قول علیؓ سے شرط مصر ثابت کرنے پر یہ لکھا ہے "لکن ھذا مشکل بالله یلدما شرط الذی ھو فرض لا یثبت الا بقطعی" یعنی یہ بہت ہی مشکل اور دشوار بات ہے کیونکہ شرط فرض کی جو فرض ہے وہ قطعی دلیل کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتی۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ قرآن کی آیت عام ہے اور قول علی خاص ہے یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد ظنی ہوتی ہے، اور ظنہ سے قرآن کے عام حکم کی تخصیص کرنا اصول فقہ کی رو سے جائز نہیں ہے۔ تاریخ جو اصول فقہ کی معتبر کتاب ہے یہ لکھا ہے "لا یجوز تخصیص الکتاب بخبر الواحد لان خبرالواحد دون الکتاب ولانه ظنی والکتاب قطعی فلا یجوز تخصیصه لان التخصیص تغییر وتغییر الشئی لایکون الابمایسا ویه اویکون فوقه" یعنی خبر واحد سے کتاب اللہ کے عام حکم کو خاص کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ خبر واحد کا درجہ کتاب اللہ سے کم ہے۔ کیونکہ وہ ظنی ہے اور قرآن قطعی ہے ۔پس ظنی سے قطعی کی تخصیص جائز نہیں ہے کیونکہ تخصیص تغیر ہے یعنی حکم کو بدلنا ہے اور کسی حکم یقینی کو بدلنا ایسی دلیل سے ہوسکتا ہے جو اس کے مساوی ہو یا اس سے اوپر درجہ رکھتی ہو۔ خبر واحد ظنی نہ قرآن کے برابر ہے نہ اس سے فائق ہے تو خاص کرنا اس سے ناجائز ہوا۔

افسوس ہے کہ یہ مقلدین اصول بنا کر پھر اس کے خلاف کر رہے ہیں۔ "کبر مقتا عنداللہ ان تقولوا مالا تفعلون"۔ یعنی ایسے لوگوں پر خدا تعالیٰ کا بڑا غضب ہے جو ایک بات کہتے ہیں اور پھر اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ یہ قول حنفیہ کے نزدیک متروک العمل ہے۔ بائیں طور کہ ردالمختار جلد ۱ صفحہ ۵۲۷ میں ہے کہ جس گاؤں میں امام کے حکم سے مسجد بنائی جاوے اور اس نے جمعہ کی اذان دی ہو تو وہاں تمام ائمہ کے نزدیک جمعہ درست ہے۔ اب شہر کی شرط کہ وہاں بازار وغیرہ ہوں لغو ہو گئی۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ علامہ حنفی نے عینی شرح بخاری صفحہ ۲۶ میں لکھا ہے کہ اگر خلیفہ اسلام کسی گاؤں میں اپنا خلیفہ بھیج دے کہ وہ حدود وقصاص جاری کرے تو وہ گاؤں شہر ہو جائے گا جس میں جمعہ پڑھنا درست ہوگا اور جب نائب کو معزول کر دے گا تو وہ گاؤں بن جاوے گا، پس اصل شرط خلیفہ یا اس کے نائب کی قرار پائی۔ شہر کی شرط لغو ہو گئی۔ اس لیے ہدایہ میں شہر کی تعریف یہ لکھی ہے کہ مصر وہ موضع ہے جہاں امیر ہو اور قاضی جو حدود وغیرہ جاری کرے۔ اس تعریف کی رو سے شہروں میں بھی جمعہ جائز نہ ہوا، اور نہ قصبوں میں۔ کیونکہ شرعی حکومت کسی جگہ قائم نہیں، اور نہ اسلامی آئین نافذ ہے اور نہ حدود جاری ہیں تو جمعہ کو ادا کرنا ہر جگہ ناجائز ہوا۔ حالانکہ خود مفتی اور دیگر احناف شہروں اور قصبوں میں

فرضی جمعہ پڑھ رہے ہیں۔

ساتواں جواب یہ ہے کہ قول علی میں مصر کی شرط کا ذکر ہے اور حنفیہ نے فنا مصر کو بھی شامل کر لیا حالانکہ فنا مصر کا کوئی ذکر نہیں ہے اور یہ قول علیؓ کے خلاف ہے۔

آٹھواں جواب یہ ہے کہ عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ امام جہاں اتر پڑے وہاں جمعہ ہو سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں تلخیص الحبیر صفحہ ۱۳۲ میں ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ” خلیفہ ایک بار جنگل میں سویدا میں اترے تھے جمعہ کا دن آ گیا لوگوں نے آپ کے لیے جمعہ کا انتظام کیا، بطحا وادی میں جگہ تیار کی، پھر اذان ہوئی تو آپ نکلے اور خطبہ پڑھا اور دو رکعتیں بلند قرائت سے پڑھائیں پھر لوگوں کو خطاب کیا تو فرمایا” الامام یجمع حیث کان“ کہ امام جہاں ہو جمعہ پڑھے۔ اس سے شہر کی شرطیت باطل ہوئی۔

قوم اوڈ خانہ بدوش جنگلوں میں جہاں ڈیرہ جما لیتے ہیں جمعہ پڑھ لیتے ہیں۔ بندہ نے اوڈوں کے ڈیروں پر جمعہ پڑھایا ہے اور مولانا عبداللہ مرحوم رئیس قوم اوڈ جو مولانا عبدالستار صاحب محدث دہلوی، غفراللہ لہ کی طرف سے والی الجماعۃ تھے اوڈوں کو ان کے ڈیرے میں تبلیغ کرتے اور جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ احکام کی تعمیل اور وعظ و تذکیر فرمایا کرتے تھے۔

نانواں جواب یہ کہ قول علیؓ اپنے مافوق قول حضرت عمر فاروق خلیفہؓ کے فرمان کے معارض ہے جو تلخیص صفحہ ۱۳۳ میں ہے۔” عن ابی ھریرۃ ان عمر کتب الیھم ان جمعوا حیث ما کنتم“ یعنی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کی جماعت کی طرف یہ حکم لکھ بھیجا کہ تم جہاں کہیں رہو جمعہ ضرور پڑھو۔ اس سے شہر کی شرط باطل ہوئی کیونکہ حضرت عمر خلیفہ درجہ دوم ہیں اور حضرت علی درجہ چہارم ہیں اس لیے امام ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ حنفیہ نے اور ائمہ محدثین نے آنحضور ﷺ کے بعد درجہ فضیلت حضرت ابو بکرؓ کو دیا ہے پھر حضرت عمرؓ کو پھر حضرت عثمانؓ کو اور پھر حضرت علیؓ کو دیا ہے۔ شرح فقہ اکبر کا صفحہ ۷۵ ملاحظہ ہو لکھا ہے” وقد جمعوا علی فضیلتہ و حقیۃ خلافتہ“ یعنی حضرت عمر کی سب امت پر فضیلت ہونے اور ان کی خلافت کے حق ہونے پر امت محمدیہ کا اجماع ہے۔ نیز ملا علی قاری نے یہ حدیث لکھی ہے ”ان الحق یجری علی لسان عمر“ یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کی زبان پر حق جاری ہے صفحہ ۷۷ میں لکھا ہے ” ولا

یخفی ان تقدیم علی علی الشیخین مخالف لمذھب اھل السنۃ والجماعۃ علی ماعلیہ جمیع اھل السلف ”یعنی مخفی نہ رہے کہ حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ پر مقدم کرنا تمام اہل سنت والجماعت اور تمام اہل سلف کے خلاف ہے جب یہ ثابت ہوا کہ درجہ فاروقؓ کا فائق اور حق و باطل میں فارق ہے تو جمعہ کے لیے شہر کی شرط باطل ہوئی۔ اور فاروقی حکم نافذ ہوا کہ جہاں کہیں اہل ایمان ہوں جمعہ پڑھا کریں۔

دسواں جواب یہ کہ بخاری شریف کے صفحہ ۱۳۴ جلد ا میں ہے کہ حضرت انسؓ نے زاویہ میں جو بصرہ کے قریب ایک جگہ ہے اپنے غلام کو حکم دیا۔ پس اپنے اہل اور بیٹوں کو جمع کر کے نماز عید پڑھی۔ ”صلی کصلوٰۃ اھل المصر وتکبیر ھم“ یعنی شہر والوں کی طرح نماز عید پڑھی اور انہی کی طرح تکبیریں کیں۔

اور کتب فقہ میں صاف لکھا ہے کہ جمعہ اور عید کی ایک ہی شرطیں ہیں۔ جب عید ایک بستی زاویہ میں پڑھی گئی تو جمعہ بھی جائز ہے۔ پس شہر کی شرط بہر حال باطل ہوئی۔ مقلدین احناف کی کوئی بات معقول نہیں ہے۔ ادھر تو بادشاہ ہونے اور شہر ہونے کی شرط اس لیے ضروری کہتے ہیں کہ جماعت زیادہ ہو۔ اور کوئی نزاع نہ پیدا ہو۔ اور ادھر یہ کہتے ہیں کہ جمعہ کی نماز کے لیے جماعت شرط ہے۔ اور وہ کم از کم تین چار آدمی شرط ہیں۔ جب تین آدمی جمعہ کی شرط قرار پائی تو شہر کی شرط بے کار ہو گئی۔ اب جہاں تین چار مسلمان ہوں جمعہ پڑھ لیا کریں کہ یہ درست ہے۔

گیارہواں جواب یہ کہ جس روایت میں قول علیؓ کا ذکر ہے یہ طبقہ ثالثہ کی ہے چنانچہ درایہ تخریج ہدایہ بر حاشیہ صفحہ ۱۶۸ میں ہے ”روی عبدالرزاق عن علی موقوفا لاتشریق ولا جمعۃ الافی مصر جامع واسنادہ صحیح“ یعنی حضرت علیؓ سے موقوف روایت ہے کہ عید اور جمعہ جامع شہر کے بغیر پورے نہیں ہوتے یہ روایت مصنف عبدالرزاق کی ہے اور عبدالرزاق طبقہ ثالثہ کی کتاب ہے۔

(ملاحظہ ہو عجالہ نافعہ صفحہ ۷)

اس طبقہ کی کتابوں کی روایتوں پر لکھا ہے۔ ”واکثر آں احادیث معمول بہ نزد فقہا نشدہ اند بلکہ اجماع بر خلاف آنہا منعقد گشتہ“۔ یعنی اس طبقہ

کی اکثر حدیثیں فقہا اسلام کے نزدیک معمول بہ نہ تھیں بلکہ اجماع ان کے خلاف منعقد ہوا کہ یہ قابل عمل نہیں ہیں۔

بارہواں جواب یہ ہے کہ قول علی کا یہ ہے کہ اس قول کا راوی عبدالرزاق ہے اور عبدالرزاق شیعہ ہے اور شیعہ کا یہ مذہب ہے کہ جمعہ شہر میں ہونا چاہیے پس جس راوی کی روایت اس کے مذہب کے موافق ہو اور وہ دیگر دلائل عامہ کے خلاف ہو تو اس کو قبول نہ کیا جاوے گا۔ مشکوٰۃ کے مقدمہ عبدالحق محدث دہلوی کے صفحہ ۵ میں ہے "وحدیث المبتدع مردود عند الجمہور" یعنی جمہور محدثین نے اہل بدعت فرقہ کے راویوں کی روایتوں کو مردود قرار دیا ہے۔ پھر اختلاف ذکر کر کے لکھا ہے "والمختار انہ ان کان داعیا الی بدعتہ ومروجالہ رد" یعنی پسندیدہ بات یہ ہے کہ اگر اس کی روایت بدعت کی طرف مدعی ہو اور اس کو رواج دے تو رد کی جاوے گی۔ پھر لکھا ہے "وان لم یکن کذالک قبل الاان یروی شئیا یقوی بدعتہ مردود قطعا" یعنی اس بدعتی راوی کی روایت بدعت کی طرف داعی نہ ہو تو وہ قبول کی جاوے گی کیونکہ وہ ثقہ ہے مگر یہ کہ وہ ایسی چیز کو روایت کرے کہ اس کی بدعت کو تقویت دیتی ہو تو وہ قطعاً مردود ہے۔ کیونکہ یہ روایت شیعہ مذہب کو تقویت دیتی ہے لہٰذا یہ مردود ہے۔

تیرھواں جواب یہ ہے کہ اس کی موقوف سند جس کو بعض نے صحیح قرار دیا ہے اس کا پہلا راوی عبدالرزاق ہے جو شیعہ ہے اور اخیر عمر میں نابینا ہو کر اپنی حالت سے بدل گیا تھا (ملاحظہ ہو تقریب و مقدمہ فتح الباری صفحہ ۴۸۹)۔

حضرت علیؓ کی اس روایت میں ایک راوی ابو عبدالرحمٰن سلمی ہے جس کا نام عبداللہ بن حبیب ہے امام ابو حاتم فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے اس کی روایت ثابت نہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۱۵۴) پس روایت ☆ علیؓ والی مخدوش ہے۔ اور حضرت عمرؓ کا حکم فائق ہے کہ جمعوا حیث ما کنتم جس کا معنی امام شافعی نے یوں کیا ہے "فمعناہ فی ای قریۃ کنتم لان مقامھم من البحرین انما کان فی القریٰ" یعنی اس کا معنی ہے کہ جس گاؤں میں تم ہو وہاں ہی جمعہ پڑھ لیا کرو۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ سائل کا مقام بحرین کی بستیوں میں کسی بستی میں تھا وہاں جمعہ پڑھنے کا حکم دیا گیا تو جمعہ بستیوں میں درست ہوا۔

چودہواں جواب یہ ہے کہ یہ روایت طبقہ ثالثہ کی ہے مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اس طبقہ میں مصنف عبدالرزاق کو شمار کیا ہے۔ طبقہ ثالثہ کی بابت لکھا ہے "اکثر آں احادیث معمول بہ نزد فقہا نشدہ اند بلکہ اجماع بر خلاف آں منعقد گشد (عجالہ نافعہ صفحہ ۷) یعنی اس طبقہ کی اکثر حدیثیں معمول بہا نہیں ہیں بلکہ اجماع ان کے خلاف منعقد ہو چکا ہے۔ لہٰذا قول علیؓ حجت نہیں ہے۔

پندرہواں جواب یہ ہے کہ منتقی میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کا حج تمتع اور قرآن کی بابت حکم سنا کہ وہ منع کرتے ہیں حضرت علیؓ نے دونوں کا احرام باندھ کر حضرت عثمانؓ کا خلاف کیا اور کہا "ماکنت لادع سنته النبی ﷺ بقول احد" کہ میں سنت نبوی کو کسی کے قول کے مقابلہ میں نہیں چھوڑ سکتا۔

جب حضرت علیؓ نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی ان کے قول کے مقابلہ میں فرمان نبویؐ نہیں چھوڑ سکتے کہ حکم عام ہے "رواح الجمعة واجب علیٰ کل محتلم" یعنی جمعہ کو جانا ہر بالغ پر فرض ہے۔

(نسائی کتاب الجمعۃ صفحہ ۱۶۱)

سولہواں جواب یہ کہ قول علیؓ متروک الظاہر ہے کیونکہ بظاہر جمعہ اور عید کی نفی ہے کہ یہ دونوں دن مصر میں نہیں آئے حالانکہ سب ایام ہفتہ اور اتوار کے شہروں میں اور دیہات میں یکساں وارد ہوتے ہیں تو نماز جمعہ یا نماز عید یا تکبیریں ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ خلاف ہے جو مخدوش ہے۔

سترہواں جواب یہ ہے کہ یہ قول تعامل صحابہؓ کے خلاف ہے کیونکہ عہد نبویؐ میں صحابہ کرام نے جواثا میں جمعہ پڑھا جو بحرین کی بستیوں سے ایک بستی مشہور ہے اور خلفاء راشدین کے وقت اہل سباہ نے پڑھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے جمعہ کسی مقام پر ممنوع نہیں۔

اٹھارہواں جواب یہ ہے کہ لا جمعۃ میں لام نفی کمال کا ہے نفی جنس کا نہیں ہے جس کا مطلب ہے کہ پورے ثواب اور اجر والا جمعہ شہروں میں ہوتا ہے کیونکہ وہاں جماعت کثیر ہوتی ہے اور جس نماز میں خواہ وہ ظہر ہو یا عصر یا جمعہ کی ہو لوگوں کی کثرت ہوگی ثواب زیادہ ملے گا۔

انیسواں جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کا یہ حکم سیاسی تھا کیونکہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بغاوت پھیلی ہوئی تھی اور فسادات شروع تھے انہوں نے جمعہ اور عید کا حکم شہروں میں فرمایا تا کہ شہروں سے باہر دیہات میں کوئی شخص باغیانہ تقریریں خطبوں میں نہ کر سکے اور سب شہروں میں حاضر ہو کر حکام اسلام کے احکام سنیں، جیسے عہد نبویؐ میں مدینہ میں اہل عوالی حاضر ہو کر جمعہ پڑھا کرتے تھے تا کہ نئے احکام جو حیات نبوی میں نازل ہوتے تھے ان کا علم حاصل کریں نیز مسجد نبوی میں ہزار جمعہ کا ثواب ملے اور نماز اقتداء نبوی میں اجر وثواب میں بڑھ جائے پھر ہر ہفتہ زیارت نبوی سے فیض یاب ہوں۔ اسی سے حضرت علیؓ نے اجتہاد کیا کہ کمال جمعہ کا شہر میں ہے اور یہ ہرگز مراد نہیں کہ جمعہ شہر کے بغیر صحیح اور درست نہیں ہے کہ یہ خلاف نصوص ہے۔

بیسواں جواب یہ ہے کہ یہ قول علیؓ کسی حدیث نبوی کے موافق نہیں ہے بلکہ خلاف ہے کیونکہ حدیث صحیح میں ہے ''الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة الاالاربعة مملوك او امراة او صبي او مريض'' یعنی ہر مسلمان پر جماعت میں جمعہ حق اور فرض ہے لیکن غلام، عورت، مسافر، بیماران چاروں کو جو معذور ہیں معاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کو بھی جمعہ پڑھنا منع نہیں ہے اگر یہ سب لوگ پڑھ لیں گے تو منع نہیں ہے۔ چنانچہ قدوری صفحہ ۲۹ باب صلوٰۃ الجمعہ میں ہے ''فان حضروا وصلوا مع الناس اجزاهم عن فرض الوقت'' یعنی اگر غلام، عورت، بیمار اور لڑکا جمعہ میں حاضر ہو کر جمعہ پڑھ لیں تو یہ جائز ہے ان کو فرض وقتی سے کفایت کرے گا۔ ظہر نہ پڑھنی پڑے گی جمعہ کا اجر وثواب حاصل ہو جائے گا۔

یہ دلیل عام ہے کہ ہر مسلمان پر جمعہ فرض ہے جس سے دیہات مستثنیٰ نہیں ہیں۔

وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور جلد ۲۶ شمارہ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰۔

مورخہ ۴، ۱۳، ۲۰، ۲۷، ۱۲ اپریل و ۶، ۱۵ جون و ۲۰، ۲۷ جولائی و ۱۰، ۱۷، ۱۱ اگست ۱۹۷۳ء۔

مستورات پر نماز جمعۃ المبارک

سوال: مکرم ومحترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دو مسئلے بھیج رہا ہوں، براہ کرم ان کو قرآن وسنت کی روشنی میں واضح فرمائیں۔

(1) مستورات کو جمعہ کے دن مسجد میں جانے کا کیا حکم ہے؟ احناف کہتے ہیں کہ جمعہ مستورات پر فرض نہیں ہے معاف ہے اگر وہ پڑھیں گی تو وہ نماز نفل ہوگی۔ جس سے ظہر ان کے ذمہ سے ساقط نہ ہوگی۔ اس لئے فرض نماز اپنے گھر چھوڑ کر نماز جمعہ نفلی کیلئے اگر مسجد میں جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔

اب آپ دلائل سے واضح فرمائیں کہ مستورات کیلئے فرض جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جمعہ پڑھ لیا جائے تو فرض ادا ہو گیا یا نماز ظہر پڑھنی پڑے گی؟۔

سائل محمد رمضان

کھڈ محمدی ڈیپلو ضلع تھرپارکر سندھ۔

الجواب بعون الوھاب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ رب العالمین امابعدفاقول و باللہ التوفیق۔

جواب: واضح ہو کہ اہل حدیث اور احناف کا یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ لڑکے، عورت، غلام، مریض، مسافر پر جمعہ فرض نہیں ہے لیکن اگر یہ پانچوں نماز جمعہ پڑھ لیں گے تو ان کے ذمہ سے فرض وقتی ظہر ساقط ہو جائے گا اور جمعہ فرض ظہر کی جگہ کفایت کر جائے گا۔ اور نماز ظہر ان کو ادا نہ کرنی پڑے گی۔ چنانچہ حنفی مذہب کی معتبر کتاب ھدایۃ جس کو وہ مثل قرآن اور دیگر کتب کا ناسخ تصور کرتے ہیں، اس میں یہ لکھا ہے کہ "ولا تجب الجمعة على مسافر ولا امراة ولا مريض ولا عبد ولا الاعمى (الىٰ قوله) فان حضروا فصلوا مع الناس اجزاهم عن الوقت" جلد ا صفحہ ۱۲۹۔

بلکہ اسی صفحہ پر یہ لکھا ہے "ويجوز للمسافر والعبد والمريض ان يوم الجمعة" یعنی نماز جمعہ نہ مسافر پر فرض ہے اور نہ عورت پر اور نہ بیمار پر اور نہ غلام پر اور نہ

نا بینے پر۔ لیکن اگر یہ سب جمعہ میں حاضر ہو جائیں تو ظہر وقتی فرض کی جگہ نماز جمعہ کفایت کر جائے گی بلکہ اگر مسافر یا غلام یا بیمار جمعہ میں امامت کرا کر ان لوگوں کو نماز جمعہ پڑھا دیں جن پر جمعہ فرض ہے تو یہ بھی درست ہے' اور اگر کسی جگہ صرف یہی معذور لوگ ہوں تو ان کے ساتھ امام جمعہ ادا کر سکے گا (ہدایہ صفحہ ۱۷۰)۔ نیز اسی صفحہ میں لکھا ہے کہ ان معذوروں کی مثال اس مسافر کی ہے جس پر سفر میں روزہ فرض نہیں ہے لیکن اگر اس نے رمضان میں روزہ رکھ لیا تو اس کا فرض ادا ہو جائے گا۔

آج کل کے بعض لاعلم لوگ منہ سے حنفی بنتے ہیں مگر حنفی مذہب کی ان کو کچھ خبر نہیں ہے اور وہ خود مقلد ہو کر مجتہد بنتے ہیں۔ اور بغیر ثبوت کے اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہیں جس سے خود گمراہ ہو کر دوسرے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

عہد نبویؐ میں عورتیں جمعہ پڑھتی تھیں۔

(فتح الباری صفحہ ۴۶۵ پ ۱۰) اور تلخیص الحبیر صفحہ ۱۳۳ اور نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۲۳۳ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضورﷺ نے ہجرت سے پہلے جمعہ پڑھنے کا اذن دیا اور حکم لکھا:۔

فکتب الی مصعب بن عمیر اما بعد انظر ۳ الیوم تجھر فیه الیھود بالزبور فاجمعوا نساء کم و ابناء کم فاذا مال النھار عن شطرہ عند الزوال من یوم الجمعة فتقربوا الی اللہ برکعتیں"

یعنی نبی کریمؐ نے اپنے مبلغ اور نائب مصوب بن عمیرؓ کو مدینہ طیبہ میں یہ تحریر فرمایا کہ تم اپنے مقام مدینہ میں دیکھو کہ یہود نا مسعود کتاب الٰہی زبور کی اشاعت کر رہے ہوں گے لہٰذا تم بھی اپنے لوگوں' مردوں' عورتوں' لڑکوں کو جمعہ کے دن جمعہ کر کے زوال کے وقت دو رکعتیں نماز پڑھاؤ چنانچہ حضرت مصعب نے حسب الحکم نبویؐ مدینہ میں جمعہ قائم کر دیا۔ یہاں تک کہ آں حضورﷺ ہجرت کر کے تشریف لے آئے تو آنجناب نے حسب دستور جمعہ شروع کر دیا۔

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ جمعہ میں عورتیں اور لڑکے بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ گو ان پر فرض نہ تھا۔

کشف الغمہ جلد ۱ صفحہ ۱۴۳ میں ہے:۔ وفی روایة من اتی الجمعة من

الرجال والنساء فليغتسل۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ جمعہ کے دن جو مرد اور عورتیں نماز جمعہ میں حاضر ہوں ان کو چاہیئے کہ غسل کر کے آئیں۔اس روایت سے بھی عورتوں کیلئے غسل کر کے جمعہ میں حاضر ہونے کی اجازت ہے۔اور سب مرد عورتوں کو جو جمعہ کی نماز میں حاضر ہوں غسل کرنا ضروری ہے۔

نیز کشف الغمہ جلد ا صفحہ ۱۴۹ میں ہے:۔وانفضوامرة في اثناء الصلوٰة الا اثني عشر رجلا وامراة۔

یعنی ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ صحابہ کرام آنحضور ﷺ کو خطبہ نماز کی حالت میں کھڑے چھوڑ کر اور تاجروں کا گھڑیال سن کر اناج خرید نے چلے گئے۔صرف بارہ مرد اور ایک عورت باقی رہ گئے تھے (اگر یہ بھی چلے جاتے عذاب الٰہی آ جاتا) اس پر قرآن میں سورہ جمعہ کی آخری آیت نازل ہوئی تو پھر کبھی نہ گئے۔

اس واقعہ سے بھی ثابت ہوا کہ عورت عہد نبویؐ میں جمعہ میں شریک ہوا کرتی تھی۔دیگر یہ کہ مشکوٰۃ باب الخطبہ میں حدیث ہے جس میں حضرت ہشام بنت حارثہ کا بیان ہے:۔

"ماا خذت ق والقرآن المجيدالاعن لسان رسول الله ﷺ بقرء ها ها كل جمعة على المنبراذاخطب الناس" (رواہ المسلم)۔

یعنی نہیں سیکھی میں نے سورۃ قٓ القرآن المجید مگر زبان رسول اللہ ﷺ کی سے۔ کیونکہ آپ ہر جمعہ کو منبر پر یہ خطبہ پڑھا کرتے تھے جبکہ لوگوں کو خطبہ سنایا کرتے تھے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ام ہشام جمعہ میں شریک ہوا کرتی تھیں اور آنجناب جو ہر جمعہ میں اس سورہ کی تلاوت کرتے تو ام ہشام اس کو یاد کر لیا کرتی تھیں ورنہ گھر بیٹھے سن کر یاد کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس زمانہ میں لاؤڈ سپیکر نہ تھا کہ اس کے ذریعے سن کر یاد کر لی ہو۔فتذکر۔

دیگر یہ کہ بموقع حج دربار الٰہی میں جب حجاج پیش ہوتے ہیں تو سب کے سر ننگے ہوتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ننگے سر نماز ہو جاتی ہے اسی طرح حج کے موقع پر سب عورتیں بیت اللہ میں مردوں کے ساتھ فرضی جمعہ پڑھتیں ہیں اس تعامل پر عہد نبویؐ سے لے کر اب تک کسی عالم بامر اللہ نے انکار نہیں کیا۔اسی طرح مسجد نبویؐ کی اقتداء

میں نماز جمعہ فرضی پڑھتے ہیں۔

لیکن عورتوں کو کسی نے نہیں حکم دیا کہ یہ ان کی نفل نماز ہوئی ہے اب ان کو ظہر وقتی ادا کرنی چاہیئے تو اس سے اجماع امت ثابت ہو گیا۔

اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ عورتیں جمعہ پڑھیں تو ان کا نفل ہو گا۔ فرض ظہر ان کو دوبارہ ادا کرنا پڑے گا۔ یہ سراسر باطل ہے اور ایسا شخص خارق اجماع امت اور صاف گمراہ اور بدعتی ہے۔ مسلمانوں کو اس کی بات ہرگز نہ ماننی چاہیئے۔ ورنہ جو لوگ ایسے بے علم مولویوں کی بات مانیں گے وہ گمراہ ہو جائیں گے۔

نیز بخاری شریف میں حدیث ہے کہ ایک عورت نے آنحضورﷺ کا حال دیکھ کر کہا کہ "الا اجعل لك شئیا تقعد علیه" آپ کو خطبہ جمعہ میں بیٹھنے سے تکلیف ہوتی ہے کیا میں آپ کیلئے کوئی ایسی چیز نہ بنوا دوں کہ آپ اس پر تشریف رکھا کریں تب آپ نے فرمایا "ان شئت فعلت المنبر" اگر تو چاہے تو منبر بنوا دے۔ تب اس نے منبر بنوا دیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ جمعہ کے دن عورتیں آ کر حال بیٹھنے کھڑے ہونے کا دیکھتی تھیں۔

خلاصہ یہ کہ عورتوں کا جمعہ میں آنا اور جمعہ پڑھنا جائز ہے۔ مسلم شریف میں حدیث ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا "لا تمنعوا النساء حظوظھن من المساجد اذا استاذنتکم" یعنی تم عورتوں کو مسجدوں سے اپنا حصہ لینے سے نہ روکو جبکہ وہ تم سے اذن حاصل کریں تو اذن دے دو۔

بخاری شریف کی حدیث ہے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک بار آنحضورﷺ نے عشاء کی نماز پڑھانے میں دیر کر دی تو حضرت عمرؓ نے آپ کو آواز دی کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ عورتوں اور بچوں کو نیند آ گئی ہے۔ تب آپ تشریف لائے اور نماز پڑھا دی۔ اس سے بھی ظاہر ہوا کہ مسجد میں عورتیں اور بچے آ کر جماعت سے نمازیں پڑھتے تھے۔ اسی طرح جمعہ بھی جائز ہے۔

بخاری میں ایک اور حدیث ہے جو حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں "ان النساء فی عهد النبیﷺ کن اذا سلمن من الکتوبة قمن وثبت رسول

الله ﷺ ومن صلی من الرجال ماشاء الله فاذاقام رسول الله ﷺ قام الرجال" (بخاری)۔

عورتیں عہد نبویؐ میں سلام پھیرتے ہی فوراً چلی جاتی تھیں۔ اور آنحضور ﷺ اور لوگ کچھ دیر ٹھہرے رہتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوتے تو لوگ بھی آپ کے ہمراہ کھڑے ہو جاتے تھے۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ عورتیں مسجد میں آ کر نماز پڑھتی تھیں اور وہ فرض نماز سے سلام پھیرتے ہی چلی جاتی تھیں اور آنحضور ﷺ اور لوگ عورتوں کے جانے کے بعد جایا کرتے تھے۔

ہدایہ کے حاشیہ کفایہ میں ہے "اما صلوٰۃ الجمعۃ فقد ذکرہ شیخ من قبعد صلوٰۃ العیدین حتیٰ یباح من الخروج الیھا بالاجماع" (کفایہ صفحہ ۶۷ مطبوعہ احمدی) یعنی نماز جمعہ کا حکم عیدین کا سا ہے کہ عورتوں کو جمعہ کی نماز کیلئے جانا بالاجماع مباح ہے۔

حدیث وفقہ اور اجماع علماء کے ثبوت کے بعد اب جو شخص انکار کرے گا وہ سراسر گمراہ ہے۔

از جناب مولانا عبدالقادر صاحب عارف حصاری
تنظیم اہلحدیث لاہور ۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء۔

خطبہ جمعہ میں ادائیگی نماز

اخبار اہل حدیث سوہدرہ مطبوعہ یکم اکتوبر ۶۲ء کے صفحہ ۱۱ پر ایک سوال لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ خطبہ کے دوران میں سنتیں پڑھنی کیسی ہیں اور کتنی پڑھنی چاہیے؟ اس کا جواب یہ ارشاد ہوا کہ بہتر یہی ہے کہ آرام سے بیٹھ کر خطبہ وغیرہ سن لیں کیونکہ خطبہ کو دو فرض کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور سکون سے نماز بھی ادا نہ ہو سکے گی' فرض جمعہ کے بعد سنتیں پڑھ لے (تا آخر) علماء کا فرمان ہے' کہ وہ صحابی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کے عادی تھے' اس لیے اجازت ملی:۔

علامہ سندھی نے اپنی تعلیق علی ابن ماجہ جلد ا صفحہ ۳۴۳ میں آپ کے جواب کی تردید کردی ہے' فرماتے ہیں "ویردہ حدیث اذا جاء احد کم والامام یخطب فلیصل رکعتین او کما قال وھو حدیث صحیح اخرجہ مسلم وغیرہ فیہ اذن فی الرکعتیں حال خطبۃ الامام" (تعلیقات سلفیہ صفحہ ۱۶۵ جلد ا) یعنی خطبہ جمعہ کی حالت میں نماز کے عدم جواز کے مسئلہ کو یہ حدیث قولی رد کرتی ہے کہ آنحضورﷺ نے فرمایا جب تم خطبہ جمعہ کے دوران آؤ تو دو رکعت پڑھ لو' اس حدیث میں خطبہ کی حالت میں دو رکعت پڑھنے کا اذن ہے' نیز تعلیقات سلفیہ میں یہ منقول ہے کہ "وقال (ای السندی) فی الحجۃ (صفحہ ۲۹ جلد ۲) ولا تغتر فی ھذہ المسئلۃ بما یلھج بہ اھل بلدك فان الحدیث صحیح واجب اتباعہ "یعنی اس مسئلہ میں اہل شہر کے مخالفانہ جمود سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے کیونکہ حدیث صحیح وارد ہے' جس کی اتباع واجب ہے علامہ سندھی حنفی بزرگ ہیں جو تقلید پر جمود نہیں رکھتے سلفی حنفیہ کی طرح انصاف پسند ہیں' اگر حنفی مذہب کا مسئلہ خلاف حدیث ہو تو اس کو رد کر دیتے ہیں' جس کے بہت سے نظائر ان کی تالیفات میں موجود ہیں' ان میں سے ایک یہ مسئلہ ہے کہ خطبہ کی حالت میں نماز تحیۃ المسجد جائز ہے یا نہیں' حنفیہ نا جائز کہتے ہیں علامہ سندھی فرماتے ہیں' یہ بات بروئے حدیث صحیح مردود ہے" میں کہتا ہوں کہ یہ دو رکعت تحیۃ المسجد کی ہو یا سنۃ الجمعہ ہوں' جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ نے منتقی میں فرمایا ہے کہ احادیث صحیحہ کی رو سے پڑھنا جائز اور مشروع ہے' اس بارہ میں حدیث قولی بھی وارد ہے اور حدیث فعلی بھی وارد ہے' نسائی میں اس مسئلہ پر باب باندھ کر پھر یہ حدیث لکھی ہے کہ ایک شخص اس حال میں آیا کہ آنحضورﷺ منبر پر خطبہ فرما رہے ہیں' آپ نے اس سے

دریافت کیا کہ تم نے دو رکعت نماز ادا کرلی ہے اس نے کہا کہ نہیں آپؐ نے فرمایا فارکع یعنی دو رکعت ادا کر جب صریح حدیث موجود ہے تو پھر آپ کا یہ کہنا آرام سے بیٹھ کر خطبہ سننا چاہیے' سراسر غلط ہوا' جس کی شرع میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

یہ آپ نے عجیب فرمایا کہ خطبہ دو رکعت کے قائم مقام ہے' اس کو سننا چاہیے' جب نص وارد ہو چکی تو آپ کو اس قیاسی دلیل کے پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بے شک خطبہ قائم مقام دو رکعت ہے مگر تمام احکام میں قائم مقام نہیں ہے اس کے احکام علیحدہ ہیں ورنہ خطبہ فوت ہونے پر اور دو رکعت نماز جمعہ میں شامل ہونے پر دو رکعت کی قضا واجب ہو گی' حالانکہ اس کے اہل حدیث قائل نہیں' تو پھر اس قیاس سے کیا فائدہ ہے؟ پھر آپ نے حدیث کے اطلاق کو علماء کے قول سے مقید کرنے کی ناجائز سعی کی ہے' حالانکہ قول کسی حدیث عام کا مخصص اور مطلق کا مقید ہرگز نہیں ہو سکتا۔ امام سفیان یا امام احمد حدیث "لا صلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب" یعنی فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی کی بابت یہ کہہ دیں کہ "ای من یصلی وحدہ' یعنی یہ اکیلے کے لیے حکم ہے تو کیا آپ اس کو تسلیم کرلیں گے' ہرگز نہیں' تو اس بارہ میں آپ علماء کی قید اختراعی سے حدیث مطلق کو مقید کریں' تو یہ کہاں کا انصاف ہے' پھر فقہاء صحابہ میں سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا اس پر عمل مشہور ہے جو بڑے پکے اہلحدیث تھے' اور ان کے خلاف کسی صحابی کا عمل صریح طور پر ثابت نہیں ہوا۔

محدثین نے کتب حدیث میں اس مسئلہ پر باب باندھ کر اس کا مشروع ہونا ثابت کیا ہے' اور آپ اہل رائے کا مسلک اپنا رہے ہیں جو شان اہل حدیث کے خلاف ہے' امام ترمذی نے باب باندھا ہے "باب فی الرکعتین اذاجاء الرجل والامام یخطب" پھر اس کے تحت حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ اور مروانؓ کے خطبہ کا واقعہ لکھا ہے' کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بحالت خطبہ دو رکعت پڑھنے لگے تو سپاہی نے ان کو روکا انہوں نے فرمایا "ما کنت لاترکھما بعد شئی رائیۃ من رسول اللہ ﷺ" یعنی میں ان دو رکعتوں کو کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتا' جبکہ آنحضرت ﷺ کو دیکھ چکا ہوں کہ آپؐ نے ایک شخص کو بحالت خطبہ ان دو رکعتوں کے پڑھنے کا حکم فرمایا تھا تو اس نے دو رکعت پڑھ لی تھیں۔

امام ترمذی نے محدثین کا مذہب یہی قرار دیا ہے اور اہل کوفہ کا عمل اس کے خلاف لکھا ہے اور پھر فرمایا "والقول الاول اصح" کہ صحیح قول اول ہی ہے کہ خطبہ کی حالت میں جو شخص آئے وہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے۔ دلائل کی رو سے بھی صحیح اور راجح ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

الحدیث سوہدرہ جلد ۱۵ شمارہ ۳۰ مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۲ء۔

خطیب کا منبر پر حاضرین کو سلام کہنے کا حکم

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ خطیب نماز جمعہ اور خطبہ کیلئے جب مسجد میں داخل ہوتا ہے تو لوگوں کو سلام مسنون کہتا ہے لیکن جب خطبہ کے لئے منبر پر چڑھے تو اس وقت حاضرین کو سلام مسنون کہے یا نہ کہے؟ اس کا جواب دیا جاوے کیونکہ دیوبندی فتاوی امداد المفتین کے صفحہ ۲۵ جلد ۴ میں سائل کا سوال یہ ہے کہ خطیب منبر پر چڑھتے وقت کچھ دعا اور السلام علیکم کہہ کر منبر پر بیٹھتا ہے' کیا یہ فعل موافق شریعت کے ہے؟ اس کا جواب مفتی دیوبند نے یہ دیا ہے کہ خطبہ کیلئے منبر پر چڑھنے کے وقت السلام علیکم وغیرہ کہنا نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ سے کہیں منقول نہیں ہے اس لئے اس کا ترک کرنا ضروری ہے۔ صفحہ ۲۶ لہٰذا اس مسئلہ کی تحقیق کی جاوے۔ بینوا و توجروا (سائل بندہ یکے از بندگان خدا تعالیٰ)

الجواب بتوفیق الوھاب

الحمدللہ رب العالمین امابعد فاقول وباللہ التوفیق۔ واضح ہو کہ مقلدین حنفیہ کی درسگاہ اور ان کے مفتیان دین خواہ کتنی شہرت رکھتے ہوں اور علوم مروجہ عربیہ فقہ۔ منطق فلسفہ وغیرہ میں کتنے ہی ماہر ہوں لیکن علم حدیث میں بہت ہی کمزور ہوتے ہیں۔ علم فقہ حنفیہ اور کتب فقہ کی تعلیم اور مطالعہ میں ان کا اکثر شغل ہوتا ہے اس لئے مقلدین حنفیہ کی تصنیفات فتاوؤں میں مسائل پڑھ کر کبھی دھوکہ نہ کھانا چاہیئے ان کے ہر مسئلہ کو کسی محقق عالم بالحدیث سے دریافت اور تحقیق کر لینی چاہیئے۔ علامہ ابن القیمؒ جن کو علامہ ملا علی قاری نے اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے اپنی بے نظیر کتاب اعلام الموقعین کی جلد اول صفحہ ۷۶ میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن امامؒ احمد نے بیان کیا کہ میں نے اپنے باپ امام احمدؒ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شہر میں مقیم ہو جہاں ایک اہلحدیث عالم ہے لیکن وہ علم حدیث کی تحقیق میں کمزور ہو کہ صحیح اور ضعیف حدیث میں امتیاز نہ کر سکے اور وہاں دوسرا عالم اہل رائی سے ہو پھر اس شخص مقیم کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو وہ کون سے عالم سے مسئلہ کی تحقیق کرے۔ اہل حدیث سے یا اہل رائی سے۔

تو میرے والد بزرگوار امام احمدؒ نے یہ جواب دیا کہ "یئسل اصحاب

الحدیث ولا یئسال اصحاب الرائی ضعیف الحدیث اقویٰ من اھل الرائی 'اہ''یعنی اس شخص کو چاہیئے کہ اہل حدیث عالم سے مسئلہ دریافت کرے اہل رائی سے دریافت نہ کرے۔ چنانچہ جس سائل نے مفتی دیوبند سے مسئلہ دریافت کیا ہے وہ اگر کسی اہل حدیث عالم سے مسئلہ دریافت کرلیتا تو اس کو بروئے حدیث نبوی جواب صحیح دیا جاتا۔ اب اس کا جواب اہلحدیث سے سنیئے کہ خطیب جب منبر پر چڑھے تو اسے چاہیئے کہ حاضرین کی طرف متوجہ ہوکر سلام مسنون کہے جس کا ثبوت یہ ہے تلخیص الجسیر صفحہ ۱۳۶ میں امام حافظ ابن حجرؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے"وقال الاشرم حدثناابوبکربن ابی شیبۃثناابوامامۃعن مجاھد عن الشعبی قال کان رسول اللہ ﷺ اذاصعد المنبر یوم الجمعۃاقبل الناس فقال السلام علیکم۔الحدیث۔ وھو مرسل" یعنی حضرت شعبیؒ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے دن منبر پر چڑھا کرتے تھے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر السلام علیکم کہتے تھے۔اس سے ثابت ہوا کہ خطبہ جمعہ کیلئے منبر پر جب خطیب چڑھے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر سلام کہے اگر کوئی حنفی عالم یہ کہے کہ یہ حدیث تو مرسل ہے اور مرسل اقسام ضعیف سے ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ علماء دیوبند نے اصول حدیث کی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے انھاء السکن اس کے صفحہ ۳۶ پر لکھا ہے کہ مرسل روایت جوصحابہ اور تابعین سے ہو وہ مقبول ہے اور اس پر اجماع ہے' چنانچہ عبارت یہ ہے"اماالاجماع فھوان الصحابۃوالتابعین اجمعواعلی قبول المراسیل من العدل"یعنی صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے کہ اگر عادل کی طرف سے مرسل روایت آجائے تو وہ مقبول ہے اور صفحہ ۳۷ میں ہے"اجمع التابعون باصرھم علی قبول المرسل ولم یاء ت عنھم انکارہ عن احدمن الائمۃبعدھم الی راء س المائین"یعنی تابعین کا اس بات پر اجماع ہے کہ مرسل روایت مقبول ہے کسی تابعی اور امام نے اس کا انکار نہیں کیا دوسری صدی کے شروع تک یہ اجماع قائم رہا ہے اور یہ بھی صفحہ ۳۶ پر لکھا ہے۔ ہمارے حنفیہ کے نزدیک مرسل تابعی کی مقبول ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ"فقبلہ ابوحنیفۃومالک واحمد" کہ ابوحنیفہؒ اور مالکؒ اور احمد ائمہ نے مرسل روایت کو قبول کیا ہے۔...... میں کہتا ہوں کہ میری پیش کردہ روایت امام شعبی تابعی کی مرسل ہے امام شعبی کی بابت اکمال فی اسماء الرجال مترجم کے صفحہ ۶۶ میں ہے کہ

امام شعبی نے کہا کہ میں نے پانچ سو صحابہ کرام کو پایا ہے امام زھری تابعی کا بیان ہے کہ علماء اصلی چار ہیں۔ابن مسیب مدینہ اور شعبہ کوفہ میں اور امام حسن بصری بصرہ میں اور امام مکحول شام میں۔اور وہ خلافت حضرت عمرؓ میں پیدا ہوئے اور بیاسی سال کی عمر پا کر وفات پا گئے۔

میں کہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ کے اساتذہ کی فہرست پڑھ کر ان کی سوانح حیات میں دیکھو امام شعبی ان کے استاد ہیں۔انہاء السکن کے صفحہ ۳۸ پر خاص امام شعبی کی مرسل کا یہ حکم بھی ملاحظہ کر لو "قال الذهبی فی تذکرة الحفاظ قال احمد العجلی مرسل الشعبی صحیح لایکاد یرسل الا صحیحا" (جلد ۱ صفحہ ۷۰) یعنی امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ شعبی کی مرسل روایت صحیح ہوتی ہے کیونکہ وہ کسی غلط بات کو نبی کریمؐ کی طرف منسوب نہیں کرتے۔بلکہ علامہ آجری نے تو ابوداؤد سے یہ نقل کیا ہے کہ "مرسل الشعبی احب الی من مرسل النخعی" کہ شعبی کی مرسل حدیث مجھے ابراہیم نخعی کی مرسل روایت سے زیادہ محبوب ہے۔بہر کیف یہ حدیث شعبی کی مرسل مفتیان دیوبند پر مسئلہ سلام خطیب میں حجت تامہ ہے باقی رہے علماء اہلحدیث کہ ان کے نزدیک مرسل حدیث ضعیف ہے جو حجت نہیں ہے تو ان کو جواب یہ ہے کہ اس مرسل روایت کی تائید دیگر روایات سے پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہیں کہ مجمع الزوائد جلد ۲ صفحہ ۱۸۴ میں یہ باب درج ہے "باب سلام الخطیب" پھر اس کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی گئی ہے "عن ابن عمر قال کان رسول اللهﷺ اذا دخل المسجد یوم الجمعة سلم علی من عند المنبر من الجلوس فاذا صعد المنبر و توجه الی الناس فسلم علیهم" یعنی ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ جناب رسول اللہﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تو سلام کہتے اور جب منبر پر چڑھتے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر ان کو سلام کہتے تھے اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔اوسط میں اس روایت میں ایک راوی عیسیٰ بن عبداللہ انصاری ضعیف ہے۔وذکر ابن حبان فی الثقات کہ ابن حبان نے اس راوی کو ثقہ راویوں میں ذکر کیا ہے۔اور تلخیص صفحہ ۱۴۶ میں امام شافعی کے طریق سے سلمہ بن اکوع سے روایت نقل کی ہے "انه قال خطب رسول الله علی الدرجة التی تلی فل المستراح قائماً ثم سلم ثم جلس علی المستراح حتی فرغ

المؤذن من الاذان ثم قام فخطب الحديث" یعنی سلمہ بن اکوع نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب اس درجہ منبر پر کھڑے ہوتے جو اس درجہ کے متصل ہوتا جس پر بیٹھ کر آپ آرام فرماتے تھے' تو کھڑے ہو کر سلام کہتے پھر بیٹھ جاتے جب موءذن اذان سے فارغ ہوتا تو پھر خطبہ پڑھتے تھے۔

نیز امام ابن حجر نے یہ لکھا ہے "ولابن ماجة عن جابر انه ﷺ كان اذا صعد المنبر سلم۔ اسناده ضعيف" یعنی ابن ماجہ کی جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب منبر پر چڑھتے تو السلام علیکم کہتے تھے۔ اور یہ لکھا ہے "وفي الباب عن عطاء مرسلا وعن الشعبي عن النبي ﷺ وابي بكر و عمر" یعنی سلام کہنے کے بارہ میں عطاء تابعی سے بھی مرسل روایت آئی ہے اور شعبی نے نبی کریم ﷺ اور ابوبکرؓ اور عمرؓ سے بھی روایت ذکر کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ تفسیر درمنشور جلد ۶ صفحہ ۲۲۲ میں امام شعبی سے بروایت ابن ابی شیبہ مرسل روایت مذکور ہے اس کے آخری الفاظ یہ ہیں "وكان ابو بكر و عمر يفعلانه" یعنی ابوبکر اور عمرؓ ہر دو خلیفے بھی اسی طرح کیا کرتے تھے کہ منبر پر چڑھ کر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر سلام کہا کرتے تھے یہ روایت منقولہ اگرچہ فرداً فرداً ضعیف ہیں لیکن شعبی کی مرسل کی مؤید ہیں اور یہ اصول ہے کہ اگر مرسل روایت کی دیگر روایات اور تعامل صحابہ سے تائید پائی جاوے تو وہ حجت ہے اب نہ حنفیہ کو اعتراض کرنے کی گنجائش ہے اور نہ اہلحدیث کو۔ پس مسئلہ ثابت ہو گیا کہ جمعہ کے دن خطیب کو منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو سلام کہنا مسنون ہے اور مفتی دیوبند کا یہ لکھنا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام سے کہیں منقول نہیں علم حدیث کی قلت پر مبنی ہے۔ درایہ تخریج ہدایہ برحاشیہ ہدایہ صفحہ ۱۷۲ میں ہے۔

"روى عبدالرزاق عن ابن جريج عن عطاء كان النبي ﷺ اذا صعد المنبر يوم الجمعة استقبل الناس بوجهه وقال السلام عليكم ولابن ماجة عن الشعبي نحوه" یعنی عبدالرزاق نے ابن جریج سے نقل کیا کہ عطا تابعی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب منبر پر چڑھا کرتے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر سلام کہا کرتے تھے۔ ان دو مرسل روایتوں سے مسئلہ خوب ثابت ہو گیا کہ خطیب کا منبر پر کھڑے ہو کر سلام کہنا سنت

ہے۔

پس مولانا عبدالحی لکھنوی کا حاشیہ ہدایہ پر یہ لکھنا کہ اس کی کچھ اصل نہیں ہے سراسر باطل ہے چنانچہ عبارت یہ ہے "الثانی جری الرواج فی زماننا ان الامام یسلم علی القوم حین یرقی علی المنبر وھو امر لا اصل له وقد ورد الاحادیث بعض ذالك فانها ضعیفة کماذکره الزیلعی" یعنی دوسری یہ بات بدعت ہے جو ہمارے زمانہ میں رواج ہے کہ امام جب منبر پر چڑھتا ہے تو قوم پر سلام کہتا ہے یہ ایسا امر ہے جس کا کوئی اصل نہیں ہے اس بارہ میں جو بعض حدیثیں وارد ہیں وہ سب ضعیف ہیں جیسا کہ ذیلعی نے ذکر کیا ہے اور نور الایضاح فقہ کی کتاب صفحہ ۱۳۰ میں ہے "ولا یسلم الخطیب القوم اذا استویٰ علی المنبر" یعنی خطیب منبر پر کھڑا ہو تو قوم پر سلام نہ کہے۔ اسی طرح دیگر کتب فقہ میں ہے جو علم حدیث میں عدم فقاہت پر مبنی ہے اعلام الموقعین جلد ا صفحہ ۷۷ میں ہے "واصحاب ابی حنیفةؒ مجمعون علی ان مذھب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث عنده اولیٰ من القیاس والرای کما قدم حدیث القھقة مع ضعفه علی القیاس والرای" یعنی علماء حنفیہ کا اجماع ہے کہ مذہب ابوحنیفہ کا یہ ہے کہ ضعیف حدیث رائے قیاس سے بہت بہتر ہے اس لئے امام ابوحنیفہ نے حدیث قہقہ سے وضو ٹوٹنے کی حدیث کو قیاس پر مقدم کیا ہے۔

از عبدالقادر عارف حصاری سلمہ الباری

الحدیث لاہور۔ جلد ۶ شمارہ ۴۹ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۷۵ء۔

خطبہ سے پہلے منبر پر سلام کہنا

واضح ہو کہ علماء حنفیہ وخطباء وغیرہ جب منبر پر چڑھتے ہیں تو حاضرین کو سلام نہیں کہتے۔ چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد۲ صفحہ ۲۶ میں اس سوال کے جواب میں کہ خطیب منبر پر چڑھتے وقت کچھ دعا اور السلام علیکم کہہ کر منبر پر بیٹھتا ہے کیا یہ فعل موافق شریعت کے ہے؟ یہ لکھا ہے کہ خطبہ کے وقت منبر پر چڑھنے کے وقت السلام علیکم وغیرہ کہنا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام سے کہیں منقول نہیں اس لئے ترک کرنا اس کا ضرور ہے۔ الخ۔

تعاقب حصاری: الحمدللہ رب العالمین امابعد فاقول و باللہ التوفیق۔ واضح ہو کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب ''انصاف'' کے صفحہ ۷۷ میں انصاف فرماتے ہوئے یہ صحیح لکھا ہے کہ ''واشتغالھم بعلم الحدیث قلیل قدیماً و حدیثاً'' یعنی ان حنفیوں کا شغل علم حدیث کے ساتھ بہت تھوڑا رہا ہے قدیم زمانے میں اور اس نئے زمانے میں ان کا یہی حال ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاہ صاحبؒ کا یہ فرمان سو فیصد صحیح ہے یہی وجہ ہے کہ بچوں کا عقیقہ کرنا احادیث صحیحہ قولیہ وفعلیہ اور تعامل صحابہؓ اور ان کے آثار سے ثابت ہے جو سنت مؤکدہ ہے لیکن امام محمدؒ مؤطا میں کتاب الآثار میں عقیقہ کو رسم جاہلیت قرار دیتے ہیں چنانچہ یہ لکھا ہے ''ان العقیقۃ کانت فی الجاھلیۃ فلما جاء الاسلام رفضت'' یعنی عقیقہ کرنا زمانہ جاہلیت میں تھا جب اسلام آیا تو اسے چھوڑ دیا گیا۔

پھر لکھا ہے ''وقال محمد وبہ ناخذ وھو قول ابی حنیفۃ'' امام محمد نے کہا یہی ہمارا مذہب ہے اور یہی ابوحنیفہ کا فتویٰ ہے۔

جب عقیقہ جیسا مشہور مسئلہ علم حدیث سے معلوم نہ ہوا تو دیگر مسائل میں علم حدیث کیا ہوتا تھا۔ اس لئے حنفی مذہب کے بہ نسبت دیگر مذاہب مالکی، شافعی، حنبلی وغیرہ کے اکثر مسائل خلاف حدیث ہیں۔ چنانچہ مسئلہ زیر بحث حدیث سے ثابت ہے۔ مجمع الزوائد جلد۲ صفحہ ۱۸۴ میں یہ حدیث ہے۔

''عن ابن عمر قال کان رسول اللہ ﷺ اذا دخل المسجد یوم الجمعۃ سلم علی من عند منبرہ من الجلوس فاذا صعد المنبر توجہ الی الناس فسلم

علیھم (طبرانی فی الاوسط) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے جناب رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے دن مسجد میں داخل ہوتے تو جو لوگ منبر کے پاس بیٹھے ہوتے ان کو سلام کہا کرتے تھے پس جب منبر پر چڑھتے تھے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر ان کو سلام کہا کرتے تھے۔

اس حدیث کی سند میں عیسیٰ بن عبداللہ انصاری ضعیف ہے لیکن ابن حبان نے اس کو ثقہ راویوں میں ذکر کیا ہے اگر اس حدیث کو ضعیف بھی کہا جائے تب بھی اس سے خطیب کو سلام کہنا مستحب ہے۔ چنانچہ علامہ ابن ہمام جو حنفیہ میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں وہ اپنی کتاب فتح القدیر کے کتاب الجنائز میں یہ فرماتے ہیں۔

"والاستحباب یثبت بالضعیف غیرالموضوع" یعنی کسی حدیث ضعیف سے بھی کسی عمل کا مستحب ہونا ثابت ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ موضوع نہ ہو۔

بہرحال یہ حدیث مفتیانِ دیوبند پر حجت ہے ان کے پاس سلام نہ کہنے کی کوئی حدیث نہیں ہے۔ وہ صرف یہ روایت پیش کرتے ہیں "اذاخرج الامام فلاصلوٰۃ ولا کلام" یعنی امام جب خطبہ جمعہ کے لئے نکل آئے تو پھر نہ نماز پڑھنا جائز ہے اور نہ ہی کلام کرنا جائز ہے۔

لیکن یہ دلیل کئی وجوہ کی بنا پر قابل رد ہے۔ اول یہ کہ یہ سخت ضعیف ہے۔ مجمع الزوائد جلد۲ صفحہ ۱۸۴ میں اس روایت کو ذکر کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایوب بن نہیک ایک راوی ہے "وھو متروک ضعفه جماعته" یہ راوی متروک ہے ایک جماعت محدثین نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اگرچہ ابن حبان نے اس کو ثقہ راویوں میں ذکر کیا ہے لیکن ابن حبان پر جماعت کی تضعیف مقدم ہے جب کہ یہ اصول ہے کہ تعدیل پر جرح مقدم ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ روایت صحیح حدیث کے مخالف ہے جو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اذاجاء احدکم والامام یخطب فلیصل رکعتین خفیفتین" جب تم میں سے کوئی اس حال میں آئے کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو اس کو چاہیئے کہ وہ ہلکی سی دو رکعتیں پڑھ لے۔ اس حدیث شریف کے سب راوی ثقہ ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث میں امام و خطیب کو سلام اور کلام کی ممانعت

نہیں ہے۔ بہر کیف خطیب کو منبر پر سلام کہنا مشروع ہے۔ پھر اس روایت کی تائید اس مرسل روایت میں پائی جاتی ہے جو تفسیر درمنشور جلد ٦ صفحہ ۲۲۲ میں ہے۔

"اخرج ابن ابی شیبة عن الشعبی قال کان رسول الله ﷺ اذا صعد المنبر یوم الجمعة استقبل الناس بوجهه الکریم فقال السلام علیکم و یحمد الله ویثنی علیه ویقراء سورة ثم یجلس ثم یقوم فیخطب ثم ینزل وکان ابوبکر وعمر یفعلانه" یعنی امام شعبیؒ سے روایت ہے جو امام ابوحنیفہ کے استاد ہیں وہ یہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے دن منبر پر چڑھتے تو لوگوں کی طرف اپنا چہرہ مبارک کر کے سلام کہتے اور اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا کرتے اور قرآن کی کوئی سورت پڑھتے پھر بیٹھ جاتے پھر کھڑے ہوتے اور خطبہ دیتے پھر نیچے اتر آتے تھے۔ اور آپ کے دو خلفاء حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ بھی اسی طرح کرتے تھے۔

یہ روایت مرسل ہے اور مرسل حنفیہ کے نزدیک حجت ہے۔ اگر حنفیہ مرسل حدیثوں سے انکار کر دیں تو ان کا مذہبی خانہ سارا ہی خراب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حنفی مذہب کے مسائل مرسل حدیثوں پر مبنی ہیں اس لئے انہوں نے اپنی اصولی کتابوں میں یہ لکھ دیا ہے کہ مرسل حدیث حجت ہے۔ چنانچہ علماء دیوبند نے ایک کتاب اصول حدیث پر لکھی ہے جس کا نام "انہاء لسکن" رکھا ہے اس کے صفحہ ۳٦ میں یہ لکھا ہے کہ "واما اهل القرون الثلاثة فمرسلهم مقبول عندنا مطلقاً کمامر" یعنی تینوں زمانوں کی مرسل حدیث ہمارے حنفیہ کے نزدیک مطلقاً حجت ہے۔ اور صفحہ ۳۸ پر یہ نقل کیا ہے "قال احمد العجلی مرسل الشعبی صحیح لایکاد یرسل الاصحیحا" یعنی امام شعبیؒ کی مرسل حدیث صحیح ہے کیونکہ صحیح روایت کو مرسل بیان کرتے ہیں۔ بلکہ آجری نے ابوداؤد سے نقل کیا ہے کہ شعبیؒ کی مرسل روایت ابراہیم نخعی کی مرسل سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔

بہر کیف امام شعبی کی مرسل روایت بابت سلام خطیب حنفیہ پر حجت ہے۔ الرحمة المهداة فصل رابع مشکوٰۃ کے صفحہ ۲۷ میں بروایت بیہقی یہ حدیث درج ہے "عن جابر وغیرہ ان النبی ﷺ کان اذا صعد المنبر سلم" حضرت جابر وغیرہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب خطبہ کے لئے منبر پر چڑھتے تو سلام کہتے۔ (یہ حدیث بھی حنفیہ پر حجت ہے)

زادالمعاد جز اول کے صفحہ ۲۱۷ میں یہ لکھا ہے "فاذادخل المسجد سلم علیھم فاذاصعد المنبر استقبل الناس بوجھه وسلم علیھم" یعنی آنحضور ﷺ کا یہ معمول تھا جب مسجد میں جمعہ کے دن داخل ہوتے تو حاضرین پر سلام کرتے پھر جب منبر پر چڑھتے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر سلام کہتے۔

علماء دیوبند اور کوفہ کے اہل رائے کا مسئلہ کہ خطیب سلام نہ کہے' ان حدیثوں سے رد ہو گیا۔ تلخیص الحبیر صفحہ ۱۳۶ میں حافظ ابن حجرؒ نے خطیب کے سلام کہنے کے بارہ میں متعدد روایات ذکر کی ہیں جن کے مجموعہ سے استدلال صحیح ہے کہ خطیب کو سلام کہنا چاہیے۔ انہاء السکن دیوبندی کے صفحہ ۷ میں ہے۔

"ان الضعیف اذاتعددت طرقه اوتاتیه بمایرجع قبوله فہوالحسن لغیرہ" یعنی حدیث ضعیف جب کہ کئی طریقوں سے مروی ہو یا اس کو کسی مرجح دلیل سے قبولیت حاصل ہو تو وہ حدیث حسن لغیرہ ہو جاتی ہے' جس سے استدلال کرنا صحیح ہے اور اس بارے میں امام شعبیؒ کی مرسل روایت مرجح موجود ہے جس سے نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفاء حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کا تعامل ثابت ہے۔ پس فقہ کی کتاب نور الایضاح کے صفحہ ۱۳۰ پر جو یہ لکھا ہے "ولا یسلم الخطیب علی القوم اذا استوی علی المنبر" کہ خطیب منبر پر کھڑا ہو تو حاضرین کو سلام نہ کہے سراسر باطل ہے جو عدم اشتغال بالحدیث پر مبنی ہے۔ چنانچہ درایہ تخریج ہدایہ برحاشیہ ہدایہ صفحہ ۱۷۲ میں اس کی تردید ثابت ہے۔ چنانچہ ابن حجر لکھتے ہیں۔

"روی عبدالرزاق عن ابن جریج عن عطاءٍ کان النبی ﷺ اذاصعد المنبر یوم الجمعة استقبل الناس بوجھه وقال السلام علیکم ولابن ابی شیبة عن الشعبی نحوہ" یعنی حضرت عطاء تابعی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب جمعہ کے دن منبر پر چڑھتے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور السلام علیکم کہتے تھے۔

یہ روایت بھی مرسل ہے جو امام شعبی کی مرسل روایت کی مؤید ہے جو حنفیہ پر اتمام حجت ہے جس سے دیوبندی مفتیان کا فتوی باطل ہوا کیونکہ وہ مرسل حدیث کو بھی مسند کی طرح حجت جانتے ہیں۔ اس مسئلہ میں تو مرسل اور مسند سب جمع ہیں اور خلفاء راشدین کا تعامل مزید مؤید ہے۔ اب حدیث "فعلیکم بسنتی وسنة الخلفآء

الراشدین" پڑھئے کہ تم میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔ اور دیوبند کے دارالعلوم کے خزانہ علم سے یہ عبارت فتویٰ کی پڑھو کہ خطبہ کے وقت منبر پر چڑھنے کے وقت السلام علیکم وغیرہ کہنا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام سے کہیں منقول نہیں اس لئے ترک کرنا اسکا ضرور ہے۔ یہی علمائے حنفیہ قدیماً وحدیثاً لکھتے چلے آئے ہیں۔ اسی مکھی پر مکھی مارنے کا نام تقلید ہے۔ چنانچہ علامہ ابن ہمام فتح القدیر کے باب نکاح الرقیق میں یہ لکھتے ہیں "وکثیرمایقلدالساھون الساھین" یعنی بہت لوگ بھولنے والے ہوتے ہوئے بھولے ہوئے لوگوں کی تقلید کرتے چلے آتے ہیں۔

اسی کا نام اردو زبان میں مکھی پر مکھی مارنا ہے۔ اسی وجہ سے مقلد کو فتویٰ لکھنا جائز نہیں ہے اگرچہ وہ دیوبند کا فارغ شدہ عالم کہلاتا ہو۔ کیونکہ مفتی کیلئے مجتہد ہونا لابدی امر ہے۔ درمختار جلد۴ صفحہ ۳۱۸ میں ہے:۔

"ان المفتی عندالاصولیین ھوالمجتھد" علماء اہل اصول کے نزدیک مفتی مجتہد ہوا کرتا ہے۔

کیونکہ مفتی کا عالم کامل ہونا ضروری ہے' اور مقلد عالم نہیں ہوتا۔ چنانچہ روضۃ الندیہ صفحہ ۳۳۹ کتاب القضاء میں لکھا ہے "نقل عضدالدین الاجماع علی انہ لایسمی المقلدعالماً" یعنی امام عضدالدین نے اجماع نقل کیا ہے کہ مقلد کو عالم نہیں کہنا چاہیئے' وہ عالم نہیں ہوتا۔

علامہ ابن القیمؒ جن کو علامہ ملا علی قاری نے اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے' وہ اپنی کتاب اعلام الموقعین جلد۲ صفحہ۱۸۱ میں فرماتے ہیں "واذاکان المقلدلیس من العلماء باتفاق العلماء لم یدخل فی شئی من ھذہ النصوص" یعنی جملہ علماء کے اتفاق کے مطابق جب مقلد کا شمار علماء میں نہیں ہے تو وہ ان نصوص کا مصداق نہیں ہے جن میں علم اور علماء کی فضیلت اور درجہ کا ذکر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جب دیوبند کے علماء سب علوم حاصل کرتے ہیں۔ قرآن' حدیث' فقہ' اصول حدیث' اصول فقہ' صرف ونحو' منطق' فلسفہ' لغات عربیہ' پھر تقلید کیوں کرتے ہیں؟ اور مقلد کیوں کہلاتے ہیں۔ کیونکہ تقلید کی تعریف میں تو عدم بالدلیل داخل فی الماہیت ہے۔ اسی وجہ سے علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ مقلد عالم نہیں ہے

توپھر کیوں دیوبند میں دارالعلوم بنایا اور کیوں وہاں قرآن' حدیث اور علم فقہ کو پڑھایا جاتا ہے۔ اگر قرآن وحدیث کو تبرک کے طور پر پڑھاتے ہو اور پڑھتے ہو اور اپنے اہل رائے کی تقلید کو واجب جان کر لازم رکھتے ہو تو پھر اس وعید الٰہی کے مستحق ہو جو قرآن وحدیث میں وارد ہے کہ جو علماء قرآن وحدیث کو پڑھ کر اس پر عمل نہ کریں ان پر لعنت وارد ہے اور جہنم کی وعید آئی ہے اور یہ خدا اور سول سے صریح غداری ہے کہ قرآن وحدیث کا علم حاصل کریں اور عمل اہل فقہ کی رائے پر کرتے رہیں۔ یہ تو یہودیوں کا طریقہ تھا۔

امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر جلد ا صفحہ ۲۰۵ میں یہ لکھتے ہیں "ان اللہ حرم التقلید فمن دعاالی النظروالاستدلال کان علی وفقالقرآن ودین الانبیآء ومن دعا الی التقلید کان علی خلاف القرآن وعلی وفاق الکفار" یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تقلید کی مذمت بیان فرمائی ہے پس جس شخص نے دلائل شرعیہ پر غور کرنے اور ان سے دلیل کی طرف لوگوں کو دعوت دی تب تو ٹھیک ہے اس نے قرآن کے موافق عمل کیا اور وہ انبیاء علیہم السلام کے دین پر چلا۔ اور جس نے لوگوں کو تقلید کی طرف بلایا اس نے قرآن وحدیث کے خلاف عمل کیا اور کفار کے طریقہ پر چلا۔

اب دیوبندی علماء ومفتیان غور کر کے جواب دیں کہ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر کے لوگوں کو تقلید شخصی کی طرف دعوت دی ہے اور اس کو واجب قرار دیا ہے۔ یا قرآن وحدیث پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے ہم نے تو دیوبندی کتابوں میں تقلید شخصی کی طرف دعوت پڑھی ہے جو خلاف قرآن ہے اور امام فخرالدین رازی کے قول کے مطابق کافروں کا طریقہ ہے اور یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔

مقلدین تو یہ کہتے ہیں کہ چاروں مذاہب حنفی' شافعی' مالکی اور حنبلیپر اجماع ہوگیا۔ ہر مقلد کو اپنے مذہب کے اندر رہنا چاہیئے اگر اپنے مذہب کو ترک کر کے دوسرے مذہب کی طرف گیا تو اس کو تعزیر لگے گی۔

اور امام شعرانی کشف الظنون میں یہ لکھتے ہیں کہ ایک مذہب کی پابندی میں احادیث نبویہ کو ترک کرنا پڑے گا کیونکہ ایک مذہب تمام احادیث شرعیہ پر حاوی نہیں ہے۔

میزان شعرانی کے صفحہ ۱۳ پر یہ لکھا ہے "لایکمل لمومن العمل بالشرعیة

کلھاو ھو مقلدلمذھب واحدا"یعنی جو مومن ایک مذہب کا پابند ہوا وہ تمام شریعت محمدیہ پر پورا عمل نہ کر سکے گا۔

پس جب تقلید کی پابندی میں تمام احادیث نبویہ پر عمل نہ ہوا بلکہ اس نے اپنے خلاف مذہب کو ترک کر دیا تو وہ گمراہ ہو گیا۔ پس تقلید شخصی اور مذہبی پابندی حرام ہے۔

میزان شعرانی صفحہ ۴۸ میں ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے خود یہ فرمایا ہے "حرام علی من لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی "یعنی جس شخص کو میرے قول کی دلیل معلوم نہ ہو اس کو میرے قول پر فتویٰ دینا حرام ہے۔

اس سے تقلید شخصی کا حرام ہونا ظاہر ہوا کیونکہ تقلید کی تعریف میں عدم معرفت دلیل داخل ہے۔ قول سدید حنفی صفحہ ۴ میں ہے "التقلیدالاخذبالقول من غیر دلیل" اور جمع الجوامع لابن السکن جلد ۲ صفحہ ۲۵۱ میں ہے "التقلیداخذقول الغیرمن غیرمعرفة دلیله "یعنی بغیر دلیل کے کسی کا قول لینا تقلید ہے۔

فقط

والسلام۔

السید ابوالشکور عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث مورخہ یکم ذوالقعدہ ۱۳۹۹ء۔

احناف اور احتیاط الظہر

حسب پیشگوئی جناب نبی کریم ﷺ امت محمدیہ میں افتراق پیدا ہو چکا ہے اور وہ فرقہ بندی میں مبتلا ہو گئی ہے بلکہ ایک ایک فرقہ کئی کئی شاخوں میں متفرق ہے مثلاً رافضی فرقہ کی کئی شاخیں ہیں مرجیہ کی کئی شاخیں ہیں۔ اسی طرح مرزائی کی دو شاخیں ہیں جو لاہوری اور قادیانی کے نام سے مشہور ہیں اور حنفی مذہب کی کئی شاخیں ہیں جو دیوبندی' بریلوی' ندوی وغیرہ کے نام سے مشہور ہیں مگر تمام ممالک کے قدیم و جدید زمانوں پر غور کیا جائے تو حنفی مذہب کی بہت سی شاخیں نکلیں گی۔ مولانا عبدالحی صاحب حنفی لکھنوی نے اپنی کتاب الرفع والتکمیل میں حنفی مذہب کی تعریف یہ لکھی ہے "ان الحنفیة عبارة عن فرقة تقلدالامام اباحنیفة فی المسائل الفرعیة" یعنی حنفی مذہب سے وہ فرقہ مراد ہے جو فروعی مسائل میں امامؒ ابوحنیفہ کی تقلید کرتا ہے۔ پس وہ اگر اعتقادی مسائل میں معتزلہ یا جہمیہ' قبر پرست ہو یا پیر پرست' مگر فروعی مسائل نماز' روزہ' حج وغیرہ احکام میں امام ابوحنیفہ ہی کا مقلد ہو گا تو اس کو حنفی مذہب کی تعریف کی رو سے حنفی ہی کہا جائے گا بلکہ مسائل منصوصہ کے علاوہ مسائل اجتہادیہ میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنے والا بھی حنفی ہو گا کیونکہ مذہب مجموعہ فروع کا نام ہے۔ چنانچہ امداد الفتاویٰ صفحہ ۵۳ جلد ۳ میں مولانا اشرف علی صاحب حنفی نے اس کی صراحت فرمائی ہے اور رسالہ خیر التنقید میں مولانا خیر محمد صاحب جالندھری نے بھی اس کی تشریح کی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اعتقادات اور اصول میں تقلید نہیں ہے اس میں حنفیہ کے نزدیک آزادی ہے کہ جس طرح کوئی چاہے کرے۔ عقیدہ رکھے اس لئے مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے فرمایا ہے کہ حنفی مذہب میں کئی لوگ معتزلہ ہیں کئی جہمیہ ہیں کئی شیعہ ہیں وغیرھا من الفرق الضالة یہی وجہ ہے کہ بریلوی حنفی اعتقادات میں کوئی جہمیہ ہے اور کوئی معتزلہ اور کوئی مرجیہ ہے کوئی اتحادیہ اور کوئی حلولیہ ہے اسی طرح ان کے قدیم اور جدید صوفیوں کا حال ہے۔ گویا حنفی مذہب ایک گلدستہ ہے جو مختلف فرقوں کا مجموعہ ہے جب حنفی مذہب میں ان گمراہ فرقوں کی شمولیت بھی ہو گئی تو ان فرقوں کے بادشاہوں اور عالموں نے اس مذہب حنفی میں امام ابوحنیفہؒ وصاحبین اکابر علماء حنفیہ کے خلاف اپنے قیاس فاسد سے مسائل اختراع کر کے کتب حنفیہ میں شامل کر دیئے اور سب کتب فقہ مشکوک و مخدوش کر دیں۔ چنانچہ نماز احتیاطی بھی جس

کو بعض حنفی لوگ پڑھتے ہیں اسی طرح مذہب حنفی میں داخل کی گئی ہے' چنانچہ مضمون ہذا میں اس کی ابتداء اور اس کا حکم شرعی بیان کیا جاتا ہے لیکن پہلے قیاسی طریق سے اس کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں۔ پھر محد ثانہ طریق سے اس کی تحقیق کی جاوے گی' انشاء اللہ۔

نماز احتیاطی کی ابتداء: فتاویٰ نذیریہ جلد اصفحہ ۳۷۵ میں ہے' نماز احتیاط الظہر بدعت سیئہ ہے جو ایک بادشاہ عباسی معتزلی نے کہ عرب وعجم پر حکمران تھا' اس کی بنیاد ڈالی' حنفی مذہب میں ہرگز یہ نماز درست نہیں ہے جو یہ پڑھے وہ حنفی ہے نہ مالکی نہ شافعی نہ حنبلی بلکہ معتزلی مذہب ہے۔ اس ظالم نے یہ حکم دیا تھا کہ نماز احتیاط الظہر کل جگہ جاری کی جائے جو اس کو نہ پڑھے اسے تعزیر لگائی جائے جو مولوی اس وقت عبد الدینار والدراہم تھے انہوں نے اسے قبول کیا اور فتوؤں میں درج کر گئے۔

اس قصہ کو ایک عالم جید قصوری پنجابی حنفی المذہب نے خوب تحقیق سے لکھا ہے' کذا فی تفسیر المحمدی الخ۔

میں کہتا ہوں کہ فاضل مفتی نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے فتویٰ تاتارخانی میں' جس کو چالیس مجتہدوں نے لکھا ہے یہ درج ہے "وھو مذھب الاعتزال فعلی السنی ان یعرض عنہ" یعنی احتیاطی نماز پڑھنا معتزلہ کا مذہب ہے سنی المذہب کو اس نماز سے اعراض کرنا چاہیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نماز احتیاطی حنفی مذہب میں داخل نہیں ہے اس کو معتزلہ مذہب کے لوگوں نے اختراع کیا ہے اور وہ حنفی مذہب میں داخل تھے۔ انہوں نے اس کو اپنے قیاس سے نکال کر مذہب حنفی میں شامل کر دیا چنانچہ فقہ کی جن کتابوں میں اس کے پڑھنے کا ذکر ہے یا جائز لکھا ہے وہ وہی معتزلہ مذہب کے تاثرات ہیں ان کا اعتبار نہ کرنا چاہیئے اور جن کتابوں میں اس کو منع لکھا ہے اور وہ بھی حنفی مذہب کی ہیں ان کا اس مسئلہ میں اعتبار کرنا چاہیئے کیونکہ وہ اصل حنفی مذہب ہے' تاتارخانی کو چالیس مجتہدوں نے تیار کیا ہے تو چالیس حنفی مجتہدوں کی یہ شہادت ہوگئی کہ یہ معتزلہ کا مذہب ہے حنفی مذہب میں نماز احتیاطی نہیں ہے۔ پس نماز احتیاطی پڑھنے والا حنفی نہیں ہو سکتا بلکہ معتزلہ میں شمار ہوگا کیونکہ پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ حنفی وہ ہے جو فروعات میں امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہو' احتیاطی والے معتزلہ کے مقلد ہیں لہٰذا وہ معتزلی ہیں۔

امام ابوحنیفہ نے نماز احتیاطی نہیں پڑھی: کسی کتاب فقہ میں منقول اور مروی نہیں ہے

کہ نماز احتیاطی امام ابوحنیفہؒ نے پڑھی ہے اور نہ ہی امام ابوحنیفہؒ کے وقت اس کا وجود تھا اور نہ متقدمین علماء حنفیہ نے اس کو پڑھا ہے' بحرالرائق میں ہے "ولیس ھذاالقول اعنی الاختیارالاربع بعدھا مرویا عن ابی حنیفة و صاحبیه" یعنی جمعہ کے بعد چار رکعت ظہر پڑھنے کا قول امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین سے مروی نہیں ہے۔ جب امام صاحب سے یہ منقول ہی نہیں تو اس کا پڑھنا ان کا مذہب کیسے ہوسکتا ہے۔ پس جو حنفی امام ابوحنیفہؒ کو اس مسئلہ میں چھوڑ کر دوسرے مذہب کی تقلید کرتے ہیں وہ حنفی مذہب سے خارج ہیں۔ طحطاوی تنویرالابصار حاشیہ درمختار میں لکھتے ہیں "ان الصلوٰۃ الاربع مبنی علی الضعف المخالف للمذھب" یعنی چار رکعت ظہر بعد جمعہ ضعیف قیاس یا روایت پر مبنی ہے جو حنفی مذہب کے مخالف ہے نیز لکھا ہے "ولیس لھااصل فی المذھب ای صلوٰۃ الاربع بعدالجمعه" یعنی مذہب حنفی میں اس کا کوئی اصل نہیں ہے۔

نماز احتیاطی کیوں نکالی گئی ہے: بحرالرائق میں ہے "انماوضعھابعض المتاءخرین عند الشك فی صحة الجمعة بسبب روایة عدم تعددھافی مصرو احدولیست ھذہ الروایة بالمختار" یعنی نماز احتیاطی کو اس شک کی بنا پر کہ جمعہ شاید صحیح نہ ہو متاخرین نے اختراع کیا ہے اور اس شک کا سبب وہ روایت ہے کہ ایک شہر میں کئی جمعے جائز نہیں ہیں حالانکہ یہ روایت معتبر نہیں ہے۔ تنویرالابصار میں ہے "انما وضعھابعض المتاء خرین عندالشك فی صحة الجمعة" یعنی اس کو متاخرین نے ایجاد کیا ہے جبکہ ان کو جمعہ کے صحیح ہونے پر شک ہوا اس تصریح سے کئی باتیں ظاہر ہوگئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس نماز کا وجود عہد نبویؐ سے لے کر ائمہ اربعہ تک نہ تھا اور ائمہ اربعہ و متقدمین سے لے کر متاخرین حنفیہ تک اس کا کوئی وجود نہ تھا اس کو متاخرین حنفیہ نے (جو معتزلہ تھے) شک کی بیماری میں مبتلا ہو کر ایجاد کیا ہے دوم یہ کہ جس کو شک اور وہم کی بیماری لگی ہو وہ اس کو پڑھے یقین اور اعتقاد صحیح سالم والا اس کے قریب نہ جائے' تیسرا یہ کہ شک پیدا ہونے کا سبب یہ ہوا کہ شہروں اور دیہات میں جمعہ متعدد جگہ ہونے لگا اور روایت مذہب میں یہ ہے کہ جمعہ شہر میں ایک جگہ ہو اور اگر کئی جگہ ہوں تو یہ ناجائز ہے پھر جس کا پہلے واقع ہوگا اس کا صحیح ہوگا اور جس کا بعد میں ہوا اس کا باطل ہوگا۔ اب یہ پتہ نہیں رہتا کہ سب سے پہلے کس کا ہوا؟ اس لئے ظہر نماز پڑھ لے تاکہ جمعہ اگر باطل ہوگیا تو نماز ظہر جو اس

وقت کی نماز ہے وہ صحیح رہ جائے لیکن یہ روایت حنفی مذہب کی کہ کسی ایک جگہ تعدد جمعہ جائز نہیں ہے' غیر معتبر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دیہات میں جہاں ایک جمعہ ہو تب بھی وہاں ظہر پڑھتے ہیں اور شک یہ کرتے ہیں کہ دیہات میں جمعہ پڑھنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اور دیگر ائمہ کے نزدیک جائز ہے۔ اب اگر قائلین فرضیت جمعہ حق پر ہیں اور جمعہ پڑھنا دیہات میں فرض ہے تو جمعہ پڑھ لیا اور خیال کر لیا کہ ہم ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں اور وہ مصر میں فرض کہتے ہیں اور دیہات سے نفی کرتے ہیں تو ظہر بھی پڑھ لی' پس دونوں کشتیوں پر ایک ایک پاؤں رکھ کر سوار ہو گئے تاکہ دونوں نمازوں سے کوئی نماز تو صحیح ہو جائیگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

الجحدیث سوہدرہ جلد ۸ شمارہ ۴۰ مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء۔

نماز احتیاطی

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت میں افتراق ہو جائیگا اور وہ تہتر فرقوں میں منقسم ہو جائیگی۔ ان میں صرف ایک فرقہ ناجیہ ہوگا، علماء اہل حق کا اجماع ہے کہ وہ ایک فرقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت کا ہے کیونکہ آنحضور ﷺ نے طائفہ ناجیہ کی تعریف یہ فرمائی ہے، "ماانا علیه الیوم واصحابی" (طبرانی) یعنی ناجی گروہ وہ ہے جو اس طریقہ پر ہے جس پر آج کے دن میں اور میرے اصحاب چل رہے ہیں، سو گروہ اہل سنت اسی طریقہ پر چلتا ہے، اس لئے اس کی تعریف یہ ہے، "اهل السنة والجماعت وهم الذین طریقتهم طریقة الرسول علیه السلام واصحابه رضی الله عنهم دون اهل البدعت" یعنی اہل سنت والجماعت وہ لوگ ہیں جن کا طریقہ وہی ہے جو طریقہ رسول ﷺ اور صحابہ کرام کا ہے، اور ان کا طریقہ اہل بدعت سے جدا ہے، (توضیح تلویح مطبوعہ نولکشور ص ۳۵۴) مجالس الابرار میں بھی اسی طرح ہے، جس کی عبارت یہ ہے، "اهل السنت والجماعت وهم الذین طریقتهم طریق النبی ﷺ واصحابه دون اهل البدع والضلال" مطلب وہی ہے جو سابقہ عبارت کا ہے۔ اس طریقہ پر چلنے والا گروہ صرف ایک ہوگا، اس کی تقسیم نہ ہو سکے گی، اگر تقسیم ہوگی تو اس وقت جب اس کی ہیئت اعتقادی اور عملی بدل جائے گی اور وہ راہ عمل طریقہ نبوی اور طریقہ سلف صالحین میں تغیرات پیدا کر دے گا، جب اس طرح ہو جائے۔ تو پھر ان میں جو اس طریقہ مشروعہ پر قائم ہوگا اور ان میں وحدت ہوگی، وہ اہل حق اور ناجیہ کہلانے کا مستحق ہوگا، چنانچہ ائمہ اربعہ اور مجتہدین اور محدثین متقدمین کے عہد میں اہل سنت میں اسی طرح وحدت تھی، جس طرح عہد نبوی و صحابہ میں تھی۔

تیسری صدی میں تغیر شروع ہوا جو یہاں تک ترقی کر گیا کہ چہارم صدی میں تقسیم شروع ہو گئی، اور حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی نامی فرقے مشہور ہو گئے، صرف ایک گروہ محدثین کا اس طریقہ پر قائم رہا جو اس فرقہ بندی میں نہیں داخل ہوا، پس وہی حقیقی اہل سنت والجماعت ہے۔ جس کو اہل حدیث، اصحاب حدیث، اہل اثر بھی کہتے

ہیں۔ حنفی، شافعی وغیرہ فرقوں کو بعض علماء اس وجہ سے اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ اہل سنت سے نکلے ہیں، اور جن ائمہ کے اقوال وآراء کی بالتعیین تقلید عقیدہ بالوجوب سے کرتے ہیں، وہ ائمہ اہل سنت تھے، تقلید شخصی کی وجہ سے ان میں ایسے تغیرات پیدا ہوگئے ہیں جن سے وہ طریقہ قائم نہ رہا جس پر جناب نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ اپنے عہد میں قائم رہے ہیں، پھر ہر امام کے مقلدین اپنے مذہب میں قیاس آرائیاں کر کے امور محدثہ نکالنے لگے، اور ان کو شرع بنالیا، جس سے تقریباً تمام مذاہب میں عموماً اہل بدعت والضلال فرقے پیدا ہوگئے۔ نماز احتیاطی بھی ان ہی گمراہ لوگوں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ شاید قبول نہ ہو اس لئے بطور احتیاط کے بعد جمعہ نماز احتیاطی پڑھ لو، تاکہ یہی منظورِ خدا ہو جائے، اور یہ وہ عجیب حرکت ہے جسے نہ عقل قبول کرتی ہے نہ زمانہ رسالت، اور بعد میں اسے اپنایا گیا۔

اب محدثانہ طریق سے اس کی تردید ملاحظہ فرمایئے۔ محدثین اس نماز احتیاطی کو بدعت سیئہ قرار دیتے ہیں، اور ظہر کی نیت سے نماز جمعہ کے بعد اس کے پڑھنے کو منع کہتے ہیں۔

نماز احتیاطی کے باطل ہونے کی پہلی دلیل: قرآن مجید میں ہے "اقم الصلوٰة لدلوك الشمس" یعنی قائم کر نماز کو بوقت ڈھلنے سورج کے۔ اس حکم الٰہی سے زوال شمس کے بعد نماز قائم کرنا ثابت ہوا، اب احادیث نبویہ پر غور کرنا چاہئے کہ جمعہ کے روز سورج ڈھلنے پر کتنی نماز پڑھی، اور دیگر ایام میں کتنی پڑھیں کیونکہ احادیث قرآن کی تفسیر ہیں اور تعامل نبوی ص کلام الٰہی کی تبیین ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے "عن انس ان النبی ﷺ کان یصلی الجمعة حین تمیل الشمس رواہ البخاری" یعنی حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کی نماز سورج ڈھلنے کے وقت پڑھتے تھے کان جب مضارع پر داخل ہوتا ہے تو ماضی استمراری کا معنی دیتا ہے اس لئے مشکوٰۃ کی تخریج تنقیح الرواۃ صفحہ ۲۶۲ میں ہے "والحدیث یدل علی مواظبته ﷺ علی صلوٰة الجمعة اذا زال الشمس" یعنی یہ حدیث اس مسئلہ پر دلیل ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نماز جمعہ ہمیشہ

سورج ڈھلنے کے وقت پڑھتے تھے، رہی یہ بات کہ نماز جمعہ کی کتنی رکعتیں پڑھتے تھے؟ سو یہ مسئلہ مندرجہ ذیل حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

"عن عمر قال صلوٰۃ الجمعۃ رکعتان و الفطر رکعتان و النحر رکعتان و السفر رکعتان تمام غیر قصیر علی لسان النبی ﷺ" یعنی حضرت عمرؓ نے فرمایا، جمعہ کی نماز دو رکعت ہے اور عید الفطر کی دو رکعت ہے اور عید قربانی کی نماز دو رکعت ہے اور سفر کی نماز دو رکعت ہے، اور یہ دو دو رکعتیں پوری نمازیں ہیں کم نہیں ہیں، رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک نے یہی فرمایا ہے (نسائی شریف)

میں کہتا ہوں کہ تعامل مستمرہ نبوی اور اجماع سلف و خلف سے اس حدیث کی تصدیق ہو رہی ہے کہ جمعہ کے دن دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے اور دیگر حدیثوں سے یہ ثابت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری میں سورہ منافقون یا پہلی میں سورہ اعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورہ غاشیہ پڑھتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے دیگر ایام میں ظہر نماز پڑھی ہے جو چار رکعت تھی، پھر آنحضور ﷺ نے امت کو یہ خطاب فرمایا ہے کہ "صلوا کما رائیتمونی اصلی" (بخاری) یعنی تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ پس قرآن میں ایک نماز سورج ڈھلنے کے وقت پر پڑھنے کا حکم تھا، جمعہ کے دن نماز جمعہ دو رکعت پڑھ کر آنحضور ﷺ نے اس پر عمل کر دیا، اور دیگر ایام میں ظہر پڑھ کر عمل کیا۔ اور ہم کو حکم فرمایا کہ تم اسی طرح نمازیں پڑھو، جس طرح میں نے پڑھی ہیں۔ لہٰذا ہم اسی طرح عمل کریں گے۔ اب جو شخص جمعہ کے دن نماز جمعہ بھی پڑھتا ہے اور ظہر بھی پڑھتا ہے، وہ حکم نبیؐ اور تعاملِ نبویؐ کے سراسر خلاف کرتا ہے۔

آنحضور ﷺ نے نماز جمعہ اور نماز ظہر ایک ہی وقت میں ہرگز نہیں پڑھی، اب جو شخص طریقہ نبویؐ کے خلاف عمل کریگا وہ گمراہ ہوگا۔

خلاف پیغمبر کسے راہ گزید!
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

بطالت احتیاطی کی دوسری دلیل : مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان

کیا ہے کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے خطبہ سنایا اور یہ فرمایا "ایھا الناس قد فرض علیکم الحج فحجوا" یعنی اے لوگو تم پر حج فرض کیا گیا ہے پس تم حج کرو، ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا حج کرنا ہر سال فرض ہے؟ آنحضور ﷺ یہ سن کر خاموش رہے یہاں تک کہ اس نے تین بار یہ سوال دہرایا تو آپ نے فرمایا اگر میں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا، اور تم اس پر عمل کرنے کی طاقت نہ رکھتے، جس چیز کے بیان کرنے کو میں چھوڑ دوں تم بھی اس پر سوال کرنے اور دخل دینے میں مجھے چھوڑ دو پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے اپنے نبیوںؑ پر اختلافات اور سوالات کی بھرمار شروع کر دی تھی۔ جب میں تم کو کسی چیز کا حکم کر دوں تو حسب طاقت اس کو بجا لاؤ اور جس سے منع کر دوں اس کو چھوڑ دو۔ محلی جلد اصفحہ ۶۴ میں ہے کہ جس چیز کا شارع حکم کر دے وہ فرض ہے اور جس سے منع کر دے وہ حرام ہے اور جس چیز کا حکم ہم کو کیا جائے حسب طاقت اس کو بجا لائیں گے۔ "وان نفعل مرة واحدة تودی ماالزمنا ولا یلزمنا تکراره فای حاجة الی قیاس اورای مع ھذا البیان الواضح" (ترجمہ) اگر ہم نے ایک بار کسی وقت کسی حکم پر عمل کر لیا تو جو فرض ہم پر لازم ہوا وہ ادا ہو گیا، اس کا تکرار اس وقت لازم نہیں ہے، اس اصول کے واضح ہوتے ہوئے کسی رائے اور قیاس کی ضرورت نہیں رہی۔

یہ اصول اس حدیث سے ثابت ہے، نووی میں اصولوں کا اختلاف ذکر کرتے ہوئے امام نوویؒ نے بھی شرح مسلم میں یہ فرمایا ہے کہ "والصحیح عند اصحابنا لا یقتضیه" یعنی صحیح مذہب یہ ہے کہ امر تکرار کو نہیں چاہتا جبکہ ایک بار اس پر عمل کیا جائے پس جب یہ مسلّم ہوا تو فیصلہ یہ ہے کہ جمعہ کے دن زوال شمس پر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ جس پر جمعہ کی نماز دو رکعت پڑھ کر عمل کر لیا اور "اقم الصلوٰة لدلوك الشمس" پر عمل ہو گیا۔ اب تکرار لازم نہیں ہے۔ یعنی دوبارہ ظہر پڑھنا شرعاً لازم نہیں ہے کیونکہ شارع نے ہم کو اس کا حکم نہیں دیا۔ تو اب رائے قیاس سے ایک عبادت بالتکرار شرع میں اختلاف پیدا کرنا ہے، جس سے سابقہ امتیں ہلاک ہوئی تھیں، پس ظہر احتیاطی پڑھنے والے بھی ہلاکت کے گڑھے میں گر رہے ہیں کیونکہ انہوں نے جمعہ میں شبہات پیدا کر کے یہ نماز قیاس سے نکالی ہے۔ اور اپنے خیال

ناقص میں وہ احتیاط کر رہے ہیں اور حقیقت میں شریعت کا خلاف ہو رہا ہے کیونکہ ایک وقت میں دوبار نماز پڑھ رہے ہیں، حالانکہ اس وقت میں ایک بار نماز پڑھنی فرض ہے اور ایک نماز کو دوبارہ پڑھنا ناجائز ہے۔

حدیث شریف میں ہے "عن ابن عمرقال رسول اللہ ﷺ لاتصلو اصلوٰۃفی یوم مرتین رواہ احمد و ابوداودو النسائی" یعنی ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک دن میں ایک نماز کو دوبار مت پڑھو۔ اس سے شاید کوئی یہ خیال کرے کہ نماز احتیاطی والے ایک نماز کو دوبار نہیں پڑھتے بلکہ وہ دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھتے ہیں ایک جمعہ اور دوسری احتیاطی ظہر ہے۔ اگر جمعہ کو دوبار پڑھتے یا ظہر کو دوبار ادا کرتے، تب اس حدیث مذکور کی رو سے منع ہوتا، تو اس وہم کا ازالہ یوں ہے کہ سورج ڈھلنے کے بعد ایک نماز کا حکم ہے، خواہ وہ ظہر ہو جیسے دیگر ایام میں عام طور پر پڑھی جاتی ہے یا نماز جمعہ ہو جیسے جمعہ کے دن نماز جمعہ کو ادا کیا جاتا ہے "اقم الصلوٰۃ" کا حکم مطلق ہے جب ایک پڑھی گئی تو اس حکم پر عمل ہو گیا۔ اب جو شخص جمعہ کے بعد ظہر پڑھتا ہے وہ دوبارہ اس حکم پر عمل کرتا ہے جس سے تکرار لازم آگیا اور یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک نماز کو دوبار پڑھنا ہے "وما یعقلھاالاالعالمون" جمعہ کے علاوہ دیگر دنوں میں حضور ﷺ کا یہ عمل ہے "فصلی الظھرحین زالت الشمس" یعنی جب سورج ڈھل گیا تو ظہر پڑھی اور جمعہ کے روز یہ عمل ہے "کان یصلی الجمعۃحین تزول الشمس" کہ جب سورج ڈھل گیا تو نماز جمعہ پڑھی۔ پس سورج ڈھلنے کے وقت فرض نماز ایک ہے جس کو دوبارہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ یہ حکم قرآن اور طریقہ نبویؐ کے خلاف ہے اگر کسی شخص کو یہ شبہ پڑ جائے کہ بعض احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے اکیلے فرض نماز پڑھی، پھر ان کو جماعت مل گئی تو دوبارہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کر کے وہ تکرار عمل کے مرتکب ہوئے تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ تنقیح الرواۃ صفحہ ۲۱۳ میں ہے "ان ذالك لیس من اعادۃ الصلوٰۃ فی یوم مرتین لان الاولی فریضۃ و الثانیۃ نافلۃ"۔

یعنی یہ ایک نماز کو دن میں دوبار پڑھنے میں داخل نہیں ہے کیونکہ اس

صورت میں پہلی نماز فرض ہے اور دوسری نفل ہے۔ ممانعت اس صورت میں ہے کہ ادائیگی فرض کی نیت سے فرض نماز دوبارہ پڑھی جائے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جس شخص نے اکیلے نماز پڑھی پھر اس کو جماعت مل گئی تو حکم "وارکعو مع الراکعین" یعنی جماعت سے نماز پڑھو، اور حکم نبوی "فصل مع الناس وان کنت قدصلیت" یعنی لوگوں سے مل کر نماز پڑھو، اگرچہ تونے اکیلے نماز پڑھ لی ہے۔ یہ دوبارہ نماز جماعت کے ساتھ شارع نے اس لیے پڑھنے کا حکم دیا ہے کہ نمازی نے پہلے اکیلے پڑھی ہے۔

اسی طرح اگر جمعہ کے دن ظہر پڑھنے کا حکم شارع نے دیا ہے تو وہ پیش کیا جائے۔ ورنہ ثابت شدہ اور مشروع امر پر غیر ثابت شدہ اور غیر مشروع کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قیاس، قیاس مع الفارق ہے، جو باطل ہے۔ اگر یہ تسلیم کیا جاوے کہ نماز احتیاطی پڑھنا ایک نماز کو دوبارہ پڑھنا نہیں ہے بلکہ بظاہر دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھنا ہے، تب بھی یہ ظہر احتیاطی ممنوع ہے کیونکہ پھر اس حدیث کے خلاف ہے جو مستدرک حاکم میں ہے۔

"عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ ﷺ من جمع بین صلوٰتین من غیرعذرفقداتی باباًمن ابواب الکبائر"، رسول خدا ﷺ نے فرمایا جس نے بغیر عذر شرعی کے دو نمازوں کو جمع کیا وہ کبیرہ گناہوں کے دروازوں میں سے ایک دروازہ میں داخل ہوا۔

یہ حدیث بھی مطلق وارد ہے خواہ دو وقت کی دو نمازوں کو ایک وقت میں بلا عذر پڑھے جیسے عام غافلوں کی عادت ہو رہی ہے یا ایک وقت میں دو فرض نمازوں کو جمع کرے، جیسے ظہر احتیاطی والے جمعہ اور ظہر کو جمع کر رہے ہیں، یہ سب منع ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمعہ اور ظہر ایک دن پڑھنا خواہ دو نمازوں کو جمع کرنا ہو یا ایک نماز کو دوبارہ پڑھنا ہو ہر صورت سے منع ہے۔

بطلان احتیاطی کی تیسری دلیل: قرآن مجید میں ہے "یاایھاالذین آمنوااذانودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعواالی ذکراللہ الایہ" (سورہ

جمعہ) یعنی اے مومنو! جب نماز جمعہ کیلیے پکارا جائے تو ذکر الٰہی کی طرف تم جلد حاضر ہو جایا کرو۔

اس آیت سے جملہ اہل ایمان کا جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھنا فرض ثابت ہوا۔ ہاں بعض اہل ایمان مثلاً غلام، عورت، بیمار، مسافر اور معذورین ہیں ان کو فرضیت سے حدیث نبویؐ نے مستثنےٰ کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں حائضہ، نفاس والی، مجنون اور طفل نادان، فرض نمازوں سے بھی مستثنےٰ ہیں، مگر جمعہ کے معذورین کو یہ جائز ہے کہ وہ جمعہ پڑھ لیں اور ظہر نہ پڑھیں، اور یہ بھی جائز ہے کہ جمعہ نہ پڑھیں اور صرف ظہر پڑھ لیں، لیکن ظہر ترک کر کے جمعہ پڑھنا ان کے لئے افضل ہے، کیونکہ نماز جمعہ کے فضائل بہ نسبت نماز ظہر زیادہ ہیں۔

کلام الٰہی عموم امکنہ میں جمعہ ادا کرنے کا حکم دے رہی ہے۔ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ہے "دلیل الافتراض من کلام اللہ تعالیٰ علی العموم فی الا مکنۃ" یعنی کلام الٰہی نے عمومی طور پر ہر جگہ جمعہ پڑھنا فرض قرار دیا ہے۔ پس تمام شہروں اور دیہات کے رہنے والوں کو جمعہ کی نماز کے فضائل و برکات حاصل کرنے چاہئیں۔ یہ تمام مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہے، جب نماز جمعہ ادا کی گئی تو ظہر کی نماز ساقط ہو گئی۔ چنانچہ آیت مذکورہ کے بعد دوسری آیت ہے جس میں ارشاد ہے "فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ الآیہ" یعنی جب نماز جمعہ ادا ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل ڈھونڈو' یعنی رزق تلاش کرو۔

امام ابن المنذر نے سعید بن جبیر تابعیؒ سے روایت کیا ہے انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ "اذا فرغت یوم الجمعۃ فاخرج الی باب المسجد فساوم بالشئی و ان لم تشترہ" (در منثور) یعنی جب تو نماز جمعہ سے فارغ ہو جائے تو مسجد کے دروازہ کی طرف نکل جا اور کسی چیز کا بھاؤ کرنے لگ جاؤ' اگرچہ اس چیز کو نہ ہی خریدنا ہو۔

اس سے مقصد اس حکم کی تعمیل ہے کہ نماز جمعہ ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ' عراک بن مالکؒ جو تابعین سے ہیں' جب نماز جمعہ ادا کر لیتے تو مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو جاتے اور یہ دعا پڑھتے "اللھم اجبت دعوتك وصليت فريضتك

وانتشرت كما امرتني فارزقني من فضلك وانت خير الرازقين" (حاشیہ جامع البیان منقولہ از تفسیر کبیر) یعنی اے اللہ میں نے تیری دعوت (اذان) قبول کی اور تیرا فرض (جمعہ) ادا کیا اور تیرے حکم کے مطابق زمین میں پھیل رہا ہوں تو مجھے اپنے فضل سے رزق دے تو تمام رازقین سے بہتر ہے۔

ان تصریحات سے یہ ثابت ہوا کہ نماز جمعہ کے بعد ظہر نہیں ہے اگر جمعہ کے بعد ظہر پڑھنے کا حکم ہوتا تو نماز جمعہ ادا کرنے پر مسجد سے نکل جانے کا حکم نہ ہوتا بلکہ یہ حکم ہوتا کہ "فاذا قضيت الصلوٰة فصلوا الظهر" جب نماز جمعہ ادا کر چکو تو پھر نماز ظہر پڑھو جب یہ حکم نہیں ہے اور اگر بالفرض یہ حکم ہوتا تو تمام ممالک کے اہل اسلام قرن اول سے تا ایں زمانہ نماز ظہر پڑھا کرتے اور دیگر نمازوں کی طرح جماعت کی اس میں پابندی ہوتی "اذلیس فلیس" تو اب ظہر احتیاطی پڑھنا حکم "فانتشروا فی الارض" کے سراسر خلاف ہے اور اس بدعی نماز ادا کرنے والے مخالف قرآن اور نافرمان رحمان ہیں۔

بعض لوگ جو یہ شبہ کرتے ہیں کہ جمعہ ہم پر فرض نہیں ہے اس لئے ظہر پڑھتے ہیں یہ بالاجماع باطل ہے کیونکہ نماز جمعہ قطعی دلیل سے فرض عین ثابت ہے۔ کتب حدیث اور کتب فقہ میں جمعہ فرض عین لکھا ہے' جس کا منکر کافر قرار دیا گیا ہے۔ باقی جو لوگ شہر وغیرہ ہونا شرط باندھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں' یہ شرط کسی قطعی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ جو لوگ قول علیؓ اور روایات ضعیفہ اور محتملہ پیش کرتے ہیں وہ ظنی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں' جن سے شریعت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ قاعدہ اہل علم میں مسلم ہے کہ "شرط الفرض لايكون الا فرضا" یعنی فرض کی شرط بھی فرض ہوتی ہے۔ جب شرط فرض ہے تو اس کا ثبوت بھی دلیل قطعی سے ہونا لازم ہے' جیسا کہ فرض دلیل قطعی سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ علماء نے خود اس مشکل کا احساس کیا ہے مجمع الانہار جلد ۱ صفحہ ۱۰۹ میں ہے "لكن هذا مشكل جدا لان الشرط الذي هو فرض لايثبت الا بقطعي الخ" یعنی حضرت علیؓ کے قول وغیرہ سے شہر کی شرط ثابت کرنا نہایت مشکل ہے کیونکہ شرط فرض ہے اور فرض دلیل قطعی سے ثابت ہوتا ہے۔ یہاں قطعی دلیل معدوم ہے جب قطعی دلیل نہیں ہے تو جمعہ فرض عین ہے

تمام مسلمانوں کو بلاشبہ ادا کرنا لازم ہے اور شبہ سے جمعہ ادا کرنا شیطانی وسوسہ ہے جیسا کہ فتاوی تاتار خانی میں ہے حنفیہ کے ایک سید بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کو شبہ سے ادا کرنا شیطانی وسوسہ ہے پس ظہر احتیاطی بروئے قرآن و حدیث باطل ہے۔

بطالت احتیاطی کی چوتھی دلیل : مشکوۃ میں حدیث ہے "خمس صلوات افترضهن الله تعالی" یعنی آنحضور ﷺ نے فرمایا پانچ نمازیں ہیں جن کو اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے۔ دوسری حدیث میں ہے صلوا خمسكم یعنی تم اپنی پانچ نمازیں پڑھو۔ حدیث معراج میں ہے "امرت بخمس صلوات كل يوم" یعنی مجھے خدا تعالی کی طرف سے ہمیشہ ہر دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک شخص اہل نجد سے آکر ارکان اسلام کے متعلق سوال کرنے لگا، تو آنحضور ﷺ نے فرمایا "خمس صلوات في اليوم والليلة فقال هل على غيرهن قال لا الا ان تطوع" یعنی دن اور رات میں ہمیشہ پانچ نمازیں پڑھنا، اس نے کہا کہ پانچ نمازوں کے علاوہ کوئی نماز میرے ذمہ ہے؟ آپ نے فرمایا کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ تو نفل پڑھے۔ پھر اس نے کہا کہ والله لا ازيد على هذا ولا انقص منه فقال رسول الله ﷺ افلح ان صدق یعنی خدا کی قسم میں ان فرائض پر کوئی چیز نہ بڑھاؤں گا اور نہ اس سے کم کرونگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اس شخص نے سچ کہا ہے تو فلاح پا گیا (مسلم شریف)۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس نے فرائض اور شرائع اسلام پر کوئی چیز بڑھانے اور اس سے کم کرنے میں حلفاً نفی کر دی اور اس پر اس کو مفلح قرار دیا گیا ہے۔ ان مجموعہ احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ جمعہ کا دن ہو یا غیر جمعہ کا ہمیشہ دن رات میں پانچ نمازیں عین فرض ہیں جمعہ کے دن اگر جمعہ فرض ہوگا تو ظہر ساقط ہوگی۔ اور جس پر جمعہ فرض نہیں اس پر ظہر ہے۔ عدد پانچ ہی کا رہے گا اگر جمعہ اور ظہر دونوں فرض کہے جائیں یا فرض کے طور پر پڑھے جائیں تو جمعہ کے دن چھ نمازیں مستقل قرار پاتی ہیں جو ان حدیثوں کے سراسر خلاف ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ کے ساتھ ظہر بھی پڑھنا پانچ نمازوں میں ایک نماز بڑھانا ہے جس سے فلاح نہ ہوگی۔

احتیاطی ظہر باطل ہونے کی پانچویں دلیل: کتب حدیث میں یہ حدیث مشہور ہے اور مسلم کل ہے کہ آنحضور ﷺ نے یہ فرمایا "انماالاعمال بالنیات وانمالامرىء مانوى" یعنی اعمال کا اعتبار اور قبولیت نیت کی بنا پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی چیز ہے جسکی اس نے نیت کی ہے۔ اس حدیث کو ثلث اسلام اور قاعدہ کلیہ قرار دیا گیا ہے۔ اور اس حدیث کی صحت، عظمت اور کثرت فوائد پر اہل اسلام کا اجماع ہے اور امام شافعی نے فرمایا ہے کہ اس سے ستر باب فقہ کے مستفاد ہیں، اس حدیث میں کلمہ حصر کا اِنَّمَا وارد ہے جس پر جماہیر علماء اہل عربیہ اور اہل اصول نے اتفاق کیا ہے کہ یہ حصر کے لئے موضوع ہے۔

پس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اعمال شمار اور مقبول ہونگے، جو صحیح نیت کے ساتھ ہونگے اور جو بغیر تصحیح نیت کے ہونگے وہ مردود ہیں۔ پس نیت فرض اور منوی یعنی عمل کا یقین کر لینا شرط ہے۔ چنانچہ امام نووی شرح مسلم میں وانمالامرىء مانوى پر یہ فرماتے ہیں "قالوا فائدة ذكره بعد انماالاعمال بالنية بيان ان تعين المنوى شرط فلو كان على انسان صلوٰة مقضية لا يكفيه ان ينوى الصلوٰة الفائتة بل يشترط ان ينوى كونهاظهرا وغيرهاولولااللفظ الثانى لاقتضى الاول صحة المنية بلاتعيين اواوهم ذالك" یعنی اہل علم نے کہا کہ انماالاعمال بالنیۃ کے بعد رسول اللہ ﷺ کا انمالامرىء مانوى ذکر فرمانے کا فائدہ یہ ہے کہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ جس چیز کی نیت کی جائے اس کا معین کرنا شرط ہے، مثلاً کسی انسان کے ذمہ نماز فرض کی قضا ہو تو اس کو مجمل نیت کر لینی کافی نہیں ہے کہ میں فوت شدہ نماز کی قضائی دیتا ہوں، بلکہ شرط یہ ہے کہ اس کی تعیین کرے کہ فلاں وقت کی نماز یعنی ظہر ہے یا عصر ہے اگر یہ دوسرا جملہ نہ ہوتا تو پہلا جملہ مطلق نیت کا وہم ڈالتا تھا کہ وہ بھی صحیح ہے۔

امام نووی کے اس فائدہ کی تائید دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جو کہ یہ ہے کہ "عن عماربن ياسرقال من صام اليوم الذى يشك فيه فقدعصى اباالقاسم ﷺ" رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ، عمار بن یاسر سے روایت ہے

انہوں نے فرمایا کہ جس شخص نے روزہ رکھا شک کے دن بے شک اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔ یہ حدیث صحیح ہے اور لفظاً موقوف اور حکماً مرفوع ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب شعبان کی ۲۹ تاریخ کو چاند نظر نہ آئے اور شک پڑ جائے کہ کل رمضان ہے یا ۳۰ تاریخ شعبان ہے۔ ممکن ہے کسی علاقہ میں چاند نظر آگیا ہو اور ہم کو ابر یا غبار کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو پھر روزہ رکھ لیا کہ اگر چاند ثابت ہوا تو یہ روزہ رمضان کا ہے اور اگر نہ ثابت ہوا تو یہ روزہ نفلی ہے تو یہ ناجائز ہے روزہ نہ ہوگا بلکہ وہ نافرمان رسول ﷺ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے شک کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔

حنفیہ کی شائع کردہ مشکوٰۃ مترجم حاشیہ مظاہر حق صفحہ ۷۷ ا جلد دوم کے حاشیہ پر لکھا ہے ''مکروہ ہے اس طرح کی نیت کرنا کہ اگر کل رمضان ہو تو یہ روزہ رمضان میں محسوب ہو اور اگر رمضان نہ ہو نفل یا واجب میں محسوب ہو''۔

پس اس قاعدہ مدللہ منصوصہ سے ثابت ہوا کہ نماز احتیاطی باطل ہے بلکہ ان کا جمعہ بھی باطل ہے۔ جمعہ تو اس لئے کہ اس میں نیت متزلزل اور متذبذب ہے' اور احتیاطی نماز اس لئے کہ یہ بے ثبوت اور غیر مسنون عمل ہے۔

دونوں سے گئے پانڈے
نہ حلوہ ملا نہ مانڈے

کیونکہ نماز احتیاطی پڑھنے والوں کی کوئی بھی بالتعیین نیت نہیں ہے۔ نہ مستقل نیت جمعہ کی ہے اور نہ ظہر کی ہے۔ جمعہ بھی شک اور تردد سے پڑھتے ہیں' اور ظہر بھی شک و شبہ سے ادا کرتے ہیں' حالانکہ ہر ایک کی الگ الگ مستقل نیت کرنا فرض ہے۔ اگر فرض پڑھنا ہے تو فرض کی اور اگر نفل پڑھنا ہے تو نفل کی' جمعہ کے دن اگر جمعہ ادا کرنا فرض ہے تو اس کی نیت بالتعیین کرنا فرض ہے' اگر ظہر فرض ہے تو اس کی نیت بالتعیین کرے' اس طرح مجمل اور مشکوک نیت کرنا کہ جمعہ شک سے پڑھتا ہوں اگر جمعہ فرض ہے تو فرض ہو جائے ورنہ نفل کا ثواب ملے اسی طرح ظہر احتیاطی پڑھنا کہ اگر جمعہ ادا نہیں ہوا تو ظہر میرے ذمہ ہے اس کو ادا کرتا ہوں اور جمعہ نفل ہوا' اور اگر علم الٰہی میں فرض تھا اور وہ ادا ہو گیا تو یہ

ظہر نفل ہے پس جمعہ یا ظہر سے ایک فرض ہوگا اور ایک نفل ہوگا۔ یہ ظہر احتیاطی والوں کا ارادہ اور نیت ہوتی ہے۔ پس جیسے شک کے دن روزہ رکھنا حرام ہے اسی طرح شک سے جمعہ اور ظہر پڑھنا عقلاً نقلاً درست نہیں ہے کیونکہ خراب ہے نہ قطعی فرض کی نیت ہے اور نہ قطعی نفل کی ہے۔ اس لئے اس کو وسوسہ شیطانی قرار دیا گیا ہے۔ اور شک والی عبادت معتبر نہیں ہے' اور نہ دو فرضوں کو شک سے پڑھنا کسی دلیل سے ثابت ہے۔ اور یہ دو کشتیوں پر ایک ایک پاؤں رکھ کر سوار ہونا ہے ایسا شخص غرق ہونے سے نجات نہیں پا سکتا۔

احتیاطی باطل ہونے کی چھٹی دلیل: احتیاطی پڑھنے میں علماء اور فرقہ بعد لوگوں کا بڑا تنازعہ اور جھگڑا ہے بعض اس کو بالکل ناجائز کہتے ہیں اور بعض جائز تصور کرتے ہیں' مسائل مختلف فیہا اور متنازعہ کے فیصلہ میں قرآن مجید نے یہ اصول بتایا ہے کہ "فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول" یعنی اے مومنو! جب تمہارا باہمی نزاع کسی چیز میں واقع ہو جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو' یعنی قرآن و حدیث پر فیصلہ کر لو' سو ہم اس نزاع کو قرآن و حدیث کی طرف لوٹاتے ہیں تو قرآن میں یہ لکھا ہے کہ "ام لھم شرکاء شرعوالھم من الدین مالم یاذن بہ اللہ" (سورہ شوریٰ) یعنی کیا ان کے ایسے شریک ہیں جو ان کے لئے دین میں وہ چیزیں شروع کرتے ہیں جن کا اذن اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ شریعت اور شریعت کے امور مقرر کرنا اور نافذ کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ وہ اپنے رسول کی معرفت مقرر کرے۔ سو اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں مقرر کر دی ہیں اور جمعہ کے دن جمعہ کی نماز مقرر کر دی ہے۔ اگر جمعہ سے رہ جائے تو ظہر پڑھ لے پس جمعہ اور ظہر دونوں پڑھنا اور اس ظہر کا نام احتیاطی ظہر رکھنا شرع جدید ہے' جس کو اللہ نے مقرر نہیں کیا یہ لوگوں نے اپنے قیاس سے شرع بنالی ہے' اور ایسی شرع بنانا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا ہے کیونکہ "ان الحکم الا اللہ" یعنی حکم تو صرف اللہ کا ہے اور فرمایا "و لا یشرك فی حکمه احدا" اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ پس اہل رائے نے جو اپنی رائے سے ظہر احتیاطی ایجاد

کر کے دین میں ملادی یہ خدا کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ اللہ اس سے مسلمانوں کو بچائے۔ (آمین)

احتیاطی کے باطل ہونیکی ساتویں دلیل : حدیث میں وارد ہے کہ میرے بعد بہت اختلاف ہو گا تم اس وقت میری سنت اور خلفاء راشدینؓ کے طریقہ کو لازم پکڑ لینا' یعنی حدیث اور تعامل خلفاء راشدینؓ پر جمع رہنا اور دین میں نئے کام پیدا کرنے سے پرہیز کرنا' کیونکہ دین میں ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (مشکوٰۃ) جب مسائل میں اختلاف ہو تو اس کو رسول کی طرف لوٹانے کا حکم تھا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو یہ معیار بتادیا کہ ہر کام میں میری سنت اور میرے خلفاءؓ کا طریقہ دیکھو اگر وہ کام میں نے کیا ہے یا میرے خلفاءؓ نے کیا ہے تو تم کر لو ورنہ چھوڑ دو کیونکہ دین میں نیا کام بدعت ہے اور بدعت وہی کام ہے جس کو حضور ﷺ نے اور صحابہؓ اور خلفاءؓ نے نہ کیا ہو اور بعد میں لوگوں نے رائے قیاس سے نکالا ہو' سو احتیاطی نماز آنحضور ﷺ نے پڑھی اور نہ خلفاءؓ نے پڑھی ہے اور نہ دیگر صحابہؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ اور ائمہ محدثینؒ میں سے کسی ایک نے۔ یہ تو شیعہ اور معتزلہ اور اہل رائے نے محض وسوسہ اور شبہ سے ایجاد کی ہے لہٰذا بدعت ہے۔

بعض لوگ ایسی بدعتوں کو بدعت حسنہ کے بہانے سے کر لیتے ہیں ان کو واضح ہو کہ مجالس الابرار میں لکھا ہے "ان کل بدعة فی العبادات البدنية المحضة لاتكون الاسئية" یعنی عبادات بدنی میں (ہر نیا کام) بدعت سیئہ ہی ہوتی ہے حسنہ نہیں ہوتی۔ اس لئے حضرت علیؓ نے نماز عید الفطر سے پہلے عید گاہ میں نفل پڑھنے سے منع کر دیا تھا کہ اس سے ثواب نہیں ملتا' بلکہ یہ گناہ ہے۔ (مجالس الابرار) پس نماز احتیاطی کے باطل ہونے پر یہ سات دلائل ہیں' جو ہفت افلاک ہیں جن کے ذریعہ ہر منصف انسان عرش مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

فقہاء عظام اور نماز احتیاطی : مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی حنفی نے بھی شرائط کے فقدان اور تعدد جمعہ کے عدم جواز کو اس کا سبب ایجاد قرار دیا ہے' چنانچہ فرماتے ہیں' ہر شخص کو تردد اداء جمعہ اور سقوط ظہر رہتا ہے' اس وجہ سے لوگوں نے

ایجاد احتیاط ظہر کا کیا تھا' اگر جمعہ ادانہ ہوگا' تو ظہر بالیقین ادا ہو جائے گی اور جمعہ ادا ہو گیا' تو یہ رکعات نفل ہو جائیں گی' یہ اصل اس کی ہے (منقولہ از فتاویٰ نذیریہ جلد ا صفحہ ۳۷۲) اس صراحت سے یہ امر صاف روشن ہو گیا کہ اس نماز کا ثبوت قرآن و حدیث و تعامل صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ وائمہ مجتہدینؒ و محدثینؒ سے بالکل نہیں ہے یہ تو معتزلہ نے ایجاد کی ہے اور متاخرین نے ان کی اتباع بے دلیل محض شک اور تردد میں پڑ کر کی ہے' اور موجودہ احتیاطی ادا کرنے والے ان کی تقلید میں پڑھتے چلے جاتے ہیں' اور سب مکھی پر مکھی مار رہے ہیں' شریعت میں نہ اس کا ثبوت ہے نہ کوئی دے سکتا ہے۔

علامہ ابن الہمام نے کیا اچھا لکھا ہے "وکثیر مایقلد الساھون الساھین" یعنی اکثر یہ عمل ہو رہا ہے کہ بھولے ہوئے' بھولے ہوئے لوگوں کی تقلید کر رہے ہیں (فتح القدیر باب نکاح الرقیق) گمراہ فرقوں کا تمام سلسلہ اسی طرح ہے کہ نہ وہ ادلہ شرعیہ کا ثبوت دیکھتے ہیں اور نہ صحابہؓ و تابعینؒ وغیرہم کا تعامل پیش نظر رکھتے ہیں' صرف تقلید یا محض ظن سے کام چلا رہے ہیں جو صاف گمراہی ہے "ان ھم الایظنون" کیا عجیب فرمان الٰہی ہے کہ لوگ اپنے واہی تباہی خیالوں پر جمے ہیں۔

اس نماز احتیاطی کی بابت بعض کتب فقہ میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اس کو کسی مکان میں ادا کیا جائے جن متاخرین معتزلہ حنفیوں نے اس کو ایجاد کیا ہے انہوں نے اس کے خفیہ پڑھنے کی تاکید کی ہے' چنانچہ ہمارے رسالہ "احتیاط الظہر" میں اس کی تفصیل ہے' لیکن حنفیوں نے اس کو اعلانیہ پڑھنا شروع کر دیا ہے جس کا راز کھل گیا تو پھر اس سے مفاسد پیدا ہو گئے' جس سے متاثر ہو کر خود اس کے پڑھنے والوں نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ جاری کر دیا فسادات یہ ہیں "فھذہ علة الاعتزال وفیه تھمة المسلمین وانھم یقیمون التطوع بالجماعة ویترکون الجماعة فی الفرض وھذا فاسدوانه من جھال الشیطان و فسادعلم الاسلام وھوالجمعة" (فتاویٰ تاتارخانی) یعنی یہ کہ جمعہ کے دن ظہر فرض جمعہ فرض نہیں ہے' یہ معتزلہ کی پھیلائی ہوئی بیماری پیدا ہو گئی اور اس سے مسلمانوں پر تہمت لگ گئی۔ دوم نماز جمعہ کو نفل تصور کر کے جماعت سے ادا کیا (حالانکہ بزعم ان کے یہ نفلی نماز ہے جو باجماعت

درست نہیں ہے)اور ظہر کو فرض سمجھ کر بغیر جماعت کے پڑھا جو طریقہ فاسد ہے اور یہ جاہل لوگوں کا کام ہے اس سے جمعہ جو اسلام کا جھنڈا تھا گر گیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ معتزلہ حنفیوں نے جمعہ کے شرائط نہ پائے جانے کے سبب اس کو نفل تصور کر لیا' اور جمعہ فرض کی طرح اس کو پڑھا' اذان دی اور جماعت وخطبہ سے ادا کیا' یہ فساد اول ہے کہ نماز جمعہ فرض ہے اور اس کے فرض عین ہونے پر تمام امت کا اجماع ہے' اس کو نفل اعتقاد کر لیا اور نفل کی نیت سے ادا کیا' حالانکہ نفل اس طرح ادا کرنا ناجائز ہے' اور کتب فقہ میں بھی مکروہ لکھا ہے' دوسرا فساد یہ ہے کہ ظہر کو فرض سمجھا حالانکہ جمعہ کے دن نماز جمعہ فرض ہے ظہر فرض نہیں ہے' پھر اس کو بغیر جماعت کے ادا کیا حالانکہ فرض ظہر جماعت سے ادا کیا جاتا ہے یہ جہالت کا کام ہے جس سے جمعہ کو سخت نقصان پہنچا ہے اور اسلام کا یہ جھنڈا بے کار ہو گیا۔

بحر الرائق میں لکھا ہے "وكان كثر ذلك اى نسبة عدم فرضية الجمعة الى الامام من جهلة زماننا ايضا ومنشاء جهلهم صلوٰة الاربع بعد الجمعة بنية الظهر" یعنی یہ بدنامی بہت پھیل گئی کہ جمعہ کی نماز فرض نہ ہونے کا مسئلہ امام ابو حنیفہؒ کی طرف نسبت کرنے لگے' یہ بات ہمارے زمانہ کے جاہل لوگوں نے کی اور اس کا سبب یہ ہوا کہ جمعہ کے بعد ظہر کی نیت سے چار رکعت پڑھنی شروع کر دیں' اس سے تیسرا فساد ظاہر ہوا کہ جمعہ کی نماز فرض نہ ہونا حنفی مذہب کی طرف نسبت کیا اور اس کو امام ابو حنیفہؒ کا مذہب قرار دیا جو صریح جھوٹ اور محض جاہلوں کا پروپیگنڈہ ہے' امام ابو حنیفہؒ جمعہ کے دن نماز جمعہ کو فرض جانتے تھے۔

در مختار میں ہے "قد افتيت مرارا بعدم الصلوٰة الاربع بعدها بنية الظهر خوف عدم فرضيتها فى زماننا" یعنی میں نے اس نماز احتیاطی کے ناجائز ہونے کا کئی بار فتویٰ دیا ہے' اس خوف سے کہ لوگ جمعہ کو فرض نہیں سمجھتے (حالانکہ یہ فرض عین ہے) تنویر الابصار میں ہے "بلزم من فعلها فى زماننا من المفسدة العظيمة وهو اعتقاد الجهلة ان الجمعة ليست بفرض فيتكاسلون عن اداء الجمعة" یعنی ہمارے زمانے میں نماز احتیاطی سے بڑا فساد لازم آگیا ہے اور وہ یہ کہ جاہلوں نے جب دیکھا کہ جمعہ کے بعد ظہر پڑھتے ہیں تو انہوں نے یہ

اعتقاد کر لیا کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ فرض نہیں ہے۔ ظہر فرض ہے اور وہ جمعہ کی نماز ادا کرنے میں سستی کرنے لگے۔

فقہاء حنفیہ کی ان عبارتوں سے واضح ہو گیا ہے کہ نماز احتیاطی میں بڑے مفاسد پیدا ہو گئے' اور بجائے فائدہ کے اعتقادی اور عملی نقصان ہوا اس لئے اس کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا گیا' اب یہ ناجائز ہے کیونکہ اہل علم میں یہ قاعدہ مسلم ہے کہ " ان درء المفاسدمقدم علی جلب المنافع والمصالح" یعنی مفاسد کا دفع کرنا منافع اور مصالح حاصل کرنے پر مقدم ہے' مثلاً شراب اور جوا کے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مفاسد بھی بتائے ہیں اور منافع بھی فرمائے ہیں لیکن منافع پر مفاسد کو ترجیح دیکر شراب حرام کر دی اور جوا بھی منع کر دیا' اسی طرح نماز احتیاطی منع ہے اور موجب فساد ہے' چنانچہ ہمارے زمانے میں اس سے ایک اور مفسدہ عظیمہ پیدا ہو گیا ہے کہ جمعہ کے دن چھ نمازیں مستقل ہونے کا اعتقاد پیدا ہو گیا' کیونکہ انہوں نے یقین کیا کہ شک اور شبہ سے نماز احتیاطی پڑھنا شیطانی اثر ہے' چنانچہ فتاویٰ تاتارخانی میں ہے "قال السیدالھمنی ربی بان اداء الجمعة بالشبھة من وسوسة الشیطان" یعنی ہمارے سید صاحب نے فرمایا کہ مجھے رب نے الہام کیا ہے کہ جمعہ کو شبہ سے ادا کرنا شیطانی وسوسہ ہے جب جمعہ یقینی طور سے ادا ہو گیا تو ظہر بیکار ہو گئی کیونکہ جمعہ شکی ادا ہونے کی بنا پر ظہر احتیاطی جاری کی گئی تھی' تب انہوں نے مذہب اعتزال کو پختہ کرنے کے لئے یہ دعویٰ کر دیا کہ جمعہ کے دن چھ نمازیں مستقل ہیں' چنانچہ مولوی محمد حسن صاحب فیض پوری نے نماز احتیاطی کے ثبوت میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں بہت طول طویل بحث کی ہے اور اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ سب سے اول نماز ظہر فرض تھی پھر جمعہ فرض ہوا' تو دوسری چیز کے فرض ہونے سے پہلی فرض نماز منسوخ نہیں ہو جاتی' اسی طرح اور اختراعی خیالات اور وہمی دلائل ذکر کر کے لوگوں میں یہ اعتقاد جمایا ہے کہ جمعہ کے دن چھ نمازیں مستقل ہیں۔ یہ بروئے قرآن واحادیث وتعامل سلف صالحینؒ واجماع امت سراسر باطل ہے' یہ مفسدہ عظیمہ سب مفاسد سے بدترین ہے اس لئے ان تمام مفاسد کے پیش نظر نماز احتیاطی بالکل ناجائز ہے۔ مولانا رشید احمد صاحب اپنے فتویٰ میں فرماتے ہیں حنفیوں کا یہ عمل

پسند نہیں' اول تو یہ احتیاط وجوب کے درجہ کو پہنچی اور خود بدعت ہے' دوسرے بعضے اولی النزاع آپس میں جھگڑا اٹھانے والے ہو گئے (تاآخر) پس نماز احتیاط لغو ہے۔ یہ کیا بے موقع بات ہے کہ شرط جمعہ موجود نہیں اور فقط تردد کی وجہ سے نوافل باجماعت ادا کریں اور فرض ظہر کو تنہا تنہا پڑھیں' کس قدر خلاف عقل طرز عمل ہے۔

تاتارخانی کے چالیس مجتہد حنفی یہ لکھتے ہیں "لایجوز اعادة فرض الظهر بعد الجمعة یقیناً ولا شکاً" یعنی نماز احتیاطی یقینی طور سے جائز ہے اور نہ شکی طور سے جائز ہے' بہر صورت منع ہے اور بحر الرائق میں بھی ہے کہ جاہلوں کے اعتقاد خراب ہونے کے باعث اس کے ناجائز ہونے کا کئی بار فتویٰ دیا گیا ہے کہ 'بعد جمعہ ظہر نماز کے ترک میں احتیاط ہے۔ کسی اختلافی صورت میں اقویٰ دلیل پر عمل کرنے کا نام احتیاط ہے' دو نمازوں کو شک و شبہ سے پڑھنا احتیاط نہیں ہے یہ شیطانی وسوسہ ہے' تنویر الابصار میں ہے "فلیس الاحتیاط فی فعلهما باقوی الدلیلین وقد علمت ان مقتضی الدلیل هو الاطلاق" یعنی یہ وہ احتیاط نہیں ہے جو دو مخالف دلیلوں میں سے اقویٰ دلیل پر عمل ہوتا ہے یہ معلوم ہے کہ دلیل کا اقتضا یہ ہے کہ جمعہ مطلق فرض ہے' نیز لکھا ہے "فکان الاحتیاط فی ترکها" یعنی احتیاط اس میں ہے کہ اس کو چھوڑا جائے "اطفاء الشمعه" حصہ دوم صفحہ ۲۲۶ میں ہے "لایعید فرض الظهر الامعتزلی بسبب السلطان اور افضی بسبب کون الامام علی زعمهم غائبا" یعنی ظہر احتیاطی پڑھنے والا یا تو معتزلی ہوگا' بادشاہ کے ظلم کی سبب سے یا رافضی ہوگا' ان کے اس خیال کے سبب کہ امام مہدی غائب ہے۔ الغرض نماز احتیاطی حنفی سلفیوں کے نزدیک ناجائز ہے اور اب بھی اہل انصاف حنفی اس کو بدعت تصور کرتے ہیں یا لغو کہتے ہیں' صرف اہل بدعت اس کے رائج کنندہ ہیں۔

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

(قوانین فطرت جلد ۷ شمارہ ۱، ۲، ۳، ۴ بابت ماہ جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۶۰ء)

قصر نماز کے لیے کتنی مسافت شرط ہے؟

''الاعتصام'' لاہور ۱۸ اپریل ۱۹۶۹ء میں ''باب المسائل والاحکام'' کے تحت ایک سائل کا سوال یوں درج ہوا ہے: کتنے میل کے فاصلہ پر قصر کرنا جائز ہے؟ مولانا محمد علی صاحب جانباز نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ: ''نماز قصر کی رخصت کے لیے درحقیقت شارع علیہ السلام نے کوئی حد مقدار مسافت مقرر نہیں فرمائی۔ جس حد تک کوئی شخص عرف عام کے مطابق مسافر سمجھا جاتا ہے بس اسی حد تک یا اس سے زیادہ فاصلہ کے لیے مسافر نماز قصر کی رخصت کا مستحق ہے'' انتہیٰ۔

میں کہتا ہوں یہ جواب غلط ہے۔ مولانا نے اس پر کوئی دلیل شرعی نہیں دی صرف چند بزرگان دین کے اقوال عدم علم مسئلہ حد مسافت پر لکھ دیئے ہیں۔ خود کوئی تحقیق نہ کر سکے۔ حالانکہ مسافر کے لیے مسافت کی حد بندی صحیح اور صریح حدیث مسلم شریف میں موجود ہے۔ جس کو مولوی محمد علی صاحب نے نقل کیا ہے' حدیث یہ ہے ''عن انس قال کان رسول اللہ ﷺ اذا خرج مسیرۃ ثلاثۃ امیال او فراسخ یصلی رکعتین'' (صفحہ ۲۴۲ جلد ۱) ''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ جب تین میل یا فرسخ سفر کو نکلتے تھے تو (رباعی نمازوں کو) دو دو رکعت پڑھا کرتے تھے''۔ اس حدیث میں شعبہ راوی کو شک ہے کہ حضرت انسؓ نے تین میل کہے یا تین فرسخ۔ لیکن دوسری حدیث سے تین میل کی تعیین پائی جاتی ہے۔ لہٰذا دوسرا احتمال رفع ہوا' وہ حدیث یہ ہے ''عن ابی سعید رضی اللہ عنہ انہ قال کان رسول اللہ ﷺ اذا سافر فرسخا یقصر الصلوٰۃ'' رواہ سعید بن منصور۔ ''ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ایک فرسخ کی مسافت کا سفر فرماتے تو نماز قصر کیا کرتے تھے۔

فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ تو یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کا بیان قرار دی جائے گی' کہ وہاں تین میل کا لفظ صحیح ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو مولوی محمد علی جانباز نے دو احتمال ظاہر کیے ہیں: ایک یہ کہ اس میں طویل سفر کا احتمال ہے کہ سفر طویل میں اقامت کی جگہ سے تین میل یا تین فرسخ دور ہو کر دوگانہ شروع کرتے تھے۔ دوسرا احتمال تحدید سفر کا ہے' یہ احتمال قوی ہے کہ اس پر لفظ کان اور اذا اور لفظ یصلی وغیرہ پائے جاتے ہیں جو دوام اور استمرار پر دلالت کرتے ہیں اور طویل سفر کے لیے تین

میل پر قصر کرنا کوئی معمول بہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی قائل ہے۔

بلکہ اپنے شہر یا گاؤں کو چھوڑ کر نکلنے پر دوگانہ شروع کر دینا جائز اور درست ہے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح میں سبل السلام میں امیر صنعانیؒ ارشاد فرماتے ہیں "المراد من قوله اذا خرج اذا كان قصده مسافة هذا القدر" یعنی حدیث میں اذا خرج سے مراد یہ ہے کہ جب اس قدر مسافت کا ارادہ کرتے تو نماز قصر شروع کر دیتے تھے پھر لکھتے ہیں "لان المراد انه كان اذا اراد سفراً طويلا فلا يقصر الا بعد هذه المسافة" یعنی اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ اگر طویل سفر کا ارادہ کرتے تو پھر تین میل کی مسافت پر قصر کرتے تھے۔

پس دوسرے احتمال کی نفی ہو گئی کیونکہ یہ احتمال بعید تھا' جس پر کوئی دلیل نہ تھی۔ اور احتمال وہ حارج ہوتا ہے جو بظاہر قریب ہو اور کسی دلیل سے پیدا ہوا ہو۔ پس جب پہلے احتمال کی تعیین ہو گئی کہ تین میل کی مسافت کے ارادہ کے سفر کرنے پر قصر نماز کی جائے گی تو مسافر کے لیے مسافت کی حد بندی پائی گئی۔ اس لیے ماہرین حدیث نے اس حدیث کو مسافر کے لیے مسافت کی حد بندی میں صریح قرار دیا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی صاحب جانباز نے حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث مسافر کی حد بندی میں صریح ہے۔

اور تلخیص الحبیر صفحہ ۱۲۹ میں مذاہب کا اختلاف نقل کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ نے اس پر یہ تنبیہ کی ہے "يعارض من هذا ماروواه مسلم عن يحيى بن يزيد الهنائي سالت انس بن مالك عن قصر الصلوٰة قال كان رسول الله ﷺ اذا خرج ثلاثة اميال او ثلاثة فراسخ صلى ركعتين" یعنی پہلے مسافت کی حد جو اقوال سلف سے نقل کی گئی ہے ان کے معارض مسلم کی یہ حدیث یحییٰ بن ھنائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ نماز قصر کتنی مسافت پر ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت ﷺ تین میل یا تین فرسخ کی مسافت کے لیے سفر کرتے تو نماز قصر پڑھتے تھے۔ اس کے بعد امام حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں "وهو يقتضى الجواز فى اقل من ثلاثة فراسخ وروى سعيد بن منصور عن ابى سعد رضى الله عنه قال كان رسول الله ﷺ اذا سافر فرسخا يقصر الصلوٰة" یعنی یہ حدیث چاہتی ہے کہ قصر نماز تین فراسخ سے کم میں بھی جائز ہے۔ اور اس پر یہ حدیث سعید بن منصور والی بھی دلیل ہے' جس میں

آنحضرت ﷺ کا ایک فرسخ پر نماز قصر کرنا ثابت ہے اور کتاب شرح مشکوٰۃ مرعاۃ المفاتیح جلد۲ اور صفحہ ۲۵۵ میں لکھا ہے "ذهب الظاهرية كما قال النووی ای ان اقل مسافة القصر ثلاثة اميال و كانهم احتجوا فی ذالك بما رواه مسلم و ابو دائود من حديث انس رضى الله عنه" یعنی ظاہریہ کا یہ مذہب کہ مسافر کے لیے مسافت کی حد تین میل ہے۔ اور وہ حدیث انسؓ سے دلیل دیتے ہیں۔

اور حدیث انس رضی اللہ عنہ پر حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں "قال الحافظ وهوا صح حديث ورد فی بيان ذالك واصرحه" یعنی حدیث مسلم کی مسافت کے حد بیان میں نہایت صحیح اور بہت صریح ہے۔ اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ محلیٰ ابن حزمؒ جلد۵ صفحہ ۸ میں ہے "باسناده عن محمد بن زيد فليدة عن ابن عمر وقال تقصر الصلوٰة فی مسيرة ثلاثة اميال" یعنی عبداللہ بن عمرو نے فرمایا کہ نماز قصر کے لیے تین میل مسافت کی حد ہے۔ چنانچہ امام شوکانیؒ نے مسافت کی حد بندی پر اختلاف اقوال نقل کرتے ہوئے حدیث مسلم کی روایت تین فرسخ کی مسافت کو متیقن ٹھہرایا ہے اور پھر یہ لکھا ہے "لكنه روى سعيد بن منصور عن ابی سعيد قال كان رسول الله ﷺ اذا سافر فرسخاً يقصر الصلوٰة وقد اورد الحافظ هذا فی التلخيص ولم يتكلم عليه فان صح كان الفرسخ هوالمتيقن ولا يقتصر فيما دونه" یعنی سعید بن منصور کی روایت جو ابن حجرؒ نے تلخیص میں ذکر کر کے اس پر کوئی جرح نہیں کی۔ وہ اگر صحیح ہو تو یہ امر متیقن ہو جاتا ہے کہ مسافت کی مقدار تین میل ہے۔ اس سے کم مسافت میں قصر جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ سعید بن منصور کی روایت صحیح ہو تو فھو المراد' اگر صحیح نہ ہو تب بھی دو احتمالوں میں سے ایک احتمال کو ترجیح دینے میں کافی ہے۔ اور سنن ابوداؤد میں امام ابوداؤد نے یہ باب منعقد کیا ہے' باب متی یقصر المسافر' یعنی مسافر کتنی مسافت میں نماز قصر کرے؟ پھر اس کے تحت وہی حدیث ذکر کی ہے جو مسلم کے حوالے سے حضرت انسؓ سے نقل کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ حدیث مسافت کی مقدار بیان کرنے میں صحیح اور صریح ہے۔

اگر عرف عام میں مطلق سفر کو لیا جائے تو بھی تین میل کی مقدار صحیح رہے

گی۔ چنانچہ علامہ وحید الزمان ابوداؤد کے ترجمہ پر فائدہ لکھ کر یوں فرماتے ہیں' لیکن صحیح اور مختار قول اس باب میں جس پر ہمارے مشائخ ہیں یہ ہے کہ' جس کو عرف عام میں سفر کہیں اس میں قصر درست ہے اگرچہ وہ تین میل ہے۔ یہی قول ہے داؤد ظاہریؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا اور دلیل ان کی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے جو اس باب میں سب حدیثوں سے بہتر ہے' انتہیٰ۔ میں کہتا ہوں حدیث انس رضی اللہ عنہ جو بروایت مسلمؒ ذکر ہوچکی ہے۔ اور حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جس کو سعید بن منصور نے روایت کیا ہے ہر دو مسافت کی مقدار بیان کرنے میں صریح ہیں۔ اور عرف عام میں بھی مطلق نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس حدیث کی رو سے عرف عام بھی تین میل سے شروع ہوگا۔ اور یہی حق اور صحیح ہے۔ اگر عرف عام کو مطلق چھوڑا جائے تو عوام کو بلکہ خواص کو بھی حد بندی معلوم نہ ہوگی۔ اس لیے عرف عام کو اس حدیث کے مطابق رکھنا چاہیئے۔

پس مولانا محمد علی صاحب نے مسافت کی مقدار کو معین کیے بغیر عرف عام پر چھوڑ دیا ہے' یہ مخدوش ہے کہ اس سے مسافت کی حد بندی متعین نہیں ہوسکتی اور عوام کوئی اندازہ نہیں کرسکتے۔ جب تین میل کی حد بندی ہوگی تو اس کو ہر شخص معلوم کرسکتا ہے اور عرف عام بھی اس کا موئید ہے۔ اکثر اہلحدیث' حدیث انس رضی اللہ عنہ کے پیش نظر نو (۹) میل مسافت کی حد بتاتے ہیں کہ تین بھی اس میں داخل ہیں۔ یقین اور احتیاط اسی میں ہے۔ میرا بھی پہلے یہی خیال تھا لیکن حدیث سعید بن منصور نے اس خیال کو بدل دیا' اب متعین تین میل ہی ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ باری
تنظیم اہلحدیث لاہور مورخہ ۲ اپریل ۱۹۷۱ھ۔

تعاقب بر فتوائے قصر در سسرال

راقم کے پاس تائید یا تردید کے لئے حسب ذیل فتویٰ آیا ہے۔

سوال یہ تھا کہ داماد سسرال جائے تو وہاں دوگانہ ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟ جواب حسب ذیل ہے۔

''سسرال کے ہاں داماد کی جائیداد یا سکونتی مکان نہ ہو اور سسرال کا گھر مسافت قصر یعنی تین فرسخ (نوکوس) پر واقع ہو پھر وہاں تین دن تک قیام کرنا ہو تو اسے سسرال کے ہاں تین روزہ قیام میں نماز قصر یعنی دوگانہ پڑھنے کا حق ہے اور انشاء اللہ دوگانہ پڑھنے میں اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے سسرال کے ہاں پوری نماز پڑھی تھی۔ اس کے بارے میں عرض ہے کہ:

(۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نزدیک اگرچہ قصر جائز ہے تاہم وہ سفر میں پوری نماز کو افضل جانتے تھے۔

(۲) وہ خلیفۃ المسلمین تھے اور وہ سمجھتے تھے میری پوری قلمرو پر جائے رہائش ہے۔

(۳) یہ کہ مکہ معظمہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جائیداد یعنی رہائشی مکانات تھے گویا وہ مکہ معظمہ کے باشندے تھے۔ علاوہ ازیں یاد رہے کہ سسرال کا رشتہ عارضی ہے اور یہ کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے لہٰذا سسرال کے گھر کو اپنی رہائش گاہ تصور کرنا پرلے سرے کی حماقت اور سادگی ہے، بہرحال کسی صحیح حدیث میں یہ وضاحت نہیں ملتی کہ سسرال کے گھر میں داماد کو قصر یعنی دوگانہ پڑھنا جائز نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (محمد عبیداللہ بقلم خود، صدر مدرس دارالحدیث محمدیہ ملتان)۔

تعاقب: واضح ہو کہ مفتی صاحب موصوف الصدر کے فتویٰ کے تین حصے ہیں اول حصہ میں ان کا اپنا مسلک اور عندیہ درج ہے کہ داماد کو سسرال کے گھر میں بحالت سفر دوگانہ پڑھنا جائز ہے مسئلہ چونکہ مختلف فیہ ہے اس لیے ہر شخص ذی علم کو اختیار ہے کہ اپنی علمی تحقیق کے مطابق کسی مسلک کو اختیار کرلے اگر اسی حد تک مسئلہ رہتا تو تعاقب یا تنقید کی حاجت نہ تھی کیونکہ ''سمجھ اپنی اپنی پسند اپنی اپنی'' دوسرے حصہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ اتمام نماز کے بارہ میں تاویلات سے کام لیا ہے جن کو عموماً علماء محققین نے تسلیم نہیں کیا۔ فتویٰ کے تیسرے حصہ میں ان لوگوں کے حق میں حماقت کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے جو یہ مسلک رکھتے

ہیں کہ داماد مسافر کو اپنے سسرال کے گھر میں آکر پوری نماز پڑھنی چاہئے دوگانہ نہ پڑھنا چاہئے۔ حالانکہ جن لوگوں کا یہ مسلک ہے وہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں جو الرحمۃ المہداۃ فصل رابع مشکوٰۃ کے صفحہ ۲۹ میں درج ہے "عن عثمان بن عفان انه صلی بمنی اربع رکعات فانکر الناس علیه فقال یا ایھاالناس انی تاھلت بمکة منذ قدمت وانی سمعت رسول الله ﷺ یقول من تاھل فی بلد فلیصل صلوٰة المقیم رواه احمد" یعنی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بموقعہ حج باوجود مسافر ہونے کے منیٰ میں چار رکعت پڑھیں تو اس پر لوگوں نے اعتراض کرنا شروع کردیا کہ آپؓ نے مسافر ہونے کے باوجود چار رکعت کیوں پڑھیں یہ نماز تو مقیم کی ہے تب حضرت عثمانؓ نے لوگوں سے یہ خطاب کیا کہ اے لوگو! میں جب سے مکہ معظمہ میں آیا ہوں یہاں شادی کرلی ہے اور میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں شادی کرلے تو وہ مقیم کی طرح نماز پڑھے' (مسند امام احمد)۔

اس حدیث پر اگرچہ بعض محدثین نے جرح کی ہے مگر امام احمد اور امام ابوحنیفہؒ کا یہ مذہب ہے کہ جب کوئی صحیح حدیث معارض نہ ہو تو رائے قیاس کرنے سے ضعیف حدیث پر عمل کرنا مناسب ہے۔ پس سسرال میں مسافر داماد کو بروئے اس حدیث نماز پوری پڑھنی چاہیئے۔ اس حدیث کے معارض کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے کہ مسافر کو سسرال میں بھی دوگانہ پڑھنا ضروری ہے، مفتی صاحب اس حدیث کو نہ مانیں تو یہ ان کا اختیار ہے لیکن اس حدیث کی رو سے جو شخص سسرال کے گھر میں پوری نماز پڑھے جبکہ مسافر کو ویسے بھی اتمام روا ہے تو پھر موصوف کا یہ قیاس کہ سسرال کا رشتہ عارضی ہے جو کسی وقت ٹوٹ سکتا ہے، لہٰذا سسرال کے گھر کو اپنا گھر تصور کرنا پرلے درجہ کی حماقت اور سادگی ہے۔ کیا مفتی صاحب کسی شرعی دلیل سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ نماز قصر کا دارو مدار اصلی اور عارضی رشتوں پر ہے؟ ھاتوا برھا نکم ان کنتم صادقین اچھا مفتی صاحب یہ بتائیں کہ تین دن تک آنجنابؒ نے دوگانہ جائز رکھا ہے جس سے یہ مترشح ہے کہ اگر چار پانچ روز کے قیام کا ارادہ ہو تو پوری پڑھے۔ بھلا اگر یہ داماد سسرال میں یا کسی جگہ چار پانچ روز کے قیام کا عزم بالجزم کرلے تو پھر مسافر پوری نماز پڑھے کہ اب یہ مقیم کے حکم میں ہوگیا، یہ قیام ارادی موجب اتمام مستقل ہے یا عارضی؟ اگر عارضی ہے تو پھر اس عارضی قیام میں اتمام کیوں ضروری ہے

یہ تو مسافر کے دوسرے تیسرے دن ارادہ بدلنے پر وہ کسی وجہ سے چل پڑا تو ٹوٹ گیا پھر اس عارضی قیام میں اتمام کیوں جائز ہوا؟ اگر قیام مستقل ہے تو یہ شق غلط ہے کیونکہ مسافر کا مستقل قیام تو اپنے گھر میں ہی ہوتا ہے۔ اچھا مفتی صاحب یہ مسئلہ بھی حل کریں کہ اگر کوئی مسافر ننھیال میں جا کر ٹھہرے تو نماز قصر کرے یا اتمام؟ اگر قصر کرے تو دلیل کیا ہے یہاں رشتہ حقیقی ہے۔ اسی طرح کسی گاؤں میں کسی مسافر کی لڑکی ہے یا ہمشیرہ بیاہی ہوئی ہے یا کسی بستی میں اس کی خالہ ہے تو ان کے گھروں میں ملنے کے لیے جائے اور دو تین روز قیام کرے تو نماز قصر کرے یا اتمام؟ اگر قصر کرے تو دلیل کیا ہے رشتہ تو مستقل ہے عارضی نہیں ہے اگر اتمام کرے تو کیوں؟ دلیل شرعی مقصود ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رشتہ داریوں کے لحاظ سے قصر اور اتمام موقوف نہیں ہے یہ نص تو سسرال کے بارہ میں وارد ہے دراصل ددھیال' ننھیال اور سسرال یہ اپنے گھر کا حکم رکھتے ہیں ان میں مسافر جائے تو دوگانہ نہ پڑھے اتمام کرے ہاں حضرت عثمانؓ والی روایت پر جرح کر کے بعض محدثین نے دوگانہ جائز رکھا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے لہٰذا حجت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ الرحمۃ المہداۃ کے مذکورہ حوالہ میں ایک متفق علیہ روایت ہے "عن عبداللہ بن زید قال صلی عثمان بن عفان بمنیٰ اربع رکعات" کہ حضرت عثمانؓ نے منیٰ میں چار رکعت پڑھیں دوگانہ نہیں پڑھا۔ یہ اتمام حضرت عثمانؓ کا سب علماءِ محدثین کو مسلّم ہے لیکن پھر اس اتمام کی تاویلیں اور توجیہات علماء نے مختلف کی ہیں جن سب کی تردید امام ابن القیمؒ نے زاد المعاد میں کی ہے۔ مثلاً مفتی صاحب نے اس کی پہلی تاویل یہ لکھی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے نزدیک اگرچہ قصر جائز ہے تاہم وہ سفر میں پوری نماز کو افضل سمجھتے تھے۔ یہ تاویل رجماً بالغیب لکھ دی ہے۔ اس پر مفتی صاحب نے کوئی ایسی نص نہیں پیش کی جو ان کے مذہب اتمام کی فضیلت پر دال ہو۔ ہاں اس کے خلاف روایت زاد المعاد کے صفحہ ۱۲۹ جلد ا میں ہے کہ ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں سفر میں جناب رسول اللہ ﷺ اور ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کے ہمراہ رہا ہوں کہ یہ سب دوگانہ سے زیادہ نماز نہ پڑھتے تھے۔ پس فضیلت کا دعویٰ باطل ہوا۔ دوسری تاویل یہ لکھی ہے کہ وہ خلیفہ تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ میری پوری قلمرو پر جائے رہائش ہے یہ تاویل بھی بلا دلیل ہے۔ امام ابن القیمؒ فرماتے ہیں "وھذا التاویل بان امام الخلائق علی الاطلاق رسول اللہ ﷺ کان ھوا ولی بذالک و کان

ھو الامام المطلق ولم یربع" یعنی یہ تاویل بھی مردود ہے کیونکہ آنحضورﷺ امام الخلائق اور امام مطلق تھے آپؐ دوگانہ پڑھتے رہے کسی مقام پر اترے تو پوری نماز چار رکعت نہیں پڑھی۔ میں کہتا ہوں دیگر خلفاء راشدین نے بھی دوگانہ پڑھا ہے کسی نے بھی کسی مقام پر اتر کر اتمام نہیں کیا تو پھر حضرت عثمانؓ ایسا کیوں کرتے تھے۔ یہ مذہب تو حنفیہ کا ہے کہ امام جہاں اتر پڑے وہی شہر ہے اور وہاں جمعہ پڑھنا جائز ہے۔ تیسری توجیہہ مفتی صاحب نے یہ لکھی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی مکہ معظمہ میں جائیداد تھی اور مکانات تھے۔ گویا آپؓ مکہ معظمہ کے باشندے تھے۔ یہ توجیہہ بھی غلط ہے۔ امام ابن القیمؒ اس تاویل کا بھی رد کرتے ہیں۔ "فان عثمانؓ من المھاجرین الاولین وقد منع النبیﷺ من الاقامة بمکة بعد نسکه ورخص لھم فیھا ثلاثة ایام فقط فلم یکن عثمان یقیم بھا" یعنی حضرت عثمانؓ مہاجرین اولین میں سے تھے تحقیق نبی کریمﷺ نے مہاجرین کو احکام حج پورے کرنے کے بعد مکہ میں مقیم ہونے سے منع فرمادیا تھا۔ صرف تین دن قیام کرنے کی رخصت دی تھی۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ میں مقیم نہ تھے۔ پھر جائیداد اور مکانات کے بارہ میں یہ لکھتے ہیں "وذالك لانھم ترکوھا للہ وماترك للہ فانه لایعا دفیه ولایسترجع الخ" یعنی مہاجرین نے اپنے مکانات اور جائیداد اللہ کے لیے چھوڑ دیے تھے۔ اس لیے وہ فی سبیل اللہ چھوڑی ہوئی جائیداد اور مکانات کی طرف رجوع نہیں کرسکتے تھے اور نہ ان کو واپس لے سکتے تھے جیسے متصدق کو اپنا صدقہ خریدنے سے منع کیا گیا ہے۔

پس مفتی صاحب کی تمام تاویلات غلط ہوگئیں یہی حال دیگر توجیہات کا ہے۔ امام ابن القیمؒ نے چھٹی تاویل یہ لکھی ہے "التاویل السادس انه کان قد تاھل بمنیٰ والمسافر اذا اقام فی موضع وتزوج فیه او کان له به زوجة اتم" یعنی چھٹی تاویل منیٰ میں پوری نماز پڑھنے کی یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں شادی کرلی تھی اور حکم شرعی یہ ہے کہ مسافر جس موضع میں شادی کرلے یا اس موضع میں اس کی اہلیہ موجود ہو تو وہ مسافر وہاں پوری نماز پڑھے پھر لکھتے ہیں "یروی فی ذالك حدیث مرفوع عن النبیﷺ" یعنی اس مسئلہ میں کہ جہاں کسی شخص نے شادی کرلی ہو وہاں نماز پوری پڑھے۔ نبی کریمﷺ سے مرفوع حدیث مروی ہے۔ پھر اس حدیث کی بابت یہ لکھتے

ہیں" فروی عکرمة بن ابراهيم عن ابی ذباب عن ابيه قال صلى عثمان باهل منیٰ اربعا وقال یاایھاالناس فلما قد مت تاهلت بها" یعنی ابی ذباب نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں پوری نماز چار رکعت پڑھی اور لوگوں کے اعتراض پر یہ خطاب فرمایا کہ اے لوگو! کہ میں جب سے آیا ہوں یہاں شادی کر لی ہے" وانی سمعت رسول الله ﷺ یقول اذا تاهل الرجل ببلدة فانه يصلی بها صلوٰة مقيم" اور میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سُنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں شادی کر لے تو وہ وہاں پوری نماز پڑھے جیسے مقیم پڑھتا ہے۔"رواه الامام احمدؒ فی مسنده" اس کو امام احمد نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے۔ وعبداللہ بن الزبیر الحمیدی فی مسندہ اور امام حمیدی نے بھی اپنی مسند میں اس حدیث کو روایت کیا ہے اور امام بیہقیؒ نے اس کے انقطاع کی وجہ سے اس کو معلول لکھا ہے اور اس روایت کی تضعیف کی ہے کہ اس روایت کی سند میں عکرمہ بن ابراہیم وارد ہے جو ضعیف ہے اور امام ابوالبرکات ابن تیمیہؒ نے اس ضعف کی یوں مدافعت کی ہے کہ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں عکرمہ کا ذکر کیا ہے مگر اس پر کوئی جرح نہیں کی حالانکہ امام بخاریؒ کی یہ عادت ہے کہ جب کسی راوی کا ذکر کرتے ہیں تو وہ مجروحین کی جرح کا ضرور ذکر کرتے ہیں۔ پھر یہ لکھتے ہیں" وقد نص احمد وابن عباس قبله ان المسافر اذا تزوج لزمه الاتمام" یعنی امام احمدؒ اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کی صراحت کی ہے کہ جب مسافر شادی کرلے تو نماز پوری پڑھے۔

پھر علامہ ابن القیم لکھتے ہیں" وهذا قول ابی حنيفةؒ ومالك واصحابه" یعنی یہی مذہب امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور ان کے اصحاب کا ہے۔ پھر بطور فیصلہ یہ کہتے ہیں" وهذا احسن مااعتذر به عن عثمانؓ " یعنی یہ بہت اچھی توجیہہ ہے جو حضرت عثمانؓ کی طرف سے پوری نماز پڑھنے کے عذر میں بیان کی گئی ہے۔ امام طحاوی حنفیؒ جو سفر میں نماز قصر کرنا واجب قرار دیتے ہیں حضرت عثمانؓ کی بابت مختلف اقوال نقل کر کے آخر میں لکھتے ہیں "انارا ینا الرجل اذاکان مقیما فی اهله فحکمه فی الصلوٰة حکم الاقامة" یعنی ہم یہ جائز سمجھتے ہیں کہ جب کوئی شخص مسافر اپنی اہلیہ کے پاس ٹھہر جائے تو نماز میں اس کا حکم مقیم کا ہے صفحہ ۲۴۸ جلد ا۔ میں کہتا ہوں کہ امام حمیدی نے اپنی مسند میں حدیث

واقعہ عثمانؓ کو مرفوعاً ذکر کیا ہے جس پر مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے مسند حمیدی کی حدیثوں کی تبویب کرتے ہوئے یوں باب فہرست میں لکھا ہے "اتمام الصلوٰۃ لمن تاھل ببلدۃ" یعنی جو شخص کسی شہر میں شادی کر لے تو اس کے نماز پوری پڑھنے کا بیان۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ مسئلہ احمقانہ نہیں ہے۔ اس نص سے منصوص ہے۔ اس حدیث کو مجمع الزوائد کے صفحہ ۱۵۶ جلد ثانی میں علامہ محدث ہیثمی نے بھی ذکر کر کے اس پر یوں باب منعقد کیا ہے۔ "باب فیمن سافر فتاھل فی بلدٍ" اس بات کا باب کہ کوئی شخص مسافر کسی شہر میں شادی کر لے تو وہ کس طرح نماز پڑھے۔ پھر حدیث واقعہ حضرت عثمانؓ کو مرفوعاً ذکر کر کے اس کو ثابت کیا ہے امام احمدؒ نے اس روایت کو اپنی مسند میں ذکر کیا ہے جس پر یوں تبویب کی گئی ہے "باب من اجتاز ببلد فتزوج فیھا او کان له به زوجة فلیتم" (صفحہ ۱۱۵ جلد ۵) یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ اگر کوئی شخص مسافر کسی شہر میں سے گزرے اور وہ وہاں شادی کر لے یا وہاں اس کی زوجہ ہو تو وہ مقیم کی طرح پوری نماز پڑھے۔ اور امام ابویعلی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور منتقیٰ (صفحہ ۲۱۱ جلد ۳ مع شرح نیل الاوطار) میں اس حدیث پر یوں باب منعقد کیا ہے " باب من اجتاز فی بلد فتزوج فیه اوله فیه زوجة فلیتم" اس کا ترجمہ اور مطلب بھی وہی ہے جو فوق الذکر باب کا ہے۔ امام شوکانیؒ مسافر کے لیے قصر کے وجوب کے قائل ہیں جیسا کہ حنفیہ کا مذہب ہے وہ مخالف دلائل کا جواب دیتے ہوئے حضرت عثمانؓ کے واقعہ اتمام منیٰ کا وہی جواب نقل کرتے ہیں جو امام ابن القیمؒ نے لکھا ہے۔ "قال ابن القیم انه کان قد تاھل بمنیٰ والمسافر اذا قام فی موضع وتزوج فیه او کان له به زوجه اتم" اس کا ترجمہ اور تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے (زاد المعاد جلد ۳ صفحہ ۲۰۲) اور صفحہ ۲۰۳ میں مفتی صاحب کی تاویلات کا رد کرتے ہوئے کہ فان الاقامة بمكة علی المهاجرین حرام پھر یہ لکھتے ہیں۔ " والذی ذکرنا ھنا احسن ماقیل" خلاصہ ان تمام تصریحات کا یہ ہے کہ جو اکابر علماء سلف خلف محدثین اس کے قائل ہیں وہ دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں لہٰذا "احمق" اور "سادگی" وغیرہ الفاظ بالکل غیر مناسب ہیں۔ مفتی صاحب ان لفظوں کو واپس لیں ورنہ سائل مستفتی جو آپ کے ان الفاظ سے خوش ہو کر عقیدت مند ہوا ہے اس کا جرم بھی ان پر عائد ہوگا۔ "فافهم وتدبر ولا تکن من الجاهلین" باقی رہا اصل مسئلہ تو یہ علماء

میں مختلف فیہ ہے آپ جس طرح چاہیں مسلک رکھیں لیکن اگر مسافر کے لیے قصر عزیمت نہیں رخصت ہے تو پھر یہ احتیاط ہے کہ مسافر داماد اپنے سسرال میں جا کر اتمام کرے۔ اور یہی راجح ہے کیونکہ حضرت عثمانؓ کا مذہب مسافر کے لیے اتمام کا نہیں قصر ہی کا ہے۔

از ابوالشکور عبدالقادر عارف حصاری
الاعتصام لاہور جلد ۳۱ شمارہ ۲۶ مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۸۰ء۔

سفری نماز کی حضر میں ادائیگی ۔ سبابہ کے اٹھانے ۔ سنت غیر مؤکدہ اور مستحب میں فرق کے بارے میں سوالات ۔

سوال: مکرم بھائی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ براہ کرم ان سوالوں کا جواب دیجیے ۔

(1) انسان سفر میں ہو جبکہ نماز قصر کا حکم ہے مگر کسی وجہ سے نماز ادا نہ کر سکے حضر میں ان قصر نمازوں کو کس طرح ادا کرے قصر یا پوری ؟

(2) ایک صاحب کہتے ہیں سبابہ کا اٹھانہ سنت ہے، دوسرے کہتے ہیں کہ نہیں، مستحب ہے ۔ تحقیق سے فیصلہ کریں ۔

(3) سنت غیر مؤکدہ اور مستحب میں کیا فرق ہے ؟ ۔

محمد اسماعیل ۱۱ ۔ پنجاب رجمنٹ

جواب: (1) سفر میں جو نماز قضا ہو حضر میں وہ پوری پڑھنی ہوگی کیونکہ علت سفر نہ رہی ۔ پھر اس نے قضا کر دی تو اس انعام کا مستحق نہ رہا ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نماز قضا کیوں ہوئی ؟ اصل یہ ہے کہ عمداً چھوڑی ہے تو شرع میں نہ قضا کرنے کا حکم ہے اور نہ اس کی کوئی صورت ہے ۔ انسان سو جائے تو جب بیدار ہو وہی اس کا وقت ہے ۔ اگر بھول جائے تو جب یاد آئے وہی اس کا وقت ہے ۔ اگر بے ہوش ہو جائے تو جب ہوش آئے وہی اس کا وقت ہے ۔ پھر قضا ہو جانے کی صورت کیا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ نماز نفسانی عذر بنا کر عمداً چھوڑی ہے جس کی قضا نہیں ۔ اس پر جرم ہے کہ وہ کافر ہو گیا اس لئے مسلمان توبہ کر کے ہووے ۔

(2) تشہد میں سبابہ اٹھانہ سنت ہے ۔

(3) سنت غیر مؤکدہ اور مستحب میں کچھ فرق نہیں ۔ دونوں آنحضور ﷺ سے ثابت ہوتے ہیں ۔ دونوں کی تعریف ایک ہی ہے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہوں اور ان کے کرنے سے ثواب، اور ترک سے عذاب نہ ہو، بس ۔

مستحب کا معنیٰ اچھا اور بہتر کام اور سنت غیر مؤکدہ کا معنیٰ یہ ہے کہ طریقہ نبوی سے جس کی تاکید نہیں آئی ہے اگر عمل کرے تو اچھا ہے ۔ سنت مؤکدہ وہ ہے جس کی تاکید ظاہر ہو جیسے سنت الفجر اور نماز وتر کہ ان کی تاکید آئی ہے ۔ ھذا ما عندی و اللہ اعلم بالصواب ۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی (فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم صفحہ ۱۵۴) ۔

حضر و مطر (اقامت اور بارش) میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا مسئلہ

ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (بابت' اور ۱۴ مارچ ۱۹۸۰) کی دو قسطوں میں ایک مضمون جمع بین الصلاتین کے موضوع پر شائع ہوا ہے' جس میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بارش وغیرہ کی صورت میں دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا صحیح نہیں ہے۔مدیر "الاعتصام" نے چونکہ اسے ایک علمی مذاکرے کے عنوان سے شائع کیا ہے اس لئے راقم بھی اس موضوع پر اپنی گذارشات پیش کرتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں محولہ بالا مضمون میں جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ درست نہیں ہے اور جس طرح سفر میں دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا (چاہے جمع تقدیم ہو یا جمع تاخیرا صحیح ہے' اسی طرح بارش' مرض وغیرہ عذر کی صورت میں بھی شرعاً دو نمازوں کو جمع کیا جاسکتا ہے۔

اصل بحث شروع کرنے سے پہلے ایک اصولی بات گوش گزار کر دینی ضروری ہے کہ جب کوئی امر کسی خاص دلیل سے ثابت ہو تو اس کے خلاف عام دلیل سے تمسک کرنا جائز نہیں۔ علم اصول کی کتاب میں یہ قاعدہ موجود ہے جسے بالعموم بحث و مناظرہ میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے خلط مبحث ہو جاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق فتح الباری وغیرہ میں ہے کہ "اگر کسی شئی کا حکم معلوم کرنا ہو تو پہلے اس کے متعلق خاص دلیل معلوم کرنی چاہئے' اگر خاص دلیل مل جائے تو پھر عام کی طرف جانے کی ضرورت نہیں اور اگر خاص دلیل میسر نہ ہو تو پھر عام کے تحت داخل ہو گی۔"

مذکورہ مقالہ نگار نے اس اصول کو نظر انداز کر کے بارش میں نمازیں جمع کرنے سے انکار کر دیا ہے اور دلیل اس پر یہ دی ہے کہ قرآن نے نمازوں کو اوقات معینہ پر ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا حالانکہ قرآن کے اس حکم سے کسی بھی صاحب علم کو انکار نہیں۔ یہ ایک عام حکم ہے لیکن اگر کوئی خاص صورت اس سے استثناء کی احادیث میں ملے گی تو اس پر عمل کرنا اس عام حکم کے خلاف نہیں ہو گا۔ جس طرح خود مقالہ نگار اس بات کے قائل ہیں کہ سفر میں دو (۲) نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا

صحیح ہے۔ حالانکہ یہ بھی بظاہر اس عموم قرآن کے خلاف ہے جس میں نمازوں کو اپنے وقت پر پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے لیکن چونکہ سفر میں جمع بین الصلاتین نبی ﷺ سے ثابت ہے اس لیے یہ ایک ایسا امر ہے جو خاص دلیل سے ثابت ہے' اب کسی عام دلیل سے اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ بارش وغیرہ میں بھی جمع بین الصلاتین خاص دلیلوں سے ثابت ہے' اس کا انکار صحیح نہیں۔ جیسا کہ اس کے دلائل آگے آئیں گے۔

دوسری دلیل مضمون میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حسب ذیل روایت پیش کی گئی ہے۔

> "میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ نے کوئی نماز بے وقت پڑھی ہو مگر دو (۲) نمازیں کہ آپ ﷺ نے مغرب و عشاء کو مزدلفہ میں جمع کیا اور اس دن صبح کو وقت سے پہلے پڑھا۔"

حالانکہ اس روایت کا مطلب بھی یہی ہے کہ بلاوجہ آپ ﷺ نے سوائے حج کے موقعہ کے کبھی نمازیں جمع کر کے نہیں پڑھیں۔ اس سے خاص مواقع پر پڑھی گئیں نمازیں مستثنیٰ ہوں گی۔ جیسے سفر کے دوران آپ ﷺ نے جمع کر کے پڑھیں۔ اگر اس کا وہ مطلب لیا جائے جو مقالہ مذکور میں لیا گیا ہے تو پھر اس روایت سے سفر کی حالت میں بھی جمع بین الصلاتین کی نفی ہو جائے گی جیسا کہ حنفی اس روایت سے یہی ثابت کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی جمع بین الصلاتین (تقدیم یا تاخیر) کے (سفر میں بھی) قائل نہیں۔ حالانکہ روایت کا یہ مطلب لینا خود آپ کے پیش کردہ ان دلائل کے خلاف ہے جو آپ نے سفر میں جمع کے جواز میں پیش کیے ہیں۔ آپ کو شاید اس تعارض کا احساس نہیں ہوا' ورنہ شاید مضمون میں یہ روایت اس سیاق میں پیش نہ کی جاتی کیونکہ اس سیاق میں اس روایت کو پیش کرنا احناف کی طرح بالکل غلط ہے۔

تیسری دلیل مضمون میں یہ دی گئی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضر میں ایک موقعہ پر جو نمازیں جمع کر کے پڑھی تھیں (جو قائلین جمع فی الحضر کی سب سے بڑی دلیل ہے) وہ جمع حقیقی (یعنی جمع تقدیم یا جمع تاخیر) نہیں تھی بلکہ جمع صوری تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض علماء نے انہیں جمع صوری ہی لکھا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک تکلف ہے اس لیے دیگر دوسرے علماء اسے جمع حقیقی ہی پر محمول کرتے ہیں اور یہی دوسرا موقف زیادہ قرین حقیقت

ہے اس کے دلائل آگے مضمون میں آئیں گے۔

اب ہم وہ دلائل پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش بیماری وغیرہ عذر کی صورت میں بھی جمع تقدیم یا جمع تاخیر جائز ہے۔

مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں ایک باب ہے باب الجمع بین الصلوتین فی المطر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ یوں کیا ہے "بیان جواز جمع درمیان دو (۲) نماز بہ سبب باران" یعنی "یہ باب اس مسئلے کے بیان میں ہے کہ بارش کے موقعہ پر دو (۲) نمازیں جمع کرنا جائز ہے۔" پھر اس کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی ہے عن نافع عن عبداللّٰہ بن عمر کان اذا جمع الامراء بین المغرب والعشاء فی المطر جمع معھم۔ جس کا ترجمہ محدث دہلوی نے یہ لکھا ہے "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وقتیکہ جمع مے کروند امیران مدینہ درمیان نماز مغرب و عشاء در باراں جمع مے کرد بایشاں" یعنی "سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بارش کے سبب سے دو (۲) نمازیں مغرب اور عشاء کی حکام مدینہ جب جمع کر کے پڑھتے تھے تو ان کے ساتھ شامل ہو جایا کرتے تھے۔" (مؤطا مع مسوی مصفی ج ۱ ص ۱۴۹' طبع دہلی)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اہل مدینہ اور ان کے حکام بارش کے عذر سے دو (۲) نمازیں مغرب اور عشاء جمع کر کے پڑھتے تھے تو سیدنا عبداللہ عاشق سنت بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ یہ زمانہ صحابہ کا تھا اس زمانہ خیر القرون میں یہ تعامل ہوا کسی صحابی یا تابعی نے اس پر انکار نہیں کیا تو باقاعدہ اصول فقہ یہ جماع سکوتی ہوا جو فاضل ہزاروی اور ان کے اخوان پر حجت ہے۔ اس حدیث کی شرح میں شاہ ولی اللہ مرحوم یہ فرماتے ہیں ذھب اکثرھم الی جواز الجمع فی المطر۔ یعنی "اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ بارش کے عذر سے نمازیں جمع کرنا جائز ہے۔"

شاہ ولی اللہ اس سے پہلے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کرتے کہ صلّی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الظھر والعصر ثمانیا جمیعا۔ یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کی آٹھ رکعتیں اکٹھی پڑھیں۔" پھر فرماتے ہیں کہ قید ضرورت لاحق شدہ باجماع جمہور امت ولہذا جمع فی المطر و فی المرض مشروع شد (حوالۂ مذکور) یعنی جمہور امت کے اجماع سے نمازوں کے جمع کرنے میں قید ضرورت لاحق ہونے میں مسلم ہے اس لیے بارش اور مرض میں دو (۲) نمازیں جمع کرنا مشروع ہے۔"

صحیح ابن خزیمہ کے جزء ثانی ص۸۵ میں یوں باب لکھا ہے باب الرخصة في الجمع بين الصلوتين في الحضر وفي المطر یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ بارش کے موقعہ پر حضر میں دو (۲) نمازوں کو جمع کرنے کی رخصت ہے۔" پھر اپنے دعویٰ کے ثبوت میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کی ہے وہ فرماتے ہیں۔ صليت مع النبي صلى الله عليه وسلم بالمدينة ثمانيا و سبعا جميعا۔ قلت لم فعل ذالک قال ارادان لا يحرج امته۔ یعنی "میں نے مدینہ منورہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آٹھ رکعت (ظہر اور عصر کی) اور سات رکعت (مغرب اور عشاء کی) اکٹھی پڑھی تھیں" راوی حدیث' ابو سعید نے کہا کہ "میں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا عمل دو (۲) نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھنے کا کیوں کیا تھا؟ تو انہوں نے یہ فرمایا کہ تاکہ امت کو کسی قسم کی تنگی اور دشواری نہ ہو۔" یعنی امت کو تکلیف سے بچانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ بارش کی وجہ سے ایسا عمل کیا تھا پھر امام ابن خزیمہ نے لکھا ہے۔ لم يختلف علماء الحجاز ان الجمع بين الصلوتين في المطر جائز۔ کہ "علماء حجاز کا اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بارش کی وجہ سے نمازیں جمع کرنا جائز ہے۔" پھر یہ لکھا ہے کہ اذ جائز عندهم للمقيم ان يصلي الصلوات كلها ان احب في اخر وقتها وان شاء في اول وقتها۔ یعنی "علماء نے یہ جائز قرار دیا ہے کہ نمازوں کو آخر وقت میں جمع کرے اور اگر چاہے تو اول وقت میں جمع کرے سب جائز ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرح نمازیں جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ متعین نہیں کی۔ مطلق ذکر کیا ہے کسی امام نے اس کی وجہ بارش کو قرار دیا ہے جیسے امام مالک اور امام ابن خزیمہ ہیں اور بعض نے بیماری وغیرہ کا عذر ذکر کیا ہے۔

لیکن امام نووی نے شرح مسلم میں ان سب کا رد کیا ہے۔ فاضل ہزاروی نے لکھا ہے کہ اس سے مراد جمع صوری ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ:

بخاری اور مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں راوی کہتے ہیں قلت يا ابا الشعشاء اخر الظهر و عجل العصر واخر المغرب و عجل العشاء قال وانا اظنه یعنی عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے حدیث کے راوی ابو الشعثاء

سے کہا کہ میرا خیال ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ظہر کو دیر سے اور عصر کو جلدی اور مغرب کو دیر سے اور عشاء کو جلدی کر کے پڑھا ہو گا۔ تب ابو الشعثاء نے کہا کہ میرا بھی یہی خیال ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر راوی حدیث کو اعلم بالمراد جان کر اس حدیث ابن عباس سے جمع صوری مراد لی جائے تو پھر بھی اس جمع فی المدینہ کی وجہ بارش تھی۔ چنانچہ بخاری و مسلم ابو داؤد' نسائی وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت یوں ہے کہ نماز پڑھی نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں سات اور آٹھ رکعتیں اکٹھی ظہر اور عصر' مغرب عشاء ابو ایوب رضی اللہ عنہ تمیشانی نے جابر سے کہا کہ شاید یہ بارش کی رات کا واقعہ ہو گا۔ جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ شاید یہی وجہ ہو۔" اب کون سے راوی کی مراد لو گے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جب ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کوئی وجہ اور عذر بیان نہیں کیا تو اس کو مطلق ہی رکھا جائے کہ خواہ کوئی حاجت اور عذر پیش آجائے تو نمازیں جمع کرنی درست ہیں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ کوئی دشواری اور تکلیف ہو تو اس کے رفع کرنے کے لیے نمازیں جمع کرنی درست ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ مسند احمد ج۵ ص۱۷ میں یہی روایت ہے کہ عبداللہ بن شقیق نے بیان کیا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ہم کو ایک دن خطبہ دیا کہ عصر کے بعد وعظ شروع کیا اور مسلسل تقریر کرتے رہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور ستارے چمکنے لگے لوگوں نے مغرب کی نماز کی بابت الصلوۃ کہا تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کچھ پرواہ نہ کی اور سلسلہ تقریر جاری رکھا تب ایک شخص بنی تمیم قبیلہ کا کھڑا ہو گیا اور اس نے بلند آواز سے زور زور سے الصلوۃ الصلوۃ کہنا شروع کر دیا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی طیش میں آگئے اور فرمایا اتعلمنی بالسنۃ کہ "کیا تو مجھے سنت کی تعلیم دیتا ہے۔" تو مجھ سے حدیث سن لے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا۔ آنجناب نے نمازیں ظہر و عصر' مغرب و عشاء جمع کر کے پڑھی تھیں۔ میں نے مغرب کو عشاء کے ساتھ جمع کر لیا ہے۔ عبداللہ بن شقیق نے سنا تو اس سے اس کے دل میں شک اور تعجب پیدا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور ان سے یہ واقعہ بیان کر کے تصدیق طلب کی تو انہوں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تائید فرمائی۔ یہ حدیث مسلم اور نسائی میں بھی ہے۔

چنانچہ مسند احمد کی شرح فتح الربانی جلد۵' ص۱۳۲ میں نسائی کی روایت کو نقل کیا ہے اس میں ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بصرہ میں ظہر عصر مغرب عشاء کو جمع کر کے پڑھا اور درمیان میں سنت نفل نہیں پڑھے۔ اور پھر یہ لکھا ہے فعل ذالک من شغل ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ عمل کسی شغل کی وجہ سے کیا تھا۔ جب راوی حدیث نے اس کو عام سمجھ کر اپنے شغل کی وجہ سے نمازیں جمع کیں۔ تو پھر ہم کو بھی خاص حالات اور ضروریات میں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن عام علوت نہ بنانا چاہیے۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجتہ اللہ البالغہ مترجم بمع عربی ج۱' ص۳۶۵ میں یہ فرماتے ہیں۔ جاز عند الضرورة الجمع بین الظهر والعصر والمغرب والعشاء یعنی "کسی ضرورت لاحق پر ظہر اور عصر۔ مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا جائز ہے۔ فتح الربانی شرح مسند میں ہے استدل باحادیث الباب القائلون بجواز الجمع فی الحضر للحاجة مطلقا لکن شرط ان لا تتخذ ذالک عادة۔ یعنی "باب کی حدیثوں سے ان علماء نے استدلال کیا ہے۔ جو اس بات کے قائل ہیں کہ حضر میں مقیم کو کسی حاجت کی بنا پر نمازیں جمع کرنا جائز ہے بشرطیکہ ہر وقت کی علوت نہ بنا لے۔" موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے عربی حاشیہ میں حدیث ابن عباس پر یہ لکھا ہے ظاهر الحدیث یدل علی جواز الجمع فی الحضر من غیر عذر۔ یعنی "ظاہر حدیث کا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں بغیر عذر شرعی کے جمع کی تھیں۔" صرف تنگی اور دشواری اور تکلیف رفع کرنے کی تعلیم تھی کہ جب کوئی علت اور عذر ہو جائے تو اس طرح نمازیں پڑھ لیا کریں۔ نیز حاشیہ میں یہ لکھا ہے قال الحافظ فی الفتح وقد ذهب جماعة من الائمة الی الاخذ بظاهر الحدیث بجواز الجمع فی الحضر للحاجة مطلقا بشرط ان لایتخذ ذالک خلقا وعادة۔ (موطا جلد۱' ص۳۶)

> "یعنی حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں یہ لکھا ہے کہ ائمہ محدثین میں سے ایک جماعت ظاہر حدیث پر عمل کرنے کی قائل ہے کہ کسی حاجت ضروری پیش آمدہ پر نمازیں جمع کر لیں تو یہ جائز ہے لیکن اس طرح نمازیں جمع کرنے کی علوت نہ ٹھہرالیں۔"

مولانا صادق صاحب سیالکوٹی کتاب صلوٰۃ الرسول کے ص۳۶۵ میں سفر کی جمع نماز

بصورت تقدیم و تاخیر بیان کرنے کے بعد یہ عنوان لکھتے ہیں "جمع بین الصلاتین در حضر" پھر یہ لکھتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول ﷺ نے ہماری جانیں اور ماں باپ آپ پر قربان ہوں امت کی آسانی کے لیے ضرورت کے وقت سفر کے علاوہ حضر میں بھی جمع بین الصلاتین کی اجازت دے دی ہے۔ پھر اس کے بارے میں دو (۲) حدیثیں لکھی ہیں۔ اور وہ دونوں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روائتیں ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ظہر اور عصر کو جمع کر کے پڑھا حالانکہ وہاں نہ دشمن کا خوف تھا اور نہ سفر کی حاجت تھی۔ ابو زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ نبی اکرم ﷺ نے ایسا کیوں کیا تھا۔ تو سعید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ جس طرح تم نے مجھ سے دریافت کیا ہے اسی طرح میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ اپنی امت کو دشواری میں نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ دوسری روایت میں بھی یہی ذکر ہے۔ اس کے بعد یہ لکھتے ہیں "پس اگر ہم گھر پر ہوں تو پھر بھی کسی ضرورت کے وقت ظہر اور عصر۔ مغرب اور عشاء اکٹھی کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ بلاضرورت ایسا نہ کریں اور نہ ہی علاوت بنالیں۔"

ظاہر ہے مولانا صادق سیالکوٹی کی یہ شرط کہ "بلاضرورت ایسا نہ کریں اور نہ ہی علاوت بنا لیں۔" ان کی اپنی اختراع نہیں ہے بلکہ سب علماء و محدثین نے اس جمع رخصت میں یہ شرط رکھی ہے ان کی اس صراحت سے آپ نے شرط ماخوذ کی ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ضرورت اور حاجت کے وقت نمازیں جمع کرنا رخصت ہے جس پر نبی اکرم ﷺ نے عمل کیا ہے ہمیشہ علاوت بنانا تعامل نبوی کے خلاف ہے اور ان احادیث کے بھی خلاف ہے جو نمازوں کو اوقات معینہ میں ادا کرنے کے متعلق وارد ہیں۔ اور دائمی حکم نہیں ہے جیسے بارش کے موقعہ پر نمازیں جمع کرنا بارش کے ہونے تک ہے جب بارش کی بندش ہو گئی اور نمازیں جمع کرنے کی بھی بندش ہو گئی۔ مجمع الزوائد میں ہے۔ باب الجمع للحاجۃ یعنی "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ کوئی حاجت پیش آجائے تو نماز جمع کرنی جائز ہے۔" پھر اس کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی گئی ہے عن عبداللّٰہ بن مسعود قال جمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بین الاولی والعصر و بین المغرب والعشاء فقیل له فی ذالک فقال صنعت هذا لکی لا تحرج امتی۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط والکبیر یعنی

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح جمع کر کے دو (۲) نمازوں کو پڑھنے کی وجہ دریافت کی گئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے یہ عمل اس لیے کیا ہے تاکہ میری امت کسی تکلیف اور دشواری میں مبتلا نہ رہے کبھی کوئی حاجت اور ضرورت پیش آجائے تو دو (۲) نمازوں کو اکٹھی کر کے پڑھ سکتے ہیں۔" اس حدیث سے سیدنا ابن عباس کی روائت اور ان کے عمل کی تائید پائی گئی۔

میں کہتا ہوں کہ حاجت اور ضرورت کسی حدیث میں متعین نہیں ہے بارش بھی ایک حاجت ہے اس میں بھی نمازیں جمع کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ جب کہ علماء اہل حجاز کا اس پر تعامل پایا گیا ہے۔ منتقی الاخبار حدیث کی معتبر کتاب ہے جس کی شرح نیل الاوطار ہے اس میں یوں باب منعقد کیا گیا ہے باب جمع المقیم لمطر وغیرہ۔ یعنی "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ مقیم بارش وغیرہ کے عذر سے نمازیں جمع کر سکتا ہے۔ پھر اس کے ثبوت میں وہی حدیث ابن عباس پیش کی گئی ہے جو مسلم ابو داود۔ ابن ماجہ وغیرہ میں ہے جو پہلے گزر چکی ہے جس میں بغیر خوف اور بارش کے نماز جمع کر کے پڑھنے کا ذکر ہے۔ اگر دشمن کا خوف اور بارش عذر نہ بن سکتے تو ان کی نفی نہ کی جاتی گویا یہ عذر مسلم ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر ان عذروں کے نمازیں جمع کیں تو اگر یہ عذر پائے جائیں تو ان نمازوں کو جمع کرنا بطریق اولیٰ جائز ہوا۔ اس کو اصول فقہاء میں اقتضاء النص اور دلالۃ النص وغیرہ کہتے ہیں اس کی مثال یوں ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرو تو اس سے کھڑے پانی میں پاخانہ کرنا بطریق اولیٰ منع ثابت ہوا۔ ایسا ہی قرآن میں ہے کہ اپنے والدین کو اف نہ کہو تو اس سے گالی دینا بطریق اولیٰ منع ثابت ہوا۔ امام شوکانی اس دلیل اور استدلال پر یہ فرماتے ہیں قلت هذا یدل بفحواه علی الجمع للمطر والخوف والمرض یعنی "اس حدیث کے مضمون سے یہ پایا جاتا ہے کہ بارش اور خوف اور بیماری کے عذر سے نمازیں جمع کرنا جائز ہے۔"

پھر یہ حدیث ذکر کی ہے وللاثرم فی سننه عن ابن سلمة بن عبدالرحمٰن انه قال من السنة اذا كان یوم مطران الجمع بین المغرب والعشاء۔ یعنی "امام اثرم نے اپنی سنن میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ ابو سلمۃ بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ سنت یہ ہے کہ

بارش کے دن دو (۲) نمازوں مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھنا چاہیے۔" راوی حدیث جب کسی مسئلہ کے بیان میں سنت کا لفظ کہے تو اس سے سنت نبوی ﷺ مراد ہوتی ہے پس یہ حدیث مرفوع کا حکم رکھتی ہے۔

الفتح الربانی جز نمبر۵' ص۱۳۱ میں یوں باب لکھا ہے باب جمع لمقیم لمطر وغیرہ یعنی "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ مقیم بارش وغیرہ کے عذر سے دو نمازوں کو جمع کر لے تو یہ جائز ہے۔ پھر اس کے ثبوت میں وہی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ذکر کی ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ "جناب نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں ظہر اور عصر۔ مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھا۔ اس وقت نہ خوف تھا اور نہ بارش کا عذر تھا" یہ باب اس حدیث پر منعقد کرنے والے بمضمون حدیث بارش کے عذر سے نمازیں جمع کرنا ثابت کر رہے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوا کہ بارش کے عذر سے نمازیں جمع کرنا مسلم اور معمول بہ ہے مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حاشیہ کشف المغطا ص۲۲ میں ہے : اختلف الناس فی جواز الجمع بین الصلوتین للمطر فی الحضر فاجازہ جماعۃ من السلف روی ذالک عن ابن عمرو فعلہ عروۃ وابن المسیب و عمر بن عبدالعزیز و ابو بکر بن عبدالرحمٰن وابو سلمۃ و فقہاء المدینۃ وھو قول مالک والشافعی واحمد بن حنبل۔ یعنی "بارش کے موقعہ پر نمازوں کے جمع کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہے سلف صالحین کی ایک جماعت نے بارش میں نمازوں کو جمع کرنے کو جائز قرار دیا ہے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مذہب ہے عروہ اور ابن المسیب اور عمر بن عبدالعزیز اور ابو بکر بن عبدالرحمٰن اور ابو سلمہ اور فقہا اہل مدینہ اور امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا یہی مذہب تھا کہ بارش کے عذر سے نمازیں جمع کرنا جائز ہے۔" شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مؤطا کی شرح مصفیٰ میں لکھا ہے کہ "جمہور امت نے بارش اور بیماری میں نمازیں جمع کرنا مشروع قرار دیا ہے۔"

الفتح الربانی میں بحوالہ فتح الباری یہ لکھا ہے کہ "ہر حاجت بارش وغیرہ میں نمازوں کو جمع کرنا جائز لکھا ہے امام ابن سیرین اور ربیعہ اور اشہب اور ابن المنذر قفال کبیر اور ایک جماعت اہل حدیث کا یہ مذہب ہے۔" کشف الغمہ شعرانی ج۱' ص۱۳۹ میں ہے واما الجمع بالمطر فقد فعلہ الصحابۃ کثیرا۔ یعنی "بارش کے عذر سے نمازیں جمع کرنا صحابہ کرام کا عمل تھا۔" فتح الربانی جلد۵' ص۱۳۱ میں ہے امام بیہقی سے نقل کیا ہے۔ وقد روینا عن ابن

عباس و ابن عمر الجمع بالمطر۔ یعنی "ہم نے ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ وہ نمازوں کو بارش کے موقع پر جمع کیا کرتے تھے۔" نیز فتح الربانی میں امام نودی سے نقل کیا ہے۔ ھذا مذھبنا فی الجمع بالمطر و قال به جمھور العلماء فی الظھر والعصر والمغرب والعشاء یعنی "یہ ہمارا مذہب ہے کہ بارش کے موقعہ پر ہم ظہر اور عصر مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھتے تھے۔ اور جمہور علماء کا بھی یہی مذہب ہے۔"

غنیتہ الطالبین مترجم بمع عربی جلدا' ص۸۸۶ میں حضرت جیلانی یہ فرماتے ہیں "مینہ کے سبب سے مغرب و عشاء کی نمازوں کو جمع کرنا روا ہے اور ظہر و عصر نماز کے جمع کرنے میں دو روائتیں ہیں اور یہی حکم راستے کی کیچڑ کے علاوہ پانی بھرنے کی یا تند ہوا ہونے کی حالت میں ہے اس میں بھی جمع کرنے کے بارے دو روائتیں ہیں۔ جب بہ سبب پانی برسنے کے نماز جمع کی تو دیکھنا چاہیے کہ اس نے اول وقت میں دوسرے وقت کو اس لحاظ سے جمع کرنا چاہا کہ اول نماز کے وقت پانی برس رہا ہے اور یقین ہے کہ دوسری نماز کے وقت تک اسی طرح برستا رہے گا مگر جمع کرنا دوسری نماز کے وقت منحصر رکھے تو جائز ہے اور برابر ہے خواہ اس وقت مینہ برستا رہے یا تھم جائے۔" اس سے یہ ظاہر ہوا کہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جمع نماز کے قائل ہیں اگرچہ ان کو ولی اللہ ماننے والے اور گیارہویں دینے والے جمع نماز کے منکر ہیں جو قادری کہلاتے ہیں اور فاضل ہزاروی کا بھی رد ہو گیا جو اسے ہمارے شہروں کا رواج بتلاتے ہیں حالانکہ یہ بغداد تک پھیلا ہوا ہے۔

امام ابن القیم زاد المعاد ج۱' ص۱۳۳ میں جمع نماز کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کذالک لاجل المشقۃ والحاجۃ اولٰی۔ یعنی "اسی طرح مشقت اور حاجت ضروری کے وقت بطریق اولیٰ جائز ہے۔" تبویب مسند ابوداؤد طیالسی ج۱' ص۱۳۶ میں ہے باب ماجاء فی الجمع بین الصلاتین فی الحضر للحاجتہ۔ یعنی "اس باب میں اس مسئلہ کا بیان ہے کہ حضر میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا کیا حکم ہے؟"

پھر اس کے ثبوت میں یہ حدیث ذکر کی ہے عن سعید بن جبیران ابن عباس جمع بین الظھر والعصر من شغل وزعم ابن عباس انه صلی مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بالمدینته بین الظھر والعصر جمیعا یعنی "سعید بن جبیر نے روایت کیا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کسی کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے دو نمازوں ظہر اور عصر کو جمع کر کے

ادا کیا اور انہوں نے ایسا اس خیال سے کیا کہ انہوں نے مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ظہر اور عصر کو جمع کر کے پڑھا تھا۔" یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا دوسرا واقعہ ہے پہلا واقعہ بصرہ کا ہے کہ انہوں نے عصر کے بعد خطبہ طویل کیا کہ مغرب کی نماز کا وقت گزر گیا کہ ستارے چمکنے لگے تب انہوں نے مغرب کو عشاء کے ساتھ جمع کر کے ادا کیا اور یہ بیان کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں مغرب اور عشاء کو ملا کر پڑھا تھا اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جس طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ کے واقعات متعدد ہیں اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے واقعات متعدد ہیں کہ وقتاً فوقتاً آپ ﷺ اس طرح عمل کرتے رہے۔ واضح ہو کہ حدیث میں لفظ جمیعا ہے جو جمع حقیقی وقتی پر دال ہے فاضل ہزاروی اس سے جمع صوری مراد لیتے ہیں یہ معنی مجازی ہے جو حقیقت کے خلاف ہے۔

علامہ خطابی شرح ابو داؤد معالم ج۱ ص۲۳۶ میں یہ فرماتے ہیں اسم الجمع عرفا لایقع علی من اخر الظهر حتی صلاها فی اٰخر وقتها وعجل العصر فصلاها فی اول وقتها لان هذا قد صلی کل صلٰوة منهما فی وقتها الخاص بها۔ "ظاہر میں اسم جمع کا ان نمازوں پر واقع نہیں ہوتا جو اپنے اپنے وقتوں پر پڑھی گئی ہیں کہ ظہر کے وقت میں تاخیر کرنی اور عصر کو اول وقت میں پڑھنا عرف عام میں اس کو جمع نہیں کہتے کیونکہ دونوں اپنے وقتوں پر ادا ہوئی ہیں۔" پھر علامہ خطابی یہ فرماتے ہیں وانما الجمع المعروف بینهما ان تکون الصلاتان معافی وقت احدهما الاتری ان الجمع بینهما بعرفته والمزدلفته کذلک۔ یعنی "عرفی جمع یہ ہے کہ دو نمازوں کو ملا کر ایک وقت کی نمازیں پڑھنا کیا تم غور نہیں کرتے کہ حجاج حج کے موقعہ پر عرفات اور مزدلفہ میں کس طرح دو نمازیں ادا کرتے ہیں۔"

تبویب مسند ابوداؤد طیاسی جلد اول ص۱۳۶ میں ہے کہ عبدالملک بن علقمہ ابو علقمہ ثقفی بیان کرتے ہیں کہ ثقیف قبیلہ کا ایک وفد جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کیا آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ یہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ صدقہ تو محض اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے اور ہدیہ سے مقصود کوئی حاجت پوری کرانا اور اپنے رسول کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ فسالوه فما زالوا یسئلونه حتی ماصلوا الظهرالامع

العصر "پس' انہوں نے مسائل دریافت کرنے شروع کر دیے اور اس قدر سوال کر کے جواب حاصل کرتے رہے کہ نماز ظہر نہ پڑھی اور اس کو عصر کے ساتھ ملا کر پڑھا" یہ حدیث تقریری ہے کہ وہ ظہر کے وقت آئے اور مسائل کے جوابات حاصل کرنے میں مصروف رہے پھر ظہر کو عصر کے ساتھ جمع کر کے پڑھا آپ ﷺ نے ان کے اس عمل کو دیکھا اور جائز رکھا اس حدیث سے مقلدین حنفیہ اور فاضل ہزاروی اور ان کے اخوان کارد ہو گیا کہ کسی حاجت اور شغل کے وقت نمازیں جمع کرنا جائز ہے۔

حدیث کی کتاب التاج الجامع للاصول فی احادیث الرسول کے صفحہ ۲۹۵ میں ہے ای جمع الصلوۃ للسفر وللمرض و للخوف وللمطر رحمۃ لعباداللہ۔ یعنی "نماز کو سفر اور بیماری اور خوف دشمن اور بارش کے موقعوں پر جمع کرنے کی رخصت ربنا اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بڑی مہربانی اور شفقت ہے۔" پھر التاج الجامع للاصول میں جمع نماز کی وہی احادیث ذکر کی ہیں جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اور حاشیہ میں یہ لکھا ہے۔ فیہ جواز الجمع للخوف وللمطر بل للمرض لانہ اشق من السفر والمطر فاذا جاء ھم العدو ببلدھم فلھم جمع الصلٰوۃ وللجماعۃ ان تصلی تقدیما اذا کان المطر عندھم۔ یعنی "جمع نماز کی حدیثوں سے یہ ظاہر ہوا کہ دشمن کے خوف اور بارش کی وجہ سے نمازیں جمع کرنا جائز ہے بلکہ بیماری کی وجہ سے بھی جائز ہے کیونکہ سفر اور بارش سے بیماری میں مشقت اور تکلیف زیادہ ہے اگر دشمن شہر پر حملہ کر دے تو شہر والے نمازیں جمع کر سکتے ہیں۔ اور اگر بارش ہو رہی ہو تو جماعت جمع کر سکتی ہے۔

مجمع الزوائد جلد ۲' ص ۱۶۰ میں یہ درج ہے۔ باب مدۃ الجمع یعنی "کتنی مدت تک نماز جمع کی جا سکتی ہے" پھر یہ حدیث ذکر کی گئی ہے عن ابن عباس ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اقام بخیبر ستتہ اشھر یصلی الظھر والعصر جمعًا والمغرب والعشاء جمعًا۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط۔ یعنی "ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ خیبر میں چھ ماہ قیام پذیر رہے تو وہاں ظہر اور عصر کو جمع کر کے پڑھتے رہے اور مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھتے رہے۔"

اس حدیث کو طبرانی نے اوسط میں ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث اگرچہ اسناد کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن درایت کی رو سے صحیح ہے کیونکہ نمازوں کو جمع کرنا کسی حاجت اور عذر

لاحق ہونے پر موقوف ہے تو عذر اور حاجت جب تک عارض رہیں گے نماز جمع ہوتی رہے گی۔ مثلاً سفر میں نماز جمع ہوتی رہیں گی اور اسی طرح اگر بیماری کا عارضہ ہوا تو جب تک بیماری عارض رہے گی نمازیں جمع ہوتی رہیں گی۔ اسی طرح بارش کا سلسلہ شروع ہوا تو جب تک بارش برستی رہے گی نمازیں جمع ہوتی رہیں گی۔ اس پر اوقات متعینہ میں نمازیں ادا نہ کرنے کا اعتراض وارد نہ ہو گا کیونکہ اعلام الموقعین میں نمازیں جمع کرنے کے مسئلہ پر مقلدین اہل رای کی تردید کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں الاوقات التی بینھا النبی صلعم بقوله وفعله نوعان بحسب حال اربابھا۔ اوقات السعته والرفاھیته واوقات العذر والضرورة۔ یعنی "جناب نبی اکرم ﷺ نے نمازوں کے اوقات جو اپنے قول و فعل سے بیان فرمائے ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک وقت کشادگی اور آرام کا اور دوسرا وقت عذر اور حاجت کا۔"

یہ نمازیوں کے حالات کی رو سے ہیں' دونوں کے لیے الگ الگ احکام مخصوص ہیں" پھر ان کی تفصیل کی ہے۔ مثلاً جو شخص نماز پڑھنی بھول گیا یا سو گیا تو ان کا وہی وقت ہے جب یاد آجائے یا سویا ہوا بیدار ہو جائے خواہ وہ کوئی وقت ہو اس کے لیے وہی وقت عین نماز کا ہے اب اس سے صاف ظاہر ہے کہ نمازوں سے اوقات مقررہ کے علاوہ کے وقت ہوں گے ان کا اور اختیاری وقتوں کا باہم بڑا فرق ہو گا اس لیے معذوروں کے لیے تین وقت مقرر فرمائے گئے ہیں اور جن کو کوئی عذر نہ ہو ان کے لیے پانچ وقت مقرر ہیں۔ معذور شخص دو وقتوں میں تو ان کے ساتھ ہے اور ایک وقت اس کے لیے مخصوص ہے۔ احادیث میں نماز جمع کرنے کا مقصد وقتوں کا جمع کرنا ہے فعل کا جمع کرنا مراد نہیں ہے جمع صوری میں وقت جمع نہیں ہوتا۔ فعل جمع ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک شخص بیٹھ کر انتظار کرے اور وقت کو دیکھتا رہے یہاں تک کہ اتنا وقت رہ جائے کہ ادھر نماز سے فارغ ہو ادھر دوسری کا وقت آجائے مثلاً ظہر کی نماز ایسے وقت میں ادا کرے کہ ادھر سلام پھیرا ادھر عصر کا وقت داخل ہو گیا۔ تو پھر اس کو ادا کرے یہ دو نمازیں دو وقتوں میں ادا ہوئیں۔ اب غور کرو کہ یہ نمازی کے لیے آسانی ہے یا مصیبت ہے؟ مقصود شارع کا آسانی اور راحت تھا جو وقتی جمع سے حاصل ہوتا لیکن صوری جمع والوں نے وقتوں کی جانچ پڑتال میں ڈال کر نمازیوں پر سختی کر دی۔ یہ خلاصہ ہے امام ابن القیم رحمہ اللہ کی بحث کا جو اعلام الموقعین مترجم میں درج

ہے (جلد۵' ص۷۷۰ ملاحظہ ہو) فاضل ہزاروی نے اوقات نماز کی بحث لکھ کر پھر یہ لکھا ہے کہ "اوپر کی بحث سے یہ مقصود تھا کہ ہر نماز اپنے اپنے وقت پر فرض ہے پس جو شخص عصر کو ظہر کے وقت یا عشاء کو مغرب کے وقت پڑھتا ہے گویا اس نے نماز فرض ہونے سے پہلے ادا کرلی۔"

میں کہتا ہوں کہ آپ نے اس بحث میں بڑا کمال کیا کہ اپنی تردید آپ ہی کر دی کہ ص۲ پر لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر شروع کرتے اگر ظہر کا وقت ہو جاتا تو ظہر اور عصر دونوں کو ظہر کے وقت ادا فرماتے پھر سفر شروع کرتے (تا آخر) سفر میں جمع تقدیم اور تاخیر دونوں ثابت ہیں۔ جیسے احادیث میں بکثرت آپ کے واقعات ہیں۔"

پس فاضل ہزاروی جواب دیں کہ جب نماز اپنے اپنے وقت پر فرض تھی تو نبی اکرم ﷺ نے ایک نماز کو دوسری نماز کے وقت میں کیوں پڑھا؟ اور یہ عمل سفر میں بکثرت کیوں کیا؟ اس خلاف اصول نمازیں جمع کرنے کا جو جواب آپ دیں گے وہی جواب ہماری طرف سے حضر میں بارش یا ضروری حاجت اور شغل کے عذر سے نمازوں کو جمع کرنے کا ہو گا۔

فاضل ہزاروی نے نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی اپنے رسالہ کے ص۶ پر یہ لکھا ہے کہ "پہلے یہ بات ذہن نشین رہے کہ آپ ﷺ نے جو نماز جمع کی ہے وہ بغیر کسی عذر کے ہے" اور ص۷ پر لکھتے ہیں کہ "آپ یہ بات نہ بھولیں کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز بغیر عذر کے جمع کی ہے۔" اور پھر ص۶ میں یہ لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ساری زندگی نمازیں اپنے اپنے وقت میں ادا فرمائی ہیں۔ حالانکہ بموقعہ حج دو نمازوں کو ایک وقت میں ادا کرنا ثابت ہے اور سفر میں آپ کی جمع تقدیم و تاخیر ثابت ہے اس لیے یہ دعویٰ کہ آپ ﷺ نے ساری زندگی نمازیں اپنے اپنے وقت پر ادا فرمائیں غلط ہے۔ فاضل ہزاروی نے بڑے جوش میں آکر یہ لکھا ہے کہ بارش کے وقت ظہر کے وقت عصر کو اور مغرب کے وقت عشاء کو پڑھ لیتے ہیں جب کہ قرآن و حدیث سے اس طرح دو نمازیں جمع کرنا پہلے یا آخری وقت ثابت نہیں یہ آپ کی کم علمی کا جوش ہے۔

کشف الغمہ ص۱۳۴ میں امام شعرانی یہ نقل کرتے ہیں وکان عمر وابو سلمته بن عبدالرحمٰن وابن عمر یفعلونه ویقولون من السنته اذا کان یوم مطران یجمع بین المغرب والعشاء وبین الظهر والعصر یعنی "عمر اور ابن عمر اور ابو سلمہ یہ عمل کرتے تھے

اور یہ سمجھتے تھے کہ بارش کے دن سنت یہ ہے کہ مغرب اور عشاء اور ظہر اور عصر کو جمع کر کے پڑھا جائے۔ جب تین صحابہ عمر اور ابن عمر اور ابو سلمہ کا یہ عمل ہوا اور ان کا یہ کہنا کہ اس طرح عمل کرنا سنت ہے تو بارش کے وقت نمازیں جمع کرنا مشروع ہوا اور راوی جب کسی عمل کو سنت کہہ دے تو وہ حدیث مرفوع کا درجہ رکھتی ہے۔ کما لا یخفی علی الماھر باصول الحدیث۔

نیز کشف الغمہ میں یہ روایت ہے وقال ابن عمر رضی اللہ عنھما مطرنا ذات لیلتہ فاصبحت الارض مبتلتہ فجعل الرجل یاتی بالحصا فی ثوبہ فیبسطہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم مااحسن ھذا۔ یعنی "سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک رات ہمارے پر اس قدر بارش ہوئی کہ زمین تربتر ہو گئی صبح ہوئی تو ایک شخص کپڑے میں کنکریاں ڈال کر لایا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا کر بچھا دیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا کیا اچھا ہوا یہ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ رات کو نمازیں جمع کی ہوں گی اس لیے بارش کا اندازہ ہو جائے کہ نمازیں اس قدر بارش سے جمع ہو سکتی ہیں! اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا اچھا ہوا کہ جمع نماز مناسب وقت پر ہوئی۔ واللہ اعلم ابن عمر رضی اللہ عنہ اسی وجہ سے بارش میں نمازیں جمع کرنے کے قائل تھے۔ اور سنت جانتے تھے اور ابن عمر رضی اللہ عنہ اسی وجہ سے نماز کو بارش کے سبب سے جمع کیا کرتے تھے۔ کمامرّ ذکرہ۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع نماز کی حدیث پر یہ لکھا ہے۔ قال بعض اھل العلم یجمع بین الصلاتین فی المطروبہ یقول الشافعی واحمد واسحاق۔ یعنی "بعض ائمہ محدثین اہل علم بارش کے عذر سے نمازیں جمع کرنے کے قائل تھے۔"

<u>علماء اہل حدیث کی تصریحات</u>: فاضل ہزاروی نے بعض اہل حدیث کے فتوے بھی نقل کیے ہیں عذر کے بغیر نمازوں کو جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ بغیر عذر کے نمازوں کو جمع کرنا جائز نہیں لیکن بارش اور بیماری وغیرہ ہو تو ان عذروں سے نمازیں جمع کرنا جائز ہے اس سے کسی عالم اہل حدیث کو انکار نہیں ہے چنانچہ علماء اہل حدیث کے فتوے نقل کیے جاتے ہیں جو بارش کے عذر سے نماز جمع کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری تحفۃ الاحوذی جلد۱ ص۱۶۸ میں لکھتے ہیں۔ من عرض لہ عذر یجوز لہ الجمع۔ یعنی "جس شخص کو کوئی عذر لاحق ہو تو اس کو نماز جمع کرنا

جائز ہے۔" پھر لکھتے ہیں والعذر قد یکون بالسفر وقد یکون للمطر و بغیر ذالک ونحن نقول بہ۔ یعنی "عذر کبھی سفر کا ہو جاتا ہے اور کبھی بارش کا اور کبھی اس کے علاوہ کوئی اور عذر تو ہم اس کے قائل ہیں کہ ایسے عذروں میں نمازیں جمع کرنا جائز ہے۔" مولانا حکیم محمد صادق صاحب سیالکوٹی کا فتویٰ جو ان کی کتاب صلوٰۃ الرسول ﷺ ص۳۶۵ پر درج ہے کہ "ہم گھروں پر ہوں تو بھی کسی ضرورت کے وقت نماز ظہر و عصر مغرب و عشاء اکٹھی کر کے پڑھ سکتے ہیں۔"

اس عبارت میں لفظ "کسی ضرورت" عام ہے جو بارش کو بھی حاصل ہے۔ فقہ محمدیہ طریقہ احمدیہ حصہ اول ص۸۷ میں یہ عنوان ہے۔ گھر میں نماز جمع کرنے کے بیان میں" پھر یہ لکھا ہے کہ گھر میں ضرورت کے وقت نماز کو جمع کر کے پڑھنا جائز ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ منتقی میں ابن عباس کی حدیث جمع نماز من غیر خوف ولا مطر والی لکھ کر یہ لکھتے ہیں یدل بفحواہ علی الجمع للمطر والخوف والمرض۔ یعنی "یہ حدیث اپنے مضمون سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بارش اور خوف اور بیماری کے عذروں سے نماز جمع کرنا جائز ہے۔"

مفتی اعظم مولانا حافظ عبداللہ محدث روپڑی کا فتویٰ فتاویٰ علماء حدیث کے ص۲۲۶ میں درج ہے کہ سائل نے سوال کیا کہ بارش کے روز نماز جمع کر کے پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ تو اس کا جواب بہت طویل دیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نقل کر کے یہ لکھا ہے "یہ حدیث اپنے مفہوم سے بارش و خوف اور بیماری کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنے پر دلالت کرتی ہے۔" پھر اس پر بحث کر کے آخر میں یہ لکھا ہے "خلاصہ یہ کہ بارش کی وجہ سے نماز جمع کرنے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔" جناب مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم کا فتویٰ فتاویٰ علمائے اہل حدیث جلد چہارم ص۱۱۸ میں درج ہے۔ سائل نے یہ سوال کیا کہ نماز جمع کرنے کا طریقہ کیا ہے اور کب جمع کرنی چاہئے تو اس کا جواب یہ لکھا ہے کہ نماز سفر میں جمع کی جا سکتی ہے یا جب بارش ہو رہی ہو اور عوام کا دوبارہ مسجد میں جمع ہونا مشکل ہو یا باعث تکلیف ہو ایسی حالت میں ظہر اور عصر نیز مغرب اور عشاء جمع ہو سکتی ہیں۔"

جناب مولانا نواب صدیق حسن خاں محدث بھوپالی مرحوم کا فتویٰ ان کی مشہور کتاب

دلیل الطالب میں جمع نماز کے بارہ میں ص۳۴۹ سے ص۳۵۰ تک بحث درج ہے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کر کے یہ لکھتے ہیں "یہ حدیث اپنے الفاظ سے دلالت کرتی ہے کہ بارش و خوف و بیماری کی وجہ سے نمازیں جمع کی جاسکتی ہیں۔" پھر جمع صوری کی بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔" رہی جمع تاخیر یا جمع تقدیم تو وہ صرف مزدلفہ میں ثابت ہے یا مطر یا بارش کی حالتوں میں "نواب صاحب کے فتوؤں کے اقتباسات سے یہ ظاہر ہوا کہ نماز جمع تقدیم و تاخیر بارش کی حالت میں بھی وہ جائز قرار دیتے ہیں۔ جس کے فاضل ہزاروی منکر ہیں۔

مولانا محمد اسحاق صاحب شیخ الحدیث مدرسہ تقویۃ الاسلام غزنویہ لاہور کا فتویٰ فتاویٰ علمائے حدیث کے ص۲۲۸ میں ہے۔ جو طویل عبارت میں ہے بقدر حاجت اس کا ضروری اقتباس یہ ہے "بلا عذر دو نمازوں کو جمع کرنا درست نہیں ہاں سفر' خوف' بارش اور مرض جیسے عذروں میں فقہاء محدثین کے نزدیک جمع کرنا جائز ہے۔ سفر میں نبی اکرم ﷺ سے صحیح احادیث میں تقدیم تاخیر اور صوری تینوں طریق پر جمع کرنا ثابت ہے دوسرے عذروں کو اس پر قیاس کیا جاتا ہے۔ نیز بعض احادیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و سلف صالحین کے آثار سے اس کی تائید پائی جاتی ہے۔"

راقم عرض گزار ہے کہ سب عذروں میں علت اور وجہ قیاس منصوص ہے کہ امت سے مشقت تنگی دشواری کو دفع کرنا اور آسانی پیدا کرنا ہے اور قرآن بھی اس پر ناطق ہے ماجعل علیکم فی الدین من حرج یعنی "اللہ تعالیٰ نے تمہارے دین میں تنگی اور دشواری نہیں رکھی۔" مثلاً بیمار کھڑا نہ ہو سکے تو بیٹھ کر نماز پڑھ لے اور بیٹھ نہ سکے تو لیٹ کر اشارے سے پڑھ لے اور اگر بے ہوش ہو اور نمازوں کا وقت نکل جائے تو نماز معاف ہے۔

فتاویٰ مصریہ ص۲۷ میں ہے فعل کل صلوۃ فی وقتھا افضل من الجمع اذالم یکن لہ حاجۃ یعنی "ہر نماز اپنے وقت پر ادا کرنی افضل ہے جب کہ اس کو کوئی عذر اور حاجت عارض نہ ہو۔" اگر حاجت ہو تو پھر جمع نماز کی رخصت ہے اور فتاویٰ علمائے حدیث جلد چہارم میں جمع نمازوں کی بحث میں لکھا ہے کہ زید اگر اس قدر ضعیف مسلوب القویٰ ہو گیا ہے کہ فرائض ۵ پنجگانہ کو اپنے اپنے وقت پر نہیں پڑھ سکتا تو اس کو جمع بین الصلاتین پر مداومت نہیں کرنا چاہیے ہاں اگر گاہے گاہے جمع کر لیا کرے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے پھر

ارغام المبتدعین کے حوالہ ص ۱۱ میں سے یہ سوال و جواب نقل کیا ہے کہ "بغیر عذر شرعی کے جمع بین الصلوتین کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ لکھا ہے کہ ہمارا قول اس بارے میں یہ ہے کہ اگر اتفاقیہ کوئی شخص حالت اقامت میں دو نمازیں جمع کرلے تو کچھ قباحت نہیں لیکن اس کی عادت نہ پکڑے اور نہ کثرت کرے۔ رسول اللہ ﷺ سے بھی اتفاقی طور پر ثابت ہے۔ کہ مدینہ میں ظہر و عصر مغرب و عشاء کو بغیر عذر' خوف' سفر' بارش کے جمع کر کے پڑھا جب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا کہ آپ ﷺ کا ارادہ تنگی امت سے دور کرنا تھا۔"

جمع سے مراد جمع حقیقی ہی ہے جمع صوری نہیں: فاضل ہزاروی اس جمع کو جمع صوری قرار دیتے ہیں امام نووی اس تاویل پر یہ لکھتے ہیں ھذا احتمال ضعیف اوباطل لانه مخالف للظاھر مخالفته لا تحتمل۔ کہ "یہ احتمال ظاہر حدیث کے مخالف ہے جو مخالفت غیر محتملہ ہے۔"

امام ابن القیم رحمہ اللہ جمع صوری کی تردید کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں وھذا امر فی غایة العسر والحرج والمشقة وھو خلاف مقصد الجمع والفاظ السنة الصحیحة الصریحة تردہ۔ یعنی "اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جمع صوری پر محمول کرنا نہایت تنگی اور مشکل اور مشقت کا باعث ہے اور جمع نماز کے مقصود کے سراسر خلاف ہے اور حدیث کے الفاظ اس کو رد کرتے ہیں۔"

اور حضرت مولانا العلام محمد عطاء اللہ صاحب رحمہ اللہ نسائی شریف کے حاشیہ ص ۶۹ میں جمع صوری کی تاویل کی یوں تردید کرتے ہیں ھذا الظاھر بل الظاھر ھو الجمع الحقیقی لانه ھو الحقیقته فی الجمع والجمع الصوری مجاز ولا یصار الی المجاز الا اذا تعذر الحقیقته وھو ممنوع۔ یعنی "جمع صوری مراد لینا ظاہر حدیث کے خلاف ہے ظاہر معنی یہ ہے کہ اس سے مراد جمع حقیقی ہے کہ نماز جمع حقیقت میں کی تھی کہ دو نمازوں کو ایک ہی وقت میں اکٹھا کیا تھا جمع صوری مراد لینا مجازی معنی ہے اور جب تک حقیقت متعذر نہ ہو مجازی معنی مراد لینا منع ہے۔" دوسرا جواب یہ دیا ہے قلت وابن عباس علله برفع الحرج ولا یخفی ان فھم الراوی اولی والذی حملوہ علیه من الجمع الصوری ینافیه کماحققه ابن تیمیة فی القاعدہ فی احکام السفر۔ یعنی "میں یہ کہتا ہوں کہ اس جمع نماز

کی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خود علت بیان کر دی ہے کہ نماز کو رفع حرج کے لیے جمع کیا تھا اور یہ اصول کی بات ہے کہ راوی حدیث جو مراد حدیث کی بیان کرے وہ سب سے بہتر ہے جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے قاعدہ احکام سفر میں اس کو تحقیق سے ذکر کیا ہے۔"

حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علاقہ یمن کی طرف اپنے دو مبلغ بھیجے تو انہیں اصول تبلیغ سمجھا کر یہ فرمایا کہ یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا۔ کہ تم احکام اسلام بیان کرتے ہوئے آسانی کرنا دشواری و تنگی نہ ڈالنا اور خوش خبریاں دینا اور نفرت نہ ڈالنا" اور یہ فرمایا الدین یسر کہ دین اسلام آسان ہے اس میں تنگی اور دشواری نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں نمازوں کو جمع کیا تو اس کی علت خود بیان فرمائی کہ صنعت ھذا لکی لاتحرج امتی رواہ الطبرانی فی الاوسط الکبیر کہ میں نے ظہر اور عصر اور مغرب و عشاء کو صرف اس لیے جمع کر کے پڑھا ہے کہ میری امت کو نمازوں کے پڑھنے میں کوئی دشواری اور تنگی نہ ہو اور یہی علت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کی ارادان لا یحرج امتہ "کہ نمازوں کے جمع کرنے کی یہی وجہ ہے کہ اپنی امت کو دشواری نہ ہو اور یہی اصول قرآن کریم میں مذکور ہے ماجعل علیکم فی الدین من حرج۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے پر دین میں تنگی نہیں رکھی۔

اور فاضل ہزاروی نے جو اس جمع فی المدینہ کو جمع صوری قرار دینے کی کوشش کی ہے یہ اس علت منصوصہ کے سراسر خلاف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں فرمایا ان قولہ صلی اللہ علیہ وسلم لئلا تحرج علی امتی یقدح فی حملہ علی الجمع الصوری لان القصد الیہ لایخلو عن حرج۔ یعنی "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ میں نے نمازوں کو اس لیے جمع کر کے پڑھا ہے تاکہ میری امت پر تنگی اور مشقت نہ رہے جمع صوری کی تاویل کو رد کرتا ہے کیونکہ جمع صوری تو خود موجب حرج ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ سفر میں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں جمع کیں وہ جمع حقیقی ہی تھی کہ ایک وقت میں دوسری نماز کو پڑھتے رہے جمع تقدیم اور تاخیر دونوں ثابت ہیں لیکن یہ عمل جمع نماز کا مقلدین حنفیہ کے خلاف ہے وہ بھی فاضل ہزاروی کی طرح سفر کی جمع حقیقی کو جمع صوری کی تاویل سے ٹھکراتے ہیں اور یہ کہتے ہیں لایجمع بین فرضین فی وقت بعذر سفر ومطر اور درمختار' شرح وقایہ' کنز الدقائق میں ہے کہ "دو فرض نمازوں کو سفر اور

بارش کے عذر سے ایک وقت میں جمع کر کے نہ پڑھا جائے۔" جب ان کو سفر نبوی کی جمع تقدیم و تاخیر کی احادیث سنائی جائیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ سب جمعین صوری تھیں۔

اس کا جواب فتح الربانی ص۱۲۹ میں یہ لکھا ہے ان الجمع رخصة فلو كان على ماذكروه لكان اشد ضيقا واعظم حرجا فى السفر من الاتيان على صلوٰة فى وقتها لان الاتيان بكل صلوٰة فى وقتها اوسع من مراعاة طرفى الوقتين بحيث لا يبقى من وقت الاولٰى الابقدر فعلها۔ یعنی "نمازوں کا جمع کرنا آسانی کے لیے رخصت تھی اور اگر جمع صوری مراد لی جائے تو یہ سفر میں نہایت تنگی ہے بلکہ ہر نماز کو وقت پر ادا کرنے سے بھی زیادہ دشواری ہے کیونکہ ہر نماز اپنے وقت پر تو آسانی سے ادا ہو جاتی ہے اور جمع صوری میں دو وقتوں کی نگرانی کرنی پڑتی ہے کہ پہلی نماز کے آخری وقت کا اتنا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ کہ اس میں پہلی نماز ایسے اندازہ سے ادا کرے کہ اس سے فارغ ہوتے ہی دوسری نماز کا وقت ہو جائے اور وہ ساتھ ہی پہلی نماز کے ادا ہو جائے سو یہ نہایت ہی دشواری ہو گی جو آسانی کی رخصت کے خلاف ہے۔" میں کہتا ہوں کہ یہی دشواری جمع صوری کی حضر میں پیش آئے گی۔ حالانکہ حضر میں جمع نماز کی صورت آسانی کے لیے رخصت تھی اور بارش کے سلسلے میں جمع صوری کی صورت ہی بالکل لغو ہے کیونکہ اس میں بارش برسنے کی حالت معلوم کر کے نمازیں جمع کرنی پڑتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جیسے مقلدین کی تاویل سفر میں ظاہر احادیث کے خلاف ہے نیز جمع صوری باعث حرج ہے ایسے ہی حضر میں کسی عذر اور حاجت اور مشکل پیش آنے پر جمع صوری آسانی کے خلاف موجب حرج ہے پس جہاں مطلق جمع نماز کا ذکر ہے خواہ سفر ہو یا حضر وہاں جمع حقیقی ہی مراد ہے۔ جو واقع حرج اور باعث آسانی ہے جمع صوری کی تاویل باطل ہے خصوصاً بارش میں نمازیں جمع کرنے میں جمع صوری ہو ہی نہیں سکتی وہ بارش برسنے اور کم زیادہ ہونے پر موقوف ہے اس میں تو جمع حقیقی ہی ہو سکتی ہے صوری نہیں کما تقدم۔

هذا ما عندى والله اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ اللہ الباری

الاعتصام جلد ۳۲' شمارہ ۶' ۷' ۸ مورخہ ۵ و ۱۲ و ۱۹ ستمبر سنہ ۱۹۸۰ء

ایک رکعت نماز شرع میں پائی جاتی ہے

سوال: کیا حکم ہے شرع محمدی کا اس مسئلہ میں: ایک رکعت نماز کا وجود شرع میں پایا جاتا ہے یا نہیں؟۔ اگر فرضی یا نفلی نماز میں ایک رکعت نماز کا ثبوت ہے تو وہ بیان کیا جاوے۔ مقلدین حنفیہ کے تمام علماء یہ کہتے ہیں کہ ایک رکعت نماز وتر پڑھنا فاسد ہے وتر نہ ہوگا کیونکہ ایک رکعت بتیرہ یعنی لُنڈی ہے جس کا وجود شرع میں نہیں پایا جاتا۔ وتر تین رکعت نماز مغرب کی طرح پڑھنے چاہئیں۔ مغرب کی تین رکعت بھی وتر ہیں اور ان کو دن کے وتر کہا جاتا ہے۔ اور عشاء کے بعد وتر رات کے وتر کہلاتے ہیں تو یہ بھی دن کے وتروں کی طرح پڑھے جائیں گے قاعدہ یہ ہے نماز تطوع اس طرح پڑھی جائے جس طرح فرائض میں اس کی نظیر صبح کے دو فرض ہیں۔ چار رکعت نفل کہ ان کی نظیر ظہر، عصر، عشاء کے چار فرض پائے جاتے ہیں۔ مغرب کی تین رکعتیں فرض ہیں تو رات کے وتر اس کی نظیر کے مطابق تین رکعت مغرب کے فرضوں کی طرح ادا کرنے ہوں گے۔

وتر کی زیادہ سے زیادہ تعداد کتنی ہے؟۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ تین وتر ہیں ان سے زیادہ پڑھنا ثابت نہیں۔ گوجرانوالہ کے مفتی مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی کا فتویٰ اخبار الاعتصام میں یوں شائع ہوا کہ وتر زیادہ سے زیادہ گیارہ رکعت ہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟۔ آپ پوری تحقیق سے یہ مسئلہ حل کریں۔ مجھے آپ کی تحقیق ہر مسئلہ میں پسند ہے۔ اور اس سے میری تسلی ہو جاتی ہے۔

بینوا توجروا (عبدالحمید۔ لاہور)

الجواب بعون الوہاب وھو الموافق للصواب

الحمد لله رب العالمين اما بعد فاقول و بالله التوفيق، واضح ہو کہ ایک رکعت وتر پڑھنے کا ثبوت ایسی احادیث نبویہ میں پایا جاتا ہے جو ثبوت اور دلائل کی رو سے قطعیہ ہیں جو حد تواتر کو پہنچ چکی ہیں۔ میرے عندیہ میں بعد از علم ان احادیث نبویہ کو تقلیداً یا عناداً ٹھکرا دینا کفر ہے اور ان کے منکر کو کافر قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ اس انکار سے احادیث نبویہ کی تکذیب لازم آتی ہے اور یہ کفر ہے۔ اسی وجہ سے میرے نزدیک منکر حدیث منکر رسول اللہ ﷺ متصور ہے۔ جس طرح منکر قرآن، منکر اللہ تعالیٰ کا تصور کیا جاتا

ہے۔ قرآن وحدیث ہر دو کے انکار سے مسلمانوں کو بچنا چاہیے۔ ایک رکعت نماز وتر کے ثبوت میں احادیث تو بکثرت ہیں جو کتب حدیث معتبرہ میں پائی جاتی ہیں اور محدثین نے ان حدیثوں پر ایک رکعت کے ثبوت کے لیے باب منعقد کیے ہیں۔ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے کہ بندہ مکفوف البصر ہو چکا ہے اور لکھنے پڑھنے سے معذور ہے۔ یہاں صرف چند احادیث قولیہ وفعلیہ سے ثبوت پیش کیا جاتا ہے زیادہ تفصیل مطولات میں ملاحظہ کریں، خصوصاً قیام اللیل للامام المروزی کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

احادیث قولیہ: (1) مشکوٰۃ میں ایک حدیث ابن عمرؓ سے یوں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اذا خشی احد کم الصبح صلی رکعة" (متفق علیہ) یعنی رات کا نماز پڑھتا ہوا جب کوئی تمہارا صبح ہونے کا اندیشہ کرے تو ایک رکعت پڑھی جاتی ہے جب صبح قریب ہو تو صرف ایک رکعت نماز وتر پڑھ کر سلسلہ نماز تہجد کا ختم کردے کہ وتر آخر نماز کے ہوا کرتا ہے۔

(2) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دوسری حدیث یوں آئی ہے جو مشکوٰۃ سے منقول ہے "قال رسول اللہ ﷺ الوتر رکعة من آخر اللیل" (مسلم) یعنی نماز وتر آخر رات میں ایک ہی رکعت ہے۔ ابن عمرؓ کی ان دونوں حدیثوں سے ایک رکعت نماز ثابت ہے۔

(3) مشکوٰۃ میں حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے "قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ وتر یحب الوتر" یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور وہ ایک ہی کو دوست رکھتا ہے۔ وتر دراصل ایک ہی رکعت ہے اس سے پہلے جس قدر نفلوں کی رکعتوں کو پڑھو گے ان کے مجموعہ کو بھی وتر کہا جاتا ہے۔ وہ ایک رکعت سب کو وتر کا نام دے دیتی ہے۔ مثلاً اگر دس نفلیں دو دو رکعت کرکے پڑھتے رہو اور پھر ایک رکعت وتر علیحدہ پڑھ لو تو ان کو گیارہ وتر کہا جائے گا۔ اگر بارہ رکعت پڑھ کر پھر صرف ایک رکعت وتر پڑھ لو تو ان کو تیرہ رکعت وتر کہا جائے گا۔ حدیث میں ہے کہ آخر کی ایک رکعت پہلی نماز کو وتر بنا دیتی ہے۔

(4) مشکوٰۃ میں بروایت بخاری یہ حدیث وارد ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا کہ حضرت معاویہؓ ایک ہی رکعت پڑھتے ہیں اس کا کیا حکم ہے تو حبرالامۃ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "اصاب انه فقیه" یعنی وہ درست کام کرتے ہیں کیونکہ وہ فقیہ ہیں۔ اور دوسری روایت میں ہے "اوتر معاویة بعد العشاء برکعة و عنده مولیٰ ابن عباس

٭ اس کی سند میں ایک راوی جریر بن عبدالحمید ہے اس کو اخیر عمر میں وہم ہوگیا تھا معلوم نہیں یہ روایت وہم سے پہلے کی ہے یا بعد کی (تہذیب التہذیب)۔

فاخبره فقال دعه فانه قد صحب النبی ﷺ "یعنی معاویہؓ نے نماز عشاء کے بعد صرف ایک رکعت وتر نماز پڑھی اس وقت حضرت ابن عباسؓ کا غلام ان کے پاس تھا اس نے آکر ابن عباسؓ کو خبر دی کہ معاویہؓ صرف ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کا ذکر چھوڑ دو وہ تو آنحضور ﷺ کی صحبت میں رہے ہیں اور (وہ کاتب وحی تھے اور آنحضور ﷺ کے سالہ تھے) ان دونوں روایتوں کے ملانے سے یہ ثابت ہوا کہ ایک رکعت نماز درست اور صحیح ہے۔ اور اس کو جو پڑھتا ہے وہ دین میں سمجھدار ہے۔ اور جو اس سے انکار کرتا ہے وہ سفیہ ہے۔ اور اس پر اس فقیہ صحابی کا تعامل تھا جو اکثر آنحضور ﷺ کی صحبت میں رہا۔ اور آپ کا حقیقی رشتہ دار تھا کہ اس کی ہمشیرہ آنحضور کے گھر میں بقید زوجیت آباد تھی۔ اور وہ کاتب وحی تھا۔ اس لیے اس کو فقاہت نصیب ہوئی اور وہ ملک عرب کا اجماعی امیر المومنین قرار پایا۔ جس نے نکاح شغار کا عرب سے قلع قمع کیا۔ رضی الله عنه وارضاه۔

اس حدیث قولی وفعلی سے ایک رکعت نماز کا وجود ثابت ہو گیا۔ اب جو اس کا انکار کرتا ہے وہ فقیہ نہیں ہے۔ بلکہ سفیه من السفهاء ہے، جس سے پناہ مانگنی چاہیے۔

(5) مشکوٰۃ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ سے یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "من احب ان یوتر بخمس فلیفعل ومن احب ان یوتر بثلاث فلیفعل ومن احب ان یوتر بواحدة فلیفعل" (ابوداؤد نسائی ابن ماجہ) جو شخص پانچ وتر پڑھنا چاہے وہ پانچ پڑھ لے اور جو شخص تین وتر پڑھنا چاہے وہ تین پڑھ لے اور جو صرف ایک ہی پڑھنا چاہے وہ ایک پڑھ لے۔

اس حدیث سے صریح طور پر ایک رکعت نماز کا پڑھنا ثابت ہوا۔ جس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی مومن بالرسول انکار کرسکتا ہے۔ الا من سفه نفسه۔

(6) حدیث صحیح میں جو بروایت مسلم، مشکوٰۃ میں ہے یہ ارشاد نبوی ہے "اجعلوا اخر صلوتکم باللیل وترا" تم اپنی رات کی نماز کے آخر میں ایک رکعت وتر پڑھو۔ اس حدیث سے دو مسئلے ثابت ہوئے ایک یہ کہ رات کی نماز آخر میں صرف ایک رکعت وتر ہے۔ دوسرا یہ کہ وتر کے بعد کوئی نماز نہیں ہے۔ وتر آخری نماز ہے امت محمدیہ کو اسی حکم کی پابندی

لازم ہے۔ پس عشاء کے بعد وتر پڑھ کر دو نفل جو بیٹھ کر پڑھے جاتے ہیں یا تہجد کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے ہیں یہ بدعت ہیں۔ بعض حدیثوں میں جو آنحضور کا وتروں کے بعد دو نفلوں کا بیٹھ کر پڑھنا مروی ہے وہ آپ کا خاصہ تھا۔ یہ چھ عدد قولی حدیثیں ہیں جن سے ایک رکعت وتر نماز ثابت ہوئی ہے پس ان کا انکار کفر ہے۔

بعض لوگ جو ایک وتر نماز کو بتیرا یا لُنڈی رکعت کہتے ہیں یہ سراسر غلط ہے۔ چنانچہ قیام اللیل میں ایک وتر کے ذکر میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی نے یہ کہا کہ ایک وتر نماز کو بتیرا کہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا یہ غلط ہے۔ یہ تو اللہ کا اور اس کے رسول کا مقرر کردہ طریقہ ہے۔ بتیرہ تو وہ نماز ہوتی ہے جس کا رکوع یا سجدہ پورا نہ ہو۔ میں کہتا ہوں مقلدین کی نمازیں جو وہ جلدی جلدی پڑھتے ہیں اور ان کا رکوع اور سجود شرعی دستور کے مطابق نہیں ہے وہ البتہ لُنڈی نمازیں ہیں سچ ہے۔ میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایک رکعت وتر سنت نبوی ہے اس کو لُنڈی نماز کہنا گمراہی ہے۔ اس عقیدہ سے بچنا لازم ہے۔

فعلی حدیثوں سے ثبوت: (1) کتب حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی یہ مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ رات کی نماز گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ "یوتر بواحدۃ" نماز وتر ایک رکعت پڑھتے تھے۔ اس حدیث سے ایک رکعت نماز ثابت ہوئی۔ دیگر روایتوں میں اس کی تفصیل ہے کہ دو دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرا کرتے رہے۔ اور پھر آخر میں وتر ایک رکعت پڑھا کرتے تھے۔ یہ عمل اکثری تھا۔ یعنی نبی کریم ﷺ ایک رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔

(3) قیام اللیل کے اسی حوالہ میں یہ حدیث ہے کہ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں "صلی رسول اللہ ﷺ مثنیٰ مثنیٰ ویوتر بواحدۃ" آنحضور ﷺ رات کو دو دو رکعت پڑھتے رہتے تھے پھر وتر ایک رکعت پڑھتے۔

(4) قیام اللیل میں عبداللہ بن زبیرؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ "کان النبی ﷺ اذا صلیٰ العشاء صلیٰ بعدھا اربعا ثم الوتر بسجدۃ" نبی کریم ﷺ جب عشاء کی نماز پڑھتے تو اس کے بعد چار رکعت پڑھا کرتے تھے پھر ایک رکعت وتر پڑھتے تھے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عشاء کے بعد بھی وتر پڑھنا جائز ہے۔ اور اس کے بعد کوئی نماز نہیں

ہے۔اگر پڑھتے تو راوی حدیث بیان کر دیتا۔اسی طرح متعدد احادیث فعلیہ سے ایک رکعت وتر پڑھنا ثابت ہے۔پس سب احادیث قولیہ وفعلیہ دس صحابہ سے زائد راویوں سے آئی ہیں۔اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے اپنی آخری کتاب بوادرالنوادر میں یہ لکھا ہے کہ تدریب الراوی میں ہے کہ دس راویوں سے جو روایت مردی ہو وہ متواتر ہے۔قیام اللیل صفحہ ۱۱۹ میں امام مروزیؒ فرماتے ہیں "الاخبار التي رويت عنه انه او تر بواحدة اثبت واصح" وہ احادیثؒ نبویہ جو ایک رکعت وتر کے بارہ میں وارد ہیں بہت زیادہ ثابت اور نہایت صحیح ہیں۔

پھر صحابہ کرام حضرت علیؓ وسعد بن وقاصؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم کا تعامل ذکر کیا ہے۔پھر صفحہ ۱۲۳ میں لکھتے ہیں کہ نعمان یعنی ابوحنیفہؒ کا گمان یہ تھا کہ وتر صرف تین رکعات ہیں۔اس سے زائد پڑھنے جائز نہیں اور نہ اس سے کم پڑھنے درست ہیں۔اور جس نے ایک وتر پڑھا اس کا وتر فاسد ہے۔اور اس پر واجب ہے کہ وتر کا اعادہ کرے۔اور تین رکعت وتر پڑھے۔آخر میں سلام پھیرے اگر دو رکعت پر سلام پھیرا تو وتر اس کا باطل ہے اسی طرح وتر کی بابت ان کے دیگر خیالات ہیں کہ وتر سواری پر جائز نہیں ہے وغیرہ۔پھر لکھتے ہیں "قال هذا خلاف الاخبار الثابتة عن رسول الله ﷺ واصحابه وخلاف ما اجمع عليه اهل العلم وانما اتى من قلة معرفة بالاخبار وقلة مجالسة للعلماء" یعنی ان کا یہ خیال اور قول خلاف احادیث نبویہ وآثار صحابہ کے ہے۔اور خلاف اجماع اہل علم کے ہے۔اور یہ بات ان سے اس لیے صادر ہوئی کہ ان کو احادیث نبویہ کا علم قلیل تھا اور علماء محدثین کی مصاحبت کم رہی ہے۔تو یہ امام صاحبؒ کیلیے عذر تھا کہ ان کو ایک وتر نماز کی حدیثیں نہ پہونچیں۔اب ان کے مقلدین ان کی تقلید کی بناپر انکار کریں گے تو یہ انکار کفر ہوگا اور اس کو کفر وشرک تقلیدی کہتے ہیں جس کی تردید کتاب وسنت میں موجود ہے اس لیے امام ابوحنیفہ یہ فرماگئے "اتركوا قولي بقول الرسول وقول الصحابة" یعنی تم میرے قول کو فرمان نبوی اور فرمان صحابہ کے مقابلہ میں ترک کر دیا کرو۔اب جو مقلد ترک نہ کرے گا وہ نافرمان رسول ﷺ ونافرمان صحابہ ہونے کے علاوہ نافرمان امام ابوحنیفہ کا بھی تصور کیا جائے گا۔پس ایک وتر کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

ہر کہ شک آرد کافر گردد

باقی رہا علماء حنفیہ کا یہ کنا کہ ایک رکعت نماز کی نظیر فرضوں میں نہیں پائی جاتی۔ اور دیگر نوافل وسنن کی پائی جاتی ہے۔ یہ تین طرح سے غلط ہے اول یہ کہ یہ قاعدہ محض قیاسی ہے۔ کتاب وسنت سے ثابت شدہ شرعی نہیں ہے۔ ہم اہلحدیث نصی بات کے قائل ہیں اختراعی کے نہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ حنفیہ وتر نماز کو نہ فرض کہتے ہیں اور نہ سنت اور نفل کہتے ہیں' بلکہ ان کے بین بین جانتے ہیں جس کا نام انہوں نے واجب رکھا ہے تو پھر اس کی نظیر فرائض میں تلاش کرنا قاعدہ کے خلاف ہوا۔ تیسری وجہ یہ کہ ایک رکعت نماز کی نظیر فرائض میں پائی جاتی ہے جس سے انکار کرنا جہالت ہے چنانچہ نماز خوف کی کم از کم ایک رکعت فرض ہے جس کے دلائل یہ ہیں۔ بلوغ المرام میں یہ حدیث ہے "عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله ﷺ صلوٰۃ الخوف رکعة علی ای وجهٍ کان "نماز خوف کی ایک رکعت ہے جس وجہ پر پڑھنا ممکن ہو پڑھ لے۔ یہ روایت ایک رکعت کے ثبوت میں صاف و صریح ہے لیکن اس کی اسناد ضعیف ہے اور اس کے متن سے جو مفہوم ثابت ہے وہ صحیح ہے کیونکہ دیگر دلائل صحیحہ اس کے موید ہیں چنانچہ مشکوٰۃ میں ایک صحیح روایت یوں وارد ہے "عن ابن عباس قال فرض الله الصلوٰۃ علی لسان نبیکم ﷺ فی الحضر اربعاً وفی السفر رکعتین وفی الخوف رکعة" ابن عباس نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہارے نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک پر لوگوں کے لیے نماز فرض اور مقرر کی ہے وہ حضر میں چار رکعت ہے اور سفر میں دو رکعت ہے اور بحالت خوف دشمن صرف ایک رکعت ہے اس حدیث صحیح سے دو باتیں ثابت ہوگئی ہیں ایک یہ کہ سفر اور خوف کی نماز ناقص اور کم نہیں ہے کہ چار رکعت سے گھٹا کر دو یا ایک رکعت کی گئی ہو بلکہ حضر اور سفر اور خوف میں یہ تعداد اللہ تعالیٰ نے مستقل باعتبار مختلف حالتوں کے مقرر کی ہے۔ دوسری یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ شرع میں ایک رکعت نماز کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور ایک رکعت وتر کے مسنون اور مشروع ہونے کی نظیر فرائض میں موجود ہے پس اس قاعدہ قیاسیہ کی رو سے بھی ایک رکعت وتر پڑھنا صحیح ثابت ہوگیا۔

بہر صورت کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

دیگر دلیل اور سنیئے کہ مشکوٰۃ شریف میں یہ فعلی حدیث وارد ہے' جس سے قولی

حدیث کی تائید پائی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ مع اپنی فوج مجاہدین کے ضجنان اور عسفان کے درمیان اترے تو وہاں آنجناب ﷺ نے اپنی فوج کو نماز خوف اس صورت سے پڑھائی ''فتکون لھم رکعة ولرسول اللہ ﷺ رکعتان'' یعنی مجاہدین کی تو ایک ایک رکعت ہوگئی اور رسول اللہ کی دو رکعت ہوگئیں۔

میں کہتا ہوں کہ نماز خوف کی ہر موقع اور محل کی اور مختلف حالتوں کی بناء پر کئی صورتوں سے پڑھی گئی ہے۔ اس کی ایک صورت صرف ایک رکعت کی بھی ہے' تو کم از کم نماز کی ایک رکعت ہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ شرع میں نماز کی ایک رکعت بھی ہے اس نظیر پر وتر کی ایک رکعت بھی جائز رکھی گئی ہے اگرچہ وتر ایک ایک ہی سلام سے نو' سات' پانچ اور تین بھی ثابت ہیں۔ لیکن بسا اوقات ایک ہی وتر پڑھا گیا ہے۔

نماز خوف کی طرح وتر کی نماز بھی کثیر الانواع ہے لیکن ایک رکعت دیگر رکعتوں سے جداگانہ پڑھنا آنحضور ﷺ کا کثیر عمل تھا۔ پس سب صورتیں جائز اور درست ہیں۔ یہ یاد رہے کہ نفلی نماز کی قسمیں مختلف ہیں' مثلاً تسبیح نماز' نماز کسوف وخسوف' نماز استسقاء وغیرہ تو ان کی کیفیت مختلف طور پر وارد ہے جس سے ظاہر ہے کہ نفلی نماز کی نظیر فرائض میں نہ پائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے مثلاً فرضی نماز سواری پر جائز نہیں ہے۔ اور وتر اور دیگر نوافل جائز ہیں فرضی نماز میں ہر حالت میں قبلہ کی طرف منہ رکھنا ضروری ہے۔ اور وتر اور دیگر نوافل میں صرف ایک دفعہ قبلہ کی طرف سواری کا منہ پھیر کر پھر جدھر کو جانا ہو منہ کر کے چلے۔ اور سواری پر چلتی حالت میں نماز وتر اور دیگر نوافل پڑھتا جائے تو یہ درست ہے۔ دیگر مسئلہ کہ وتر کی رکعت زیادہ سے زیادہ کتنی ہیں تو اس کا جواب یہ کہ وتر ایک ہی رکعت ہے باقی اس سے پہلے جس قدر چاہے نفل پڑھ لے دو' چار' چھ' آٹھ' دس' بارہ' ان کے بعد ایک رکعت پڑھے گا تو وہ سب کو وتر کا نام دے دے گی۔ دو کے ساتھ ایک ہوئی تو تین وتر اور چار کے ساتھ ایک ملا دی تو پانچ وتر اور اگر چھ کے ساتھ ایک ملا دی تو سات وتر اور اگر آٹھ کے ساتھ ایک ملا دی تو نو وتر اور اگر دس کے ساتھ ایک ملا دی تو گیارہ وتر اور اگر بارہ کے ساتھ ایک رکعت ملا دی تو تیرہ رکعت وتر کہلائیں گے۔ تیرہ رکعت سے زیادہ وتر پڑھنا ثابت نہیں ہے اگرچہ اکثری عمل گیارہ کا رہا ہے چنانچہ نسائی شریف میں ایک باب یوں منعقد کیا گیا ہے ''باب الوتر بثلاث عشرة رکعة'' یعنی یہ باب تیرہ رکعت کے بیان

میں ہے۔ پھر اس کے ثبوت میں یہ حدیث ذکر کی ہے "عن ام سلمه قالت کان رسول الله ﷺ یوتر بثلاث عشرة رکعة (الحدیث)" حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ تیرہ رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ زیادہ سے زیادہ وتروں کی تعداد تیرہ ہے اور دیگر حدیثوں میں وتر ایک رکعت ہے پس کوئی کتنا بڑا جامع العلوم اور علامہ ہو اگر اس کی بات خلاف حدیث رسول ہو تو مردود ہے پس ایک وتر کا یا تیرہ وتر کا انکار جہالت کا مظہر ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث جلد ۵۰ شمارہ ۸ مورخہ ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ۔

تین رکعت وتر دو تشہد کے ساتھ پڑھنا ثابت نہیں

مسئلہ وتر میں اہلحدیث اور ائمہ محدثین کا کئی امور میں شدید اختلاف ہے۔ ان سب پر یہاں بحث کرنے کی فرصت نہیں۔ صرف تین وتر کی کیفیت پر یہاں بحث کی جاتی ہے۔ اہل علم خصوصاً احناف حضرات کو منصفانہ نظر سے غور فرما کر حق بات کو قبول کر لینا چاہئے۔
چنانچہ "شرح طحاویہ فی العقیدہ السلفیہ" مطبوعہ مکہ مکرمہ' جو بحکم سلطان ابن سعود رحمۃ اللہ علیہ مکہ مکرمہ میں طبع ہوئی ہے۔ اس کے ص-۲۸۱ میں لکھا ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ حنفی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ جو امام حماد بن زید محدث کے ساتھ ہوا حکایت کرتے ہیں کہ جب حضرت حماد نے امام صاحب کے پاس حدیث ای الاسلام روایت کی اور کہا آپ دیکھتے نہیں کہ سائل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا ای الاسلام افضل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الایمان" پھر ہجرت اور جہاد کو بھی امور ایمان میں شمار کیا۔ فسکت ابوحنیفہ تو ابوحنیفہ خاموش ہو گئے۔ آپ کے ایک شاگرد نے کہا کہ آپ اس کو جواب کیوں نہیں دیتے۔ تو آپ نے فرمایا بماجیبہ وھو یحدثنی بھذا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ "وہ مجھے اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتا ہے' میں اس کا کیا جواب دوں؟
اس واقعہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ پہلے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اعمال شرعیہ کو ایمان کا جز نہیں سمجھتے تھے۔ جب حدیث سنائی گئی تو خاموش ہو گئے اور جواب نہ دیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ مسئلہ تسلیم کر لیا۔
دوسری یہ بات ظاہر ہوئی کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جب کوئی عقیدہ یا مسئلہ حدیث کے خلاف بیان کر دیتے اور پھر حدیث مل جاتی تھی اور کوئی محدث انہیں سمجھا دیتا تھا' تو امام صاحب حدیث نبوی کی تعظیم کرتے ہوئے اس کو تسلیم فرما لیتے تھے۔ اس لئے ان کا یہ قول مشہور ہے : اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔ "یعنی جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔"
بلکہ اپنے تلامذہ اور معتقدین کو یہ فرما گئے : اترکوا قولی بخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقول الصحابۃ "یعنی میرے قول کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ کے مقابلہ میں چھوڑ دینا ہو گا۔" مثلاً حدیث صحیحہ سے وتر ایک رکعت سے تیرہ تک ثابت ہیں ور اقوال صحابہ بھی اس پر ناطق ہیں اور کتب فقہ میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ

مذہب ہے کہ وتر تین رکعت سے زیادہ اور کم پڑھنے جائز نہیں' تو حسب وصیت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب وہی ہو گا جو صحیح احادیث اور اقوال صحابہ سے ثابت ہوگا۔ فقہ کی کتابوں والا مذہب احادیث صحیحہ کے مقابلہ میں غلط قرار دیا جائے گا اور بحکم اترکوا قولی وہ متروک ہو گا۔ اس تمہید کے بعد اب اصل مسئلہ سنئے کہ احادیث نبویہ سے تین وتر دو طریقے سے پڑھنے ثابت ہیں۔ ان طریقوں کے علاوہ کوئی اور طریقہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔

(ا) اول یہ طریقہ ہے کہ تین وتر پڑھے تو دوسری رکعت میں تشہد بیٹھ کر التحیات اور دعا کے بعد سلام پھیر دے اور پھر ایک رکعت اکیلی پڑھ کر سلام پھیر دے۔ یہ طریقہ سب سے اقویٰ اور کثیر العمل ہے۔ جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ یہ حدیث تمام کتب حدیث میں متعدد طرق سے تقریباً تواتر کا درجہ رکھتی ہوئی مروی ہے کہ صلاۃ اللیل مثنی مثنی۔ "رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔"

ایک حدیث بخاری میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر سوال کیا کہ کیف صلوۃ اللیل "کہ رات کی نماز کی کیفیت کیا ہے؟" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مثنی مثنی "دو دو رکعت ہے۔"

اب مثنی مثنی کا مطلب کسی راوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ اس سے کیا مراد ہے۔ قال قلت لابن عمر مامعنی مثنی مثنی؟ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : تسلم من کل رکعتین۔ "ہر دو رکعت میں تشہد کے بعد سلام پھیرنا مراد ہے۔" (مسلم)

یہ راوی حدیث اور صحابی رسول کی تفسیر ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ وتر رات کی نماز ہے۔ اس کی تین رکعتوں میں دو پر سلام پھیرا جائے گا۔ باقی ایک وتر ہے' وہ اکیلی پڑھی جائے گی۔ جس کی رو سے پہلی دو رکعتوں کو یا دو سے زیادہ رکعتوں کو وتر بنا دیں گی اور سب کو وتر کہنا جائز ہو گا۔ چنانچہ مسلم کی صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : الوتر رکعۃ من اخراللیل۔ (مشکوۃ) "یعنی وتر آخر رات میں ایک ہی رکعت ہے۔"

دوسری حدیث میں ہے۔ صلی رکعۃ واحدۃ توترلہ ما قد صلی۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت پڑھی جس نے ساری نماز کو وتر بنا دیا۔ یعنی مجموعہ کو وتر کہیں گے۔ چنانچہ

مشکوۃ میں حدیث ہے کہ عبداللہ بن قیس نے سوال کیا کہ آنحضرت ﷺ کتنی رکعت وتر کی پڑھتے تھے' تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ فرمایا۔ کبھی سات پڑھتے تھے اور کبھی نو رکعت پڑھتے تھے اور کبھی گیارہ رکعت پڑھتے تھے اور کبھی تیرہ رکعت پڑھتے تھے۔ ولم یکن یوتر بانقص من سبع ولا اکثر من ثلاث عشرۃ "یعنی سات سے کم اور تیرہ سے زیادہ آپ ﷺ نے وتر نہیں پڑھے ہیں۔(ابوداود) یہ بھی بطور اغلب کے فرمایا ہے۔ ان احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ ایک رکعت کو بھی وتر کہہ لیتے ہیں اور اس ایک کو دیگر دوگانوں سے ملا کر سب کو بھی وتر کہہ سکتے ہیں۔

جب وتر نماز رات کی ہوئی اور اس کو مثنیٰ کے اصول سے پڑھنا ہے' تو تین رکعت میں دو رکعت پر تشہد پڑھنا اور سلام پھیرنا پڑے گا۔ چنانچہ فتح الباری جز۔۴' ص۔۵۳۶ میں ہے : روی الطحاوی من طریق سالم بن عبداللہ بن عمر عن ابیہ انہ کان یفصل بین شفعہ ووترہ بتسلیمۃ واخبران النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یفعلہ واسنادہ قوی۔ "یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تین رکعت کی دو رکعت اور ایک رکعت کے درمیان سلام کے ساتھ فاصلہ کرتے تھے اور یہ خبر دیتے تھے کہ رسول ﷺ بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔ اس حدیث کی اسناد قوی ہے۔" تو یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب قرار پائے گا' جو حدیث نبوی اور عمل صحابہ سے ثابت ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ صلوۃ اللیل مثنی مثنی کا مطلب یہ ہے کہ دو رکعت کے بعد تشہد پڑھے اور سلام نہ پھیرے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ مطلب راوی حدیث اور حدیث نبوی ﷺ کے خلاف ہے۔ چنانچہ مسند احمد جلد۔۴ مع شرح ص۔۲۶۷ میں ہے : کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی ما بین صلوۃ العشاء الاخر ای الفجر احدی عشرۃ رکعۃ یسلم فی کل اثنتین ویوتر واحدۃ۔ "یعنی آنحضرت ﷺ کی نماز عشاء کے بعد سے لے کر فجر تک گیارہ رکعت تھی۔ آپ ﷺ ہر دو رکعت میں سلام پھیرتے تھے اور وتر ایک رکعت پڑھتے تھے۔"

جن حدیثوں میں یہ ذکر ہے کہ آپ ہر دو رکعت کے بعد تشہد پڑھتے' ان میں سلام کا ذکر نہیں' تو ان کے ساتھ یہ حدیثیں ملا کر کہا جائے گا کہ دو رکعتوں میں تشہد کے بعد سلام بھی ہے۔ محدثین کا اصول ہے کہ مجمل' مفصل پر اور مطلق' مقید پر محمول ہے اور یہ اصول ہے کہ الاحادیث یفسر بعضھا بعضا۔ کہ احادیث باہم ایک دوسرے کی تفسیر ہیں'

سب کو ملا کر مطلب لینا چاہئے اور جن حدیثوں میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چار چار رکعت بڑے طول اور حسن سے پڑھی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ دو دو کا قاعدہ اور سلام پھیرنے کا قاعدہ درست نہ ہوا' تو اس کا جواب ہمارے زمانے کے سب سے بڑے محدث اور مفتی حضرت الا فاضل مولانا حافظ عبداللہ صاحب محدث روپڑی رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ "اس سے مراد بھی دو دو رکعت ہیں۔ مگر چونکہ رسول اللہ ﷺ دو رکعت پڑھ کر ترویحہ نہیں کرتے تھے۔ یعنی دو رکعت سے سلام پھیر کر تھوڑی دیر آرام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ چار پوری ہو جاتیں تو ترویحہ کرتے۔ اس لئے ایک ترویحہ میں جو آپ نے دو دو کر کے پڑھی تھیں' اس کو راوی نے چار کے لفظ سے بیان کر دیا۔ اور ثم کا لفظ ترویحہ پر دلیل ہے کیونکہ ثم کا لفظ تاخیر اور مہلت پر دلالت کرتا ہے۔ گویا چار پڑھ کر کچھ مہلت کے بعد اور چار پڑھتے۔(حاشیہ اہلحدیث کے امتیازی مسائل۔ ص۔۵۷)

یہ ٹھیک ہے لگاتار دو دو کو سلام کے ساتھ پڑھنے کو چار پڑھنا کہا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تین وتر میں سلام پھیر کر ایک رکعت الگ پڑھنے کو تین کہا جاتا ہے اور گیارہ رکعت میں دو دو پر سلام پھیرنے اور ایک رکعت الگ پڑھنے کو گیارہ رکعت پڑھنا کہا جاتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک رکعت پڑھنا بتیراء ہے۔ یعنی دم کٹی اور ناتمام ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کہنا باطل ہے۔ قیام اللیل میں حدیث ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور یہ سوال کیا کیف اوتر؟ "میں وتر کیسے پڑھوں؟" حضرت عبداللہ نے فرمایا: اوتر بواحدة "وتر ایک پڑھا کر۔" اس نے کہا کہ میں ڈرتا ہوں کہ لوگ اس کو بتیرا کہیں گے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسنة الله وسنة رسوله تريد هذه سنة الله وسنة رسوله "یعنی کیا الٰہی طریقہ اور نبوی طریقہ کو ایسا کہیں گے۔"

دوسری روایت میں ہے: لم يصب من قال ذالك انما البتيرا ان يقوم الرجل فيصلى الركعة يقرا فيها ويتم ركوعها وسجودها ثم يقوم فى الثانية فلا يقرا فيها ولا يتم ركوعها وسجودها فتلك بتيرا "یعنی جو شخص اس رکعت وتر کو بتیراء کہتا ہے اس کا کہنا درست نہیں ہے۔ بتیراء تو صرف یہ نماز ہے کہ ایک شخص دو رکعت نماز شروع کرے۔ پہلی قرات اور رکوع سجود سے پوری پڑھی اور دوسری رکعت میں نہ قرات پڑھے نہ رکوع وسجود کو پورا کرے تو یہ بتیراء ہے۔"

قیام اللیل میں ایک رکعت وتر کا ثبوت بہت سی حدیثوں سے دیا ہے اور تین رکعت میں دوگانہ اور ایک رکعت کے درمیان سلام سے فصل کرنے کو ثابت کیا ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کا اس پر تعامل ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازاں "رحمتہ المہداۃ" فصل رابع مشکوٰۃ ص-۱۱۵ میں یہ قولی حدیث ہے : عن ابن عمران رجلا سال النبی صلی اللہ علیه وسلم عن الوتر فقال الفصل بین الواحدة من الثنتین بالسلام رواه الدار قطنی۔ "یعنی ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر کی کیفیت دریافت کی تو فرمایا کہ دوگانہ اور ایک رکعت کے درمیان سلام کے ساتھ فصل کر دے۔" ان تمام احادیث سے تین رکعت وتر کے سلام کے ساتھ فصل کر کے پڑھنا ثابت ہوا اور یہ مسنون ہے۔

بعض الناس کہتے ہیں کہ ہر نفلی نماز کی نظیر فرضی نماز میں پائی جاتی ہے۔ دو کی نظیر فجر کے دو فرض اور چار کی نظیر ظہر کے چار فرض اور تین کی نظیر مغرب کے تین فرض ہیں۔ ایک رکعت کی نظیر فرض نمازوں میں موجود نہیں۔ پس یہ ناقص نماز ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کہنے والا متعصب بے علم ہے۔ ایک رکعت نماز کی نظیر بھی موجود ہے۔ چنانچہ نماز خوف میں کئی صورتیں حدیثوں میں آئی ہیں۔ بعض صورتوں میں فوج نبوی نے ایک ایک رکعت پڑھی ہے اور حدیث بروایت مسلم واحمد وغیرہ یوں مروی ہے : عن ابن عباس قال فرض اللہ الصلوة علی لسان نبیکم فی الحضر اربعا فی السفر رکعتین وفی الخوف رکعة۔ "یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر حضر میں چار رکعت اور سفر میں دو رکعت اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے۔" پس نظیر فرائض میں پائی گئی۔ پھر اگر نظیر نہ ہو تب بھی کوئی بات نہیں، کیونکہ وتر نماز کی کیفیت دیگر نمازوں (فرض، سنت) سے الگ ہے۔ مثلاً یہ کہ وتر پانچ رکعت پڑھنے ثابت ہیں جن میں ایک التحیات پڑھا جاتا ہے۔ وتر کی نو رکعت بھی ثابت ہیں۔ ان میں دو تشہد اور ایک سلام ہے اور وتر کی سات رکعت بھی حدیث سے ثابت ہیں، جن میں ایک ہی تشہد پڑھا جاتا ہے اور وتر میں یہ اختیار ہے کہ ایک پڑھے یا تین پڑھے یا پانچ پڑھے۔ چنانچہ حدیث قولی میں یہ ارشاد ہے : فمن احب ان یوتر بخمس فلیفعل ومن احب ان یوتر بثلاث فلیفعل ومن احب ان یوتر بواحدة فلیفعل۔ رواه ابوداود والنسائی وابن ماجه (مشکوٰۃ ص-۱۱۲) "یعنی جو شخص چاہے پانچ وتر پڑھے، جو

چاہے تین پڑھے اور جو چاہے ایک وتر پڑھے۔" اس سے ثابت ہوا کہ وتر کی تعداد اختیاری ہے۔ اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ ایک ہی رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ پس وتر کی نظیر فرضی نمازوں میں تلاش کرنا فضول ہے۔

دوسری صورت وتر کی تین رکعت پڑھنے کی یہ ہے کہ دو رکعت پڑھ کر کھڑا ہو جائے تشہد کے لئے نہ بیٹھے۔ تیسری رکعت میں تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیر دے۔ تین رکعتوں کے درمیان نہ بیٹھے اور تیسری رکعت میں سلام پھیرے۔ یہ بھی درست اور جائز ہے' کیونکہ حدیث نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔ چنانچہ تلخیص الحبیر ص-۱۱۹ وبلوغ الامانی شرح مسند احمد ج-۴ ص-۲۹۴ میں ہے : ورواہ الحاکم ایضا عن عائشۃ قالت کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یوتر بثلاث لا یقعد الا فی اخرھن وقال صحیح علی شرط الشیخین۔ "یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین رکعت وتر پڑھتے تھے' تو صرف آخری رکعت میں بیٹھتے تھے۔" اس سے ثابت ہوا کہ تین رکعت کے درمیان سلام نہ پھیرنا ہو تو پھر قعدہ نہ کرنا چاہئے۔ اگر قعدہ کیا ہے تو اس پر سلام پھیرنا چاہئے۔ اگر سلام نہ پھیرنا ہو' تو پھر قعدہ نہ کرنا چاہئے۔ اس کی نظیر پانچ رکعت وتر ہیں کہ پانچ رکعت وتر میں قعدہ صرف ایک ہی کرنے کا حکم ہے۔

جن حدیثوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تین رکعت وتر کی پڑھیں تو ان میں سلام سے فصل نہ کیا' ان سے یہی صورت مراد ہے۔ اس صورت پر بھی بعض سلف صالحین کا عمل پایا گیا ہے۔ چنانچہ قیام اللیل ص-۱۲۳ میں ہے : عن طاوس انه کان یوتر بثلاث لا یقعد بینھن۔ "یعنی طاوس (تابعی) تین وتر پڑھتے تو ان کے درمیان قعدہ نہ کرتے تھے۔" وعن عطاء انه کان یوتر بثلاث رکعات لا یجلس فیھن ولا یتشھد الا فی اخرھن۔ "یعنی عطاء (تابعی جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے جلیل القدر استاد تھے) وہ جب تین وتر پڑھتے تھے تو ان رکعتوں کے درمیان نہ بیٹھتے' آخری رکعت میں بیٹھتے اور تشہد بھی آخری رکعت میں ہی پڑھتے تھے۔"

امام محمد بن نصر مروزی قیام اللیل ص-۱۲۲ میں فرماتے ہیں : صدق فی ذالک الحدیث انه لم یسلم فی الرکعتین ولا فی الثلاث ولا فی الاربع ولا فی الخمس ولا فی الست ولم یجلس ایضافی الرکعتین کما لم یسلم بینھما "یعنی جن حدیثوں میں یہ آیا ہے

کہ آنحضرت ﷺ نے دو رکعت وتروں میں سلام نہ پھیرا یہ ٹھیک ہے۔ یہ تین میں سلام پھیرا نہ چار نہ پانچ میں نہ چھ میں' لیکن یہ بات بھی ساتھ ہی ہے کہ ان دو رکعت وتروں میں قعدہ بھی نہ کیا تھا اور سلام بھی نہ پھیرا تھا۔"

میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وتر پڑھنے میں آنحضرت ﷺ کے مختلف حالات ہیں جو صحیح حدیثوں سے ثابت ہیں۔ وہ سب درست ہیں' اور یہ امت پر آسانی ہے' جس طرح چاہے کوئی عمل کرے۔

بلوغ الامانی شرح مسند احمد ج۔۴' ص۔۳۰۲ میں وتر کی مختلف ہیئتوں پر بحث کی ہے اور یہ لکھا ہے : قد جعل اللّٰه في الامر سعة وعلمنا النبي الوتر على هيأت متعددة۔ "اس امر میں اللہ تعالیٰ نے فراخی رکھی ہے اور ہم کو متعدد شکلوں میں وتر پڑھ کر تعلیم دے دی ہے کہ سب طرح درست ہیں۔" ہاں تین رکعت میں سلام پھیر کر فصل کرنے کی صورت زیادہ صحیح' راجح اور کثیر العمل ہے۔ چنانچہ ص۔ ۳۰۳ میں لکھا ہے : الصحيح ان الا فضل ان يصليهما مفصولة بسلامين لكثرة الاحاديث الصحيحة۔ "دو رکعتوں میں سلام پھیر کر پھر اکیلی رکعت دوسرے سلام سے پڑھے۔" اس بارہ میں احادیث صحیحہ کثرت سے وارد ہیں۔ باقی رہی یہ صورت جو احناف میں مروج ہے کہ تین وتروں میں دو تشہد پڑھتے ہیں اور سلام آخر میں پھیرتے ہیں۔ یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب مبارکپوری رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بے نظیر شرح مشکوٰۃ مرعاۃ المفاتیح ج۔۲' ص۔۲۰۱ میں وتر کے مسئلہ کی تعداد وکیفیت پر بحث فرماتے ہوئے یہ لکھا ہے : ولم اجد حديثا صحيحا صريحا في اثبات الجلوس في الركعة الثانية عند الايتار بثلاث۔ "تین رکعت وتروں میں دوسری رکعت میں بیٹھنے اور سلام نہ پھیرنے کے بارہ میں مجھے کتب حدیث میں کوئی مرفوع صحیح حدیث نہیں ملی ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ اس بارہ میں تمام کتب حدیث متداولہ جو عرب وعجم کے مکتبوں اور درسگاہوں میں پائی جاتی ہیں' ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے اور نہ خلفائے راشدین کا تعامل اس پر پایا گیا ہے۔ یہ صورت کوفہ سے پیدا ہو کر حنفی دنیا میں پھیل گئی ہے۔ یہ لوگ جو ایسی روایتوں سے استدلال کرتے ہیں' جن میں یہ ذکر ہے کہ وتر تین رکعت ہے اور سلام آخر میں پھیرنا چاہئے۔ اس سے صورت نمبر۔۲ مراد ہے اور جن روایتوں میں یہ ذکر

ہے کہ رات کے وتر مثل دن کے وتروں یعنی مغرب کی نماز کی طرح ہیں۔ وہ مرفوع روایتیں سب ضعیف ہیں اور پھر ان سے تین رکعت کی تعداد میں مشابہت مراد ہے' کیونکہ مشابہت میں تمام امور کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ جیسے کہا جائے کہ زید مثل شیر کے ہے یا شیر کی طرح ہے۔ تو زید کے دم کا ہونا لازم نہیں ہے۔ صرف شجاعت میں مشابہت مراد ہوگی۔

اگر کوئی حنفی عالم کوئی ایسی مرفوع صحیح صریح حدیث پیش کر دے جس میں یہ ذکر ہو کہ "آنحضرت ﷺ نے تین رکعت وتر پڑھے' تو ان میں دو تشہد پڑھے اور درمیان میں سلام سے فصل نہ کیا۔ اور تیسری رکعت میں تشہد پڑھا تو سلام پھیرا تھا۔" تو اس کو پچیس روپے انعام دیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔ ہاں اگر کوئی متعدد اور مختلف حدیثوں سے کوئی ایک ایک چیز ثابت کر کے ایسی صورت بنائے تو اس پر میں یہ شعر پڑھ دوں گا۔

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا
بھان متی نے کنبہ جوڑا

ہاں میں احناف حضرات کی خدمت میں یہ حدیث پیش کرتا ہوں کہ مغرب کی طرح تین رکعت پڑھنے کی ممانعت آئی ہے اور اس پر یہ حدیث ناطق ہے : عن ابی هريرة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا توتروا بثلاث واوترا بخمس او بسبع ولا تشبهوا بصلوة المغرب اخرجه الدار قطنی وقال اسناده ثقات وصححه الحاكم وهو على شرط الشيخين یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم تین رکعت مغرب کی نماز کی مشابہت سے نہ پڑھا کرو' وتر پانچ پڑھ لیا کرو یا سات پڑھ لیا کرو۔

یہ حدیث صحیح ہے' اس سے نماز مغرب کی مشابہت سے وتر پڑھنے ممنوع ثابت ہوتے ہیں۔ اب جن روایتوں میں مغرب کی طرح وتر پڑھنے کا ذکر ہے' یا تین وتر پڑھنے کا مطلق ذکر ہے' تو مراد تین رکعت ان دو صورتوں کے مطابق پڑھنا ہے۔ کیونکہ وہ اس بیان میں صریح ہیں لہٰذا صریح کو صریح پر محمول کرنا اور متعارض حدیثوں میں مطابقت کرنا محدثین کا مسلمہ اصول ہے۔ مقلدین کو تقلید کے مرض سے شفا ہو جائے تو ان تمام حدیثوں پر عمل کرنا آسان ہے۔ ان لوگوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی خواہ مخواہ تقلید کر کے وتر کے تمام حکموں میں جملہ محدثین کی خلاف ورزی کی ہے۔ بلکہ احادیث صحیحہ اور تعامل صحابہ کی

خلاف ورزی اختیار کر رکھی ہے۔ اسی واسطے کسی عارف نے یہ کہا ہے کہ۔

عبادت بتقلید گمراہی است

جو شخص ایک ہی قسم کی حدیث لے کر باقی سے انکار کرتا اور ٹھکراتا ہے۔ وہ آیت افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ کا مصداق ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے تین رکعت وتر دو تشہدوں سے بغیر سلام کے کیوں اختیار کئے تھے؟ تو اس کا جواب امام محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ "امام ابوحنیفہ کو علم حدیث میں معرفت ومہارت کم تھی۔" پھر امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علم حدیث میں یتیم تھے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ "امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب کو یعنی تمام اہل رائے کو علم حدیث میں بصیرت تامہ نہ تھی۔ وہ بغیر علم حدیث کے (مسائل تراشنے اور ان پر بحث کرنے کی) بے جا دلیری کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اکثر مسائل کتب فقہ کے احادیث صحیحہ اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ علم حدیث میں علماء اہل رائے اور ان کے مقلدین کی محدثین کے مقابلہ میں بنیادی کمزوری اور ضعف ہے۔

عبدالقادر عارف الحصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور

جلد۔۱۸' شمارہ۔۳۲' ۳۳' مورخہ ۲ و ۱۱ فروری سنہ۔۱۹۶۶ء

مسئلہ قضاء وتر کی تحقیق

اخبار "تنظیم اہلحدیث" (شمارہ ۲۹ ستمبر سنہ۔۱۹۶۱ء) میں ایک سوال شائع ہوا ہے کہ تہجد رہ جائے تو وتر کی قضاء ہے کہ نہیں؟

اس سوال کا جواب جماعت اہلحدیث کے مفتی حضرت العلام حافظ عبداللہ صاحب محدث (روپڑی) ادام اللہ فیوضھم نے دارالافتاء سے صادر فرمایا جو درج ذیل ہے۔

مشکوٰۃ باب الوتر ص۔۱۰۳ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نیند یا بیماری غالب آجاتی اور قیام اللیل رہ جاتا' تو دن کو بارہ رکعت پڑھ لیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر سمیت اکثر گیارہ رکعت پڑھتے۔ اس لیے دن میں ایک رکعت بڑھا

کر پڑھ لیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی ویسے قضا نہیں' بلکہ دن میں ایک رکعت بڑھا کر پڑھ لینی چاہیے۔ اگر ایک وتر پڑھنا ہو' تو دن میں اس کی بجائے دو پڑھے' اگر تین پڑھنے ہوں تو چار اگر پانچ پڑھنے ہوں تو چھ' اگر سات پڑھنے ہوں تو آٹھ' اگر نو پڑھنے ہوں تو دس پڑھ لے۔ بس یہی قضا ہے۔ (انتھی)

ایک شق تیرہ رکعت کی آپ نے چھوڑ دی' کیونکہ تیرہ رکعت وتر کا بھی ثبوت ہے۔ ابوداود میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی باللیل ثلاث عشرۃ رکعۃ "یعنی آنحضرت ﷺ رات کو تیرہ رکعت نماز پڑھتے تھے۔" تو اب آپ کے حساب سے ان کو قضا کے طور پر چودہ رکعت پڑھنی چاہیے۔

راقم حصاری کو آپ کے اس اجتہادی فتویٰ سے سخت اختلاف ہے' کیونکہ یہ تفصیل ائمہ متقدمین' مجتہدین و محدثین میں سے کسی نے نہیں لکھی اور نہ کوئی اس کا قائل ہے۔

مسئلہ قضا وتر میں آنجناب نے صرف ایک حدیث کو پیش نظر فرما کر اس پر اجتہاد کا پل باندھ دیا ہے' جو سراسر خام ہے' اگر اس پر اہل علم دیگر دلائل چلائیں گے' تو یہ دھڑام سے گر جائے گا۔

آپ نے مشکوٰۃ کے حوالہ سے جو حدیث پیش کی ہے یہ تفصیل قضا وتر میں نص نہیں ہے' بلکہ مبہم ہے جس میں کئی احتمال ہیں۔ اول یہ کہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ قیام اللیل کے انواع متفرقہ میں سے کون سی نوع رہ جاتی تھی' تو آپ بارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔

اگر ہر نوع کے فوت ہونے پر بارہ رکعت پڑھا کرتے تھے' تو پھر کفارہ کی ایک رکعت نہیں بنتی زیادہ بنتیں ہیں۔ مثلاً دلالت اقترانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ عمر رسیدہ ہو کر جب نو رکعت سے قیام کرتے تھے اور وہ بیماری یا غلبہ نیند سے کبھی رہ جاتا تھا' تو آپ دن کو بارہ رکعت پڑھتے ہوں گے۔ اس اعتبار سے کفارہ کی رکعت تین ہوتی ہیں۔ جس سے آپ کا حساب ساقط ہو جاتا ہے۔

اگر یہ حساب نہ لیں تو اکثر رکعت کو ملحوظ رکھ لیں' وہ یہ کہ آپ تیرہ رکعت بھی پڑھتے تھے۔ اس اعتبار سے کفارہ ایک رکعت بڑھائیں' تو چودہ ہو جائیں گی' جن کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یا بارہ اصل نوافل کی قضا مفقود ہو جائے گی' جو آپ کو دوسری جگہ سے تلاش کرنی پڑے گی' تو وہ قضا کی دوسری قسم ہو جائے گی۔ جس کے آپ قائل نہیں' کیونکہ آپ نے

اپنے کلام میں حصر کر دیا ہے کہ بس یہی قضا ہے۔ جس سے عیاں ہے کہ دوسری کوئی صورت نہیں ہے۔ حالانکہ موجود ہے۔ حدیث کے جو الفاظ محل استدلال ہیں وہ یہ ہیں : وکان اذا غلبه نوم او وجع عن قیام اللیل صلی من النهار ثنتی عشرۃ رکعة "یعنی جب کبھی آپ کو کوئی بیماری یا نیند غالب آجاتی' تو آپ دن کو بارہ رکعت پڑھ لیا کرتے تھے۔"

دوسرا احتمال یہ ہے کہ وتر کی قضا تو آپ ﷺ صبح کی نماز سے پہلے دے لیتے ہوں اور یہ بارہ رکعت تہجد کی قضا ہو کہ قیام اللیل بارہ رکعت بغیر وتر کے ثابت ہے کہ وتر ایک رکعت ملانے سے تیرہ رکعت بن جاتی ہیں' جن کا ثبوت موجود ہے اور صبح ہو جانے پر بطور قضا وتر پڑھنے کا ذکر اس حدیث میں موجود ہے کہ قیام اللیل ص-۱۳۹ میں باسناد وارد ہے۔ حضرت ابودردا نے لوگوں کو خطاب کیا کہ لا وتر لمن ادرکه الصبح "یعنی جس شخص نے وتر نہیں پڑھے اور صبح ہو گئی' تو اس کے لئے کوئی وتر نہیں۔ یہ سنکر لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت ابودردا کے اعلان کی خبر دی' تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ کذب ابوالدردا کان النبی صلی اللہ علیه وسلم یصبح فیوتر۔ یعنی ابودردا نے غلط کہا ہے۔ آنحضور ﷺ کو بغیر وتر کے صبح ہو جاتی تو آپ صبح کے وقت وتر پڑھ لیا کرتے تھے۔" اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی قضا صبح کے وقت پڑھ لیا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی قضا صبح کے وقت ضروری ہے۔

(۲) قیام اللیل دن کو بارہ رکعت پڑھ لے تو یہ جائز ہے۔ مگر جرمانہ کی کوئی رکعت نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اس طرح تو وتر دیگر نماز تہجد سے علیحدہ ہو جائے گا۔ حالانکہ ساتھ ہونا ضروری ہے' تو اس کا جواب یہ ہے کہ وتر دیگر رکعات تہجد سے الگ پڑھ لینا جائز ہے۔ اس میں توسیع ہے۔ قیام اللیل ص-۱۱۷ میں ہے : عن سعید بن المسیب کان ابوبکر اذا جاء فراشه اوتر فان قام من اللیل صلی۔ "یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب اپنے بچھونے کے پاس آتے تو وتر پڑھ لیا کرتے تھے۔ پھر جب رات کو بیدار ہو کر کھڑے ہوتے تو نماز تہجد پڑھتے تھے۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ بارہ رکعت جو دن کو پڑھی گئی ہیں' ان میں آٹھ تہجد کی ہوں اور چار رکعت صلوۃ الضحیٰ ہو۔ مرعاۃ المفاتیح میں ہے : قیل ثمان منها صلوۃ اللیل واربع صلوۃ الضحی۔ "یعنی ان بارہ رکعتوں میں آٹھ تو تہجد کی ہیں اور باقی صلوۃ الضحیٰ کی چار

رکعت ہیں۔" کیونکہ ضحیٰ کی چار رکعت آپ اول النہار اکثر پڑھا کرتے تھے۔ گو کبھی کم وبیش ہی پڑھ لیا کرتے تھے۔ باقی رہا وتر تو یہ نماز صبح سے پہلے پڑھنا جائز ہے' اگر رہ جائے تو پھر اس کی قضا نہیں ہے۔

مشکوۃ میں ہے' زید بن اسلم نے کہا کہ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من نام عن وترہ فلیصل اذا اصبح یعنی جو شخص سو گیا اور وتر نہ پڑھ سکا' تو اس کو چاہئے کہ صبح کے وقت وتر پڑھے۔ اس کی تائید اس صحیح حدیث سے ہوتی ہے۔ جس سے امام ابن حزم مجتہد نے استدلال کیا ہے : من نام عن صلوۃ اونسیھا فلیصل اذا ذکرھا۔ یعنی جو شخص سو گیا اور اس کی نماز رہ گئی یا بھول گیا' تو وہ جب یاد آئے' اسی وقت نماز پڑھے۔

امام ابن حزم فرماتے ہیں : ھذا عموم یدخل فیہ کل صلوۃ فرض او نافلۃ وھو فی الفرض امر فرض وفی النفل امر ندب قال ومن تعمد ترکہ حتّٰی دخل الفجر فلا یقدر علی قضائہ ابدا۔ (نیل الاوطار) "یعنی حدیث میں لفظ صلوۃ عام ہے' جو فرض اور نفل (ہر نماز) کو شامل ہے۔ فرض کی قضا فرض ہے اور نفل کی مندوب ہے۔ جو شخص عمداً وتر نہ پڑھے یہاں تک کہ صبح ہو جائے' وہ قضائی نہیں دے سکتا۔ نائم کو صبح کے وقت بیداری ہوئی تو وہ نماز صبح سے پہلے وتر کی قضائی دے' امر نبوی ﷺ فلیصل اذا اصبح اس پر دال ہے۔

چوتھا احتمال یہ ہے کہ نہار میں بارہ رکعت جو آپ نے پڑھی ہیں یہ تمام نماز ضحیٰ کی ہو اور اس کو قائم مقام قیام اللیل کر دیا ہو۔ اگرچہ عام طور پر نماز ضحیٰ کی چار رکعت ہیں' مگر کبھی آپ نے بارہ بھی پڑھی ہوں گی کہ اس کی ترغیب فرمائی ہے : من صلی الضحٰی ثنتی عشرۃ رکعۃ بنی اللّٰہ لہ قصرا من ذھب فی الجنۃ۔ "یعنی جو شخص نماز ضحیٰ بارہ رکعت پڑھے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ جنت میں سونے کا محل تیار کر دیتا ہے۔" ممکن ہے جس رات قیام اللیل رہ جاتا ہو اس دن آپ بارہ رکعت ضحیٰ کی پڑھتے ہوں کہ ان سے قیام اللیل کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔ جیسے یہ ارشاد ہے : اربع رکعات قبل الظھر بعد الزوال تحسبن بمثلھن من السحر۔ "یعنی زوال کے بعد نماز ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھنا سحری کی نماز کے برابر درجہ رکھتی ہیں۔"

اول النہار بارہ رکعت نماز چاشت پڑھی' تو اس میں تہجد کی نماز بھی آگئی' جیسے نماز میں تراویح پڑھی تو نماز کی ضرورت نہ رہی۔ جیسے رمضان میں تراویح اور تہجد دو نمازیں ثابت

نہیں ہیں۔ اسی طرح جب قیام اللیل فوت ہوئی تو اس دن بارہ رکعت قیام اللیل کی قضا اور نماز ضحیٰ اس سے علیحدہ چار یا بارہ رکعت ثابت نہیں۔ حالانکہ نماز ضحیٰ آپ ﷺ پڑھا کرتے تھے، کبھی چار کبھی آٹھ، بلکہ یزید ماشاء اللہ اور حدیث زیر بحث میں یہ الفاظ ہیں : کان نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی صلوۃ احب ان یداوم علیہا۔ "یعنی نبی کریم ﷺ جب کوئی نماز پڑھتے تو اس پر ہمیشگی کرنے کو دوست رکھتے تھے۔" اگر آنحضرت ﷺ بارہ رکعت کے علاوہ چار رکعت نماز ضحیٰ پڑھتے تو ان کا ذکر بھی ساتھ ہی ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہی نماز ضحیٰ تھی، جو بوجہ فوت ہونے قیام اللیل کے بجائے چار یا آٹھ کے بارہ رکعت پڑھ دی ہوگی۔

پانچواں احتمال وہ ہے جو آپ نے ظاہر فرمایا ہے کہ قیام اللیل عام طور پر گیارہ رکعت تھا، جب کسی وجہ سے فوت ہوا تو نماز میں ایک رکعت بڑھا کر بارہ پڑھ دی ہوں۔ مگر یہ بعید ہے، کیونکہ دیگر حدیث میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ بیاج نہیں لیتا کہ اس نے اس کو اپنے بندوں پر حرام کر دیا ہے۔ قضا ہمیشہ بمثل ادا کی ہوتی ہے، زائد کا دستور نہیں ہے۔ نیز یہ قضا وتر کی نہیں کہلا سکتی، کیونکہ وتر کی قضا وتر سے ہوتی ہے، شفع سے نہیں کہ اس کو نہ عرفاً وتر کہہ سکتے ہیں نہ شرعاً کما لا یخفی علی اھل العلم۔ پھر یہ مطلب دیگر احادیث نبویہ ﷺ اور تعامل سلف کے خلاف ہے، کیونکہ دیگر احادیث نبویہ ﷺ اور تعامل سلف سے وتر کی قضا صبح کے وقت دینا ثابت ہے، چنانچہ اس کے دلائل یہ ہیں، جن سے صریحاً وتر کی قضا ثابت ہے۔ آپ نے جو حدیث پیش کی ہے اس میں وتر کا خاص ذکر نہیں ہے۔ قیام اللیل کا مطلق ذکر ہے۔ جس میں کئی احتمال ہیں اور اصول یہ ہے کہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال یعنی کسی دلیل میں خلاف استدلال کے احتمال ہو جائے تو اس سے استدلال بیکار ہو جاتا ہے۔ ہمارے پیش کردہ دلائل میں خاص وتر کا ذکر ہے، تو وتر اس عام سے مستثنیٰ کرنا چاہئے۔ تاکہ سب احادیث کی مطابقت ہو جائے ورنہ تعارض ہوگا۔

بلوغ المرام میں ابوسعید سے روایت ہے کہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من نام عن الوتر اونسیہ فلیصل اذا اصبح او ذکر "یعنی جو شخص سوگیا یا بھول گیا اور اس کے وتر رہ گئے، تو وہ صبح کے وقت پڑھ لے، یا بھولا ہوا جب یاد کرلے تب اسی وقت پڑھ لے۔"

بلوغ المرام میں اس حدیث سے پہلے یہ حدیث ہے : من ادرک الصبح ولم یوتر فلا وترلہ

"یعنی جس نے وتر نہیں پڑھے اور صبح ہو گئی تو اس کے لئے کوئی وتر نہیں ہے۔"

محدثین نے دونوں متعارض حدیثوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ من ترک الوتر متعمدا فقد فاتته السنة وفات وقت اداء الوتر۔ یعنی جو شخص اختیاری طور پر صبح سے پہلے وتر نہیں پڑھے' تو اس کے لئے کسی وقت بھی وتر پڑھنا جائز نہیں ہے۔ ہاں جو شخص وتر کسی عذر سے رات کو نہ پڑھ سکا تو صبح کے وقت وتر بطور قضا پڑھ سکتا ہے۔ حدیث میں ہے: لیس فی النوم تفریط انما التفریط فی من لم یصل الصلوة حتی یجیئی وقت صلوة الاخری۔ یعنی سوتے ہوئے نماز کا وقت چلا جاتا اور نماز اس وقت ادا نہ کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ جرم تو یہ ہے کہ نماز بیداری میں نہ پڑھے اور دوسری نماز کا وقت آ جائے۔

پس رات کا وتر بوجہ نیند غالب ہونے کے رہ گیا' تو اس کو جب بیدار ہو ادا کرے۔ نسائی شریف ص۔۱۹۹' ج۔۱ باب الوتر بعد الاذان میں ہے۔ محمد بن منتشر کہتے ہیں کہ وہ مسجد عمر وبن شرجیل میں تھے کہ نماز کی اقامت ہو گئی' لوگ عمرو بن شرجیل کا انتظار کرتے رہے' پس وہ آئے اور عذر کرنے لگے کہ میں اب تک وتر ادا کرتا رہا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ اذان کے بعد وتر جائز ہے کہ نہیں؟ انہوں نے فرمایا! ہاں جائز ہے بلکہ اقامت کے بعد بھی جائز ہے: وحدث عن النبی صلی اللہ علیه وسلم انه نام عن الصلوة حتی طلعت الشمس ثم صلی۔ "انہوں نے حدیث بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز سے پہلے سو گئے تھے' یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔ پھر بیدار ہو کر آپ نے نماز پڑھی۔" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ایک نماز کے وقت سو گیا اور دوسری نماز کا وقت آ گیا' تو پہلے اس کو پہلی نماز قضا پڑھنی چاہئے' پھر دوسری نماز پڑھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سونے والا جب بیدار ہو' تو اس کا وہی وقت نماز ہے' اسی میں نماز پڑھنی چاہئے۔ دوسرے کسی وقت کا انتظار نہ کرنا چاہئے۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور

جلد۔۱۵' شمارہ۔۱۷' ۱۶ مورخہ ۹' ۱۶ نومبر سنہ۔۱۹۶۳ء

مسئلہ قضاء وتر کی تحقیق

سوال : کسی نے سوال کیا تھا کہ تہجد رہ جائے تو وتر کی قضا ہے یا نہیں؟

ہم نے اس کا یہ جواب دیا کہ مشکوٰۃ باب الوتر ص۔۱۰۳ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نیند یا بیماری غالب آجاتی اور قیام اللیل رہ جاتا تو دن کو بارہ رکعت پڑھ لیتے۔ رسول اللہ ﷺ وتر سمیت اکثر گیارہ رکعت پڑھتے۔ اس لئے دن میں ایک رکعت بڑھا کر پڑھ لیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی ویسے قضا نہیں' بلکہ دن میں ایک رکعت بڑھا کر پڑھ لینی چاہئے۔ اگر ایک وتر پڑھنا ہو تو دن میں اس کی بجائے دو پڑھے' اگر تین ہوں تو چار پڑھے' اگر نوں ہوں تو دس پڑھے۔ بس یہی اس کی قضا ہے۔

تعاقب : اس پر مولانا عبدالقادر صاحب حصاری نے تعاقب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں : ایک شق تیرہ رکعت کی آپ نے چھوڑ دی' کیونکہ تیرہ رکعت وتر کا بھی ثابت ہے۔ ابوداود میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ رات کو تیرہ رکعت نماز پڑھتے تھے۔ اب آپ کے حساب سے دن کو قضا کے طور پر چودہ رکعت پڑھنی چاہئے

جواب تعاقب : مولوی عبدالقادر حصاری نے اس تعاقب میں سخت غلطی کی ہے' وتر کی حد نو تک ہے۔ اس لئے ہم نے نو تک لکھا ہے۔ تیرہ رکعت وتر نہیں بلکہ تہجد سمیت تیرہ ہیں۔ ہمارا فتویٰ دو حدیثوں پر مبنی ہے۔ پہلی حدیث جو ہم نے مشکوٰۃ کے حوالہ سے لکھی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں : وکان اذا غلبہ نوم او وجع عن قیام اللیل صلی من النھار ثنتی عشرۃ رکعۃ۔ "یعنی جب کبھی آپ ﷺ کو کوئی بیماری یا نیند غالب ہو جاتی' تو آپ دن کو بارہ رکعت پڑھ لیا کرتے۔

دوسری حدیث یہ ہے' امام بخاری رحمہ اللہ نے باب باندھا ہے : باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل فی رمضان وغیرہ۔ اس کے تحت جو حدیث بیان کی وہ یہ ہے : عن ابی سلمۃ بن عبدالرحمٰن انہ اخبرہ انہ سال عن عائشۃ رضی اللہ تعالٰی عنھا کیف کانت صلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان فقالت ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ الحدیث۔ "یعنی ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کی

نماز رمضان میں کس طرح ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان وغیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔" مشکوٰۃ والی حدیث میں دو عذروں کا ذکر ہے۔ ایک غلبہ نیند کا' دوسرا بیماری کا۔ لیکن مقصد اس سے مجبوری ہے۔ جس کی صورتیں اور بھی ہیں۔ جیسے بھول کر رہ جائے یا امام نہ ہو' نہ مقتدی ہو اور اقامت ہو گئی۔ مقتدی کو حکم ہے کہ نماز کے ساتھ شامل ہو جائے' وہ وتر نہیں پڑھ سکتا۔ ہاں اگر امام ہو تو وہ پڑھ سکتا ہے' کیونکہ اس کے بغیر نماز کھڑی نہیں ہوتی۔

دوسری حدیث اکثریت پر محمول ہے' کیونکہ شاذونادر رات کی نماز کم وبیش ہوتی تھی' لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو اس طرح حصر کے ساتھ بیان کیا جس سے زیادہ کی نفی ہو گئی۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ گیارہ رکعت کے مقابلہ میں دوسری صورتیں کالعدم اور شاذ ہیں۔ اس وجہ سے اہلحدیث نے تراویح کی بنا اس حدیث پر رکھی ہے اور وہ گیارہ رکعت تراویح پڑھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور تمیم داری کو گیارہ رکعت کا حکم دیا۔

اعتراض : مولوی عبدالقادر نے پہلا اعتراض یہ کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمر رسیدہ ہو گئے' تو نو رکعت قیام کرتے' اس صورت میں ایک رکعت نہ بڑھی بلکہ تین بڑھیں۔ تب بارہ بنتیں ہیں اور جب تیرہ پڑھتے تو ایک رکعت بڑھنے سے چودہ ہو گئیں اور چودہ کا ثبوت بھی کوئی نہیں۔

جواب : اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اپنے فتویٰ میں ایک رکعت کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی بنا پر کیا ہے اور حصر کے ساتھ لکھا ہے۔ بس یہی قضا ہے۔ جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں حصر ہے۔ باقی نو اور تیرہ اس پر محمول ہیں' کیونکہ جب گیارہ کا حکم معلوم ہو گیا کہ وہاں ایک رکعت کی زیادتی ہے' تو شاذ صورتوں کو بھی اس طرح سمجھ لینا چاہیے۔ یعنی ان میں بھی ایک رکعت کی زیادتی ہو گئی۔

دوسرا اعتراض : دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی قضا صبح کی نماز سے پہلے دے لیتے ہوں اور یہ بارہ رکعت تہجد کی قضا ہو کہ قیام اللیل بارہ رکعت بغیر وتر کے ثابت ہے' جو وتر ایک ملانے سے تیرہ بن جاتی ہیں۔

جواب : اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام

اللیل رمضان' غیر رمضان میں گیارہ رکعت ہوتا تھا۔ اس کو چھوڑ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مشکوۃ والی حدیث شاذ صورت تیرہ مراد لینا جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کالعدم قرار دے کر فرمایا ہے کہ گیارہ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے' یہ کس قدر کمزوری ہے۔ اس لئے ہم نے اپنے فتویٰ کی بنا گیارہ پر ہی رکھی ہے۔

علاوہ ازیں مولوی عبدالقادر نے سائل کے سوال اور ہمارے فتویٰ پر غور نہیں کیا۔

سائل کا سوال یہ ہے۔

جب وتر رہ جائیں تو ان وتروں کا کیا حکم ہے؟

مشکوۃ کی جو حدیث ہم نے پیش کی ہے' وہ نیند اور بیماری پر بند نہیں بلکہ مقصد اس کا مجبوی کی حالت بیان کرنا ہے' جیسے ابھی بیان ہوا ہے۔ امام تو جماعت سے پہلے پڑھ سکتا ہے' لیکن مقتدی کیا کرے؟ وہ تو اقامت نماز کے بعد مجبور ہے۔ پس آپ کا یہ کہنا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پڑھ لیتے ہوں یہ مشکوۃ کی حدیث کے مقصد کے خلاف ہے۔

تیسرا اعتراض : تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ بارہ رکعت جو دن کو پڑھی گئی ہیں' ان میں سے آٹھ رکعت تہجد کی ہوں اور چار رکعت صلوۃ الضحیٰ ہو۔

جواب : یہ اعتراض جواب کا محتاج نہیں۔ مشکوۃ کی حدیث کے سراسر خلاف ہے' کیونکہ اس میں بارہ رکعت کو قیام اللیل کے قائم مقام بنایا ہے۔ جس کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ گیارہ رکعت سے زیادہ قیام نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ تقسیم تہجد اور صلوۃ الضحیٰ کی محض فرضی ہے۔

چوتھا اعتراض : یہ کیا ہے کہ شاید یہ بارہ رکعت نماز ضحیٰ کی ہوں اور اس کو قائم مقام قیام اللیل کر دیا ہو۔

جواب : یہ اعتراض بھی تیسرے اعتراض کی قسم ہے جو محض فرضی ہے۔ ایک نماز کا دوسری نماز کے قائم مقام بغیر دلیل کے نہیں کیا جاتا۔ قرآن حدیث میں کہیں یہ ذکر نہیں اور نہ یہ کسی کا مذہب ہے کہ صلوۃ الضحیٰ قیام اللیل کے قائم مقام ہے۔

مولوی عبدالقادر نے اس مقام پر ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس کا حال بھی سن لیجئے الفاظ یہ ہیں : اربع رکعات قبل الظهر بعد الزوال تحسبن بمثلهن من السحر۔ "یعنی زوال کے بعد نماز ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھنا سحری کی نماز کے برابر درجہ رکھتی ہیں۔"

اس حدیث سے مراد ثواب ہے' جیسے حدیث میں ہے کہ رمضان میں عمرہ حج کا درجہ رکھتا ہے یا مسجد قبا میں نماز پڑھنا عمرہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں کہ حج عمرہ ادا ہو جاتا ہے۔ بلکہ نفس ثواب مطلب ہے۔ پھر اس حدیث میں چار رکعت ظہر سے پہلے کا ذکر ہے کہ وہ سحری کی نماز کا درجہ رکھتی ہیں۔ نماز ضحیٰ کے متعلق تو کوئی حدیث نہیں آئی کہ وہ قیام اللیل کے قائم مقام ہے' یہ محض آپ کا مفروضہ ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے حدیث کا مطلب غلط بیان کیا ہے۔ آپ نے مطلق کہا ہے کہ سحری کی نماز کا درجہ رکھتی ہیں۔ جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ساری کی ساری نماز ان چار رکعت سے الگ ہے اور وہ وہی قیام اللیل ہے جو کم سے کم سات رکعت ہوتی ہے۔

حالانکہ یہ مطلب صحیح نہیں بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ نماز ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھنا ایسا ہے جیسے یہ چار رکعت سحری کے وقت پڑھی جائیں۔ گویا قیام اللیل سے یہاں کچھ مطلب ہی نہیں' بلکہ یہ بتانا مقصد ہے کہ زوال کے بعد کا وقت چار رکعت کے حق میں ایسا ہی فضیلت والا ہے جیسا سحری کا وقت۔

اس کے علاوہ بخاری میں باب تحریض النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی صلوۃ اللیل والنوافل من غیرا یجاب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز ضحیٰ بعض دفعہ نہیں پڑھی۔ پس مولوی عبدالقادر صاحب کے تیسرے چوتھے اعتراض کی جڑ ہی کٹ گئی۔

باقی جس کسی حدیث میں نبی اکرم ﷺ کی نماز ضحیٰ کا ذکر آیا ہے تو وہ سببی ہے' جیسے مکہ میں پڑھی اس کا سبب ادائیگی شکر تھا اور سفر سے عموماً مدینہ منورہ میں ضحیٰ کے وقت واپس تشریف لاتے اور پہلے مسجد میں داخل ہوتے تو وہ نماز تحیۃ المسجد ہوتی۔

پانچواں اعتراض : یہ کیا ہے کہ ایک رکعت بڑھا کر پڑھنا یہ بیاج ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ بیاج نہیں لیتا کہ اس نے اس کو اپنے بندوں پر حرام کر دیا ہے۔

جواب : بیاج میں دستور ہے کہ وہ ضرور لیا جاتا ہے۔ سود اور بیاج قرضوں میں ہو سکتا ہے۔ نفل میں بیاج نہیں' کیونکہ حدیث میں ہے : المتطوع امیر نفسہ "یعنی نفل والا اپنے نفس کا امیر ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اونٹ خریدا تو اس کی قیمت سے زیادہ دے دیا۔ (بخاری)

مولوی عبدالقادر صاحب نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے پوہ پھٹنے کے بعد وتر کی قضا ثابت ہے۔ باقی قسطوں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے' مگر تیسری قسط میں اس پر خصوصیت سے زیادہ زور دیا ہے۔ گیارہ دلائل بالتفصیل ذکر کیئے ہیں۔

لیکن اس بات پر زور دینا فضول ہے' ہم پہلے ہی سے اس کے قائل ہیں۔ یہاں جس چیز کی بحث ہے وہ قضاء وتر بعد نماز فجر ہے۔ یعنی نماز فجر سے پہلے وتروں کی قضائی کا کوئی جھگڑا نہیں جو کچھ جھگڑا ہے وہ نماز فجر کے بعد ہے۔

تعارضات : پہلی قسط میں مولوی عبدالقادر صاحب نے قضاء وتر پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے : من نام عن صلوۃ اونسیھا فلیصل اذا ذکرھا۔ "یعنی جو شخص اپنی نماز سے سو جائے یا بھول جائے' تو پڑھے جب اس کو یاد آئے۔"

دوسری قسط میں قضاء وتر کے ثبوت کے لئے بلوغ المرام سے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : من نام عن الوتر اونسیہ فلیصل اذا اصبح او ذکر۔ "یعنی جو شخص سو گیا یا بھول گیا اور اس کے وتر رہ گئے' تو وہ صبح کرے یا جب یاد کرے پڑھ لے۔" ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ نماز فجر کے بعد بھی قضاء وتر ہے۔ تیسری قسط میں لکھا ہے۔ جس شخص کا قیام اللیل رہ جائے وہ دن میں بارہ نفل پڑھے۔ یہ قضا نہیں بلکہ دن کی عبادت ہے' جو رات کو نہ کر سکا تو دن کو کرلی اس کو وتر کی قضاء قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قضا صبح کی نماز تک ہے۔ اس قسط کے آخر میں لکھا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ وتر کی قضا تو صبح تک ہے' لیکن تاہم رات کی عبادت کا تدارک کرنا چاہئے تو دن کو بارہ نفل پڑھ لے مگر اس کو وتر کی قضا نہ سمجھے۔

مولوی عبدالقادر کی پہلی اور دوسری قسط کی عبارتوں سے تو ثابت ہوتا ہے کہ وتر کی قضا صبح کی نماز کے بعد بھی ہے اور تیسری قسط کی دونوں عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد وتر کی قضا نہیں۔

اگر مولوی عبدالقادر کہیں کہ میری مراد یہ ہے کہ جو دیدہ دانستہ صبح سے پہلے وتر نہ پڑھے اس کے بعد از نماز صبح قضا نہیں' تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیدہ دانستہ چھوڑنے والے پر تو نماز صبح سے پہلے بھی قضا نہیں۔ چنانچہ قسط نمبر۔۲' ص۔۵' کالم۔۳ میں بلوغ المرام کی حدیث لکھی ہے : من ادرک الصبح ولم یوتر فلا وترلہ۔ "یعنی جس نے دیدہ دانستہ وتر

نہیں پڑھے اور صبح ہو گئی اس کے لئے کوئی وتر نہیں۔" پھر آپ کا اس بات پر زور دینا کہ دیدہ دانستہ وتر چھوڑنے والے پر صبح کی نماز کی قضاء نہیں' یہ سب بحث فضول ہو گئی۔

نوٹ: ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے منتقی مع نیل الاوطار جلد ثالث میں باب باندھا ہے :باب قضاء مایفوت من الوتر والسنن الراتبة والاوراد۔ "یعنی باب ہے وتر اور سنتوں اور وظائف کی قضاء کا" اس میں یہ حدیث لائے ہیں' جو ہم نے اپنے فتویٰ میں نقل کی ہے : کان اذا منعه من قيام الليل نوم او وجع صلى من النهار ثنتى عشرة ركعة "یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام اللیل سے نیند یا بیماری روکتی تو وہ دن میں بارہ رکعت پڑھ لیتے۔

اس باب میں اس حدیث کا لانا دلیل ہے کہ یہ بارہ رکعت قیام اللیل کی قضا ہے اور قیام اللیل میں وتر بھی داخل ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گیارہ رکعت والی حدیث پر باب باندھا ہے :باب قيام النبى صلى الله عليه وسلم باليل فى رمضان وغیرہ۔

اس باب سے ثابت ہوا کہ گیارہ رکعت قیام اللیل ہے۔ پس ہم پر یہ اعتراض نہ رہا کہ بارہ رکعت کی قضا کہنا کسی کا مذہب نہیں۔ محدثین کی عبارتوں سے اس کو قضاء کہنا ثابت ہو گیا۔ جس کی صورت یہی ہے کہ ایک رکعت بڑھا کر پڑھی جائے۔

تعارض دوم : ہم نے جو اپنے فتوے میں لکھا ہے کہ وتر کی ویسے قضاء نہیں بلکہ دن میں ایک رکعت بڑھا کر پڑھ لینی چاہیے۔ اس پر مولوی عبدالقادر صاحب دوسری قسط کالم۔۲ میں لکھتے ہیں کہ یہ بعید ہے' کیونکہ دیگر حدیث میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ بیاج نہیں لیتا کہ اس نے اس کو اپنے بندوں پر حرام کر دیا ہے۔ قضاء ہمیشہ بمثل ادا ہوتی ہے زائد کا دستور نہیں اور پہلی قسط کالم دوم میں آپ لکھتے ہیں۔ وتر کی قضا آپ صبح کی نماز سے پہلے دے لیتے ہوں اور یہ بارہ رکعت تہجد کی قضا ہو کہ قیام اللیل بارہ رکعت بغیر وتر کے ثابت ہے کہ وتر ایک رکعت ملانے سے تیرہ رکعت بن جاتی ہیں جن کا ثبوت موجود ہے۔ اس عبارت میں زائد رکعت کو بیاج قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قضاء بمثل ہوتی ہے اور دوسری عبارت میں مشکوٰۃ والی حدیث کو تیرہ رکعت پر حمل کیا ہے۔

اب ایک اور حدیث سنئے : عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى من الليل ثلث عشره ركعة من ذالک بخمس ولا يجلس فى شئى الا فى

اخرھا۔ (متفق علیہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تیرہ رکعت پڑھتے ان سے پانچ وتر پڑھتے۔ ان میں کسی جگہ نہ بیٹھتے' مگر آخر میں اس بنا پر بیاج ہو گیا' کیونکہ وتر پانچ ہو گئے اور آٹھ رکعت کی قضا بارہ ہوئی اور وتر بھی بیچ میں قضاء مان لیں' ایک تو قضاء بمثل نہ ہوئی بلکہ شفع ہوئی۔ دوم دن میں وتر کی قضاء ثابت ہوگی حالانکہ آپ انکار کرتے ہیں۔

تعارض سوم : فتویٰ میں جو مشکوٰۃ کے حوالہ سے حدیث ذکر ہوئی ہے۔ اس پر مولوی عبدالقادر صاحب قسط اول کالم دوم میں لکھتے ہیں۔ یہ مبہم ہے جس میں کئی احتمال ہیں اور قسط دوم اور تین میں لکھتے ہیں کہ یہ مطلق ہے جس میں کئی احتمال ہیں۔

مبہم وہ ہوتا ہے جس کی مراد کا پتہ نہ لگے اور وہ تفسیر کا محتاج ہوتا ہے۔ جیسے : جاء نی رجل ای زید یعنی ایک شخص آیا۔ اس سے پتہ نہیں چلا کہ وہ کون ہے زید ہے یا عمر یا بکر ای زید (یعنی زید) اس کی تفسیر ہوگی اور وہ معین ہو گا۔ مطلق وہ ہوتا ہے جس کا معنی واضح ہو اور اس کے متعلق اصول یہ ہے : المطلق یجری علی اطلاقہ "یعنی مطلق اپنے اطلاق پر جاری رہتا ہے۔ جیسے آپ نے مشکوٰۃ کے حوالہ سے قسط دوم کالم تین سے یہ حدیث ذکر کی ہے : من نام عن الوتر فلیصل اذا اصبح۔ "یعنی جو سو گیا اور وتر نہ پڑھ سکا تو اس کو چاہئے کہ صبح کے وقت وتر پڑھے۔ اس حدیث میں وتر مطلق ہے۔ خواہ ایک ہو یا تین یا پانچ یا سات یا نو۔ کوئی معین نہیں جو چاہے پڑھ سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک جب قیام الیل مطلق ہے تو اس کو اپنے اطلاق پر رکھنا چاہئے۔ اس کے لئے صورتیں پیدا کرنا اطلاق کے خلاف ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا قیام خواہ نو رکعت ہو یا گیارہ رکعت یا تیرہ رکعت ہو۔ جب رہ جاتا تو اس کا تدارک یوں کرتے کہ دن میں بارہ رکعت پڑھ لیتے۔ رہا یہ کہ اس کا نام کیا رکھیں قضاء یا کچھ اور تو یہ لفظی بحث ہے جو اہل علم کی شان نہیں۔ مقصد عمل ہے اور ہم نے تو ابن تیمیہ رحمہ اللہ (صاحب منتقی) کے باب باندھنے سے اس کا قضاء ہونا بھی ثابت کر دیا۔ پس لفظی بحث بھی نہ رہی۔ والحمد للہ علی ذالک۔

اصل بات یہ ہے کہ مولوی عبدالقادر نے غور اور تدبر سے کام نہیں لیا اور قلم برداشتہ لکھتے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام میں تعارضات پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ کئی جگہ معنی اور مطلب بھی صحیح بیان نہیں کر سکے۔ دیکھئے چار رکعت زوال کے بعد کی حدیث

کامطلب غلط بیان کیا ہے۔ چنانچہ اوپر اس کا ذکر ہو چکا ہے اور قسط۔۳ ص۔۹ کالم۔۲ میں دار قطنی کے حوالہ سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ذکر کی ہے۔ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من فاتہ الوتر من اللیل فلیقضہ من الغد۔ اس حدیث میں دو راوی ضعیف ہیں۔ ایک ابوعاصم اور دوسرا اس کا استاد نائل بن سعید بصری۔ پہلے کے متعلق مغنی حاشیہ دار قطنی میں ہے کہ اس میں ضعف ہے اور دوسرے کے متعلق مغنی میں ہے کہ اسحاق بن راہویہ اس کو کذاب کہتے ہیں۔ ابوحاتم رحمہ اللہ اور نسائی کہتے ہیں متروک ہے۔ یحیٰ اور دار قطنی نے اس کو ضعیف کیا ہے۔ (دار قطنی مع مغنی ص۔۱۷) اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ وہ جس کا وتر فوت ہو جائے وہ صبح اس کی قضاء دے' حالانکہ غد کے معنی کل (آئندہ) کے ہیں نہ کہ صبح کے اور عبداللہ بن عمر کا بھی یہی مذہب ہے۔ زوال تک وتر کی قضاء کے قائل ہیں اور کئی بڑے بڑے تابعین کا بھی یہی مذہب ہے۔ جیسے شعبی رحمہ اللہ' عطا' حسن بصری رحمہ اللہ' طاوس' مجاہد رحمہ اللہ اور حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ ملاحظہ ہو نیل الاوطار۔۲ باب قضا مایفوت من الوتر ص۲۹۴۔

خیال فرمائیے' ایک طرف تو مولوی عبدالقادر صاحب دن میں وتر کی قضاء سے انکار کر رہے ہیں اور دوسری طرف یہ حدیث نقل کر رہے ہیں' جس سے دن میں وتر کی قضاء ثابت ہوتی ہے لیکن سمجھتے نہیں۔ اسی طرح قسط۔۳ ص۔۱۰ کالم۔۲ میں موطا امام مالک باب الوتر بعد طلوع الصبح کے حوالہ سے مولوی عبدالقادر صاحب کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سو گئے۔ جب نیند سے بیدار ہوئے تو پوچھا کہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ (خود نابینا تھے) خادم نے کہا' لوگ نماز سے فارغ ہو چکے ہیں۔ پس ابن عباس رضی اللہ عنہ نے پہلے وتر پڑھے پھر نماز پڑھی اور عبادہ بن صامت قوم کے امام تھے۔ ایک دن صبح کے بعد گھر سے نکلے' موذن اقامت کہنے لگا۔ اس کو خاموش کر دیا اور خود وتر پڑھنے لگے۔ اس کے بعد لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ ان کے علاوہ قاسم بن محمد اور عبداللہ بن عامر سے بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے بعد فجر وتر پڑھے۔ ان افعل سلف کے بعد امام مالک فیصلہ فرماتے ہیں کہ انما یوتر بعدالفجر من نام عن الوتر ولا ینبغی لاحدان یتعمل ذالک حتّٰی یصبح وترہ بعد الفجر۔ اس عبارت کے معنی مولانا عبدالقادر صاحب یوں کرتے ہیں۔ "فجر کے بعد وتر اس شخص کے لئے ہے جو سو گیا ہو' پھر بیدار ہوا۔ جو اختیاری طور پر عمداً ایسا کرے اس کے

لئے جائز نہیں۔" لیکن یہ معنی صحیح نہیں' صحیح یوں ہیں۔ "کہ فجر (پوہ پھٹنے) کے بعد صرف وہ شخص وتر پڑھے جس کا وتر سونے کی وجہ سے رہ گیا ہو۔ پھر بیدار ہو اور کسی شخص کو یہ لائق نہیں کہ وہ فجر کے بعد وتر پڑھنے کا قصد کرے۔ یہاں تک کہ وہ وتر کو (رات سے ہٹا کر) فجر کے بعد رکھ دے۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ وغیرہ کے عمل سے چونکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعد صبح وتر کا وقت ہے۔ اس غلطی میں مبتلا ہو کر ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص رات کو وتر چھوڑ کر اس وقت پڑھنے کا قصد رکھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس عبارت سے اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایسا قصد نہ کرے' کیونکہ وتر کی ادائیگی کا وقت نہیں رہا یہ کہ مسئلہ کی ناواقفی سے کسی نے رات کو وتر نہیں پڑھا مسئلہ سے واقف تھا کہ یہ وتر کا وقت نہیں ہے' مگر سستی سے رات کو اس سے وتر رہ گیا تو کیا اس وقت قضاء کر سکتا ہے کہ نہیں یہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ اس عبارت سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی سستی سے فرض نماز نہ پڑھے تو کیا وہ اس کی قضاء دے یا صرف توبہ ہی کافی ہے۔ منتقی میں اس پر باب باندھا ہے۔ اسی طرح روزہ وغیرہ کا حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ کسی قوم کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد سنتیں رہ گئیں' پھر عصر کے بعد ان کی قضا دی۔ جیسے یہ سب مسائل اپنی اپنی جگہ علیحدہ ہیں اسی طرح وتر کا یہ مسئلہ علیحدہ ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس عبارت میں اس کا بیان نہیں کر رہے' بلکہ وتر کا اصل وقت بتا رہے ہیں۔ مولوی عبدالقادر صاحب نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ اس مسئلہ کا بیان ہو رہا ہے۔ پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مذہب بھی نہیں کہ ایسا قصد کرنے والا شخص فجر کے بعد وتر نہ پڑھے' بلکہ پڑھے' مگر کامل نہیں ہو گا ناقص ہو گا' کیونکہ ایسے شخص کے لئے یہ وقت مکروہ ہے۔

ملاحظہ ہو زرقانی ج۱' ص۲۶۔

اللہ تعالیٰ غور وتدبر کی توفیق بخشے اور خامیاں دور کرے۔ اس قسم کی بعض خامیاں اس مضمون میں اور بھی ہیں' مگر ہمارا مقصد تنبیہ ہے' استقصاء نہیں' اس لئے اس پر اکتفا کی جاتی ہے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

عبداللہ امرتسری روپڑی رحمۃ اللہ علیہ

فتاویٰ اہلحدیث جلد دوم' ص۳۰۸ تا ۳۱۷

نماز وتر پڑھنے کی کیفیت

کمترین عارف حصاری نے ایک مضمون بابت نماز وتر دفتر تنظیم میں ارسال کیا ہے جو غالباً شائع ہو چکا ہوگا اب ایک فتویٰ حنفی مذہب کے ایک مسلمہ عالم کا ارسال کرتا ہوں جو میری تائید میں ہے۔ اس سے حضرات حنفی کو عبرت حاصل کر کے حق بات کو قبول کرنا چاہیئے اور تقلید پر جمود نہ رکھنا چاہیئے کہ مسلمان کی شان سے بعید ہے۔ فتاویٰ عبدالحیٔ جلد اول صفحہ ۳۰۸ میں جو سوال و جواب درج ہیں ان کی نقل بعینہ حسب ذیل ہے۔

سوال: نماز وتر خصوصاً تین رکعتیں حضورﷺ سے کیونکر ثابت ہیں۔ بعینہ مثل نماز مغرب کے ثابت ہیں۔ یا دو رکعت جدا اور ایک رکعت جدا یا تینوں رکعت متصل آخر کے ایک تشہد سے اور درمیان میں تشہد حضور نبی کریمﷺ سے ثابت ہے یا نہیں؟۔

جواب: وتر کے تین رکعتیں کے ساتھ حضرت سرور انبیاء علیہ السلام سے تین طرح منقول ہیں

(۱) دو رکعتوں اور تیسری رکعت کے درمیان میں فصل سلام کہ "قال ابن عمر کان النبی ﷺ یفصل بین الشفع والوتر اخرجه احمد وقواه ابن حبان وابن السکن فی صحیحها والطبرانی کذافی تلخیص الحبیر" حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام دو رکعوں اور ایک رکعت کے درمیان فصل کرتے تھے۔ اس کو احمد اور طبرانی نے روایت کیا اور احمد ابن حبان اور ابن سکن نے اپنی صحیحوں میں قوی کیا ہے جیسا کہ تلخیص الجسیر میں ہے۔

(۲) تینوں رکعتیں ایک تشہد سے پڑھتے تھے۔ یعنی تیسری رکعت میں تشہد پڑھتے تھے۔ "قالت عائشة رضی الله تعالی عنها قالت کان رسول الله ﷺ یوتر بثلاث لایجلس الافی آخر هن اخرجه احمد والنسائی والبیهقی والحاکم ولفظ احمد کان یوتر بثلاث لایفصل ینهن ولفظ الحاکم لایقعد الافی آخر هن" حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضور سرور کائناتﷺ وتر کی تین رکعتیں پڑھتے تھے اور ان کے آخر میں نشست فرماتے تھے۔ اس کو احمد اور نسائی اور بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور احمد کی روایت میں ہے کہ حضورﷺ تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور ان کے بیچ فصل نہیں کرتے تھے۔ اور حاکم کی روایت میں ہے کہ حضورﷺ تینوں رکعتوں کے ختم ہونے کے بعد قعود کرتے تھے۔

(۳) آپ تین رکعتیں دو قعدہ اور ایک سلام کے ساتھ نماز مغرب کی طرح پڑھتے تھے۔ یہ روایت خود حضور سرور دو عالم ﷺ سے بسند غیر معتبر اور صحابہؓ سے معتبر سندوں کے ساتھ مروی ہوئی ہے۔ تلخیص الحبیر وتخریج احادیث ہدایہ میں لکھا ہے "وتر اللیل ثلاث کوتر النهار صلوٰة المغرب اخرجه الدار قطنی من طریقه یحیی بن ذکریا ابن ابی الهواجب عن الاعش عن مالك بن الحارث عن عبدالرحمن بن یزید عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ وتر الفیل ۔الخ' قال الدارقطنی تضروبه یحیی وهو ضعیف قال البیهقی الصحیح وقفه علی ابن مسعود ورواه الدار قطنی قضن ایضامن حدیث عائشةؓ وفیه اسماعیل بن مسلم المکی ضعیف" رات کی وتر تین رکعتیں ہیں جس طرح دن کی وتر مغرب کی نماز ہے اس کو دار قطنی نے بطریق یحیی بن ذکریا ابن ابوالحواب روایت کیا ہے۔ انہوں نے اعمش سے انہوں نے مالک بن حارث سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن یزید سے انہوں نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا رات کے وتر تین رکعتیں ہیں جیسے دن کے وتر مغرب کی نماز ہے دار قطنی نے کہا ہے یہ حدیث فقط یحیی نے روایت کی ہے جو ضعیف ہے۔ بیہقی نے کہا ہے صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث ابن مسعودؓ پر موقوف ہے۔ دار قطنی نے بھی حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ اس میں اسماعیل بن مسلم مکی ضعیف ہیں اور فتح القدیر میں ہے "صح عن ابن مسعود وتر اللیل ثلاث کوتر النهار صلوٰة المغرب وانما ضعفوا رفعه" رات کی وتر تین رکعتیں ہیں جیسے دن کی وتر نماز مغرب ہے یہ حدیث ابن مسعودؓ سے صحیح ہے البتہ اس کا مرفوع ہونا (یعنی حدیث رسول ہونا۔ع) ضعیف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب حرره الراجی عفوربه القوی ابو الحسنات محمد عبدالحئی تجاوز الله عن ذنبه الجلی والخفی۔

نشان مہر محمد عبدالحئی ابوالحسنات۔

یہ فتویٰ مولانا عبدالحئی صاحب حنفی مرحوم لکھنوی کا جن کی شخصیت حنفی دنیا میں شہرہ آفاق ہے اور محتاج تعارف نہیں ہے ان کی تصانیف عرب وعجم میں مشہور اور مروج ہیں جن کے مطالعہ کے علماء محتاج ہیں۔ آنجناب مرحوم نے اس مسئلہ اور بعض دیگر مختلف فیہا مسائل میں بہت اچھا فیصلہ لکھا ہے۔ بلکہ آخر عمر میں یہ لکھ گئے کہ میں نے بہت تحقیق اور بحث سائل

میں کی ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ جملہ مسائل میں محدثین کا مسلک راجح پایا اور یہی حق ہے۔ مولانا موصوف نے وتر کی تین صورتیں لکھی ہیں اول نمبر اس صورت کو دیا ہے جو احادیث صحیحہ اور قویہ سے ثابت ہے اور اس پر کوئی جرح نہیں فرمائی ہے کیونکہ وہ احادیث صحیحہ کثیرہ سے ثابت ہے۔ دوسری صورت کو بھی تسلیم کیا ہے اور اس پر کوئی جرح نہیں کی اور اس کو امام حاکم نے صحیح کہا ہے۔ ہمارے احباب حنفیہ حضرات ان دو صورتوں کو تسلیم نہیں کرتے اور ان میں بے جا تاویلیں کرتے ہیں جو سراسر مردود ہیں اور تاویل الکلام مالا یرضی بہ القائل کی مصداق ہیں۔ تیسری صورت کو مولانا نے اس لیے ذکر کر دیا ہے کہ یہ حنفی مذہب میں مروج تھی ورنہ یہ صحیح حدیث سے صریحاً ثابت نہیں ہے۔ جیسے کہ پہلی دو صورتیں ثابت ہیں۔ جس حدیث کو پیش کیا جاتا ہے وہ حدیث رسول نہیں ہے اس کی سند ضعیف ہے۔ اور جن روایتوں کی سند صحیح ہے اور ان میں یہ ذکر ہے " لا یسلم بینھن "کہ درمیان میں سلام نہ پھیرتے تھے۔ ان سے وتر کی دوسری صورت مراد ہے کہ وہ مجمل ہیں تو ان کو مفصل پر محمول کریں گے یا وہ محتمل ہونے کی وجہ سے ساقط الاستدلال رہیں گی اور صریح حدیثیں ان پر مقدم رہیں گی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ابن مسعود کی موقوف حدیث پر ہمارا عمل ہے تو اس کی مدافعت یوں ہے کہ احادیث مرفوعہ کے مقابلہ میں موقوف حجت نہیں ہے خود حنفیہ کا یہ اصول ہے کہ موقوف بمعنی قول صحابی تب حجت ہے کہ سنت اس کی نفی نہ کرے نیز دیگر صحابہ سے ابن مسعود کے خلاف تعامل پایا جاتا ہے۔ قیام اللیل میں ہے کہ حضرت نافع فرماتے ہیں " سمعت معاذالقاری یسلم بین الشفع والوتر وھو یوم الناس فی رمضان بالمدینۃ علی عھد عمر بن الخطاب "یعنی حضرت معاذؓ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں لوگوں کی امامت کرتے تھے تو رمضان شریف میں مدینہ میں تین رکعت وتر کی پڑھتے تو درمیان میں سلام پھیرا کرتے تھے۔ دوسری روایت جو اس کے بعد ہے اس میں تصریح ہے کہ مسجد نبوی میں ہم قیام کرتے تھے تو حضرت معاذ ہماری امامت کرتے تھے تب دوگانہ وتر نماز میں سلام پھیر کر ایک رکعت اکیلی پڑھتے تھے۔

"وکان یصلی معہ رجال من اصحاب رسول اللہ ﷺ لم ارا احدا یعیب ذالک علیہ "یعنی حضرت معاذ کے ساتھ صحابہ کرام سے کئی اشخاص ہوتے تھے ان میں سے کسی نے بھی عمل معاذ پر اعتراض نہیں کیا۔ تو یہ اجماعی عمل قرار پایا جس سے حنفیہ منکر

ہیں۔ حنفیہ کا مذہب ضعیف ہے جو مسائل میں ضعیف روایتوں پر مبنی ہوتا ہے اور اس مذہب میں صحیح اور صریح روایتوں کا قحط ہے۔ اس لیے محدثین متقدمین اس مذہب سے متنفر رہے ہیں۔ اور بعض حنفی علماء نے مسائل کی تحقیق میں اہلحدیث تائید احادیث کی رو سے کر دی ہے مثلاً مولانا عبدالحئی حنفی مرحوم سے سوال ہوا کہ تہجد اور وتر ایک نماز ہے یا الگ الگ دو نمازیں ہیں تو اس کا جواب موصوف نے یہ دیا کہ احادیث مختلفہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر کا اطلاق کبھی نماز تہجد پر اور کبھی قیام اللیل پر جو تعداد میں طاق ہو ہے۔ اور یہ وتر عین تہجد ہے۔ پھر حدیث لکھ کر ترجمہ کیا ہے کہ ابو امامہ نے کہا کہ حضور سرور عالم ﷺ وتر کی نو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ اس کو احمد اور طبرانی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے وتر کی پانچ یا سات یا نو یا گیارہ رکعتیں پڑھو۔ اس کو دار قطنی اور ابن حبان نے روایت کیا ہے اور حاکم نے یہ اور زائد روایت کیا کہ وتر کی تین رکعت نہ پڑھا کرو اور اسے مغرب کی نماز کے مشابہ نہ بناؤ۔ اس حدیث کے تمام رجال ثقہ ہیں۔

اس صراحت سے ثابت ہوا کہ وتر سنت نماز ہے اس لیے اس کی کیفیت اور تعداد رکعت میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے اور اسی طرح اب بھی جائز ہے کہ سلف کا اس پر اسی طرح تعامل پایا گیا ہے۔ وتر کا الحاق تراویح' تہجد سب کے ساتھ ہو جاتا ہے کہ یہ سب قیام اللیل ہیں۔ جن کی حقیقت ایک ہے۔ طاق رکعت وتر ہے سب نماز قیام اللیل کو وتر کہہ سکتے ہیں۔ قیام اللیل صفحہ ۱۱۴ میں یہ حدیث ہے " عن جابر صلی بنا رسول اللہ ﷺ فی شهر رمضان ثمان رکعات و اوتر (الی آخر الحدیث) فقال انی کرهت او خشیت ان یکتب علیکم الوتر " یعنی آنحضور ﷺ نے ماہ رمضان میں آٹھ رکعت تراویح اور وتر پڑھائے۔ تین دن ایسا کیا اور پھر نہ نکلے اور یہ فرمایا کہ میں نے یہ اندیشہ کیا کہ کہیں تم پر وتر فرض نہ ہو جائیں۔ اس حدیث میں قیام رمضان کو وتر سے تعبیر کیا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ وتر سنت ہیں جو وتر کو فرض واجب کہتے ہیں ان کا مذہب باطل ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت صحابیؓ صاف فرماتے ہیں " امر حسن جمیل عمل به النبی والمسلمون بعده ولیس بواجب (رواه البیهقی) " یعنی وتر پڑھنا اچھا اور نہایت عمدہ ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے بعد تمام مسلمانوں نے وتر پڑھے ہیں۔ لیکن یہ واجب نہیں ہیں (سنت ہیں) عاصم بن حمزہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے سنا ہے آپ فرماتے ہیں " ان

الوتر ليس بحتم ولكنه سنة فلاتدعوه رواه احمد والدارمی" یعنی وتر واجب نہیں ہیں سنت ہیں ان کو چھوڑا نہ کرو۔ پس حنفیہ کا مذہب ہر طرح غلط ثابت ہوا اور اہل حدیث کا مسلک جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے یہ حق صحیح ہے۔ فللہ الحمد۔

عبدالقادر عارف حصاری
تنظیم اہل حدیث لاہور مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۴۴ء۔

قیام رمضان

ہر سال ماہ رمضان میں اکثر مقلدین حنفیہ عوام کو یہ کہا کرتے ہیں کہ تراویح بیس رکعت سنت ہیں' گیارہ رکعت تراویح بمعہ وتر کا پڑھنا سنت نہیں ہے بلکہ یہ ناقص عبادت ہے۔ یہ اہل حدیث لوگ عبادت الٰہی کو گھٹاتے ہیں۔ اس لیے اس مضمون واجب الاظہار میں آٹھ رکعت تراویح کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

قیام رمضان تراویح کو کہتے ہیں: عہد نبوی وعہد صحابہ کی یہ قدیمی اصطلاح ہے کہ نماز عشاء کے بعد رمضان میں جو فجر سے پہلے نماز پڑھی جاتی ہے' اس کو قیام رمضان کہتے ہیں۔ عہد نبوی وصحابہ کے بعد جب اس نماز کو جماعت کی صورت میں پڑھنے لگے اور چار رکعت کے بعد راحت حاصل کرنے لگے تو اس کا نام علماء کی اصطلاح میں تراویح ہوا۔ اب کتب حدیث وفقہ میں جہاں قیام رمضان کا کسی باب یا حدیث وفقہ میں وارد ہے' اس کا ترجمہ تراویح کیا جاتا ہے۔ کتب حدیث وکتب فقہ کے تراجم ملاحظہ کریں گے تو اس کا ثبوت ظاہر ہو جائے گا۔ اب جو ملا مولوی مقلد یہ کہتا ہے کہ آٹھ عدد تراویح کے ثبوت کے لیے ایسی دلیل پیش کرو جس میں لفظ تراویح ہو' ورنہ تسلیم نہ کیا جائے گا۔ یہ سراسر جہالت وحماقت ہے اور دراصل تحقیق کرنے سے صاف گریز اور عوام کو فریب اور دھوکہ دینا ہے۔

امام نووی مسلم شریف کی شرح میں تبویب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح۔ یعنی "اس باب میں قیام رمضان کا بیان ہے جس کو تراویح کہتے ہیں۔" پھر جلد اول ص۲۹ میں فرماتے ہیں: والمراد بقیام رمضان صلٰوۃ التراویح۔ یعنی "قیام رمضان سے مراد نماز تراویح ہے۔" اسی طرح صلٰوۃ رمضان سے مراد بھی تراویح ہے۔ کما لا یخفٰی علٰی اھل العلم۔ نیز اس کو صلٰوۃ اللیل بھی کہا جاتا ہے' جیسے حدیث مسلم میں ہے کہ صلٰوۃ لیالی رمضان کا ذکر کر کے پھر یہ فرمایا: خشیت ان تفرض علیکم صلٰوۃ الیل فتعجزوا عنھا۔ یعنی "میں نے اندیشہ کیا کہ تم پر رات کی نماز فرض نہ کی جائے' جس کی ادا سے تم عاجز ہو جاؤ۔

نماز تراویح کی ترغیب: مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ قیام رمضان کے بارہ میں لوگوں کو رغبت دیتے تھے اور اس کو واجب قرار دیتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه۔ یعنی "جس نے رمضان میں ایمان اور ثواب کی نیت سے تراویح پڑھیں' اس کے گذشتہ گناہ بخشے گئے۔"

پس جب صلوٰۃ اللیل اور قیام رمضان کا اتحاد ہے تو تراویح اور تہجد کا بھی اتحاد ہوا۔ جب تراویح پڑھ لی تو تہجد کی ضرورت نہیں رہی اور اگر تراویح نہ پڑھی اور آخر رات میں سو کر تہجد پڑھ لیا تو نماز تراویح ہو گئی' کیونکہ نماز ایک ہے۔ صرف بعض صفات میں مغائرت ہونے سے دو نام ہو گئے ہیں۔ اگر پہلی رات جماعت سے رمضان میں قیام کر لیا تو یہ تراویح ہے اور اگر آخر رات سو کر قیام کر لیا تو تہجد ہو گا' خواہ رمضان ہو یا غیر رمضان' نماز ایک ہی ہے۔

رمضان میں تراویح اور تہجد کے ایک ہونے کا ثبوت: عن ابی سلمة بن عبدالرحمٰن انه سأل عائشة کیف کانت صلوٰۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فی رمضان فقالت ما کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یزید فی رمضٰن ولا فی غیرہٖ علی احدٰی عشرة رکعة۔ (بخاری) یعنی "ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رمضان کی نماز (تراویح) کی بابت سوال کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔"

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آنحضور ﷺ کی نماز تراویح اور تہجد ایک ہی تھی' کیونکہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے تراویح کی نماز دریافت کی تھی کہ وہ کتنی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرما دیا کہ گیارہ رکعت پڑھتے تھے لیکن رمضان کے ساتھ غیر رمضان کا ذکر کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ غیر رمضان میں جو تہجد تھی' وہی رمضان میں تراویح تھی۔ دیوبند کے عالم شہیر مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں: والمختار عندی انها واحدة۔ یعنی "میرے نزدیک پسندیدہ بات یہی ہے کہ تہجد اور تراویح رمضان میں نماز ایک ہی ہے۔" جو شخص دو نمازیں الگ کہتا ہے' اس کے ذمہ یہ ثبوت ہے کہ وہ رمضان میں آنحضرت ﷺ سے دو نمازیں تراویح اور تہجد الگ الگ پڑھنا ثابت کرے۔ خصوصاً ان راتوں میں جبکہ آپ نے تین دن تراویح پڑھ

کر دکھائی تھیں۔

آٹھ تراویح کی دوسری دلیل: قیام اللیل مروزی ص۔۹۰ وطبرانی صغیر ص۔۱۰۸ میں یہ حدیث ہے: عن جابر بن عبداللہ قال صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی شھر رمضان ثمان رکعت ثم اوتر۔ یعنی "جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ماہ رمضان میں تراویح آٹھ رکعت پڑھائی تھی پھر وتر پڑھائے۔"

آٹھ رکعت تراویح کی تیسری دلیل: مسند احمد میں یہ حدیث وارد ہے: عن جابر بن عبداللہ عن ابی بن کعب قال جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ عملت اللیلۃ عملا قال ما ھو قال نسوۃ معی فی الدار قلن لی انک تقراء ولا نقرأ فصل بنا فصلیت ثمانیا والوتر قال فسکت النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال فراینا ان سکوتہ رضا بما کان۔ یعنی "جابر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا' اس نے بیان کیا کہ یارسول اللہ! میں نے رات کو ایک کام کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے گھر کی عورتوں نے مجھ سے کہا کہ ہم کو قرآن یاد نہیں کہ پڑھ سکیں' آپ قاری قرآن ہیں' ہم کو نماز تراویح پڑھائیں۔ تب میں نے ان کو آٹھ رکعت تراویح اور وتر پڑھا دیئے۔ آپ سن کر خاموش ہو گئے' ہم نے آپ کی خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہیں۔"

اسی طرح کا واقعہ مجمع الزوائد میں بھی مروی ہے اور قیام اللیل میں بھی ہے۔ اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ تراویح آٹھ رکعت ہیں۔ یہ سنت تقریری ہے' پہلی فعلی تھی۔ پس فعلی اور تقریری احادیث سے آٹھ رکعت کا مسنون ہونا ثابت ہو گیا' فللہ الحمد۔

مقلدین حنفیہ بھی ایک حدیث پیش کرتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بیس رکعت تراویح سوائے وتر کے پڑھی تھی۔ حنفیہ کے مسلم امام ابن ہمام یہ لکھتے ہیں کہ فضعیف بابی شیبۃ ابراھیم بن عثمان متفق علی ضعفہ مع مخالفۃ الصحیح۔ یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان راوی کی وجہ سے ضعیف ہے' یہ راوی بالاتفاق ضعیف ہے پھر باوجود ضعیف ہونے کے بخاری کی صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے' اس لیے یہ صحیح حدیث کے معارض نہیں آسکتی۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا فرمان: مشکوۃ باب قیام شہر رمضان ص۔۱۱۰ میں

ہے : عن السائب بن یزید قال امر عمر ابی بن کعب وتمیما الداری ان یقوما للناس فی رمضان باحدی عشرة رکعتة (کذا فی الموطا) یعنی "سائب بن یزید سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ لوگوں کو رمضان میں گیارہ رکعت پڑھایا کریں۔" یہ روایت صحیح ہے اور احادیث مرفوعہ کے موافق ہے اور بیس رکعت کی روایتیں ضعیف ناقابل قبول ہیں اور صحیح حدیث کے خلاف ہیں' اس لیے وہ قابل قبول نہیں کہ مرفوع کے مقابلہ میں موقوف حجت نہیں ہے' فتفکروا۔

چیلنج: اگر کوئی شخص بیس تراویح کا مسنون ہونا کسی حدیث صحیح سے ثابت کر دے تو اس کو مبلغ یک صد روپیہ انعام دیا جائے گا' لکھ دیا کہ سند رہے اور جو شخص رمضان میں آنحضور ﷺ سے تراویح اور تہجد دو نمازیں پڑھنا ثابت کر دے تو اس کو بھی مبلغ یک صد روپیہ انعام دیا جائے گا۔ آٹھ تراویح کے دلائل ایسے قوی ہیں کہ امام ابن ہمام اور ابن نجیم مصری صاحب البحر الرائق علامہ طحطاوی وغیرہ نے بھی اپنی تصنیفات میں یہ تسلیم کیا ہے کہ تراویح کی نماز آٹھ رکعت مسنون ہے۔

نہایت افسوس ہے کہ اس دور کے متعصب حنفیہ آٹھ رکعت تراویح مسنونہ کو ناجائز اور بیس رکعت تراویح کو سنت نبوی اور سنت خلفاء قرار دیتے ہیں جو بالکل غلط اور باطل ہے۔ ہاں آٹھ کو سنت جان کر پڑھے اور باقی رکعت کو نوافل سمجھ کر پڑھے تو یہ جائز ہے مگر حد بندی اور تعین نہ کرے ورنہ بدعت پیدا ہو جائے گی' اس سے بچو۔ والسلام

عبدالقادر عارف حصاری

الارشاد جدید کراچی جلد۔۱۳' شمارہ۔۲' بابت ماہ جنوری سنہ۔۱۹۶۵ء

ماہ رمضان المبارک کا قیام

تراویح: رمضان شریف میں جو عام طور پر لفظ تراویح بولا جاتا ہے' یہ لفظ عہد نبوی میں استعمال نہیں ہوا' اس لیے کسی حدیث میں وارد نہیں۔ تراویح جمع ترویحہ کی ہے اور ترویحہ راحت سے مشتق ہے یعنی ایک بار آرام کرنا۔ عہد نبوی اور عہدہ صدیقی میں قیام رمضان جماعت سے ادا کرنے کا التزام نہ تھا۔ عہد فاروقی میں جب اس کا التزام ہوا اور لوگ اس نما

کو جماعت سے ادا کرنے لگے تو ہر دو تسلیمہ کے درمیان راحت حاصل کرنے لگے۔ بس پھر اس کا نام تراویح رکھا گیا۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری' ارشاد الساری' زرقانی شرح موطا)

پس تراویح کی تعریف علماء نے یہ بیان فرمائی ہے کہ نماز تراویح وہ نماز ہے جو ماہ رمضان میں عشاء کے بعد جماعت کے ساتھ پڑھی جائے۔ اس کی تعریف سے یہ ظاہر ہوا کہ تراویح میں جماعت کا ہونا شرط ہے۔ اگر جماعت سے نہ پڑھی گئی تو اس کو تراویح نہیں کہا جائے گا۔ ہاں اگر اکیلے اکیلے پڑھیں گے تو اس کو قیام رمضان کہا جائے گا کیونکہ قیام رمضان سے وہ نماز مراد ہے جو رمضان شریف کی راتوں میں عشاء کے بعد پڑھی جائے' خواہ جماعت سے پڑھی جائے' خواہ اکیلے اکیلے ادا کی جائے' بہرحال وہ قیام رمضان ہے۔ یہ نماز تو ایک ہی ہے صرف اعتباری فرق ہے۔ قیام رمضان نماز تراویح سے اعم ہے اور تراویح اخص ہے۔ یہی نماز اگر جماعت سے پڑھ کر دو تسلیمہ کے بعد آرام کیا گیا تو اس کو تراویح کہیں گے اور یہی نماز رمضان شریف کی راتوں میں عبادت کے طور پر پڑھی گئی تو اس کو قیام رمضان کہیں گے' خواہ اکیلے اکیلے یہ عبادت کر لے یا جماعت سے مل کر کر لے' بہرصورت قیام رمضان ادا ہو جائے گا۔ مگر عرف عام میں رمضان کی اس نماز کو نماز تراویح سے پکارا جاتا ہے۔ (چنانچہ شرح مسلم میں امام نووی فرماتے ہیں : المراد بقیام رمضان صلٰوۃ التراویح کہ قیام رمضان سے مراد نماز تراویح ہے) اسی لیے علامہ کرمانی نے یہ کہہ دیا ہے کہ اتفقوا علٰی ان المراد بقیام رمضان صلٰوۃ التراویح۔ یعنی "قیام رمضان سے بالاتفاق نماز تراویح مراد ہے۔" (فتح الباری)

قیام رمضان کی فضیلت : قیام اللیل ص۔۸۸ میں ہے : عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ۔ یعنی "جو شخص قیام کرے رمضان میں ساتھ ایمان صحیح کے اور طلب کرنے ثواب کے' بخشے جاتے ہیں واسطے اس کے پچھلے گناہ اس کے۔"

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص توحید و رسالت پر قرآن وحدیث کے مطابق ایمان رکھ کر اور ریا وغیرہ ہر قسم کی بدنیتی سے دور ہو کر ثواب حاصل کرنے کی نیت سے مخلصانہ طور پر قیام رمضان کرے گا' اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور جس قدر اعتقاد صحیح اور یقین کامل ہو گا اور محض اللہ کی رضا اور ثواب کے حصول کی نیت کرے گا'

اتنا ہی ثواب اور مغفرت زیادہ پائے گا۔

نیز اس سے یہ ظاہر ہوا کہ مشرک' بدعتی اور ریا و نمود' دنیوی غرض اور طمع رکھنے والوں کو اس قیام رمضان کا کچھ ثواب حاصل نہیں ہے بلکہ وہ بموجب عاملة ناصبة تصلی نارا حامية آگ میں جہنم کی داخل ہوں گے۔ اسی واسطے آنحضور ﷺ نے فرمایا : رُبَّ صائم لیس له من صیامه الا الجوع ورُبَّ قائم لیس له من قیامهٖ الا السهر۔ (ابن ماجه' نسائی' ابن خزیمه' حاکم) یعنی بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے ہیں کہ ان کو روزہ کے ثمرات میں سے سوائے بھوکا رہنے کے کچھ بھی حاصل نہیں ہے اور بہت سے رمضان کی راتوں میں قیام کرنے والے ایسے ہیں کہ ان کو رات کو جاگنے کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا' پس ایمان صحیح اور اخلاص اختیار کریں۔

قیام صائم : قیام اللیل ص۔۸۸ میں حدیث شریف وارد ہے کہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ذکر شهر رمضان فقال ان رمضان شهر افترض اللّٰہ صیامه وانی سننت للمسلمین قیامه فمن صامه وقامه ایمانا واحتسابا خرج من الذنوب کیوم ولدته امه۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے رمضان مبارک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ رمضان وہ مہینہ ہے کہ اس کے روزوں کو اللہ نے فرض ٹھہرایا ہے اور میں نے اس میں قیام (نماز تراویح) کو سنت قرار دیا ہے۔ لہٰذا جس شخص نے ازروئے ایمان اور طلب ثواب کے رمضان کے روزے رکھے اور اس کی راتوں میں قیام کیا (نماز تراویح پڑھی) تو وہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جائے گا جیسے کہ اپنی ماں کے شکم سے آج ہی پیدا ہوا ہے۔

اس حدیث سے نماز تراویح کی بڑی فضیلت ثابت ہوئی اور یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ نماز سنت ہے اور سَنَنْتُ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس نماز کے ادا کرنے کا طریقہ سکھلایا ہے اور اس کو جاری کیا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ میں نے اپنی طرف سے بغیر حکم الٰہی کے اس کو ایجاد کیا ہے' کیونکہ یہ آپ کی شان سے بعید ہے۔ دوسری حدیث میں صاف یہ الفاظ ہیں : یا ایها الناس قد اظلکم شهر عظیم شهر مبارک شهر فیه لیلة خیر من الف شهر شهر جعل اللّٰہ صیامه فریضة وقیام لیله تطوعا۔ یعنی اے لوگو! تم پر ایک مہینہ آرہا ہے جو بہت بڑا اور مبارک مہینہ ہے' اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے' اللہ تعالیٰ نے اس ماہ کے روزے فرض کیے ہیں اور اس کی رات کی تراویح کی نماز کو ثواب

کی چیز ٹھہرایا ہے' پس یہ تطوع اور نفلی عبادت ہے جو حکم الٰہی سے جاری کی گئی ہے۔

نماز تراویح کا حکم: آنحضور ﷺ بغیر عزیمت کے اس کی ترغیب دیتے تھے۔ مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ عن ابی هریرة قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یرغب فی قیام رمضان من غیر ان یامرهم فیه بعزیمة فیقول من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه۔ یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیام رمضان کے بارہ میں ترغیب دیا کرتے تھے اور تاکید کے ساتھ اس کا حکم نہیں فرماتے تھے' یہ فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی قیام کرے رمضان میں ساتھ ایمان اور ثواب حاصل کرنے کی نیت سے' اس کے پہلے گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نماز تراویح مستحب ہے' واجب نہیں ہے۔ امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں: واتفق العلماء علی استحبابها کہ علمائے دین نماز تراویح کے مستحب ہونے پر متفق ہیں۔ پھر امام نووی نے حدیث مذکورہ بالا کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے: قوله من غیر ان یامرهم بعزیمة معناه لا یامرهم امر ایجاب وتحتیم بل امر ندب وترغیب۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے فرمان من غیر ان یامرهم بعزیمة کا مطلب یہ ہے کہ آپ وجوب اور لزوم کا حکم نہیں دیتے تھے بلکہ مستحب ہونے کی رغبت دیتے تھے۔ پھر فرماتے ہیں: وهذه الصیغة تقتضی الترغیب والندب دون الایجاب کہ یہ صیغہ ترغیب اور استحباب کو مقتضی ہے' ایجاب کو نہیں چاہتا۔

پھر لکھا ہے کہ واجتمعت الامة علی ان قیام رمضان لیس بواجب بل هو مندوب کہ تمام امت کا اجماع ہے کہ نماز تراویح واجب نہیں ہے بلکہ وہ مستحب ہے۔ واجب اور مستحب کا فرق یہ ہے کہ واجب کا تارک گنہگار ہے اور مستحب کا تارک گنہگار نہیں ہے' ثواب اور فضیلت سے محروم ہے۔ پس اس سے مفتی جریدۂ اہلحدیث سوہدرہ کا وہ فتویٰ غلط ثابت ہوا جو نمبر ۳۱' جلد ۲' سوال نمبر ۷۹ کے جواب میں شائع ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص عمداً تراویح چھوڑ دے گا تو گنہگار ہو گا۔ مفتی صاحب نے تارک تراویح کے گنہگار ہونے پر کوئی نص پیش نہیں فرمائی' صرف یہ حدیث لکھی ہے کہ من قام رمضان ایمان واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه۔ لیکن اس حدیث میں گنہگار ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے' صرف فضیلت کا ذکر ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں : ثم فسرہ بقولہ فیقول من قام رمضان (الحدیث) یعنی آنحضرت ﷺ نے اپنے قول کی یوں تفسیر فرمائی کہ رمضان کا قیام کرنے والے کے پہلے گناہ معاف کئے جاتے ہیں۔ هذه الصيغة تقتضي الترغيب والندب دون الايجاب کہ یہ صیغہ ترغیب اور استحباب کو چاہتا ہے' وجوب کو نہیں چاہتا۔ یہی حدیث ہماری دلیل ہے' اسی کو مفتی صاحب نے دلیل بنایا ہے۔ پس ناظرین ہی انصاف کرلیں۔

ہر کار خیر: حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ نے رمضان مبارک کے قریب ارشاد فرمایا کہ رمضان کا مہینہ آگیا ہے جو بڑی برکت والا ہے' حق تعالیٰ اس میں تمہاری طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنی رحمت خاصہ نازل فرماتا ہے' خطاؤں کو معاف کرتا ہے' تمہارے تنافس کو دیکھتا ہے' (ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نیک کام کرنا اور دوسرے کی حرص میں کرنا تنافس ہے) اور ملائکہ سے فخر کرتا ہے' پس اللہ کو اپنی نیکی دکھلاؤ' بدنصیب ہے وہ شخص جو اس مہینہ میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہ جائے۔ (ترغیب وترہیب)

نماز تراویح باجماعت: عن عائشة رضی الله عنها قالت كان الناس يصلون في مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم في رمضان بالليل اوزاعا يكون مع الرجل شئی من القران فيكون معه النفر الخمسة او الستة او اقل من ذالك او اكثر يصلون بصلوته قالت فامرني رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة من ذالك ان انصب له حصيرا على باب حجرتي ففعلت فخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد ان صلى العشا الاخرة فاجتمع اليه من في المسجد فصلى بهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلا طويلا۔ (الحدیث) یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ لوگ رمضان شریف میں متفرق طور پر آنحضور ﷺ کی مسجد میں رات کو تراویح پڑھتے تھے' کسی شخص کو قرآن یاد ہوتا تو اس کے ساتھ پانچ یا چھ آدمی مل کر نماز پڑھتے' کسی کے ساتھ کم یا زیادہ ہوتے اور وہ اس کے ساتھ مل کر نماز تراویح پڑھتے تھے۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ مجھے آنحضور رسول اللہ ﷺ نے رات کو حکم فرمایا کہ اپنے حجرہ کے دروازہ پر پردہ کے لیے بوریا کھڑا کروں' پس میں نے ایسا ہی کیا تو پھر آنحضرت ﷺ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد تشریف لائے اور آپ کی طرف مسجد میں رہنے والے (اصحاب صفہ) جمع ہوئے' پس آپ نے ان کو بہت لمبی رات تک نماز تراویح پڑھائی۔ (قیام اللیل ص۔۸۹)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے تین دن جماعت کے ساتھ نماز تراویح ادا کی پھر جماعت چھوڑ دی اور یہ فرمایا کہ ولکنی خشیت ان تفرض علیکم فتعجزوا عنہا۔ کہ میں نے جماعت اس لیے چھوڑ دی کہ مجھے اس بات کا خوف ہوا کہ کہیں یہ نماز جماعت تم پر فرض کی جائے اور تم سے ادا نہ ہو سکے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز تراویح جماعت سے پڑھنا' پڑھانا مسنون ہے اور اس کا سنت ہونا حدیث تقریری اور فعلی سے ثابت ہے اور آپ نے جو جماعت ترک کی' وہ مصلحت وقتی تھی ورنہ اصل جماعت تراویح میں مشروع اور مسنون ہے' جس پر اب تک عام طور پر امت کا تعامل چلا آرہا ہے۔

قیام اللیل ص ۹۰ میں ہے کہ عن ابی ھریرة قال خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم واذا ناس فی رمضان یصلون فی ناحیة المسجد فقال ما ھٰؤلاء قیل ھٰؤلاء ناس لیس معھم قرأن واُبی بن کعب یصلی بھم فھم یصلون بصلوته فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اصابوا او نعم ما صنعوا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو لوگ مسجد کے ایک گوشہ میں رمضان شریف میں نماز تراویح پڑھ رہے تھے۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ جواب دیا گیا کہ ان لوگوں کو قرآن یاد نہیں ہے اور اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ حافظ قرآن ان کو نماز تراویح پڑھا رہے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ انہوں نے بہت اچھا کام کیا ہے۔

اس حدیث سے بھی جماعت سے نماز تراویح پڑھنا افضل ثابت ہوا' کیونکہ آپ نے ان کے اس عمل کی تحسین فرمائی' جس سے فضیلت ثابت ہوئی۔ نیز قیام اللیل میں ہے کہ ان ابی بن کعب کان یصلی بالناس فی قیام رمضان فلما توفی ابی قام بھم زید بن ثابت۔ کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز تراویح پڑھاتے رہے' جب وہ فوت ہوئے تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کاتب وحی لوگوں کو نماز تراویح پڑھاتے رہے۔

قیام اللیل میں ہے کہ عن انس قال کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یجمع اھله لیلة احدٰی وعشرین فیصلی بھم الٰی ثلث اللیل ثم یجمع ھم لیلة ثنتی وعشرین فیصلی بھم الٰی نصف اللیل ثم یجمعھم لیلة ثلاث وعشرین فیصلی بھم الی ثلث اللیل ثم یامرھم لیلة رابع وعشرین ان یغتسلوا فیصلی بھم حتّٰی یصبح ثم لا

یجمعھم۔ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ اپنے اہل کو اکیسویں تاریخ کو جمع کرتے اور تہائی رات تک نماز پڑھاتے پھر بائیسویں رات کو جمع کرتے اور ان کو نصف رات تک نماز پڑھاتے پھر تیئیسویں رات کو ان کو اکٹھا کرتے اور دو تہائی رات تک ان کو نماز پڑھاتے پھر چوبیسویں رات کو ان کو غسل کرنے کا حکم فرماتے اور صبح تک نماز پڑھاتے پھر ان کو جمع نہ کرتے۔

اس حدیث سے بھی قیام لیل میں جماعت سے نماز پڑھنا مشروع اور مسنون ثابت ہوا۔

اسی طرح قیام اللیل میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضور ﷺ کے ہمراہ رمضان میں صبح تک چار رکعت نماز ادا کی۔ اس سے بھی جماعت سے رات کی نفلی نماز پڑھنا مسنون ثابت ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ کچھ لوگ تو اکیلے نماز تراویح پڑھ رہے ہیں اور کچھ جماعت سے پڑھ رہے ہیں' تب فرمایا : لو جمعت ھؤلاء علی قاری واحد لکان امثل ثم عزم فجمعھم علی ابی بن کعب قال ثم خرجت معہ لیلۃ اخری والناس یصلون بصلوۃ قارئھم فقال عمر نعمت البدعۃ کہ کاش! میں ان تمام لوگوں کو ایک قاری کی اقتداء میں جمع کر دوں تو اچھا ہے پھر ارادہ کر کے لوگوں کو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے ماتحت جمع کر دیا پھر دوسری رات نکلے اور لوگوں کو دیکھا کہ وہ ایک قاری کی اقتدا میں نماز تراویح پڑھ رہے ہیں تو فرمایا کہ یہ اچھی بدعت ہے۔

یعنی نفس جماعت تو ثابت ہے لیکن عہد نبوی سے عہد فاروقی تک اس کا اہتمام اور انتظام نہ ہوا تھا' اب انتظام ہو گیا تو آپ نے لغوی لحاظ سے اس کو بدعت فرمایا نہ کہ شرعی لحاظ سے' کیونکہ شرعی بدعت تو گمراہی ہے' اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نہ جمع کرتے اور نہ ایسا کرتے دیکھ سکتے تھے۔

اس واقعہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد کی سنت بھی ثابت ہو گئی کہ ایک امام کے ماتحت سب نمازی لوگ نماز تراویح پڑھتے رہے اور کسی نے انکار نہیں کیا تو اجماع ہو گیا۔ پس جماعت سے نماز پڑھنا اجماعی چیز ہے' جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی جماعت کی تنظیم کرنا ثابت ہے' چنانچہ قیام اللیل ص۔۹۰ میں ہے : کان علی بن ابی طالب یامر الناس بقیام رمضان فیجعل للرجال اماما وللنساء

امامان کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز تراویح پڑھنے کا حکم فرماتے اور مردوں کے لیے علیحدہ امام مقرر کرتے اور عورتوں کے لیے علیحدہ امام مقرر کرتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن رمضان شریف کی رات کو باہر نکلے تو دیکھا کہ مسجدوں میں قندیلیں روشن ہیں اور قرآن مجید پڑھا جا رہا ہے یعنی نماز تراویح میں حافظ قرآن سنا رہا ہے' تب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نور اللّٰہ لک یا ابن الخطاب فی قبرک کما نورت مساجد اللّٰہ بالقرآن۔ کہ اے ابن الخطاب رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو روشن کرے' جس طرح آپ نے اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو قرآن سے روشن کیا۔

الغرض اسی طرح جماعت سے نماز تراویح پڑھنا احادیث مرفوعہ وموقوفہ سے ثابت ہے اور تعامل نبوی اور تعامل صحابہ سے ثابت ہے۔ خیر القرون میں برابر اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ ہاں عہد فاروقی سے پہلے اس پر زیادہ اہتمام اور پابندی سے عمل نہ تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ نظام کر دیا جس پر اب تک عمل درآمد چلا آتا ہے۔ پس بحکم فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین۔ کہ میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑ لو۔

نماز تراویح جماعت سے پڑھنی افضل ثابت ہوئی۔ حضرت محب السنہ امامنا امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ الصلوٰة فی الجماعة احب الیک ام یصلی وحده فی قیام شهر رمضان قال یعجبنی ان یصلی فی الجماعة یحی السنة۔ کہ نماز تراویح جماعت سے پڑھنا آپ کو زیادہ محبوب ہے یا اکیلے پڑھنا؟ تب امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جماعت سے پڑھنا محبوب ہے کہ سنت زندہ ہو۔

اسی طرح امام اسحاق امام المحدثین رحمۃ اللہ علیہ نے تصدیق فرمائی' ملاحظہ ہو۔ (قیام اللیل)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے مسئلہ دریافت کیا گیا کہ آپ کو نماز تراویح جماعت سے پڑھنا زیادہ خوش معلوم ہوتا ہے یا اکیلے پڑھنا؟ امام صاحب موصوف نے فرمایا کہ یعجبنی ان یصلی مع الامام ویوتر معه "کہ مجھے یہ خوش لگتا ہے کہ امام کے ہمراہ نماز تراویح پڑھے اور وتر بھی اس کے ہمراہ پڑھے" کیونکہ قال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ان الرجل اذا قام مع الامام حتی ینصرف کتب له بقیة لیلته۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک جس نے امام کے ساتھ نماز پڑھی یہاں تک کہ امام نماز سے پھرا تو اُس کے لیے تمام رات کی عبادت کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

اس سے بھی جماعت سے نماز پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوئی۔ امام نووی شرح صحیح مسلم جلد۔۱' ص۔۲۵۹ میں فرماتے ہیں کہ اختلفوا فی ان الافضل صلوتها منفردا فی بیته ام فی جماعت المسجد "کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ تراویح اکیلے گھر میں پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھنا افضل ہے۔" تب فرمایا کہ فقال الشافعی وجمهورا صحابه وابو حنیفة واحمد وبعض المالکیة وغیرهم الافضل صلوتها جماعة کما فعله عمر بن الخطاب والصحابة رضی اللّٰه عنهم واستمر عمل المسلمین علیه لانه من الشعائر الظاهرة فاشبه صلوٰة العید۔ یعنی امام شافعی اور ان کے جمہور اصحاب اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد اور بعض مالکی وغیرہ تو یہ کہتے ہیں کہ نماز تراویح جماعت سے افضل ہے جیسے کہ حضرت عمر اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے عمل کیا اور مسلمانوں کا تعامل اس پر قائم ہوا اور یہ نماز عید کے مشابہہ اسلام کے ظاہرہ شعائر سے ہے۔

لیکن امام مالک اور ابو یوسف اور بعض شافعیہ گھر میں اکیلے پڑھنا افضل کہتے ہیں کیونکہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ فرض نماز کے بعد باقی نمازیں گھر میں افضل ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ گھر میں نماز پڑھنا جماعت سے نماز پڑھنے کے منافی نہیں ہے' آنحضور ﷺ نے اپنے گھر والوں کو جمع کر کے جماعت سے نماز پڑھی' نماز تراویح جماعت سے پڑھنا افضل ہے' خواہ مسجد میں پڑھے یا گھر میں پڑھے' یہ اختیار ہے۔ حدیث میں ہے کہ صلوة الجماعة تفضل صلوة الفذ بسبع وعشرین درجة۔ کہ جماعت کی نماز اکیلے کی نماز پر ستائیس درجے فضیلت رکھتی ہے۔

دیگر حدیث میں ہے کہ ان صلوٰة الرجل مع الرجل ازکٰی من صلوٰته مع الرجل وما کثر فهو احب الی اللّٰه۔ کہ تحقیق ایک شخص کے ساتھ نماز پڑھنی اکیلے پڑھنے سے زیادہ ثواب رکھتی ہے اور دو شخصوں کے ساتھ نماز پڑھنی ایک شخص کے ساتھ نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب رکھتی ہے۔ پس جس قدر زیادہ ہوں وہ اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہیں۔

ان عموم ادلہ سے بھی جماعت کی فضیلت ثابت ہوئی۔ پس تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ نماز تراویح جماعت سے پڑھیں۔

تعداد تراویح: نماز تراویح مع وتر گیارہ رکعت سنت ہے' اس پر اجماع ہے۔ ان سے زائد رکعات پر اجماع نہیں ہے' اختلاف ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ

کے عہد اور صحابہ کے عہد میں گیارہ رکعت نماز تراویح پڑھی گئی ہے۔ ان سے زائد پڑھنے کا ثبوت بسند صحیح ثابت نہیں ہے اور جو حدیث ان سے زائد رکعتوں کے متعلق بیان کی جاتی ہے' وہ ضعیف ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں : متفق علی ضعفہ۔ بخاری شریف باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل فی رمضان وغیرہ۔ "یعنی باب ہے آنحضرت ﷺ کا رمضان اور غیر رمضان میں رات کو نماز پڑھنا۔"

پھر حدیث ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کی ذکر کی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مسئلہ پوچھا کہ کیف کانت صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان۔ کہ آنحضور ﷺ کی نماز رمضان کی راتوں میں کس طرح تھی؟ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا کہ ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدٰی عشرۃ رکعۃ۔ کہ آنحضرت ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔

سائل کا سوال رمضان کی راتوں کی نماز کا ہے' جس کے جواب میں حضرت ملکہ دو عالم نے صاف بیان فرمایا کہ رمضان اور غیر رمضان رات کی نماز گیارہ رکعت سے زیادہ نہ تھی۔ پس تراویح ہو یا تہجد ہو' کل نماز رات کی رمضان اور غیر رمضان میں ایک ہی تھی جو گیارہ رکعت تھی' صرف اعتباری فرق ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ رمضان میں پڑھی جاتی ہے۔ قیام رمضان ہے' اس لحاظ سے کہ وہ جماعت سے پڑھ کر راحت حاصل کی جاتی ہے۔ تراویح ہے' اس لحاظ سے کہ وہ سو کر پڑھی جاتی ہے۔ تہجد ہے' تہجد کے معنی بیداری اور ترک خواب کے ہیں۔ پس جو نماز کچھ سو کر پھر اٹھ کر پڑھی جائے تو وہ نماز تہجد ہے۔ اگر رمضان میں ہے تو یہی قیام رمضان ہے۔

آٹھ تراویح: قیام اللیل ص-۹۰ میں ہے : عن جابر قال صلّٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان لیلۃ ثمان رکعات والوتر۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے رمضان میں آٹھ رکعت تراویح اور وتر پڑھے۔

فتح الباری میں ہے کہ ولم ار فی شئی من طرقہ بیان عدد صلاتہ فی تلک اللیالی لکن روی ابن خزیمۃ وابن حبان من حدیث جابر قال صلّٰی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان ثمان رکعات ثم اوتر۔ یعنی میں نے حدیث مذکورہ بالا کی کسی سند

میں یہ نہیں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان راتوں میں کتنی رکعتیں پڑھائی تھیں لیکن ابن خزیمہ اور ابن حبان نے جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں وتر کے علاوہ آٹھ رکعتیں پڑھائی تھیں۔

عمدۃ القاری میں علامہ عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ لکھا ہے کہ فان قلت لم یبین فی الروایات المذکورۃ عدد الصلوۃ التی صلاھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی تلک اللیالی۔ یعنی اگر تو یہ سوال کرے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان تین راتوں میں جو نماز پڑھائی تھی' ان کی تعداد روایات میں بیان نہیں ہوئی۔

تو اس کے جواب میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : قلت روی ابن خزیمۃ وابن حبان من حدیث جابر رضی اللّٰہ عنہ قال صلّٰی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی رمضان ثمان رکعات ثم اوتر۔ کہ میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں وتر کے علاوہ آٹھ رکعتیں پڑھائی تھیں۔

اس تصریح سے ثابت ہوا کہ جن تین راتوں میں آنحضرت ﷺ نے نماز تراویح جماعت سے پڑھائی تھی' ان کی تعداد گیارہ رکعت مع وتر تھی۔ یہ حدیث صحیح یا حسن ہے۔ امام ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی کتابوں میں صحت کا التزام کیا ہوا ہے' وہ جو حدیث ذکر کرتے ہیں' وہ صحیح ہوتی ہے۔ پس یہ دونوں محدث اس حدیث کی صحت پر متفق ہیں۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے میزان الاعتدال میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ اسنادہ وسط "کہ اس حدیث کی سند اچھی ہے' درمیانی ہے۔"

معجم صغیر طبرانی میں بھی یہ حدیث ہے :عن جابر بن عبداللّٰہ قال صلّٰی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی شھر رمضان ثمان رکعات و اوتر۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب حنفی دیوبندی اپنے رسالہ "کشف الستر عن صلٰوۃ الوتر" کے ص۔۲۷ میں فرماتے ہیں : اذا التراویح التی صلاھا صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی رمضان بھم کانت احدٰی عشرۃ رکعۃ کما عند ابن خزیمۃ ومحمد بن نصر وابن حبان عن جابر ثمان رکعات و اوتر والوتر ثلاث ھناک ایضًا۔ یعنی جو تراویح نماز آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے ساتھ پڑھی تھی' وہ گیارہ رکعت تھی جیسا کہ ابن خزیمہ اور

محمد بن نصر مروزی اور ابن حبان نے جابر رضی اللہ عنہ سے آٹھ رکعت اور وتر روایت کئے ہیں' وتر اس جگہ تین ہیں۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں : واخرج ابن حبان في صحيحه من حديث جابر انه صلّى بهم ثمان ركعات ثم اوتر وهذا اصح۔ (تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک جلد۔ا' ص۔۳۰) یعنی ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے آٹھ رکعت تراویح اور وتر روایت کئے ہیں' یہ حدیث بہت صحیح ہے۔ (كذا في الزرقاني)

۲- قیام اللیل ص۔۹۰ میں ہے : عن جابر جاء ابي بن كعب في رمضان فقال يارسول الله كان مني الليلة شيئي قال وما ذاك يا ابي قال نسوة داري قلن انا لا نقرأُ القرآن فنصلي خلفك بصلوٰتك فصليت بهن ثمان ركعات والوتر فسكت عنه وكان شبه الرضا۔

از احقر عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث جلد۔۳۱' شمارہ۔۱۷' ۱۸' ۱۹' ۲۰ مورخہ یکم و پندرہ رمضان ویکم و پندرہ شوال سنہ۔۱۳۷۰ھ

تہجد اور تراویح ایک ہی نماز ہے

علمائے اہلحدیث واحناف کا متفقہ فیصلہ

واضح ہو کہ ہر سال قبل از رمضان یا رمضان میں وعظوں' تقریروں' رسالوں' اشتہاروں ور اخباروں میں یہ زور وشور سے کہا اور لکھا جاتا ہے کہ رمضان میں بیس تراویح سنت مؤکدہ ہیں اور رمضان کی مستقل نماز ہے جو نماز تہجد سے بالکل الگ ہے۔ فرقہ غالیہ یہ دعویٰ کرتا تو کوئی تعجب نہ تھا لیکن دیوبند کی درسگاہ کے اکثر علماء یہ دعویٰ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسا غلط اور باطل دعویٰ کیوں کیا جاتا ہے۔ درآنحالیکہ محدثین اور فقہائے متقدمین کا اس پر اتفاق ہے کہ قیام رمضان جس کا عرفی نام تراویح ہو گیا ہے' وہ وہی نماز ہے و غیر رمضان کی راتوں میں صلوٰۃ اللیل' قیام اللیل اور تہجد کے ناموں سے موسوم ہے۔ جب رمضان میں صلوٰۃ اللیل ادا کی جاتی ہے تو بوجہ رمضان کے اس کا نام قیام رمضان ہے

اور جب لیلتہ القدر میں پڑھی جائے تو اس کا نام قیام لیلتہ القدر ہو جاتا ہے۔ نماز تو ایک ہے' صرف اعتباری فرق ہے۔

اصول حنفیہ کی کتاب السبیل الاقدم ترجمہ مسلم الثبوت کے ص۔۳۱ میں ہے کہ "جب دونوں میں تغایر اعتباری ہوا تو یہ مختلف اعتبار سے ایک کا دوسرے پر صادق ہونا جائز ہو گا۔"

مصنف کہتے ہیں کہ مقولات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ مقولات حقیقیہ اور مقولات اعتباریہ۔ مقولات حقیقیہ کا تصادق باعتبارات مختلفہ گو ممتنع ہے مگر صورت مذکورہ میں لازم نہیں آتا اور مقولات اعتباریہ کا تصادق باعتبار مختلف صورت مذکورہ میں گو لازم آتا ہے مگر یہ ممتنع نہیں ہے۔

پس تراویح' تہجد' قیام رمضان' قیام اللیل' صلوٰۃ اللیل' صلوٰۃ الوتر ایک ہی نماز کے مختلف اعتبار سے یہ نام ہیں۔ اگر اس نماز کو رمضان کی راتوں میں ادا کیا گیا تو اس کا نام قیام رمضان ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو قیام رمضان کے باب میں ذکر کیا ہے اور قیام رمضان کی تعداد گیارہ رکعت بمع وتر ثابت کی ہے اور اسی حدیث کو صلوٰۃ اللیل کے باب میں بھی ذکر کیا ہے' جس سے دونوں کی حقیقت کا ایک ہو ثابت ہوا۔

اسی طرح امام محمد رحمہ اللہ نے موطا میں اس حدیث کو قیام شہر رمضان میں ذکر کیا ہے جس پر مولانا عبدالحی مرحوم نے حاشیہ پر یوں لکھا ہے: ویسمی التراویح۔ "یعنی اس قیام شہر رمضان کا عرفی نام تراویح ہے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں جس نماز کا ذکر ہے' وہ تراویح کو بھی شامل ہے جبکہ وہ رمضان میں ادا کی جائے۔ امام ابن الہمام نے فتح القدیر جلد ۱' ص۔۳۳۳' میں فریقین کے دلائل پر بحث کرتے ہوئے بیس رکعت تراویح کی تضعیف بیان کرکے تراویح کا مسنون عدد گیارہ رکعت قرار دیا ہے۔

بحر الرائق میں ابن نجیم نے امام ابن الہمام کا فیصلہ نقل کر کے یہ مان لیا کہ وقد ثبت ذالک کان احدی عشرۃ رکعۃ بالوتر کما ثبت فی الصحیحین من حدیث عائشۃ الخ۔ یعنی یہ بات ثابت ہو گئی کہ نماز تراویح گیارہ رکعت ہیں جیسا کہ صحیحین کی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں آیا ہے۔

نیز لکھا ہے: فاذن یکون المسنون علی مشائخنا ثمانیۃ والمستحب اثنا عشر

البحر الرائق جلد۔۲' ص۔۶۱) یعنی بیس رکعت تراویح میں سے مسنون آٹھ رکعت ہیں اور بارہ رکعت مستحب ہیں۔ (سنت نہیں)

بہت سے حنفیہ نے امام ابن الہمام کا فیصلہ منظور کرلیا ہے جو انہوں نے یہ لکھا ہے : ان قیام رمضان سنۃ احدی عشرۃ رکعۃ بالوتر الخ۔ یعنی تراویح گیارہ رکعت سنت نبوی ہے۔

فتح القدیر مصری جلد۔۱' ص۔۳۳۴ طحطاوی نے بھی شرح درمختار میں لکھا ہے کہ سنت گیارہ رکعت ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب ما ثبت بالسنہ میں لکھا ہے : لکن المحدثین قالوا ان ھذا الحدیث (ابن عباس) ضعیف والصحیح ما روتہ عائشۃ انہ صلی احدی عشرۃ رکعۃ کما ھو عادتہ فی قیام اللیل۔ یعنی بیس تراویح کی حدیث ضعیف ہے اور حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گیارہ رکعت تراویح پڑھی تھیں جیسا کہ آپ کی عادت قیام اللیل میں تھی۔

مولانا ابو الحسن شرنبلالی حنفی نے مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں یہ لکھا ہے : وصلاتھا بالجماعۃ سنۃ کفایۃ لما ثبت انہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صلّٰی بالجماعۃ احدٰی عشرۃ رکعۃ بالوتر علی سبیل التداعی الخ۔ یعنی نماز تراویح جماعت سے پڑھنا سنت کفایہ ہے کیونکہ آنحضور ﷺ نے اعلان کے طور پر گیارہ رکعت بمع وتر جماعت سے پڑھائی تھیں۔

علامہ زیلعی حنفی نے نصب الرایہ جلد۔۱' ص۔۲۸۳ میں بیس تراویح کی حدیث ضعیف ثابت کر کے پھر یہ لکھا ہے : ثم انہ مخالف للحدیث الصحیح عن ابی سلمۃ بن عبدالرحمٰن انہ سأل عائشۃ کیف کانت صلٰوۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی رمضان قالت ما کان یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ۔ یعنی بیس والی روایت حدیث صحیح کے بھی مخالف ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں رات کی نماز گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے۔"

پس امام زیلعی کے نزدیک بھی جو غیر رمضان میں صلوٰۃ اللیل تھی وہ رمضان میں قیام رمضان بن گئی' دونوں نمازیں ایک ہیں۔ اسی طرح دیگر اکابر علماء حنفیہ کا فیصلہ ہے اور یہی

علماء اکابر دیوبند فرماتے ہیں۔ مثلاً مولانا انور شاہ صاحب محدث دیوبند مرحوم جن کی شخصیت موجودہ علماء دیوبند سے بہت بلند ہے۔ چنانچہ رسالہ "الفرقان" لکھنؤ جلد۔۲۰' نمبر۔۲' مطبوعہ ماہ صفر سنہ۔۱۳۷۲ھ میں یہ لکھا ہے : "استاذنا مولانا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کے متعلق بس جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ علم وتفقہ و ورع وتقویٰ میں ان کا مقام ہمارے اس دور کے خواص میں بھی کتنا بلند تھا۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثانی نے اپنی شرح مسلم میں ایک جگہ ان کے بارہ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ لم ترعیون ولم یزھم مثلہ۔ یعنی "اس زمانہ کے لوگوں کی آنکھوں نے ان کی اور نظیر اور مثال نہیں دیکھی اور انہوں نے خود بھی اپنے جیسا نہیں دیکھا۔" علی ہذا القیاس' حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے ان کے متعلق جو یہ فرمایا : "اس امت میں ان کا وجود اسلام کی صداقت کی دلیل اور ایک مستقل معجزہ ہے۔" تو جو لوگ حضرت شاہ صاحب سے اچھی طرح واقف نہیں ممکن ہے کہ وہ ان بزرگوں کے ارشادات میں کوئی مبالغہ سمجھیں لیکن جو واقف ہیں ان کے نزدیک تو یہ بالکل حقیقت ہے جو نپے تلے لفظوں میں ادا کی گئی۔

جب اکابر علماء دیوبند میں ان کی شخصیت کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام کی صداقت کی دلیل اور معجزہ ہیں تو اب اہلحدیث کے مسلک کی صداقت کی دلیل اور معجزہ مولانا انور شاہ کا یہ فیصلہ ہے جو تمام علماء دیوبند پر ناطق ہے۔ چنانچہ فیض الباری جلد ثانی' ص۔۴۲ میں ہے :

یوید فعل عمر رضی اللّٰہ عنہ فانہ کان یصلی التراویح فی بیتہ فی آخر اللیل مع انہ کان امرھم ان یودوھا بالجماعۃ فی المسجد ومع ذالک لم یدخل فیھا وذالک لانہ کان یعلم ان عمل النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان باداتھا فی اٰخر اللیل ثم نبھھم علیہ قال ان الصلٰوۃ التی تقومون بھا فی اول اللیل مفضولۃ منھا لو کنتم تقیمونھا فی اٰخر اللیل فجعل الصلٰوۃ واحدۃ وفضل قیامھا فی اٰخر اللیل علی القیام بھا فی اول اللیل وعامتھم لما لم یعرفوا مرادہ جعلوہ دلیلا علی تغایر الصلاتین وزعموا انھا کانت صلٰوتین۔ یعنی اس مسلک کی تائید (جو اہلحدیث کا مسلک ہے) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں تراویح آخر شب میں پڑھا کرتے تھے حالانکہ انہوں نے دیگر لوگوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ تم مسجد میں جماعت کے ساتھ

پڑھا کرو اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ جماعت میں شریک نہ ہوتے تھے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہی تھا کہ آپ اس نماز کو آخر رات میں پڑھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خبردار بھی کر دیا تھا کہ جو نماز تم لوگ رات کے اول حصہ میں پڑھتے ہو' اس کو اگر آخر رات میں پڑھا کرو تو یہ افضل ہے' اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز تراویح اور تہجد کو ایک ہی نماز قرار دیا ہے لیکن عامی لوگوں نے ان کی مراد کو سمجھا نہیں' اُلٹا اس کو دو نمازوں کی مغائرت کی دلیل بنا دیا اور یہ گمان کر بیٹھے کہ تہجد اور تراویح دو نمازیں ہیں۔ (حالانکہ دونوں ایک ہیں)

نیز یہ لکھا ہے : قال عامة العلماء ان التراويح وصلٰوة الليل نوعان مختلفان والمختار عندى انهما واحدة۔ یعنی عام حنفی علماء تراویح اور تہجد کو دو مختلف نمازیں قرار دیتے ہیں لیکن میری تحقیق میں یہ دونوں نمازیں ایک ہی ہیں۔

پھر لکھا ہے کہ "اگرچہ دونوں کے اوصاف میں کچھ اختلاف ہے مگر صفات کا اختلاف نوعی اختلاف کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ان کا یہ خیال میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہے۔ بل تلک صلٰوة واحدة۔ بلکہ یہ دونوں نمازیں ایک ہی ہیں۔

پھر لکھتے ہیں : اذا تقدمت سُمِّىَ باسم التراويح واذا تاخرت سميت باسم التهجد۔ یعنی جب اس نماز کو پہلے حصہ رات میں پڑھا جائے تو اس کا نام تراویح ہے اور جب سو کر آخر رات میں پڑھا جائے تو اس کا نام تہجد ہے۔

نیز یہ فرماتے ہیں : انها يثبت لغير النوعين اذا ثبت عن النبى صلى الله عليه وسلم انه صلى التهجد مع اقامته بالتراويح۔ یعنی ان دونوں نمازوں کا مغائر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہو جائے کہ آپ نے تراویح کے ساتھ نماز تہجد بھی پڑھی تھی۔

نیز شاہ صاحب موصوف کا العرف الشذی ص۳۰۹ میں یہ فیصلہ ذکر کیا گیا ہے : ولا مناص من تسليم ان تراويحه عليه السلام كانت ثمانية ركعات ولم يثبت فى رواية من الروايات انه عليه السلام صلى التراويح والتهجد عليحدة فى رمضان۔ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تراویح آٹھ رکعات تھیں اور یہ کسی روایت سے ثابت نہیں کہ آپ نے رمضان میں تراویح اور تہجد الگ الگ پڑھی ہوں۔

اور میں کہتا ہوں کہ تمام دنیا کے حنفی جمع ہو کر یہ ثابت کرنا چاہیں کہ آنحضرت ﷺ نے رمضان میں دو نمازیں علیحدہ علیحدہ پڑھی تھیں تو ہرگز نہیں ثابت کر سکتے بلکہ ان تین راتوں میں جو آپ نے لوگوں کو جماعت سے رات کی نماز پڑھائی' ایک ہی نماز پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ اگر دو نمازیں الگ الگ پڑھی ہوتیں تو صحابہ کرام بیان کر دیتے' اذ لیس فلیس۔

نیز اگر آپ نے رمضان کی راتوں میں دو نمازیں پڑھی ہوتیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جن سے رمضان کی رات کی تمام نماز پوچھی گئی تھی' صاف بیان کر دیتیں کہ رمضان میں تراویح اتنی رکعت پڑھتے تھے اور تہجد کی نماز اتنی پڑھتے تھے' جب وہ غیر رمضان کی راتوں کی نماز بتا رہی ہیں کہ وہ رمضان کی تراویح کو نہیں بتا سکتی تھی بلکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضور ﷺ نے ہم کو آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھائے تھے۔

چنانچہ اس حدیث کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں اور علامہ انور شاہ صاحب نے کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر ص-۲۷ میں حدیث جابر رضی اللہ عنہ کو تسلیم کر کے آٹھ رکعت تراویح کے مسنون ہونے کی دلیل بتایا ہے۔ اذا التراویح التی صلاھا صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی رمضان بھم کانت احدٰی عشرۃ رکعت لما عند ابن خزیمۃ ومحمد بن نصر الی قولہ رواہ ابو یعلی قال الھیثمی اسنادہ حسن۔

اب مولانا رشید احمد گنگوہی کا فیصلہ سنئے۔ لیکن پہلے ان کی حیثیت معلوم کر لیجئے۔ حکایات اولیاء کے ص-۳۰۴ میں ان کا ایک خواب درج ہے کہ آنحضور ﷺ مجھے خواب میں ملے تو مجھ سے سو مسائل پوچھے' میں نے سب صحیح بتائے پھر کہتے ہیں "اس روز سے میں نہایت خوش ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اگر سارے عالم میرے خلاف ہوں گے تو انشاء اللہ حق میری جانب ہو گا"

مولانا کے نزدیک کثیر کے مقابلہ میں واحد حق پر ہو سکتا ہے۔ اس سے حنفیہ کی یہ دلیل باطل ہو گئی کہ ہم سواد اعظم یعنی جماعت کثیر ہیں' اس لیے سچے ہیں۔ پس یہ اصول اور روایت غلط ہو گئی۔ اب مولانا رشید احمد گنگوہی کا فیصلہ سنئے جو انہوں نے تحقیق کے بعد صحیح جان کر لکھا ہے اور یہ ناسخ ہے ان کے اس فیصلہ کا جو فتاویٰ رشیدیہ اور رسالہ الرای النجیح میں درج ہے کیونکہ بعد تحقیق تھا۔ بہرحال آپ کا فیصلہ لطائف قاسمیہ کے ص-۱۳ اور مکتوب سوم کے ص-۱۷ میں درج ہے۔ بقدر ضرورت الفاظ درج ذیل ہیں :

"بر اہل علم پوشیدہ نیست کہ قیام رمضان وقیام لیل فی الواقع یک نماز است کہ در رمضان برائے تیسیر مسلمین در اول شب مقرر کردہ شدہ ہنوز عزیمت در ادائیش آخر شب است ۔۔۔ تراویح نفس تہجد است علیٰ التحقیق ۔۔۔ مگر در رمضان کہ تراویح است قولی سنت مئوکدہ خواہد ماند۔" خلاصہ مطلب اس عبارت کا یہ ہے کہ "نماز تہجد اور تراویح علی التحقیق دونوں ایک نماز ہیں' یہی حق بات ہے۔"

حکایات اولیاء کے ص-۳۸ پر ہے : حضرت نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری زبان سے غلط نہ نکلوائے گا۔" بس دیوبند کے ان دو مسلم بزرگوں کا فیصلہ اہلحدیث کے حق میں ہو چکا ہے' لہٰذا ان کے بعد دیگر علماء دیوبند کو ہم ہیچ سمجھتے ہیں کہ وہ جو اہلحدیث کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ حسد اور عناد پر مبنی ہے جو ناقابل التفات ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور مورخہ ۲۴/ فروری سنہ۔۱۹۷۲ء

مسئلہ تراویح اور بزرگان احناف

برادران اسلام! امت مسلمہ کو سب سے زیادہ نقصان فرقہ بندی سے پہنچا ہے۔ یہ فرقہ بندی ہی کی آفت ہے جو مسلمانوں کو ایک محمدی پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہونے دیتی' ورنہ آپ سوچیں' جب اللہ ایک اور اس کا دین ایک' رسول ایک اور اس کی سنت ایک تو فرقہ بندی کیا معنی؟ فرقہ بندی کی اصلی بنیاد ضد اور تعصب ہے۔ اگر ضد اور تعصب نہ ہو تو کوئی فرقہ بندی نہ ہو۔ یہ تعصب ہی ہے جو آدمی کو حق سے دور رکھتا ہے اور صحیح سوچنے نہیں دیتا ورنہ ایسی کوئی بات نہیں کہ حق سمجھ میں نہ آئے۔ کتنے مسائل ہیں جو اختلافی نہیں لیکن ضد اور تعصب کی کھینچا تانی نے ان کو اختلافی چھوڑ امتیازی بنا رکھا ہے۔ مسئلہ تراویح بھی ان میں سے ایک ہے۔ سلف کا اس مسئلہ میں قطعاً اختلاف نہیں تھا' سب اس بات پر متفق تھے۔ رسول مقبول ﷺ کی سنت آٹھ رکعت نماز تراویح ہے۔

اس مسئلہ میں اختلاف اس وقت پیدا ہوا' جب فرقہ پرستی نے زور پکڑا۔ رکعات تراویح کو اجماع صحابہ کی مہر لگا کر معین کر دیا گیا اور جو تعداد مسنون نہ تھی' اس کو مسنون بنا دیا گیا۔ یہ فرقہ پرستی کا ہی اثر ہے کہ آج بیس تراویح کو ہی مذہب اہل سنت بتایا جاتا ہے اور

کم وبیش پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی بلکہ برا منایا جاتا ہے۔ ذیل میں مسئلہ تراویح پر ایک تحقیقی مضمون بصورت مکالمہ پیش کیا جاتا ہے اور زمانہ حال کے مقلدین احناف نے حدیث میں جو افسوسناک خیانت اور تحریف کی ہے اس کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ قارئین کرام مقلدین حضرات کی بے انصافیاں ملاحظہ فرمائیں۔ اس مکالمہ میں "ح" سے مراد حنفی اور "م" سے مراد محمدی (اہلحدیث) ہے۔

ح -- السلام علیکم!

م -- وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ' کیسے تشریف لائے؟

ح -- ایک مسئلہ دریافت کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔

م -- فرمایئے!

ح -- تراویح سنت رسول کیا ہے؟

م -- تراویح سنت رسول آٹھ رکعت ہے۔

ح -- کیا یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

م -- ہاں! بخاری اور مسلم میں ہے :

انه سأل عائشة كيف كانت صلوٰة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلمَ فى رمضان فقالت ما كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يزيد فى رمضان ولا فى غيره علىٰ احدٰى عشرة ركعة "ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا' آنحضرت ﷺ کا قیام رمضان کتنا تھا؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا رمضان ہو یا غیر رمضان آنحضرت ﷺ گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔

ح -- اس میں تو تراویح کا تو نام بھی نہیں۔

م -- تراویح کا نام تو کسی حدیث میں بھی نہیں۔

ح -- پھر تراویح لیتے کہاں سے ہیں؟

م -- لیتے تو احادیث سے ہی ہیں لیکن احادیث میں تراویح کا لفظ نہیں آتا بلکہ صلوٰۃ رمضان یا قیام رمضان کا لفظ آتا ہے' جس سے مراد تراویح ہی ہوتی ہے۔ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے بھی نبی کریم ﷺ کی نماز تراویح کا سوال کیا تھا جس کا جواب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ دیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی نماز تراویح اور تہجد ایک ہی تھیں اور وہ گیارہ رکعت سے

زیادہ نہ تھیں۔

ح ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے تو اس نماز کا ذکر کیا ہے جو رمضان اور غیر رمضان دونوں میں پڑھی جاتی ہے یعنی تہجد کا۔ اگر ان کی مراد تراویح ہوتی تو غیر رمضان کا ذکر نہ کرتیں' کیونکہ تراویح غیر رمضان میں نہیں ہوتیں۔

م ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تہجد کا ذکر کیسے کر سکتی تھیں جب سوال صلوٰۃ رمضان کا تھا' کیا تہجد صلوٰۃ رمضان ہے؟

ح ۔ اگرچہ تہجد رمضان کی نماز نہیں لیکن رمضان میں تہجد تو ہو سکتی ہے' ممکن ہے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے یہ سوال کیا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رمضان کی تہجد کتنی تھی؟

م ۔ اول تو صلوٰۃ رمضان سے تہجد مراد نہیں ہو سکتی' کیونکہ صلوٰۃ جو کہ عام ہے اور تہجد اور تراویح دونوں کو شامل ہے۔ رمضان کی قید سے خاص ہو گئی ہے' جس سے رمضان کی خاص نماز یعنی تراویح ہی مراد ہو سکتی ہے لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ ما کان یزید کہہ کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد ہی بیان کی ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں تراویح بھی پڑھتے تھے یا صرف تہجد پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ اگر تہجد پر ہی اکتفا کرتے تھے تو یہی ہمارا دعویٰ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تراویح اور تہجد ایک ہی تھیں اور وہ گیارہ رکعت سے زیادہ نہ تھیں۔ اگر تہجد کے علاوہ تراویح بھی پڑھتے تھے تو ثابت کریں کہ رمضان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد اور تراویح علیحدہ علیحدہ تھیں اور یہ ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ ثابت یہ ہے کہ رمضان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد ہی تراویح تھیں۔

مولانا انور شاہ دیوبندی فرماتے ہیں : لا مناص من تسلیم ان تراویحه علیه السلام کانت ثمانیة رکعات ولم یثبت فی روایة من الروایات انه علیه السلام صلی التراویح والتهجد علیحده فی رمضان بل طول التراویح وبین التراویح والتهجد فی عهده علیه السلام لم یکن فرق فی الرکعات بل فی الوقت والصفة (عرف الشذی ص-۳۰۹)

"یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تراویح آٹھ رکعت ہی تھیں' کسی بھی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تراویح اور تہجد علیحدہ علیحدہ پڑھی ہوں۔ آپ تراویح کو ہی لمبا کر دیتے تھے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تراویح اور تہجد میں رکعتوں میں فرق

تھا۔"

تمام محدثین بھی آنحضرت ﷺ کے قیام رمضان کو اسی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت کرتے ہیں اور تو اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جو کہ حنفی مذہب کے بانیوں میں سے ہیں' موطا امام محمد میں تسلیم کرتے ہیں کہ یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی تراویح کے بارے میں ہے۔

ایسے ہی امام ابن ہمام' ابن نجیح' طحاوی' علامہ عینی' ملا علی قاری' شیخ عبدالحق محدث دہلوی' علامہ ابو الحسن شرنبلالی وغیرہم سب اجلہ احناف تسلیم کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی نماز تراویح آٹھ رکعت ہی تھیں اور یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ ابن ہمام فرماتے ہیں : فتحصل من هذا كله ان قيام رمضان سنة احدى عشرة ركعة بالوتر فعله صلى الله عليه وسلم۔ یعنی اوپر کی ساری بحث سے نتیجہ نکلا کہ سنت قیام رمضان گیارہ رکعت ہی ہے جو کہ آپ نے خود کیا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں : لكن المحدثين قالوا ان هذا الحديث ضعيف والصحيح ما روته عائشة انه صلى احدى عشرة ركعة كما هو عادته في قيام الليل وروى انه كان بعض السلف في عهد عمر بن عبدالعزيز يصلون باحدى عشرة ركعة قصد التشبه برسول الله صلى الله عليه وسلم۔ (ما ثبت بالسنة ص-۲۲) یعنی محدثین کے نزدیک صحیح حدیث تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی ہے کہ آنحضرت ﷺ عادت کے مطابق رمضان میں بھی وتر سمیت گیارہ رکعت ہی پڑھا کرتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں بعض سلف اتباع سنت کے خیال سے آٹھ تراویح ہی پڑھتے تھے' بیس والی روایت ضعیف ہے۔

ح -- اگر یہ حدیث تہجد کے بارے میں نہیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے غیر رمضان کا ذکر کیوں کیا؟

م -- ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ حدیث تہجد کے بارے میں نہیں' ہم تو کہتے ہیں کہ اس حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ بتایا ہے کہ رمضان ہو یا غیر رمضان' سرور کائنات ﷺ گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے یعنی سرور کائنات ﷺ کی تہجد اور تراویح ایک ہی نماز تھی۔ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے کیف کے ساتھ سوال کیا تھا' جس سے ان کی مراد یہ تھی یعنی آٹھ رکعت تو پھر رمضان کی کیا خصوصیت؟ اگر زیادہ تھی تو اس کی

کیفیت بتلایئے؟ کیا رکعتیں زیادہ ہوتی تھیں یا آٹھ کو ہی لمبا کر دیتے تھے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا کہ آنحضرت ﷺ رکعتیں تو زیادہ نہیں کرتے تھے' البتہ رکعتوں کو طویل کر دیتے تھے یعنی آنحضرت ﷺ رمضان میں بھی پڑھتے تو آٹھ ہی پڑھتے تھے لیکن پوچھ نہ وہ کتنی اچھی ہوتی تھیں۔

حنفیوں کے مشہور علامہ عینی بھی فرماتے ہیں: یحمل علی التطویل دون الکثرۃ۔ یعنی آنحضرت ﷺ رمضان میں رکعتیں زیادہ نہیں کرتے تھے' صفت ادائیگی کو بہتر بنا دیتے تھے۔

مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں: وبین التراویح والتہجد فی عہدہ علیہ السلام لم یکن فرق فی الرکعات بل فی الوقت والصفۃ۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے عہد میں تراویح اور تہجد میں رکعتوں میں فرق نہیں تھا' صفت اور ادائیگی و وقت میں فرق تھا۔

ح -- آپ کی بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

م -- آج کل کے حنفی علماء کا یہ گروہی تعصب ہے جو وہ اس حدیث میں تحریف کرتے ہیں' ورنہ پہلے حنفی جو متعصب نہ تھے' اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ حدیث تراویح کے بارے میں نص ہے' جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اصل میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث جو کہ درجہ اول کی تینوں کتابوں میں ہے اور اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے' حنفیوں کے بیس تراویح کے مسلک کے لیے بہت خطرناک ہے۔ یہ حدیث بیس تراویح کو نہ سنت چھوڑتی ہے' نہ اجماعی' اس وجہ سے حنفی علماء اس حدیث میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ح -- تحریف کیسے کرتے ہیں؟

م -- پہلے معنی کو بگاڑتے تھے' اب حدیث کی عبارت کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔

ح -- بدلنا کیسے؟

م -- فی رمضان کا لفظ اُڑانا چاہتے ہیں کہ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔" یعنی جب فی رمضان کا لفظ نہ ہو گا تو تراویح کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔

ح -- حدیث کی عبارت کیسے بدلی جا سکتی ہے؟ میں تو نہیں مانتا۔

م -- نہ ماننے کا تو علاج نہیں۔ اگر دیکھنا ہو تو بخاری شریف "محمد سعید اینڈ سنز' کراچی" والوں کی دیکھ لیں۔ جو حال ہی میں حنفیوں نے چھپوائی ہے' اس میں انہوں نے عربی عبارت

اور اردو ترجمے دونوں سے "فی رمضان" کی عبارت نکال دی ہے۔

ح -- یہ تو بہت بری بات ہے' آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

م -- تاکہ اپنا مذہب جھوٹا نہ پڑے' فرقہ بندی اسی لیے تو بری ہے کہ وہ سب کچھ کرا دیتی ہے۔

ح -- فی رمضان سے آخر ان کو کیا نقصان ہے؟

م -- فی رمضان سے یہ حدیث تراویح کے بارے میں نص ہو جاتی ہے' جس کا نقصان ان کو یہ پہنچتا ہے کہ سنت تراویح آٹھ رکعت ثابت ہوتی ہیں اور بیس اجماعی بھی نہیں رہتیں۔

ح -- اجماعی کا کیا مطلب؟

م -- احناف کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس تراویح کا حکم دیا تھا اور تمام صحابہ بیس پڑھنے لگ گئے تھے یعنی بیس پر اجماع ہو گیا تھا۔

ح -- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث اجماع صحابہ کے دعوی کو کیسے رد کرتی ہے؟

م -- حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو آٹھ سے زیادہ کی نفی کرتی ہیں' اگر اجماع ہوتا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نفی نہ فرماتیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ما کان یزید فی رمضان والا اعلان خلافت راشدہ کے آخری ایام کا ہے' کیونکہ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ جنہوں نے یہ سوال کیا تھا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ شہادت علی رضی اللہ عنہ کے وقت ان کی عمر سولہ' سترہ سال کے قریب تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اس وقت آٹھ تراویح کا اعلان فرمانا صاف بتاتا ہے کہ صحابہ بیس رکعت پر متفق نہیں تھے۔

اول تو یہ بات غلط ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعت پڑھنے کا حکم دیا' کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت آٹھ ہی ہے تو وہ بیس کا حکم کیسے دے سکتے تھے؟ اس کے علاوہ موطا امام مالک رحمہ اللہ میں جو کہ درجہ اول کی کتاب ہے' صراحتاً موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم الداری رضی اللہ عنہما کو گیارہ رکعتیں پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ عبارت یہ ہے : امر عمر ابی بن کعب وتمیم الداری ان یقوما للناس فی رمضان باحدی عشرۃ رکعۃ اور یہی وہ تعداد ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے۔

امام جوزی رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول نقل کرتے ہیں: انه قال الذی جمع علیه الناس عمر بن الخطاب احب الی وهو احدی عشرة رکعة وهی صلٰوة رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ولا ادری من این احدث هٰذا الرکوع الکثیر۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مجھے تو گیارہ رکعت ہی زیادہ پسند ہیں کیونکہ گیارہ رکعت پر ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا تھا۔ گیارہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود پڑھتے تھے۔ اس کے بعد امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا پتہ نہیں لوگوں نے یہ (۲۰ اور ۴۰ وغیرہ) بہت سی رکعتیں کہاں سے نکال لی ہیں' یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو ان کا کوئی ثبوت نہیں۔

ح -- مولانا مودودی صاحب نے تو اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس کا حکم دیا تھا اور اس پر تمام صحابہ نے اجماع کر لیا تھا۔

م -- یہ بالکل غلط ہے' بیس تراویح پر صحابہ کا اجماع کبھی بھی نہیں ہوا۔ اگر شک ہو تو ترمذی شریف اٹھا کر دیکھ لیں۔

اس کے علاوہ حدیث میں یہ صراحت بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تین رات جماعت کروائی ہے' وہ آٹھ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر تھے۔ چنانچہ ابن خزیمہ' ابن حبان' طبرانی' قیام اللیل اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: صلی بنا رسول الله صلی الله علیه وسلم فی شهر رمضان ثمان رکعات ثم اوتر۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں رمضان المبارک میں آٹھ رکعت تراویح اور وتر پڑھائے۔

ایک اور حدیث بھی ہے جس میں یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر کہا کہ اے اللہ کے رسول! آج رات اپنی سمجھ سے ہی میں نے ایک کام کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کیا؟ ابی رضی اللہ عنہ نے کہا گھر میں عورتیں کہنے لگیں کہ ہمیں قرآن یاد نہیں ہے' آج ہمیں تراویح ہی پڑھا دو' سو میں نے ان کو آٹھ رکعت پڑھا کر وتر پڑھا دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو رہے' گویا آپ نے پسند فرمایا۔ یہ روایت ابو یعلی' طبرانی اور قیام اللیل میں ہے۔

ح -- بات تو بڑی صاف ہے' پتہ نہیں پھر یہ اختلاف کیوں ہے؟

م -- صرف فرقہ پرستی کی وجہ سے۔

ح -- یہ تو بڑی بری بات ہے' مسئلہ میں ضد کیسی؟ اچھا کہیں بیس کا بھی ذکر آتا ہے یا

نہیں؟

م -- بیہقی اور ابن ابی شیبہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ رمضان شریف میں بیس تراویح اور وتر پڑھتے تھے' لیکن یہ روایت بالکل ضعیف ہے۔

ح -- حنفی بھی اسے ضعیف مانتے ہیں؟

م -- ہاں تمام حنفی علماء بھی اسے ضعیف مانتے ہیں۔ چنانچہ مولانا انور شاہ صاحب عرف الشذی میں لکھتے ہیں : واما النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فصح عنہ ثمان رکعات واما عشرون رکعۃ فھو عنہ علیہ السلام بسند ضعیف وعلی ضعفہ اتفاق۔ (ص-۳۰۹) رسول اللہ ﷺ سے تو آٹھ رکعت تراویح ہی ثابت ہیں' بیس رکعت والی حدیث تو ایسی ضعیف ہے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے۔

ح -- پھر یہ مولوی بیس لیتے کہاں سے ہیں؟

م -- وہ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ کی سنت تو آٹھ ہی ہے لیکن خلفاء کی سنت بیس ہے۔

ح -- کیا یہ صحیح ہے؟

م -- صحیح کیسے؟ آپ خود ہی سوچیں' یہ ہو سکتا ہے کہ خلفاء رسول ﷺ کی سنت کے مقابل اپنی سنت جاری کرتے؟

ح -- یہ تو نہیں ہو سکتا کہ رسول کریم ﷺ کی سنت اور ہو اور صحابہ کرام کی اور' لیکن آخر وہ کیسے کہتے ہیں کہ بیس خلفاء کی سنت ہے؟

م -- صرف ضعیف روایتوں کی بنا پر' گروہ بندی اسی لیے تو بری ہے کہ ایک اعلیٰ چیز چھوڑ کر ایک گھٹیا چیز لینی پڑتی ہے۔

موطا امام مالک میں جو درجہ اول کی کتاب ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گیارہ تراویح کا حکم موجود ہے' لیکن ہمارے بھائی اپنا مطلب نکالنے کے لیے موطا امام مالک کی روایت تو نہیں لیتے' حالانکہ وہ صحیح بھی ہے اور سنت نبوی کے مطابق بھی۔ بیہقی وغیرہ تیسرے درجے کی ضعیف روایات لیتے ہیں تاکہ اپنا مذہب ثابت ہو جائے۔

ح -- بیس تراویح پڑھنے کی کوئی صحیح روایت ہے ہی نہیں؟

م -- ابھی مولانا انور شاہ صاحب دیوبندی کے حوالہ سے بیان ہوا ہے کہ بیس رکعت نماز

تراویح کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔

رسول کریم ﷺ حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے بارے میں تو ایک بھی صحیح روایت نہیں ملتی کہ انہوں نے کبھی بیس پڑھی ہوں۔

ح -- اگر ان پانچ بڑوں سے بیس پڑھنا ثابت نہیں تو پھر تو بات ہی ختم' پھر تو بیس پڑھنی ہی نہیں چاہئیں۔

م -- نہیں' بیس پڑھنا منع' کیونکہ نفل ہیں' جتنے کوئی چاہے پڑھے' بات سنت ہونے کی ہے کہ آیا بیس سنت ہیں یا نہیں؟

ح -- کیا بیس سنت نہیں؟

م -- سنت تو وہ تعداد ہو سکتی ہے جو رسول کریم ﷺ نے خود پڑھی ہو' جب آنحضرت ﷺ کا بیس پڑھنا کسی صحیح روایت سے ثابت ہی نہیں تو بیس سنت کیسے؟

اس بات کو تو محقق حنفی علماء بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ بحرالرائق میں ہے: ان الدلیل یقتضی ان تکون السنة من العشرین ما فعله صلی الله علیه وسلم منها ثم ترکه خشیة ان تکتب علینا والباقی مستحب وقد ثبت ان ذالک کان احدٰی عشرة رکعة بالوتر کما ثبت فی الصحیحین من حدیث عائشة فاذن یکون المسنون منها علٰی اصول مشائخنا ثمانیة والمستحب اثنا عشر۔ دلیل کا تقاضا یہی ہے کہ بیس رکعات تراویح میں سے سنت اسی قدر ہوں جس قدر رسول اللہ ﷺ نے خود پڑھی ہوں' باقی رکعت مستحب ہوں اور یہ صحیحین کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے تراویح مع وتر گیارہ رکعت ہی پڑھی ہیں۔ اس تحقیق کے بعد یہ کہنا پڑے گا کہ آٹھ رکعت تو سنت ہیں' باقی مستحب۔ (بحرالرائق جلد۔۲' ص۔۷۲)

ح -- اگر سنت آٹھ ہی ہے تو پھر آٹھ سے زیادہ کیوں پڑھی جائیں؟

م -- سنت تو وہی ہے جو آنحضرت ﷺ نے خود پڑھیں لیکن جیسے عشاء کی دو سنتوں کے بعد نفل پڑھنا منع نہیں' ایسے ہی آٹھ رکعت سے زیادہ بطور نفل پڑھنا منع نہیں۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی اپنی کتاب تحفة الاخیار میں لکھتے ہیں: فان الزیادة علٰی مقادیر السنن جائزة اتفاقا لکن لا علٰی سبیل السنیة بل علٰی سبیل التطوع۔ سنتوں پر زیادتی بالاتفاق جائز ہے لیکن سنت کے طور پر نہیں بلکہ نفل کے طور پر۔

حاصل کلام یہ کہ اپنی طرف سے نوافل کی تعداد معین کرنا' پھر اس پر ہمیشگی کرنا اور اس سے کم وبیش پڑھنے والوں کو مورد طعن بنانا' یہ غلط ہے۔ مقلدین احناف کی بے انصافی اور سینہ زوری یہ ہے کہ وہ بیس کو سنت کہتے ہیں اور مقرر کر دیتے ہیں' حالانکہ صحیح چیز یہ ہے کہ بیس نہ سنت نبوی ہے نہ سنت خلفاء راشدین۔

ح — یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ بیس خلفاء کی سنت ہے۔

م — آپ سوچیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بیس تراویح سنت خلفاء ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تراویح میں سنت رسول کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ یہی سنت رسول بھی ہے' پھر سوال ہو گا کہ جب بیس سنت خلفاء بھی ہے اور سنت رسول بھی تو پھر اسے سنت خلفاء کیوں کہتے ہیں؟ سنت رسول کیوں نہیں کہتے؟ کیا سنت خلفاء' سنت رسول سے اہم ہے؟

کیا مسلمان رسول کی سنت کو ہلکا سمجھتے ہیں؟ اور خلفاء کی سنت کو زیادہ؟ جو بیس کو سنت خلفاء کہہ کر پڑھلیا جاتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ تراویح میں سنت رسول کوئی نہیں تو پھر سوال پیدا ہو گا کہ کیا رسول کریم ﷺ نے تراویح پڑھی نہیں۔ اگر کہا جائے کہ نہیں تو پھر خلفاء نے یہ تراویح کی بدعت کیوں جاری کی؟ انہوں نے یہ بیس کی تعداد کہاں سے لے لی؟

اگر کہا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے تراویح تو پڑھی تھیں۔ ہم کہیں گے تو پھر وہ کیوں نہیں پیش کی جاتیں جو آنحضرت ﷺ نے پڑھی تھیں' بیس کو کیوں پیش کیا جاتا ہے؟ آنحضرت ﷺ کی سنت ہوتے ہوئے پھر کسی اور کی سنت کی کیا ضرورت ہے؟

ح — تراویح کو خلفاء کی سنت اس لیے کہتے ہیں کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جاری کروائی تھیں۔

م — کون کہتا ہے کہ تراویح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جاری کروائی ہیں؟ تراویح خود سید الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ پڑھتے تھے اور لوگوں کو پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے بلکہ آپ نے تین رات تراویح کی جماعت بھی ادا کروائی ہے۔

ح — آنحضرت ﷺ نے صرف تین رات جماعت کرائی' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سارا مہینہ کرانے کا حکم دیا۔

م — اگرچہ آنحضرت ﷺ نے تین رات جماعت کرائی لیکن آپ سارا ماہ جماعت کرانے کے خلاف نہ تھے بلکہ چاہتے تھے کہ سارا ماہ جماعت ہو' صرف فرضیت کے خوف سے آپ

ایسا نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر کہ اب فرضیت کا خطرہ نہیں رہا' باقاعدہ جماعت شروع کرا دی۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا اجتہاد نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کی تکمیل تھی۔ لہٰذا سارا ماہ تراویح باجماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریری سنت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کرا کر اشارہ کر دیا تھا کہ تراویح باجماعت بھی ہو سکتی ہے۔ پھر جماعت چھوڑ کر یہ بھی بتا دیا کہ جماعت کوئی ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ کرام حضرت عمر وغیرہ رضی اللہ عنہم تراویح گھر پڑھتے تھے۔

ح -- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب جماعت باقاعدہ شروع کروائی تو شاید رکعتیں بھی بڑھا دی ہوں۔

م -- حضرت عمر رضی اللہ عنہ رکعتیں کیسے بڑھا سکتے تھے' جب ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا علم تھا' بلکہ موطا امام مالک میں صراحتاً موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو رمضان شریف میں گیارہ رکعتیں پڑھانے کا حکم دیا تھا اور یہ وہی تعداد ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود پڑھتے تھے۔

ح -- اگر بیس منع نہیں تو پھر بیس کا ثواب لازماً آٹھ سے زیادہ ہو گا' جو بیس پڑھتے ہیں وہ تو پھر اچھے ہوئے۔

م -- ثواب تو سنت کی پیروی میں ہے۔ جب سنت آٹھ ہے تو آٹھ کو ہی اچھی طرح پڑھنے میں زیادہ ثواب ہے۔ بیس پڑھنے والے اچھے کیسے؟ وقت تو وہ اتنا ہی لگاتے ہیں' جتنا آٹھ میں لگتا ہے' بلکہ اس سے بھی کم۔ رکعتیں جتنی زادہ ہوتی ہیں' نماز کا درجہ اتنا ہی گر جاتا ہے' کیونکہ اعتدال واطمینان کم ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے' آمین ثم آمین۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور

جلد ۲۰' شمارہ ۲۹' مورخہ یکم دسمبر سنہ ۱۹۶۷ء

مسئلہ تراویح

ایک بریلوی کے بیس سوالات اور ان کے چالیس جوابات

ایک پندرہ روزہ بریلوی اخبار بنام رضاء مصطفیٰ گوجرانوالہ سے شائع ہوتا ہے جس میں اکثر شرک وبدعت کی اشاعت ہوتی ہے۔ اس کا ایک شمارہ نمبر۔۲۴' جلد۔۹ کا میری نظر سے گزرا۔ اس کے ص۔۶ پر ایک مضمون بعنوان "آٹھ رکعات پر بیس سوالات" بندہ عارف حصاری کے مطالعہ میں آیا' جس کو غور سے پڑھا گیا۔ عنوان سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید یہ کوئی علمی اور دقیق سوالات ہوں گے جن کا جواب کوئی بہت بڑا محقق ہی دے سکے گا لیکن مضمون پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ سوالات نہایت ہی عامیانہ ہیں۔ بریلوی مقلد نے محض عصبیت کا شکار ہو کر یہ طومار کھڑا کیا ہے جو اہلحدیث اور حنفی مذہب کی کتابوں سے ناوانی اور کم فہمی پر مبنی ہے۔ علماء محققین نے بحکم اعرض عن الجاھلین ان سوالوں پر غالباً کوئی توجہ نہیں دی اور جواب جاہلاں باشد خاموشی پر عمل کیا لیکن بندہ نے مضمون پر غور کیا تو اخبار کے مدیر اور سائل کو اس سلسلہ میں بہت مغرور پایا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے عالم ہیں اور ہمارے یہ سوالات ایسے وزنی ہیں جن کا کوئی عالم اہلحدیث جواب ہی نہیں دے سکے گا۔ اس لیے راقم الحروف عارف حصاری ان کے اس تکبر کو چکنا چور کرنا چاہتا ہے۔ ناظرین اہل علم میرے جوابات کو بریلوی سوالات کے بالمقابل رکھ کر پڑھیں' انشاء اللہ العزیز بریلویت کا غرور ٹوٹ جائے گا۔

حباب بحر کو دیکھو کہ کیسے سر اٹھاتا ہے
تکبر وہ بری شے ہے کہ فوراً ٹوٹ جاتا ہے

سوال نمبر۔۱ : بیس رکعت تراویح پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب نمبر۔۱ : اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک محدثانہ' دوم فقیہانہ۔ محدثانہ جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے فعل سے تراویح کی تعداد بسند صحیح وحسن ثابت ہے' وہ سنت اور افضل ہے۔ باقی نفلی نماز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کی کوئی تحدید وتعیین نہیں ہے' جس سے جتنی ہو سکے پڑھ لے مگر اس کی تعیین سولہ' بیس یا چھتیس یا چالیس اس

طرح نہ کرے کہ اس تعداد کو شرعی حکم سنت موکدہ سمجھا جائے۔ اگر اس طرح سمجھ کر بیس تراویح پڑھے گا تو یہ بدعت ہے' کیونکہ بیس تراویح کا سنت مؤکدہ ہونا اور جماعت سے پڑھا جانا ثابت نہیں ہے۔ من ادعٰی فعلیہ البرھان۔

حدیث میں آیا ہے : الصلوۃ خیر موضوع فمن شاء استقل ومن شاء استکثر۔ (رواہ احمد والبزار وابن حبان فی صحیحہ کذا فی التلخیص ص۔۱۱۹) یعنی نماز نیکی ہے جو شخص چاہے زیادہ کرے اور جو شخص چاہے تھوڑی کرے۔ اختیاری بات ہے' جیسے مغرب سے پہلے نفلوں کی نماز' فرمایا کہ دو رکعت نفل پڑھ لو مگر جو چاہے کہ سنت نہ سمجھے۔

جو لوگ بیس تراویح سنت مؤکدہ اعتقاد رکھ کر پڑھتے ہیں اور اصل سنت نبوی یعنی آٹھ رکعت نماز تراویح کو برا جانتے ہیں' یہ سلسلہ بدعت ہے' اس سے بچنا ضروری ہے۔

جواب نمبر۔۲ : دوسرا جواب فقیہانہ ہے اور وہ یہ ہے کہ بحرالرائق جلد۔۲' ص۔۲۶ میں ہے : ان الدلیل یقتضی ان تکون السنۃ من العشرین ما فعلہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم منہا ثم ترکہ خشیۃ ان تکتب علینا والباقی مستحب قد ثبت ان ذالک کان احدی عشرۃ رکعتہ بالو ترکما ثبت فی الصحیحین من حدیث عائشۃ فاذن یکون المسنون علی اصول شائخنا ثمانیۃ منہا والمستحب اثنا عشر۔ یعنی دلیل شرعی کا اقتضاء یہ ہے کہ بیس تراویح جو مروج ہیں' ان میں سے سنت تو وہ رکعتیں ہیں جو نبی کریم ﷺ نے جماعت سے پڑھیں اور پھر فرضیت کے خوف سے چھوڑ دی تھیں' باقی نفل ہیں جن کا پڑھنا مستحب ہے۔ تحقیق دلیل شرعی سے یہ ثابت ہوا کہ گیارہ رکعت بمع وتر سنت ہیں جو صحیحین کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہیں۔ پس اس وقت ہمارے مشائخ فقہاء حنفیہ کے اصول کی بنا پر بیس میں سے آٹھ تو سنت نبوی ہیں اور بارہ نفلی ہیں۔ یہ فقہ حنفی کا بیان ہے۔

امام ابن الہمام' ابن نجیم' علامہ طحطاوی وغیرہ اکابر فقہا حنفیہ کا یہی فیصلہ ہے جن کے علم وفضل کے مقابلہ میں تمام دیوبندی وبریلوی اول سے آخر تک ایک پاسنگ کا بھی حکم نہیں رکھتے۔ پس ان کا فیصلہ تمام حنفی دنیا پر ناطق ہے۔ اب سائل کو اختیار ہے کہ محدثانہ فیصلہ کو منظور کرے یا فقیہانہ کو' اگر دونوں سے انکاری ہوا تو قصہ ختم۔

باقی ہم نے جو بیس کی تعیین کو بدعت کہا ہے' یہ حنفیہ کے مسلمہ اصول کی رو سے کہا

ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ غایة التنقیح ص۔۳۲ میں بحوالہ کفایة الشعبی یہ لکھا ہے جس کا ترجمہ نقل کرتا ہوں :

"امام جب دس ترویحے (بیس رکعات) دس سلام سے پورے کرلے' اس کے بعد گیارھواں ترویحہ یہ سمجھ کر شروع کرے کہ یہ دسواں ہی ہے لیکن پھر اس کو یاد آجائے کہ یہ زائد ہے تو امام اور مقتدی دونوں پر واجب ہے کہ نماز توڑ دیں اور الگ الگ ہر کو قضا کریں' کیونکہ صحابہ کرام نے بیس ہی رکعت پر اجماع کرلیا ہے' لہٰذا اب اس سے زیادہ پڑھنا بدعت ہے اور بدعت ضلالت ہے اور ضلالت کا انجام جہنم ہے۔"

پس اس حنفی اصول کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ آٹھ تراویح مسنون ہیں اور آٹھ پر ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو اماموں کو مقرر کرکے اجماع کرلیا۔ اس سے زیادہ نہ حدیث نبوی سے ثابت اور نہ خلفاء سے' تو اب ان کو سنت جان کر ہمیشہ جماعت سے پڑھنا بدعت ہے اور بدعت ضلالت ہے اور ضلالت کا انجام جہنم ہے۔

اگر تمام دنیا کے احناف جمع ہو جائیں تو بھی بیس رکعات تراویح کا سنت موکدہ ہونا صحیح سند سے ثابت نہیں کرسکتے۔ اخبار رضائے مصطفیٰ کے اسی شمارے میں جو بیس روایات پیش کی گئی ہیں' وہ سب ضعیف روایات کا سلسلہ ہے' ان میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس سے بیس تراویح کا مسنون ہونا ثابت ہو' پھر ان کا پیش کرنا ہی لغو فعل اور عوام کو فریب دہی ہے۔ اگر ہم ان پر فرداً فرداً بحث کرکے ان کو ھباءً منثورا کردیں تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔

جو حنفی المذہب ملا مولوی بیس رکعات کو سنت مؤکدہ کہتا ہے' وہ اپنے اکابر فقہا کی تکذیب و تجہیل کرتا ہے۔ ایسے گستاخ کو تعزیر لگانی چاہیے' جو شخص بیس رکعات کے حکم میں تفریق نہیں کرتا' سب کو ایک ہی حکم میں رکھتا ہے' وہ فقیہہ نہیں سفیہہ ہے۔

سوال نمبر۔۲ : اگر کوئی اہل حدیث بیس تراویح پڑھے ...... وہ گنہگار ہوگا یا نہیں؟ وہ اہل حدیث الخ

جواب نمبر۔۲ : جس صورت سے ہم نے اوپر لکھا ہے' اس صورت جواز سے اہل حدیث بھی کبھی پڑھ لے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر حنفیہ کو خوش کرنے کے لیے ایسا کرتا

ہے یا ان کا امام بن کر طمع مال سے ایسا کرتا ہے یا ہمیشہ اس کا بالتعین ایسا عمل ہے اور اس کو شرعی حکم اعتقاد رکھتا ہے تو وہ اہلحدیث نہیں ہے بلکہ مقلدین کی طرح کا بدعتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے اہلحدیث کو ہدایت کرے۔

سوال نمبر۔۳ : ایک اہلحدیث آٹھ تراویح پڑھے اور دوسرا بیس تراویح تو ثواب کس کو زیادہ ہو گا؟

جواب نمبر۔۳ : علامہ عینی عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری مصری جلد نمبر۔۵' ص۔۳۵ میں لکھتے ہیں : قد اختلف العلماء فی العدد المستحب فی قیام رمضان علی اقوال کثیرۃ فقیل احدی واربعین وقال الترمذی رای بعضھم ان یصلی احدی واربعین رکعۃ مع الوتر وھو قول اھل المدینۃ والعمل علی ھذا عندھم بالمدینۃ قال شیخنا رحمہ اللّٰہ وھو اکثر ما قیل فیہ قلت ذکر ابن عبدالبر فی الاستذکار عن الاسود بن یزید کان یصلی اربعین ویوتر بسبع۔ یعنی تراویح کے عدد مستحب میں علماء سلف کا اختلاف ہے۔ اس بارہ میں بہت سے اقوال وارد ہیں۔ ایک قول چالیس رکعت کا منقول ہے۔ امام ترمذی نے کہا کہ بعض نے کہا کہ اکتالیس رکعت پڑھنی چاہئیں۔ اہل مدینہ کا بھی یہی قول ہے اور مدینہ منورہ میں ان کا اسی پر عمل ہے اور ہمارے شیخ نے کہا اکثر نے بھی کہا ہے۔ علامہ عینی نے کہا کہ عبدالبر نے استذکار میں اسود بن یزید سے نقل کیا ہے کہ وہ بمعہ وتر سینتالیس رکعت پڑھتے تھے۔

اسی طرح علامہ عینی نے دوسرا قول اڑتیس رکعت کا سنایا ہے کہ امام محمد بن نصر نے ابن ایمن کے طریق سے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ مستحب یہ ہے کہ لوگ رمضان میں تراویح اڑتیس رکعت پڑھیں پھر امام اور سب لوگ سلام پھیر کر ایک رکعت وتر پڑھیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ زمانہ حرہ کے قبل ایک سو کئی برس سے اب تک اہل مدینہ کا اسی پر عمل چلا آتا ہے۔ (عمدۃ القاری) اسی طرح علامہ عینی نے چھتیس رکعت کا مذہب بھی نقل کیا ہے تو اب بریلوی علماء سے یہ الزاماً سوال ہے کہ ایک حنفی بریلوی شہر نبوی مدینہ منورہ کے تعامل کا احترام کرتا ہوا سینتالیس یا اکتالیس رکعت پڑھے اور دوسرا حنفی دیوبندی اہل کوفہ کے تعامل کی رُو سے جہاں روافض وخوارج کا زور رہا ہے' بیس تراویح پڑھے تو ثواب ان دونوں میں سے کس کو زیادہ ہو گا؟ ما ھو جوابکم فھو جوابنا۔ یعنی ؎

اس کا جواب جو کچھ دو گے ہمیں
ہماری طرف سے ہو گی مبارک تمہیں

یہ جواب تو الزامی ہے جس کو تم سر پیٹ کر کتنی بھی کوشش کرو' حل نہ کر سکو گے۔
اب تحقیقی جواب سنو کہ حدیث میں آیا ہے کہ دو شخص سفر میں نکلے تو ان کو نماز کا وقت آگیا لیکن پانی نہ ملا تو دونوں نے تیمم سے نماز اول وقت پڑھ لی اور چلتے ہوئے آگے چلے تو وقت کے اندر پانی مل گیا' تو ایک نے کہا کہ نماز دوبارہ پڑھ لینی چاہیے کہ پانی مل گیا ہے۔ دوسرے نے کہا میں نے تو نماز پڑھ لی ہے' وہ کافی ہے۔ تب ایک نے نماز دوبارہ پڑھ لی اور دوسرے نے تیمم والی نماز پر کفایت کی۔ جب سفر سے دونوں واپس آئے تو انہوں نے آنحضور ﷺ سے سب قصہ سنایا اور استصواب رائے کیا تو آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو جس نے نماز نہ لوٹائی تھی یہ فرمایا : اصبت السنة واجزاءک صلوتک۔ یعنی تو نے شرعی طریقہ پر عمل کیا' اصلی حکم یہی ہے' تیری نماز تجھے کافی ہے اور دوسرے کو یہ فرمایا : ولک الاجر مرتین۔ کہ تیرے لیے دوبارہ پڑھنے کا اجر ہے۔ ایک بار صلوٰة بالتیمم کا اور دوسرا صلوٰة بالوضو کا۔

ٹھیک اسی طرح جو شخص آٹھ رکعت پڑھتا ہے' اس کو کہا جائے گا : اصبت السنة واجزاءک صلوٰة رمضان کہ تو نے سنت نبوی پر عمل کیا' یہ قیام رمضان تجھے کافی ہے تو آنحضور ﷺ کا رفیق ہو گا کہ حدیث من احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنة ناطق ہے۔ یعنی سنت کا محب آنحضور ﷺ کا محب ہے اور آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میرا محب میرے ساتھ جنت میں ہو گا۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی نے تحفۃ الاخیار میں بحوالہ شرح منہاج سبکی سے نقل کیا ہے : قال الجوزی من اصحابنا عن مالک انه قال الذی جمع علیه الناس عمر بن الخطاب احب الی وهو احدی عشرة رکعة وهی صلوٰة رسول الله صلی الله علیه وسلم کذا فی المصابیح للسیوطی۔ یعنی امام جوزی نے امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ تراویح کی وہ تعداد جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا اور امام مقرر کر کے تعامل شروع کرایا' مجھے بہت محبوب ہے اور وہ گیارہ رکعت ہیں اور یہی وہ نماز ہے جس کو رمضان میں رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے۔

پس یہ اہلحدیث امام مالک رحمہ اللہ کی طرح جنت میں آنحضور ﷺ کا رفیق ہو گا اور دوسرے اہل حدیث سے یہ دریافت کیا جائے گا کہ تو نے بیس کا عمل ہمیشہ کے لیے ان کو سنت تصور کر کے بالتعیین اختیار کیا ہے یا بلا تعیین نفلی کے طور کبھی بیس اور کبھی اکتالیس کبھی سولہ بھی پڑھتا ہے؟ اگر اس نے شق اول اختیار کی تو ہم اس کو کہیں گے کہ تو اہل حدیث نہیں بلکہ اندرونی منافق حنفی خبیث ہے۔ اس مذہب سے توبہ کر اور خالص اہل حدیث بن جا اور اگر اس نے شق دوسری اختیار کی تو ہم کہہ دیں گے کہ اس کو نفلوں کا بھی اجر میسر ہے۔ اے سائل! ؎

ہر آنچہ خواہی جامہ ے پوش
من انداز قدت را میشناسم

مقلدین عہد حاضر نے بیس تراویح کی تعداد شرعاً مقرر کر کے اس طرح حد بندی مقرر کر رکھی ہے کہ لا يذيد على هذا ولا ينقص کہ نہ زیادہ ہو اور نہ اس سے کم ہو یہ بدعت ہے جو گمراہی ہے۔

سوال نمبر۔۴ : تراویح کے کیا معنی ہیں' شرعاً اس کا اطلاق کم از کم کتنی رکعت پر حقیقتاً ہو سکتا ہے؟

جواب نمبر۔۴ : تراویح جمع ترویحہ کی ہے جس کے معنی ایک بار آرام کرنے کے ہیں کہ ترویحہ راحت سے ہے۔ یہ لفظ شرعی نہیں' علماء کا اصطلاحی اور عرفی ہے کہ لوگ دو سلام کے بعد استراحت کرنے لگے تو اس صلوٰۃ رمضان کو تراویح کہنے لگے۔ یہ لفظ نہ قرآن میں آیا ہے اور نہ حدیث میں اور نہ اقوال صحابہ میں بلکہ بعد میں اصطلاح بنائی گئی ہے۔ حدیث میں اس کو قیام رمضان کہا گیا ہے۔ فتح الباری میں ہے : وذكرا النووى ان المراد بقيام رمضان صلوٰة التراويح' كذا فى شرح المسلم النووى۔ یعنی قیام رمضان سے مراد تراویح ہے اور یہ ترویحہ آٹھ رکعت میں اور تین وتروں کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ سنن کبریٰ بیہقی میں حدیث ہے' عطاء بن ابی رباح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ وہ آنحضور ﷺ کی صلوٰۃ اللیل کی کیفیت بیان فرماتی ہیں : يصلى اربع ركعات فى الليل ثم يتروح۔ یعنی نماز تہجد کی ہر چار رکعت کے بعد راحت فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح گیارہ رکعتوں کے تین ترویحوں کی بنا پر ان کو تراویح کہا جا سکتا ہے۔ اگر

کوئی اپنی بیس رکعات اختراعیہ کے ترویحلت کے برابر گیارہ رکعتوں کو تراویح نہ کہے تو اس کی مرضی ہے۔ تراویح نام شرعی نہیں ہے' شرعی نام قیام رمضان ہے۔ سو رمضان میں گیارہ رکعتوں کے ادا کرنے سے قیام رمضان کا اطلاق ان پر صحیح اور صادق ہے۔

امام بخاری وامام بیہقی وامام محمد وغیرہ محدثین نے قیام رمضان کے نام سے باب منعقد کئے ہیں اور ان کے تحت حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ قیام رمضان گیارہ رکعت ہے اور یہی مسنون ہے۔

سوال نمبر۔۵ : نماز تہجد کا وقت کیا ہے اور نماز تراویح کا کیا وقت ہے؟

جواب نمبر۔۵ : فتح الباری اور ارشاد الساری میں لکھا ہے : سميت الصلوة بالجماعة في ليالي رمضان التراويح لانهم اوائل ما اجتمعوا عليها كانوا يستريحون بين كل تسليمين۔ یعنی رمضان کی راتوں میں جو نماز جماعت سے پڑھی جاتی ہے' اس کا نام تراویح رکھا گیا ہے کیونکہ ابتداء میں جب لوگ اس نماز کو جماعت سے پڑھنے لگے تو دو تسلیم کے درمیان استراحت کرنے لگے۔

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ جماعت کے علاوہ اکیلے کوئی شخص قیام رمضان کرے تو اصطلاحاً اس کا نام تراویح نہ ہو گا' اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام رمضان تو ہمیشہ کیا ہے اور تراویح کے طور قیام رمضان صرف تین رات کیا ہے۔ ان تراویح کی تعداد علامہ عینی حنفی تین رات کا واقعہ ذکر کر کے گیارہ رکعت بمع وتر بتائی ہیں۔ (ملاحظہ ہو عمدۃ القاری شرح بخاری جلد۔۳' ص۔۵۹) اسی طرح فتح الباری جلد۔۱' ص۔۵۹۷ میں ہے' بوجہ اختصار عبارات نہیں لکھی گئیں' ہر دو محدثوں نے اس کے ثبوت میں ابن خزیمہ اور ابن حبان کی وہ حدیث پیش کی ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھائے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اس نماز کی جماعت کا اہتمام کیا تو انہوں نے قاریوں (ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما) کو گیارہ رکعت جماعت سے پڑھنے کا حکم فرمایا' ملاحظہ ہو موطا امام مالک وقیام اللیل ورسالہ مصابیح للسیوطی۔

اس سے حنفیہ کی اس ضعیف اور منکر روایت کا بھی رد ہو گیا جس کی یہ عبارت ہے :

عن ابن عباس ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يصلي في شهر رمضان في غير

جماعة عشرين ركعة والوتر۔ (رواہ البیھقی) یعنی نبی کریم ﷺ ماہ رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے' بغیر جماعت کے۔ یہ روایت اس قدر ضعیف ہے کہ اس کے ضعف پر تمام محدثین متفق ہیں۔ اس ضعیف روایت سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ بیس رکعت بغیر جماعت کے آنحضور ﷺ نے پڑھی ہیں تو یہ تراویح نہیں ہیں' کیونکہ تراویح کی تعریف میں جماعت سے پڑھنے کی قید ہے جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے' آنحضور ﷺ کا بیس تراویح بصورت جماعت پڑھنا کسی ضعیف روایت سے بھی ثابت نہیں ہے تو ان کو مسنون کہنا سراسر باطل اور ایمان کے منافی ہوا۔

باقی رہا یہ سوال کہ تراویح کا وقت کب سے کب تک ہے' اس کے لیے حنفیہ کی مشہور کتاب ہدایہ جس کو مثل قرآن ناسخ کتب کہا جاتا ہے' ملاحظہ کریں کہ مطبوعہ مصطفائی جلد-۱' ص-۱۳۱ میں یہ عبارت ہے : والاصح ان وقتها بعد العشاء الى آخر الليل۔ یعنی بہت صحیح بات یہ ہے کہ تراویح کا وقت عشاء کے بعد سے لے کر طلوع فجر تک ہے۔ درمختار مع رد المختار جلد-۱' ص-۴۷۳ میں یہ لکھا ہے : ووقتها بعد العشاء الى الفجر۔ یعنی تراویح کا وقت عشاء کے بعد سے لے کر صبح تک ہے۔ یہی محدثین نے لکھا ہے۔

پس جو اخبار رضائے مصطفیٰ کے ص-۵ پر یہ لکھا گیا ہے کہ جاننا چاہیے کہ نماز عشاء کے بعد ہونے سے پہلے رمضان شریف میں جو نماز پڑھی جائے' اسے تراویح کہتے ہیں۔ یہ تعریف سراسر غلط ہے اور حدیث کے خلاف ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے آخری عشرہ میں جو تین دن تراویح پڑھی تھیں' اس میں ایک دن عشاء کے بعد پڑھنے کا ذکر ہے اور دوسری بار وسط رات میں پڑھی ہیں' تیسری بار کے متعلق یہ لکھا ہے : فقام بنا حتى خشينا ان يفوتنا الفلاح۔ (الحدیث) یعنی تیسری بار ہم کو اتنی دیر تک تراویح پڑھائی کہ ہم کو سحری فوت ہونے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ (مشکوٰۃ)

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو دو اماموں کو تراویح پڑھانے پر مقرر کیا تھا اور وہ گیارہ رکعت پڑھاتے تھے' اس میں سائب بن یزید کا بیان ہے : فما كنا ننصرف الا فى فروع الفجر رواہ مالک (مشکوٰۃ) ان دو دلیلوں سے ثابت ہوا کہ تراویح کا وقت طلوع فجر تک ہے۔ پھر بریلوی کی غلط تعریف میں جماعت کی قید مذکور نہیں' حالانکہ تراویح میں جماعت کا ہونا شرط ہے۔ اگر کوئی اکیلے پڑھے گا تو وہ اصطلاحاً تراویح نہ ہو گی' بخلاف قیام رمضان کے کہ اس

میں جماعت شرط نہیں ہے' خواہ جماعت سے پڑھے یا اکیلے' دونوں صورتوں سے قیام رمضان حاصل ہو جائے گا۔ لیکن تراویح بغیر جماعت کے حاصل نہ ہو گی گو عرفاً اس کو تراویح کہتے ہیں' اصطلاحاً نہیں ہے کہ قیام رمضان تراویح سے اعم ہے۔

چونکہ نماز تہجد اور قیام رمضان ایک ہی ہیں' صرف ناموں کا فرق ہے اور یہ فرق بوجہ مختلف حالتوں کے ہے۔ نماز تہجد کا وقت بھی عشاء کے بعد سے لے کر فجر تک ہے' تہجد کا معنی بیداری بھی ہے اور نیند کا معنی بھی ہے کہ یہ لفظ اضداد سے ہے' جب تہجد کا معنی ترک خواب اور بیداری ہے اور اس کا وقت عشاء کے بعد سے طلوع فجر تک ہے تو عشاء کے بعد اگر کوئی شخص گیارہ رکعت سے قیام کر لے تو اس کو صلوٰۃ اللیل اور قیام اللیل اور نماز تہجد بھی کہا جائے گا۔ چنانچہ حدیث میں ہے : عن عائشة قالت كان النبی صلی اللہ علیه وسلم یصلی فیما بین ان یفرغ من صلوٰة العشاء الی الفجر احدی عشرة رکعة یسلم من کل رکعتین ویوتر بواحدة الحدیث۔ (متفق علیه) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ نبی ﷺ عشاءؒ کے بعد سے فجر تک میں گیارہ رکعت پڑھا کرتے اور ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیر کر وتر ایک رکعت پڑھا کرتے تھے۔

اس سے مقلدین کا بایں طور بھی رد ہو گیا کہ وہ ایک رکعت اکیلی پڑھنا گناہ سمجھتے ہیں' حالانکہ ایک رکعت پڑھنا وتر کا قولی اور فعلی احادیث سے ثابت ہے۔ بہرحال قیام رمضان اور تراویح اور تہجد کا وقت ایک ہی ہے اور نماز بھی ایک ہی ہے کہ رمضان میں دو نمازیں پڑھنا آنحضور ﷺ سے ثابت نہیں ہے' ان سب کی حقیقت ایک ہے صرف اعتباری فرق ہے۔ تہجد' تراویح اور قیام رمضان سے اعم ہے کہ وہ رمضان کے علاوہ دیگر مہینوں میں بھی پڑھا جاتا ہے اور ان کا ایک ہونا حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ سائل نے صلوٰۃ رمضان کا حال پوچھا کہ کتنی رکعتیں پڑھتے تھے تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے۔ سوال رمضان کی نماز کا ہوا تو غیر رمضان کا ذکر کر کے تمام نماز رات کی حقیقت ایک ہی بتا دی کہ وہ گیارہ رکعت ہی تھی' خواہ کوئی موسم ہو یعنی اگر وہ غیر رمضان میں ہو گی تو اس کے تین نام ہوں گے۔ صلوٰۃ اللیل' قیام اللیل اور صلوٰۃ الوتر۔

جب رمضان میں اس کا اہتمام جماعت سے ہوا تو اب اس کے کئی نام ہو گئے۔ قیام

رمضان' تراویح' قیام اللیل' صلوٰۃ اللیل' صلوٰۃ الوتر۔ اگر بغیر جماعت کے پڑھی تو پھر چار نام ہوں گے۔ قیام رمضان' صلوٰۃ اللیل' قیام' صلوٰۃ الوتر۔ اس کی مثال یوں ہے کہ نمازوں میں بارہ رکعت جو فرضوں کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں' ان کے شرعی اصطلاح میں تین نام ہیں۔ سنن رواتب' صلوٰۃ التطوع' صلوٰۃ نوافل۔ نماز ایک ہی ہے مگر مختلف اعتبار سے نام کئی ہیں۔ ایسی باتوں کو محدثین وفقہاء متقدمین نے احادیث پر محققانہ نظر فرما کر اخذ کیا ہے۔

سوال نمبر۔٦ : نماز تہجد کب شروع ہوئی اور نماز تراویح کب شروع ہوئی؟

جواب نمبر۔٦ : تہجد کا حکم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ومن اللیل فتھجد به (الآیة) یعنی "آپ رات کو تہجد پڑھیں" میں وارد ہے اور اسی کا نام قیام اللیل بھی ہے جس کا حکم سورہ مزمل میں آیا : یاایھا المزمل قم اللیل الا قلیلا (الآیة) یعنی "اے کپڑا اوڑھنے والے! سو رہنے کو چھوڑ کر تہجد کی نماز کے لیے قیام کر آدھی رات یا اس سے کم کر تھوڑا سا یا اس پر زیادہ کر اور قرآن کو اس میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔ یہ سورتیں مکی ہیں۔ تب آنحضور ﷺ اور جماعت مسلمین رات کو قیام کرنے لگے اور طول قیام سے بہت مشقت اٹھانے لگے۔ تب سورہ مزمل میں اس حالت کا ذکر فرمایا کہ تیرا رب خوب جانتا ہے کہ تو اور تیرے ساتھ کے لوگوں کی ایک جماعت قریب دو تہائی رات کے' کبھی آدھی رات کے اور تہائی رات تہجد پڑھتے ہیں' رات دن کا پورا اندازہ اللہ تعالیٰ کو ہے' وہ خوب جانتا ہے کہ تم اسے ہرگز نہ نباہ سکو گے پھر اس نے تم پر مہربانی کر دی کہ جتنی تم کو آسان ہو' اتنی نماز پڑھ لیا کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عکرمہ اور حسن اور قتادہ وغیرہ رحمھم اللہ کا بیان ہے کہ پہلے تہجد کی نماز فرض تھی پھر اس آیت کے آنے سے فرضیت منسوخ ہو گئی اور مسنونیت باقی رہ گئی۔ پھر آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں تشریف لائے تو سنہ۔۲ھ میں ماہ رمضان کے صیام فرض اور مقرر ہو گئے تو پھر وہی قیام اللیل قیام رمضان ہو گیا کیونکہ قیام اللیل کا وقت عشاء کے بعد سے لے کر فجر تک تھا۔ اس وقت میں سونا بھی تھا' سحری بھی کھانی تھی تو دو نمازیں تراویح اور تہجد پڑھنا امت محمدیہ پر بڑی مشقت تھی کہ وہ اتنا بار نہ اٹھا سکتی ہے جیسا کہ اللہ مہربان نے خود فرمایا لن تحصوہ کہ تم اتنا قیام ہرگز نہ نباہ سکو گے' تب تین رات آنحضرت ﷺ نے قیام فرما کر اس قیام کا اول' اوسط' آخر وقت ظاہر کر دیا اور ان راتوں میں ایک ہی نماز پڑھی اور پڑھ کر بتا دی کہ یہی قیام اللیل ہے اور یہی قیام

رمضان ہے۔

اگر دو الگ الگ ہوتیں تو آنحضور ﷺ دو نمازوں کو الگ الگ پڑھ کر بتا دیتے کہ دو نمازیں علیحدہ علیحدہ ہیں اور نہ صحابہ کرام نے تراویح اور تہجد کے نام سے دو الگ نمازیں پڑھیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب تراویح کا اہتمام فرمایا تو ایک دن لوگوں کو پڑھتے دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا : والتی تنامون عنها افضل من التی تقومون یرید آخر اللیل وکان الناس یقومون اولہ۔ یعنی یہ لوگ آخر رات میں قیام کرتے تو افضل تھا۔ اور وہ لوگ اول رات میں قیام کرتے تھے۔ دونوں نمازوں کے ایک ہونے پر یہ بھی قوی دلیل ہے کہ وتر نماز تہجد کے آخر میں تھا' قیام رمضان میں وتر اس کے آخر میں ہو گیا کیونکہ تہجد کی نماز الگ نہ تھی اور نہ اس کے آخر میں وتر رہتا۔ جیسے نماز ظہر دلوک شمس سے وقت عصر تک ادا کی جاتی ہے۔ جب جمعہ فرض ہوا تو ظہر جمعہ میں داخل ہو گئی۔ جمعہ کے دن ظہر الگ پڑھنے کا حکم نہیں کہ جمعہ ہی کافی ہو گیا۔ ٹھیک اسی طرح رمضان کے آنے پر قیام اللیل ہی قیام رمضان بن گیا۔ دو الگ الگ نمازیں پڑھنے کا حکم نہیں ہے۔ پھر قیام اللیل' صلوٰۃ اللیل' قیام رمضان' صلوٰۃ الوتر' تراویح ایک ہی نماز ہونے کی یہ قوی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تین دن تراویح پڑھا کر یہ عذر داری فرما دی : ولکنی تخوفت ان یفرض علیکم۔ (قیام اللیل ص۔۸۹) یعنی میں نے اس خوف سے پھر تراویح نہ پڑھائی کہ کہیں تم پر فرض نہ کی جائے۔

قیام اللیل ص۔۱۴ میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ماہ رمضان ہم کو آنحضور ﷺ نے آٹھ تراویح اور وتر پڑھائے پھر ہم آپ کے منتظر رہے کہ آپ مسجد میں تشریف لا کر ہم کو تراویح کی نماز پڑھائیں گے لیکن صبح تک نہ آئے۔ صبح کے وقت آئے تو یہ معذرت فرمائی : خشیت ان یکتب علیکم الوتر۔ کہ میں اس اندیشہ سے نہ آیا کہ کہیں تم پر وتر کی نماز فرض نہ ہو جائے۔ مسلم میں ہے : خشیت ان تفرض علیکم صلوۃ اللیل فتعجزوا عنها۔ یعنی میں ڈرتا ہوں کہ تم پر رات کی نماز فرض نہ کی جائے جس کے ادا کرنے سے تم عاجز ہو جاؤ۔ مسلم کے دوسرے طریق میں ہے کہ ذالک فی رمضان کہ یہ بات آپ نے رمضان میں کہی۔

طحاوی جلد۔۱' ص۔۲۰۶ میں ہے : خشیت ان یکتب علیکم قیام اللیل ولو کتب

علیکم ما قمتم به فصلوا ایها الناس فی بیوتکم الحدیث۔ یعنی چوتھی رات کو میں اس لیے تراویح کے لیے نہیں آیا کہ رات کا قیام تم پر فرض نہ ہو جائے' اگر فرض کیا گیا تو تم نباہ نہ سکو گے۔ اے لوگو! اب تم اس نماز کو اپنے گھروں میں پڑھ لیا کرو۔ یہ واقعہ ایک ہی ہے تو قیام رمضان پر قیام اللیل اور صلوٰۃ اللیل اور وتر کا اطلاق آگیا چونکہ قیام رمضان عرفا تراویح کو کہتے ہیں' خصوصا جبکہ جماعت سے پڑھی گئی ہے تو ان سب ناموں کا اطلاق ایک ہی نماز پر پایا گیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ نماز تہجد اور تراویح ایک ہی چیز ہے' نام کئی ہیں۔

سوال نمبر۔۷ : نماز تہجد رمضان وغیر رمضان میں ہے یا نہیں؟

جواب نمبر۔۷ : حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ ظاہر ہے کہ غیر رمضان میں جو نماز بصورت تہجد ہے' وہی رمضان میں قیام رمضان ہے۔ مختلف حالتوں کی وجہ سے نام دو ہیں' شے ایک ہے۔ دیوبند کے بہت بڑے محدث مولانا انور شاہ مرحوم جو شہرہ آفاق تھے' جن کی نظیر بلحاظ علم وتفقہ بریلوی فرقہ کے اولین وآخرین میں نہیں پائی جاتی' وہ باوجود حنفی المذہب ہونے کے دیوبندی وبریلوی تحقیقات پر پانی پھیرتے ہوئے اہلحدیث کے حق میں یوں بیان دیتے ہیں : قال عامة العلماء ان التراویح وصلوٰة الیل نوعان مختلفان والمختار عندی انهما واحد وان اختلف صفتاهما۔ (فیض الباری جلد۔۲' ص۔۴۲۰) یعنی عام علماء کا یہ خیال ہے کہ تہجد اور تراویح دو علیحدہ علیحدہ قسمیں ہیں مگر میرے نزدیک جو پسندیدہ تحقیق ہے' وہ یہ ہے کہ تہجد اور تراویح ایک ہی شے ہیں۔ اگرچہ ان کی حالتیں مختلف ہیں۔ یعنی اگر رمضان میں عشاء کے بعد جماعت سے گیارہ رکعتوں کو پڑھا تو یہ تراویح کہلائی' اگر عشاء کے بعد سو گیا تو پھر بغیر جماعت کے رمضان میں آخر رات میں گیارہ رکعت پڑھیں تو اس کا نام تہجد ہے اور اس کو قیام رمضان بھی کہا جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما دو اماموں کو مدینہ منورہ میں ان کو گیارہ تراویح مع وتر پڑھانے پر مقرر فرمایا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں : هذا موافق لحدیث عائشة کہ یہ تقرری فاروقی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے موافق ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک صلوٰۃ اللیل اور صلوٰۃ التراویح ایک ہی ہیں۔ فتدبروا ولا تکونوا من الجاهلین والمعاندین۔

سوال نمبر۔۸ : نماز تراویح صرف رمضان میں ہے یا نہیں؟

جواب نمبر۔۸ : وہی صلوٰۃ اللیل جب رمضان میں جماعت سے پڑھی گئی تو اس کا نام تراویح ہے' یہی صلوٰۃ اللیل غیر رمضان میں سو کر اکیلے پڑھی گئی تو اس کا نام تہجد ہے۔ بہرحال نام صلوٰۃ اللیل ہے اور اس کو قیام اللیل بھی کہا جاتا ہے۔ جب اس کی حالت مختلف ہو تو نام مختلف ہو جاتے ہیں مگر رکعات کی تعداد بہرکیف گیارہ ہی رہتی ہے۔ رمضان میں آخر رات پڑھنا افضل ہے' فتذکر!

سوال نمبر۔۹ : ہند کے اہلحدیث کہلانے والوں کے پیشوا مولوی نذیر حسین دہلوی ایک ختم قرآن تراویح میں اور ایک ختم نماز تہجد میں سنتے تھے؟

جواب نمبر۔۹ : اس واقعہ کا ثبوت پیش کریں' ورنہ جھوٹ متصور ہو گا۔ سنی سنائی بات مقابلے کے وقت کافی نہیں ہوتی' کفي بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع۔ آدمی کے لیے یہی جھوٹ کافی ہے کہ وہ سنی سنائی باتیں بغیر ثبوت کے بیان کرتا ہے۔ فتاویٰ نذیریہ جلد اول کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ تراویح اور نماز تہجد ایک ہی شے ہیں۔ البتہ حنفیہ کی کتابوں میں ایک صورت ختم قرآن کی تراویح میں لکھی ہے جو سراسر بدعت اور تمام رمضان میں نماز تراویح کا بیڑا غرق کرنے والی ہے۔ وہ آپ سنئے کہ کیسی عجیب ہے۔

ینوع الحکم حاشیہ عین العلم ص۔۹۸ میں ہے : ويختم (اى القرآن) فيه ولو ختم التراويح في ليلة ثم لم يصل التراويح جاز بلا كراهة لانه ما شرع التراويح الا للقراءة كما في المحيط وكذا في جامع الرموز۔ یعنی تراویح میں قرآن ختم کرنا چاہیے' اگر کسی نے ایک ہی رات میں قرآن نماز تراویح میں ختم کر دیا' پھر اس نے تمام رمضان تراویح نہ پڑھی تو یہ بلا کراہت جائز ہے' کیونکہ تراویح ختم قرآن ہی کے لیے مشروع ہوئی ہے۔

تحفۃ الاخیار ص۔۵۲ میں مولانا عبدالحی لکھنوی نے بھی یہ مسئلہ ختم قرآن کا لکھا ہے مگر یہ بدعت ہے' کیونکہ اس طرح تراویح میں قرآن ختم کرنا نہ کسی حدیث سے ثابت ہے اور نہ سلف صالحین کا تعامل اس طرح پایا گیا ہے' یہ فقہی قیاس کی بدعت ہے۔ اب سائل کو یہ مصرع بار بار پڑھنا چاہیے جس طرح مولود میں نعت گا کر پڑھتے ہیں :

ہم الزام ان کو دیتے تھے' قصور اپنا نکل آیا

سوال نمبر۔۱۰ : صحاح ستہ یا دیگر کتب حدیث میں کیا کوئی حدیث صحیح الاسناد بالاتفاق صریح الدلالت مرفوع متصل ہے' جس کا یہ مضمون ہو کہ حضور نبی کریم ﷺ نے رمضان

میں آٹھ تراویح پڑھی ہیں؟

جواب نمبر۔۱۰ : وہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے جو قطعی الصحت اور قطعی الدلالت ہے کہ صلوٰۃ رمضان جس کو قیام رمضان اور تراویح سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ غیر رمضان میں محض تہجد کہلاتا ہے وہ گیارہ رکعت ہے' اس پر تمام محدثین اور علماء حدیث متفق ہیں اور اکابر فقہاء حنفیہ بھی یہ جانتے ہیں جیسے ابن الہمام' ابن نجیم مصری' طحطاوی سے منقول ہو چکا ہے بلکہ ابن نجیم مصری نے تو یہ لکھ دیا ہے کہ فاذن یکون المسنون علی اصول مشائخنا معها۔ یعنی ہمارے مشائخ حنفیہ کے اصول کی رُو سے بیس میں سے آٹھ مسنون ہیں' باقی زائد نفل ہیں۔ لفظ مشائخ صیغہ جمع کا ہے جس میں اکابر فقہاء حنفیہ سب داخل ہیں۔ ان کے مقابلے میں اختلاف کرنے والے ہیچ ہیں جو کالعدم ہیں جن کے علم وفضل کے مقابلے میں باقی پاسنگ بھی نہیں تو حدیث صحیح صریح ہے اور طرفین کے اکابر علماء کا اس پر اتفاق ہے' اصاغر کا اعتبار نہیں ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ اکابر حنفیہ سے ہیں' وہ قیام رمضان کا باب منعقد کر کے پھر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کو ذکر کرتے ہیں' جس سے صاف ظاہر ہوا کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا قیام رمضان کو محیط ہے۔ جس کا نام جماعتی پابندی سے تراویح ہوا۔ امام مالک رحمہ اللہ جو امام محمد رحمہ اللہ کے شیخ الحدیث ہیں' یہی فرماتے ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے سنن کبریٰ میں قیام رمضان کا باب منعقد کیا ہے تو حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کے تحت ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس حدیث سے قیام رمضان کی تعداد رکعت ثابت ہوتی ہے۔ امام الدنیا فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں قیام رمضان کا باب منعقد کیا ہے تو حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے استدلال کر کے اپنے دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔ اسی طرح علامہ زرقانی نے علامہ سلیمان الباجی مالکی سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے رکعات تراویح کی تعداد گیارہ ثابت ہے۔ امام زیلعی رحمہ اللہ نے بھی نصب الرایۃ میں حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے تراویح مراد لی ہے۔ ملا علی قاری حنفی نے بھی مرقاۃ میں یہی لکھا ہے۔

علامہ رئیس المحدثین حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے عدد رکعات تراویح گیارہ کا ثبوت دیا ہے۔ علامہ قسطلانی اور امام سیوطی' شافعی نے بھی اس کو عدد رکعات تراویح پر محمول کیا ہے۔ علامہ عینی حنفی نے بھی شرح عمدۃ القاری میں یہی لکھا

ہے۔ مجمع الزوائد کے مؤلف ابوبکر بن سلیمان الہیثمی قیام رمضان والتراویح کا عنوان لکھ کر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے دلیل لاتے ہیں۔ اسی طرح علامہ شوکانی' امام امیر یمانی' علامہ عبدالحی لکھنوی روایت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عدد گیارہ تراویح پر استدلال کرتے ہیں۔ اسی طرح دیگر محدثین اور فقہاء کی شہادتیں موجود ہیں۔ مذاہب اربعہ کے علماء اور علماء اہلحدیث باتفاق رائے یہ کہتے ہیں کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا مع وتر گیارہ تراویح پر ناطق ہے' پھر حدیث جابر رضی اللہ عنہ جس کی سند حسن ہے' وہ بھی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کی مصدق ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صلوٰۃ رمضان کی تعداد سائل کے سوال پر بتائی اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو آٹھ رکعت تراویح اور وتر پڑھائے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے گیارہ تراویح مع وتر پر دو امام مقرر فرمائے اور حضرت مولانا شیخ عبدالحق رحمہ اللہ محدث دہلوی نے اپنے رسالہ ما ثبت بالسنۃ میں لکھا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں بعض سلف گیارہ رکعت پڑھتے تھے۔ قصد التشبیہ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ص-۲۱۷) یعنی ان کا ارادہ یہ تھا کہ ہماری تراویح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو جائے اور امام مالک رحمہ اللہ نے بھی فرمایا کہ مجھے یہ گیارہ ہی زیادہ محبوب ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہیں۔ جب تمام اکابر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے تراویح پر دلیل لیتے ہیں تو اتفاق پایا گیا' اب اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

سوال نمبر-۱۱ : حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان مبارک میں کتنی شب "تراویح" پڑھی ہیں' جس حدیث میں اس کا ذکر ہے' اس میں تعداد رکعت بیان کی ہے یا نہیں؟

جواب نمبر-۱۱ : علامہ عینی نے عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تین رات تراویح پڑھائی تھی' اس کی تعداد گیارہ رکعت مع وتر تھی۔ عبارت یہ ہے : فان قلت لم یبین فی الروایات المذکورۃ عدد الصلوٰۃ التی صلاھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی تلک اللیالی قلت روی ابن خزیمۃ وابن حبان من حدیث جابر قال صلّٰی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان ثمان رکعات ثم اوتر۔ یعنی اگر تو یہ کہے کہ جن راتوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح پڑھی تھیں' ان کی رکعتوں کی تعداد کیوں بیان نہیں ہوئی تو میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث

روایت کی ہے کہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم کو جو رمضان میں آنحضور ﷺ نے نماز پڑھائی تھی' وہ آٹھ رکعت تھی پھر وتر پڑھائے تھے۔

اسی طرح یہ حدیث فتح الباری میں رئیس الناقدین امام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ہم کو آنحضور ﷺ نے آٹھ تراویح اور وتر پڑھائے تھے۔ ابن حجر اور علامہ عینی حنفی نے اس روایت کو آٹھ رکعت تراویح کے ثبوت میں پیش کیا ہے اور اس پر کوئی جرح نہیں کی۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث صحیح یا حسن ہے اور امام خزیمہ اور امام ابن حبان نے یہ التزام کیا ہے کہ ہم اپنی کتابوں میں صحیح روایات ذکر کریں گے' جیسا کہ کتب اصول میں یہ لکھا ہے : فانه يخرج في الصحيح ما كان راويه ثقة غير مدلس سمع من شيخه وسمع منه الاخذ عنه ولا يكون هناك ارسال ولا انقطاع (الٰی قوله) فالحاصل ان ابن حبان وفى بالتزام شروطا ولم يوف الحاكم۔ (تدریب الراوی ص-۵۳) یعنی امام ابن حبان اپنی صحیح میں وہ روایت تخریج کرتے ہیں جس کا راوی ثقہ ہو مدلس نہ ہو اور اس نے اپنے شیخ سے اس روایت کو سنا ہو۔ اسی طرح اس سے اس روایت کے لینے والے نے بھی سنا ہو اور اسناد میں ارسال اور انقطاع نہ ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ امام ابن حبان نے جو شروط صحت روایت کے مقرر کئے ہیں' ان کو پورے طور پر نبھایا اور امام حاکم سے ایسا نہ ہو سکا۔ نیز ص-۵۴ میں ابن خزیمہ کی بابت یہ لکھا ہے کہ صحيح ابن خزيمة اعلٰى مرتبة من صحيح ابن حبان۔ یعنی صحیح ابن خزیمہ ابن حبان کی صحیح سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ اور امام ذہبی جو راویوں کی تنقید میں مہارت تامہ رکھتے ہیں' حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل فرما کر لکھتے ہیں کہ اسناده وسط کہ اس حدیث کی سند درمیانے درجے کی ہے۔

امام مروزی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے باسنادہ ان تین راتوں کی تراویح کا قصہ نقل کیا ہے' اس میں یہ الفاظ صریح ہیں کہ رمضان کی ان راتوں میں' آنحضور ﷺ نے ہم کو آٹھ رکعت اور وتر پڑھائے تھے۔ ملا علی قاری نے قیام اللیل مرقاۃ ص-۱۷۴ جلد-۲ میں صاف یہ لکھا ہے : فانه صح عنه انه صلى بهم ثمان ركعة والوتر۔ یعنی یہ صحیح روایت سے ثابت ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو آٹھ تراویح اور وتر پڑھائے تھے۔

مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے تحفۃ الاخیار میں ان تین راتوں میں آٹھ تراویح کا پڑھنا نقل

کر کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بیس رکعت والی کی تصدیق کی ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث سے استدلال کیا ہے' ملاحظہ ہو ان کا رسالہ المصابیح ص ۱۱' اور امام زیلعی حنفی نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے اور حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اس کی مشتیبان ہے تو سائل کا مطالبہ پورا ہو گیا ہے۔ اب اگر نہ مانیں تو ان کی بدقسمتی!؎

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

حدیث جابر رضی اللہ عنہ کے بعض راویوں پر بعض محدثین کی جرح نقل کر کے مقلدین اس حدیث کی تکذیب کرتے ہیں جو انصاف کے سراسر خلاف ہے کیونکہ نفس جرح سے تو صحیحین کے بعض راوی بھی خالی نہیں ہیں لیکن جرح کے اصول ہیں جو جرح غیر مفسر ہو جس کو مبہم کہتے ہیں' ناقابل قبول ہے۔ اسی طرح کسی راوی کی بعض محدثین نے توثیق کی ہو اور جارحین میں غلو و تشدد پایا جاتا ہو تو ایسی جرح مردود ہوتی ہے۔ حدیث جابر رضی اللہ عنہ کے راویوں کی جرح مردود کی قسم سے ہے۔ اگر کوئی جرح نقل کر کے اعتراض کرے گا تو ہم اس کے دانت کھٹے کر دیں گے' انشاء اللہ۔ اگر نفس جرح کسی راوی کو مردود کر دیتی ہے اور ہر راوی' حدیث کی سند میں بلاتفاق ثقہ ہونا شرط ہے تو پھر تمام حنفی مذہب کے ائمہ' ابو حنیفہ' ابو یوسف' محمد وغیرہ مجروح ہیں' جن پر محدثین نے ایسی جرحیں کی ہیں کہ وہ کسی صورت لائق اعتبار نہیں رہتے۔ ہم اگر حدیث جابر رضی اللہ عنہ کو کسی راوی کی جرح کی وجہ سے چھوڑ دیں تو ہمارے مسلک کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو محدثین کی جرح کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا تو حنفی مذہب کا بالکل صفایا ہو جائے گا کیونکہ حنفی مذہب کا دارومدار امام ابو حنیفہ کوفی رحمۃ اللہ علیہ پر ہے جو محدثین کے نزدیک مجروح ہیں۔ یہ یاد رہے کہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ کی سند میں کوئی ایسا راوی نہیں ہے جو بلاتفاق ضعیف ہو' ہاں بیس تراویح والی روایت میں بعض راوی ایسے ہیں جو بلاتفاق ضعیف ہیں۔

اچھا اگر تسلیم کر لیا جائے کہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ ضعیف ہے جب بھی اصولی طور پر ہمارے مسلک کو کچھ ہرج نہیں پہنچتا' کیونکہ یہ تو مسلم امر بین الفریقین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تراویح صرف تین دن رمضان کے آخری عشرہ میں پڑھا کر پھر فرضیت کے خوف سے

چھوڑ دی تھیں' اب قابل غور یہ بات ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تین دن جو تراویح پڑھائی' وہ کتنی رکعت تھی؟ اس میں دو احتمال ہو سکتے ہیں کہ آٹھ تھیں یا بیس؟ کیونکہ تیسرے عدد پر کوئی روایت صحیح یا ضعیف ناطق نہیں ہے۔ جب دو احتمال قائم رہے تو ان میں سے ایک احتمال بیس والا تو قابل قبول نہیں ہے' کیونکہ بیس رکعت والی حدیث میں یہ صراحت ہے کہ وہ بغیر جماعت کے پڑھی تھیں یا کوئی ایسی روایت ہے جس میں جماعت کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس کے خلاف حدیث جابر رضی اللہ عنہ میں صاف ذکر ہے کہ ان تین دنوں میں آنحضرت ﷺ نے ہم کو آٹھ رکعت پڑھائی تھیں۔ بیس والی روایت میں دو نقص ہیں' ایک یہ کہ وہ بالاتفاق ضعیف ہے' دوم اس میں تین دن جماعت کرانے کا اور بیس رکعت جماعت سے پڑھنے اور پڑھانے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور آٹھ کی روایت جابر رضی اللہ عنہ میں صرف یہ بات ہے کہ اس کے ایک راوی پر بعض المحدثین نے جرح کی ہے' سو اس کا کوئی حرج نہیں کیونکہ کسی مسئلہ یا حدیث میں کسی واقعہ میں دو احتمال ہوں پھر ان میں سے ایک احتمال پر حدیث ناطق ہو جائے خواہ وہ ضعیف ہو تو اس احتمال کی تعیین کرنی ضروری ہے۔ پھر حدیث جابر رضی اللہ عنہ کی تقویت دو دلیلوں سے ہو چکی ہے' ایک حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ آنحضرت ﷺ رات کی نماز رمضان اور غیر رمضان میں مع وتر گیارہ سے زیادہ نہ پڑھتے تھے۔ دوسری دلیل حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا حکم ہے کہ انہوں نے دو اماموں کو یہ حکم دیا تھا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھائیں' ملاحظہ ہو موطا امام مالک و رسالہ مصابیح للسیوطی وغیرہ۔

اور یہ جو بعض روایتوں میں ذکر ہے کہ بیس تراویح عہد فاروقی میں پڑھائی جاتی تھیں یا حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کا حکم دیا تھا وہ سب منقطع یا ضعیف قسم مردود سے ہیں۔ نیز کسی زمانے میں کسی کا عمل ہو تو وہ نہ خلیفہ کا حکم متصور ہو سکتا ہے اور نہ فعل' یہ ذرا سوچنے کی بات ہے اس کو بار بار سوچئے!

سوال نمبر۔۱۲ : پورے رمضان میں تراویح پڑھنا یہ کس کی سنت فعلی ہے؟ صحابہ کی سنت پر عمل کرنا سنت ہے یا نہیں؟

جواب نمبر۔۱۲ : حدیث عائشہ وحدیث جابر و حکم عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے گیارہ عدد تراویح مع وتر باتفاق رائے محدثین وفقہاء سنت قرار پا چکی ہیں : کما ھو بیانہ۔ اب اس کے مقابلے میں کسی کا فعل سنت نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا تمام رمضان میں تراویح جماعت سے

پڑھنا' یہ سنت نہیں مستحب ہے کہ اس کی فضیلت آئی ہے بلکہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو نعمت البدعۃ فرمایا' سنت نہیں فرمایا اور یہ فرمایا کہ آخر رات میں پڑھنا افضل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بھی آخر رات میں اکیلے پڑھتے تھے۔ یہی سنت نبوی اور سنت صدیقی رضی اللہ عنہ ہے کہ قیام رمضان آخر رات گھر میں کیا جائے۔

طحاوی جلد۔۱' ص۔۲۴۱ میں ہے کہ مسئلہ حج پر ایک اصول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا ہے کہ فسنة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم احق ان یوخذ بها من سنة عمر یعنی سنت نبوی زیادہ حقدار ہے کہ سنت عمر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں اس کو قبول کیا جائے۔ امام طحاوی حنفی نے طحاوی شرح معانی الآثار جلد۔۱' ص۔۲۰۶ میں ماہ رمضان میں قیام کرنے پر باب منعقد کیا ہے تو اس میں یہ بھی لکھا ہے : هل هو فی المنازل افضل ام مع الامام یعنی قیام رمضان گھروں مین افضل ہے یا امام کے ساتھ جماعت سے؟ پھر امام طحاوی نے گھروں میں اکیلے پڑھنا افضل قرار دیا ہے اور اس پر بہت دلائل پیش کیے ہیں۔ پھر بحث کے بعد آخر میں یہ فیصلہ دیا ہے : هذه الاثار کلهم یفضل صلٰوة وحده فی شهر رمضان علی صلوته مع الامام وذالک هو الصواب۔ یعنی "یہ کل احادیث اور اقوال فضیلت دیتے ہیں رمضان میں اکیلے اکیلے پڑھنے کو' اس تراویح پر جو امام کے ساتھ جماعت میں پڑھی جاتی ہے' یہی مسلک درست ہے۔"

اب بریلوی سائل کی مرضی ہے کہ اپنے بھائی کی تائید کریں یا تردید کردیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں جو تعامل رہا' وہ مسلک طحاوی کا موید ہے' فتذکر۔

سوال نمبر۔۱۴۳ : بخاری مسلم بلکہ صحاح ستہ میں تہجد کی نماز کی کتنی رکعت مذکور ہیں؟ ہمیشہ آٹھ رکعت یا کم یا زیادہ؟ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات میں کتنی رکعت کا بیان ہے؟

جواب نمبر۔۱۴۳ : تہجد کی صورت میں اول عمر اور آخر عمر اور دیگر ضروریات کے پیش نظر تہجد کی رکعتوں میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ کم از کم سات اور زیادہ سے زیادہ تیرہ رکعت مروی ہیں مگر عمر میں اکثر اور اغلب عمل گیارہ رکعت کا رہا ہے' خصوصاً رمضان میں تو یہی قیام رہا۔ اس لیے رمضان کی رکعت سائل نے پوچھی تو گیارہ رکعت بتائی اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بھی تین رات کا تعامل گیارہ ہی بتایا اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اکثری عمل کو

اپنایا اور وہ گیارہ عدد ہے۔

سوال نمبر۔۱۴ : صحاح ستہ میں کسی کتاب میں اکثر اہل علم اور صحابہ' تابعین کا تراویح کے متعلق کیا عمل تھا؟ بیس رکعت یا کم یا زیادہ؟ حضرت شیخ المحدثین شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر جمہور امت کا کیا عمل بتایا ہے؟

جواب نمبر۔۱۴ : جمہوریت ہر زمانے کی مختلف رہی ہے۔ عہد نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب صحابہ کا تعامل گیارہ رکعت پر ہوا' اور پھر یہی تعامل بوجہ نبوی تعامل کے عہد صدیقی رضی اللہ عنہ اور ابتداء عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں رہا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو اماموں کو گیارہ عدد پر مقرر کیا تو اس پر جمہوریت قائم ہو گئی۔ گیارہ رکعت کی قرآت میں طوالت کی وجہ سے اکتاہٹ ہونے لگی تب لوگوں نے رکعتیں بڑھانی شروع کر دیں۔ گیارہ سے اکتالیس تک بلکہ اس سے بھی کم وبیش لوگوں نے بطور نفل قیام رمضان کیا اور تراویح کی رکعتوں میں اختلاف ہو گیا۔ جب اختلاف ہو تو قرآن نے یہ اصول بتایا ہے فردوہ الی اللہ والرسول کہ جب تمہارا کسی چیز پر نزاع ہو جائے تو صرف اللہ اور رسول کی طرف اس نزاع اور اختلاف کو لوٹا دو۔ جب ہم نے رسول کی طرف لوٹایا تو گیارہ رکعت کا فیصلہ صادر ہوا۔ اب اسی پر ہمارا عمل ہے۔ جمہوریت کسی کے نزدیک حجت نہیں' خود حنفیہ کے بہت سے مسائل جمہور صحابہ' جمہور تابعین' جمہور علماء کے خلاف ہیں' جن میں حنفیہ جمہور کی پرواہ نہیں کرتے۔ مثلاً جس جانور کو ذبح کیا جائے اور اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکلے تو جمہور صحابہ وجمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ وہ حلال ہے مگر احادیث صحیحہ اور جمہور صحابہ اور جمہور ائمہ کے خلاف حنفی مذہب یہ ہے کہ وہ حرام ہے۔

جمہوریت کو رہنے دیجئے ورنہ حنفی مذہب سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ہر زمانے میں جمہوریت مدینے کی کچھ اور مکہ کی اور' اور کوفہ کی دیگر رہی ہے۔ آپ کوفہ میں رہیے' اچھا آپ کو جمہوریت کا اصول منظور ہے تو پھر رفع یدین رکوع کو جاتے آتے وقت احادیث متواترہ صریحہ سے ثابت ہے اور جمہور صحابہ' جمہور تابعین' جمہور تبع تابعین' جمہور ائمہ دین کا مذہب ہے کہ رفع یدین کرنا سنت ہے مگر اہل رائے کی کوئی پارٹی اس سنیت کی منکر ہے تو اب سائل اور اس کے اعوان واخوان کو رفع یدین اختیار کر کے شہیدوں کا ثواب حاصل کر لینا چاہیے ورنہ ایسی سنت کا منکر جو متواتر حدیث سے ثابت ہو' کافر ہے۔

آپ شیخ عبدالحق دہلوی کی طرف تو بہت جلدی دوڑ کر گئے مگر امام سیوطی جو جامع العلوم اور تمام علوم میں ان سے زیادہ ماہر ہیں' ان کے رسالہ المصابیح کو تسلیم کیوں نہ کیا؟ کیا اس میں زہر تھا؟ اچھا آپ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ دہلوی کا فیصلہ ہی مانئے! وہ اپنی کتاب ما ثبت بالسنة کے ص۔۱۲۲ میں یہ لکھتے ہیں : ولکن المحدثن قالوا ان هذا الحدیث (ای حدیث ابن عباس) ضعیف والصحیح ما روته عائشة انه صلی احدی عشرة رکعة کما هو عادته فی قیام اللیل وروی انه کان بعض السلف فی عهد عمر بن عبدالعزیز یصلون باحدی عشرة رکعة قصد التشبیه برسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم۔ یعنی محدثین کے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ رکعتیں پڑھی تھیں' جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا جیسے کہ آپ کی عادت تہجد میں تھی اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بیس والی روایت ضعیف ہے اور یہ منقول ہے بعض سلف صالحین سے کہ وہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں گیارہ رکعت تراویح پڑھتے تھے اور ان کا ارادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تراویح سے مشابہت پیدا کرنے کا تھا۔

اس شہادت سے یہ بات صاف ہو گئی کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ والی روایت دلیل حنفیہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اور تراویح کا عدد رکعت وہی ہے جو تہجد کا ہے اور سلف میں برابر اس سنت پر عمل رہا ہے۔ اگرچہ بطور نفل لوگ زیادہ رکعتیں پڑھتے رہے مگر سنت نبوی سے مشابہت رکھنے والے بھی تھے۔ اب شیخ صاحب جمہور کا عمل کچھ بتائیں' ہمیں تو حقیقت کو لینا ہے کہ عمل نبوی میں بیس رکعت کا وجود نہیں ہے۔ تہجد اور تراویح میں آپ کا معمول گیارہ رکعت ہی تھا اور اسی کا حکم حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے دیا۔ چنانچہ امام طحاوی شرح معانی الآثار ص۔۱۷۳ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کو روایت کرتے ہیں : عن السائب بن یزید قال امر عمر بن الخطاب ابی بن کعب وتمیم الداری ان یقوما للناس باحدی عشرة رکعة۔ یعنی سائب بن یزید نے بیان کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو مخصوص ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو مامور فرمایا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھایا کریں' کیونکہ یہی نماز عشاء اور فجر کے مابین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ طحاوی کے ص۔۱۶۷ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے : کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یصلی فیما بین ان یفرغ من صلٰوة العشاء الی الفجر احدی عشرة رکعة یسلم بین کل رکعتین ویوتر

بواحدۃ یعنی آنحضرت ﷺ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر پھر بعد صبح تک گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور ہر دوگانہ کے بعد سلام پھیرا کرتے تھے اور وتر ایک رکعت پڑھا کرتے تھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ نماز تہجد اور قیام رمضان ایک ہی شے ہیں اور ان کا وقت عشاء کے بعد سے لے کر صبح تک ہے اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے دو اماموں کو نماز تراویح گیارہ رکعت پر مامور فرمایا' کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کو ان تین راتوں میں گیارہ رکعت پڑھتے دیکھا تھا' اس سنت پر عمل کیا۔ اب بھی ہر شخص کو جو سچا اہل سنت والجماعت ہے' اس سنت نبوی وفاروقی پر عمل کرنا چاہئے کہ یہی حق ہے۔

شیخ عبدالحق صاحب سے کسی چیز کے لینے کی آخر ضرورت کیا ہے جبکہ احادیث سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے عہد سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا تعامل رمضان میں گیارہ رکعت پر ثابت ہوا اور عہد فاروقی میں بھی اس پر عمل پایا گیا تو فرقہ ناجیہ کے لیے یہ ثبوت کافی ہے۔ حدیث میں فرقہ ناجیہ کی تعریف یہ آئی ہے : ما انا علیه واصحابی کہ جس طریقہ اور طرز عمل پر میں اور میرے صحابہ قائم ہیں' اُس طریقے پر جو طائفہ قائم رہے گا وہ اہل حق اور ناجیہ ہے۔ عہد نبوی میں نہ حنفیہ وغیرہ فرقوں کا نام ونشان تھا کہ سب کتاب وسنت پر عمل کرتے تھے اور نہ بیس تراویح کا وجود تھا کہ سب مرد' عورتیں گیارہ تراویح مع وتر پڑھتے تھے۔

چنانچہ حدیث میں ہے : عن جابر قال جاء ابی بن کعب الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فقال یارسول اللّٰہ انه کان منی اللیلة شیئی یعنی فی رمضان قال وما ذاک یا ابی قال نسوة فی داری قلن انا لا نقرأ القراٰن فنصلی بصلاتک قال فصلیت بهن ثمان رکعات والوتر فسکت فکان شبه الرضاء ولم یقل شیئا رواہ ابو یعلی والطبرانی بنحوہ فی الاوسط قال الهیثمی فی مجمع الزوائد ص۔۷۴' جلد۔۲ اسنادہ حسن وذکرہ ابن نصر المروزی فی قیام اللیل ص۔۹۰ یعنی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! رات میں نے (اپنی سمجھ سے) ایک کام کر دیا' یہ رمضان کے مہینہ کا واقعہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا کیا بات ہے؟ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے گھر کی عورتوں نے کہا کہ ہم لوگوں کو قرآن یاد نہیں ہے' لہٰذا تراویح کی نماز آپ اپنے گھر ہی پڑھیے' ہم بھی آپ کے پیچھے پڑھ لیں گے۔ چنانچہ میں نے اُن کو آٹھ رکعتیں اور اس کے بعد وتر کے ساتھ نماز پڑھا دی۔ آنحضرت ﷺ

خاموش رہے اور ایسا معلوم ہوا کہ آپ نے اس کو پسند فرمایا۔
یہ دلیل سنت تقریری ہے کہ آنحضور ﷺ نے آٹھ تراویح کے عمل کو برقرار رکھا۔
اب اس کے ساتھ حدیث عائشہ وحدیث جابر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا دو اماموں کو آٹھ تراویح پر مقرر کرنے کا واقعہ ساتھ ملایا جائے تو عہد نبوی اور عہد فاروقی میں آٹھ تراویح پر اجماع ثابت ہو جاتا ہے جس کے مقابلے میں بعد کی جمہوریت کوئی چیز نہیں۔ بس اہل حق کے لیے یہی بات کافی ہے ؎

جو شمع صفات حق پر پروانہ ہو
لبریز نشاط اس کا پیمانہ ہو

سوال نمبر۔۱۵ : کتب حدیث میں بیس تراویح کے متعلق احادیث ہیں یا نہیں؟
جواب نمبر۔۱۵ : مرفوع حدیث بیس تراویح کے متعلق صحیح سند کے ساتھ کوئی نہیں پائی گئی' صرف ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طبقہ ثالثہ سے ہے جو بالاتفاق ضعیف ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے خلاف ہے جو صحیحین میں ہے۔ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خود حنفیہ نے بھی مردود قرار دیا ہے اور دیگر آثار صحابہ بالخصوص جو خلفاء کی طرف منسوب ہیں' وہ سب ضعیف اور بے ثبوت ہیں۔
سوال نمبر۔۱۶ : کسی حدیث کے اسناد میں اگر بعض ضعف ہو تو جمہور امت کی تلقی بالقبول کرنے سے وہ حدیث حجت قابل عمل رہتی ہے یا نہیں؟
جواب نمبر۔۱۶ : جس حدیث میں ضعف شدید ہو کہ راوی اس کا جھوٹا اور متروک الحدیث ہو تو اس کو جمہور محدثین نے کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ایسی حدیث کو تلقی بالقبول حاصل ہے۔ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف جمہور محدثین لے لیتے ہیں مگر اس کے بھی تین شرائط ہیں' جیسے تدریب الراوی میں ص۔۱۹۶ میں درج ہے کہ تین شرطوں سے ضعیف حدیث لی جا سکتی ہے۔ اول یہ کہ ضعف معمولی ہو' شدید نہ ہو مثلاً کوئی راوی متہم بالکذب نہ ہو یا ایسا راوی نہ ہو جو فحش غلطیاں کرتا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ حدیث کسی قاعدہ معمول بہ کے تحت داخل ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ عمل میں اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھے بلکہ احتیاط مدنظر ہو ورنہ جمہور محدثین وفقہاء صحیح حدیث پر اپنے عمل کا دارومدار رکھتے ہیں۔ اگرچہ جمہور علماء عمل میں ان کے خلاف ہوں' جیسے مولانا عبدالرشید نعمانی حنفی

ابن ماجہ کے مقدمے میں جو انہوں نے اپنے مذہب کی حمایت میں مرتب کیا ہے' اس کے ص۔۷ا میں محدثین کا یہ دستور بیان کیا ہے :

فاخذ هولاء بهذه الروايات التي جمعوها ودونوها وحرروها ونقحوها وصححوها على ميزان الرجال دون تلقي الائمة الفقهاء من الصحابة والتابعين ولم يكن عندهم فرق في ذالک سواء عمل بها الصحابة والفقهاء ام لم يعملوا بها عضوا عليها بالنواجذ وجعلوها قاضية على محتمل القران وخصوا بها عام الكتاب وطرحوا قول كل صحابي وفتوى كل تابعي يخالف مروياتهم۔ یعنی ان فقہاء محدثین نے ان روایات مرفوعہ کو لیا ہے جن کو انہوں نے اپنی کتابوں میں لکھ کر جمع کیا ہے اور راویوں کی تحقیق کی بناء پر ان کو صحیح قرار دیا اور ان کے مقابلے میں ائمہ فقہاء صحابہ و تابعین کی تلقی کی کچھ پرواہ نہیں کی اور ان کے نزدیک اس بات میں کوئی فرق نہیں کہ صحابہ اور فقہاء نے ان پر عمل کیا ہے یا نہیں۔ وہ تو ان احادیث نبویہ کو مضبوط پکڑ لیتے ہیں اور ان کو قرآن کے احتمالی معنوں پر فیصلہ کن قرار دیتے ہیں اور قرآن کے عام حکم کو بھی خاص کر لیتے ہیں اور احادیث نبویہ کے خلاف جو کسی صحابی کا قول اور کسی تابعی کا فتویٰ ہو' اس کو پھینک دیتے ہیں۔

میں کہتا ہوں مسئلہ تراویح میں محدثین اور علمائے اہل سنت نے یہی طرز عمل اختیار کیا ہے کہ وہ صحیحین کی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اور قیام اللیل وغیرہ کی حدیث جابر رضی اللہ عنہ اور تعامل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قبول کیا ہے اور ان کے خلاف جو کسی کا عمل پایا گیا' خواہ وہ بیس کا ہو یا چھتیس کا ہو یا اکتالیس کا ہو' قبول نہیں کیا اور فقہاء حنفیہ نے بھی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کی بنا پر آٹھ تراویح کو مسنون قرار دے کر باقی کو نفل زائد از سنن لکھا ہے۔ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ متعلقہ بیس تراویح جس میں شدید قسم کا ضعف ہے' محدثین اور فقہاء نے اس کو قبول نہیں کیا۔ باقی رہا سلف صالحین کا عمل سو وہ مختلف ہے۔ آٹھ' سولہ' بیس' چھتیس' چالیس وغیرہ کے اقوال عمدۃ القاری وفتح الباری وغیرہ میں منقول ہیں۔ اس سے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کو تلقی بالقبول حاصل ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ فقہاء حنفیہ یا دیگر کسی سلف نے بیس تراویح کا عدد اختیار کیا ہے تو وہ اپنی طرف سے زیادہ عبادت کی نیت سے کیا ہے۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ ہم نے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کو قبول کر لیا ہے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

سوال نمبر۔۱۷ : صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جس قول و فعل میں اجتہاد کو دخل نہ ہو' وہ حکم میں حدیث مرفوع کے ہے یا نہیں؟ اصول حدیث میں اس کے متعلق کیا فیصلہ ہے؟

جواب نمبر۔۱۷ : یہ سوال پڑھنے سے ظاہر ہوا کہ یہ عربی مقولہ صحیح ہے : السائل کالاعمی یعنی سائل مثل اندھے کے ہوتا ہے۔ فعل میں' خواہ صحابی کا ہو یا تابعی کا حکماً مرفوع ہونے کا کوئی اصول نہیں ہے۔ تدریب الراوی ص۔۱۲۱ میں ہے :قال شیخنا الامام الشمنی ولا یتاتی فعل مرفوع حکمًا۔ یعنی ہمارے شیخ امام شمنی نے فرمایا ہے کہ کسی کا فعل مرفوع حکمی نہیں آتا۔" باقی رہا قول سو وہ اس صورت میں مرفوع حکمی ہو سکتا ہے : مالا یدخل الرای فیہ۔ یعنی اس میں رائے کا کوئی دخل نہ ہو۔ لیکن واقعہ بیس تراویح پر چسپاں کرنا بالکل غلط ہے کیونکہ بیس تراویح پڑھنے والوں کے عمل میں اجتہاد کا دخل ہے۔ چنانچہ اس معنی کی ایک حدیث ہمارے مضمون میں گذر چکی ہے کہ نماز نیکی ہے جو شخص چاہے زیادہ کرلے اور جو شخص چاہے کم کرلے۔

چنانچہ نوافل ماثورہ کے علاوہ بہت سے نوافل اولیاء عظام وصوفیائے کرام پڑھتے رہے ہیں۔ اسی لیے نماز تراویح کی تعداد سلف صالحین نے ایک مقرر نہیں رکھی بلکہ آٹھ سے چالیس تک عمل کرتے رہے ہیں۔ اس میں اجتہاد بایں صورت ظاہر ہوا کہ قیام نبوی میں اور قیام صحابہ میں تطویل قرآت اس قدر تھی کہ عشاء سے سحری تک جا پہنچتی۔ عوام کو قرآت کی یہ طوالت برداشت نہ ہوئی تو انہوں نے اس کی جگہ میں رکعات بڑھا دیں۔ چنانچہ زرقانی شرح موطاء مطبوعہ مصر جلد۔۱' ص۔۲۱۵ میں یہی لکھا ہے اور فتاویٰ ابن تیمیہ ص۔۱۴۸ میں بھی یہی لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے جب طول قیام لوگوں پر شاق ہونے لگا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ قیام میں تخفیف کر کے وتر کے علاوہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھانے لگے۔ رکعات کی یہ تعداد زیادتی طول قیام کے عوض تھی۔ بعض سلف چالیس رکعتیں پڑھتے تھے تو ان کا قیام اور بھی ہلکا ہوتا تھا۔ اس کے بعد تین رکعت وتر پڑھتے تھے اور بعض بلا وتر چھتیس رکعات پڑھتے تھے۔" پس اس سے ظاہر ہوا کہ بیس عدد تراویح کے پڑھنے میں ایسا ہی دخل ہے جیسا چالیس کے پڑھنے میں ہے' سو یہ کوئی چیز نہیں۔

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اُتر سکتی نہیں آئینہ تحریر میں!

سوال نمبر۔۱۸ : اگر کسی حدیث کا ایسا اسناد ہو کہ بعد کے طبقہ کا ایک راوی ضعیف ہو تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس طبقے سے پہلے محدثین کے نزدیک بھی وہ حدیث ضعیف ہو؟

جواب نمبر۔۱۸ :

کر لیں یہ گمراہ گمراہی کی اپنی دھوم دھام
جب تلک مہدی کے لشکر کا پتہ لگتا نہیں

اس کا کوئی راوی مطعون با لکذب ہو تو وہ روایت قطعی' ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ روایت کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک مقبول اور دوسری مردود۔ مقبول کی چار قسمیں ہیں۔ صحیح لذاتہ' جیسے حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔ دوسری صحیح لغیرہ' جیسے حدیث جابر رضی اللہ عنہ۔ تیسری حسن لذاتہ' جیسے حدیث ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی جس میں عورتوں کو تراویح پڑھانے کا ذکر ہے۔ چوتھی حسن لغیرہ' جس کی مثالیں اصول حدیث میں بہت ہیں اور مردود کی بہت قسمیں ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک راوی ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان ہے جس کی رئیس المحدثین شعبہ نے تکذیب کی ہے اور امام احمد بن حنبل اور امام الدنیا امام بخاری اور رئیس الناقدین یحییٰ بن معین اور امام نسائی وغیرہم کی تضعیف فتح الباری' نصب الرایہ وغیرہ میں منقول ہے۔ امام سیوطی اپنے رسالہ "المصابیح" ص۔۳ میں فرماتے ہیں : ومن یکن بہ مثل شعبۃ فلا یلتفت الی حدیثہ۔ یعنی شعبہ جیسا حاذق محدث جس شخص کی تکذیب کرے' اس کی حدیث قابل التفات بھی نہیں ہے۔

تہذیب التہذیب جلد۔۱' ص۔۱۴۵ میں ہے جس کی عربی کا ترجمہ یہ ہے : "معاذ عنبری فرماتے ہیں کہ شعبہ بغداد میں تھے' میں نے ان کے پاس خط لکھ کر دریافت کیا کہ ابو شیبہ قاضی واسط (کو اپنا استاد مان کر) ان سے احادیث روایت کروں؟ تو شعبہ نے مجھے جواب میں لکھا کہ نہیں ان سے کچھ روایت مت کرو' وہ برا آدمی ہے۔"

اور تہذیب التہذیب جلد۔۱' ص۔۱۴۵ میں ہے کہ امام احمد بن حنبل نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے اور اسی حوالے سے امام عبداللہ بن مبارک رئیس التابعین سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا "ارم بہ" یعنی اس کو پھینک دو۔ جب اس حدیث کے راوی مذکور کو محدثین کرام نے منکر حدیث' متروک الحدیث اور جھوٹا بتایا ہے تو اس کے نیچے طبقہ کے کون

محدثین ہیں جو اس حدیث کو قبول فرما کر عمل کے قابل قرار دیتے ہیں۔ پہلے طبقہ کے محدثین دفقہاء سے بہ اسناد صحیح یہ نقل کریں کہ انہوں نے اس حدیث کو سنت نبوی قرار دے کر عمل کیا ہو؟ ویسے سلف میں کسی نے بیس تراویح پڑھ لی ہوں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بیس تراویح مقرر و مسنون ہیں۔ اگر آپ سچے ہیں تو اس کا ثبوت پیش کریں۔

سوال نمبر۔۱۹ : کیا کسی حدیث کے اسناد صحیح ہونے سے یہ ضروری ہے کہ اس کے متن حدیث پر عمل کیا جائے یا کسی حدیث کے محض اسناد ضعیف ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ متن حدیث قابل عمل نہ ہو؟

جواب نمبر۱۹ : مقدمہ صحیح مسلم میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ اسناد کا ہونا دین سے ہے۔ اگر اسناد نہ ہوتا تو ہر شخص جو چاہتا کہتا اور اسی کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کر دیتا۔ اسناد ہی کی بنا پر احادیث کو جانچ کر کسی کو صحیح' کسی کو حسن' کسی کو ضعیف' کسی کو موضوع قرار دیا جاتا ہے اور متواتر اور مشہور اور خبر واحد کا امتیاز بھی اسناد ہی سے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر محدثین نے اصول حدیث مقرر فرما کر احادیث میں امتیاز کر دیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور یہ حسن ہے اور فلاں ضعیف ہے اور فلاں موضوع ہے۔ اسی اسنادی اصول کی بنا پر کتب فقہ' ہدایہ وغیرہ کی منقولہ روایات کی تنقید کر کے اکثر کو ناقابل اعتبار قرار دے دیا ہے اور جن روایات ضعیفہ پر مذہب حنفیہ کی بنیاد قائم تھی' ان کو مسترد کر دیا ہے اور ائمہ اہل کوفہ جو اہل رائے ہیں' جن پر حنفی مذہب کی چکی چل رہی ہے' وہ سب ضعیف ہیں تو ان کی روایات کے متنوں کو کیسے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ اصول حدیث میں یہ قاعدہ ضرور لکھا ہے کہ اسناد کے ضعیف ہونے سے متن کا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا' کیونکہ ہو سکتا ہے دوسری صحیح سند سے ثابت ہو اور کسی حدیث کے اسناد صحیح ہونے سے متن کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے کہ متن میں کوئی شذوذ یا کوئی علت موجود ہو۔ سو محدثین ماہرین نے ایسی احادیث کے متنوں اور سندوں میں یہ چیزیں پا کر ان کو بیان کر دیا ہے' اب بعد میں کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کسی حدیث کے متن کو اس کی سند ضعیف ہونے کے باوجود صحیح قرار دے' کیونکہ اس کے معلوم کرنے کا قاعدہ اصول حدیث میں بیان کیا گیا ہے اور اس کی رُو سے کسی حدیث متنازعہ کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ تدریب الراوی کے ص۔۱۶۲ میں تقریب النواوی سے یہ نقل کیا ہے : اذا رأيت

حدیثا باسناد ضعیف فلک ان تقول ھو ضعیف بھذا الاسناد ولا تقل ضعیف المتن لمجرد ضعف ذلک الاسناد الا ان یقول امام انه لم یرد من وجه صحیح او انه حدیث ضعیف مفسرا ضعفه یعنی "جب تو کسی حدیث کو ضعیف اسناد کے ساتھ دیکھے تو تجھے یہ کہنا چاہیے کہ یہ حدیث اس اسناد کے ساتھ ضعیف ہے' مگر اس صورت میں کہ امام یہ کہہ دے کہ یہ حدیث کسی دوسری صحیح سند سے نہیں روایت کی گئی ہے یا کہہ دے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کے ضعف کی تفسیر کر دے تو پھر اس حدیث کو ضعیف المتن کہا جا سکے گا۔"

یہ متن کا ترجمہ ہے' اس کی شرح تدریب الراوی میں امام سیوطی رحمہ اللہ نے مزید تشریح کر دی ہے' وہاں ملاحظہ کی جائے۔ اسی وجہ سے امام سیوطی نے رسالہ "المصابیح" میں اس روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ستیاناس کر دیا ہے جس میں بیس تراویح کا ذکر ہے۔ دیگر یہ آثار جو بیس تراویح کے متعلق اسناد اور متن کی رُو سے تضعیف کر دی ہے' اس لیے بیس تراویح کو محدثین اور فقہاء نے مسنون قرار نہیں دیا۔

اگر حنفیہ اپنی کسی روایت کو حکمی مرفوع بنانے کی کوشش کریں گے تو پھر بھی ہم کو کامیابی ہے' کیونکہ صحیح سند سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جب نماز تراویح کا جماعت کے ساتھ بندوبست کیا تو دو اماموں کو حکم دیا کہ وہ گیارہ عدد تراویح پڑھائیں۔ اس عدد میں اجتہاد اور رائے کو دخل نہیں ہے تو یہ تعداد شرعی قرار دی جائے گی۔ خصوصاً جب کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اس کی مؤید اور مصدق ہے۔ اسی طرح حدیث جابر رضی اللہ عنہ جس کی اسناد حسن ہے' جس کو علمائے حنفیہ اسناد کی رُو سے ضعیف قرار دیتے ہیں۔ اس کے متن کو ضعیف نہ کہا جائے گا' کیونکہ اس کی تائید حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اور حدیث واقعہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حکم فاروقی رضی اللہ عنہ سے تائید پائی جاتی ہے تو اس صورت میں متن حدیث جابر رضی اللہ عنہ صحیح قرار دیا جائے گا۔

مقلدین حنفیہ عجیب کشمکش میں ہیں کہ بیس عدد تراویح کے صحیح بنانے میں جو جال بنتے ہیں' اسی میں خود پھنس جاتے ہیں ؎

ہفتاد دو فرقہ ے پویند اے بے مانند
گم کردہ ترا بہر طرف می جویند سرگردانند

سر رشتہ حق بدست یک طائفہ آت اہلحدیث آنند
باقی تکلف سخن می گویند مقلد انند

سوال نمبر۔۲۰ : شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی تراویح کی کتنی رکعت بتاتے ہیں؟ ابن تیمیہ نے تراویح کے عدد رکعت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟ حضور سیدنا قطب الاقطاب غوث الاعظم اور محدث نووی شارح مسلم شریف کتنی تراویح کو مسنون فرماتے ہیں؟

جواب نمبر۔۲۰ : پہلے ہمارا مسلک سمجھئے جو اس شعر میں ہے :

اصل دیں آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفیٰ بر جان مسلم داشتن

یعنی ہمارے مذہب کا دارومدار کتاب وسنت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان دونوں اصولوں سے مسائل پر دلائل مل جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اقوال الرجال کو حجت شرعی نہیں سمجھتے۔ مسائل میں بحث کے وقت یہی تمنا اور خواہش ہوتی ہے کہ توحید سنت کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلہ میں شرک وبدعت خس وخاشاک اڑ جائیں۔

تمنائے دل بس مدحت توحید وسنت ہے
یہی ہے دین اور ایمان یہی مقصود ملت ہے

اور سائل کو بھی ہم یہی ہدایت کرتے ہیں کہ :

مسلک سنت پہ سائل چلا جا بے دھڑک
جنت الفردوس کو سیدھی گئی ہے یہ سڑک

اول تو احادیث نبویہ کے مقابلہ میں اقوال امت کو طلب کرنا ہی گمراہی ہے' دوم یہ کہ اقوال علماء میں جب اختلاف ہو تو اس وقت حکم شرعی یہ ہے کہ کتاب وسنت کی طرف اس مسئلہ کو لوٹا دیا جائے۔ اہل حدیث جو علمائے سلف وخلف کے اقوال پیش کرتے ہیں وہ یا تو التزاماً ہوتے ہیں یا تائیداً ہوتے ہیں' ہم ان کو مستقل حجت نہیں جانتے۔ اگر سائل علماء کے اقوال کو پسند کرتا ہے تو ائمہ محدثین' امام بخاری' امام ابن حبان' حافظ ابن حجر' علامہ سیوطی' علامہ شوکانی' علامہ زرقانی' علامہ عینی' علامہ زیلعی' علامہ ابن الہمام اور مؤلف بحر الرائق' ملا علی قاری' مولانا انور شاہ دیوبندی کی شہادتیں منظور کرے کہ وہ سب آٹھ تراویح اور تین وتر کو مسنون قرار دیتے ہیں۔ جب وہ ان کی شہادتیں منظور نہیں کرتا تو ہم کو دوسرے علماء

کے اقوال پیش کرنے کی تکلیف کیوں دیتا ہے' کیا سائل ان علمائے کرام جن کو سوال میں نامزد کیا گیا ہے مستقل متبوع مانتا ہے تو اس کو چاہیے کہ دیگر مسائل اختلافیہ میں بھی ان کے اقوال کو منتہائے بحث قرار دے ورنہ اس آیت کا مصداق ہو گا : افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ یعنی اہل کتاب کا یہ شیوہ تھا کہ وہ کتاب کے بعض مسائل کو جو ان کی خواہش کے مطابق ہوتے تھے' مان لیتے تھے اور جو خلاف ہوتے تھے' ان کو نہ مانتے تھے۔

یہی رویہ سائل اور اس کے اخوان کا ہے کہ جس کسی عالم کا قول ان کے مسلک کے مطابق ہوا' اس کا نام لے دیا اور پھر جب اسی کا قول ان کے مسلک کے خلاف آیا تو اس کو تسلیم نہ کیا مثلاً شیخ المشائخ حضرت جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ذات الٰہی عرش پر ہے اور اسی کے خلاف جو عقیدہ رکھے وہ گمراہ ہے۔ مقلدین حنفیہ کا عقیدہ شاہ جیلانی کے خلاف ہے' اسی طرح وہ اعمال کو ایمان کے اجزاء میں شمار کرتے ہیں اور مقلدین کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ اسی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر کو سنت قرار دیتے ہیں اور حنفیہ اس کے منکر ہیں۔ اسی طرح وہ پیروں کو مریدوں کا کھانا کھانا حرام قرار دیتے ہیں اور مقلدین کھاتے ہیں' وغیرہ۔

اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اہلحدیث کو فرقہ ناجیہ اور حنفیہ کو فرقہ مرجیہ قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اہل سنت صرف اہلحدیث ہیں اور یہ لکھا ہے کہ سورۂ فاتحہ نماز کا رکن ہے اور جو اس کو چھوڑے گا' اس کی نماز باطل ہے لیکن سائل کا مذہب اور عقیدہ حضرت شیخ جیلانی کے اکثر مسائل اصولی وفروعی کے خلاف ہے۔ اس فرقہ متبدعین نے ان کو صرف مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لیے منتخب کر رکھا ہے کہ ان کو اپنے مذہب کوفی میں ان سے بہتر اور افضل گیارہویں کے کما لینے اور حاجت روائی کرنے والا کوئی دستیاب نہ ہوا' اس لیے دوسرے مذہب کے حضرت الشیخ کے دروازے سے بھیک مانگتے اور ان کے در کے "کتے" کہلاتے ہیں لیکن جب حضرت جیلانی ان کتوں کو ان کے مذہب کے خلاف مسائل بتاتے ہیں تو یہ فوراً بریلی کو بھاگ جاتے ہیں جس سے ظاہر ہوا کہ جیلانی کے کتے کہلانا محض غداری ہے۔ کتوں کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کا دروازہ چھوڑ کر دوسرے دروازوں پر نہیں جاتے لیکن یہ انسانی کتے اُن کے خلاف ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ ہم اور ہمارے مشائخ مصلح عالم ہیں۔

بادہ عصیاں سے دامن تر بتر ہے شیخ کا
پھر بھی دعویٰ ہے کہ اصلاح دو عالم ہم سے ہے

سائل نے شاہ ولی اللہ صاحب کا اسم گرامی بھی لکھ دیا ہے' حالانکہ انہوں نے اپنی کتاب بلاغ المبین میں قبر پرستوں کا صفایا کر دیا ہے کہ گور پرستوں اور بت پرستوں کو یکساں قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان کے دیگر اعتقادی اور عملی مسائل ان کے مذہب کے خلاف کتب شاہ ولی اللہ میں موجود ہیں' جن کو سائل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تاہم جب سائل ضرور ہی ان کا فیصلہ چاہتا ہے تو ان کی معتبر کتاب مصفیٰ شرح موطا جلد اول' ص-۱۷۷ سے ان کا فیصلہ پیش کیا جاتا ہے۔ "از فعل آنحضرت ﷺ یاز دہ رکعت ثابت شدہ۔" یعنی آنحضور ﷺ کے فعل سے صرف گیارہ رکعت ہی ثابت ہیں۔

امام مالک نے موطا میں قیام رمضان کے متعلق پہلے گیارہ رکعت مع وتر کا باب منعقد کیا ہے جس کے تحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ذکر فرمائی ہے جس سے ظاہر ہوا کہ یہ حدیث نماز تراویح کو بھی شامل ہیں۔ جس کی تائید وتصدیق شاہ ولی اللہ صاحب نے فرما دی ہے پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے گیارہ رکعت کا ثبوت دیا ہے جس پر شاہ ولی اللہ نے کوئی تنقید نہیں کی۔ پھر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اجتہادی طور پر یہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور رکعتیں بڑھا کر بیس کر دی تھیں۔ پھر لکھا ہے "لہٰذا امام احمد مخیر واشتہ است در ادائے یاز دہ رکعت وبیست وسہ رکعت۔ یعنی امام احمد نے مسلمانوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ جو چاہے گیارہ رکعت پڑھے اور جو شخص چاہے تئیس رکعت مع وتر پڑھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بیس رکعت والی روایت بالکل مردود ہے۔

سائل نے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ بھی طلب کیا ہے' سو ان کا فیصلہ نہ سائل کو مفید نہ اہل حدیث کو مضر ہے۔ چنانچہ وہ اپنے فتاویٰ جلد-۱' ص-۱۴۸ میں لکھتے ہیں : وكان النبى صلى الله عليه وسلم قيامة باالليل هو وتره يصلى بالليل فى رمضان وغير رمضان احدى عشرة ركعة او ثلاث عشرة ركعة. یعنی نبی کریم ﷺ کا رات کا قیام رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ حد تیرہ رکعت سے زیادہ نہ تھا۔ نیز امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا قیام تو گیارہ یا تیرہ رکعت کا تھا پھر بعد میں سلف صالحین میں سے بعض نے بیس رکعت' چالیس رکعت' بعض نے چھتیس تک بڑھا دی

تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسنون تو گیارہ ہی رکعت ہیں' باقی ترغیب رمضان کی وجہ سے سلف صالحین نے بطور نوافل رکعتیں بڑھا دی تھیں۔ یہ زائد تعداد جو عدد مسنون سے علاوہ ہے جس کو سنت نہیں قرار دیا جا سکتا' پس جو شخص ان کو مسنون شارع اعتقاد رکھ کر پڑھے گا' وہ بدعتی اور گمراہ ہے۔

دیگر یہ کہ سائل نے امام علامہ نووی سے بھی اپنی شفا ڈھونڈی ہے کہ ان کے دواخانے میں ہماری بیماری کی کیا دوا لکھی ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ امام نووی نے صلوٰۃ اللیل پر باب باندھ کر عدد رکعات نبوی کا ثبوت حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: عنھا کان لا یزید فی رمضان ولا غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ (جلد اول' ص۔۲۵۳) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ رمضان میں اور رمضان کے سوا دیگر دنوں میں رات کو گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان الوتر رکعۃ وان الرکعۃ صلوٰۃ صحیحۃ۔ یعنی وتر ایک رکعت کا نام ہے اور ایک رکعت بھی نماز صحیح ہے۔ پس امام نووی نے سائل اور اس کے مذہب والوں کی ناک کاٹ کر پھینک دی۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ رمضان میں تراویح اور ہے اور صلوٰۃ اللیل اور ہے اور وتر تین رکعت ہیں' نہ اس سے کم جائز ہیں اور نہ زیادہ جائز ہیں لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے دونوں باتوں کو رد کر دیا کہ رمضان اور غیر رمضان میں رات کی نماز بروئے حدیث عائشہ گیارہ رکعت ہے اور وتر کی ایک رکعت پڑھنا صحیح ہے کہ نماز کی ایک رکعت بھی ہوتی ہے۔

پھر امام نووی نے قیام رمضان کا باب منعقد کیا ہے تو اس کے تحت تراویح کی رکعت کی کوئی تعداد ذکر نہیں کی' کیونکہ پہلے صلوٰۃ اللیل کی تعداد بتا چکے تھے۔ ہاں یہ بتایا ہے کہ اجتمعت الامۃ علی ان قیام رمضان لیس بواجب بل ھو مندوب۔ (جلد۱' ص۔۲۵۹) یعنی تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ تراویح ضروری نہیں' مستحب ہے۔ دوسری جگہ یہ لکھا ہے: واتفق العلماء علی استحبابھا۔ یعنی تمام علماء کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ نماز تراویح مستحب ہے۔ قدوری فقہ حنفیہ میں بھی لکھا ہے: "یستحب الخ" یعنی نماز تراویح مستحب ہے۔ لیکن اس کے حاشیہ پر طحطاوی سے نقل کیا ہے کہ تراویح باجماع امت سنت ہے۔ قدوری پر نقد کرتے ہوئے مؤلف ہدایہ نے یہ لکھا ہے: والاصح انھا سنۃ۔

کہ اصح بات یہ ہے کہ تراویح سنت ہے۔ پھر ترویحہ کی بابت صاحب ہدایہ نے یہ نقل کیا ہے : استحسن البعض الاستراحة علی خمس تسلیمات۔ یعنی بعض حنفیہ نے استراحت پانچ سلاموں کے بعد اچھی سمجھی ہے۔ اس سے تراویح کی وجہ تسمیہ بھی بعض حنفیہ نے غلط کر دی۔ بہرحال سائل نے امام نووی کا حوالہ طلب کیا تھا سو امام نووی نے حنفیہ کا قلعہ مسمار کر دیا کہ تراویح مستحب بتائی یعنی اگر پڑھے تو ثواب ہے اگر نہ پڑھے تو عذاب نہیں ہے مگر حنفیہ کے ایک رسالہ میں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص بیس رکعت تراویح نہ پڑھے یا اس کے سنت مؤکدہ ہونے کا اعتقاد نہ رکھے وہ بلاشبہ بدعتی اور گنہگار ہے۔ (غایۃ التنقیح ص-۵۰)

پس مؤلف قدوری اور امام نووی نے ان کی تردید کر دی کہ گنہگار نہ ہو گا کہ تراویح مستحب ہے یعنی اگر کوئی پڑھے تو ثواب ہے۔ نہ پڑھے تو عذاب نہیں' حدیث سے ان کی تائید پائی جاتی ہے کہ مسلم کی حدیث میں آیا ہے ...... کان یرغب فی قیام رمضان من غیر ان یامرھم فیہ بعزیمۃ۔ یعنی رسول اللہ ﷺ تراویح کی رمضان میں ترغیب دیا کرتے تھے' اس کے ضروری ہونے کا حکم نہ فرماتے تھے۔ شرح نووی میں ہے : معناہ لا یامرھم امر ایجاب وتحتیم بل امرندب وترغیب الخ۔ مطلب اس کا وہی ہے جو اوپر گذرا۔ پس جو گواہ سائل نے بول کر مانگا تھا' اس نے اس کے خلاف بیان دے کر تقلیدی مذہب باطل کر دیا۔

ہوا فیصلہ مدعی کا میرے حق میں اچھا
کہ زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہ کنعاں کا

اچھا! حضرت سائل صاحب! الحمد للہ یہاں تک آپ کے بیس سوالات کے جوابات ختم ہو گئے ہیں اور ہم نے تمہارا غرور اور کبر چکنا چور کر کے رکھ دیا ہے' اب فتور نہ ڈالو گے ؎

غرور ٹوٹ جاتا ہے راہ عشق میں مغرور کا
یہاں سر ٹھوکریں کھاتا ہے قیصر وفغفور کا

سائل نے اپنے سوالات کے اول و آخر میں ہمارے اکابر علماء کو گستاخ ہو کر خطاب کیا کہ ہمارے سوالوں کے جوابات دو' اکیلے دو یا سب سے مدد مانگ کر دو' سو ہم نے بغیر کسی دوسرے عالم کی مدد کے اکیلے ہی خداداد علم وفہم سے ایسے جوابات دے دیئے ہیں جن سے

اس فرقہ کی شورش کی تمام قلعی کھل گئی ہے اور اُن کے وہ متکبرانہ سوالات کافور ہو گئے۔
وآخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔
حررہ عبدالقادر عارف حصاری
تنظیم اہلحدیث لاہور
جلد ۲۵، شمارہ ۳۳ تا ۳۸، مورخہ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۶۷ء و ۵، ۱۲، ۱۹، ۲۶ جنوری و ۲، ۹، ۱۶ فروری سنہ ۱۹۶۸ء

بیس رکعت تراویح پر فقہ حنفی کی رُو سے ایک نظر

حضرات! مقلدین حنفیہ میں عام رواج ہے کہ وہ رمضان شریف میں بیس عدد رکعت تراویح کو سنت نبوی جان کر نیت باندھ کر زبان سے کہہ کر پڑھتے ہیں حالانکہ ان کے معتبر فقہاء نے یہ تصریح کر دی ہے کہ سنت نبوی آٹھ رکعت ہیں۔ بیس رکعت تراویح آنحضرت ﷺ کے قول و فعل سے ثابت نہیں ہیں، آٹھ رکعت پر جو زیادت ہے وہ بعد میں ہوئی ہے جو سنت نہیں ہے۔

چنانچہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ جو مذہب حنفی میں بڑے محقق شمار کئے گئے ہیں، اپنی مشہور کتاب فتح القدیر شرح ہدایہ میں بطور فیصلہ لکھتے ہیں : ان الدلیل یقتضی ان یکون السنة من العشرین ما فعله صلی اللّٰہ علیه وسلم منها والباقی مستحبا وقد ثبت ان ذلک کان احدی عشرة رکعة بالوتر کما ثبت فی الصحیحین من حدیث عائشة فاذا یکون المسنون علی اصول مشائخنا ثمانیة منها انتهی۔ یعنی دلیل کا اقتضاء یہ ہے کہ بیس رکعت تراویح میں سے سنت وہی ہیں جو آنحضرت ﷺ نے پڑھی ہیں اور وہ بمع وتر گیارہ رکعت ہیں، جیسے کہ بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہیں، باقی رکعت مستحب ہیں اور مسنون ہمارے مشائخ کے اصول کی بنا پر آٹھ رکعت ہیں۔

رد المختار میں لکھا ہے : وذکر فی الفتح ان مقتضی الدلیل کون المسنون منها ثمانیة والباقی مستحبا وتمامه فی البحر۔ یعنی فتح القدیر میں یہ لکھا ہے کہ دلیل کا اقتضاء یہ ہے کہ بیس رکعت میں سے آٹھ مسنون ہیں، باقی مستحب ہیں۔

فتح القدیر میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ : فحصل من هذا کله ان

قیام رمضان احدی عشرۃ رکعۃ بالوتر فی جماعۃ فعلہ علیہ السلام۔ یعنی تمام تقریر کا ماحصل یہ ہوا کہ قیام رمضان بمع وتر گیارہ رکعت جماعت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا فعل تھا۔

شیخ عبدالحق حنفی ما ثبت بالسنۃ میں فرماتے ہیں : والصحیح ما روتہ عائشۃ انہ صلی احدی عشرۃ رکعۃ کما ھو عادتہ فی قیام اللیل۔ یعنی صحیح بات یہ ہے کہ قیام رمضان گیارہ رکعت ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جیسے کہ آپ کی عادت قیام اللیل میں تھی۔

طحطاوی شرح درمختار میں ہے : ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یصلھا عشرین بل ثمانیا۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے بیس رکعت نہیں پڑھیں بلکہ آٹھ پڑھی ہیں۔

فتح المعین میں فتاویٰ شرنبلالیہ سے منقول ہے : وفی شرنبلالیۃ الذی فعلہ علیہ السلام بالجماعۃ احدی عشرۃ رکعۃ بالوتر وما روی انہ کان یصلی فی رمضان عشرین سوی الوتر ضعیف۔ یعنی آنحضرت علیہ السلام نے جماعت کے ساتھ گیارہ رکعت بمع وتر پڑھی ہیں اور وہ جو مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے رمضان میں وتر کے علاوہ بیس تراویح پڑھی ہیں' ضعیف ہے۔ اسی طرح دیگر کتب فقہ میں ہے۔

اس تصریح سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا کہ سنت نبوی آٹھ رکعت ہیں' بیس نہیں ہیں۔ اب جو شخص بیس تراویح کو سنت نبوی جان کر اور یہی نیت باندھ کر پڑھے گا' وہ بدعتی ہو گا' کیونکہ غیر سنت کو سنت جاننا بدعت ہے۔ ہر چیز شرع کے حدود کے اندر رہنی چاہیے۔ اب جو شخص سنت کو فرض جان کر پڑھے یا فرض کو سنت جان کر پڑھے تو یقیناً بدعتی ہو گا' کیونکہ اس نے حکم شرعی کو بدل دیا' بس اسی طرح اس تراویح بیس رکعت کو سمجھ لینا چاہیے کہ سنت نبوی آٹھ ہیں اور باقی زائد نفل ہیں' خواہ بیس ہوں یا چالیس' ان کو مستحب جان کر پڑھے تو کچھ مضائقہ نہیں البتہ سنت نبوی جان کر جماعت سے اہتمام کے ساتھ پڑھنا بدعت ہے۔ ...... جو حدیث من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد کے تحت داخل ہے۔ فقہاء نے امر مندوب پر اصرار کرنے اور اس کو لازم کر لینے کو اسی لیے بدعت قرار دیا ہے کہ اس سے اس کا حکم تبدیل ہو جاتا ہے۔ بس یہی صورت یہاں ہے' اگر کوئی یہ کہے کہ ہم سنت نبوی جان کر نہیں پڑھتے بلکہ سنت خلفاء جان کر پڑھتے ہیں جیسے ہمارے

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ یہ سنت خلفاء ہے۔

حموی نے اشباہ میں لکھا ہے : قد صرح في كثير من المتداولات المعتبرة بانها سنة عمر رضي الله عنه لان النبي عليه الصلوٰة والسلام لم يصلها عشرين بل ثماني۔ یعنی فقہ کی بہت معتبر کتابوں میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ بیس تراویح سنت عمر رضی اللہ عنہ ہے، سنت نبوی نہیں ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بیس رکعت تراویح نہیں پڑھی ہیں بلکہ آپ نے آٹھ رکعت پڑھی ہیں۔

اسی طرح مولانا محمد حسن صدیقی نانوتوی کنز کے حاشیہ پر فرماتے ہیں : ولا بأس بان يقال التراويح سنة عمر لان النبي صلى الله عليه وسلم لم يصلها عشرين بل ثمانيًا۔ یعنی کچھ خطرہ نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ بیس تراویح سنت عمری رضی اللہ عنہ ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بیس رکعت تراویح نہیں پڑھی ہیں بلکہ آٹھ پڑھی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سنت عمری رضی اللہ عنہ ہے، سنت نبوی نہیں پس ہم (حنفیہ) سنت عمری جان کر پڑھ لیتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو سند صحیح کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا کسی دیگر خلیفہ راشد سے بیس تراویح قولاً یا فعلاً ثابت نہیں ہیں بلکہ گیارہ رکعت بمع وتر کا حکم دینا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ چنانچہ موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں ہے، سائب بن یزید کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ لوگوں کو رمضان میں گیارہ رکعت پڑھائیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے المصابیح میں ایک روایت سائب بن یزید سے یہ نقل کی ہے کہ وہ کہتے ہیں : كنا نقوم في زمان عمر ابن الخطاب باحدى عشرة ركعة یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہم لوگ گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ سنت عمر رضی اللہ عنہ بھی سنت نبوی کے موافق ہے۔ اب اگر اس کے خلاف کوئی روایت ہو بھی تو وہ اول تو قابل قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ سنت نبوی اور سنت عمری کے خلاف ہو گی۔ دوم وہ نفل کے طور پر تراویح ہو گی نہ کہ سنت کے طور پر۔ سوم یہ کہ عوام مقلدین نماز تراویح پڑھتے ہیں تو سنت رسول ہی کہتے ہیں اور متابعت رسول ہی کی نیت باندھتے ہیں، کبھی کسی حنفی سے یہ نہیں سنا گیا کہ اس نے نیت کرتے وقت سنت عمری رضی اللہ عنہ کہا ہو بلکہ عوام تو سنت عمر رضی اللہ عنہ کسی نماز کو جانتے ہی نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ بیس تراویح کو سنت رسول جان کر اہتمام سے پڑھنا بدعت ہے جو بجائے ثواب کے گناہ ہے' فافهم وتلبرو ولا تكن من المعاندين۔

مجالس الابرار میں ہے : شرط اخر لابد منه وهو ان يكون العمل موافقا للسنة لان العمل متى كان على خلاف السنة لا يقبله الله تعالى۔ یعنی عمل کی قبولیت کے لیے ایک اور ضروری شرط یہ ہے کہ وہ سنت کے موافق ہو' کیونکہ اگر سنت کے خلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول نہ کرے گا۔

ایک اور طریق سے بیس رکعت تراویح کا خلاف سنت ہونا: فتاویٰ قاضی خاں سے مجالس الابرار میں منقول ہے کہ ان لم يكن عارفا باهل زمانه فهو جاهل۔ یعنی جو شخص اپنے زمانہ کے لوگوں کا حال نہ پہچانے تو وہ جاہل ہے۔

پھر لکھا ہے کہ اس زمانہ کے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کی طبیعتیں ایسی پستہ ہیں کہ ان کا مطیع ہونا دشوار ہے جیسے قرآن میں ہے کہ راہ ہدایت دیکھیں تو اس کو اختیار نہیں کرتے اور اگر راہ الٹی دیکھیں تو اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس بناء پر افضل یہ ہے کہ امام جماعت کی حالت کے موافق رغبت اور نفرت کا لحاظ رکھ کر نماز پڑھایا کرے۔ اس قدر قرآت کرے کہ جس میں جماعت سے لوگ نفرت نہ کریں۔ جماعت کا زیادہ ہونا تطویل قرآت سے بہتر ہے۔ ان لوگوں نے تراویح کی علات کر لی ہے عبادت نہیں جانتے کہ جس میں قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے تراویح میں قرآت وغیرہ کی شرط کی ہے۔

یہ لوگ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں جو نہ رکوع پورا کرے اور نہ سجدہ پورا کرے اور نہ قومہ اور نہ جلسہ اور نہ قرآن پڑھنے میں ترتیل کرے جیسے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے بلکہ وہ جلدی سے راگنی میں بایں طور پڑھتا ہے کہ بعض کلمات کے حروف یا حرکات رہ جاتی ہیں۔ حالانکہ بزازیہ میں مذکور ہے کہ راگنی میں قرآن کا پڑھنا بالاتفاق حرام ہے۔ امام اگر راگنی میں پڑھتا ہے تو اگر کوئی شخص اُس مسجد کو چھوڑ کر اور مسجد میں جا کر پرہیزگار امام کے پیچھے پڑھے تو گنہگار نہ ہو گا۔ لیکن اب معاملہ برعکس ہے کہ اپنی مسجد کو بلا عذر چھوڑ کر اس مسجد میں جاتے ہیں جہاں طرح طرح کے نغمے اور راگ سے پڑھتے ہیں اور ایسا امام تلاش کرتے ہیں جو نہ رکوع پورا ادا کرے اور نہ سجدہ پورا ادا کرے اور نہ قرآن کو ترتیل سے پڑھے بلکہ

ربما ینکرون علی من یتم الرکوع والسجود ویرتل القرآن وینفرون عنه ویکونون عن الذین اتخذوا دینهم لعبا ولهوا وغرتهم الحیوة الدنیا وهم عن الاخرة غافلون۔
یعنی ایسے اماموں پر اعتراض کرتے ہیں جو رکوع اور سجدہ پورا کرے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح پڑھے اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ ان لوگوں سے ہیں جنہوں نے اپنے دین کو ہنسی کھیل ٹھہرایا ہے اور دنیا کی زندگی کا فریب کھایا ہے اور وہ آخرت سے غافل ہوئے۔
انتهى کلامه مترجمًا۔

مجالس الابرار کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ لوگوں کی حالت کے موافق قرأت کرے اور جس قدر پڑھے ترتیل سے پڑھے اور اس کو عبادت جان کر ادا کرے نہ کہ عادت کے طور پر۔ اب جو لوگ اس کا خلاف کر رہے ہیں کہ حفاظ قرآن کو مسجدوں میں مقرر کرتے ہیں اور وہ نہایت جلدی فرفر پڑھتے ہوئے پارہ ختم کرتے ہیں یا راگنی سے پڑھتے ہیں اور ستائیسویں کو قرآن ختم کر دیتے ہیں اور رکوع' سجود' قومہ' جلسہ شرع کے مطابق ادا نہیں کرتے' یہ لوگ محض عادت پوری کرتے ہیں۔ ایسی عبادت نہیں کرتے کہ جس میں قرب الٰہی حاصل ہو بلکہ جو دل لگا کر عبادت کرے اس پر اعتراض کرتے ہیں اور نفرت رکھتے ہیں حتیٰ کہ دوسری مسجد میں جس میں کہ جلدی تراویح پڑھائی جاتی ہو' چلے جاتے ہیں۔ سو ایسے لوگ گنہگار ہیں جن کو بجائے ثواب کے گناہ وصول ہوتا ہے۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ نماز تراویح نہ پڑھیں اور صرف فرضی نماز اور سنت رواتب پر کفایت کر لیں' کیونکہ روزہ بغیر تراویح کے بھی ہو جاتا ہے۔ اگر تراویح کا ثواب حاصل کرنا ہو اور طبیعت پر زیادہ بوجھ بھی نہ ڈالنا ہو تو اکیلے گھر جا کر پڑھ لیا کرے یہ بھی ثابت اور درست ہے۔ الدین یسر' دین الٰہی میں تو بڑی آسانی ہے جس کو چاہے اختیار کرے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ اعتراض تو اہلحدیثوں پر بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ان کا امام اور مقتدی اس حالت سے پڑھیں گے تو ان کو بھی ویسا ہی گناہ ہو گا' اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اہلحدیث عموماً آہستگی سے پڑھتے ہیں کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ جلدی نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی' مسترد کر دی جاتی ہے اور حنفی جلدی جلدی پڑھتے ہیں بلکہ آج کل تو حنفی کی تعریف ہی یہ ہے کہ جو جلدی جلدی نماز پڑھے اور آخر وقت وہ پختہ حنفی ہے اور جو اس کا عکس کرے وہ وہابی ہے۔

دوم اہلحدیث نماز تراویح آٹھ رکعت پڑھتے ہیں جو شارع کی جانب سے خود ہی آسان عدد ہے اور مقلدین نے بیس کی گنتی پوری کرلی ہے جو بعد کے لوگوں نے یہ تعداد تطویل قرآت کی جگہ بڑھائی تھی۔ یہ گنتی چونکہ زیادہ ہے خاص کر اگر ترتیل قرآت مسنون طریق پر کی جائے اور ہر چہارگانہ کے بعد اسی قدر بیٹھا جائے اور رکوع سجود وغیرہ پوری مقدار سے کیا جائے تو حنفیہ کو پڑھنا ہی غیر ممکن ہو جائے۔ اس لیے خلاف ترتیل اور جلدی جلدی پڑھتے ہیں اور رکوع' سجود' قومہ' جلسہ وغیرہ پورا نہیں کرتے۔ ایسے چالاک اور ہوشیار اماموں کے نام ریل گاڑی' ڈاک گاڑی' بمبئے میل وغیرہ رکھے ہوئے ہیں کیونکہ یہ ریل کی طرح تیز چلتے ہیں۔

سوم یہ کہ اہل حدیث اول رات پڑھنا اور جماعت سے پڑھنا لازم نہیں جانتے۔ طبیعت اکتا جائے تو اکیلے بھی پڑھ لیتے ہیں اور بعض آخر رات بھی پڑھ لیتے ہیں اور مسجد کے علاوہ گھروں میں بھی پڑھ لیتے ہیں۔ غرضیکہ جیسے جیسے شارع سے آسانیاں ثابت ہیں' ویسے عمل کر لیتے ہیں۔ اس طرح کی پابندی نہیں کرتے کہ نفرت تک نوبت پہنچ جائے۔ برخلاف اس کے حنفیہ نے بڑی پابندی کی ہوئی ہے کہ جماعت سے ضرور پڑھے اور اول رات ہی پڑھے اور مسجد میں پڑھے اور تمام قرآن ضرور سنے' کیونکہ اگر نہ سنا تو اندیشہ ہے کہ ستائیسویں کو کچھ دے گا نہیں اور تراویح ضرور پڑھے ورنہ روزہ نہ ہو گا۔

پس ان پابندیوں کی وجہ سے امام کو اور مقتدیوں کو ضرور اپنی ڈیوٹی پوری کرنی ہوتی ہے' خواہ دل میں نفرت ہی آتی رہے اور خواہ جلدی کرنی پڑے۔ ایک رسم' علت کو ضرور پورا کر دیا جائے' انا للہ۔ یہ معمول عام طور پر شہروں اور دیہاتوں میں حنفیہ کا پایا جاتا ہے جس کو شبہ ہو وہ مختلف مقامات کی گشت لگا کر خود مشاہدہ کر لے' اس کو خود ہی روشن ہو جائے گا کہ حنفی دنیا بیس عدد کے جال میں پھنس کر نماز کا کیا حال کر رہی ہے اور ان کے امام انجن کی طرح کیسی تیزی میں گرفتار ہیں۔ ہمارے کہنے کی بات نہیں ہے' حنفی دنیا کا عمل خود شہادت دے گا۔

بیس رکعت تراویح پڑھنے کے بیسیوں نقصان: یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ حنفیہ ہی کی کتابوں سے نقل کر کے کہہ رہے ہیں۔ اب اور عجیب بات سنئے :

زمانہ حاضرہ میں جو حنفی لوگ اپنی عادت کے موافق بیس رکعت تراویح پڑھتے ہیں' ان کو بجائے ثواب ودرجہ ملنے کے بیسیوں گناہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی تفصیل حنفیہ کی معتبر کتاب مجالس الابرار مجلس اٹھائیسویں سے مندرجہ ذیل ہے :

مئولف مجالس الابرار فرماتے ہیں کہ "جس نے تراویح ایسے طور پر پڑھیں کہ نہ رکوع پورا کیا نہ سجدہ' نہ قومہ پورا کیا نہ جلسہ اور نہ ان میں طمانینت تو وہ گنہگار مستحق عذاب ہوا اور اس آیت کے مصداق ہوا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا : الذین ضل سعیهم فی الحیوۃ الدنیا وهم یحسبون انهم یحسنون صنعا۔ یعنی وہ لوگ کہ گم ہو گئی کوشش اُن کی زندگانی دنیا میں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم خوب کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے خسران مبین اور غبن عظیم ہے یعنی روز قیامت کو کچھ ثواب حاصل نہ ہو گا۔

یہاں ایک عجیب نکتہ ہے جس کا بیان کرنا ضروری ہے تاکہ انصاف اور حق کی طرف میلان ہو۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ بیس رکعت تراویح کی ہر رکعت میں ایک قومہ اور ایک جلسہ ہے اور دونوں میں اطمینان کرنا ہے' اُن میں سے جس کو بھی ترک کرے گا گنہگار ہو جائے گا پس اگر ایک میں طمانینت ترک کی تو بیس تراویح کے بیس گناہ ہوئے اور اگر قومہ اور جلسہ ترک کر دیئے گئے تو تمام چالیس گناہ ہوئے اور اگر ان کے ساتھ برملا مسجد میں معصیت کرنی بھی ساتھ ملا لیں تو تمام گناہ ایک سو ساٹھ ہوئے اور اگر ان کے ساتھ یہ گناہ بھی ملا لیے جائیں کہ جس رکعت کا قومہ یا جلسہ یا ان میں طمانینت فوت ہوئی اس کا اعادہ کرنا واجب تھا اور اس نے اعادہ نہ کیا تو یہ ترک واجب کا گناہ ہوا تو سب مل کر ایک سو اسّی گناہ ہوئے۔

علاوہ ازیں اس جلد بازی میں جو ذکر انتقالات کے اندر مشروع ہیں وہ انتقال کے پورا کرنے کے بعد کئے جاتے ہیں' جس میں دو کراہتیں ہیں۔ ایک اس ذکر کو اس مقام سے ٹال دینا' دوسرا غیر جگہ رکھ دینا۔ اس سے چار چار مکروہ لازم آئے اور چار سنتوں کا ترک کرنا لازم آیا مثلاً جس نے قومہ یا قومہ کے اندر طمانینت کو ترک کیا تو سمع اللہ لمن حمدہ اور اللہ اکبر جھکتے ہوئے کہنے میں آئیں گے بلکہ "اللہ اکبر" بعد سجدہ کے کہنے میں آئے گا اور طریق مسنون یہ تھا کہ سمع اللہ لمن حمدہ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے کہے (اور ربنا ولک الحمد آخر تک دعا بھی قومہ میں پڑھنی مسنون ہے) اور تکبیر سجدہ کو جھکتے ہوئے کہے اور ایسے ہی اگر جلسہ ترک کرے یا جلسہ میں طمانینت کو ترک کرے تو کچھ لفظ پہلی تکبیر کے

جھکتے ہوئے کہنے میں آئیں گے بلکہ کچھ لفظ دوسری تکبیر کے سجدہ کے بعد کہنے میں آئیں گے۔ (جلسہ میں رب اغفرلی دعا مسنون ہے' یہ کہاں کہنے میں آئے گی؟؟) اور طریق مسنون یہ تھا کہ پہلی تکبیر سجدہ سے اٹھتے ہوئے کہے اور دوسری تکبیر جھکتے ہوئے کہے (درمیان دونوں تکبیروں کے جلسہ کے وقت طمانینت کی حالت میں اللّٰھم اغفرلی وارحمنی آخر تک دعا پڑھنی بھی مسنون ہے' وہ کیوں ھضم کر گئے) سو اب مکروہات کی گنتی تمام رکعتوں (بیس تراویح) میں اسی ہو جائے گی اور اس سے اسی سنتیں چھوٹ جائیں گی اور اگر ان مکروہات کا اظہار شامل کریں کیونکہ مکروہ امر کا ظاہر کرنا بھی مکروہ ہے تو تمام مکروہات ایک سو ساٹھ ہو جائیں گے اور ایک سو ساٹھ سنتیں ترک ہوں گی۔

اب کیا وہ شخص عاقل شمار کیا جائے گا جو رمضان کی راتوں میں ہر رات ایک سو اسی گناہ کرے اور ایک سو ساٹھ مکروہ کام کرے اور ایک سو ساٹھ سنتیں ترک کرے۔ (حالانکہ یہ مہینہ عبادت کرنے کا تھا نہ کہ رات کو مسجدوں میں گناہ کرنے کا) جب ہر ہر سنت (کو خراب کرنے) پر عتاب اور شفاعت سے محرومی ہے تو پھر مرد عاقل کب پسند کرتا ہے کہ اپنے آپ کو رسول رب العالمین کی شفاعت سے محروم کرے جس کی تمام خلق حتیٰ کہ انبیاء اور اولیاء اور صلحاء بھی امیدوار تلاش رکھیں گے۔ انتھی مترجمًا۔

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ مقلدین احناف کا اکثر منیع (فعل) جو یہ ہے کہ نماز تراویح جلدی جلدی ادا کرتے ہیں اور اپنے زعم میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت عبادت کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے' دراصل بجائے ثواب کے ان کو گناہ ہوتا ہے اور گناہ بھی ایک نہیں بلکہ بیسیوں۔ چنانچہ اوپر حساب ہو چکا ہے اور یہ سب کچھ حنفی مذہب کی بابت لکھا گیا ہے ورنہ قرآن وحدیث کی رُو سے تو ان کے پلہ میں خاک بھی نہیں ہے۔ نہ ان کے فرض قبول ہیں اور نہ سنن' رواتب اور نہ نوافل کیونکہ سب خلاف سنت اور موافق اپنی عادت کے ادا کرتے ہیں۔

ان کے قیام' قرأت' رکوع' قومہ' جلسہ' سجدہ' تشہد وغیرہ اور ان جگھوں کے اذکار اور دعائیں قرآن وحدیث کے موافق نہیں ہیں۔ ایک طرف کتب حدیث نکال کر نماز نبوی کا نقشہ سامنے رکھیں اور دوسری طرف مقلدین حنفیہ کی نماز کا فوٹو اتاریں اور پھر دونوں کا تقابل کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میں سیاہ اور سفید' مشرق ومغرب کا فرق ہے اور اہل انصاف کو یقین ہو

جائے گا کہ ان لوگوں کی نماز کو نبی ﷺ کی نماز سے کچھ واسطہ ہی نہیں ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے : یاتی علی الناس زمان یصلون ولا یصلون اور ولیصلین اقوام لاخلاق لھم۔ یعنی ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ نمازیں پڑھیں گے لیکن سب بے نماز رہیں گے' ان کو کچھ حصہ نہ ملے گا"

خیر ہم یہاں بروئے قرآن وحدیث ان کی نماز کی تنقید کرنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ لوگ ان تمام آیتوں اور احادیث کو جو ان کے عمل وعقیدہ کے خلاف ہیں' شافعیوں یا حنبلیوں یا مالکیوں یا اہلحدیثوں کی دلیلیں قرار دے کر ناقابل قبول جانتے ہیں یعنی اپنے گھر میں انہوں نے بٹوارہ کیا ہوا ہے جو مسائل کتب فقہ اور جو دلائل ان کی اپنی کتابوں میں ہیں' خواہ وہ ضعیف اور موضوع ہوں' ان کو ہی وحی آسمانی سمجھتے ہیں' اس لیے ہم فقہاء اور انہی کے علماء کی تصریح سے ان کی تردید کر رہے ہیں اور ہر چہار گانہ کے بعد بقدر چار رکعت ہی ان کو بیٹھنے کی ہدایت ہے۔

مجالس الابرار میں ہے : ویجلسون بین کل الترویحتین قدر ترویحۃ واحدۃ اس بیٹھنے میں جب بقدر ہر چہار رکعت کے دیر لگائیں اور پھر ہر چہار گانہ کو خوب اطمینان سے ادا کریں اور قرات بھی ترتیل مسنونہ سے پڑھیں اور پھر ایک پارہ قرآن کا بھی ختم کریں اور پھر دل میں گھبراہٹ اور نفرت بھی ظاہر نہ کریں تب ہم جانیں کہ یہ لوگ بہت عابد ہیں پھر صرف یہ سوال رہ جائے گا کہ اس کیفیت سے عبادت کرنا (ہر چہار گانہ پڑھ کر چہار گانہ کے قدر ہی بیٹھنا) اور اس گنتی سے تراویح پڑھنا قول یا فعل نبوی سے ثابت ہے یا نہیں باقی مذکورہ بالا اعتراض رفع ہو جائیں گے اور مرقومتہ الصدر گناہوں سے بچ جائیں گے ورنہ اب تو ہم از روئے فقہ حنفیہ بھی یہ کہتے ہیں کہ زمانہ حاضرہ کے ماہ رمضان المبارک میں بجائے عبادت کے عادت پوری کر کے بجائے ثواب کے گناہ حاصل کرتے ہیں اور یہ ہم نے اکثر کی بناء پر کہا ہے ورنہ جو احناف اہل انصاف اس کا ارتکاب نہیں کرتے' وہ قلیل کالمعدوم ہیں جو ہماری تحریر سے مستثنیٰ ہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں : ولقد صلیت فی مائۃ مسجد فما رأیت اھل مسجد یقیمون الصلوٰۃ علی ماجاء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعن اصحاب رضوان اللہ علیھم اجمعین۔ یعنی میں نے سو مسجدوں میں نماز

پڑھی ہے لیکن کسی مسجد والوں کو سنت نبوی ﷺ اور طریق صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے موافق نماز پڑھتے ہوئے نہیں پایا۔

اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ نازک حال ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو سنت رسول اللہ ﷺ اور طریق صحابہ رضی اللہ عنہم پر چلائے اور اسی پر خاتمہ کرے' آمین۔

عبدالقادر عارف حصاری (از گنگا ضلع حصار)

تنظیم اہلحدیث روپڑ

جلد ۹' شمارہ ۱۷۔ مورخہ ۳ و ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء

مسئلہ تراویح پر مناظرہ

موضوع پنج کوسی ضلع بہاولنگر میں عاجز نے جامع مسجد اہلحدیث میں خطبہ جمعہ پڑھتے ہوئے یہ مسائل بیان کئے کہ تراویح جس کو شرعی اصطلاح میں قیام رمضان کہا جاتا ہے' آٹھ رکعت اور تین وتر کل گیارہ رکعات سنت موکدہ ہیں جن کو گھر میں آخر رات کے وقت پڑھنا افضل ہے۔ مسجد میں جماعت سے پڑھنا جو عام طور سے ملکوں میں مروج ہے' یہ جائز ہے۔ اس پر دوام اور پابندی کر کے عمل کرنا اور حافظوں کو قرآن سنانے کے لیے مقرر کرنا اور پھر ان کو ستائیسویں رمضان میں اُجرت دینا یہ بدعت حسنہ ہے۔ سنت نبوی یا سنت خلفاء نہیں ہے۔ اپنے دلائل سنا کر خطبہ ختم کیا گیا۔ خطبہ چونکہ لاؤڈ اسپیکر پر بیان ہوا تھا' اس لیے دیوبندیوں' بریلویوں' حنفیوں نے سنا' تقریر میں خطیب نے یہ بھی کہا تھا کہ بیس رکعت تراویح کو سنت موکدہ جان کر اور زبان سے کہہ کر ہمیشہ پڑھنا بدعت ہے' اس کا ثبوت سنت نبوی اور سنت خلفاء سے نہیں ملتا۔

حنفی مولویوں نے اِن تمام مسائل کی مخالفت کی اور رات کو ان کے مولوی مسمی نور جمال صاحب نے لاؤڈ اسپیکر پر ایک گھنٹہ تقریر کی اور کہا بیس رکعت تراویح سنت موکدہ ہیں اور مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھنا سنت ہے اور ثواب زیادہ ہے' کیونکہ قرآن تراویح میں سنا جاتا ہے۔ اس پر یہ دلائل دیئے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین دن تراویح پڑھائی اور جماعت کے ساتھ یہ نماز ادا کی۔ پھر فرض ہونے کے اندیشے سے جماعت نہ پڑھی' لوگ اکیلے پڑھتے رہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے لیے امام مقرر کیا' وہ بیس رکعت پڑھاتا

رہا پھر ہمیشہ یہ تعامل جاری رہا اور اب تک تمام ملکوں میں اس پر عمل قائم ہے۔ بارہ سال تک تمام لوگ بیس رکعت ہی ادا کرتے رہے پھر دو سو سال سے فرقہ اہلحدیث نے جو بعد میں پیدا ہوا' گیارہ رکعت تراویح کا عمل شروع کر دیا جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بیس تراویح کا ثبوت احادیث میں پایا گیا ہے۔

پھر اس دعوے پر یہ دلائل پیش کئے : (ا) ابن ابی شیبہ' طبرانی' بیہقی' ابن عدی اور بغوی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے : كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔" اس سے بیس رکعت تراویح کا ثبوت پایا گیا تو یہ سنت ہیں۔

(۲) موطا امام مالک میں یہ روایت ہے : كان الناس يقومون في زمن عمر بن الخطاب في رمضان بثلاث وعشرين ركعة۔ یعنی "لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مع وتر ۲۳ رکعت پڑھتے تھے۔" اس سے بیس تراویح سنت خلفاء ثابت ہوئیں۔

(۳) حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : فسیری بعدی اختلافا كثيرا فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين۔ "میرے بعد مسائل میں بہت اختلاف پیدا ہو جائے گا' پس تم میری سنت اور خلفاء کی سنت کو لازم پکڑو۔" پس بیس تراویح سنت نبوی اور سنت خلفاء ہے' جس پر ائمہ دین کا تعامل رہا ہے۔ گیارہ رکعت ثابت نہیں ہیں۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ روایت ہے : عن يحيى بن سعيد ان عمر بن الخطاب امر رجلا ان يصلي بهم عشرين ركعة۔ "یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھایا کرے۔" اس سے یہ ثابت ہوا کہ عہد فاروق رضی اللہ عنہ میں بیس تراویح کا تعامل فرمان عمر رضی اللہ عنہ سے جاری ہوا۔

(۵) عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں بیہقی سے منقول ہے : كانوا يقومون على عهد عمر بعشرين ركعة وعلى عهد عثمان وعلى مثله۔ "لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے اور ایسا ہی حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے عہد میں ہوا۔" اس سے تین خلفاء کا تعامل بیس تراویح پر ثابت ہوا۔

(۶) ہدایہ میں ہے : واظب عليه الخلفاء الراشدون۔ "کہ بیس تراویح پر خلفاء الراشدین نے ہمیشگی کی ہے۔" جب خلفاء راشدین کا دائمی تعامل ثابت ہوا تو بیس ہی سنت

قرار پائیں۔

(۷) ترمذی میں اہل علم کا اختلاف ذکر کر کے یہ لکھا ہے : واکثر اهل العلم علی ما روی عن علی وعمر وغیرهما من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم عشرین رکعة یعنی "اکثر اہل علم کا عمل ان روایتوں پر ہے جو حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں کہ وہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے۔" پس یہ تعامل درست ہے جس پر ہم حنفیوں کا عمل ہے۔

(۸) دیگر یہ روایت ہے کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ماہ رمضان میں قاریوں کو بلایا اور ان میں سے ایک شخص کو یہ حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھایا کرو اور وتر آپ پڑھا دیا کرتے تھے۔" اس سے بھی تعامل خلفاء کا بیس تراویح پر ثابت ہوا۔

(۹) ایک اور روایت میں یوں ہے : عن ابی الحسنا ان علی ابن ابی طالب امر رجلا یصلی بنا خمس ترویحات عشرین رکعة۔ یعنی "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیس تراویح پڑھانے کا ایک شخص کو حکم دیا۔" اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ تراویح بیس ہی عدد ہیں۔

(۱۰) امام شافعی' امام احمد' امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ چاروں امام بیس تراویح کے قائل ہیں۔

(۱۱) تراویح اور تہجد دو جداگانہ نمازیں ہیں۔ تراویح سے پہلے تہجد بطور فرضیت کے جاری تھا اور تراویح بعد میں مسنون ہو کر جاری ہوئی۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "سننت قیامه"

(۱۲) حضرت طلق بن علی صحابی رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو نماز تراویح پڑھائی پھر گھر جا کر مسجد میں لوگوں کو تہجد پڑھایا اور وتر نہ پڑھائے۔ اس کے لیے کسی اور شخص کو آگے کر دیا اور کہا کہ میں پہلے وتر پڑھا چکا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔ اس فعل صحابی سے تراویح اور تہجد دو نمازیں ہونا ثابت ہوا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جو روایت اہلحدیث پیش کرتے ہیں' اس میں صلوٰۃ رمضان سے مراد تہجد ہے۔

(۱۳) تابعین بھی بیس تراویح پڑھتے رہے جیسا کہ عینی نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ سعید بصری' عبدالرحمٰن بن ابوبکر' بشیر بن شکل' ابن ابی الملیکہ' حارث ہمدانی' عطاء بن ابی

رباح اور ابو البختری رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابہ اور تابعین کی پیروی ضروری ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ میرے صحابہ مثل ستاروں کے ہیں' ان میں سے جس کی پیروی کرلی' ہدایت پالی۔

پس اس طرح اس حنفی مولوی نے کسی حنفی عالم کی کتاب سے یہ دلائل سنا دیئے۔

جوابات عارف حصاری : عاجز عارف حصاری نے اپنے وقت میں ان کے جوابات دیئے' جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرات! حنفی مولوی نے جو بیس تراویح کے دلائل پیش کئے ہیں' یہ اصول حدیث اور اصول فقہ کی رُو سے ضعیف ہونے کی وجہ سے مردود ہیں۔ یہ ہوا کے عارضی بادل ہیں جو لوگوں کے سروں پر طاری کر دیئے ہیں۔ اب میرے جوابات اور آٹھ رکعت تراویح کے قوی اور راجح دلائل سنئے' جن سے یہ ہوائی بادل چھٹ جائیں گے اور صداقت کا سورج صاف ہو کر روشنی دے گا۔

(ا) ان کی پہلی دلیل حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کا جواب یہ ہے کہ اس کی اسناد عینی شرح بخاری جلد۔۲' ص۔۳۵۹ میں یوں ہے : حدثنا منصور بن مزاحم حدثنا ابو شیبة عن الحکم عن مقسم عن ابن عباس کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یصلی فی رمضان عشرین رکعة والوتر۔ "کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس تراویح اور وتر پڑھا کرتے تھے۔"

اس روایت کی جس قدر سندیں ہیں' ان سب میں راوی ابو شیبہ جس کا نام ابراہیم بن عثمان ہے' وارد ہے جو نہایت درجہ کا ضعیف ہے۔ خود عینی حنفی نے ہی اس راوی کی جرح نقل کر دی ہے کہ امام شیبہ نے اس کو جھوٹا کہا ہے اور امام احمد اور امام یحییٰ' امام بخاری اور امام نسائی وغیرہم اور دیگر ائمہ نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام عدی نے کامل میں صراحت کی ہے کہ اس کی یہ حدیث منکر روایتوں میں شامل ہے۔ تقریب میں حافظ ابن حجر نے اس کو متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ حافظ صفی الدین نے تہذیب الکمال میں لکھا ہے کہ ابوداؤد نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ نسائی نے بتایا ہے کہ یہ متروک الحدیث ہے۔ یہ ایسا ضعیف ہے کہ کسی نے بھی اس کو ثقہ اور عادل نہیں کہا ہے' اس لیے علماء احناف کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یہ راوی ضعیف ہے۔ اس بنا پر یہ روایت ناقابل استدلال ہے۔

چنانچہ علامہ ابن ہمام فتح القدیر شرح ہدایہ جلد اول' ص۔۲۰۵ میں فرماتے ہیں : حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہا ضعیف بابی شیبہ ابراہیم بن عثمان جد الامام ابی بکر بن

ابی شیبہ متفق علٰی ضعفہ مع مخالفۃ الصحیح۔ یعنی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ابی شیبہ راوی ہے جس کے ضعف پر سب ائمہ کا اتفاق ہے۔ پھر یہ ضعیف روایت صحیح حدیث کے خلاف ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے۔

فتح الباری شرح بخاری جلد۔۲' ص۔۳۱۷ میں ہے : حدیث ابن عباس ..... فاسنادہ ضعیف وقد عارضہ حدیث عائشۃ الذی فی الصحیحین۔ یعنی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اسناد ضعیف ہے اور یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے مخالف ہے جو بخاری و مسلم میں وارد ہے۔

اس صراحت سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ حنفیہ کی پیش کردہ دلیل بالاتفاق ضعیف ہے' جس سے استدلال باطل ہے' کیونکہ جو حدیث ضعیف احکام کے بارہ میں وارد ہو' وہ ناقابل احتجاج ہوتی ہے۔

امام نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں : ان کان یصرف ضعفہ لم یحل لہ ان یحتج بہ فانھم متفقون علٰی انہ لا یحتج بالضعیف فی الاحکام جلد۔۱' ص۔۲۱ یعنی اگر معلوم ہو کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو اس سے دلیل پکڑنا حلال نہیں ہے' اس لیے کہ ائمہ فقہاء و محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ احکام میں ضعیف حدیث سے دلیل نہ لائی جائے۔ پس حنفیہ کا اس روایت سے دلیل لانا باطل ہے۔

دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جو بخاری و مسلم میں ہے جس میں رمضان کی نماز کا سوال وجواب ہے' وہ قیام رمضان تراویح کو بھی شامل ہے۔ اس کو صرف تہجد پر محمول کرنا بالکل غلط ہے کیونکہ ائمہ محدثین اور فقہاء حنفیہ جن کو پوری فقاہت حاصل تھی' حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں قیام رمضان کو شامل سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام ابن حجر اور علامہ ابن ہمام نے روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف اور معارض قرار دیا ہے کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا گیارہ رکعت قیام رمضان کی مثبت ہے۔

ملا علی قاری حنفی مرقاۃ جلد۔۲' ص۔۱۷۵ میں امام ابن تیمیہ سے نقل کرتے ہیں : اعلم انہ لم یوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی التراویح عددا معینا بل لا یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علٰی احدی عشرۃ رکعۃ۔ یعنی یہ بات جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کا کوئی خاص عدد قولاً مقرر نہیں کیا لیکن عملاً رمضان اور غیر رمضان میں رات کو

گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب ما ثبت بالسنۃ کے ص۔۲۴۲ پر رقمطراز ہیں: لکن المحدثین قالوا ان ھذا الحدیث (حدیث ابن عباس) ضعیف والصحیح ما روتہ عائشۃ انہ صلی احدی عشرۃ رکعۃ کما ھو عادتہ فی قیام اللیل وروی انہ کان بعض السلف یصلون باحدٰی عشرۃ رکعۃ قصدا للتشبہ برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ یعنی محدثین نے کہا ہے کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ تو ضعیف ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ رکعتیں مع وتر پڑھی ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے' یہی عادت آپ کی تہجد میں تھی۔ (اور یہی قیام رمضان میں) اس لیے عہد خلافت عمر بن عبدالعزیز میں بعض سلف صالحین سنت نبوی کے ارادہ سے گیارہ رکعت ہی پڑھتے تھے۔

پس حنفیہ کا یہ کہنا بھی باطل ہوا کہ عہد نبوی سے بارہ سو سال تک بیس تراویح کا رواج رہا۔ پھر دو سو سال سے فرقہ اہلحدیث نے گیارہ رکعت تراویح کو رواج دیا جبکہ یہ تعامل عہد نبوی سے جاری ہے۔

(۴) موطاء کی روایت جو زمانہ عمر کے بارہ میں پیش کی ہے کہ لوگ اس وقت بیس تراویح پڑھتے تھے' یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بیان کرنے والا راوی یزید بن رومان ہے' جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا' وہ بعد میں پیدا ہوا۔ لہٰذا یہ روایت منقطع ہے اور منقطع روایت ضعیف ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ زیلعی حنفی نصب الرایہ جلد۔۱' ص۔۲۹۴ میں لکھتے ہیں: ویزید بن رومان لم یدرک عمر۔ کہ یزید بن رومان نے عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ اسی طرح جناب عینی حنفی عمدۃ القاری شرح بخاری جلد۔۲' ص۔۸۰۴ میں لکھتے ہیں: ویزید لم یدرک عمر ففیہ انقطاع۔ یعنی یزید نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا' اس کی سند منقطع ہے۔

پھر اس روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ عہد فاروقی میں بیس رکعت تراویح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے پڑھتے تھے یا خود بخود نفل کے طور پر رمضان میں زیادہ عبادت کے شوق سے پڑھتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس صریح اور صحیح سند سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے لوگ گیارہ رکعت تراویح پڑھتے تھے۔ چنانچہ موطا امام مالک ص۔۴۰ میں

ہے: عن السائب بن یزید انہ قال امر عمر بن الخطاب ابی بن کعب و تمیما الداری ان یقوما للناس باحدی عشرۃ رکعۃ۔ یعنی سائب بن یزید نے بیان کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو شخصوں کو حکم فرمایا' ایک ابی بن کعب اور دوسرا تمیم داری رضی اللہ عنہما کو کہ لوگوں کو گیارہ رکعت تراویح پڑھایا کریں۔ قیام اللیل ص۔۱۹۱ میں بھی یہ روایت درج ہے۔

امام بیہقی نے اپنی کتاب معرفۃ السنن والآثار جلد۔۱' ص۔۴۴۷ میں امام شافعی اور امام مالک کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ تراویح پڑھائیں۔ پس عہد فاروقی میں لوگ گیارہ رکعت ہی پڑھتے رہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے اپنے رسالہ المصابیح فی صلوٰۃ التراویح کے ص۔۱۹ میں سعید بن منصور کی یہ روایت نقل کی ہے: حدثنا عبدالعزیز بن محمد حدثنی محمد بن یوسف سمعت السائب بن یزید یقول کنا نقوم فی زمن عمر بن الخطاب باحدی عشرۃ رکعۃ۔ سائب نے بیان کیا کہ ہم زمانہ عمر رضی اللہ عنہ میں گیارہ رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں: سندہ فی غایۃ الصحۃ۔ کہ اس اثر کی سند نہایت صحیح ہے۔

اس حدیث موقوف سے چار باتیں ظاہر ہوئیں۔ اول یہ کہ یزید کی روایت جو دلیل حنفیہ کی ہے' سراسر باطل ہے۔ کیونکہ ہماری پیش کردہ صحیح روایت سے گیارہ کا تعامل ثابت ہے۔ دوسرا یہ کہ زمانہ فاروقی کا یہ تعامل حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جاری ہوا۔ تیسرا یہ کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں جس گیارہ رکعت کا ذکر رمضان اور غیر رمضان میں ہے' وہ تراویح کو بھی شامل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی فعلی سنت پر بنیاد رکھ کر گیارہ کا حکم نافذ کیا تھا۔ چوتھا یہ امر کہ گیارہ رکعت تراویح کا عمل عہد نبوی اور عہد فاروقی سے جاری چلا آرہا ہے۔ دو سو سال سے جاری بتانا جھوٹ اور دین میں بددیانتی ہے جیسا کہ جھوٹوں کا شیوہ ہے۔

(۳) تیسری دلیل مسلم ہے کہ اختلاف کے وقت اس امر کو لازم پکڑنا چاہیے جو سنت نبوی اور سنت خلفاء ہو۔ چنانچہ مسئلہ تراویح میں اہلحدیث لوگوں نے سنت نبوی اور سنت خلفاء گیارہ رکعت کو لازم پکڑا ہے۔ حدیث فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین میں سنت خلفاء سے مراد نبوی سنت کے علاوہ دوسری سنت نہیں کہ عہد نبوی میں اسلام مکمل ہو گیا تھا۔ پھر خلفاء شارع نہ تھے کہ اپنا علیحدہ طریقہ جاری کرتے۔ اگر کوئی مصلحت یا انتظام

کے طور پر کام کیا تو اس کو اجتہادی طور پر کیا کہ کسی حکم نبوی سے استنباط کر لیا۔ پھر بھی اس کو سنت قرار نہ دیا۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز تراویح کے لیے دو امام مقرر کیے اور ان پر دائمی پابندی لگا دی تو اس کو سنت نہ کہا بلکہ بدعت حسنہ قرار دیا۔ اس لیے خود شامل نہ ہوئے بلکہ گھر میں آخر رات کے وقت پڑھتے تھے کہ سنت نبوی یہی ہے اور لوگوں سے بھی کہا کہ اول رات پڑھنے سے آخر رات کو پڑھنا افضل ہے۔ بہرحال حدیث مذکورہ میں سنت خلفاء سے مراد سنت نبوی ہے اور خلفاء کی سنت کو اس لیے ساتھ ذکر کیا کہ بعض امور خاصہ نبوی ہیں' خلفاء کے تعامل میں جو امور آگئے وہ سب امت کے لیے معمول بہ ہیں۔

نور الانوار میں یہ قاعدہ مذکور ہے : المعرفة اذا اعيدت كانت الثانية عين الاولى۔ یعنی معرفہ جب دوبارہ لایا جائے تو دوسرے کا مصداق عین اولیٰ ہوتا ہے' اس لیے اس قاعدہ کی رُو سے حدیث میں سنت خلفاء سے سنت نبوی ہی مراد ہے۔ شرح مسلم الثبوت ص۔۵۰۹ میں ہے : لان المجتهدين كانوا يخالفونهم والمقلدون كانوا يقلدون غيرهم ولم ينكر عليه احد لا الخلفآء انفسهم ولا غيرهم فعدم حجية قولهم كان معتقدهم۔ یعنی مجتہدین نے کئی مسائل میں خلفاء کی مخالفت کی ہے اور مقلدین بھی خلفاء کے سوا اوروں کی تقلید کرتے چلے آئے ہیں۔ جس پر کسی نے انکار نہیں کیا۔ نہ خلفاء نے اور نہ غیروں نے۔ پس خلفاء کے اقوال کا حجت نہ ہونا مقلدین کا اعتقاد تھا۔

میں کہتا ہوں اسی وجہ سے اذان عثمانی کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بدعت کہہ دیا تھا۔ بہرحال سنت نبوی اور سنت خلفاء گیارہ عدد تراویح ہیں۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے جو یہ دلیل ذکر کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھائے' اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی سند منقطع ہے' اس لیے کہ اس کی سند میں یحییٰ بن سعید ہے جو کہتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو بیس تراویح پڑھانے کا حکم دیا کہ لوگوں کو بیس پڑھایا کرے' اس راوی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنہ۔۲۳ھ میں شہید ہو گئے اور یحییٰ صغار تابعین میں سے ہے' جنھوں نے ایک دو صحابیوں سے ملاقات کی ہے۔ وہ سنہ۔۱۴۳ھ میں وفات پا گئے تھے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ اثر صحیح اثر کے خلاف ہے جو پہلے گذر چکا

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو شخصوں کو لوگوں کا امام مقرر کیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھایا کریں پھر بار بار حکم بدلنے کی کیا ضرورت تھی۔

(۵) بیہقی کے حوالہ سے جو یہ قول ذکر ہوا کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے زمانوں میں لوگ بیس تراویح پڑھا کرتے تھے' اس کا جواب یہ ہے کہ اس اثر کی سند میں ابو عبداللہ بن فنجویہ دینوری ہے۔ کتب رجال میں اس کا حال معلوم نہیں ہوا۔ پس یہ راوی مجہول الحال ہے' لہٰذا حجت نہیں ہے۔ اور پھر یہ اثر صحیح اثروں کے خلاف ہے۔ نیز اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ ان زمانوں میں لوگ خلفاء کے حکم سے پڑھا کرتے تھے یا خود نفلوں کے طور پر پڑھتے تھے جب تک یہ صراحت نہ ہو' یہ حجت نہیں ہے۔ دیگر یہ کہ اس اثر میں جو یہ الفاظ ہیں : وعلی عهد عثمان وعلی رضی الله عنهما مثله۔ یہ عبارت حدیث کی نہیں ہے' مدرج ہے۔ تحفۃ الاحوذی جلد اول' ص-۷۶۔

(۶) ہدایہ میں جو یہ لکھا ہے کہ خلفاء نے بیس رکعت تراویح پر مواظبت کی ہے' یہ صریح جھوٹ ہے' اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ چار خلفاء کیا ایک خلیفہ کے حکم یا اس کے عمل سے صحیح سند کے ساتھ تمام علماء حنفیہ ثبوت نہیں دے سکتے۔ درایہ تخریج ہدایہ ص-۱۲۳ میں حافظ ابن حجر نے ہدایہ کا کلام نقل کر کے یہ لکھا ہے : لم اجده۔ یعنی میں نے اس کا ثبوت کہیں نہیں پایا۔

(۷) ترمذی میں امام ترمذی کا یہ کہنا کہ حضرت عمر اور حضرت علی وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہما بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے۔ لفظ روی صیغہ مجہول کے ساتھ درج ہے۔ یہ لکھنا حجت نہیں ہے' جب تک ان صحابہ کرام سے صحیح سندوں کے ساتھ روایات نہ پیش کی جائیں' قابل قبول نہیں ہیں۔ دیکھو آمین بالجہر کی بابت اجماع صحابہ ہے کہ وہ آمین بلند آواز سے کہتے تھے جس کو عبدالرزاق نے یوں روایت کیا ہے : اخرج عبدالرزاق عن ابن جریج عن عطاء قال قلت له اکان ابن الزبیر یومن علی اثر ام القرآن قال نعم ویؤمن من ورائه حتی ان المسجد للجة۔ یعنی حضرت عطاء نے بیان کیا کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہی اور ان کے پیچھے جو لوگ تھے' سب نے آمین کہی کہ مسجد میں شور ہو گیا۔ اسے بیہقی نے اپنی دوسری سند سے ذکر کیا ہے۔ اذا قال الامام ولا الضآلین سمعت لهم رجة بآمین۔ یعنی حضرت عطاء نے بیان کیا کہ میں نے دو سو صحابہ کو اس مسجد

میں پایا کہ جب امام نے ولا الضآلین کہا تو میں نے ان سب سے سنا کہ انہوں نے بلند آواز سے آمین کہی۔

ان اثروں سے ثابت ہوا کہ آمین بالجہر پر صحابہ کا اجماع ہے لیکن حنفیہ ان احادیث کو نہیں مانتے اور ہمیشہ آہستہ آمین کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان مقلدین کو اپنے تقلیدی مذہب کی لاج رکھنی مقصود ہے' نہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع منظور ہے اور نہ صحابہ کی۔ ان کے امام کے قول کے مطابق ضعیف حدیث بھی مل جائے تو قبول ہے۔

(۸) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاریوں سے بیس تراویح پڑھانے کو کہا۔ یہ روایت بھی ضعیف ہے' کیونکہ اسناد میں حماد بن شعیب ہے۔ میزان میں ہے کہ ابن معین نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ امام بخاری نے متروک الحدیث کہا ہے۔ امام نسائی نے اسے ضعیف اور ابو حاتم نے غیر قوی کہا۔ ابن عدی نے کہا اس کی اکثر روایات کا اعتبار نہیں۔ دوسرا راوی عطاء بن سائب ہے جو حماد مذکور کا استاد ہے' اس کا حافظہ کمزور تھا۔ اب یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ حماد نے عطاء سے حافظہ خراب ہونے سے پہلے یہ روایت سنی یا بعد میں؟ پس یہ اثر مخدوش اور قابل استدلال نہیں ہے۔

(۹) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بیان کیا گیا کہ انہوں نے ایک شخص کو بیس تراویح پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ اس کی اسناد میں ابو الحسنا راوی ضعیف ہے' کیونکہ تقریب التہذیب کے ص۔۲۹۴ میں لکھا ہے کہ یہ ساتویں طبقہ کا راوی ہے جو مجہول ہے۔ پھر اس نے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکم بیان کیا ہے' یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کی ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہیں ہوئی' نہ ان کا زمانہ پایا۔ یہ کبار تبع تابعین سے ہیں جن کی ملاقات کسی صحابی سے نہیں۔ لہٰذا یہ دلیل ناقابل عمل ہے' جس سے دلیل پکڑنا صحیح نہیں۔

اسی طرح علامہ عینی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے' اس کی سند میں اعمش ہے جو بیس تراویح کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے' اس نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ چنانچہ تقریب ص۔۱۴۲ میں ہے : حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سنہ۔۳۲ھ یا سنہ۔۳۳ھ میں وفات پا گئے تھے اور اعمش کی بابت تقریب ص۔۱۴۳ میں ہے : وکان مولدہ اول احدی وستین۔ یعنی اعمش کی پیدائش سنہ۔۶۱ھ کے اوائل میں ہوئی ہے۔ جب وہ بعد میں پیدا ہوا تو وہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا حال کیسے بیان کر سکتا ہے' لہٰذا یہ دلیل بھی مردود ہے۔

مولانا عبدالرشید نعمانی نے دراسات اللبیب ص۔۳۴۳ کے حاشیہ میں امام حاکم کی کتاب اصول الاحادیث کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے: (ترجمہ) قاضی ابو یوسف نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ کسی شخص کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ کوئی حدیث روایت کرے مگر اس شرط سے کہ اس نے خود اس محدث کے منہ سے سنی ہو کہ جب سنے تو اس کو خوب یاد کرے پھر آگے بیان کرے۔

حنفیہ کے اکثر دلائل منقطع السند ہوتے ہیں کہ ان کی ملاقات مروی عنہ سے نہیں ہوتی' اس لیے وہ مردود ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ اسی لیے قلیل الحدیث تھے' ان کو ایسی احادیث موصول نہ ہوئیں جو کسی محدث کے منہ سے سنی گئی ہوں۔ تب انہوں نے اجتہاد سے کام لیا' پھر حنفیہ ان کے مسائل کو ضعیف روایتوں سے ثابت کرتے ہیں جو منہج باطل ہے۔ چنانچہ انہوں نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بیس رکعت تراویح نقل کی ہیں۔

مصنف ابن شیبہ نے ص۔۴۰۶ میں اس کی سند یوں نقل کی ہے: حدثنا حمید بن عبدالرحمٰن عن حسن عن عبدالعزیز بن رفیع قال ابی بن کعب یصلی بالناس فی رمضان بالمدینة عشرین رکعة ویوتر بثلاث۔ یعنی عبدالعزیز بن رفیع نے بیان کیا کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ماہ رمضان میں مدینہ میں لوگوں کو بیس تراویح اور تین وتر پڑھایا کرتے تھے۔

یہ روایت بھی منقطع السند ہے جو قسم ضعیف سے ہے۔ کیونکہ عبدالعزیز راوی نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ چنانچہ تقریب ص۔۱۷ میں ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فضلاء صحابہ سے تھے' وہ سنہ۔۳۲ھ میں وفات پا گئے۔ کوئی سنہ۔۱۹ھ میں بتاتا ہے' اختلاف ہے۔ اور عبدالعزیز کی بابت تقریب ص۔۲۱۴ میں ہے کہ وہ چوتھے طبقے کا راوی ہے جو سنہ۔۱۳۰ھ یا اس کے بعد ستر برس کی عمر سے متجاوز ہو کر فوت ہوئے۔ عبدالعزیز راوی نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا تو ان کا بیان باعتبار اصول امام ابوحنیفہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے اور پھر یہ صحیح سند سے روایت کردہ اثر کے خلاف ہے' جس میں یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو گیارہ تراویح پڑھانے کا حکم دیا۔ (ملاحظہ ہو موطاء امام مالک)

(۱۰) نمبر دس میں امام شافعی' امام مالک' امام احمد' امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ چار اماموں سے بیس تراویح نقل کی ہیں' یہ دلیل بھی باطل ہے۔ اول یہ کہ یہ ائمہ کے اقوال ہیں جو سنت نبوی اور سنت خلفاء کے مقابلہ میں حجت نہیں ہے اور عہد فاروقی کا تعامل حجت ہے کہ ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما لوگوں کو گیارہ تراویح پڑھاتے رہے۔

دوسرے یہ کہ زمانہ ائمہ سلف میں نفلی طور پر مختلف رکعتیں پڑھی گئی ہیں۔ اس بارہ میں گیارہ اقوال مروی ہیں۔ عمدۃ القاری شرح بخاری جلد۔۵' ص۔۳۵۵ میں علامہ عینی حنفی نے لکھا ہے : قد اختلف العلمآء فی العدد المستحب فی قیام رمضان علی اقوال کثیرۃ یعنی علماء سلف نے مستحب عدد میں اختلاف بہت کیا ہے کہ تراویح کتنی پڑھنی چاہئی' اس بارہ میں بہت سے اقوال وارد ہیں۔ پھر علامہ عینی نے ان اقوال کو ذکر کیا ہے کہ ایک قول اکتالیس کا ہے' جیسا ترمذی نے اہل مدینہ کا عمل نقل کیا ہے۔

دوسرا قول حافظ ابن عبدالبر نے استذکار میں اسود بن یزید سے ۴۰ رکعت نقل کی ہیں۔ تیسرا قول ۳۸ رکعت کا ہے جو محمد بن نصر نے امام مالک سے نقل کیا ہے۔ قال یستحب ان یقوم الناس فی رمضان بثمان وثلاثین رکعة ثم یسلم الامام والناس ثم یوتر بھم بواحدۃ یعنی امام مالک نے فرمایا کہ مستحب یہ ہے کہ لوگ رمضان میں ۳۸ رکعت نفل پڑھیں پھر امام اور لوگ سلام پھیر کر ایک رکعت وتر پڑھیں۔ امام مالک نے کہا کہ زمانہ حرہ کے قبل ایک سو برس سے اب تک اہل مدینہ کا اس پر عمل چلا آتا ہے۔ اس تعامل سے حنفیہ کا دو طرح رد ہو گیا۔ ایک یہ کہ تراویح میں سنت موکدہ مقرر نہیں' نفل کے طور پر جس قدر چاہے پڑھے۔ دوسرا یہ کہ وتر ایک رکعت ہے' دیگر نفلوں سے الگ کر کے پڑھنا مشروع ہے جس کے حنفیہ منکر ہیں۔ چوتھا قول ۳۶ رکعت کا ہے۔ پانچواں قول ۳۴ رکعت کا ہے کہ زرارہ بن اوفیٰ رضی اللہ عنہ اسی طرح پڑھتے تھے۔

چھٹا قول ۲۸ رکعت کا ہے کہ سعید بن جبیر آخری عشرہ میں اور زرارہ رضی اللہ عنہ اولین دو عشرہ میں اسی طرح پڑھتے تھے۔ ساتواں قول ۲۴ رکعت کا ہے' یہ بھی سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ آٹھواں قول ۲۰ رکعت کا ہے' یہ مسلک حنفیہ کا ہے۔ نواں قول ۱۹ رکعت کا ہے' یہ ابو مجلز سے مروی ہے۔ دسواں قول ۱۳ رکعت کا ہے۔ امام عینی نے امام محمد بن نصر کی سند سے نقل کیا ہے کہ سائب بن یزید کہتے ہیں : کنا نصلی فی زمان عمر بن الخطاب فی

رمضان ثلاث عشرۃ رکعۃ۔ کہ ہم زمانہ فاروقی میں تیرہ رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے۔

امام اسحاق فرماتے ہیں کہ سائب کی اس روایت سے زیادہ ثابت روایت میں نے نہیں سنی ہے۔ ذالک ان صلاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانت من اللیل ثلاث عشرۃ رکعۃ یعنی نماز نبوی رات کو تیرہ رکعت ہوا کرتی تھی۔ گیارھواں قول گیارہ رکعت کا ہے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں : وقیل احدی عشر رکعۃ وھو اختیار مالک لنفسہ واختارہ ابوبکر العربی۔ یعنی گیارہ رکعت کا قول بھی ہے' اس کو امام مالک نے اپنی ذات کے لیے پسند کیا ہے اور اسی کو ابوبکر عربی نے پسند کیا ہے۔

فتح الباری جلد۔۲' ص۔۲۲۶ میں ہے کہ سائب بن یزید سے روایت ہے کہ گیارہ رکعت تراویح ہے۔ محمد بن یوسف نے کہا کہ تیرہ رکعت ہے۔ حافظ امام ابن حجر فیصلہ فرماتے ہیں : والعدد الاول موافق لحدیث عائشۃ والثانی قریب منہ۔ گیارہ کا عدد حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے موافق ہے کہ آنحضور ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں رات کی تمام نماز گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے۔

اس تصریح سے ثابت ہو گیا کہ صرف بیس تراویح پر تمام دنیا کا عمل اول سے آخر تک بتانا سراسر جھوٹ ہے' باطل ہے اور ان تمام اقوال میں سے گیارہ رکعت تراویح کا مذہب حق اور راجح ہے اور یہی سنت نبوی اور فاروقی ہے۔ باقی محض نفل کے طور پر پڑھے گئے۔ اگر سنت نہ سمجھا جائے تو تمام عدد جائز ہیں لیکن سنت قرار دے کر پڑھنا بدعت ہے۔

چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب رسالہ الارتیاب جلد۔۲۲' نمبر۔۱۲ ماہ دسمبر سنہ۔۱۹۵۱ء کے ص۔۹ پر یہ لکھتے ہیں : "بدعت کہتے ہیں مقاصد شرعیہ کے بدلنے کو کہ غیر مقصود کو مقصود بنا دے یا مقصود کو غیر مقصود بنا دے۔"

اب اس کی مثال مولانا اشرف علی صاحب کے الفاظ میں سنئے' کتاب اصلاح الرسوم کے ص۔۴۷ میں ہے : "احادیث میں سجدۂ شکر کا فعل مباح وارد ہے مگر فقہاء حنفیہ نے حسب قول علامہ شامی اس لیے مکروہ کہا ہے کہ کہیں عوام اس کو سنت مقصودہ نہ سمجھ لیں۔"

پس اسی قاعدہ کی رُو سے بیس تراویح کو سنت موکدہ سمجھنا اور تارک کو تارک سنت سمجھنا بدعت ہے' کیونکہ اس میں حکم شرعی کو توڑ دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص تجاوز کرے گا اللہ تعالیٰ کی حدوں سے' پس ایسے لوگ ظالم ہیں۔

مولانا اشرف علی نے اصلاح الرسوم ص۔۳۷ پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ تم میں ہر شخص کو لازم ہے کہ اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے وہ یہ کہ نماز کے بعد داہنی طرف سے پھرنے کو ضروری سمجھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بسا اوقات بائیں جانب سے بھی پھرتے دیکھا ہے۔ (بخاری جلد۔ا' ص۔۱۱۰)

مولانا اشرف علی صاحب نے طیبی شارح مشکوۃ سے نقل کیا ہے کہ "اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو شخص کسی امر مستحب پر اصرار کرے اور عزیمت اور ضروری قرار دے اور کبھی دوسری شق پر عمل نہ کرے تو ایسے شخص سے شیطان اپنا حصہ گمراہ کرنے کا حاصل کر لیتا ہے۔"

پس اس قاعدہ مشروعہ مسلمہ کی رُو سے ہم کہتے ہیں کہ گیارہ تراویح حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا و حدیث جابر رضی اللہ عنہ اور فرمان و تقریری عمر رضی اللہ عنہ کی رُو سے سنت ثابت ہیں۔ چنانچہ علامہ شرنبلالی شرح نور الایضاح میں فرماتے ہیں کہ : "نماز تراویح جماعت سے پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے گیارہ رکعت تراویح مع وتر پڑھیں۔"

ابن ہمام کی شرح فتح القدیر سے یہ نقل کیا ہے : **فتحصل من هذا كله ان قيام رمضان سنة احدى عشرة ركعة بالوتر في جماعة فعله عليه الصلوٰة والسلام ثم تركه لعذر۔** یعنی اس بحث سے یہ حاصل ہوا کہ تراویح گیارہ رکعت سنت ہیں' جسے آپ نے جماعت کے ساتھ مع وتر پڑھا پھر عذر کی وجہ سے ترک کر دیا۔

کتاب سر السنان التائید مذہب النعمان ص۔۳۲۷ میں ہے' شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ : "بیس رکعت تراویح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے' جیسا کہ اب عام رواج ہے لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں اس کا ذکر ہے' وہ ضعیف ہے اور پھر معارض ہے حدیث صحیح کے ساتھ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالات نبوی سے بلحاظ دیگر لوگوں کے زیادہ واقف تھیں کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز گھر میں پڑھا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تراویح گیارہ رکعت سنت ہیں' بیس سنت نہیں ہیں۔

(۱۱) یہ دلیل بھی غلط اور بالکل باطل ہے کہ نماز تہجد اور قیام رمضان یعنی تراویح دو جدا جدا نمازیں تھیں۔ اگر نماز تراویح اور تہجد جدا جدا دو نمازیں ہوتیں تو رمضان میں دونوں

پڑھی جاتیں اور ان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جداگانہ بیان کر دیتیں کیونکہ ان سے رمضان کی نماز دریافت کی گئی تھی اور رمضان کی نماز قیام رمضان المعروف تراویح ہے۔

چونکہ غیر رمضان میں تہجد کی نماز بھی اتنی ہی تھی' اس لیے اس کو بھی ساتھ ہی بیان کر دیا۔ تمام احادیث پر طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی نماز کے جو عشاء کے بعد صبح سے پہلے رمضان میں پڑھی جاتی ہے' چار نام ہیں۔ تراویح' قیام رمضان' تہجد فی رمضان اور صلوٰۃ رمضان۔ نماز ایک اور نام مختلف اعتبار سے چار ہیں۔ جیسے ذات الٰہی کے سو نام ہیں اور ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اعتبار سے کئی نام ہیں۔ محمد' احمد' قاسم' عاقب وغیرہ۔ کئی ناموں سے ذات میں تغایر پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں یہ بات ہے کہ نماز تہجد پہلے سے رائج تھی اور تراویح بعد میں مشروع ہوئی جس کا نام قیام رمضان تھا لیکن قیام رمضان میں تہجد جذب ہو گیا ہے۔ جیسے نماز ظہر پہلے فرض تھی پھر جمعہ بعد میں فرض ہوا تو ظہر جمعہ میں جذب ہو گئی کہ نماز جمعہ ادا کرنے پر ظہر ساقط ہے۔

اسی طرح تراویح عشاء کے بعد پڑھنے سے تہجد کی نماز ساقط ہے اور اگر رمضان میں آخر رات قیام کیا جائے تو اس کو تہجد اور قیام رمضان دو ناموں سے موسوم کیا جائے گا اور اگر عشاء کے بعد جماعت سے ادا کیا گیا تو اس کو تراویح اور قیام رمضان کہا جائے گا' نماز تہجد ساقط ہو گئی۔

بہرحال رمضان کی راتوں میں اور غیر رمضان کی راتوں میں جو نماز پڑھی گئی وہ کل گیارہ رکعت تھی' اس سے زیادہ ثابت نہیں ہے۔ پس یہی رمضان اور غیر رمضان میں سنت موکدہ ہے۔ جیسا کہ خود اکابر علماء حنفیہ نے اس کو تسلیم کیا ہے جیسا کہ ان کا بیان گذر چکا ہے۔

مزید بحر الرائق جلد۔۲' ص۔۶۶ میں ہے : وقد ثبت ان ذالک کان احدی عشرۃ رکعۃ بالوتر کما ثبت فی الصحیحین من حدیث عائشۃ فاذا یکون المسنون علی اصول مشائخنا ثمانیۃ منها والمستحب اثنا عشر۔ یعنی ثابت یہ ہوا کہ گیارہ رکعت سنت ہیں جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہوا' پس ہمارے مشائخ کے اصول پر تراویحوں میں سے آٹھ سنت ہیں باقی نفل ہیں۔

فیض الباری شرح بخاری جلد۔۳' ص۔۴۲۰ میں مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں :

کانت تلک الصلوٰۃ واحدۃ اذا تقدمت سمیت باسم التراویح واذا تاخرت سمیت باسم التہجد (تا آخر) انما ثبت تغایر النوعین اذا ثبت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ صلی التہجد مع اقامتہ بالتراویح۔ یعنی تراویح اور تہجد ایک ہی نماز ہے۔ اگر اول رات پڑھی گئی تو تراویح نام ہوا اور اگر آخر رات پڑھی گئی تو تہجد نام ہوا۔ دو مختلف قسمیں تو تب ہوں کہ آنحضور ﷺ سے دو نمازوں کا علیحدہ علیحدہ پڑھنا ثابت ہو۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے فتاویٰ رشیدیہ میں تراویح اور تہجد میں مغائرت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے' تاہم یہ تسلیم کر لیا کہ ایک کا دوسری میں تداخل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں : مغائرت تہجد اور تراویح کی ظاہر ہے۔ مگر ہاں ایک نماز دوسرے کی قائم مقام ہو سکتی ہے کہ اگر تہجد کے وقت میں تراویح پڑھی جائے تو تہجد بھی ادا ہو جائے گا۔ (تا آخر) ہر دو نماز علیحدہ ہیں مگر ایک کے پڑھنے سے ثواب ہر دو کا حاصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر رسول اللہ ﷺ نے تمام رات نماز تراویح پڑھی تو تہجد کا بھی اس میں تداخل ہو گیا۔

رسالہ المرانی النجیح اور فتاویٰ رشیدیہ میں تو تراویح اور تہجد میں مغائرت بڑے زور سے ثابت کی لیکن لطائف قاسمیہ ص-۱۳۱۷ کے مکتوب سوم میں یہ لکھا ہے کہ :

> "بر اہل علم پوشیدہ نیست کہ قیام رمضان وقیام لیل فی الواقع یک نماز است در رمضان برائے تیسیر مسلمین در اول شب مقرر کردہ شدہ وہنوز عزیمت در اوائلش آخر شب است" ..... نزد ہموں قائل فرضیت تہجد بر آنحضرت ﷺ تراویح نفلش است علی التحقیق ..... وبروائے کسے کہ بر تہجد بر آنحضرت ﷺ منسوخ گوید چنانچہ قول عائشہ ہست رواہ مسلم فی سنن۔ پس مواظبت دلیل سنت مؤکدہ خواہد بود ودلائل قولیہ ناظر استحباب مگر تہجد رمضان کہ تراویح است دلیل قولی سنت مؤکدہ خواہد ماند۔"

پس تحقیق کے بعد اہلحدیث کے مسلک کو قبول کر لیا جس کو آج کل کے متعصبین نہیں مانتے ہیں۔ پس جب اکابر علماء دیوبند نے تراویح اور تہجد کا متحد ہونا تسلیم کر لیا تو حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے گیارہ عدد تراویح ثابت ہو گئیں۔ فللّٰہ الحمد۔ فضیلت وہی ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں۔

(۱۲) دلیل نمبر-۱۲ میں حدیث طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے تراویح اور تہجد دو مغائر نمازیں ہونے

پر استدلال کیا گیا ہے جو بالکل باطل ہے کیونکہ اس میں تہجد کا کوئی ذکر نہیں ہے اور یہ حدیث ابوداؤد باب نقض الوتر جلد اول' ص۔۲۰۳ میں وارد ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا وحید الزمان صاحب لکھنوی مرحوم نے جو کیا ہے وہ یوں ہے کہ "قیس بن طلق سے روایت ہے کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ ایک دن رمضان میں ہمارے پاس آئے اور شام تک رہے اور روزہ افطار کیا پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھائی اور وتر پڑھا بعد اس کے اپنی مسجد میں گئے اور اپنے لوگوں کو نماز پڑھائی جب وتر باقی رہ گئے تو ایک اور شخص کو آگے کر دیا اور کہا تو وتر پڑھا کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہو سکتے۔" (ابوداؤد جلد۔۱' ص۔۵۳۹)

مولانا گنگوہی نے یہ حدیث نقل کر کے یہ لکھا ہے "بعد اس کے اپنی مسجد میں جا کر آخر وقت میں تہجد ادا کیا۔"

یہ آخر شب میں تہجد ادا کرنے کا افسانہ سراسر غلط ہے۔ ناظرین اہل علم! حدیث کے الفاظ پر دوبارہ نظر ڈالیں' آپ کو حدیث میں ایسے الفاظ ہرگز نہ ملیں گے جن میں آخر شب اور تہجد کا ذکر ہو۔ مولانا نے یا تو خیانت سے کام لیا ہے' یہ تو ان کے علمی شان سے بعید ہے یا سوء فہمی سے مغالطہ کھایا ہے کہ طلق رضی اللہ عنہ نے رات کے پہلے حصہ میں ہی دونوں نمازیں پڑھی تھیں جیسے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ وہ عشاء کے وقت آنحضور ﷺ کے ساتھ فرض ادا کر کے جاتے تھے اور بعد میں مسجد میں جا کر اپنی قوم کو عشاء کی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ سببی طور پر ایک نماز کو دوبارہ پڑھنا جائز ہے۔

جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسجد میں آنحضور ﷺ کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھی پھر کوئی شخص آیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص ایسا ہے جو اس نمازی پر صدقہ کرے یعنی اس کو نماز پڑھا کر ثواب جماعت حاصل کرائے تب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی امامت کی اور جماعت سے نماز ادا کر دی۔

ٹھیک اسی طرح طلق رضی اللہ عنہ نے کیا کہ جب اپنے بیٹے کے گھر گیا تو ان کو نماز مع وتر پڑھا دی' پھر یہاں سے فارغ ہو کر مسجد میں گئے تو وہاں مسجد میں مصلیوں کو نماز پڑھا دی لیکن وتر نہ پڑھائے کہ ایک رات میں دو وتر جائز نہ تھے۔ پس یہ واقعہ دو بار نماز پڑھانے کا رات کے پہلے حصہ کا ہے' آخر رات کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ راوی نے بیان کیا ہے۔ یہ

مقلدین نے اپنی طرف سے تک بندی کر دی ہے جو سراسر باطل ہے پھر ان کے عقیدت مند مکھی پر مکھی مار کر اپنا مطلب بناتے چلے گئے۔ علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر باب نکاح الرقیق میں سچ کہا ہے : کثیر ما یقلد الساھون الساھین۔ یعنی بہت سے لوگ بھولے ہوئے لوگوں کی تقلید کرتے چلے جاتے ہیں اور تحقیق سے کام نہیں لیتے۔

میں کہتا ہوں کہ تمام مقلدین کا یہی حال ہے کہ یہ لوگ تقلید کو ستون دین جان کر اس سے کام لیتے ہیں اور گمراہ ہوتے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی تقلید سے بچائے' آمین۔

(۱۴) یہ دلیل بھی شرعی نہیں ہے۔ اگر تابعین یا تبع تابعین میں سے کوئی بیس تراویح پڑھتے تھے تو اس عمل سے بیس تراویح کا سنت موکدہ ہونا ثابت نہیں ہوتا' کیونکہ سنت وہ کام ہے جس پر آنحضور ﷺ نے مواظبت کی ہو۔

چنانچہ رئیس الحنفیہ امام ابن الہمام نے فتح القدیر میں یہ لکھا ہے کہ السنۃ ما واظبہ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بنفسہ۔ یعنی "سنت شرعی وہ کام ہے جس پر نبی کریم ﷺ نے مداومت کی ہو۔" حاشیہ نور الایضاح کے ص۔۱۴۴ میں ہے : والسنۃ فی الشریعۃ الطریقۃ المسلوکۃ فی الدین من غیر افتراض ولا وجوب۔ یعنی "سنت' شریعت میں اس طریقہ کو کہتے ہیں جو دین میں بغیر فرض اور وجوب کے جاری کیا گیا ہو۔" چونکہ شارع نے بیس تراویح کو جاری نہیں کیا لہٰذا یہ سنت شرعی نہیں ہیں۔

حاشیہ ہدایہ جلد۔۲' ص۔۱۵۱ میں ہے : من صلی التراویح ثمان رکعات اقتداء بما روی ابن عباس وغیرہ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انما صلّی فی اللیل الثلاث فی رمضان باحدی عشرۃ رکعۃ مع الوتر ثلاث رکعات ھل یکون تارکًا للسنۃ فاجیب بجواب بما حاصلہ ان جمھور الاصولیین یعرفون السنۃ بما واظب علیہ الرسول فحسب فعلی ھذا التعریف یکون السنۃ ھو ذالک القدر المذکور وما زاد علیہ یکون مستحبًا وعلیہ مشی ابن الھمام فی فتح القدیر۔ یعنی یہ سوال کیا گیا کہ جس شخص نے رمضان میں آٹھ تراویح پڑھیں اُس حدیث کے پیش نظر جو ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے ان تین راتوں میں آٹھ رکعت تراویح پڑھی تھیں تو کیا وہ شخص تارک سنت قرار دیا جا سکتا ہے؟ تو اس کا جو جواب دیا گیا' اس کا حاصل یہ ہے کہ جمہور اہل اصول علماء اہل سنت اس چیز کو جانتے تھے جس پر جناب رسول اللہ ﷺ نے ہمیشگی کی ہو'

بس۔

پس اس اصول کی بناء پر بیس تراویح میں سے اسی قدر سنت ہیں جس پر آنحضرت ﷺ نے مداوت فرمائی تھی اور وہ آٹھ ہیں باقی نفل ہیں جیسا کہ امام ابن ہمام نے فتح القدیر میں اس کی صراحت کر دی ہے۔ پس جب سلف صالحین میں اختلاف ہے جیسا کہ دس گیارہ اقوال گذر چکے ہیں تو پھر بعض تابعین کے تعامل سے بیس سنت موکدہ کیسے ثابت ہو سکتی ہیں؟ جب سلف وخلف میں تراویح کے عدد پر تنازع اور اختلاف ہے تو ایسے موقع پر قرآن کریم نے یہ اصول بیان کیا ہے : فان تنازعتم فی شیئی فردوہ الی اللّٰہ والرسول۔ یعنی فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب تمہارا کسی امر میں تنازع ہو جائے تو تم اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ پس اس بناء پر ہم نے یہ نزاع دربار نبوی میں پیش کیا تو وہاں سے یہ فیصلہ ہوا جو مندرجہ ذیل احادیث سے ثابت ہے۔

آٹھ تراویح کا ثبوت : ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے : انہ سأل عائشة کیف کانت صلٰوۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی رمضان فقالت ما کان رسول اللّٰہ یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعة الحدیث (بخاری جلد۔۱' ص۔۱۵۴) یعنی ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ ماہ رمضان میں (رات کو) کیسے پڑھتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا خواہ رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔

امام بخاری اس حدیث کو باب فضل من قام رمضان میں لائے ہیں' جس سے صاف ظاہر ہے کہ قیام رمضان بھی رمضان میں گیارہ رکعت ہوتا تھا۔ قیام رمضان کو عرف عام میں تراویح کہتے ہیں۔ پس اس سے رمضان میں آٹھ تراویح ثابت ہو گئیں۔ نیز امام بخاری نے اس حدیث کو باب قیام النبی ﷺ فی رمضان وغیرہ میں ذکر کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ تہجد رمضان اور تہجد غیر رمضان' قیام رمضان اور قیام غیر رمضان سب راتوں میں گیارہ رکعت ہی تھا۔

یہ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہوا کہ رمضان میں آنجناب رضی اللہ عنہ نے قیام رمضان اور تہجد دو نمازیں الگ پڑھی ہوں۔ اگر قیام رمضان' تہجد کے علاوہ ادا کیا ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں کو بیان کر دیتیں۔ آپ سے نماز رمضان کا سوال کیا گیا ہے جس سے قیام

رمضان مراد ہے۔ اس کی تعداد وہی بتائی گئی ہے جو غیر رمضان میں تہجد کی تھی۔ جس سے ثابت ہوا کہ غیر رمضان کا تہجد جب رمضان میں ادا ہو گا تو رمضان میں ہونے کی وجہ سے اس کو قیام رمضان کہا جائے گا۔ پھر بعد عہد صحابہ کے اس قیام رمضان کا نام تراویح رکھا گیا۔ ان گیارہ رکعتوں میں آٹھ تراویح اور تین وتر ہوتے تھے۔ وتر اور قیام لیل بھی ایک ہی طاق ہونے کی وجہ سے سب رکعتوں کو وتر کہہ سکتے ہیں' اس نماز کا نام قیام اللیل' صلوٰۃ اللیل' صلوٰۃ الوتر اور رمضان میں قیام رمضان ہے' نماز ایک ہے اور نام مختلف اعتبار سے کئی ہیں۔

امام محمد نے اس روایت کو موطاء میں ذکر کیا ہے اور اس پر جو باب منعقد کیا ہے' وہ ہے "باب قیام شهر رمضان" یعنی تراویح کا بیان۔ اس سے ظاہر ہے کہ حنفیہ کے اکابر کے نزدیک غیر رمضان کا تہجد رمضان میں قیام رمضان بن جاتا ہے۔

اسی طرح دیوبند کے اکابر مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا انور شاہ صاحب کشمیری نے بھی تسلیم کیا ہے کہ رمضان کی تراویح غیر رمضان کا تہجد ایک ہی نماز ہیں کہ دونوں پڑھنے کا ثبوت نہیں دیا گیا۔ پس اب جو علماء حنفیہ اس حدیث میں قیام رمضان سے تہجد مراد لیتے ہیں' وہ ضدی اور متعصب ہیں۔

ع تعصب میں تمیز حق وباطل ہو نہیں سکتی

بعض کہتے ہیں تہجد کا حکم تو اللہ تعالیٰ نے دیا' وہ علیحدہ نماز ہے اور تراویح کو رسول اللہ ﷺ نے مسنون کیا' یہ دوسری نماز ہوئی۔

میں کہتا ہوں یہ غلط ہے' قیام رمضان بھی اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ آنحضور ﷺ نے اپنے عمل سے اس کو مسنون کر دیا۔ مشکوٰۃ میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے' اس کے یہ الفاظ ہیں : جعل الله صيامه فريضة وقيام ليلة تطوعا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کر دیئے اور رات کا قیام نفل کر دیا۔ یہی تہجد میں ہوا کہ پہلے فرض تھا پھر نفل کر دیا اور جب رمضان آیا تو قیام رمضان میں تہجد کا تداخل ہو گیا۔ اس کی مثال جمعہ اور ظہر کی ہے' جس کی تفصیل پہلے ہو چکی۔ بہرحال بخاری کی حدیث صحیح سے قیام رمضان گیارہ رکعت ثابت ہوا۔

دوسری دلیل : عن جابر بن عبدالله قال صلّى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم

فی شھر رمضان ثمان رکعۃ ثم اوتر الحدیث۔ (رواہ ابن حبان وابن خزیمہ والطبرانی فی الصغیر ص۔۱۰۸ ومحمد بن نصر المروزی فی قیام اللیل ص۔۹۰) یعنی جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو رمضان کے مہینے میں آٹھ رکعت پڑھائیں اس کے بعد وتر پڑھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ تین رات جو آپ نے رمضان میں جماعت سے تراویح پڑھائی' وہ گیارہ رکعت تھیں۔ یہ واقعہ اس رات کا ہے کیونکہ آگے یہ الفاظ ہیں : فلما کانت القابلۃ اجتمعنا فی المسجد ورجونا ان یخرج فلم یخرج۔ یعنی آگے جو رات آئی ہم پھر مسجد میں جمع ہو گئے' امیدوار رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر نکلیں گے اور نماز پڑھائیں گے لیکن آپ نہ نکلے اور صبح کو آئے تو معذرت کر دی کہ میں اس وجہ سے نہ نکلا کہ مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں یہ نماز تم لوگوں پر فرض نہ ہو جائے۔

یہ حدیث حسن ہے۔ امام ذہبی جو فن رجال میں بڑے ماہر ہیں' اس حدیث کی سند میں لکھتے ہیں : اسنادہ وسط۔ کہ اس کی اسناد درمیانہ درجہ کی ہے یعنی حسن ہے۔

علامہ عینی حنفی نے عمدۃ القاری میں' امام ابن حجر نے فتح الباری میں اس حدیث سے تعداد رکعت پر استدلال کیا ہے۔ ابن حبان اور ابن خزیمہ نے اپنی اپنی صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے' لہٰذا ان دونوں کے نزدیک یہ روایت صحیح ہے۔ علامہ انور شاہ صاحب دیوبندی اور مولانا گنگوہی نے بھی اس حدیث کو تسلیم کیا ہے۔ عمدۃ الرعایہ میں مولانا عبدالحی لکھنوی نے بھی عدد تراویح پر اس سے دلیل لی ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی عیسیٰ بن جاریہ پر کچھ جرح ہے لیکن بعض نے اس کی توثیق کی ہے تو متکلم فیہ راوی کی حدیث کو حسن قرار دیا جاتا کہ جرح کرنے والے متشدد ہوں یا جرم بے سبب ہو تو ثقاہت غالب آجاتی ہے۔

چنانچہ علماء دیوبند نے ایک کتاب اصول حدیث کی لکھی' اس کا نام ہے انھاء السکن۔ اس کے ص۔۲۰ میں مختلف فیہ راویوں کی روایت کو حسن کا درجہ دیا ہے۔

فتح الباری جلد۔۱' ص۔۵۳۱ میں ایک راوی فلیح کا ضعف ذکر کیا اور پھر کہا فحدیثہ من قبیل الحسن۔ کہ اس کی حدیث حسن ہے۔ اس کتاب میں محمد بن اسحاق کو مختلف فیہ قرار دیا ہے پھر لکھا ہے : وھو حسن الحدیث۔ سو اس روایت کے حسن ہونے میں شبہ نہیں ہے اور پھر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اس کا شاہد قوی ہے' تو اس کے دلیل قوی ہونے میں شک

نہ رہا' یہ حدیث فیصلہ کن ہے۔

تیسری دلیل : جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! رات کو میں نے اپنی سمجھ سے ایک کام کیا ہے یعنی رمضان میں قال وما ذاک یا ابی؟ قال نسوة فی داری قلن انا لا نقرا القرآن فنصلی بصلاتک قال فصلیت بھن ثمان رکعات و اوترت فسکت فکان شبه الرضاء الخ (رواہ ابو یعلی والطبرانی بنحوه فی الاوسط قال الھیثمی فی مجمع الزوائد جلد۔۲' ص۔۷۴ اسنادہ حسن وذکرہ ابن نصر المروزی فی قیام اللیل ص۔۹۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا بات ہے؟ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے گھر کی عورتوں نے مجھ سے کہا کہ ہم لوگوں کو قرآن یاد نہیں' لہٰذا تراویح کی نماز آپ گھر پڑھئے' ہم بھی آپ کے پیچھے پڑھ لیں گی۔ چنانچہ میں نے ان کو آٹھ رکعت اور وتر پڑھا دیئے' آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اس امر کو درست سمجھا' اس لیے خاموش رہے۔ اس کو سنت تقریری کہتے ہیں۔ اس حدیث میں اجنبے کی بات آٹھ رکعت تراویح پڑھانا نہیں تھا بلکہ عورتوں کو مرد کا جماعت کرانا تھا' سو یہ جائز ہے اور آٹھ تراویح کا بھی ثبوت ہو گیا۔ اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔ یہ حدیث دوسری حدیث کے ساتھ مل گئی تو سونے پر سہاگہ ہو گیا اور ان دونوں کی مصدق حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہو گئی تو یہ ایسی مضبوط دلیل ہو گئی جس کو تمام دنیا کے احناف نہیں توڑ سکتے۔ پس آٹھ تراویح مسنون ثابت ہوئیں اور بیس عدم ثبوت سے بدعت ظاہر ہو گئیں۔

چوتھی دلیل : موطا امام مالک مطبوعہ دہلی کے ص۔۴۰ میں ہے : عن السائب بن یزید انه قال امر عمر بن الخطاب ابی بن کعب وتمیما الداری ان یقوما للناس باحدی عشرة رکعة۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھایا کریں۔ یہ روایت قیام اللیل کے ص۔۱۹۱ میں بھی ہے۔ یہ روایت قطعاً صحیح ہے' اس سے بھی گیارہ رکعت سنت قرار پائی۔ پس بیس تراویح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذمہ لگانا سراسر جھوٹ ہے۔

پانچویں دلیل : رسالۃ المصابیح امام سیوطی ص۔۱۹ میں ہے کہ محمد بن یوسف کہتے ہیں :

سمعت السائب بن یزید یقول کنا نقوم فی زمان عمر بن الخطاب باحدی عشرۃ رکعۃ الحدیث۔ یعنی میں نے سائب بن یزید سے سنا' وہ کہتے تھے کہ ہم زمانہ عمر رضی اللہ عنہ میں گیارہ رکعت تراویح ادا کیا کرتے تھے۔

اس اثر سے بھی ثابت ہوا کہ عہد فاروقی میں گیارہ رکعت تراویح پر تعامل رہا ہے۔ یہ سب دلائل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مصدق ہیں کہ اس میں صلوٰۃ رمضان سے تراویح مراد ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔

پس ان دلائل صحیحہ کو نظر انداز کر کے اور دلائل ضعیفہ کو قبول کر کے بیس رکعت تراویح کو سنت موکدہ قرار دینا اور اس سے کم وبیش کو بدعت سمجھنا اور عامل گیارہ رکعت کو تارک سنت کہنا باطل ہے اور اس کی بناء تقلید ہے جو گمراہی کا باعث ہے۔ اس لیے حنفیہ سے فردعات پر بحث نہیں کرنا چاہیے بلکہ تقلید شخصی پر مناظرہ کرنا چاہیے کہ اصل حد فاصل دونوں فریق کے درمیان صرف تقلید شخصی ہے جو مقلدین کے گلے کا طوق بن کر ان کو ترک حدیث پر مجبور کر رہی ہے۔

چنانچہ فتاویٰ عزیزی جلد اول ص۔۶۳ میں اصول مذہب ابو حنیفہ درج ہیں' ان میں ایک یہ ہے : السابعة قال بعض اصحاب الفتویٰ اذا کان فی المسئلة قول لابی حنیفة وصاحبیه وخالفه حدیث یحکمون بصحته وجبت اتباع قولهم دون الحدیث۔ یعنی ساتواں اصول یہ ہے کہ بعض علماء حنفیہ صاحب فتویٰ نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں ابو حنیفہ اور صاحبین ابو یوسف اور امام محمد کا قول وارد ہو اور حدیث نبوی اس کے خلاف اور معارض ہو جائے تو ان اماموں کا قول قبول کرنا واجب ہے' حدیث کا نہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ مقلدین منکرین حدیث سے ہیں جو گمراہ ہیں اور انکار حدیث کا سلسلہ ان ہی مقلدین سے شروع ہوا ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ "ہر وہ حدیث جس کو غیر فقیہہ صحابی نے بیان کیا ہو اگر اس کی حدیث قیاس امام کے خلاف ہو تو وہ قبول نہ کی جائے گی کیونکہ ایسی روایتوں کے قبول کرنے سے رائے قیاس کا دروازہ بند ہو جائے گا۔"

یہ چور دروازے اس لیے اصول کے نام سے قائم کیے ہیں کہ حنفی مذہب جو احادیث کے خلاف تقلید شخصی اور قیاس فقہی پر مبنی ہے' قائم رہے اور ان کو لوگوں میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ مسئلہ تراویح گیارہ رکعت کا انکار اسی اصول پر مبنی ہے کہ ہماری پیش کردہ حسن اور

صحیح احادیث کو مسترد کر کے مقلدین نے ضعیف روایات کو اپنے مذہب کے موافق پا کر ان پر تعامل کر لیا ہے اور بیس تراویح پر سنت موکدہ کا اعتقاد رکھ کر ان سے کم وبیش کو بدعت اور ضلالت قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی مونگیری حنفیؒ اپنے رسالہ غایۃ التنقیح ص۔۵۰ پر یہ لکھتے ہیں کہ "بیس رکعت تراویح کا منکر اور تارک بلاشبہ بدعتی اور گمراہ ہے۔" اس سے آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام' تابعین' ائمہ دین کا گنہگار ہونا لازم آیا اور یہ عقیدہ باطل اور ملحدانہ ہے۔ بالآخر دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حق بات قبول کرنے کی توفیق بخشے' آمین۔ یہ چار روز کی تقریروں کا خلاصہ ہے' آخر مولوی مقلد حنفی ان جوابات کو سن کر خاموش ہو گیا' والحمد للہ۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری

صحیفہ اہل حدیث کراچی

جلد۔۵۳' شمارہ۔۲۰' ۲۲' ۲۳۔ مورخہ ۱۶ شوال و ۱۶ ذوالقعدہ و یکم ذوالحجہ۔

(نوٹ) ---- اِس مضمون اور سابقہ مضمون میں قریباً ملتے جلتے دلائل ہیں لیکن فرق ضرور ہے۔ بعض دلیلیں سابقہ مضمون سے زیادہ ہیں' لہٰذا تکرار سے ملول نہیں ہونا چاہیے بلکہ محظوظ ہونا چاہیے۔ (خلیل)

آٹھ رکعت تراویح مسنون ہونے پر علماء کا اتفاق

واضح ہو کہ ماہ رمضان میں قیام لیل' قیام رمضان کی آٹھ رکعت مسنون ہونے پر علماء اسلام کا اتفاق ہے۔ اس سے زائد بطور نفل و تطوع کوئی پڑھے تو جائز ہے بشرطیکہ آٹھ سے کم وبیش معین کر کے مشروع اور مسنون قرار نہ دے کیونکہ مسنون صرف آٹھ رکعت بمع وتر صرف گیارہ ہیں۔ متقدمین علماء نے اس میں اختلاف نہیں کیا' مرور زمانہ سے فرقہ وارانہ تعصب کی وجہ سے اپنی رائے کو بنیاد بنا کر اختلاف ونزاع شروع کر دیا گیا۔ اہلحدیث اور جملہ محدثین صریح نصوص کی وجہ سے تراویح مسنون آٹھ بمع تین وتر گیارہ رکعت سمجھتے ہیں۔ احناف اپنے متقدمین علماء کی آراء کے خلاف ہیں' مسنون ہونے پر مصر ہیں۔ اس لیے یہاں علماء حنفیہ کی تصریحات سے ثبوت پیش کیا جاتا ہے' جس سے انکار کی کسی کو گنجائش نہیں ہو سکتی' انشاء اللہ تعالیٰ۔

علماء حنفیہ کے اعتراضات: علامہ حنفی عراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں لکھتے ہیں:
صلاتها بالجماعة سنة كفاية لما ثبت انه صلى الله عليه وسلم صلى بالجماعة احدى عشرة ركعة بالوتر على سبيل التداعي۔ یعنی نماز تراویح کا جماعت سے پڑھنا سنت کفایہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے جماعت کے ساتھ تداعی کے طور پر گیارہ رکعتیں وتر سمیت پڑھی تھیں۔

فتح القدیر حاشیہ ہدایہ میں شرح کمل علامہ ابن ہمام حنفی کے حوالے سے لکھا ہے:
فتحصل من هذا كله ان قيام رمضان سنة احدى عشرة ركعة بالوتر جماعة فعله عليه الصلوة والسلام ثم تركه لعذر افاد انه لولا خشية ذالك لواظبت لكم۔ یعنی اس سب بحث سے یہ حاصل ہوا کہ تراویح گیارہ رکعت سنت ہے' جماعت کے ساتھ مع وتر کے پڑھنا آپ کا فعل تھا پھر فرضیت کے ڈر سے جماعت ترک کر دی۔ اس سے مستفاد یہ ہے کہ اگر فرضیت کا خوف نہ ہوتا تو میں تم کو ہمیشہ اس طرح پڑھاتا رہتا۔

پھر فرماتے ہیں: ولا شك فى تحقق الامر من ذالك بوفاته صلى الله عليه وسلم فيكون سنة۔ یعنی اس میں شک نہیں کہ یہ آپ کی وفات تک اسی طرح ثابت رہا سو یہ سنت نبوی ہو گئی۔ یہ امام ابن الہمام کا فیصلہ ہے جو متقدمین ائمہ حنفیہ میں بلند پایہ مجتہد ہونے کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں تمام ہم عصر حنفی علماء (دیوبند ہوں یا بریلوی) زیادہ عالم وفاضل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

علامہ ابن ہمام نے فرمایا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بیس تراویح سنت خلفاء ہے' سو اس سے سنت نبوی ثابت نہیں ہو سکتی۔ اذا سنية بمواظبة بنفسه الا بعذر۔ یعنی سنت وہ کام ہے جس پر عذر کی عدم موجودگی میں خود آپ ہمیشہ قائم رہے ہوں۔ فتكون العشرون مستحبا وذالك القدر منها هو السنة كالا ربع بعد العشاء مستحبة وركعتان فهى السنة۔ یعنی بیس رکعت مستحب ہوں گی اور اسی قدر اس میں سے یعنی آٹھ سنت ہوں گی اور مقتضی دلیل کا یہی ہے۔

بحر الرائق ص۔۲۰۵ میں ہے: ذكر المحقق فى فتح القدير ما حاصله ان الدليل يقتضى ان تكون السنة من العشرين ما فعله صلى الله عليه وسلم منها ثم ترك خشية ان تكتب علينا والباقى مستحبا وقد ثبت ان ذالك كان احدى عشرة ركعت

بالوتر کما ثبت فی الصحیح من حدیث عائشة رضی اللّٰہ عنھا فاذن یکون المسنون علی اصول مشائخنا ثمانیة منھا والمستحب اثنا عشر رکعة یعنی محقق امام ابن ہمام نے فتح القدیر میں جو فیصلہ کیا ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ دلیل شرعی کے اقتضا کے مطابق بیس تراویح میں سے آٹھ رکعت مسنون ہیں جو آنحضور ﷺ کا عمل ہے جو آپ نے عذر سے چھوڑا تھا اور وہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے جو صحیح بخاری میں وارد ہے کہ آپ نے وتر سمیت گیارہ رکعت پڑھیں' پس ہمارے مشائخ حنفیہ کے اصول کی رُو سے آٹھ رکعت سنت ہیں باقی بارہ نفل ہیں۔

علامہ ابن الہمام اور علامہ ابن نجیم مئولف بحر الرائق ہر دو مسلمہ اماموں نے بالصراحت اصحاب حدیث کے موقف کی صحت کا اعلان فرما دیا ہے اور ان لوگوں کے موقف کو غلط قرار دے دیا ہے۔ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہجد کی نماز پر محمول کیا کرتے ہیں' ان ہر دو اماموں نے تراویح اور تہجد کو ایک ہی نماز قیام لیل' قیام رمضان قرار دیا ہے کہ دونوں ناموں میں صرف اعتباری فرق ہے۔

علامہ ابو السعود فتح المعین شرح کنز ص-۲۶۵ میں' امام طحاوی نے شرح در مختار ص-۲۹۵ پر امام حموی سے نقل کیا ہے : ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم لم یصلھا عشرین بل ثمانیا ولم یواظب علی ذالک۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے بیس رکعت تراویح نہیں پڑھی ہیں بلکہ صرف آٹھ رکعت پڑھی ہیں اور اس پر ہیشگی نہ کی تاکہ فرض نہ ہو جائیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی' حضرت امام ابوحنیفہ کے مسلک کی تائید کے لیے لکھی ہوئی کتاب فتح سرالمنان لتائید مذہب النعمان ص-۳۲۷ میں لکھتے ہیں : ولم یثبت روایة عشرین رکعة منه صلی اللّٰہ علیه وسلم کما ھو المتعارف الان الا فی روایة ابن ابی شیبة عن حدیث ابن عباس کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وساق الحدیث ثم قال وقالوا اسناد ضعیف وقد عارضه حدیث عائشة وھو صحیح وکانت عائشة اعلم بحال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم من غیرھا وقد کان الامر فی زمنه صلی اللّٰہ علیه وسلم ذالک بامرہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ان صلوا فی بیوتکم وقوله افضل صلوة المرء فی بیته الا المکتوبه حتی انقضی صدر من خلافة عمر رضی اللّٰہ عنه۔ یعنی بیس رکعت تراویح کی روایت آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں ہوتی' جیسا کہ اب بیس

متعارف ہیں۔ ہاں روایت ابن ابی شیبہ یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس رکعت تراویح پڑھیں مگر اس حدیث کا اسناد ضعیف ہے اور یہ روایت حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف ہے جو صحیح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان وغیر رمضان میں وتر سمیت گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھیں۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بہ نسبت دوسروں کے حالات نبوی سے واقف تھیں' یہ حکم اس انداز میں زمانہ نبوی میں نافذ رہا کہ آپ نے لوگوں کو اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا ما سوا فرضوں کے گھروں میں نماز پڑھنا افضل ہے پھر لوگ گھروں میں پڑھنے لگے یہاں تک کہ عہد خلافت فاروق رضی اللہ عنہ کا ابتدائی حصہ گذر گیا۔

فتح القدیر شرح ہدایہ ص۔۲۰۵ میں امام ابن ہمام نے بیس رکعت والی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو ضعیف قرار دیا اور کہا کہ اس روایت کے ضعیف ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے مع مخالفة للصحیح اور بالاتفاق ضعیف ہونے کے علاوہ یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بخاری کی صحیح حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا والی کے بھی خلاف ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان وغیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھیں۔

سنت کی تعریف: فتح القدیر جلد۔۱' ص۔۲۰۵ میں ہے: السنة ما واظبه بنفسه۔ یعنی سنت اس کام کو کہتے ہیں جس پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشگی کی ہو۔

شرح وقایہ میں ہے' سنت اس امر کو کہتے ہیں جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشگی کی ہو۔ (نور الہدایہ جلد۔۱' ص۔۱۴۴) فتاوی تجرید الشامی جلد۔۱' ص۔۷۳ میں ہے: "سنت موکدہ وہ ہے جس پر حضور علیہ السلام نے دوام کیا ہو۔" خلاصہ کیدانی ص۔۴ میں ہے: السنة ما واظب علیه النبی صلی اللہ علیه وسلم۔ جس پر حضور علیہ السلام نے مواظبت کی ہو۔ غنیتہ الطالبین ص۔۱۸۰ میں پیر جیلانی نے فرمایا: السنة ما سنه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔ کہ سنت وہ کام ہے جس کا طریقہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا ہو۔ ان سب متفقہ تعریفوں سے یہ امر ثابت ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے شارع مقرر تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے مسنون ٹھہرایا' وہ امت کے لیے سنت ہو گیا۔ اکابر علماء حنفیہ نے یہ تسلیم کر لیا کہ تراویح بمع وتر گیارہ رکعت مسنون ہیں اور یہی فعل نبوی ہے۔

تہجد اور قیام رمضان الگ الگ نہیں: احناف کی معتبر کتاب موطا امام محمد کے

ص-۱۴۲ میں ایک باب کا عنوان یہ ہے : قیام شهر رمضان وما فیه من الفضل۔ اس کا ترجمہ خواجہ عبدالوحید صاحب یوں لکھتے ہیں : رمضان میں تراویح کا بیان۔

پھر اس کے ثبوت میں امام محمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دو احادیث ذکر کی ہیں۔ ایک میں یہ بیان ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں لوگوں کو تین رات نماز پڑھائی پھر نہ پڑھائی اور فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔ اور دوسری حدیث عائشہ میں یہ بیان ہے کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ ماہ رمضان میں نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی ہوتی تھی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔

اس حدیث کے ذکر سے امام محمد نے دو باتیں ظاہر کر دیں' ایک یہ کہ تراویح اور تہجد ایک ہی نماز ہے' دو نمازیں نہیں ہیں۔ رمضان میں پڑھی جائے تو اس کا نام قیام رمضان ہے اور رمضان کے علاوہ اس کو تہجد کہتے ہیں۔ رمضان میں دو نمازیں تراویح اور تہجد الگ الگ پڑھنا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ حنفی مذہب کے بڑے بلند پایہ عالم مولانا انور شاہ صاحب جو اپنی زندگی میں دیوبند کی درسگاہ کے شیخ الحدیث تھے' اپنی کتاب العرف الشذی ص-۳۲۵ میں فرماتے ہیں : لا مناص من تسلیم ان تراویحه علیه السلام کانت ثمانیة رکعات ولم یثبت فی روایة من الروایات انه علیه السلام صلی التراویح والتهجد علیحدة فی رمضان۔ یعنی اس بات کے تسلیم کرنے سے حنفیہ کو کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تراویح آٹھ رکعت تھیں اور کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں تراویح اور تہجد دو نمازیں علیحدہ علیحدہ پڑھی ہوں۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب تمام علماء دیوبند کے مسلم بزرگ ہیں' ان کی ہستی کو ایک معجزہ قرار دیا گیا تھا۔ موصوف ہی اپنی کتاب کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر کے ص-۲۷ میں لکھتے ہیں : اذا التراویح التی صلاها صلی اللہ علیه وسلم فی رمضان بهم کانت احدی عشرة رکعة کما عند ابن خزیمه ومحمد بن نصر وابن حبان عن جابر ثمان رکعات والوتر' والوتر ثلاث هناک ایضا۔ یعنی تراویح کی نماز جو رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو پڑھائی تھی' وہ گیارہ رکعات تھیں جیسا کہ ابن خزیمہ اور محمد بن نصر اور

ابن حبان نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھائے تھے۔

پھر گیارہ رکعت کے ثبوت میں شاہ صاحب نے دوسری روایت یہ پیش کی ہے: وعنه قال جاء ابی بن کعب الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فقال یارسول اللّٰہ انه کان منی اللیلة شیئی یعنی فی رمضان قال وما ذاک یا ابی قال نسوة داری قلن انا لا نقرء القران فنصلی بصلٰوتک قال فصلیت بهم ثمان رکعات واوترت فکانت سنة الرضا ولم یقل شیئا رواه ابو یعلی وقال الهیثمی اسناده حسن۔ یعنی جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ! آج رات مجھ سے عجیب کام سرزد ہوا اور یہ واقعہ رمضان کا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابی کیا بات ہوئی؟ ابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہمارے محلّہ کی عورتوں نے جمع ہو کر مجھ سے کہا کہ ہم قرآن کی حافظ نہیں ہیں' آپ ہمیں نماز تراویح پڑھائیں تو ہم آپ کی اقتدا میں نماز پڑھ لیں۔ پس میں نے ان کو آٹھ رکعت تراویح پھر وتر پڑھا دیئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن کر کچھ نہ کہا گویا یہ سنت تقریری ہو گئی۔

یہ دو احادیث مستقل دو دلیلیں شاہ صاحب فاضل دیوبندی نے ذکر کر کے ان سے اتفاق کیا جو اہل حدیث کے موقف کی زبردست تائید ہے۔ ان روایتوں کی پشتیبان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ یعنی صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اس روایت کو تہجد پر محمول کرنا بھی درست نہیں کیونکہ محدثین فقہاء کا فیصلہ یہی ہے۔ محدثین اور متقدمین حنفیہ نے نماز تراویح کو ہی قیام رمضان قرار دیا ہے۔ چنانچہ امیر المومنین فیا لحدیث رئیس الفقہاء حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کو باب قیام النبی باللیل فی شهر رمضان یعنی "یہ باب ہے اس مسئلہ کے بیان میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام رات کو رمضان اور غیر رمضان میں یکساں تھا۔" پھر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا ذکر کر کے ثابت کیا کہ وہ گیارہ رکعت بمع وتر تھا۔

امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں یوں باب باندھا ہے: باب ما روی فی عدد رکعات القیام فی شهر رمضان یعنی "ماہ رمضان میں تراویح کی رکعتوں کی تعداد" پھر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے تعداد ظاہر کر دی کہ وہ گیارہ تھی۔

امام محمد نے موطا میں باب باندھا جو گذر چکا پھر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے رکعتوں کی تعداد ظاہر کر دی۔ صاحب جمع الفوائد نے باب قیام رمضان والتراویح پھر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے تعداد گیارہ کی ثابت کر دی۔ عارف ربانی شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے تبویب بخاری پر اپنا ریمارک کرتے ہوئے قیام رمضان کے باب پر یہ لکھا ہے' یعنی ان قیامه صلى الله عليه وسلم فى رمضان وغيره كان سواء ولم يكن زيادة وهو مذهب احمد فى احدى الروايتين عنه۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام رمضان غیر رمضان میں یکساں تھا' کوئی زیادتی نہ تھی۔

علامہ مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری حنفی حاشیہ بخاری جلد۔ا' ص۔۱۵۴ پر یوں لکھتے ہیں : فحصل من هذا كله ان قيام رمضان سنة احدى عشرة ركعة بالوتر فى جماعة فعله عليه الصلوٰة والسلام وتركه لعذر۔ یعنی حاصل کلام یہ کہ رمضان میں تراویح گیارہ رکعت سنت ہیں وتر سمیت۔ فتح الربانی شرح مسند احمد جلد۔۵' ص۔۱۵ میں باب کا عنوان یہ ہے :باب حجة من قال انها ثمان ركعات غير الوتر۔ یعنی "اس شخص کی دلیل کا بیان جو یہ کہتا ہے کہ تراویح سوا وتر کے آٹھ رکعت ہیں۔" پھر اس کے ثبوت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ درج کی کہ عورتوں کو جماعت سے نماز تراویح آٹھ رکعت پڑھائی پھر آخر میں ہے : فسكت النبى صلى الله عليه وسلم قال فراينا ان سكوته رضا بما كان۔ کہ آپ یہ واقعہ سن کر خاموش ہو گئے۔ راوی حدیث صحابی نے کہا کہ ہم آپ کے سکوت کو رضامندی تصور کرتے تھے۔ اس پر شارح فرماتے ہیں : وفيه دلالة على جواز القيام فى رمضان بثمان ركعات غير الوتر۔ یعنی یہ حدیث دلیل ہے کہ رمضان میں وتر کے سوا آٹھ رکعت تراویح جائز ہیں۔

پھر لکھتے ہیں : لان سكوته صلى الله عليه وسلم واقراره عليه ناطق بذالك بل ثبت كذالك من فعله صلى الله عليه وسلم۔ یعنی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاموش ہو جانا اور اس عمل کو برقرار رکھنا جائز ہونے کی دلیل ہے' بلکہ آپ کے فعل سے بھی آٹھ ہی ثابت ہیں۔

الفتح الربانی میں اس کے ثبوت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پیش کی ہے جو بخاری کے حوالہ سے ذکر ہو چکی ہے۔ دیوبند کے اکابر میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

بڑے مقبول عالم تھے' ان کا پہلے یہ خیال تھا کہ نماز تراویح اور تہجد دو الگ الگ نمازیں ہیں لیکن پھر مزید تحقیق کے بعد ان پر یہ ظاہر ہوا کہ دراصل نام دو ہیں' نماز ایک ہی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :

"بر اہل علم پوشیدہ نیست کہ قیام رمضان وقیام لیل فی الواقع یک نماز است کہ در رمضان برائے تیسیر مسلمین در اول شب مقرر کردہ شدہ لیکن ہنوز عزیمت در اوائل آخر شب است۔ ونماز تراویح نفس تہجد است علی التحقیق ..... مر تہجد رمضان کہ تراویح است دلیل قوی سنت موکدہ خواھد ماند۔"

"یعنی اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ قیام رمضان اور قیام لیل واقع میں ایک ہی نماز ہے کہ رمضان میں مسلمانوں کی آسانی کے لیے اول رات میں مقرر کی گئی ہے لیکن ہنوز فضیلت آخر رات میں ہی ہے اور تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ تراویح عین تہجد ہی ہے رمضان کی تہجد کا نام تراویح ہے۔" (لطائف قاسمیہ ص۔ ۱۳ و ۱۷ مکتوب سوم)

پس مولانا انور شاہ صاحب شیخ العرب والعجم رئیس علماء دیوبند اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی جن کی نظیر اب تک علماء دیوبند میں پیدا نہیں ہوئی' دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تراویح اور تہجد ایک ہی نماز ہے اور وہ گیارہ رکعت بالعموم ہیں۔ اب ان کے بعد دیوبند کے تمام اکابر واصاغر رمضان میں دو نمازیں تعامل نبوی اور تعامل خلفاء سے کس طرح ثابت کرتے ہیں؟

تراویح کی وجہ تسمیہ : رمضان کے علاوہ رات کی نماز کے نام یہ ہیں : صلٰوۃ اللیل' قیام اللیل' صلٰوۃ الوتر' تھجد۔ اور رمضان میں اس نماز کے نام یہ ہیں : تراویح' التھجد فی رمضان' صلٰوۃ اللیل فی رمضان' قیام اللیل فی رمضان' قیام رمضان' صلٰوۃ الوتر فی رمضان۔ یہ سب نام روایات سے ثابت ہیں۔ تراویح کے نام کی مقبولیت اس وقت شروع ہوئی جب سلف میں جماعت کا اہتمام ہوا۔ قیام رمضان کا عرفی نام تراویح ہے۔ اس سے کوئی اہل علم انکار نہیں کر سکتا۔ جو شخص لفظ تراویح بول کر ثبوت طلب کرے تو اس کو قیام رمضان کے لفظ سے ثابت کیا جائے گا۔

تعامل خلق : باقی رہا خلفاء کے تعامل کا فیصلہ تو اس کی بابت عرض یہ ہے کہ کسی صحیح

حدیث سے خلفاء راشدین کا تعامل کسی عدد معین پر ثابت نہیں ہے۔ من ادعی فعلیه البیان بالبرھان۔ ہاں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے فرمان سے بسند صحیح یہ ثابت ہے کہ آپ نے مع وتر گیارہ رکعت پڑھنے کا حکم نافذ فرمایا تھا۔ چنانچہ موطا امام مالک ص۔۴۰ اور مشکوۃ ص۔۳۸۳ میں یہ روایت ہے کہ سائب بن یزید کہتے ہیں: امر عمر ابی بن کعب وتمیما الداری ان یقوما للناس فی رمضان باحدٰی عشرۃ رکعۃ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری (دونوں حافظوں) کو یہ حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت تراویح پڑھائیں۔

امام سیوطی کے رسالہ المصابیح ص۔۱۸ میں باسنادہ یہ روایت ہے: قال الامام سعید بن منصور فی سننه حدثنا عبداللہ بن محمد حدثنی محمد بن یوسف سمعت السائب بن یزید یقول کنا نقوم فی زمان عمر بن الخطاب باحدٰی عشرۃ رکعۃ۔ سائب بن یزید کہتے تھے کہ ہم زمانہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں گیارہ رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے۔

یہ دونوں اثر سند کی رو سے صحیح ہیں' پس خلیفہ کی سنت بھی ثابت ہو گئی اور یہ مسئلہ کہ تراویح گیارہ رکعت مسنون ہیں' ثابت ہو گیا ہے' فللہ الحمد۔

عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ اہلحدیث لاہور

جلد۔۴' شمارہ۔۴۲' ۴۳' ۴۴۔ مورخہ ۱۹ و ۲۶/ اکتوبر سنہ۔۱۹۷۳ء

تحقیق مسئلہ تراویح

پسروری اشتہار کا جواب

حضرات! اسلام اتفاق واتحاد کی دعوت دیتا ہے اور افتراق اور فرقہ بندی سے روکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا۔ یعنی سب اہل اسلام متفق ہو کر اسلام کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور افتراق پیدا کر کے ایک دوسرے سے جدا جدا نہ ہو جاؤ۔

چنانچہ یہ اصول مقلدین کو بھی مسلم ہے۔ رسالہ ماہ طیبہ کوٹلی سے اعلان کرتا ہے کہ "اتحاد و تنظیم خدا کی بہت بڑی نعمت ہے جن قوموں کو یہ نعمت میسر ہے انہیں اقلیت میں

ہوتے ہوئے بھی فتح وعروج حاصل ہوتا ہے اور دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بھی اُن سے خائف ولرزاں رہتی ہیں۔" لیکن باوجود اس اصول مسلمہ کے جدا جدا مذہب پیدا کر لیے اور کئی فرقے ہو گئے' یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے چار حصے بنا لیے جس پر کسی عارف کو یہ کہنا پڑا ؎

دین حق را چہار مذہب ساختند
رخنہ در دین نبی انداختند!

اتفاق کا اصول یہ ہے کہ جو چیز مسلمہ بین الفریقین ہو' اُس میں فریقین اختلاف کو چھوڑ کر باہم متفق ہو جائیں۔ چنانچہ بارہا یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مع وتر اکثر گیارہ رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے اور کبھی کبھی تیرہ رکعت بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ یہی عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول تھا۔ یہ حنفیہ کو بھی مسلم ہے' چنانچہ التعلیق الممجد علی موطا امام محمد کے ص۔۱۴۲ پر مولانا عبدالحی صاحب حنفی لکھوی نے یہ تصریح کی ہے کہ علماء کی ایک بڑی جماعت جن میں امام محمدؒ' امام ابن ہمام' علامہ زیلعی' امام زرقانی' امام سیوطی وغیرہ شامل ہیں' یہ فرماتے ہیں کہ بیس تراویح کی حدیث ضعیف ہے اور یہ صحیح حدیث کے مخالف ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ رمضان میں (تراویح) اور غیر رمضان میں (تہجد) گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔

اور ملا علی قاری حنفی نے مرقاۃ جلد۔۔' ص۔۱۷۲ میں یہ اقرار کیا ہے کہ یہ بات صحیح طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تراویح آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھائے ہیں۔ شیخ عبدالحق دہلوی حنفی نے بھی اپنی کتاب فتح سر المنان میں یہ تسلیم کیا ہے کہ بیس تراویح جو مشہور ہیں' اس کے بارہ میں جو روایت ہے وہ ضعیف ہے اور اس کے معارض جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے وہ صحیح ہے۔ اسی طرح حنفی مذہب کے بہت بڑے عالم سید انور شاہ صاحب شیخ العرب والعجم نے العرف الشذی ص۔۳۲۹ اور کشف الوتر میں یہ تسلیم کیا ہے کہ آپ کی تراویح آٹھ رکعت تھیں اور رمضان میں تراویح اور تہجد دو نمازیں آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں ہیں اور موطا امام مالک وغیرہ کتب حدیث سے یہ واقع ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو مدینہ شریف میں آٹھ رکعت تراویح اور تین وتر پڑھانے پر مقرر کیا تھا۔ اس پر تمام اصحاب رسول اللہ ﷺ کا

اجماع ہوا اور کسی نے انکار نہیں کیا۔ اس کو اجماع سکوتی کہتے ہیں۔ باقی گیارہ' تیرہ رکعت سے زائد بطور نوافل ہیں' چھتیس' چالیس کوئی پڑھے اور ان کو سنت نبوی تصور نہ کرے تو اس کے جواز پر بھی سب کا اتفاق ہے۔ اتنی بات تو متفق علیہ ہے' باقی اس سے زیادہ جو ضد اور تعصب میں آکر غلو کیا جا رہا ہے' یہ باعث افتراق ہے ؎

تعصب وہ ہے دشمن نوع انسان!
بھرے گھر کیے سینکڑوں جس نے ویراں؛

حال ہی میں ہمارے پاس ایک دو ورقہ اشتہار پسرور ضلع سیالکوٹ سے آیا ہے جس کو مقلدین کی طرف سے کسی مولوی ابراہیم نامی نے بنام "مسئلہ تراویح پر انعامی مطالبہ" شائع کیا ہے جس میں انہوں نے تقلید کی بیڑیاں' فقہ مروجہ کی ہتھکڑیاں پہن کر اور رائے وقیاس کا طوق گلے میں ڈال کر تمام علماء اہلحدیث سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ مجھے صحاح ستہ سے ایک ایسی حدیث دکھلائی جائے جس سے یہ ثابت ہو کہ آنحضرت ﷺ نے ماہ رمضان میں مسجد کے اندر جماعت کے ساتھ آٹھ رکعت تراویح ادا کی ہیں' جو شخص یہ ثابت کر دے گا اس کو تراویح کے ہر حرف کے بدلے ایک سو روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اگر صحیح حدیث نہ ہو تو صحاح ستہ سے ضعیف حدیث ہی دکھلا دیں کہ آنحضرت ﷺ نے ساری عمر بھی جماعت کے ساتھ آٹھ رکعت تراویح ادا کی ہوں تو اس صورت میں تراویح کے ہر حرف کے بدلے مبلغ پچاس روپیہ انعام دیا جائے گا۔ (یہ الفاظ مشتہر کی علمیت کے مظہر ہیں)

اسی طرح یہ لکھا ہے کہ صحاح ستہ کے مصنف ائمہ حدیث میں سے کسی کا یہ فیصلہ پیش کر دیں کہ اس کے نزدیک حضرت عمر فاروق' حضرت علی رضی اللہ عنہما اور دوسرے اصحاب رسول علیہ الصلوۃ والسلام سے آٹھ رکعت تراویح منقول ہیں۔ اور کئی لایعنی شرائط جو نہ شرعاً صحیح ہیں اور نہ اصولاً' اس اشتہار میں درج کی ہیں جن سے حنفی مذہب کے اصولوں اور مسائل کا باطل ہونا ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ ان شرائط کی رُو سے حنفی مذہب کے امتیازی مسائل میں سے کوئی مسئلہ بھی احادیث صحاح ستہ سے ثابت نہیں ہے۔

مثلاً نہ خاص امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنا ثابت ہے' نہ آنحضور ﷺ کا رفع یدین معروف نہ کرنا ثابت ہے' نہ آمین بالسر ثابت ہے' نہ عورت کو سینہ پر اور خاص مرد کو زیر ناف ہاتھ باندھنے ثابت ہیں' نہ مقتدی کو خاص سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی منع ثابت ہے' نہ بیس تراویح

پڑھنا ثابت ہے' نہ محرمات ابدیہ سے نکاح کر کے جماع کر لینے سے حد ساقط ہونا ثابت ہے' نہ نکاح حلالہ مروجہ ثابت ہے اور نہ فریب کاری سے کسی باکرہ لڑکی سے نکاح ثابت کر کے مقدمہ جیت کر اس سے صحبت کا حلال ہونا ثابت ہے اور نہ خوف زنا سے مشت زنی کا واجب ہونا ثابت ہے اور نہ دارالحرب میں مسلمان کو سود لینا ثابت ہے' وغیرہ۔ (یہ مسائل حنفیہ کے ہیں جو کتب فقہ ہدایہ' کنز وغیرہ میں درج ہیں)

الغرض کتبہ فقہ مروجہ حنفیہ کے اکثر مسائل احادیث صحاح ستہ سے ثابت نہیں بلکہ خلاف ہیں۔ چنانچہ امام ابن ابی شیبہ نے کتاب الرد علی ابی حنیفہ لکھ کر ان احادیث سے مسائل حنفیہ کا صفایا کر دیا ہے اور مذہب حنفی کا خلاف احادیث ہونا ظاہر کر دیا ہے۔ تب اکابر علماء حنفیہ نے یہ اصول مقرر کر دیا کہ کتب حدیث صحاح ستہ کی احادیث کو جو خلاف مسائل حنفیہ ہیں' قبول نہ کیا جائے۔

چنانچہ فتاویٰ عزیزی جلد اول' ص۔۴۳ رسالہ اصول مذہب حنفی سے وہ اصول حنفیہ نقل کئے گئے ہیں جن کے بعض نمبروں کا خلاصہ ترجمہ یہ ہے۔

(۶) چھٹا اصول یہ ہے جو امام ابن ہمام نے بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جن راویوں کو امام بخاری و مسلم اصحاب صحاح ثقہ یا ضعیف کہیں ان کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور ہم پر ان کی باتوں کا قبول کرنا واجب نہیں ہے' یہ کئی ایسے راویوں کو ضعیف کہیں ان کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور ہم پر ان کی باتوں کا قبول کرنا واجب نہیں ہے۔ یہ کئی ایسے راویوں کو ضعیف کہتے ہیں جو ہمارے امام کے نزدیک عادل ہیں اور ایسے راویوں کو عادل کہتے ہیں جو ہمارے امام کے نزدیک ضعیف ہیں۔

(۷) ہمارے اصحاب فتویٰ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں ہمارے امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا قول آجائے اور حدیث نبوی جس کی صحت کا اصحاب صحاح محدثین نے فیصلہ کر دیا ہو' اس قول کے خلاف ہو' وجب اتباع قولھم دون الحدیث۔ یعنی ہم حنفیوں پر اپنے اماموں کے اقوال کی تقلید واجب ہے' حدیث کی اتباع واجب نہیں ہے' نعوذ باللّٰہ من ھذا القول۔ افسوس ہے کہ یہ ایسے مقلدین کس منہ سے منکرین حدیث کو کافر کہتے ہیں بلکہ خود منکر حدیث ہیں اور کس منہ سے کسی مسئلہ میں کتب صحاح ستہ کی شرط لگا کر حدیث طلب کرتے ہیں۔

(۸) آٹھواں اصول یہ کہ ہر وہ حدیث جس کو غیر فقیہ راوی روایت کرے وہ واجب نہیں ہے کیونکہ اس طرح رائے قیاس کا دروازہ مسدود ہو جائے گا۔ محلی ابن حزم جلد۔۴'

ص۲۱۱ میں ہے: والقوم اصحاب قیاس بزعمهم ومن کبارهم من یقول ان القیاس اولی من خبر الواحد۔ یعنی اصحاب الرای حنفیہ کے بڑوں میں سے بعض نے یہ کہا ہے کہ حدیث سے جو خبر واحد ہو قیاس امام کا اولیٰ ہے۔ ان اصولوں کے اختراع اور ایجاد کرنے کی یہی وجہ پیش آئی کہ حنفی مذہب کے مسائل اکثر احادیث نبویہ کے خلاف ہیں۔ یہ میرا کہنا نہیں ہے' ہم سے پہلے علماء نے بھی یہ لکھا ہے کہ حنفی مسائل احادیث کے خلاف ہیں۔ چنانچہ امام شعرانی نے فرمایا ہے: ان علر ابی حنیفة فی کثرة القیاس عدم بلوغ الاحادیث الصحیحة۔ یعنی قیاس سے مسائل نکالنے میں ابوحنیفہ کا یہ عذر ہے کہ ان کو احادیث صحیحہ نہیں پہنچی ہیں۔

پس جب ان کے اصول اور مسائل اور عملیات تقلیدی وقیاسی اس حد تک پہنچ چکے ہیں تو ان کا احادیث صحاح ستہ سے کسی ایسی حدیث کا مطالبہ کرنا بے سود ہے جو ان کے مذہب مخصی اور کتب فقہ اور تعامل عامہ کے خلاف ہو۔ یہ انعامی اشتہار محض مرزائی طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے دھوکہ دہی اور فریب کاری ہے کہ عوام اس سے دھوکہ کھا جائیں کہ واقعی یہ مقلدین سچے ہیں' حالانکہ بالکل جھوٹے ہیں ورنہ اگر سچے ہیں تو کوئی عالم ثالث مقرر کریں' ہم اس اشتہار کی شرائط مرقومہ کے مطابق ہی ثبوت دینے کو تیار ہیں' انشاء اللہ العزیز' لیکن ثالث غیر جانبدار مسلمہ فریقین ہو۔

ہمیں آپ کا مطالبہ منظور ہے اور ہم اس کو پورا کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن ساتھ ہی شرط بھی ہے کہ آپ کو بھی انہی شرائط مندرجہ اشتہار کی رُو سے احادیث صحاح سے آنحضرت ﷺ اور خلفاء الراشدین کا بیس تراویح ہمیشہ پڑھنا ثابت کرنا ہو گا بلکہ ہم آپ کو اور وسعت دیتے ہیں کہ اگر آپ صحاح ستہ سے ثبوت دینے سے عاجز رہیں تو دیگر کتب حدیث مستند سے بسند صحیح آنحضرت ﷺ اور خلفاء الراشدین کا تعامل دائمی یا حکم ثابت کر دیں تو تراویح کے ہر حرف کے بدلہ میں ایک ہزار روپیہ انعام حاصل کریں' بلکہ ہم اور وسعت دیتے ہیں کہ چلو کسی حدیث صحیح سے رمضان شریف میں تراویح اور تہجد دو نمازیں پڑھنا ثابت کر دیں تو دونوں لفظوں تراویح اور تہجد کے ہر حرف کے بدلہ ایک ایک ہزار روپیہ انعام حاصل کر لیں' ہم وعدہ کرتے ہیں کہ انشاء اللہ فوراً ادا کر دیں گے بلکہ بہتر صورت یہ ہے کہ فریقین اپنے اپنے انعام کسی معتبر امین مسلمہ فریقین کے پاس جمع کرا دیں

اور ایک یا تین علماء مسلمہ فریقین ثالث اور پنچ مقرر کر کے ان کے سامنے مناظرہ کریں اور یہ مناظرہ تحریری بمع تقریری ہو پھر جو فیصلہ ثالث کریں وہ فریقین تسلیم کر لیں۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہل حدیث سوہدرہ

جلد۔۸' شمارہ۔۲۳' مورخہ ۲۹ جون سنہ۔۱۹۵۶ء

(نوٹ) ---- اگرچہ نماز اشتہار کی تحریر سابقہ مضامین میں آچکی ہے مگر فقہ کے جو اصول مولانا نے بیان فرمائے ہیں' ان کی وجہ سے مضمون کی اہمیت بڑھ گئی ہے جو کسی دوسرے مضمون میں بیان نہیں ہوئے۔ بنابریں اس کی اشاعت غیر مفید نہیں ہے۔ (خلیل)

تحقیق مسائل ..... تعاقب بر فتویٰ تراویح

آپ نے الحدیث نمبر۔۳۱' جلد۔۲' سوال نمبر۔۹۷ کے جواب میں فرمایا ہے : "مسنون ہیں حضور ﷺ کا ارشاد من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ۔ جو ایماندار ثواب کی نیت سے رمضان کی رات قیام کرے' اللہ تعالیٰ اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دیتا ہے۔ پس اس حدیث کی رُو سے اگر کوئی شخص عمداً تراویح چھوڑ دے گا تو گنہگار ہو گا۔ ہاں کسی عذر کی وجہ سے ترک کرے تو معافی ہے۔"

سائل کے سوال کے دو حصے تھے' ایک یہ کہ تراویح سنت ہے یا نفل؟ دوم اگر نہ پڑھی جائے تو گناہ ہے یا نہیں؟ میرے فہم ناقص میں آپ کے دونوں جواب صحیح نہیں۔ جز اول کا جواب بایں طور پر صحیح نہیں کہ سنت نماز اور نفل نماز ایک ہی چیز ہے' صرف اعتباری فرق ہے۔ نماز تہجد' سنن رواتب' تابعہ الفرائض' نماز تراویح وغیرہ سب نوافل ہیں کیونکہ نفلی نماز وہ ہے جو فرضی نماز سے زائد ہے' اس کا نام تطوع ہے۔ فرضوں سے زائد ہونے کے اعتبار سے اس کو نفل اور تطوع کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جو حدیث حساب فرائض کے بارہ میں ہے' اس میں یہ الفاظ وارد ہیں کہ فان انتقص من فریضۃ شیئا قال الرب تبارک و تعالیٰ انظروا اھل لعبدی من تطوع فیکمل بھا ما انتقص من الفریضۃ۔ یعنی اول حساب فرض نماز کا ہو گا' اگر اس میں سے کوئی چیز کم ہوئی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے بندہ کے لیے فرضوں سے زائد کوئی نفلی نماز دیکھو' اگر ہے تو اس سے فرضی نماز کی کمی پوری کی جائے۔

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ فرض سے زائد نماز کو تطوع کہتے ہیں۔ صبح کی دو رکعت سنت کے متعلق ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں : ان اللّٰہ زادکم صلٰوۃ الٰی صلٰوتکم ھی خیرلکم من حمر النعم الا وھی الرکعتان قبل الفجر (تحفہ الاحوذی شرح ترمذی جز اول' ص۔۳۳۵) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری نماز کے ساتھ ایک اور نماز زیادہ کر دی ہے جو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے اور وہ فجر کے دو فرضوں سے پہلے کی دو رکعت ہیں۔ انہی دو سنتوں کو نفل بھی کہا گیا ہے۔

چنانچہ مشکوۃ میں ہے کہ عن عائشۃ قالت لم یکن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی شیئی من النوافل اشد تعاھدًا منہ علی رکعتی الفجر۔ (متفق علیہ) یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ نبی ﷺ نفلوں میں سے کسی نفلی نماز پر اس قدر سخت محافظت نہیں کرتے تھے جس قدر کہ فجر کی دو رکعت پر کیا کرتے تھے۔ اس حدیث میں فجر کی دو سنتوں کو نوافل میں شمار کیا گیا ہے۔ آنحضور ﷺ نے آخری عشرہ رمضان میں تین دن نماز تراویح لوگوں کو پڑھائی تھی۔ اس میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ فقلنا یارسول اللّٰہ لو نفلتنا بقیۃ لیلتنا ھذہ۔ یعنی ہم نے کہا کہ یارسول اللہ! کاش کہ آپ اس رات کے بقیہ حصہ میں بھی ہم کو نفلی نماز اور زیادہ کرتے۔ (الترمذی)

تحفۃ الاحوذی میں نہایہ سے منقول ہے کہ لو زدتنا من الصلوۃ النافلۃ سمیت بھا النوافل لانھا زائدۃ علی الفرائض۔ یعنی تراویح کو نفلی نماز کے نام سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ یہ فرائض پنجگانہ پر زائد ہے۔ سنن رواتب کو بھی نفل اور تطوع کہا گیا ہے۔

چنانچہ مشکوۃ میں باب السنن کے تحت ایک حدیث عبداللہ بن شقیق سے مروی ہے' وہ کہتے ہیں کہ سألت عن عائشۃ عن صلٰوۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن تطوعہ کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مسئلہ دریافت کیا کہ ان کی نفلی نماز کون سی تھی' کتنی تھی؟ حضرت صدیقہ مطہرہ رضی اللہ عنہا نے سنن رواتب تابعہ الفرائض یعنی بارہ رکعت سنت موکدہ کا ذکر فرمایا اور تہجد نماز بمع وتر کا ذکر کیا جس سے یہ ثابت ہوا کہ تہجد' تراویح' سنن رواتب' وتر سب نفل اور تطوع میں داخل ہیں۔ دوسرے اعتبار سے ان نوافل کو سنت بھی کہا جاتا ہے کیونکہ سنت وہ چیز ہے جو رسول اللہ ﷺ کے قول یا فعل سے ثابت ہے۔ یہ سب نوافل قولی اور فعلی احادیث سے ثابت ہیں۔

بارہ رکعت رواتب کے متعلق حدیث میں ہے کہ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من ثابر علی اثنی عشرۃ رکعۃ من السنۃ بنی اللّٰہ لہ بیتا فی الجنۃ۔ (ترمذی) یعنی جو شخص بارہ رکعت سنت پر ہمیشگی کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے لیے بہشت میں گھر بناتا ہے۔ پھر حضرت ملکہ دو عالم نے بارہ رکعت کا شمار کیا۔ اس حدیث میں بارہ رکعت رواتب تابعہ للفرائض کو سنت کہا گیا ہے اور دوسری حدیث میں انہی کو نفل کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :ما من عبد مسلم یصلی للّٰہ کل یوم ثنتی عشرۃ رکعۃ تطوعا غیر فریضۃ الا بنی اللّٰہ لہ بیتا فی الجنۃ۔ یعنی جو بندہ مسلمان خالص اللہ کے لیے بارہ رکعت نفل پڑھتا ہے' نہ فرض کے طور پر بلکہ نفل زائد کے طور پر تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔

مشکوٰۃ میں نفلی نمازوں کے ذکر کے لیے یوں باب باندھا ہے :باب السنن وفضائلھا۔ یعنی یہ باب سنتوں اور اس کی فضیلتوں کے بیان میں ہے۔ اسی طرح حدیث کی دیگر کتابوں میں ہے' الغرض علمائے دین میں یہ مسلمہ بات ہے کہ فرضوں سے زائد نماز کو تطوع اور نفل کہتے ہیں اور اس لحاظ سے کہ وہ آنحضور ﷺ کے قول و فعل سے ثابت ہے' اس کو سنت بھی کہتے ہیں۔

پس نماز تراویح نفلی نماز ہے اور مسنون ہے۔ آنحضرت ﷺ سے قولاً اور فعلاً ثابت ہے اور یہ فرضوں سے زائد ہے۔ تطوع میں شمار ہے' اس کا پڑھنا موجب اجر وثواب ہے' باعث مغفرت ذنوب ہے۔

دوسری جز سوال کی یہ تھی کہ نہ پڑھی جائے تو گناہ ہے یا نہیں؟ اس کا جواب آپ نے یہ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص عمداً تراویح چھوڑ دے گا تو گنہگار ہوگا' یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ تراویح فرض نہیں ہے' نفل ہے۔ فرض اور نفل میں بھی فرق ہے کہ فرض کی ادائیگی ضروری ہے' اس کا ترک جائز نہیں ہے۔ جو عمداً ترک کرے گا وہ گنہگار ہے' اس کے لیے وعید ہے۔ نفلی نماز کی ادائیگی ضروری نہیں ہے' مستحب ہے۔ افضل ہے' باعث اجر ہے' موجب ترقی درجات ہے۔ لیکن اس کا تارک گنہگار نہیں ہے اور اس کے لیے وعید نہیں ہے۔ مثلاً فرض نمازوں کے بعد تہجد کی نماز کا درجہ ہے جو مسنون ہے اور نفل ہے' سب نمازوں سے فائق ہے۔ حدیث میں ہے :افضل الصلوٰۃ بعد الفریضۃ صلوٰۃ اللیل۔ (ترمذی) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فرض نماز کے بعد سب نمازوں میں تہجد کی نماز افضل ہے۔

تحفۃ الاحوذی میں امام نووی سے منقول ہے : ان صلوٰۃ اللیل افضل من السنن

الرواتب لانها تشبهه الفرائض۔ یعنی رات کی نماز تہجد سنن راتبہ سے افضل ہے' کیونکہ یہ فرائض کے مشابہہ ہے لیکن نماز تہجد کے تارک کو آج تک کسی مفتی اہل حدیث یا حنفی نے گنہگار نہیں کہا اور نہ کوئی اب کہتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے' آپ بھی نہ کہتے ہوں گے' ورنہ عوام تو کیا بہت خواص بلکہ صحابہ میں سے بھی بعض بزرگ گنہگار قرار پائیں گے' ولم یقل بہ احد۔

نماز تہجد جو نفل اور مسنون ہے' رمضان مبارک میں تراویح کی صورت اختیار کر لیتی ہے لیکن تاہم تراویح بھی تو نفل ہیں اور مسنون ہیں' فرض نہیں ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ : ان رمضان شهر افترض اللّٰه صيامه وانی سننت للمسلمين قيامه۔ یعنی رمضان وہ مہینہ ہے کہ اس کے روزے اللہ نے فرض کر دیئے اور میں نے اس میں نفل پڑھنے مسنون کر دیئے۔

حضرت عمر بنٹنہ نے فرمایا کہ ان هذا الشهر كتب اللّٰه عليكم صيامه ولم يكتب عليكم قيامه فمن استطاع ان يقوم فليقم فانها نوافل الخير التی قال اللّٰه تعالٰی من لم يستطع فلينم علٰی فراشه الحديث۔ (قيام الليل) یعنی یہ رمضان مہینہ جس کے روزے اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کر دیئے ہیں اور اس میں تراویح نماز تم پر فرض نہیں کی ہے جو شخص پڑھ سکتا ہے' وہ پڑھ لے کیونکہ یہ بہترین نفل ہیں اور وہ زائد نیکی ہے جو اللہ نے فرمائی ہے اور جو نہ پڑھنا چاہے' وہ اپنے بستر خواب پر سویا رہے۔

حضرت عمر بنٹنہ نے جس فرمان الٰہی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے :فمن تطوع خيرا فهو خير له (قرآن) یعنی جو شخص زیادہ نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ حضرت عمر بنٹنہ کے فرمان اور اس استدلال بقران سے یہ ثابت ہوا کہ رمضان کی نماز تراویح تطوع اور نفل ہے' جس کا پڑھنا موجب ثواب ہے لیکن یہ نماز اختیاری ہے فرض نہیں ہے اور اس کا تارک گناہگار نہیں ہے' جو نہیں پڑھنا چاہتا وہ اپنے بستر پر سویا رہے۔ فضیلت اور ثواب سے محروم رہ جائے گا اور کوئی وعید نہیں ہے اور نہ گناہ ہے۔ من ادعی فعليه البيان بالبرهان۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہل حدیث سوہدرہ

جلد۔ ۳' شمارہ۔ ۲' مورخہ ۲۴ مارچ سنہ۔ ۱۹۵۱ء

نماز تراویح وغیرہ میں قرآن مجید سنا کر اجرت لینا شرعاً کیسا ہے؟

سوال : کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ عہد حاضرہ میں یہ عام رواج ہے کہ ماہ رمضان میں قرآن کے حفاظ مسجدوں میں تراویح پڑھانے پر مقرر ہو کر قرآن مجید سناتے ہیں۔ حنفیہ نماز تراویح میں قرآن کا ختم سنت موکدہ قرار دیتے ہیں۔ اس لیے لوگ دور دور سے قرآن کے حافظوں کو لاتے ہیں اور تراویح میں ان سے قرآن مجید سنتے ہیں اور بعض حفاظ خود سفر کر کے شہروں یا دیہات میں جگہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں کہ ان کو تراویح میں قرآن مجید سنانے کا موقعہ میسر آجائے' کیونکہ جو لوگ حافظوں سے قرآن سنتے ہیں' ختم قرآن پر کافی روپے دیتے ہیں۔ ہزار' پانچ سو' تین سو' چار سو اور بعض جگہ کم وبیش دے دیتے ہیں۔ بعض لوگ اور حافظ قرآن سنانے کی اجرت مقرر کر لیتے ہیں۔ اگر کم دیں تو ان کو قرآن مجید نہیں سناتے' جہاں ان کو زیادہ روپیہ ملتا ہے' وہاں سناتے ہیں اور بعض حفاظ تیز قرآن پڑھنے والے دو قرآن دو جگہوں پر سنا کر اُجرت حاصل کرتے ہیں۔ بعض تو مقرر کر لیتے ہیں اور بعض مقرر نہیں کرتے لیکن ان حافظوں کو یہ یقین ہوتا ہے کہ ہم کو اجرت ضرور ملے گی۔ اگر کوئی نہ دے تو حافظ ناراض ہوتا ہے اور پھر آئندہ سال ان کو قرآن مجید نہ سنائے گا۔ دریں حالات سوال یہ ہے کہ ان حافظوں کا اُجرت لینا اور لوگوں کا ان کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث اور تعامل صحابہ کی رُو سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الوھاب' وھو الموفق للصواب۔

الحمد للہ رب العالمین۔ اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔

واضح ہو کہ یہ مرض عرب وعجم میں وبا کی طرح پھیل گیا ہے۔ اب اس کے حرام یا ناجائز ہونے کا احساس کسی کو نہیں ہے۔ علماء کی یہ علامت ہے کہ جو چیز عام رائج ہو جائے اور لوگ اس کے خلاف آواز اٹھانے اور منع کرنے کو برا جانتے ہوں تو پھر اس کو جائز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر مقدمات عدالتی کے حکام اور وکلاء کی طرح حیلے بہانے اور کئی قیاسی گھوڑے دوڑاتے ہیں' جیسے حنفیہ کے ائمہ متقدمین نے تو تعلیم قرآن وحدیث وفقہ وامامت واذان کی اجرت کو حرام لکھا ہے اور اس پر کتاب وسنت سے دلائل بھی دیئے تھے لیکن متاخرین مقلدین نے اپنے ائمہ کی تقلید پر لات مار کر طمع نفسانی سے اس اُجرت کو حلال بنا

لیا اور طرح طرح کے حیلے اور حجتیں ڈھونڈ کر متقدمین کے دلائل کی تنسیخ کر دی اور غیر مقلد ہو گئے۔ بہرحال عہد حاضرہ کے حفاظ کا یہ کارنامہ موجب افسوس ہے۔

چنانچہ مذہب اہل حدیث کے مشہور عالم مولانا عبدالتواب صاحب محدث ملتانی قیام اللیل کے ص۔۱۰۳ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں : قلت قد فشا فی اهل زماننا اخذ الاجر علی الصلوة بالناس فی رمضان حتی ان الحفاظ للقران لیسا فرون من بلد الی بلد ویجدلون اهل مسجد یعینون لهم الاجر قبل ان یقوموا ویکونوا علی نشاط ویتیقن من حصول ما یرفیهم من الاجر بلی ان بعضهم لیصلی باهل مسجد فیسرع فی الفراغ ثم ینصرف الی اهل مسجد اخر فیقوم لهم وذالک کله فی اول لیلة فیحصل الاجر من هولاء وهولاء فانا للّٰه وانا الیه راجعون۔ یعنی میں کہتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں تو رمضان میں نماز تراویح کی اُجرت لینے کا عام رواج ہو گیا ہے یہاں تک کہ قرآن کے حفاظ یہ اجرت لینے کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے پھرتے ہیں کہ کہیں تراویح پڑھا کر اجرت لینے کی جگہ ملے۔ آخر تلاش کے بعد ایسے لوگوں کو پا لیتے ہیں جو ان کو اجرت قرآن سنائی کی دیں تو قیام رمضان سے پہلے ان سے اُجرت مقرر کر لیتے ہیں کہ ہم اتنا روپیہ لیں گے۔ جب لوگ مان جائیں تو اس پر خوش ہو جاتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ ہم کو اتنا اتنا روپیہ ضرور مل جائے گا بلکہ بعض حافظ قرآن تو ایک مسجد میں جلد جلد قرآن پڑھ کر ختم کر دیتے ہیں اور پھر دوسری مسجد میں قرآن سنانے چلے جاتے ہیں۔ سب سے اول رات ہی بات طے کر کے ہر دو طرف سے قرآن سنائی کی مزدوری وصول کر لیتے ہیں۔ اس طمع نفسانی سے اُجرت علی الطاعة حاصل کرنے کا بہت افسوس ہے لیکن سوائے انا للّٰہ کے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

دیوبندی فتویٰ: اب فرقہ دیوبندی کے ایک معتبر عالم کا فتویٰ سنئے۔ جناب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی فرماتے ہیں : ”جو حافظ اُجرت پر سناتے ہیں، وہ سنانا عبادت نہیں ہے۔ پس اس کو سننا بھی نہیں چاہیے۔“ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ بندہ رشید احمد گنگوہی، فتاویٰ رشیدیہ کامل ص۔۲۱۸۔

پھر ص۔۲۲۴ میں یہ لکھا ہے : ”قرآن سنانے کی اُجرت تراویح میں لینا درست نہیں کہ قرآن عبادت ہے اور عبادت پر اُجرت لینا حرام ہے۔“ قال فی رد المختار الاخذ

والمعطی آثمان انتہی۔ یعنی لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہیں۔

اور ص۔۳۲۴ میں یہ لکھتے ہیں : "اگر حافظ کے دل میں لینے کا خیال نہ تھا اور پھر کسی نے دیا تو درست ہے اور جو حسب رواج اُجرت دیتے ہیں' حافظ بھی لینے کے خیال سے پڑھتا ہے' اگرچہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تو درست نہیں۔"

ان فتووں سے دیوبندی حافظوں اور ان کے مقتدیوں کا قلع قمع ہو گیا کہ قرآن سنانے والے اور سننے والے اور ستائیسویں رمضان کو روپیہ پیسہ دینے اور لینے والے سب گنہگار ہیں۔ بیس تراویح پڑھ کر زیادہ عبادت کا فخر کرنے والے اپنے اعمال نامہ کو پیش نظر رکھ کر ان فتووں پر غور کریں کہ نہ مقرر کر کے اُجرت لینی جائز ہے اور نہ بغیر مقرر کے رواج کے طور پر جائز ہے۔

بریلوی مذہب بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہمارے ائمہ دینی کام پر اُجرت نہ لیتے تھے۔ چنانچہ انوار ساطعہ مع براہین قاطعہ کے ص۔۱۷۹ میں ہے : "پہلے صحابہ اور تابعین حتیٰ کہ امام اعظم اور امام محمد وابو یوسف تعلیم علم دین کی اُجرت نہ لیتے تھے۔" اب یہ مقلدین تقلید کا پٹہ گلے سے نکال کر غیر مقلد ہو گئے کہ سب تعلیم قرآن' حدیث' فقہ' وعظ تبلیغ پر اُجرت لیتے ہیں۔"

اسی طرح انوار ساطعہ ص۔۱۲۹ میں یہ لکھا ہے : "موافق رسم بعض ملکوں کے اگر حافظوں کو مزدوری دے کر قرآن پڑھوا دیں' یہ البتہ مکروہ ہے۔" اس کی تصدیق کتب فقہ میں موجود ہے۔ شامی نے باب الاجارہ میں لکھا ہے : قال تاج الشریعة فی شرح الهدایة ان قرأ القرآن بالاجرة لا یستحق الثواب لا للمیت ولا للقاری وعن شیخ الاسلام ان القاری اذا قرأ القران باجل المال فلا ثواب له فای شئی یهدیه الی المیت انتهی کلام الشامی۔ یعنی اگر قرآن اجرت پر پڑھا تو نہ قاری ثواب کا مستحق ہے نہ میت کو ثواب پہنچتا ہے۔

شیخ الاسلام سے یہ منقول ہے کہ قاری نے جب مال حاصل کرنے کی غرض سے قرآن پڑھا تو اُس کو کوئی ثواب نہیں ملتا پھر میت کو کیا ہدیہ یہ بھیجے گا۔

یہ جو لشکروں اور چھاؤنیوں اور بعض شہروں میں قرآن اس طرح پڑھواتے ہیں کہ روپیہ کے تین دن یا چار قرآن کے حساب سے کچھ سپارہ کا روزمرہ ٹھہر کر اس کا ٹھیکہ کرتے

ہیں' اس طرح قرآن شریف پڑھوانا میت کے لیے منع ہے۔

صفحہ۔۱۲ سیف السنہ میں جو عبارتیں طریقہ محمدیہ اور قرطبی کی نقل کی ہیں' ان میں مراد وہی مزدوری کے طور قرآن پڑھنا ہے' اس لیے کہ اس وقت میں بعض ملکوں میں وہی دستور تھا اور خود طریقہ محمدیہ کی عبارت سیف السنہ میں ہے: والماخوذ منها حرام للاخذ وهو عاص بالتلاوة والنظر لاجل الدنيا۔ یعنی قرآن پڑھ کر جو کچھ لیا گیا ہے وہ لینے والے کے لیے حرام ہے اور وہ گنہگار ہوا' اس تلاوت اور ذکر سے جو اُس نے دنیا کے طمع کے لیے کیے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ فتویٰ بریلوی مذہب کے بہت بڑے مفتی مولوی عبدالسمیع صاحب رامپوری کا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بریلوی مسلک کے لوگ جو تراویح میں قرآن سناتے ہیں اور لوگ اُن سے سنتے ہیں اور پھر ستائیسویں رمضان کو ختم قرآن پر حافظوں کو روپے کپڑے شیرینی دیتے ہیں۔ بعض مقرر کر لیتے ہیں کہ اتنے روپے لیں گے یا دیں گے اور بعض مقرر نہیں کرتے لیکن دستور معروف مثل شرط کے ہے کہ لینے دینے کی نیت اور سب کا رواج ہے۔ اسی طرح ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرا کر قاری کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں' یہ حرام اور باطل ہے اور کسی کو سننے اور سنانے کا اجر نہیں ملے گا بلکہ گناہ ہو گا۔

چنانچہ علامہ عینی حنفی نہایہ شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں: الآخذ والمعطي آثمان۔ کہ اجرت قرآن لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہیں۔

پس بریلویوں کے حافظوں اور مقتدیوں کا رمضان میں بیڑا غرق ہو گیا کہ بجائے ثواب کے عذاب کے مستحق ہو گئے۔

اہل حدیث مفتی کا فتویٰ: فتاویٰ نذیریہ جلد۔۱' ص۔۴۲۳ میں جناب حضرت خاتم المحدثین مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "بعض ائمہ سلف سے ثابت ہے کہ وہ اجرت کے ساتھ تراویح پڑھانا اور سننا جائز نہیں رکھتے تھے۔"

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے اس امام کے بارے میں سوال کیا گیا جو لوگوں سے کہے کہ اتنے روپیہ پر تم لوگوں کو رمضان میں تراویح پڑھاؤں گا؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرتا ہوں' ایسے امام کے پیچھے کون نماز پڑھے گا۔

عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں مکروہ سمجھتا ہوں کہ اجرت کے ساتھ نماز پڑھی جائے اور یہ فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ ان لوگوں پر نماز کا اعادہ واجب ہو۔ مصعب نے

عبداللہ بن معقل کو حکم کیا کہ رمضان میں جامع مسجد میں لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ پس جب افطار کیا تو مصعب نے پانچ سو درہم اور ایک حلہ عبداللہ بن معقل کے پاس بھیجا تو انہوں نے واپس کر دیا اور کہا کہ میں قرآن پر اجرت نہیں لیتا۔

کذا فی قیام اللیل احمد بن نصر المروزی۔

میرے نزدیک انہی بعض ائمہ سلف کا قول قابل قبول ہے' واللہ تعالیٰ اعلم۔

محمد عبدالرحمٰن المبارکفوری عفا اللہ عنہ۔

میں کہتا ہوں کہ اہل حدیث' دیوبندی' بریلوی علماء کا یہ متفقہ فتویٰ ہو گیا کہ تراویح پڑھانے والے حافظ اور مولوی ملا لوگ جو ستائیسویں رمضان کو یا عید پر لوگوں سے روپیہ وصول کرتے ہیں' یہ ناجائز ہے۔ اس سے قرآن سنائی اور تراویح پڑھائی کا ثواب ضائع ہے۔ عہد حاضرہ کے حافظوں کو مندرجہ ذیل احادیث کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا : من قرأ القرآن یتاکل به الناس جاء یوم القیامة ووجهه عظم لیس علیه لحم۔ یعنی جس شخص نے قرآن پڑھا تاکہ لوگوں کا اس کے ذریعہ سے مال کھائے' وہ دن قیامت کے حشرگاہ میں اس حالت میں آئے گا کہ اس کا چہرہ ایک ہڈی ہو گا جس پر گوشت نہ ہو گا۔

مشکوٰۃ کے حاشیہ پر اس حدیث پر نمبرا کا نشان دیکھو' یہ لکھا ہے : قال بعض العلماء استجرار الجیفة بالمعازف اهون من استجرارها بالمصحف۔ یعنی باجے بجا کر جو مل مردار کماتا ہے وہ اس سے کم درجہ ہے جو قرآن سے کماتا ہے۔

مرعاۃ المفاتیح جلد۔۳ میں ہے کہ : "جس شخص نے قرآن کو دنیا کا مال کمانے کا ذریعہ بنا لیا' وہ قیامت کو بد شکل ہو کر بری حالت میں آئے گا۔"

پھر حدیث مذکورہ بالا کے کئی شواہد ذکر کیے ہیں۔ ایک یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : اقروا القران ولا تاکلوا۔ یعنی قرآن پڑھو اور اس کے ذریعہ سے کچھ نہ کھاؤ۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز تراویح میں جو حفاظ قرآن سنا کر روپے لیتے ہیں اور ایصال ثواب کے لیے اہل میت سے قرآن پڑھ کر مال لیتے ہیں اور ختم پڑھ کر جو ملا لوگ طعام کھاتے ہیں' یہ سب حرام ہے۔ وہ قیامت کو بدشکل ہو جائیں گے۔ قرآن میں ہے : من کان یرید حرث الاخرة نزد له فی حرثه ومن کان یرید حرث الدنیا نوته منها وماله

فی الاخرۃ من نصیب۔ یعنی جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے' اس کو ہم وہ کھیتی زیادہ دیتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے' ہم اس کو اس سے کچھ دے دیتے ہیں لیکن آخرت میں اس کے لیے کچھ حصہ نہیں ہے۔

اس کی تفسیر حدیث سے یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : فمن عمل منھم بعمل الاخرۃ للدنیا فلیس لہ فی الاخرۃ من نصیب۔ یعنی ان میں سے جن لوگوں نے دنیا حاصل کرنے کے لیے آخرت کا عمل کیا' اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ (ترغیب)

نیز ترغیب میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا آخر زمانہ میں میری اُمت کے تین فرقے ہو جائیں گے۔ ایک وہ فرقہ جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے عبادت کرے گا' اس کو جنت میں داخل کرنے کا حکم ہے۔ دوسرا فرقہ ریا نمود کے لیے عبادت الٰہی کرے گا' اس کو دوزخ میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا۔ تیسرا وہ فرقہ جس نے عبادت الٰہی سے لوگوں کا مال کھایا' اس کی بابت بھی یہ حکم ہو گا کہ اس کو جہنم میں لے جاؤ۔

پس جو لوگ نماز تراویح پر روپیہ' جنازوں پر اسقاط اور ختم قرآن ایصال ثواب برائے میت کر رہے ہیں اور ختم پڑھ کر کھانا کھا رہے ہیں' یہ سب اس وعید کے مورد ہیں اور آج کل جو علماء مبلغین دنیا کا مال کھانے کے دورے کرتے ہیں اور جلسوں پر جا کر تقریریں کرتے ہیں اور ناظمین جلسہ سے روپے لے لیتے ہیں اور اس روپیہ سے زمین بنالی' مکان محل بنا لئے' وہ یہ حدیث سن لیں جو ترغیب میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس امت کے علماء دو قسم ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا' انہوں نے اس علم کو لوگوں پر صرف کیا اور کچھ طمع نہ کی اور نہ مال لیا۔ اس کے لیے سمندر میں مچھلیاں اور خشکی کے جانور اور ہوا کے پرندے بخشش مانگتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں اور دوسرے وہ علماء جن کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا اور انہوں نے اللہ کے بندوں سے بخل کیا کہ طمع کیا اور ان سے مال لیا' ایسے علماء کو قیامت کے روز آگ کی لگام پہنائی جائے گی اور ایک منادی پکارے گا کہ لوگو! یہ وہ علماء ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا تھا لیکن انہوں نے اس کو دنیا کے حصول کا ذریعہ بنالیا۔ وما علینا الا البلاغ۔

عبدالقادر عارف الحصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور

جلد۔۲۶' شمارہ۔۱۸' مورخہ ۹/ نومبر سنہ۔۱۹۷۳ء

نماز تراویح گھر میں پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں؟

کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ نماز تراویح دیگر سنن کی طرح گھر میں پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں؟ جماعت کے ساتھ پڑھنا افضل ہے یا اکیلے پڑھنا افضل ہے؟ مدلل جواب عنایت فرمائیں کہ اس میں لوگوں کا اختلاف ہو رہا ہے۔

(السائل صوفی عبداللہ پارچہ فروش)

الجواب بعون الوھاب وھو موفق للصواب۔ الحمد للّٰہ رب العالمین اما بعد فاقول وباللّٰہ التوفیق۔

واضح ہو کہ نماز تراویح تطوع یعنی نفلی نماز ہے' فرض واجب نہیں ہے۔ نفلی نماز کے بارہ میں شرع محمدی کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ وہ گھر میں پڑھنی افضل ہے۔ چنانچہ اس امر پر یہ حدیث دلیل ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث پر یوں باب منعقد کیا ہے: باب التطوع بالبیت۔ کہ یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ نماز نفلی گھر میں پڑھنی چاہیے۔ پھر یہ حدیث ذکر کی ہے: عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اجعلو فی بیوتکم من صلٰوتکم ولا تتخذوھا قبورا۔ (جلد۔۱' ص۔۱۵۸) یعنی فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ تم اپنی نماز میں سے اپنے گھروں کے لیے کچھ حصہ مقرر کرو اور گھروں کو قبرستان نہ بناؤ (کہ قبرستان میں نماز نہیں پڑھی جاتی)

چونکہ فرض نماز جماعت سے مسجد میں پڑھی جاتی ہے' اس لیے سنن نوافل گھر کا حصہ ہیں' ان کو حتی الوسع گھروں میں ہی پڑھنا چاہیے۔

قیام اللیل ص۔۳۰ میں یہ حدیث ہے: عن زید بن ثابت عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال افضل الصلٰوۃ صلٰوتکم فی بیوتکم الا المکتوبۃ۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ فرض نماز کے علاوہ باقی نماز سنن نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے۔

دوسری روایت میں یہ ارشاد ہے: یاایھا الناس صلوا فی بیوتکم فان افضل صلٰوۃ المرء فی بیتہ الا المکتوبۃ۔ اے لوگو! تم گھروں میں نماز پڑھو کیونکہ افضل نماز مرد نمازی کی گھر میں ہے' سوائے فرضی نماز کے کہ وہ مسجد میں افضل ہے۔

نیز قیام اللیل میں باسنادہ عاصم بن عمرو بجلی سے مروی ہے کہ چند آدمیوں کے گروہ نے

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ نفلی نماز گھر میں پڑھنے کے بارہ میں کیا حکم ہے تو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا کہ تم لوگوں نے مجھ سے وہی سوال کیا ہے جو میں نے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا : صلٰوۃ الرجل فی بیتہ نور فنوروا بیوتکم۔ کہ آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا نور ہے' پس تم اپنے گھر میں نفلی نماز پڑھ کر اس کو منور کرو۔

نیز قیام اللیل کے ص-۲۸ میں ہے : لان اکثر تطوعہ کان فی منزلہ۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر نفلی نماز اپنے گھر ہی میں ہوتی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ سنت نوافل سب گھر میں پڑھنا سنت ہیں۔ نیز قیام اللیل کے اسی صفحہ میں ہے : فان کثیرًا من العلماء کانوا لا یتطوعون فی المسجد۔ یعنی اکثر علماء' صحابہ' تابعین' تبع تابعین' محدثین رضی اللہ عنہم مسجد میں نفلی نماز نہ پڑھتے تھے۔

بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ حدیث مشکوۃ میں ہے' وہ فرماتی ہیں : کان یصلی فی بیتی قبل الظھر اربعا ثم یصلی بالناس ثم یدخل فیصلی رکعتین وکان یصلی بالناس المغرب ثم یدخل فی بیتی فیصلی رکعتین وکان یصلی من اللیل تسع رکعات فیھن الوتر۔ (الحدیث) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں ظہر کے فرضوں سے پہلے چار رکعت سنت پڑھتے تھے پھر لوگوں کو نماز پڑھا کر گھر میں آتے تو دو رکعت پڑھتے تھے' پھر لوگوں کو مغرب کی نماز پڑھا کر آتے تو دو رکعت سنت پڑھتے تھے پھر لوگوں کو عشاء کی فرض نماز پڑھا کر آتے تو میرے گھر میں دو رکعت پڑھتے اور رات کو نماز تہجد مع وتر نو رکعت پڑھتے تھے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سنن اور نماز تہجد سب گھر میں ہمیشہ پڑھتے تھے۔ اس حدیث میں کان یصلی کے الفاظ ہیں کہ مضارع پر داخل ہے جو فائدہ استمرار کا دے رہا ہے۔

نماز تراویح بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں ہی پڑھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تین دن جماعت سے تراویح پڑھی وہ بھی مثل گھر کے تھی کہ آپ نے مسجد میں بوریا کا حجرہ بنا لیا تھا اس میں لوگوں کو تین دن نماز تراویح جماعت کی صورت میں پڑھائی اور پھر یہ فرما دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے پھر تم کو اس کا نبھانا مشکل ہو گا' اس لیے اب یہ حکم ہے : فصلوا ایھا الناس فی بیوتکم فان افضل صلٰوۃ المرء فی بیتہ الا

المکتوبۃ۔ یعنی اے لوگو! یہ نماز اپنے گھروں میں پڑھا کرو کیونکہ آدمی کی نماز گھر میں افضل ہے' سوائے فرض کے کہ یہ مسجد میں جماعت سے پڑھنا افضل ہے۔

یہ حدیث قولی اس بات پر دلیل ہے کہ نماز تراویح گھر میں پڑھنا افضل ہے۔ مسجد میں جماعت سے یا اکیلے پڑھنا گھر کی نفلی نماز سے افضل نہیں کیونکہ اس پر کوئی نص نہیں ہے۔ حدیث مذکورہ کا مورد نماز تراویح ہے' لہٰذا تراویح گھروں میں پڑھنا افضل ہے۔ اگر کوئی شخص نماز تراویح مسجد میں پڑھے' اکیلا یا جماعت سے اور دوسرا شخص گھر میں پڑھے تو جس نے گھر میں پڑھی ہے' اس کی نماز مسجد میں تراویح پڑھنے والے پر ایک ہزار نماز کا ثواب زیادہ رکھتی ہے۔ چنانچہ اس پر یہ حدیث دلیل ہے جو مشکوٰۃ میں بحوالہ ابوداؤد وترمذی وارد ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے صلوٰۃ المرا فی بیتہ افضل من صلوٰتہ فی مسجدی ھذا الا المکتوبۃ۔ یعنی اپنے گھر میں نماز تطوع پڑھنے والے کی نماز میری مسجد میں نماز تطوع پڑھنے والے سے افضل ہے۔

کچھ شک نہیں کہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنا ہزار نماز کا ثواب رکھتا ہے۔ پس جس شخص نے نفلی نماز گھر میں پڑھی اس کی نماز مسجد نبوی کی نماز سے بہتر ہے کہ اگر مسجد نبوی میں ہزار درجہ کا ثواب ہے تو گھر کی نماز کا ثواب دو ہزار ہو گا۔ اس لیے نماز تراویح گھر میں پڑھنا چاہیے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ تراویح جماعت سے پڑھنا گھر میں پڑھنے سے افضل ہے' اس کا قول اِس حدیث' نص صریح کے خلاف ہے اور تراویح کے بارہ میں جو صاف آیا ہے کہ گھر میں پڑھنا افضل ہے' اس کے بھی خلاف ہے۔

چنانچہ مرعاۃ المفاتیح جلد۔۲' ص۔۲۲۶ میں ہے : الحدیث یدل علی ان الصلوٰۃ التراویح فی البیت افضل لانہ ورد فی صلوٰۃ رمضان فی مسجدہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاذا کان صلوٰۃ رمضان فی البیت افضل منھا فی مسجدہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فکیف غیرھا فی مسجد اٰخر وقد ذھب کثیر من العلمآء الی ان صلوٰۃ رمضان ای التراویح فی المسجد افضل وھذا یخالف ھذا الحدیث لان موردہ صلوٰۃ رمضان۔ یعنی یہ حدیث دلیل ہے اس بات پر کہ نماز تراویح گھر میں افضل ہے کیونکہ مورد اس حکم کا نماز تراویح ہے پس جب نماز تراویح گھر میں پڑھنا مسجد نبوی سے افضل ہوا تو دیگر مسجدوں میں نماز پڑھنے سے گھر میں تراویح پڑھنا بطریق اولیٰ افضل ہے اور بہت سے علماء کا

یہ مسلک ہے کہ رمضان کی نماز جماعت سے مسجد میں پڑھنا گھر میں پڑھنے سے افضل ہے' یہ اس صریح حدیث کے خلاف ہے۔

پھر مئولف مرعاۃ المفاتیح نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر جواب بالکل رکیک تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے' کیونکہ وہ ایک وجدانی رائے پر مبنی ہے' کوئی صاف نص ذکر نہیں کی۔ صرف یہ بات لے لی کہ افتراض کی خشیت سے (یعنی فرض ہو جانے کے ڈر سے) آنحضور ﷺ نے جماعت ترک کی اور گھر میں پڑھنے کا حکم دیا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ خشیت رفع ہو گئی تو اس علت مانع کے رفع سے جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کرنا افضل ہو گیا' کیونکہ آنحضور ﷺ نے تین دن جماعت مسجد میں کرا کر اس کی فضیلت ظاہر کر دی۔

یہ جواب بالکل لغو ہے' آنحضور ﷺ نے تین دن رات کے تین مختلف وقتوں میں جماعت کرائی اور تین دن بھی متواتر نہیں بلکہ ایک ایک دن کا وقفہ ڈال کر جماعت کرائی اور پھر جماعت ترک کر دی اور یہ ظاہر کیا کہ نماز فرض کی طرح اس نماز کی جماعت کی پابندی فرض نہیں ہے اور پھر گھروں میں اس نماز کے پڑھنے کا حکم دیا تو اس حکم کی علت یہ بیان کی : فصلوا ایها الناس فی بیوتکم فان افضل صلوٰۃ المرء فی بیته الا صلوٰۃ المکتوبة۔ (متفق علیه) یعنی اے لوگو! یہ نماز اپنے گھروں میں جا کر پڑھا کرو' کیونکہ آدمی کی نفلی نماز گھر میں افضل ہے لیکن فرض نماز مسجد میں افضل ہے۔ اس حدیث میں جو فَاِنَّ اس میں فا تعلیلیه ہے جو گھر میں نماز تراویح وغیرہ سنن رواتب کے پڑھنے کی فضیلت ظاہر کر رہی ہے۔

ترک جماعت کے بعد یہ حکم دینا اس بات پر نص ہے کہ یہ نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے ورنہ ترک جماعت کے بعد آنحضور ﷺ یہ فرماتے کہ مجھے اس نماز کے فرض ہو جانے کا خوف ہے' اس لیے اب تم اس نماز کو انفرادی طور پر ادا کر لیا کرو۔ جب افتراض کا خوف جاتا رہے تو پھر جماعت قائم کر لینا لیکن ایسا نہ فرمایا بلکہ اس کو دیگر نماز تطوع کا ایک فرد قرار دے کر گھر میں پڑھنا افضل قرار دے دیا۔

چنانچہ مئولف مرعاۃ المفاتیح دوسری حدیث کی شرح میں یہ ارشاد کرتے ہیں : والحدیث یدل علی استحباب فعل صلوٰۃ التطوع فی البیوت وان فعلها فیها افضل من فعلها فی المساجد ولو کانت المساجد فاضلة کالمسجد الحرام ومسجده صلی اللّٰه

علیه وسلم ومسجد بیت المقدس فلو صلی الرجل نافلة فی المسجد المدینة کانت بالف صلٰوة علی القول بدخول النوافل فی عموم الحدیث واذا صلاها فی بیته کانت افضل من الف صلٰوة وهکذا حکم المسجد الحرام ومسجد القدس۔ یعنی یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ نماز نفلی گھروں میں پڑھنا مستحب ہے اور گھروں میں پڑھنا افضل ہونا عموم حدیث کی رُو سے تمام مسجدوں کو شامل ہے' خواہ بیت اللہ ہو یا مسجد نبوی ہو یا مسجد قدس ہو۔ پس اگر کوئی نفلی نماز مسجد نبوی میں پڑھ کر ہزار نماز کا درجہ حاصل کرے گا تو جب اس نماز کو گھر میں پڑھے گا تو وہ ہزار نماز سے افضل ہو گی اور عموم حدیث کی رُو سے یہ حکم تمام مسجدوں اور تمام نفلی نمازوں کو شامل ہے۔

پھر مولانا رحمانی صاحب نے اس حکم سے نماز عید اور نماز کسوف واستسقاء اور تراویح وغیرہ کو اس فضیلت سے مستثنیٰ کیا ہے۔ عید وغیرہ کا استثناء تو صحیح ہے کیونکہ ان کا حکم مستقل جدا آچکا ہے لیکن تراویح کی بابت یہ حکم نہیں آیا بلکہ یہ حکم آیا ہے کہ اس نماز کو گھروں میں پڑھو کہ یہ گھروں میں افضل ہے۔ اسی بنا پر عہد نبوی میں بغیر جماعت کے اس حکم کی بناء پر لوگ صحابہ کرام گھروں میں پڑھتے رہے اور عہد صدیقی میں بھی باوجود فرض ہو جانے کا خوف اُٹھ جانے کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھروں میں ہی پڑھتے رہے اور عہد فاروقی میں بھی یہی تعامل تھا لیکن جب لوگ گھروں میں پڑھنا ترک کر کے مسجد میں متفرق طور پر اور بعض جماعت سے پڑھتے دیکھے گئے تو پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ جب لوگ گھروں میں نہیں پڑھتے اور مسجدوں میں ہی جماعت سے پڑھنا چاہتے ہیں تو مسجد میں متفرق جماعتوں کی بجائے ایک ہی امام کی اقتداء میں جماعت کی پابندی لگا دی جائے تو دو امام مقرر کر کے جماعت سے پڑھنا مقرر کر دیا مگر اس تقرری کو سنت قرار نہیں دیا بلکہ یہ کہا کہ نعمت البدعة کہ یہ اچھی بدعت جاری ہو گئی ہے۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ مسجدوں میں جماعت سے پڑھنا بدعت حسنہ ہے' کیونکہ نفس جماعت کا ثبوت ہے' اس لیے حسنہ ہے اور اس ہیئت سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کا تعامل نہیں پایا گیا بلکہ سب گھروں میں آخر رات پڑھتے رہے تو مسجدوں میں جماعت سے پڑھنا بدعت ہو گیا نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول رات صرف ایک ہی دن پڑھی ہے پھر ایک دن وسط رات میں اور پھر ایک دن آخر رات میں جماعت سے پڑھی تو ان دو

وقتوں کو ترک کر کے صرف عشاء کے بعد کی تقرری دائمی بدعت حسنہ قرار پائی۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے بدعت کی دو قسمیں ثابت ہو گئی ہیں۔ ایک حسنہ اور دوسری سیہ۔ حسنہ وہ ہے جس کا ثبوت شارع سے ہو مگر اس کی ہیئت کذائیہ کا ثبوت نہ ہو اور سیہ وہ ہے جس کا ثبوت ہی شارع سے نہ ہو' یا ثبوت ہو مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی ہیئت کذائیہ پر تعامل نہ رکھا ہو۔ ایسی بدعت سے بلدوام بچنا چاہیے اور اس کام کو اسی صورت سے ادا کرتے رہنا چاہیے۔ مثلاً وتروں کو تراویح کے ہمراہ جماعت سے پڑھے تو جائز ہے لیکن غیر رمضان میں عشاء کے وقت ہمیشہ جماعت سے پڑھے تو یہ بدعت سیہ ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مسجد میں جماعت سے عشاء کے بعد ہمیشہ نماز تراویح پڑھنا بدعت حسنہ ہے' سنت موکدہ نہیں۔ بلکہ سنت نبوی اور سنت خلفاء اربعہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اس کو ہمیشہ گھر میں آخر رات میں پڑھتے رہے۔ اگر مسجد میں جماعت سے پڑھنا مسنون ہوتا تو وہ کبھی اس سنت کے تارک نہ ہوتے اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے گو جماعت سے پڑھنے کی تقرری کر دی لیکن اس میں خود شامل نہ ہوئے' گھر میں آخر رات کو پڑھتے رہے۔ چنانچہ ایک دن باہر نکلے تو لوگوں کو تراویح سے فارغ ہو کر آتے دیکھا تو فرمایا : نعمت البدعة هذه والذی تنامون عنها افضل من التی تقومون یرید اٰخر اللیل وکان الناس یقومون اوله۔ یہ اچھی بدعت ہے' افضل یہ تھا کہ یہ لوگ اول رات کے وقت قیام کرنے کی بجائے آخر رات میں یہ نماز پڑھتے۔

اس حدیث کی بنا پر علامہ طیبی یہ فرماتے ہیں : هذا تنبیه منه علی ان صلٰوة التراویح فی اٰخر اللیل افضل۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات پر خبردار کیا ہے کہ نماز تراویح آخر رات میں پڑھنا افضل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ گھر میں پڑھے اور آخر رات میں پڑھے تو یہ دو وجہ سے مسجد میں جماعت سے پڑھنے پر افضل ہے۔ اول گھر میں پڑھنے کی وجہ سے' دوسرا آخر رات میں پڑھنے کی وجہ سے فضیلت ہے۔ قیام اللیل میں کئی روایتیں ہیں جن سے آخر رات میں نفل نماز کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ عمرو بن عبد صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سوال کیا جناب! هل من ساعات اللیل افضل من ساعة اٰخری قال جوف اللیل الاٰخر۔ کہ رات کے وقتوں میں سے کون سا وقت افضل ہے؟ ارشاد ہوا کہ آخر رات کا وقت افضل ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے : ینزل تبارک اسمه وتعالی کل لیلة الی السماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الاخر فیقول من یدعونی فاستجیب له الحدیث کہ اللہ تبارک وتعالیٰ رات کے تیسرے حصے میں آسمان دنیا پر اُترتا ہے اور یہ ارشاد فرماتا ہے کہ اس وقت کون شخص ہے جو مجھ سے دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کروں۔

پس نماز تراویح آخر رات میں پڑھنا افضل ہے۔ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان اور غیر رمضان میں معمول رہا کہ آخر رات میں گیارہ رکعت مع وتر پڑھتے رہے' جیسا کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں مذکور ہے۔ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کو آخر رات میں بیدار کرتا تو آپ قیام فرماتے اور یہ کہتے کہ اے عکرمہ میرے نزدیک یہ آخر رات کا وقت جس میں لوگ سوتے ہیں' محبوب اور افضل ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بابت یہ مروی ہے کہ وہ ماہ رمضان میں عشاء کے بعد کچھ تھوڑا سا سو کر پھر نفلی نماز پڑھا کرتے تھے۔ بہرحال نماز عشاء کے بعد تراویح جماعت کے ساتھ ہمیشہ ادا کرنا جیسا کہ عام طور پر مروج ہے' نہ تعامل نبوی سے ثابت ہے' نہ تعامل خلفاء اربعہ سے۔ اس لیے یہ سنت نہیں' جائز ہے۔ لیکن گھر میں آخر رات پڑھنا تعامل نبوی اور تعامل صحابہ سے ثابت ہے۔ یہ سنت اور افضل ہے' اس کا ثواب زیادہ ہے۔

ترغیب میں حدیث ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ نماز میں اپنے گھر میں پڑھوں تو افضل ہے یا مسجد میں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم یہ نہیں دیکھتے کہ میرا گھر مسجد سے کتنا قریب ہے؟ فلان اصلی فی بیتی احب الی من ان اصلی فی المسجد الا ان تکون صلوٰۃ مکتوبة (ترغیب جلد ۱' ص ۱۴۹) یعنی مجھے اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے زیادہ محبوب ہے مگر فرض نماز ہو تو وہ مسجد میں افضل ہے۔

اس سے نفلی نماز گھر میں پڑھنا افضل اور محبوب الٰہی ورسول صلی اللہ علیہ وسلم ثابت ہوا۔ اس حدیث میں تراویح بھی شامل ہے کیونکہ یہ بھی نفلی نماز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض نماز کو مستثنیٰ کیا ہے' تراویح کو نہیں کیا بلکہ تراویح تو فعلی احادیث سے گھر میں پڑھنا ثابت ہے۔

دیگر حدیث ترغیب میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ

ﷺ سے سوال کیا تھا کہ گھر میں نماز کا کیا حکم ہے تو آپ نے فرمایا تھا : اما صلوٰة الرجل فی بیته فنور فنوروا بیوتکم۔ (رواہ ابن خزیمہ فی صحیحه) کہ گھر میں نماز نفلی پڑھنا نور ہے' اس (نور) سے اپنے گھروں کو روشن کرو۔ اسی وجہ سے آنحضور ﷺ سنن نوافل قیام رمضان گھر میں تمام عمر ادا کرتے رہے۔ یہ مسنون امر ہے' جس کے لوگ تارک ہیں۔

ایک اور حدیث جو مجمع الزوائد جلد۔۲' ص ۔۲۴۷ میں ہے کہ صہیب بن نعمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : فضل صلوٰة الرجل فی بیته علی صلوته حیث یراه الناس کفضل المکتوبة علی النافلة۔ یعنی گھر میں نفلی نماز پڑھنا جہاں س کو باہر کے لوگ نہ دیکھیں اس قدر فضیلت رکھتی ہے جس قدر فرض نماز نفلی نماز پر فضیلت رکھتی ہے۔

ترغیب میں حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : اکرموا بیوتکم ببعض صلوتکم۔ تم اپنے گھروں کو بعض حصہ نماز سے اکرام بخشو۔

دیگر حدیث صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : اذا قضی احدکم الصلوٰة فی مسجد فلیجعل لبیته نصیبا من صلوته فان اللّٰه جاعل فی بیته من صلوٰته خیرا۔ (رواہ مسلم وغیرہ) جب تم مسجد میں نماز ادا کرو تو اپنے گھر کے لیے بھی نماز کا کچھ حصہ رکھ لو' اُس کو گھر جا کر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں نماز سے بھلائی اور خیروبرکت نازل کر دے گا۔"

ان مجموعہ احادیث سے مسجد کی بہ نسبت گھر میں سنن' نوافل' تراویح وغیرہ پڑھنے سے یہ فضائل حاصل ہونے ثابت ہوئے۔ فرضوں کے برابر ثواب ملنا' ہزار نماز سے زیادہ ثواب ملنا' گھر میں نورانیت پیدا ہونا' گھر میں خیروبرکت نازل ہونا' یہ عمل اللہ اور رسول کو محبوب ہونا وغیرہ یہ فضیلت قولی وفعلی احادیث سے ثابت ہوئی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم قرآن سنتے ہیں اور ختم قرآن کا ثواب حاصل ہوتا ہے' اس کا ایک جواب یہ ہے کہ آنحضور ﷺ رمضان میں جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر ایک قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ آخری رمضان میں دو دفعہ قرآن ختم کیا تھا' پس جو لوگ قرآن خوان ہیں وہ رات کو ایک پارہ ہمیشہ پڑھ کر آخر رمضان میں ختم کر دیں تو ختم قرآن کا ثواب حاصل ہوا اور جو لوگ قرآن نہیں پڑھ سکتے تو وہ نماز نفلی میں سورہ قل ھو اللہ تین بار ہر رکعت میں

پڑھ لیا کریں۔ حدیث میں آیا ہے کہ اس سورہ کا ایک بار پڑھنا تیسرے حصہ کے برابر ثواب رکھتا ہے۔ جب تین بار پڑھ لیا تو پورے قرآن کا ثواب حاصل ہو گیا۔

چنانچہ صحیح حدیث بخاری میں ہے کہ ابو سعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی آدمی کو دیکھا کہ وہ بار بار سورہ اخلاص پڑھ رہا ہے' یہاں تک کہ وہ آدمی سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے اِس شخص کا حال بیان کیا اور اس نے نماز میں اس قدر قرآت کو قلیل سا تصور کیا۔ فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم والذی نفسی بیدہ انها لتعدل ثلث القرآن۔ (ابن کثیر) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ یہ سورہ تیسرے حصہ قرآن کے برابر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کسی قرآن خوان کو امام بنا کر گھر میں جماعت کرا لیا کریں کہ اس طرح ختم قرآن اور سماعت کا ثواب بھی حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بابت یہ مروی ہے کہ وہ فرض نماز مسجد میں جماعت سے پڑھ کر پھر گھر میں آکر عورتوں' بچوں اور نوکروں اور بیماروں کو جمع کر کے تراویح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

قیام اللیل میں ہے' لیث کہتے ہیں کہ ہم کو یہ ثبوت نہیں پہنچا کہ عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما رمضان میں لوگوں کے ساتھ قیام کرتے ہوں۔ قاسم اور سالم تابعی بھی لوگوں کے ساتھ قیام نہ کرتے تھے۔ عن مجاهد اذا کان مع الرجل عشر سورہ فلیرددها ولا یقوم فی رمضان خلف الامام۔ مجاہد نے کہا کہ جس شخص کو دس سورتیں یاد ہوں' وہ امام کے پیچھے تراویح نہ پڑھے' اکیلے پڑھے اور ان سورتوں کو بار بار پڑھتا رہے۔

امام شافعی نے کہا کہ اگر اکیلا گھر میں تراویح پڑھے تو یہ مجھے بہت محبوب ہے۔ اگر جماعت سے پڑھے تو یہ بھی اچھا ہے۔ قیام اللیل میں ہے کہ اکیلا گھر میں پڑھے تو جماعت سے افضل ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ گھر میں پڑھتے رہے۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار جلد۱' ص۳۴۱ میں کہا ہے کہ تراویح گھر میں پڑھنا افضل ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ جماعت سے تراویح نہیں پڑھتے تھے۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث جلد۔۵۳' شمارہ۔۱۷' مورخہ یکم رمضان سنہ۔۱۳۹۴ھ

کیا نماز تراویح ایک رات میں دو مرتبہ پڑھنی جائز ہے؟

سوال : کیا نماز تراویح دو مسجدوں میں یا ایک بار مسجد میں اور دوبارہ گھر میں جماعت کی صورت سے پڑھائی جا سکتی ہے؟ اگر پڑھائی جا سکتی ہے تو اس حدیث کا کیا جواب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایک نماز کو دوبارہ نہ پڑھو؟ مدلل جواب دیں' مہربانی ہو گی۔

الجواب بعون الوہاب' الحمد للہ رب العالمین' اما بعد!

واضح ہو کہ نماز تراویح دو طائفوں کو دو مقام پر پڑھا سکتا ہے بلکہ امام فرض نماز بھی پڑھا سکتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں باب من قال یصلی بکل طائفة رکعتین کے تحت یہ حدیث مذکور ہے : عن ابی بکرة قال صلی النبی صلی اللہ علیه وسلم فی خوف الظهر فصف بعضهم خلفه وبعضهم بازاء العدو فصلی بهم رکعتین ثم سلم فانطلق الذین صلوا معه فوقفوا موقف اصحابهم ثم جاؤا اولئک فصلوا خلفه فصلی بهم رکعتین ثم سلم الحدیث۔ یعنی ابوبکرہ صحابی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ظہر کے وقت نماز خوف یوں پڑھائی کہ فوج کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک نے جناب نبی کریم ﷺ کی اقتدا کی' آپ نے ان کو دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا اور یہ گروہ دشمن کے مقابلہ میں چلا گیا جہاں دوسرا گروہ کھڑا تھا۔ پھر دوسرا گروہ آیا تو ان کو دو رکعت نماز پڑھا کر سلام پھیر دیا۔

پس دوسرے گروہ کو جو آپ نے نماز پڑھائی اس سے ثابت ہوا کہ ایک امام دو گروہوں کو نماز پڑھا سکتا ہے حالانکہ نماز ایک ہی ہے۔ ان رکعتوں میں پہلی دو رکعت نبی کریم ﷺ کے دو فرض ہوئے اور دوسرے دوگانہ میں نفل ہوئے تو اماموں کے پیچھے فرض پڑھنے جائز ہیں۔

* ابوداؤد ص۔۸۸ میں ہے : باب امامة من صلی بقوم وقد صلی تلک الصلوة۔ یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بارہ میں ہے کہ جو شخص نماز پڑھ چکا ہے' وہ کسی قوم کی امامت کر کے ان کو نماز پڑھا سکتا ہے۔ پھر اس کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے : عن جابر بن عبداللہ ان معاذ بن جبل کان یصلی مع النبی صلی اللہ علیه وسلم العشاء ثم یاتی قومه فیصلی بهم تلک الصلوة۔ یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ کر پھر اپنی قوم کی جا کر امامت کراتے' وہی نماز جو پڑھ چکے ہوتے اپنی قوم کو جا کر پڑھایا کرتے تھے۔

ابوداؤد باب نقض الوتر ص۔۲۰۲ میں یہ حدیث ہے :عن قیس بن طلق قال زارنا طلق بن علی فی یوم من رمضان وامسی عندنا وافطر ثم قام بنا تلک اللیلۃ واوتر بنا ثم انحدر الی مسجدہ فصلی باصحابہ حتی اذا بقی الوتر قدم رجلا فقال اوتر باصحابک فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا وتران فی لیلۃ۔ یعنی قیس بن طلق نے بیان کیا کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ ہماری ملاقات کے لیے آئے تو رمضان کا دن تھا' شام کے وقت ہمارے پاس ہی ٹھہرے اور یہاں ہی روزہ انطار کیا پھر رات کو نماز پڑھائی تو ہم کو نماز تراویح اور وتر پڑھائے پھر اپنی مسجد کو روانہ ہوئے اور اپنے مقتدیوں کو جاکر پھر نماز تراویح پڑھائی' جب وتر باقی رہ گئے تو پھر ایک شخص کو آگے کر دیا کہ وہ لوگوں کو وتر پڑھادے اور خود یہ عذر کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے کہ ایک رات میں دوبار وتر نہیں پڑھے جاسکتے۔

اس سے نماز تراویح دوبار پڑھانی ثابت ہوئی۔ یہ عمل صحابی کا ہے اور وہ خلاف حدیث مرفوع نہ ہو تو حجت ہے۔ حضرت العلام محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : "اقوال صحابہ کے ساتھ استدلال کرنا ٹھیٹھ اسلام میں داخل ہے۔ (ضمیمہ رسالہ اہلحدیث ص۔۳)

میں کہتا ہوں کہ اسی بنا پر تو ہم سلفی اہلحدیث کہلاتے ہیں جو بروئے حدیث ما انا علیہ واصحابی طائفہ ناجیہ ہیں۔ الحمد للہ علی ذالک۔ حنفی مذہب والے جو اہل سنت والجماعت کہلاتے ہیں' ان کا مذہب خلاف صحابہ کرام ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عبدالحی جلد اول' ص۔۲۴۶ میں تراویح دوبار پڑھنا پڑھانا ناجائز لکھا ہے لیکن کوئی دلیل پیش نہیں کی' صرف وہی قیاس ہے کہ جیسے نفل نماز میں فرض نماز والا اقتدا نہیں کر سکتا کیونکہ قوی کی بنا ضعیف پر جائز نہیں۔ اسی طرح تراویح سنت ہے تو جس شخص نے تراویح پہلے پڑھ لی پھر دوبارہ پڑھائے گا تو اس کے نفل ہوں گے تو سنت قوی ہے اور نفل ضعیف ہے۔ اس لیے اس پر سنت کی بنا صحیح نہیں کہ یہ قوی کی ضعیف پر بنا ہے' مقتدی لوگ سنت تراویح پڑھیں گے اور امام نفل پڑھے گا تو یہ جائز نہیں۔ سو یہ مذہب خلاف حدیث واقوال وافعل صحابہ کے ہے۔ اس لیے ان کو اہل سنت والجماعت کہنا اور مقلدین کا کہلانا ناجائز ہے۔ یہ لوگ ابتداء سے انتہاء تک اہل رائی ہیں جو اہل سنت سے خارج ہیں۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور۔

مسئلہ تراویح وامامت نابالغ

تحفہ رمضان: ایک ٹریکٹ "تحفہ رمضان" کے نام سے کسی تھانوی مولوی صاحب کا ہمارے مطالعہ سے گزرا جس میں بعض ایسے مسائل درج ہیں جو حدیث نبوی کے بالکل خلاف محض تقلیدی ہیں۔ مقلد شخص لکیر کا فقیر ہوتا ہے' اس کو اصل مسئلہ کی تحقیق نہیں ہوتی' تحقیق اور تقلید کا باہمی بیر اور مخالفت ہے۔

مسئلہ تراویح: چنانچہ ایک مسئلہ تراویح کو لے لیں اور "تحفہ رمضان" کے ص۔۲۹ پر لکھا ہے کہ : "رمضان شریف کے مہینے میں روزانہ نماز عشاء کے بعد بیس رکعت تراویح سنت موکدہ ہے۔" یہ قول بالکل غلط اور باطل ہے' کیونکہ سنت موکدہ علماء اسلام کی عام اصطلاح میں اور عام محاورہ میں وہ چیز ہوتی ہے جس کو جناب رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ کیا ہو جیسے صبح کی دو رکعت نماز سنت موکدہ ہے جو فرضوں سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔ اس طرح بیس تراویح رمضان شریف میں پڑھنا بالکل سنت نہیں ہے کیونکہ بیس تراویح نماز کا ثبوت کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

ایک ضعیف حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بعض مقلد مولوی حضرات بیان کرتے ہیں جس کو محدثین کرام اور علماء حنفیہ نے بالاتفاق ضعیف اور منکر کہا ہے اور یہ صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نماز تراویح آٹھ رکعت ہے' بیس رکعت سنت نہیں ہے۔ اب یہاں آٹھ رکعت نماز رمضان جس کو تراویح کہتے ہیں' ثبوت پیش کرتے ہیں۔

ثبوت: صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمن نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا : كيف كانت صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم في رمضان۔ یعنی رمضان کی نماز رسول اللہ ﷺ کی کس طرح تھی؟

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ جواب دیا : ما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يزيد في رمضان ولا في غيره على احدى عشرة ركعة۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نماز نہیں پڑھی۔

یہ حدیث بخاری شریف میں بھی ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ تمام سال میں

رات کی نماز رسول اللہ ﷺ کی گیارہ رکعت سے زیادہ نہ تھی۔ فتح الباری میں ہے: وفی الحدیث دلالة علی ان صلوته کانت مساویة فی جمیع السنة۔ یعنی تمام سال میں رات کی نماز برابر تھی، رمضان میں بھی گیارہ بمع وتر اور رمضان کے سوا بھی گیارہ رکعت بمع وتر تھی۔

رمضان میں پڑھی جائے گی تو اس کو تراویح کہیں گے اور غیر رمضان میں اس کو تہجد کہیں گے۔ اِس نماز کا نام تراویح علماء نے رکھا ہے۔ احادیث میں یہ نام نہیں آیا۔ احادیث میں اس کے نام یہ ہیں: صلٰوة اللیل (رات کی نماز) قیام رمضان (رمضان کا قیام) صلٰوة رمضان (رمضان کی نماز) صلٰوة التہجد (تہجد کی نماز) یعنی نماز ایک ہی ہے لیکن علیحدہ علیحدہ اعتبار سے نام کئی ہیں۔

دو نمازیں: رمضان شریف میں دو نمازیں تراویح اور تہجد پڑھنا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ جو شخص کسی حدیث سے رمضان شریف میں رات کو دو نمازیں (ایک تراویح اور دوسری تہجد) پڑھنا ثابت کر دیں، ہم انہیں انعام دینے کو تیار ہیں۔

گیارہ رکعت بمعہ وتر اگر رمضان میں پڑھی جائے تو اس کا نام قیام رمضان یا صلٰوة رمضان ہے اور اگر رمضان کے سوا رات کو پڑھی جائے تو یہی تہجد ہے اور رات کو پڑھنے کے سبب ہی سے اس کا نام قیام اللیل ہے۔ یہ اعتباری فرق ہے، نماز ایک ہی ہے۔ یہ فرق ایسا ہی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ایک ہے لیکن آپ کے نام مختلف اعتبار سے کئی ہیں۔ مثلاً: محمد -- احمد -- خاتم النبیین -- قاسم -- عاقب -- بشیر -- نذیر -- منیر -- مزمل -- مدثر -- وغیرہ۔

پہلی دلیل: مولانا انور شاہ صاحب دیوبندی جو اکابر علماء دیوبند سے ہیں، وہ فیض الباری جلد ۲، ص ۴۲۰ میں اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ: والمختار عندی انهما واحد وان اختلف صفتهما۔ (میری تحقیق میں مختار بات یہ ہے کہ تراویح اور تہجد ایک ہی شے ہے، حالت ان کی الگ الگ ہے۔

امام محمد نے موطا میں قیام رمضان کا ایک باب باندھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث ذکر کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی رات کی نماز جس قدر تھی، اسی قدر قیام رمضان ہے۔

دوسری دلیل: علامہ عینی حنفی نے عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری جلد ۳' ص ۵۶۷ میں صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کے حوالہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ : عدد الصلوۃ التی صلاھا رسول اللّٰہ فی تلک اللیالی قلت روی ابن خزیمۃ وابن حبان من حدیث جابر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال صلّٰی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی رمضان ثمان رکعات ثم اوتر۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے جو تین رات تراویح رمضان المبارک میں پڑھائی تھی' وہ کتنی رکعت تھی؟ اس کا جواب میں یہ کہوں گا کہ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں آٹھ رکعت اور تین وتر رمضان میں نماز پڑھائی تھی۔

یہ صریح حدیث ہے کہ نماز تراویح وتر سمیت گیارہ رکعت سنت ہے۔ پس جو شخص بیس رکعت تراویح سنت موکدہ کہتا ہے' وہ سراسر غلط کہتا ہے' جس کا سنت سے ثبوت نہیں ہے۔

تیسری دلیل: مجمع الزوائد اور قیام اللیل ص ۹۰ میں یہ حدیث ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! (ﷺ) مجھ سے آج کی رات ایک بات ہو گئی (یعنی رمضان المبارک میں) کہ عورتوں نے میرے گھر میں کہا کہ ہم قرآن حفظ نہیں پڑھ سکتیں' تمہاری نماز کے ساتھ نماز پڑھیں گی۔ میں نے ان کو آٹھ رکعت اور وتر نماز پڑھا دی' آپ ﷺ نے سن کر کچھ نہ کہا۔ فکانت سنۃ الرضا۔ یہ سنت رضامندی سے ثابت ہو گئی۔

مرد کا عورتوں کو نماز پڑھانا اور آٹھ تراویح اور وتر پڑھانا جائز ہوا۔

چوتھی دلیل: موطا امام مالک ص ۴۰ مطبوعہ دہلی میں ہے: عن السائب بن یزید انہ قال امر عمر بن الخطاب ابی بن کعب وتمیما الداری ان یقوما للناس باحدٰی عشرۃ رکعۃ۔ یعنی سائب بن یزید سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما دونوں کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھایا کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دو حافظ قرآن رمضان میں تراویح پر مقرر فرما کر ان کو حکم دیا کہ بمع وتر گیارہ رکعت لوگوں کو پڑھایا کریں۔ اس کی سند نہایت صحیح ہے' دیکھو تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی جلد ۲' ص ۷۴۔

علماء یا مقلدین جو یہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعت پڑھانے کا حکم دیا' یہ سراسر غلط ہے۔ جس راوی کا یہ بیان ہے اس نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ ہی نہیں پایا وہ روایت صاف ضعیف ہے۔ جو مذہب ضعیف ہوتا ہے وہ ضعیف روایتوں کا سہارا لیا کرتا ہے' کسی موضوع حدیث اور کسی موقوف حدیث جو خلفاء راشدین سے ہو لیکن سند صحیح ہو' کوئی عالم بیس رکعت تراویح ثابت کردے تو انعام حاصل کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے بیس تراویح پڑھنا اور پڑھانا ثابت نہیں ہے' نہ ان کے متعلق کوئی صحیح حدیث ہے۔ صرف مقلدین نے فقہ کی کتابوں میں بیس تراویح سنت لکھ دیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ احادیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ہاں بعض سلف صالحین نے نفلی عبادت کی نیت سے رمضان المبارک میں ۲۱' ۲۰' ۳۶' ۴۰ رکعات پڑھی ہیں مگر ان کو کسی امام' محدث نے سنت نہیں کہا۔ سنت وہ فعل ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمل کیا ہے۔ سو وہ رمضان المبارک میں آٹھ تراویح اور تین وتر (یعنی کل گیارہ رکعت) سنت ہیں۔ بیس رکعت کو سنت موکدہ کہنا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا ہے اور بیس تراویح کو سنت کی نیت سے پڑھنا بدعت ہے۔ ہاں آٹھ کو سنت اور باقی کو نفل مستحب جان کر کوئی پڑھ لے تو یہ جائز ہے' سنت نہ ہے۔

حنفی شہادت: شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی اپنی کتاب فتح سر المنان ص۔۳۲۷ میں فرماتے ہیں: ولم یثبت روایة عشرین رکعة منه صلی اللہ علیه وسلم کما هو المتعارف الان۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیس تراویح کی حدیث ثابت نہیں ہے' جیسا کہ آج کل رواج ہے۔

دوسری حنفی شہادت: فتح القدیر کتاب حنفی (جلد اول' ص۔۳۳۴ مصری) میں امام ابن ہمام حنفی عالم کا فرمان ہے کہ ان قیام رمضان سنة احدی عشرة بالوتر فعله صلی اللہ علیه وسلم۔ یعنی تراویح رمضان کی گیارہ رکعت وتر سمیت سنت نبوی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ بیس رکعت تراویح سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ بیس تراویح سنت خلفاء ہے تو جواب یہ ہے کہ خلفاء کا قول یا فعل بیس پر صحیح سند سے

ثابت کرو۔ دوسرا یہ کہ گیارہ رکعت کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بہ سند صحیح حکم دینا ہم نے ثابت کر دیا ہے۔

تیسری حنفی شہادت: بحرالرائق حنفی کتاب جلد۔۲، ص۔۶۶ میں مشہور حنفی عالم ابن نجیم کا فرمان ہے کہ وہ اس مسئلہ پر بحث کرنے کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ: وقد ثبت ان ذالک کان احدی عشرۃ رکعۃ بالوتر کما ثبت فی الصحیحین من حدیث عائشۃ فاذن یکون المسنون علی اصول مشائخنا ثمانیۃ منھا والمستحب اثنا عشر۔ یعنی گیارہ رکعت وتر کے ساتھ تراویح ثابت ہیں جیسے صحیحین کی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں اس کا ثبوت ہے۔ پس ہمارے مشائخ حنفیہ کے قاعدہ کی رو سے آٹھ تراویح سنت ہیں اور بارہ مستحب ہیں، یہ ٹھیک ہے۔

اس معتبر فیصلہ سے تین باتیں ثابت ہوئیں۔ اول یہ کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کی تراویح کو بھی شامل ہے۔ دوم یہ کہ آٹھ رکعت تراویح سنت ہے۔ سوم یہ کہ بارہ رکعت بیس میں سے مستحب ہیں، سنت نہیں۔ یہ فیصلہ حنفیہ کے مشائخ کے اصول پر ہوا۔ پس بیس کو سنت موکدہ بنانا باطل ہے۔ طحاوی حنفی اور دیگر حنفی مصنفوں نے بھی اسی طرح لکھا ہے کہ سنت آٹھ رکعت تراویح ہے۔

نابالغ کی امامت کا حکم: اسی ٹریکٹ (تحفہ رمضان) کے ص۔۲۶ پر یہ تحریر ہے کہ:
"نابالغ بچوں کو تراویح میں امام بنانا جائز نہیں ہے۔"

یہ مسئلہ بھی حدیث کی رُو سے بالکل غلط بلکہ باطل ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ نابالغ لڑکا جس کو قرآن مجید یا قرآن مجید کی بعض سورتیں حفظ ہوں اور نماز پڑھنے پڑھانے کا طریقہ بھی جانتا ہو، اُسے فرضوں، نفلوں اور تراویح وغیرہ میں امام بنانا جائز اور صحیح ہے۔ اس کے پیچھے بلاشبہ نماز ہو جائے گی۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ مشکوٰۃ بخاری، سنن کبریٰ بیہقی، قیام اللیل ص۔۱۰۰ میں یہ حدیث وارد ہے۔ (چونکہ حدیث طویل ہے، اس لیے) میں اس کے ترجمے کا خلاصہ لکھتا ہوں:

عمرو بن سلمہ صحابی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میرا والد اور میری قوم کے بعض لوگ فتح مکہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ انہوں نے نماز کے احکام سیکھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس طرح نماز پڑھنا ہو گا اور اپنے میں سے اس شخص کو

امام بنانا ہو گا جس کو قرآن زیادہ یاد ہو۔

جب میرا والد آیا تو انہوں نے ہم کو بھی نماز کا طریقہ سکھلایا۔ اب امام کا انتخاب ہونے لگا تو مجھے سب سے زیادہ قرآن یاد تھا کیونکہ میں بچوں کے ہمراہ قافلوں کی گذرگاہ پر چلا جاتا تھا اور وہاں سے اہل اسلام کے جو قافلے گذرتے' میں اُن سے قرآن سن سن کر یاد کر لیتا تھا۔ جب انتخاب ہوا تو حفظ قرآن کے اعتبار سے سب لوگوں نے مجھے امام بنا لیا اور میں نمازوں میں امامت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ میری قوم کے لوگ ہر مجمع میں مجھی کو اپنا امام تسلیم کر لیتے' حالانکہ میں صرف چھ سات سال کا لڑکا تھا' لیکن میری قوم میرے پیچھے نماز پڑھتی رہی۔

میرا تہبند تنگ تھا' جب سجدے کو جاتا تو تہبند سکڑ جانے کی وجہ سے نیچے کا بدن ننگا ہو جاتا۔ ایک دن ایک عورت نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو اس نے لوگوں سے کہا کہ تم اپنے امام کا ستر تو ڈھانکو۔ اس پر لوگوں نے چھ سات درہم سے ایک قمیص خرید کر مجھے پہنا دی' جس سے میں بہت خوش ہوا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نابالغ لڑکے کو مسجد کا امام بنانا جائز ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل رہا ہے۔ جو اس حدیث کو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کو نہ مانے وہ اہل سنت والجماعت نہیں ہو سکتا۔

قیام اللیل للمروزی ص۔۱۰۰ میں اور ص۔۱۰۱ میں دیگر روایتیں بھی ہیں جن سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین میں نابالغ کو امام بنا کر پڑھنے کا طریقہ جاری تھا۔ حضرت عروہ روایت کرتے ہیں کہ اشعث بن قیس امیر جماعت تھے۔ فقدم غلاما صغیرا فام الناس فعابوا علیه فقال انی انما قدمت القرآن۔ امیر جماعت نے ایک چھوٹے لڑکے کو لوگوں کا امام بنا دیا' اس نے لوگوں کی امامت کرائی۔ عام لوگ اس بات کو عیب سمجھنے لگے تو امیر جماعت نے لوگوں کو سمجھا دیا کہ انتخاب امام میں عمر کا لحاظ نہیں بلکہ قرآن کا لحاظ رکھا گیا ہے اور میں نے اسی کو تمہارا امام مقرر کر دیا ہے جو تم میں سب سے زیادہ قرآن جانتا ہے۔

قیام اللیل میں حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے حدیث ہے' وہ فرماتی ہیں کہ : کنا ناخذ الصبیان من الکتاب ونقدمهم یصلون لنا شهر رمضان فنعمل لهم القلیه والخشکار۔ یعنی ہم عورتیں معلموں سے نابالغ لڑکے لا کر ان کو اپنا امام بنا لیتی تھیں

وہ ہم کو ماہ رمضان میں تراویح پڑھاتے رہتے تھے۔ ہم ان کو شکریہ کے طور پر گوشت روٹی تیار کر کے کھلا دیا کرتی تھیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ کئی بچے نماز تراویح عورتوں کو گھروں میں پڑھاتے تھے۔

امام ابن شہاب زہری رئیس التابعین فرماتے ہیں: لم یزل یبلغنا ان الغلمان یصلون بالناس اذا عقلوا الصلوۃ وقرأوا القرآن فی رمضان وغیرہ وان لم یحتلموا۔ یعنی ہمیں ہمیشہ سے مسلمانوں کا یہ طریقہ معلوم ہوتا رہا ہے کہ جو نابالغ لڑکے نماز پڑھنا اور قرآن پڑھنا جانتے تھے وہ رمضان اور رمضان کے سوا ہر مہینہ میں لوگوں کو نماز میں امام بن کر پڑھاتے رہے ہیں۔

امام حسن بصری اور امام شافعی وغیرہ ائمہ محدثین رحمتہ اللہ علیہم اجمعین نابالغ کی امامت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حضرت سعید بن مسیب تابعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نابالغ بچہ کے پیچھے نماز جائز ہے اور اس کا ذبیحہ بھی جائز ہے۔

میں کہتا ہوں حدیث شریف میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فلیؤمھم اقراھم وان کان اصغرھم۔ یعنی امامت کے لیے قاعدہ یہ ہے کہ جس کو زیادہ قرآن یاد ہو' وہ امامت کرائے اگرچہ سب سے چھوٹا ہو۔ (قیام اللیل ص-۱۰۱)

جب احادیث سے ثابت ہوا کہ نابالغ کی امامت جائز ہے تو جو اہل الرائے اس کے مقابلہ میں اپنے اماموں کے قول و فعل پیش کریں گے' وہ سب مردود ہوں گے۔ عہد نبوی اور عہد صحابہ کرام میں نابالغ کی امامت جاری رہ چکی ہے۔ اہل الرائے کے پاس قیاس رائے کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ احادیث کے مقابلہ میں قیاس کرنا اور قیاس سے کام لینا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ تراویح اور نفلوں میں نابالغ لڑکے کی امامت بالاتفاق درست ہے۔

قیام اللیل ص-۱۰۲ میں ہے کہ "تراویح وغیرہ نوافل میں نابالغ کی امامت درست ہے۔ لا اختلاف فی ذالک نعلمہ۔ ہم اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں جانتے۔

پس تھانوی تحفہ رمضان غلط اور قطعاً غلط ہے' اہل حق اس کو قبول نہیں کرتے' فقط۔

از عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث

جلد-۱۴' شمارہ-۳۴' مورخہ ۹ مارچ سنہ-۱۹۶۲ء

کیا وتروں کے بعد دو نفل پڑھنا ثابت ہیں؟

انہی میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ عشاء کے بعد وتر پڑھتے ہیں تو حنفیہ دو رکعت نماز نفل ہمیشہ بیٹھ کر پڑھتے ہیں بلکہ بعض نام نہاد اہل حدیث کا بھی اس پر عمل ہے۔ حالانکہ یہ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے' اس میں دو خرابیاں ہیں۔ ایک عشاء کے بعد عدم ثبوت اور دوم ان کو بیٹھ کر پڑھنا۔ حالانکہ بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے۔ (اخبار الاعتصام جلد۔۱۸' نمبر۔۹' مطبوعہ ۳۰/ ستمبر سنہ ۱۹۶۶ء) میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کا فتویٰ شائع ہوا ہے۔

"البتہ وتر کے بعد دو رکعت نوافل کے لیے حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ رات کو آدمی نہ اٹھ سکے تو تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔" یہ مولانا مرحوم سے ذہول ہوا کہ غیر تحقیق طور پر یہ بات لکھ دی ہے۔ عشاء کے وقت میں جو شخص ہمیشہ وتر پڑھے' اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے ہے جو شخص نماز تہجد پڑھنے کا عادی ہے اور پھر اس کو سفر درپیش ہوا اور حالت سفر میں جیسے دوگانہ پڑھنے سے مقیم کی پوری نماز کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے اور بیٹھ کر نماز پڑھنے والے مریض کو قائم کی نماز کا ثواب میسر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان دو نفلوں سے تہجد کی نماز کا ثواب مل جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: عن ثوبان قال کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر فقال ان السفر جھد وثقل فاذا اوتر احدکم فلیرکع رکعتین فان قام من اللیل والا کانتا لہ رواہ الدارقطنی والبیھقی والطبرانی کذا فی مجمع الزوائد۔ یعنی "حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم سفر میں تھے' جناب رسول کریم ﷺ کی رفاقت کا شرف ہم کو حاصل تھا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ سفر بہت مشقت اور بوجھ کا موجب ہے۔ جب کوئی تمہارا ساتھی نماز وتر پڑھنے کا ارادہ کرے تو دو رکعت نماز پڑھ لے۔ پس اگر رات کو حسب عادت قائم ہوا فبہا ورنہ یہ دو رکعت اس قیام اللیل کی قائم مقام ہو جائیں گی۔"

پس یہ حکم سفر میں ہوا جو مسافر عادی قیام اللیل کے ساتھ مخصوص ہے۔ دراصل حضرت مولانا موصوف کو مشکوٰۃ کی روایت سے غلطی لگی ہے جو بروایت دارمی باب الوتر کی فصل ثالث میں درج ہے۔ اس میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ نبی کریم ﷺ

نے فرمایا: ان هذا السهر جهد وثقل فاذا اوتر احدکم فلیرکع رکعتین فان قام من اللیل والا کانتا له (رواہ الدارمی) یعنی "رات کو بیدار ہونا مشقت اور بوجھ ہے۔ پس جب کوئی شخص وتر پڑھے تو اس کو چاہیے کہ وہ دو رکعت پڑھ لے۔ پس اگر رات کو قیام کیا تو فہو المراد' ورنہ یہ دو رکعت اس کے لیے کفایت کر جائیں گی۔"

دراصل لفظ سہر نہیں ہے لفظ سفر ہے۔ یہ امام دارمی کو غلطی لگی ہے۔ چنانچہ مرعاۃ المفاتیح جلد-۲' ص-۲۱۸ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ففی روایة الدارقطنی والبیهقی والطبرانی عن ثوبان: قال کنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فی سفر فقال ان السفر جهد وثقل الحدیث۔ یعنی "حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر میں تھے پس آپ نے اس وقت یہ فرمایا کہ سفر بڑی مشقت اور بھاری چیز ہے۔ اس حالت میں قیام اللیل مشکل ہے تو اس کے قائم مقام دو رکعت وتروں سے پہلے یا بعد پڑھ لے تو کافی ہیں۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ حکم سفر سے مخصوص ہے۔ چنانچہ مرعاۃ المفاتیح میں ہے: ویوید لفظ السفر ان الواقعة وقعت فی حالة السفر۔ یعنی "لفظ سفر سے اس امر کی تائید پائی گئی کہ یہ واقعہ حالت سفر کا ہے۔"

جب سفر سے یہ حکم مخصوص ہوا تو عشاء کے بعد وتر پڑھ کر دو نفلوں کو ہمیشہ بیٹھ کر پڑھنا ثابت نہ ہوا تو یہ عمل بمع عقیدہ کہ وتروں کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھنا مشروع ہے' بدعت کی حدود میں داخل ہوا۔ پھر روایت ثوبان رضی اللہ عنہ میں دو احتمال ہیں کہ یہ دو رکعت مسافر پڑھے تو وتر سے پہلے پڑھے یا بعد؟ حدیث دونوں احتمالوں کی حامل ہے۔ چنانچہ مرعاۃ میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: قال البیهقی یحتمل ان یکون المراد به رکعتان بعد الوتر ویحتمل ان یکون فاذا اراد ان یوتر فلیرکع رکعتین قبل الوتر۔ یعنی جب دلیل میں دو احتمال ظاہر ہوں تو اس سے ایک احتمال پر استدلال کرنا ساقط ہو جاتا کیونکہ فن مناظرہ کا یہ قانون اہل علم میں مسلم ہے۔ اذا جاء الاحتمال سقط الاستدلال - یعنی "جب دلیل میں دوسرا احتمال پیدا ہو جائے تو استدلال ساقط ہو جاتا ہے۔"

پس جس حدیث سے مولانا ثناء اللہ صاحب نے عشاء کے وقت وتروں کے بعد دو رکعت نفل کا ثبوت دیا ہے یہ مخدوش ہے۔ اس لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ملا علی قاری نے حدیث کے احتمالوں سے پہلے احتمال کو قائم کر رکھا ہے کہ قبل وتر دو رکعت پڑھنے کا احتمال صحیح ہے'

بعد الوتر کا نہیں۔ حافظ ابن حجر نے بھی اس احتمال کو پہلے ذکر کیا ہے اور دوسرے احتمال کو دارمی اور دار قطنی کا خیال بتایا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ پہلا احتمال قوی ہے اور دوسرا ضعیف بے دلیل ہے۔ وہ ساقط ہے' قوی قبول کیا جائے گا۔ اور قوی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے اپنی امت کو یہ حکم دیا ہے: اجعلوا اٰخر صلوٰتکم باللیل وترا۔ یعنی "تم اپنی رات کی نماز کے آخری حصہ کو وتر بناؤ۔" اگر وتر کے بعد دو رکعت پڑھی جائیں تو اس حکم کا خلاف ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلا احتمال کہ مسافر کو چاہیے کہ سفر میں وتروں سے پہلے دو رکعت نفل پڑھ لے تاکہ وہ تہجد کے قائم مقام ہو جائیں۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ نماز تہجد میں وتروں سے پہلے نماز نفل ہے جس کے بعد وتر پڑھے جاتے ہیں تو نائب اور منوب کا ایک ہی طریقہ ادا ہونا چاہیے۔ پس دوسرا احتمال ساقط ہے کہ وتر کے بعد مسافر دو رکعت نہ پڑھے کہ ان کا ثبوت نہیں پایا گیا اور نہ مقیم پڑھے کیونکہ مقیم کے لیے تو بالکل ہی ثبوت نہیں ہے کہ وہ وتروں کے بعد ہمیشہ دو نفل بیٹھ کر پڑھا کرے۔ جیسا کہ مقلدین حنفیہ کا معمول ہے کہ سینہ زوری سے عشاء کی نماز کی سترہ رکعت مسلمانوں کے لیے مقرر کر رکھی ہیں۔ ان سے کم جو شخص پڑھے' اس کو کہتے ہیں کہ یہ وہابی ہے جو نمازیں ناقص پڑھتے ہیں اور اس تعیین کے التزام کا انجام یہ ہے کہ کئی بوڑھے' بچے' عورتیں' بیمار وغیرہ بلکہ مسافر تھکے ماندے عشاء کی نماز نہیں پڑھتے کہ سترہ رکعتیں کیسے پڑھیں۔ اگر صرف سات رکعتیں مقرر ہوں تو آسانی سے پڑھ لیں۔

حدیث میں ہے: الدین یسر اور حکم ہوا دو مبلغوں کو یسرا ولا تعسرا کہ تم نے لوگوں پر آسانی کرنی ہو گی' مشکل اور بھاری کام ان پر نہ ڈالنا ہو گا۔ اسی یُسر کی وجہ سے تو نمازیں پچاس سے پانچ ہوئیں۔ اور یہ لوگ سات کو سترہ بنانے میں مصروف ہیں اور پھر افسوس یہ ہے کہ مقیم اور مسافر پر بوجھ یکساں رکھتے ہیں کہ فرض کے بغیر مسافر ساری نماز بدستور پڑھے۔ اس لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ اگر نماز میں تمام سنن نوافل پڑھنے پڑتے تو پھر فرض جو اصل نماز مقصودی ہے' کیوں کم کئے جاتے ہیں۔ اور دو رکعت کم ہونے سے مسافر تھکے ماندے کو کیا فائدہ ہے۔

بہرحال وتر کے بعد دو نفل غیر ثابت ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ تہجد کے وقت وتر کے بعد آنحضور ﷺ کے فعل سے دو نفل پڑھنے ثابت ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ

تہجد کے وقت کے ساتھ خاص ہیں اور عشاء کے وقت ثابت نہیں۔ دوم یہ آنحضور ﷺ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ امت کو یہ حکم ہے اجعلوا صلٰوتکم باللیل وترا۔ جب فعل نبوی اس حکم کے خلاف ہو جو امت کو صادر ہوا تو وہ آپ کی ذات سے مخصوص ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضور ﷺ ان کو عجیب کیفیت سے پڑھتے تھے کہ بیٹھ کر ان نفلوں کو شروع کرتے۔ جب قرات ختم ہو جاتی تو کھڑے ہو جاتے پھر رکوع کرتے اور سجدہ کرتے۔ اسی طرح دونوں رکعتوں کو پڑھتے۔ جیسے یہ ترکیب آنحضور ﷺ سے مخصوص ہے' یہ نفل ---- بھی آپ سے مخصوص ہے۔

امام شوکانی نے نیل الاوطار جز ثالث میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے یہی فیصلہ کیا ہے کہ: "والظاھر ما قدمنا اختصاص ذٰلک بہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم" یعنی "اصول طور پر بھی ظاہر بات ہے کہ وتر کے بعد دو رکعت تہجد کے وقت پڑھنا آنحضور ﷺ سے خاص ہے۔" ھذا ما عندی واللّٰہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد ۱۹' شمارہ ۲۰' مورخہ ۱۵ دسمبر سنہ ۱۹۶۷ء

کیا وتروں کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھنا بدعت ہے؟

اخبار "الاعتصام" کے ۱۵ دسمبر سنہ ۱۹۶۷ کے پرچہ میں ص ۹ پر "فتاوی" کے تحت (بہ عنوان وتروں کے بعد دو نفل پڑھنا ثابت ہیں) نظر سے گزرا۔ اس عنوان کے تحت مولانا محترم عبدالقادر صاحب حصاری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وتروں کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھنا ثابت نہیں ہیں۔ اور ان کو مشروع سمجھ کر پڑھنا بدعت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محترم نے اس مضمون کے تحریر کرنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وتروں کے بعد دوگانہ بیٹھ کر پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ غالباً مولانا نے صحاح ستہ کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھا ورنہ انہیں سنن ابن ماجہ میں ہی حدیث نظر آجاتی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جناب حضرت محمد ﷺ نے دو رکعت وتروں کے بعد بیٹھ کر پڑھی ہیں۔ وہ تہجد کے وقت کے ساتھ خاص ہیں' اور اس کے علاوہ وہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ خصوصیت کا جواب تو آگے آئے گا۔ لیکن دلیل میں ہم چند احادیث نقل کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا' کہ وتروں کے بعد (مطلق نہ کہ تہجد کے وقت) دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھنا آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے۔

(۱) سنن ابن ماجہ میں ہے: ثنا حماد بن مسعدة ثنا ميمون بن موسى المرئي من الحسن عن ابى عن ام سلمة رضى الله تعالى عنها ان النبى صلى الله عليه وسلم كان يصلي بعد الوتر ركعتين خفيفتين وهو جالس۔ اس حدیث کی سند کے سب راوی ثقہ ہیں میمون بن موسیٰ المرئی بھی صدوق ہیں' ہاں وہ مدلس ہیں' اس لئے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہاں تدلیس سے کام لیا ہو' لیکن اولاً تو مولانا حصاری صاحب اپنے مضامین میں بہت سی احادیث ایسی تحریر فرماتے ہیں' جن کی اسانید میں مدلسین موجود ہوتے ہیں۔ اور سماع کی تصریح بھی نہیں کرتے' لیکن مولانا محترم صاحب اس حدیث کی یہ علت پیش کر کے اس کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ اس لئے کم از کم انہیں تو اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ ثانیاً آگے اور بھی حدیثیں آ رہی ہیں۔ جن سے اس روایت کی تائید ہوجائے گی۔ اور اس حدیث کی سند میں جو حسن اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں' ان کا نام خیرۃ ہے' اور وہ بھی مقبولہ ہے۔ اور ابن حبان ان کو اپنی ثقات میں لایا ہے۔ کذافی التقریب والتهذيب۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔
اس حدیث کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ دوگانہ سے مراد وہ دو رکعتیں ہیں، جو تہجد کے وقت وتروں کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں مطلق بعد الوتر کا بیان ہے۔ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ عشاء کے بعد رات کے اول حصہ میں، رات کے درمیانی حصہ میں اور آخر رات میں وتر پڑھا کرتے تھے۔ یعنی آپ ﷺ سے تینوں وقتوں میں رات اول، اوسط اور آخر میں وتر پڑھنا ثابت ہے۔ اور کان یصلی کا یہی مقتضی ہے کہ ہمیشہ ورنہ کم از کم اکثر تو ضرور ایسا کرتے تھے۔

مقصد یہ کہ حدیث سے معلوم ہوا، کہ جب بھی وتر پڑھتے تھے۔ (خواہ اول رات میں، یا اس کے آخر حصہ میں) تو دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ علاوہ ازیں خود مولانا صاحب نے دو رکعت کے متعلق لکھا ہے کہ بیٹھ کر ان نفلوں کو شروع کرتے، جب قرات ختم ہو جاتی تو کھڑے ہو جاتے اور رکوع کرتے اور سجدہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ دو رکعتیں طویل ہوتی تھیں اور اس کی وضاحت مسلم وغیرہ کی روایت میں ہے، لیکن اس حدیث میں ہے کہ وہ دو رکعتیں ہلکیاں (خفیفتین) ہوتی تھیں۔ (اس کی وضاحت اگلی حدیثوں میں آ رہی ہے) اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ دو رکعتیں نہیں تھیں جو تہجد کے وقت اس مخصوص طریقہ سے پڑھتے تھے۔ اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر تو یہ حدیث مسلم شریف والی حدیث کے متعارض ہو جائے گی، کیونکہ مسلم شریف والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دو رکعتیں ہی ہوتی تھیں۔ اس لئے مقصود یہ ہے، کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد ہمیشہ دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ اب کبھی تو دو رکعتیں ہلکی ہوتی تھیں اور کبھی لمبی۔ اس مخصوص طریقہ پر جو مسلم شریف کی حدیث میں وارد ہے اس میں تعارض کی کونسی بات ہے، اور دونوں جگہوں پر کان کا لفظ وارد ہے، اس سے بھی کوئی خرابی نہیں آتی، کیونکہ دونوں طریقے آپ سے دوام کے ساتھ ثابت ہیں۔ اور دو فعلوں کا اکٹھا ہونا اچنبھے کی بات بھی نہیں ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ بعض مرتبہ اتنے روزے رکھا کرتے تھے کہ خیال ہوتا تھا، کہ اب افطار ہی نہیں کریں گے۔ اور بعض مرتبہ اتنے دن افطار کرتے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ اب روزہ نہیں رکھیں گے، اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ روزے بھی بہت دن تک رکھا کرتے تھے اور پھر افطار بھی کافی عرصہ تک ہوا کرتا تھا۔ یعنی دونوں فعل مبارک

اثری ہوگئے' اس میں کوئی تعارض و تخالف نہیں ہے۔
اور مولانا صاحب نے یہ بھی عجیب بات تحریر فرمائی ہے کہ "جیسے یہ ترکیب آنحضور ﷺ سے مخصوص ہے" کیونکہ مسلم وغیرہ میں یہ وضاحت ہے کہ اس طرح آپ اس زمانے میں کرتے تھے جب آپ بڑی عمر کے ہو گئے۔ (فلما اسن وغیرھا) کے الفاظ آتے ہیں۔ لہٰذا یہ ترکیب آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ من یدعی فعلیه البیان بالبرهان جو بڑی عمر والا ہو جائے یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے چاہتا ہے' کہ میں رات کے نوافل میں قرات بھی لمبی کروں اور نوافل کو بھی ترک نہ کروں' وہ اسی ترکیب پر عمل کرسکتا ہے' یعنی شروع تو قرات بیٹھ کر کرے' لیکن جب قرات ختم ہونے کو آئے تو اٹھ کر دوسرا صاحب ثروت تو دینی خدمات کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دے۔ لا حسد الا فی الاثنین رجل اتاه الله القرآن فهو یقوم به اناء الیل واناء النهار ورجل اتاه الله مالا فهو ینفقه اناء الیل واناء النهار (ترغیب ترهیب ج-۲) تہجد گزاروں کی اس سے بڑھ کر اور کیا عظمت اور کامیابی ہو سکتی ہے' کہ لوگ قیامت کے دن حساب وکتاب میں مشغول ہوں گے۔ لیکن یہ حضرات حساب کے بغیر ہی جنت کی طرف رواں دواں ہوں گے۔ لیکن اس سے بلند مرتبہ پر فائز صرف چند لوگ ہوں گے۔ ان الذین کانوا تتجافی جنوبهم عن المضاجع' فیقومون وهم قلیل فیدخلون الجنة بغیر حساب۔ ثم یقوم الناس الی الحساب۔ (ترغیب وترهیب) اس کے علاوہ نماز تہجد کے فضائل ہیں چند مشتے نمونہ از خروارے کے طور ذکر کر دیئے' اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔

امام احمد کی مسند میں یہ حدیث ہے : حدثنا عبدالله حدثنی ابی ثنا عبدالصمد حدثنی ابی ثنا عبدالعزیز یعنی ابن صهیب عن ابی غالب عن ابی امامة ان النبی صلی الله علیه وسلم کان یصلیهما بعد الوتر وهو جالس یقرا فیهما اذا زلزلت الارض وقل یایها الکفرون۔ اس حدیث کی سند بالکل بے غبار ہے۔ اس میں پہلے حضرت عبداللہ ہے' وہ حضرت امام احمد کا فرزند ہے۔ وہ ثقہ ہے' پھر ان کا والد حضرت امام احمد ہے' پھر عبدالصمد جو ہے وہ عبدالصمد ابن الوارث ہے۔ جیسا کہ رجال کی کتب سے پتہ چل جاتا ہے اور جیسا کہ بیہقی کی روایت سے جو انہوں نے سنن میں نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے' وہ روایت یہ ہے : قال البیهقی فی سننه الکبری اخبرنا ابو عبدالله الحافظ وابوبکر احمد بن

الحسن القاضی وابو صادق محمد بن احمد الصیدلانی قالو اثنا ابوالعباس محمد بن یعقوب ثنا ابو قلابه ثنا عبدالصمد ابن الوارث ثنا ابی عن عبدالعزیز بن صهیب عن ابی غالب عن ابی امامة ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم کان یصلی رکعتین بعد الوتر وهو جالس یقرا فیهما اذا زلزلت وقل یایها الکفرون۔ مقصد یہ کہ امام احمد والی سند میں جو عبدالصمد ہے' وہ ابن عبدالوارث ہے۔ اور وہ ثقہ ہے اسی طرح اس کا باپ عبدالوارث ابن سعید' وہ بھی ثقہ ہے' اس کے بعد پھر عبدالعزیز بن صہیب ہیں وہ بھی ثقہ ہیں' پھر ابو غالب ہیں' یہ حضرت ابو امامہ کے صاحب ہیں' ان کے نام میں اختلاف ہے' لیکن وہ کنیت سے مشہور ہیں' ان کے متعلق صاحب التقریب حافظ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں : صدوق یخطی یعنی وہ سچے ہیں اور خطا بھی کر جاتے ہیں۔ یخطی کا لفظ راوی کی عدالت میں قادح نہیں ہے اور نہ اس کو احتجاج کے رتبہ سے گرا دیتا ہے' کیونکہ خطا اور وہم سے کوئی راوی معصوم نہیں ہے۔ الا ماشا اللہ یہی وجہ ہے کہ رجال کی کتب میں بہت سے ایسے رواۃ ملتے ہیں' جن کے متعلق ان کتب میں یہی لکھا ہوتا ہے۔ صدوق یخطی یا صدوق یهم یا صدوق له اوهام حلانکہ وہ صحیحین کے رواۃ میں سے ہوتے ہیں۔ مثلاً حسن بن ذکوان بخاری کے رجال میں سے ہے لیکن تقریب میں لکھا ہے۔ صدوق یخطی۔ اسی طرح حری بن عمارہ بن ابی حفصہ جو بخاری اور مسلم کے راویوں میں سے ہے کے متعلق حافظ صاحب تقریب میں تحریر فرماتے ہیں۔ صدوق یهم اسی طرح سعید بن یحیٰی بن سعید الاموی (یہ راوی بھی شیخین کے رواۃ میں سے ہے) کے متعلق حافظ صاحب تقریب میں فرماتے ہیں۔ کہ ثقہ ربما اخطا۔

بہرکیف ایسے اور بھی راوی ہیں' جو اگر شیخین کے رواۃ میں سے ہیں' لیکن ان کے متعلق رجال کی کتب میں یہی لکھا ہوتا ہے۔ کما یخطی یهم اوهام اور ربما اخطا۔ کیونکہ جہاں ان سے کچھ وہم ہوا ہے' یا خطا ہو گئی ہے' وہاں ائمہ حدیث اور حفاظ فن نے تنبیہہ کر دی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا' کہ جہاں بھی وہ راوی دیکھیں تو کہیں کہ یہاں بھی اس راوی نے خطا کی ہو گی۔ مقصد یہ ہے کہ چونکہ اس حدیث کے متعلق ائمہ حدیث میں سے کسی نے چونکہ یہ نہیں فرمایا کہ اس نے یہاں بھی خطا کی ہے' اس لئے اس کی روایت مقبول ہو گی' پھر آخر میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ ہیں' جو صحابی ہیں۔ خلاصہ کلام کہ اس حدیث

کی سند کے سب راوی ثقات ہیں' اور اس میں کوئی راوی مدلس بھی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ علت بھی نہیں ہے بلکہ دوسری حدیث سے جو آگے آرہی ہے' تقویت پکڑ کر صحیح لغیرہ بن جائے گی۔ کما لا یخفی علی ماھر الاصول اور امام احمد کا مسند احادیث کی ان کتب میں سے ہے' جن کی احادیث سے اصالتاً احتجاج کیا جا سکتا ہے' کیونکہ وہ طبقہ ثانیہ میں سے ہیں۔ کما یشیر الیہ کلام المحدث الدھلوی فی حجۃ اللّٰہ البالغۃ۔

خلاصہ مرام کہ سنداً یہ حدیث بالکل بے غبار ہے' اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ اور ان دو رکعتوں میں سورت اذا زلزلت اور قل یآیھا الکفرون پڑھا کرتے تھے اور یہ حدیث ابن ماجہ والی حدیث کی موید بھی ہے' کیونکہ اس میں بھی رکعتین خفیفتین پڑھنے کا ذکر ہے' اور اس حدیث میں بھی کان یصلی کے الفاظ ہیں جو دوام یا اکثریت پر دلیل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ روایت حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے ہے' جن سے ظن غالب یہی ہوتا ہے' کہ یہ دو رکعتیں عشاء کے بعد وتر کے بعد آپ ﷺ پڑھا کرتے تھے' کیونکہ تہجد تو آپ اپنے گھر میں ہی پڑھا کرتے تھے۔(فتامل) علاوہ ازیں حدیث کے الفاظ میں وکان یصلی رکعتین بعد الوتر اور یہ الفاظ عام ہیں۔ لہٰذا ان کو بلادلیل صرف تہجد کے وقت کے ساتھ مخصوص کرنا صحیح نہیں' کیونکہ جب صحاح احادیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رات کے تینوں وقتوں اول' اوسط' آخر میں وتر پڑھنا ثابت ہے' اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے' کہ آپ ہمیشہ وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے' تو ان دو رکعتوں کے پڑھنے کا آپ ﷺ سے ثبوت مل گیا اور وہ بھی دو' لہٰذا یہ کہنا کہ ان دو رکعتوں کا وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھنا بے ثبوت ہے۔ قطعاً صحیح نہیں۔

(۳) امام بیہقی سنن کبریٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث لاتے ہیں : حدثنا ابوالحسن محمد بن الحسن بن داود العلوی املاء ثنا ابو نصر محمد بن حمدویہ ابن سھل المروزی ثنا عبداللّٰہ بن حماد الا ملی ثنا یزید بن عبدربہ ثنا بقیہ ابن الولید عن عتبۃ بن ابی حکیم عن قتادۃ عن انس بن ملک ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یصلی بعد الوتر الرکعتین وھو جالس یقرا فی الرکعۃ الاولی بام القرآن واذا زلزلت وفی الثانیۃ قل یایھا الکفرون۔ اس حدیث کی سند میں اور سب راوی ثقہ ہیں لیکن بقیہ سخت مدلس ہیں اور سماع کی تصریح نہیں کی۔ اور عتبہ بن ابی حکیم گو صدوق ہے'

لیکن کثیر الخطا ہے اور قتادہ بھی گو ثقہ ہے، لیکن وہ بھی مدلس ہے۔ لیکن ان وجوہ سے سند میں خفیف سا ضعف پیدا ہوتا ہے اس لئے اعتبار واستشہاد میں کوئی قباحت نہیں۔ یعنی جب کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے صحیح یا حسن لذاتہ سند سے حدیث ثابت ہو گئی تو یہ حدیث گو ذرا ضعیف ہے، اس کی موید بن جائے گی اور اس کو شواہد کی حیثیت سے ذکر کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

جب ایک فعل جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ سے ثابت ہو گیا تو اس کے اتباع کو بدعت کہنا اور اس کے متبع کو نام نہاد اہلحدیث کہنا زبردستی اور سینہ زوری ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ سلف میں سے وتر کے بعد دو رکعت نہیں پڑھا کرتے تھے، بلکہ امام محمد بن نصر نے قیام اللیل میں لکھا ہے کہ وکان سعد بن ابی وقاص رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ یوتر ثم یصلی علی اثرالوتر مکانہ "یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وتر کے بعد اس جگہ نماز پڑھتے تھے۔" اسی طرح لکھا ہے کہ وکان الحسن یامر بسجدتین بعد الوتر۔ "یعنی حضرت حسن بصری وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کا امر فرمایا کرتے تھے۔" اور لکھتے ہیں: وقال کثیر بن مرۃ وخالد بن معدان لا تدعھما وانت تستطیع یعنی الرکعتین بعد الوتر "سعید بن مرہ اور خلد بن معدان (دونوں تابعی ہیں) نے فرمایا، کہ جب تک قدرت ہو وتر کے بعد دو رکعتوں کو نہ چھوڑا کرو۔" پھر فرماتے ہیں: وقال عبداللّٰہ بن مساحق کل وتر لیس بعدہ رکعتان فھو ابتر "عبداللہ بن مساحق فرماتے ہیں کہ جس وتر کے بعد دو رکعتیں نہیں پڑھی جاتیں، وہ دم کٹا ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو رکعتیں کچھ الگ نہیں ہیں، بلکہ وتر کے ساتھ ہی ہیں۔ اس لئے یہ دو رکعتیں وتر کو قیام اللیل کے آخر میں رکھنے کے منافی بھی نہیں ہیں۔ آگے پھر امام محمد بن نصر فرماتے ہیں: وقال عیاض بن عبد اللّٰہ رایت ابا سلمۃ ابن عبدالرحمن اوتر ثم صلی رکعتین فی المسجد "عیاض بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوسلمہ بن عبدالرحمن کو دیکھا، کہ وتر کے بعد مسجد میں ہی دو رکعت ادا کیں (یہ ابوسلمہ وہی بزرگ ہیں، جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام اللیل کی گیارہ رکعت کے راوی ہیں۔ بہرکیف خیرالقرون میں اور خود صحابہ سے بھی وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ لہٰذا اس کو بدعت کے حدود میں شامل کرنا خصوصاً جب کہ ان کا فعل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو۔ حضرت مولانا حصاری

صاحب کی ہی جرات ہے باقی مولانا کا یہ فرمانا کہ یہ فعل مبارک آنحضرت ﷺ سے خاص ہے۔ کیونکہ اگر آپ امت کو ایک امر فرمائیں اور خود اس کے مخالف عمل کریں تو یہ آپ کی ذات مبارک سے مخصوص ہو گا تو یہ کلیہ صحیح نہیں ہے' بلکہ اس میں تفصیل ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں کھڑا ہو کر پینے سے منع آیا ہے۔ اور ایسی کوئی حدیث نظر سے نہیں گزری جس میں یہ ہو کہ آپ نے کھڑا ہو کر امت کو اجازت دی ہے' حالانکہ صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کھڑے ہو کر بھی پیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے محققین نے یہی کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا بھی جائز ہے' گو بیٹھ کر پینا بہتر ہے۔ ایسے اور بھی امثلہ دستیاب ہو سکتے ہیں' اس لئے یہ کہنا کہ جہاں بھی آپ ﷺ کا فعل اس امر کے خلاف ہو جو آپ نے امت کو دیا ہے' تو وہ آپ کی ذات مبارک سے مخصوص ہو گا' صحیح نہیں ہے۔ پھر مولانا نے امام شوکانی کا تو قول نقل کر دیا' لیکن اس سلسلہ میں اور ائمہ حدیث کے اقوال نقل نہیں کئے اور یہ انصاف سے بعید ہے۔

دیکھئے امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں : قلت الصواب ان ھاتین الرکعتین فعلھما صلی اللہ علیہ وسلم بعدالوتر جالسا لبیان جواز الصلوۃ بعدالوتر وبیان جوازا التنفل جالسا ولم یواظب علی ذلک۔ یعنی صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے وتر کے بعد بیٹھ کر نماز پڑھی ہے' تاکہ معلوم ہو جائے کہ وتر کے بعد بھی نفل پڑھنا جائز ہے اور بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے اور آپ نے اس پر ہیشگی نہیں کی اور بہرحال اگر امام شوکانی نے تخصیص کا قول کیا ہے تو امام نووی نے اس سے جواز التنفل بعد الوتر کا اثبات کیا ہے' اب انصاف سے کہیں کہ کس کی بات درست ہے؟ اور یہ جو امام نووی نے کہا کہ آپ نے اس پر یعنی دوگانہ وتر کے بعد پر ہیشگی نہیں کی' وہ غالباً اس لیے کہ ان کے سامنے حضرت امام احمد کی مسند اور امام بیہقی کی سنن کبری والی احادیث ذہن میں نہیں تھیں' ان کے سامنے صرف وہی حدیث' یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا والی حدیث جس کی شرح میں یہ عبارت لکھی تھی' اس لیے یہ فرمایا کہ اس پر ہیشگی نہیں کی اور یہ امام نووی نے اس لیے فرمایا کہ ان کو یہ فعل بظاہر اس حدیث کے متعارض نظر آیا' جس میں آپ نے حکم دیا تھا کہ وتر کو صلوۃ اللیل میں رکھا کرو' حالانکہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ یہ چیز وارد نہیں ہوتی' کیونکہ یہ دو رکعت کوئی مستقل اور الگ نماز نہیں کہ جس کی وجہ سے یہ اس حکم کے متعارض ہو

جائے۔ ورنہ اگر اس کو وتر کے ساتھ کی نماز قرار دیا جائے۔ جس طرح کہ عبداللہ بن مساحق نے کہا ہے۔ ان کا قول گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ یعنی یہ دو رکعتیں وتروں کے لئے ایک قسم کی تتمیم کا کام دیتی ہیں' تو پھر یہ اعتراض وارد نہیں ہو گا۔ اور جو احادیث ہم نے اوپر لکھی ہیں' ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دو رکعتوں پر مواظبت معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ دوگانہ وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھنا مشروع' مسنون ہوا' نہ کہ بدعت و نام نہاد اہل حدیثوں کا فعل باقی رہا۔ مولانا کا یہ فرمانا کہ بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے۔ سو اس کے متعلق میری گزارش یہ ہے کہ اہل حدیث کرائے کے اجیر نہیں ہیں' کہ جہاں مزدوری زیادہ ملے ادھر چلے گئے' جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اہل حدیث کا مطمع نظر' منتھی البصر اور ان کی سب آرزوؤں کی تکمیل اسی میں ہے' کہ ان کو سرور کونین سید البشر جناب حضرت محمد ﷺ (بابی فداہ دامی وروحی) کے اسوہ حسنہ کا اتباع حاصل ہو جائے' اگر ان کے نامہ اعمال میں یہ ثبت ہو جائے' کہ انہوں نے حبیب خدا' احمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کی تو بس ان کے لئے یہی کافی ہے۔ باقی رہا آدھا ثواب تو یہ بھی آدھا ہے' لیکن اگر ان کو کچھ بھی نہ ملے تب بھی ان کے لیے یہی بس کرتا ہے۔ کہ انہوں نے اس ذات اقدس کی سنت کا اتباع کیا۔ جس کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے : قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ اہل حدیث کو تو سنت الرسول ﷺ کا عشق ہے۔

آخر میں' میں حضرت مولانا محترم حصاری صاحب کی خدمت میں باآدب یہ گزارش کرتا ہوں کہ ہر ایک کے لئے تحقیق کا میدان وسیع کھلا ہوا ہے۔ اس لیے جو تحقیق بھی آں محترم کو صحیح نظر آئے۔ بلا خوف لومتہ لائم پیش فرما دیا کریں لیکن اس کو ہی حرف آخر سمجھ کر جو اس کے مخالف ہو اس کو بدعتی بنا دیں' یہ چیز اچھی نہیں ہے۔ کسی کو بدعت کی طرف منسوب کرنے سے پہلے آپ غور فرما لیا کریں' تو یہ نہایت بہتر ہو گا' کیونکہ اگر کسی کو اہلحدیث سمجھنے میں غلطی کی تو اس کا نقصان اتنا نہیں ہو گا' جتنا کسی کو بدعتی سمجھنے میں غلطی کرنے سے ہو گا۔ اس لیے کہ جس کو ہم غلطی سے اہل حدیث سمجھ رہے ہیں' اگر وہ واقعتاً اہل حدیث نہیں ہے' تو اس میں ہمارا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ لیکن اگر کسی کو ہم غلطی سے بدعتی سمجھ لیں اور پھر اسی پر عجلت سے بدعتی ہونے کے فتویٰ کا ایٹم بم گرا دیں تو خود ہی سوچ لیں' اس سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ احتیاط ہر معاملہ میں بہتر ہے۔

کافی عرصہ پہلے وتر کے بعد دوگانہ نفل بیٹھ کر پڑھنے کے متعلق۔ مولانا عبدالقادر صاحب حصاری کا فتویٰ شائع ہوا تھا' جس میں مولانا موصوف نے وتر کے بعد دوگانہ بیٹھ کر ادا کرنے کو بدعت قرار دیا تھا۔ بعد میں بندہ حقیر پر تقصیر راقم الحروف نے اس پر تعاقب کیا جو کہ بفضلہ تعالیٰ انصاف پسند حلقوں میں نہایت ہی پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ بعد میں تنظیم اہلحدیث میں مولانا حصاری صاحب نے اس تعاقب پر (سندھی تعاقب پر ایک نظر کے عنوان) سے تنقید فرمائی ہمہ دانی کا دعویٰ تو نہ بندہ نے پہلے کیا ہے اور نہ اب ہے۔ اور کسی کی غلطی پر اس کو متنبہ کرنا یا اس کی لغزش کو ظاہر کرنا بھی معیوب نہیں بلکہ عین مرغوب و مطلوب عمل ہے۔) لیکن جب تعاقب محض برائے تعاقب ہو تو اس سے بجائے مفید نتیجہ نکلنے کے کدورتیں بڑھتی ہیں' اور وقت کا ضیاع اس کے علاوہ ہوتا ہے۔ اس تعاقب پر تعاقب میں بھی حضرت مولانا حصاری صاحب نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ اول تو بہت سے غیر متعلق باتیں درمیان میں لے آئے ہیں جن سے قطعاً بحث نہیں تھی اور نہ ہی وہ اہل حدیثوں میں مختلف فیہا تھیں۔ ان کو تحریر میں لانے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ پھر مولانا موصوف نے اصل مسئلہ پر جو تنقید کی ہے' اس کے متعلق ہر غیر متعصب اور ہر حال میں عدل سے متمسک متوازن اہل علم یہی رائے قائم کرے گا کہ یہ میرے تعاقب پر تعاقب ہے ہی نہیں۔ اور واللہ میں اس کے اوپر قلم ہرگز ہرگز نہ اٹھاتا' لیکن چند احباب کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے مجھے مجبوراً کچھ لکھنا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ جو حدیث کا علم زیادہ نہیں رکھتے وہ شاید مولانا کے مضمون ہذا سے اور میری دانستہ خاموشی سے یہی اندازہ فرمائیں گے کہ غالباً میں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے اور مولانا صاحب کی تنقید واقعتہ صحیح اور وقیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس پر خامہ فرسائی کرنے کے لئے مجبور ہوا ہوں۔

باقی رہا ثواب تو میں نے یہ بات اپنے مضمون میں بھی نہیں لکھی تھی کہ یقیناً وتر کے بعد دوگانہ بیٹھ کر پڑھنے والے کو پورا ثواب ملے گا۔ بلکہ اس کے برعکس آخر میں میں نے یہ لکھا تھا کہ یہ تو بیٹھ کر دوگانہ ادا کرنے سے آدھا ثواب ملتا ہے۔ لیکن اگر کچھ بھی نہ ملتا' تب بھی ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ ہم نے جناب حضرت محمد ﷺ کی سنت ادا کی اب ثواب کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ جو وہ چاہے دے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ یہ کام آنحضرت ﷺ کی سنت ہے اور ہر اہلحدیث سنت پر عمل کرنا اپنا ایمان سمجھتا ہے۔

پھر جناب نے جو ننگے پاؤں نماز پڑھنے کے متعلق لکھا ہے تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ میں ننگے پاؤں نماز پڑھتا ضرور ہوں' لیکن جوتی پہن کر پڑھنے کو ناجائز نہیں کہتا' بلکہ اس کو بھی مسنون جانتا ہوں۔ یعنی حضرت رسول اللہ ﷺ کی سنت سمجھتا ہوں۔ اور ایسے مواقع بھی گزرے ہیں کہ میں نے جوتی کے ساتھ نماز پڑھی۔ اللہ تعالیٰ اس کو بہتر جانتا ہے اور وہ اس پر گواہ ہے۔ باقی رہا اس پر ہیشگی نہ کرنا' تو اس کے لئے اور دلائل ہیں۔ جن کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں اور نہ ہی یہ زیر بحث ہے۔ اسی طرح مولانا کا یہ الزام بھی درست نہیں' کہ ہم ہمیشہ ننگے سر نماز پڑھتے ہیں۔ مولانا کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

باقی مولانا کا یہ فرمانا کہ میں نے (راقم الحروف) ان پر الزام لگایا ہے کہ وہ مدلسین کی روایات کو استدلال میں پیش کرتے ہیں' جو صحیح نہیں۔ اگر میں کوئی مثال پیش کرتا تو جواب دیا ہوتا۔ سو اس کے بارہ میں یہ گزارش ہے کہ لیجئے' دو مثالیں تو حاضر خدمت کر رہا ہوں' ان کو دیکھ کر مولانا بھی انصاف کریں اور دوسرے اہل علم بھی فیصلہ کریں کہ واقعی مولانا نے مدلسین کی روایات سے استدلال کیا ہے یا نہیں۔ ان مثالوں کے پیش کرنے سے پہلے یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان مثالوں سے میرا مقصد محض ان حدیثوں پر سندی کلام ہے نہ نفس مسئلہ کیونکہ وہ مسئلہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔ لیکن یہ مخصوص دلائل جو ہیں' وہ مخدوش ہیں۔ کیونکہ ان میں مدلسین ہیں اور روایات عن سے کرتے ہیں۔ اور ہمارا مدعا ثابت ہو جائے گا کہ مولانا بھی مدلسین کی روایات ذکر کرتے ہیں اور میں نے بھی ان مدلسین کی روایتوں کو اصالتہ ذکر نہیں کیا تھا۔ محض صحیح حدیثوں کی تائید میں جن میں ایک حدیث حسن یا صحیح تو ابوامامہ والی ہے۔ جس کو مولانا نے بے جا تعصب اور زبردستی سے ضعیف قرار دینے کی کوشش کی ہے اور صحیح حدیثیں آگے مزید تحقیق کے ضمن میں آ رہی ہیں۔ لہذا خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اگر مولانا اپنے ذکر کردہ امثلہ کے متعلق یہ فرمائیں گے کہ یہ روایتیں انہوں نے محض صحیح احادیث کی تائید کے لئے ذکر کی ہیں تو مجھ سے بھی یہی قصور ہوا ہے۔ لہذا مجھ پر ان روایتوں (جن میں کوئی مدلس راوی ہے) کی وجہ سے اعتراض بالکلیہ فضول ہے۔ اس سے وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مبادا ان حدیثوں پر میرے کلام کو بہانا بنا کر مولانا مجھے نفس مسئلہ کا مخالف قرار دے کر مجھ پر اعتراضات کی بوچھاڑ نہ کر دیں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ مدلسین کی روایات دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ لیجئے مثال نمبر۱۔

عن بریرہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بکروا بالصلوۃ فی یوم الغیم فانہ من ترک الصلوۃ فقد کفر۔ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ) (تنظیم اہلحدیث مجریہ ۲۶ شعبان سنہ ۱۳۸۸ھ ص ۸' کالم ۳) پر زیر عنوان اعمال صالحہ ایمان میں داخل ہیں' ابن حبان کی اس حدیث کی سند میں یحییٰ بن ابن کثیر ہے' جو مدلس ہے۔ دیکھیے! طبقات المدلسین للحافظ ابن حجر و فتح الباری۔ اور وہ ابوقلابہ سے "عن" کی روایت کرتے ہیں۔ کیا یہاں مدلس کی روایت سے استدلال نہیں کیا گیا؟

مثال نمبر ۲ لا تزوج المراۃ ولا تزوج امراۃ نفسھا۔ رواہ ابن ماجہ والدارقطنی ورجالہ ثقات بلوغ المرام۔ (تنظیم اہلحدیث مجریہ ۲۶ ذوالقعدہ سنہ ۱۳۸۸ھ ص ۵' کالم ۳) تحت عنوان "الاعتصام" کے ایک فتویٰ پر تبصرہ۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے لیکن اس کی سند میں ہشام ابن حسن ہیں' جو مدلس ہیں اور اس کی تدلیس مرتبہ ثالثہ میں ہے۔ اور ایسے مدلسین کی روایات جب تک سماع کی تصریح نہ کریں محدثین قبول نہیں کرتے۔ (انظر الطبقات للحافظ ابن حجر) اور وہ (ہشام) محمد بن سیرین سے "عن" کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ اس طرح اس محدث کو دار قطنی بھی اپنے سنن میں لائے ہیں اور اس کی چند اسناد ذکر فرمائی ہیں۔ لیکن سب میں یہی ہشام بن حسان ہیں اور محمد بن سیرین سے عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں ۔ مولانا نے یہ تو لکھ دیا کہ "ورجالہ ثقات" لیکن یہ دیکھنا گوارہ نہیں کیا کہ رجال کے ثقہ ہونے کے باوجود بھی کوئی علت ہو سکتی ہے' جو حدیث کو ضعیف کر دیتی ہے' بہرحال اس حدیث کی سند میں مدلس ہے اور سماع کی تصریح نہیں کی' لیکن تاہم مولانا اس کو دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ پھر بھی فرماتے ہیں کہ یہ میں نے ان پر الزام لگایا ہے۔ مولانا! اللہ تبارک تعالیٰ نے اس بندہ حقیر کو ایسی بدخصلت سے اپنے فضل وکرم سے محفوظ رکھا ہے۔

یہ یاد رہے کہ میں نے جو یہ مثالیں پیش کی ہیں' ان سے مراد وہ حدیثیں ہیں جو ان کتابوں میں مذکور ہیں' جن کا نام مولانا نے تحریر فرمایا ہے۔ مثلاً مثال اول میں ابن حبان کی صحیح اور دوسرے میں ابن ماجہ اور دار قطنی اس لئے یہ قطعاً مناسب نہ ہوگا اگر وہ کسی دوسری کتاب سے ایسی ہی حدیث نکال کر بیجا طول کلام پر آمادہ ہو جائیں۔ مولانا میں نے تو اپنی بات کا ثبوت دیا ہے' اب وہ محض الزام نہیں رہی۔

میرے دلائل میں سے دوسری دلیل پر مولانا بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس کے علاوہ وہ مجہول العدالت ہے۔" اس کی ثقاہت کتب اسماء الرجال میں پائی نہیں گئی۔ تنظیم اہلحدیث مجریہ ۷ صفر' کالم نمبر۔۳ میں' میں حیران ہوں کہ مولانا جیسا متبحر عالم ایسی بات کیسے تحریر کر گیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں تو مولانا کو یقیناً ایسا تصور نہیں کرتا کہ وہ علم اسماء الرجال سے ایسے ناواقف ہوں گے۔ پس اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو مولانا کو جانتے ہوئے بھی ایسی عبارت لکھ دینا قطعاً مناسب نہیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ وہ اس علم سے پوری طرح واقف نہیں ہیں' تو اس صورت میں انہیں اس پر قلم اٹھانے کا بھی یقیناً حق نہیں تھا۔ اولاً تو گزارش یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ابو غالب کے متعلق لکھا ہے کہ "صدوق یخطئی" اور حافظ صاحب نے تقریب کے ابتدا میں رواۃ کے مراتب ذکر کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ الخامسة من قصر عن درجة الرابعه قليلا واليه الاشارة بصدوق سئی الحفظ اوصدوق يهم اوله اوهام او يخطی۔ اس عبارت سے ہر اہل علم جان سکتا ہے کہ یہ راوی (ابوغالب) ثقہ ہے۔ نہ کہ مجہول العدالت اسی لئے حافظ صاحب نے اس کو صدوق لکھا ہے۔ اگر مجہول العدالت ہوتا تو اس کو حافظ صاحب صدوق قطعاً نہ لکھتے' بلکہ مستور اور مجہول الحال وغیرہما کے الفاظ سے یاد فرماتے۔ جیسا کہ ابتدا میں تحریر فرماتے ہیں۔

السبعة من روى عنه اكثر من واحد ولم يوثق واليه الاشارة بلفظ مستور او مجهول الحال۔ لیکن حافظ صاحب نے ان کو صدوق لکھا ہے۔ لہٰذا وہ ثقہ ہیں۔ ثانیاً ذیل میں تہذیب التہذیب سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ اس کو ملاحظہ فرما کر پھر اندازہ کریں کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ وہ مجہول العدالت ہے۔ اس کی ثقاہت کتب اسماء الرجال میں نہیں پائی گئی۔ کہاں تک درست ہے' حافظ صاحب تہذیب التہذیب ج ۱۲ میں ابوغالب کے نام کے متعلق اختلاف ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ قال اسحق بن منصور عن ابی معين صالح الحديث وقال ابو حاتم ليس بالقوی وقال النسائی ضعيف وقال الدار قطنی ثقة وقال ابن عدی قد روٰی عن ابی غالب حديث الخوارج بطور وهو معروف به ولم ارفی احاديثه حديثا منكرا وارجوانه لا باس به وحسن الترمذی بعض احاديثه صحح بعضها قلت اوقال ابن حبان لا يجوز الاحتجاج به الا فيما وافق الثقات و قال ابن

سعد کان ضعیفا وقال البرقانی عن الدار قطنی ابو غالب حزور بصری یعتبر به ووثقه موسی بن هارون کما مضی فی الذی قبله انتهی۔ اس اقتباس سے یہ معلوم ہوا کہ اس راوی (ابوغالب) کو امام یحیٰی بن معین' دار قطنی' ابن عدی' موسی بن ہارون اور ترمذی نے ثقہ قرار دیا ہے۔ اور ابو حاتم' نسائی' ابن حبان اور ابن سعد نے غیر قوی اور ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن نسائی' ابوحاتم اور ابن سعد کی تضعیف اس لئے قابل قبول نہیں کہ ان کا جرح غیر مفسر ہے اور اصول حدیث میں یہ بات مقرر ہو چکی ہے کہ جرح مبہم غیر مفسر اس راوی کے متعلق مقبول نہیں ہو گی' جس کی عدالت و ثقاہت دوسرے جہابذہ فن سے ثابت ہو چکی ہو اور یہی معاملہ اس جگہ پر ہے' کیونکہ ابو غالب کی ثقاہت اس فن کے امام یحیٰی بن معین سے منقول ہے۔ اس کے علاوہ امام دار قطنی اور ابن عدی وغیرہما سے بھی عدالت ثابت ہو چکی ہے۔ لہٰذا ان کے مقابلہ میں ابوحاتم' نسائی کی تضعیف تب ہی قابل قبول ہوتی' جب وہ مفسر ہوتی۔ باقی رہا ابن حبان کی تضعیف تو اول وہ بھی غیر مفسر ہے۔ لہٰذا قابل قبول نہیں۔ ثانیاً اس نے یہ لکھا ہے کہ لا یجوز الاحتجاج به الا فیما وافق الثقات۔ جس کا مفاد یہی نکلتا ہے' جو حافظ صاحب نے تقریب میں لکھا ہے کہ صدوق یخطئی اور حافظ صاحب نے تقریب کے ابتدا میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ انی احکم علی کل شخص منهم بحکم یشمل اصح ما قیل فیه واعدل ما وصف به بالخص عبارة واخلص اشارة۔ علاوہ ازیں ابن حبان کا تساہل توثیق میں اور تشدد تجریح میں مشہور و معروف ہے۔ اگر کسی کو اعتبار نہ آئے تو لسان المیزان' میزان الاعتدال تہذیب التہذیب اور فتح الباری کے مختلف مقامات کو ملاحظہ کر لے' تو میری بات اس کو صحیح نظر آئے گی۔ لہٰذا ان کی تخریج ان نقاد جیاد وجہابذہ فن خصوصاً امام ابن معین اور دار قطنی جیسے ماہرین کے مقابلہ میں اگر مفسر بھی ہو' تب بھی قبول نہیں ہو سکتی۔ چہ جائیکہ جبل مبہم ہو۔ اس جگہ پر ہم دو تین امثلہ نقل کرتے ہیں' جس سے اہل انصاف کو میری بات صحیح نظر آئے گی۔

(ا) حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں سوید بن عمرو کلبی (جو کہ صحیح مسلم کے رجال میں سے ہے) کے ترجمہ کے تحت میں امام ابن معین وغیرہ سے اس کی توثیق نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں : اما ابن حبان فاسرف و اجتراء فقال کان یقلب الاسانید ویضع علی الاسانید الصحیحة المتون الواهیة اور حافظ ابن حجر تقریب میں اس کے ترجمہ میں فرماتے ہیں کہ

افحش ابن حبان القول فيه ولم يأت بدليل۔

(۲) حافظ ذہبی اپنے میزان میں عثمان بن عبدالرحمن الطرائفی کے ترجمہ میں رقمطراز ہیں۔ واما ابن حبان وانه يتوقع كعادته فقال فيه يروى عن الضعفاء اشياء ويدلسها عن الثقات فلما كثر ذالک فی اخباره فلا يجوز عندى الاحتجاج بروايته بكل حال۔

(۳) حافظ ذہبی اپنے میزان میں محمد بن الفضل السدوسی عارم امام بخاری کے شیخ کے ترجمہ میں دار قطنی سے اس کی توثیق نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔ قلت فهذا قول حافظ العصر الذى لم يات بعد النسائى مثله فاين هذا القول من قول ابن الحبان المشهور فى عارم فقال اختلط فى آخر عمره وتغير حتى كان لا يدرى ما يحدث به فوقع فى حديثه المناكير الكثيره فيجب التنكب عن حديثه فيما رواه المتاخرون فاذا لم يعرف هذا من هذا ولا يحتج بشى منها (قلت) ولم يقدر ابن حبان ان يسوق له حديثا منكرا فاين ما زعم؟ ان عبارات سے آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ ابن حبان اور تو اور لیکن صحیحین کے رواۃ پر بھی بسا اوقات ایسی جرح کر جاتے ہیں' جو قطعاً صحیح نہیں۔ اسی وجہ سے نقاد فن نے ان کی جرح پر رد کی اور اس کی تضعیف کو دوسرے جہابذ فن کی توثیق کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں دیا۔

یہ تو میں نے تین مثالیں ذکر کی ہیں' اگر اور بھی مثالیں دیکھنی ہوں تو فن رجال کی کتب کا مطالعہ فرمائیں۔ بہت سی مثالیں اور بھی مل جائیں گی۔ لہٰذا چونکہ زیر بحث راوی (ابوغالب) کو دار قطنی ابن معین وغیرہما جیسے نقاد' جیاد نے ثقہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا ابن حبان جو کہ مسرف ہے' اس کی جرح مقبول نہیں ہو گی۔ کیونکہ یہ اصول حدیث کی معیاری کتب میں طے ہو چکا ہے کہ جس راوی کی توثیق ائمہ فن سے ثابت ہو چکی ہو' اس پر اس جارح کی جرح مقبول نہیں ہوگی۔ جو رجال کی جرح میں متعنت ہو۔ جیسا کہ ابن حبان' خصوصاً کوئی دلیل اپنی جرح میں پیش نہیں کی' جیسا کہ اس مسئلہ میں ہے۔ اب آپ انصاف سے کہیں کہ مولانا حصاری کا یہ تحریر فرمانا' کہ اس کی ثقاہت کتب اسماء رجال میں نہیں پائی جاتی' کہاں تک صحیح ہے۔ کیا مولانا کی نظروں سے یہ اسماء رجال کی کتب نہیں گزریں؟ فان كنت لا تدرى فتلک مصيبته وان كنت تدرى فالمصيبته اعظم آگے پھر مولانا لکھتے ہیں۔ کیونکہ جس کے نام کا مستقل پتہ نہیں تو اس کے حالات سے کیا آگاہی ہو سکتی ہے۔ یہ مولانا

کی عجیب منطق ہے کہ جس راوی کے نام میں اختلاف ہو' اس کے حالات بھی معلوم نہیں ہو سکتے۔ کیا مولانا اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ صحیحین میں بھی ایسے رواۃ پائے جاتے ہیں' جن کے ناموں میں کثیر اختلاف ہے۔ لیکن وہ اپنی کنیتوں سے مشہور ہیں' تو کیا اس وجہ سے مولانا صحیحین کے رواۃ کے متعلق بھی یہی ارشاد فرمائیں گے' کہ چونکہ ان کے نام کا بھی پتہ نہیں۔ لہٰذا ان کے حالات کیسے معلوم ہو سکتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ رواۃ مجہول العدالت ٹھہرے علی زعم مولانا الحصاری۔ کیا مجھے ان رواۃ کے ذکر کرنے کی بھی ضرورت ہے؟ در حقیقت سب رواۃ کسی نہ کسی وجہ سے اپنی کنیت سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ بعد میں رفتہ رفتہ ان کا اصل نام لوگوں کے ذہنوں سے بالکل نکل جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے ناموں میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ دیکھیے! صحابہ سب کے سب عدول ہیں۔ لیکن بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی کنیتوں سے مشہور ہو گئے تھے بعد میں ان کے ناموں میں شدید اختلاف ہو گیا۔

حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب میں سیدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ترجمہ کی ابتدا میں تحریر فرماتے ہیں: واختلف فی اسمہ واسم ابیہ اختلافا کثیرا۔ (تہذیب التہذیب ص۔۲) کم از کم میری نظر سے تو متقدمین میں خواہ متاخرین میں سے کسی کا بھی ایسا قول نہیں گزرا کہ جس راوی کے نام میں اختلاف ہو' وہ مجہول العدالت ہو جاتا ہے۔ یہ مولانا کی ہی طبع زاد ایجاد ہے' واللّٰہ موافق۔

باقی مولانا نے جو یہ لکھا ہے کہ' اب اگر دو رکعت بیٹھ کر پڑھی جائیں تو وتر نماز کے آخر میں نہیں ہو سکتے۔(تنظیم اہلحدیث مجریہ صفر۱۴ سنہ۔۸۹ ۱۳ھ ص۔۸' کالم۔۱) یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ دو رکعتیں وتر کے ساتھ ہیں۔ اس لیے ساری رکعات وتر ہو گئیں۔ ملاحظہ فرمایئے! حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث جو مسلم کی جلد اول میں مذکور ہے۔ یہ طویل حدیث ہے کہ جو سعد بن ہشام سے مروی ہے۔ جس میں ہے: قال قلت یا ام المومنین انبئینی عن وتر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقالت کنا نعدلہ سواکہ وطھورہ فیبعثہ اللّٰہ مایشاء ان یبعثہ من اللیل فیتسوک یتوضاء ویصلی تسع رکعات لا یجلس فیھا الا فی الثامنۃ فیذکر اللّٰہ ویحمدہ ویدعوہ ثم ینھض ولا یسلم ثم یقوم فیصلی التاسعۃ ثم یقعد فیذکر اللّٰہ ویحمدہ ویدعوہ ثم یسلم تسلیما یسمعنا ثم یصلی رکعتین بعد ما یسلم وھو قاعد فتلک احدی عشرۃ رکعۃ یا بنی فلما اسن

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واخذ اللحم اوتر بسبع وصنع فی الرکعتین مثل ضیعہ الاولی فتلک تسع رکعات۔ اس صحیح حدیث سے واضح ہو گیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان دو رکعتوں کو وتر کے ساتھ ہی معلق سمجھا اور قرار دیا۔ اس لیے تو فرمایا کہ فتلک احدی عشرۃ رکعت اور فتلک تسع اور یہ بالکل واضح ہے۔ اب ہم حضرت صدیقہ کے فہم کو اعتبار کریں یا مولانا حصاری کے فہم کو؟ یہ اہل انصاف خود فیصلہ کریں۔

پھر مولانا حصاری صاحب قسط نمبر۱۹ تنظیم اہلحدیث مجریہ ۶ ربیع الاول' میں لکھتے ہیں: (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت) ابوداود' طیالسی جلد اول' ص۔۱۹ میں حدیث ہے' حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: کان یوتر عند الاذان ویصلی رکعتین عند الاقامۃ پھر ترجمہ لکھا ہے' پھر لکھتے ہیں' اس حدیث میں (کان یوتر) دوام پر دلالت کرتا ہے' جس سے پیر جھنڈا صاحب کو کوئی سبیل انکار نہیں ہے۔

میں حیران ہوں کہ مولانا جیسے علماء دین کو محقق' شہیر جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آخر ایسے واہی دلائل پیش کرنے کی جرات کیسے کرتے ہیں؟ پھر مولانا کو غالباً یہ یاد نہیں رہا کہ وہ پہلے تحریر فرما چکے ہیں کہ میں نے کوئی ایسی مثال پیش نہیں کی۔ جس میں مولانا نے مدلسین کی روایات سے استدلال کیا ہو' حالانکہ اس پیش کردہ روایت میں ابو اسحاق سبیعی ہیں۔ جو مدلسین سے ہیں اور ان کی تدلیس مرتبہ ثالثہ میں سے ہے اور روایت بھی عن سے کرتے ہیں۔ گویا جس مضمون میں مجھ پر اعتراض کیا اور میرے لکھنے کو محض الزام قرار دیا۔ فسبحان من لا یضل ولا ینسی۔ اور پھر اس کی سند میں ابو اسحاق کا شیخ حارث اعور ہے جو ضعیف بلکہ کذاب ہے۔ اگرچہ طبع میں حارث کی جگہ پر ابوالحارث چھپ گیا ہے جو غلط ہے۔ ابواسحاق کی روایت حارث اعور سے ہی مشہور ہے ورنہ مولانا بتا دیں کہ یہ ابوالحارث کون ہے۔ بہرحال نتیجہ صاف ہے اگر یہ حارث ہے تو یہ ضعیف ہے۔ لہٰذا سند ضعیف ہو گئی۔ اور اگر ابوالحارث ہے جیسا کہ مطبوع میں موجود ہے تو پھر یہ کوئی مجہول راوی ہیں' پھر بھی یہ روایت ضعیف اور ناقابل استدلال بن جاتی ہے۔ لہٰذا اس روایت کو لے کر معرض استدلال میں آنا مولانا کی فقاہت اور محققیت کا حصہ ہے۔

چونکہ گزشتہ صفحات میں مولانا کی گل افشانیاں ذکر کر چکا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ میں نے آنحضرت فداہ ابی وامی وروحی صلی اللہ علیہ وسلم پر قطعاً جھوٹ نہیں باندھا' محض ایک

بات صحیح سمجھ میں آگئی تھی اور اب بھی اس کو صحیح سمجھ رہا ہوں' وہ عرض کر دی تھی اور اس کے باوجود بھی اگر وہ مجھے ایسے عظیم گناہ کا مرتکب سمجھ رہے ہوں گے تو اس کا فیصلہ انشاء اللہ رب العالمین' مالک یوم الدین کی عدالت میں ہو گا۔ میں مزید اس پر کچھ بھی لکھنا نہیں چاہتا۔ آگے مولانا فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ پھر وتروں کے بعد یہ دو رکعتیں چھوڑ دی گئیں۔ صرف وتر پر نماز کو ختم کیا گیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ ایسی حدیث کس کتاب میں ہے کہ پھر آپ نے ان دو رکعتوں کو چھوڑ دیا تھا؟ ایسی حدیث تو ابھی تک آپ نے پیش فرمائی ہی نہیں' صرف ایسی احادیث پیش فرمائی ہیں' جن سے یہ معلوم ہوتا ہے' کہ چند بار آپ نے انہیں پڑھا تھا' لیکن یہ ترک بعد میں تھا یا ابتدا میں تھا اور اس کے بعد ہمیشہ دو رکعت پڑھتے رہتے تھے۔ اس کے متعلق ان احادیث میں کوئی تعرض نہیں۔ یہ پھر وتروں کے بعد مولانا کی ہی حاشیہ آرائی ہے۔ وہ دوسروں کو تو ایسا الزام دینے سے بھی نہیں گھبراتے کہ وہ حضور ﷺ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ لیکن خود ایسی حاشیہ آرائیاں اپنی طرف سے احادیث میں کر دیتے ہیں اور ان کو کوئی کہنے والا نہیں۔ لہٰذا ان پر یہ فرض ہے کہ اپنے اس اضافے پر صراحتاً ثابت کریں ورنہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ انہوں نے کس چیز کا ارتکاب کیا ہے۔ دراصل ان احادیث میں یہ بات ہے ہی نہیں کہ ترک دوگانہ کا پہلے تھا یا بعد میں تھا۔ اب صاف بات تو محدثین کی تطبیق کے طریقہ پر یہ ہے کہ دونوں احادیث کو اپنی جگہ پر رکھا جائے۔ جن جن احادیث سے آپ کی ان دو رکعتوں پر مداومت معلوم ہوتی ہے اس کو اغلب احوال پر محمول کیا جائے۔ آخر میں کونسی خرابی ہے؟ آگے مولانا فرماتے ہیں کہ سنت بالکل نہیں ہے' اس کی تین وجوہات ہیں۔

(ا) یہ کہ یہ خاصہ نبوی ﷺ ہے اور خاصہ نبوی امت کے لئے سنت نہیں۔ مولانا خاصہ نبوی احتمالات سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ٹھوس دلیل چاہیئے۔ ورنہ بہت سی باتوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے اور پھر اس سے بہت سے کاہل اور سنت سے تغافل کرنے والوں کو ایک بہانہ ہاتھ آ جائے گا اور یہی کہیں گے کہ جناب یہ تو خاصہ نبوی ہے۔ ہم کو اس پر عمل کرنا نہیں ہے۔ باقی آگے چل کر مولانا نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لست کاحد منکم سو اس کے متعلق یہی گزارش ہے کہ یہ فرمان نبوی ﷺ تو ثواب کے متعلق تھا' یعنی ثواب کے سلسلہ میں میں آپ جیسا نہیں ہوں۔ بلکہ مجھے

بیٹھ کر نماز پڑھنے میں بھی پورا ثواب ملتا ہے۔ اور یہ بات مختلف فیہ ہے ہی نہیں' بلکہ ہم بھی یہ مانتے ہیں کہ بیٹھ کر پڑھنے کا ثواب آدھا ہی ہے۔ لیکن آدھے ثواب کو اختیار صرف اس لیے کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی سنت ہے۔ لہٰذا یہ دلیل صحیح نہیں رہی' آگے پھر رقمطراز ہیں۔

(۲) یہ کہ دو تین دفعہ کا فعل ہے۔ پھر اس کے خلاف عمل ہوتا رہا ہے۔ کیونکہ آنحضور ﷺ آخر میں وتر پڑھتے رہے ہیں' جس کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی۔ اس وجہ پر بھی دلیل معقول تو کوئی پیش نہیں فرمائی۔ آخر سے مراد اگر وہ حدیث ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: فانتھی وترہ الی الفجر تو اس کے متعلق پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ اس سے ان دو رکعتوں کی نفی نہیں ہوتی' کیونکہ آپ کا معمول رات کے آخری حصہ میں ہو کر رہ گیا تھا' یعنی آپ رات کے ابتدائی حصہ میں بھی وتر پڑھتے رہے اور وسطی حصہ میں بھی۔ لیکن اخیر عمر میں آپ کا وتر رات کے اخیر حصہ میں ہوتا تھا۔ اب کوئی اہل علم انصاف سے بتائے کہ اس سے آخر ان دو رکعتوں کی نفی کیسے ہوتی ہے؟ اور اس وجہ سے مولانا کی مراد یہ ہے کہ جن حدیثوں سے ترک معلوم ہوتا ہے وہ آخری فعل ہے تو اس کے لئے دلیل کا مطالبہ ہے کہ یہ حدیثیں بعد کی ہیں' حالانکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جو مسلم شریف میں وارد ہے جس میں انہوں نے آپ ﷺ کی آخر عمر میں رات کی نماز کو جو ذکر کیا ہے' حدیث کے الفاظ بالکل واضح ہیں کہ یہ اخیر عمر کا فعل ہے۔ اس میں دو رکعتوں کا بھی ذکر ہے اور ان سب کو ملا کر حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان کو نو شمار کیا ہے۔ فتلک تسع۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ آپ کے احتمال کو جو ناشی' عن دلیل نہیں ہے۔ صحیح سمجھیں یا دوسرے کسی اور مرد صحابی کی بات زیادہ وزنی ہو سکتی۔ کیونکہ یہ نماز آپ ﷺ اکثر گھر میں ہی پڑھتے تھے۔ لہٰذا یہ وجہ بھی معقول نہیں ہے۔ آگے لکھتے ہیں۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ نفل تہجد کے وقت پڑھے گئے ہیں۔ عشاء کے وقت پڑھنے کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ صرف ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ذکر ہے۔ سو وہ مسافر کے بیان میں ہے۔ مولانا آپ جیسے محقق شہیر سے دفوق کل ذی علم علیم والا ربانی ارشاد مبارک قطعاً مجمل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اگر جناب کو ایسی حدیث نہیں ملی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقعہ ایسی حدیث ہی وجود میں نہیں ہے' بلکہ ایسی صریح حدیث بھی ہے جو مزید تحقیق میں آرہی

ہے۔ لہٰذا یہ تیسری وجہ بھی لا یسمن ولا یغنی من جوع ہے۔ پھر آگے چل کر مولانا اس طرح گوہر افشانی کرتے ہیں' پانچواں امر تنقیح طلب یہ تھا کہ ان نفلوں کو اگر کوئی تہجد کے وقت وتروں کے بعد پڑھے' تو اس طرح پڑھنے چاہئیں کہ بیٹھ کر شروع کرے جب قرات پوری ہو جائے تو کھڑا ہو جائے پھر رکوع کرے اور سجدہ کر کے رکعت پوری کرے اسی طرح دوسری رکعت پوری پڑھے' اس طرح پڑھنے کا پورا ثواب ملے گا۔ مولانا عجیب بات فرماتے ہیں۔ پہلے تو بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وتر کے بعد دوسری نماز بالکل نہ پڑھی جائے' کیونکہ یہ فرمان نبوی ﷺ اجعلوا اخر صلوتکم باللیل وترا۔ (او کما قال) کے خلاف ہے۔ اور وتر کے بعد دو رکعت جو آپ ﷺ نے پڑھی ہیں وہ آپ کا خاصہ تھا۔ اور خاصہ امت کے لئے سنت نہیں ہے۔ اور پھر اس جگہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی تہجد کے وقت پڑھے تو پورا ثواب ملے گا' جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تہجد کے وقت وتروں کے بعد وہ بھی دو رکعت پڑھنے کے جواز کے قائل ہیں' لیکن ان کے تحریر کردہ طریقہ پر لہٰذا بجا طور پر یہ ان سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ اگر وہ امت کے لئے سنت ہے ہی نہیں تو پڑھی ہی کیوں جائیں۔ اور پھر ان کا ثواب کیسے پورا ملے گا؟

کیا سنت کی مخالفت میں بھی ثواب ملتا ہے؟ بہرحال اس تناقص کو وہ خود ہی رفع کرسکتے ہیں۔ ہم جیسے ہیچ دان تو اس کے رفع کرنے سے قاصر ہیں۔ بہر صورت اگر وہ تہجد کے وقت وتر کے بعد دو رکعتوں کے پڑھنے کو جائز اور کار ثواب سمجھتے ہیں تو باقی رہا عشاء کے بعد وتروں کے بعد کی دو رکعتوں کا اثبات سو ہمارے ذمہ ہے۔ ہم ان کو آنحضرت ﷺ کی حدیث دکھلا دیتے ہیں۔ پھر دیکھیں گے کہ وہ حق کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ باقی ان دو رکعتوں کے پڑھنے کی کیفیت کو جو مولانا نے بس ایک ہی طریقہ میں بند کر دیا ہے وہ صحیح نہیں' کیونکہ یہ کیفیت مولانا کی صورت میں ہے' کہ دو رکعتیں آپ لمبی کر کے پڑھتے تھے۔ جیسا کہ خود حدیث کا سیاق اس پر شاہد عدل ہے۔ ورنہ ساری نماز (دونوں رکعتیں پوری کی پوری) بیٹھ کر پڑھنا اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ جس میں یہ بیان ہے کہ دو رکعتوں کو خفیف کرتے تھے۔ اور ان میں سورت اذا زلزلت اور قل یایھا الکفرون پڑھا کرتے تھے۔ اور ہر ذو انصاف اس کو تسلیم کرے گا اور وہ حدیث حسن یا صحیح لغیرہ ہے۔ اسی طرح جو آگے ہم عشاء کے بعد وتر کے پیچھے دو رکعتوں کو بیٹھ کر ادا کرنے والی حدیث پیش کریں گے تو اس سے بھی اہل علم وانصاف یہی سمجھیں گے کہ یہ دونوں

رکعتیں آپ ﷺ نے بیٹھ کر ادا کیں۔

آخر میں مولانا نے جو حدیث حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمائی ہے اس کے متعلق اولاً تو یہ گزارش ہے کہ مولانا دوسروں کے دلائل پر بے جا اعتراضات کر دیتے ہیں اور ان حدیثوں کی سندوں پر زبردستی جہالت اور ضعف کا حکم صادر فرما دیتے ہیں۔ لیکن خود جو بھی دلیل پیش کرتے ہیں' اس کے متعلق اتنی کاوش بھی نہیں کرتے' کہ یہ معلوم کریں کہ اس کے راوی کا کیا حال ہے۔ اسی حدیث کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن ابی الموالی ہے۔ جس کے متعلق حافظ صاحب تقریب میں فرماتے ہیں: صدوق ربما اخطا اب غور طلب امر یہ ہے کہ مولانا نے میری پیش کردہ حدیث کی سند کے راوی ابوغالب کو ضعیف قرار دیا' حالانکہ ضعف کی وجہ کچھ بھی بیان نہ کی۔ اگر ضعف کی وجہ یہ تھی کہ ابوطالب کے ترجمہ میں یخطئی کا لفظ ہے تو اس راوی عبدالرحمٰن کے ترجمہ میں ربما اخطا کے الفاظ ہیں۔ جو یخطئی سے زیادہ وزنی ہیں' کما لا یخفی۔

اگر عبدالرحمٰن کے متعلق حافظ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ صدوق (جو حسن الحدیث ہونے پر دال ہے' تو ابو غالب کے متعلق بھی حافظ صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ صدوق۔ پھر کتنی بے انصافی ہے کہ اپنی پیش کردہ روایات کے راوی سے اعراض کرتے ہیں اور اگر دوسرا کوئی ان کے خیال اور رائے کے برخلاف دلیل پیش کرے تو فوراً اس کی تضعیف کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں' حالانکہ فی الحقیقت وہ قطعاً ضعیف نہیں ہوتی۔ ثانیاً اس حدیث میں ان دو رکعتوں کا ذکر نہیں' تو کیا عدم ذکر سے عدم وجود لازم آتا ہے۔ بسا اوقات راوی اختصار سے کام لیتے ہیں۔ ثالثاً یہ احتمال ہے' کہ یہ ترک پہلے زمانہ کا ہو جیسا کہ اس کی دلیل گزشتہ سطور میں پیش کر چکا ہوں۔ رابعاً یہ ترک وجہ جواز کے لئے بھی کر دیا ہو' لیکن اس لیے ان دو رکعتوں کی سنیت کیوں باطل ہو جاتی ہے۔ خامساً اس کے معارضہ میں ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جید اور قوی حدیث پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح آپ کا دعویٰ بھی ھباءً منثورا ہو جاتا ہے۔

امام احمد کی مسند ج-۶' ص-۲۳۶ پر یہ حدیث ملتی ہے: حدثنا عبداللہ حدثنی ابی ثنا یزید فقال ثنا بھز بن حکیم وقال مرۃ انا قال سمعت زرارۃ بن اوفی یقول سالت عائشۃ عن صلوۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم باللیل فقالت کان یصلی العشائم

يصلي بعدها ركعتين ثم نام فاذا ستيقظ وعنده وضوه مغطى وسواكه اسعاك ثم توضا فقام فصلى ثمان ركعات يقرا فيها بفاتحة الكتاب وماشاء من القران وقال مرة ماشاء الله من القران فلا يقعد من شى منهن الا فى الثامنة فانه يقعد فيها فيتشهد ثم يقوم ولا يسلم فيصلى ركعة واحدة ثم يجلس فيتشهد ويدعو ثم يسلم تسليمة واحدة السلام عليكم يرفع بها صوته حتى يوقظنا ثم يكبر وهو جالس فيقرا ثم يركع ويسجد وهو جالس فيصلى جالسا ركعتين فهذه احدى عشرة ركعة فلما كثر لحمه وثقل جعل التسع سبعا يقعد لا كما يقعد فى الاولى ويصلى ركعتين قاعدا فكانت هذه صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى قبضه الله۔ (رجال السند) امام احمد کا شیخ یزید وہ ابن ہارون الوسطی ہے۔ حافظ صاحب تقریب میں فرماتے ہیں' کہ ثقہ متقن عابد اور یزید کا استاد بہز بن حکیم ہے۔ اور وہ صدوق ہے۔ کما فی التقریب اور بہز نے زرارۃ بن اوفیٰ سے سنا ہے' وہ ثقہ ہے' کما فی التقریب سند میں کوئی انقطاع وغیرہ کی علت نہیں ہے۔

متن حدیث :اس حدیث میں جناب حضرت محمد ﷺ کی رات کی نماز تہجد کا بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ ﷺ نو رکعتیں وتر (وتر تہجد' قیام اللیل سب ایک ہی چیز مختلف اعتبارات کی وجہ سے مختلف نام ہیں) پڑھا کرتے تھے۔ اور ان نو رکعات کے بعد آپ بیٹھ کر دوگانہ ادا فرماتے تھے۔ جس میں رکوع اور سجدہ بھی بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ بعد میں پھر سات رکعات وتر اور ان کے بعد دو رکعات بیٹھ کر ادا فرماتے تھے۔ اس حدیث میں جو آیا ہے کہ آپ ایک سلام کہتے تھے۔ اس سے حدیث کے متن کی نکارت پر استدلال نہ کیا جائے کیونکہ تسلیم واحدہ صرف آواز کی اونچائی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی ایک سلام آپ اونچی آواز سے کہتے تھے' تاکہ حضرت عائشہ ؓ وتر کے لئے اٹھ جائیں۔ باقی دوسرے سلام کا ذکر نہیں ہے' سو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ نے آہستہ کہا ہو۔ اس کا انکار حدیث میں قطعاً نہیں ہے۔

(ا) دوسری حدیث میں بھی حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے جو مسند کے جز سادس ص۔۱۵۶ میں واقع ہے : حدثنا عبدالله حدثنى ابى ثنا ابوالنضرثنا محمد يعنى ابن راشد عن يزيد بن يعفر عن الحسن عن سعد بن هشام عن عائشة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان اذا صلى العشاء دخل المنزل ثم صلى ركعتين ثم صلى

بعدھا رکعتین اطول منھا ثم اوتر بثلاث لا یفصل فیھن ثم یصلی رکعتین وھو جالس یرکع وھو جالس ویسجد وھو جالس۔ (رجال السند) امام احمد کے بعد ان کا شیخ ابوالنضر ہے۔ ان کا نام ہاشم بن القاسم ہے' جو کنیت (ابوالنضر) سے زیادہ مشہور ہیں ان کے متعلق تقریب میں لکھا ہے کہ ثقہ ثبت اس کے بعد محمد بن راشد ہیں' جو شامی ہیں اور وہ صدوق ہیں۔ (قالہ فی التقریب) اور وہ یزید بن یعفر سے روایت کرتے ہیں' اس کے متعلق حافظ صاحب تعجیل المنفعۃ برجال الاربعہ میں فرماتے ہیں : قال الدار قطنی یعتبر بہ۔ یعنی امام دار قطنی فرماتے ہیں کہ یہ راوی معتبر ہے۔ وذکرہ ابن حبان فی ثقاتہ۔ اور ابن حبان نے اس راوی کو اپنے "الثقات" میں ذکر کیا ہے۔ پھر آگے حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ وقال الذھبی فی المیزان لیس بحجۃ۔ اور حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں کہ یہ راوی حجت نہیں ہے۔

بندہ راقم الحروف کہتا ہے کہ' حافظ ذہبی کا یہ فرمانا کہ یہ راوی حجت نہیں ہے۔ اس راوی کو ثقاہت سے نہیں گراتا کیونکہ یہ جرح غیر مفسر ہے۔ حافظ ذہبی صاحب نے اس جرح کا سبب بیان نہیں کیا۔ حلانکہ اس کی توثیق امام دار قطنی جیسے محقق فن اور معتدل سے موجود ہے۔ اور خود ذہبی صاحب نے میزان میں تصریح کی ہے۔ کہ امام نسائی کے بعد دار قطنی جیسا امام فن اور کوئی نہیں گزرا اور پھر امام دار قطنی اس توثیق میں منفرد بھی نہیں ہیں' کیونکہ ابن حبان نے بھی انکی توثیق کی ہے' اس لئے اس کو آپ نے "الثقات" میں ذکر کیا ہے۔ اور ہربات اصول حدیث میں طے ہو چکی ہے کہ تعدیل پر جرح صرف وہ مقدم ہوتا ہے جو مفسر ہو' لہٰذا امام دار قطنی جیسے ناقد جید کے مقابلہ میں حافظ ذہبی کا یہ جرح غیر مفسر غیر معتبر ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی مسلم نہیں کہ یہ الفاظ لیس بحجۃ جرح پر قطعی دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ حجۃ' ثقہ' ثبت وغیرہما کے الفاظ سے بہت اونچا ہے۔ اس لیے حجت ہونے کی نفی سے ثقاہت کی نفی لازم نہیں آتی۔ اب حافظ ذہبی کا قول بھی ان دو اماموں کے قول کے متعارض نہیں رہا کیونکہ حافظ ذہبی نے حجت ہونے کی نفی کی ہے۔ نہ کہ مطلق ثقاہت کی۔ لہٰذا یہ راوی ثقہ ہے۔ گو حجۃ نہیں ہے۔ اور ایسا عمل تلاش کرنا جس سے ائمہ حدیث کے اقوال کا آپس میں تعارض رفع ہو جائے' حد امکان تک نہایت ضروری ہے۔ ہمارا مذکورہ بالا دعویٰ کہ ایک ہی راوی ثقہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور غیر حجت بھی۔ دلیل

کے طور پر ذیل میں ائمہ فن کے اقوال ملاحظہ فرمائیں۔

میزان الاعتدال میں محمد بن اسحاق کے ترجمہ میں حافظ ذہبی' امام یحییٰ بن معین سے نقل فرماتے ہیں کہ قال ابن معین ثقه وليس بحجة یعنی محمد بن اسحق ثقہ تو ہیں لیکن حجت نہیں ہیں۔ (المیزان ج۔۳' ص۔۴۶۹' طبع جدید) آگے چل کر پھر لکھتے ہیں : قال ابو زرعة سالت يحيى بن معين عن ابن اسحق اهو حجة؟ قال هو صدوق الحجة عبیداللّٰہ بن عمرو الاوزاعی وسعيد ابن عبدالعزيز۔ (المیزان ج۔۳' ص۔۴۷۳) یعنی ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام یحییٰ سے پوچھا کہ کیا ابن اسحاق حجتہ ہیں' تو امام ابن معین نے جواب میں فرمایا کہ ابن اسحاق صدوق ہیں۔ حجتہ تو عبیداللہ بن عمر' اوزاعی' اور سعید بن عبدالعزیز ہیں۔ اس عبارت نے مزید وضاحت کر دی کہ حجتہ کا لفظ ثقتہ صدوق وغیرہما سے کافی ارفع واعلیٰ ہے۔

(۲) سلیمان بن حبان ابوخلد الاحمر الکوفی کے ترجمہ کے تحت لکھتے ہیں : روىٰ عباس عن ابن معين صدوق ليس بحجة "یعنی عباس الدوری ابن معین سے روایت کرتے ہیں کہ سلیمان المترجم لہ صدوق ہیں اور حجت نہیں ہیں۔" اور ابن عدی نے بھی اسی بات کو بحال رکھا ہے جیسا کہ اپنے "کامل" میں فرماتے ہیں کہ هو كماقال يحيى صدوق ليس لحجة (المیزان) "یعنی سلیمان الاحمر جیسا کہ یحییٰ نے فرمایا کہ صدوق ہیں' حجت نہیں ہیں۔"

(۳) معاذ بن ہشام بن ابی عبداللہ الدستوائی کے ترجمہ میں نقل فرماتے ہیں کہ صدوق ليس بحجة (المیزان) "یعنی معاذ بن ہشام صدوق ہیں' اور حجت نہیں" ان امثلہ سے یہ اندازہ نہ کیا جائے' کہ خاص امام ابن معین کی اصطلاح ہے' بلکہ اور ائمہ فن حدیث سے بھی ایسے امثلہ بہت موجود ہیں' ایک مثال مزید ملاحظہ فرمایئے۔

(۴) موسیٰ بن عبیدہ الزبدی کے ترجمہ میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں : قال ابن سعد ثقته وليس بحجة (المیزان) ابن سعد نے کہا کہ موسیٰ ثقہ ہیں' اور حجت نہیں ہیں۔ ایسے اور بھی بہت امثلہ مزید رجال کے کتب میں ملتے ہیں۔ لیکن طوالت کے خوف سے ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ ہماری پیش کردہ حقیقت کے ثبوت کے لئے یہ امثلہ بھی کافی اور شافی ہے۔ بہرکیف جب عدم حجیت ثقاہت کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ حجت کا لفظ ارفع واعلیٰ ہے۔ للہذا ان کی نفی سے اس سے ادنیٰ درجہ کا انتفاء نہیں ہو گا' تو پھر زیر بحث راوی یزید بن معفر کے متعلق حافظ ذہبی کا یہ فرمان کہ ليس بحجة اس راوی کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس

کو ثقاہت و صداقت کے مرتبہ سے گراتا ہے۔ کیونکہ اس کی توثیق اس شان کے امام (دارقطنی) سے ثابت ہو چکی ہے۔ اس راوی کے بعد الحسن آتے ہیں۔ یہ حسن بصری ہیں' جس کے متعلق تقریب التہذیب میں حافظ صاحب ارقام فرماتے ہیں کہ ثقہ فقیہ فاضل مشہور اس کے بعد سعد بن ہشام ہیں' وہ بھی ثقہ ہیں۔

التقریب بالجملہ اس حدیث کی سند حسن لذاتہ کے درجہ سے متنزل نہیں ہے' بلکہ اگر اس کو صحیح لغیرہ کہا جائے تو صواب سے بعید نہیں ہے۔

متن الحدیث : اس حدیث سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اگر اول رات میں عشاء کی نماز کے بعد بھی وتر پڑھتے تھے' تو دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ اب تو شارع بارع علیہ الصلوۃ السلام سے عشاء کے بعد وتر کے پیچھے دوگانہ بیٹھ کر پڑھنا ثابت ہو گیا اور اس سے قبل ایک عام دلیل حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے پہلے مقالہ میں پیش کر چکا ہوں۔ اب ان ادلہ واضحہ کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی ان دو رکعتوں کے متعلق بدعت کا حکم لگاتا ہے اور ہم کو بدعتی قرار دیتا ہے تو اس کے جواب میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ :

بدم گفتی وخور سندم عفاک اللہ نکو گفتی

(۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے عشاء کی نماز کے بعد چار رکعتیں پڑھیں۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کیونکہ گو آنحضرت ﷺ اکثری طور پر دو رکعت پڑھا کرتے تھے' لیکن بعض اوقات چار رکعتیں بھی پڑھا کرتے تھے' چنانچہ عشاء کے بعد ان چار رکعات کا ثبوت صحیح بخاری میں بھی موجود ہے۔

(۲) یہ جو کہا کہ ثم اوتر بثلاث لا یفصل فیھن یعنی پھر آپ ﷺ تین رکعات وتر ادا فرماتے تھے' جس میں فصل نہیں کرتے تھے یعنی اکٹھے پڑھتے تھے اور دو پر سلام نہیں پھیرا کرتے تھے' یہ بات بھی غیر معروف نہیں' کیونکہ آنحضرت ﷺ کے تین رکعات وتر کی کیفیتوں میں سے احادیث صحیحہ میں یہ کیفیت بھی وارد ہوئی ہے۔ یعنی تین رکعات ایک سلام سے پڑھنا اور درمیان میں تشہد کے لئے بھی نہ بیٹھنا' بلکہ تیسری رکعت میں بیٹھ کر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرتے تھے۔

(۳) اور آپ ﷺ کا اول اللیل میں عشاء کی نماز کے بعد وتر پڑھنا بھی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس حدیث کے متن میں کوئی نکارت نہیں رہی۔

(۳) ایک اور حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' وہ بھی ملاحظہ فرماتے چلیے۔
حدثنا عبداللّٰہ حدثنی ابی ثنا الزھر بن القاسم ثنا ھشام عن قتادہ عن زرارۃ بن اوفی عن سعد بن ھشام عن ابیہ عن عائشۃ ان نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان اذا اوتر صلی رکعتین وھو جالس۔ (مسند احمد) (رجال السند) امام احمد کا شیخ الزہر بن القاسم ہے۔ اور وہ صدوق ہے۔(تقریب) وہ ہشام سے آخذ ہیں اور یہ ابن ابی عبداللہ الدستوائی ہیں۔ جس کے متعلق تقریب میں لکھا ہے' کہ ثقہ ثبت وقدرمی بالقدر (وہ ثقہ ہیں) ضابطہ ہیں اور ان پر قدریہ ہونے کا الزام ہے۔ اس حدیث میں ان کے اس مذہب کی کوئی تقویت نہیں ہے' جس کی وجہ سے روایت میں ضعف آ جائے۔ کما لا یخفی ہشام کا استاد قتادہ ہے۔ یہ ابن دعامہ الدوسی ہے' جو ثقہ ثبت ہیں (تقریب) لیکن وہ مدلس ہیں' لیکن اس کے تدلیس کے خطرہ سے اس روایت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس جیسی اور روایات اور صحابہ سے بغیر اس علت کے موجود ہیں۔ لہٰذا متابعات اور شواہد میں ایسی چیزیں معتضد ہو جاتی ہیں۔ (کما تقرر فی مقرہ) قتادہ کے بعد زرارہ آتا ہے۔ اس کے متعلق پہلی حدیث کے رجال کے متعلق گزارش کرتے وقت گزر چکا ہے۔ اور سعد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں' وہ ہشام بن عامر ہیں اور یہ صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس حدیث کی اسناد بھی صالح ہے۔ گو پہلی حدیث سے کچھ نازل ہے۔ کیونکہ اس حدیث کی سند میں زرارہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان دو واسطے ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔
متن الحدیث : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی وتر پڑھتے تھے' تو اس کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر رات کے اول' اوسط اور آخر تینوں حصوں میں ثابت ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ وتر کے بعد ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ وھذا ھو المراد والمطلوب اور یہ حدیث حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کی موید ہے' جو پہلے مضمون میں تحریر کی جاچکی ہے۔ اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وتر پڑھتے تھے' تو دو رکعت وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ ان احادیث سے بحمداللہ یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ وتر کے بعد خواہ رات کے اول حصہ میں عشاء کی نماز کے بعد خواہ رات کے اخیر حصہ میں تہجد کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا بدعت نہیں ہے' بلکہ مندوب ومسنون ہے'

کیونکہ سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کا پڑھنا علی الدوام ثابت ہے۔ مضمون ہذا سے قبل یہ تحریر کر چکا ہوں کہ نووی نے بھی ان احادیث کو دیکھ کر وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حزم جو بدعتیوں اور مقلدوں کے لئے شہاب ثاقب ہیں اور سنت کے اتباع کا شدید اہتمام کرتے ہیں' انہوں نے بھی محلّی میں یہ تصریح کی ہے' کہ وتر کے بعد نفل پڑھنا جائز ہے۔ اور دلیل میں حضرت محمد ﷺ کا وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھنے کا فعل پیش کیا ہے' حالانکہ آپ ﷺ کا یہ امر کہ وتر کو رات کی نماز کے آخر میں رکھو' انہوں نے بھی نقل کیا ہے۔ قول اور فعل کے تعارض کے متعلق پہلے مضمون میں کھڑے ہو کر پینے کا فعل پیش کر چکا ہوں۔ یہاں پر مزید وضاحت کی جاتی ہے۔

(۱) صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم زجرعن الشرب قائما۔ اور دوسری روایت میں (صحیح مسلم) کے یہ الفاظ ہیں : نھی ان یشرب الرجل قائما۔

(۲) اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے روایت مروی ہے کہ لا یشربن احدکم قائما فمن نسی فلیستقی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم امت کے لئے ہے لفظ "احدکم" واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں۔ للذا اس امر اور آپ ﷺ کے فعل (کھڑے ہو کر پینا) میں تعارض نہ ہوا' کیونکہ بظاہر یہ فعل (یعنی الشرب قائما) آپ ﷺ کی ذات شریف سے مخصوص معلوم ہوتا ہے' لیکن پھر بھی محققین علما دونوں میں جمع کی صورت کو اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہی سے مراد نہی تنزیہی ہے اور آپ کا فعل جواز پر دلیل ہے۔ اور اسی توجیہ کو حافظ ابن حجر اولی قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ مبارکپوری تحفۃ الاحوذی جلد ۱ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ومنھم من قال ان احادیث النھی محمولہ علی کراھۃ التنزیہ قال الحافظ (ای ابن حجر) ھذا احسن المسالک واسلمھا بابعد من الاعتراض یعنی حافظ صاحب فرماتے ہیں' کہ یہ توجیہ زیادہ اچھی ہے۔ اور اعتراض وغیرہ سے بھی یہی زیادہ دور ہے۔ بخلاف اس کے وتر کو رات کی نماز کے اخیر میں رکھنے کے متعلق ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم عام ہے۔(یعنی آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی بھی اس میں داخل ہے) اور وہ حدیث یہ ہے : حدثنا عبداللّٰہ حدثنی ابی ثنا محمد بن جعفر وحجاج قال ثنا

شعبة عن ابی التیاح عن ابی مجلز عن ابن عمر عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال الوتر اخر رکعة من اللیل (مسند احمد ج۔۲' ص۳۔۴) (رجال السند) امام احمد کے دو شیخ ہیں ایک محمد بن جعفر یہ مدنی بصری ہیں' جو غندر کے لقب سے معروف ہیں' یہ ثقہ ہیں۔ (تقریب) دوسرا حجاج ہے اور وہ حجاج ابن محمد المصیصی الاحور ابو محمد الترمذی الاصل ہیں۔ اس کے متعلق حافظ صاحب تقریب میں فرماتے ہیں کہ ثقة ثبت لکنه اختلط فی اخر عمره لما قدم بغداد قبل موته۔ مطلب یہ ہے کہ یہ راوی ثقہ ہیں۔

باقی رہا ان کا اختلاط' سو اس سے آخذ حضرت امام احمد ہیں' جو آپ سے اختلاط سے قبل اخذ کر چکے تھے۔ لہٰذا اس اختلاط سے حدیث کی سند میں کوئی خرابی واقع نہیں ہو سکتی۔ امام احمد کے دونوں شیخوں کا استاد شعبہ ہے اور وہ ابن الحجاج ابو بسطام الواسطی ثم البصری ہیں' اور اس کے متعلق تقریب میں مرقوم ہے کہ ثقة حافظ متقن کان الثوری یقول هو امیر المومنین فی الحدیث وهو اول من فتش بالعراق عن الرجال وذب عن السنة وکان عابدا۔ اس عبارت پر مزید حاشیہ آرائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ امام شعبہ ابوالتیاح سے روایت کرتے ہیں۔" ان کا نام یزید بن حمید ہے' اور یہ ثقہ ہیں۔ (تقریب) پھر ابو مجلز ہے۔ ان کا نام لاحق بن حمید ہے۔ یہ بھی ثقہ ہیں۔ (تقریب) اس حدیث کی سند ان شاء اللہ بے غبار ہے۔

متن الحدیث : اس حدیث میں جناب سیدالمرسلین ﷺ عمومی حکم بیان فرماتے ہیں' کہ وتر رات کی نماز کی آخری رکعت ہے۔ سیاق حدیث کا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے' کہ حکم عام ہے۔ یعنی آپ ﷺ کی ذات مقدسہ بھی اس میں داخل ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ علما لا صلوة بعد العصر کے متعلق فرماتے ہیں' کہ اس حکم میں آپ ﷺ کی ذات مبارکہ بھی داخل ہے' اس لیے آپ کا فعل (یعنی عصر کے بعد دو رکعت پڑھنا) اس سے متعارض ہے' اس لیے یا تو اس کی نہی کو تنزیہ پر محمول کیا جاتا ہے' یا فعل کو متاخر ہونے کی وجہ سے اس نہی سے مخصوص مانا جاتا ہے۔ (انظر حصول المامول) ہر نوع جب ایسے قول کہ جس میں آپ ﷺ کی ذات گرامی داخل نہ ہو۔ (جیسا کہ نهی عن الشرب قائما) میں ہے اور فعل متعارض میں بھی محققین جمع کا طریقہ ہی اختیار کرتے ہیں' تو پھر اس صورت میں کہ قول میں آپ ﷺ کی ذات والا بھی شامل ہو اور فعل اس سے بظاہر متعارض ہو تو

وہاں تو بطریق اولی جمع ہی مناسب ہے۔ باقی رہا جمع' تو ایک تو صورت اس کی وہ ہے جو امام نووی وغیرہ نے اختیار کی ہے اور ایک وہ ہے' جو یہ بندہ ناچیز راقم الحروف پہلے مضمون میں عرض کر چکا ہے۔ ان میں کوئی صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے' باقی اس فعل کو بدعت قرار دینا' یا جو ان کو مسنون سمجھ کر پڑھتا ہے' اس کو بدعتیوں کے زمرہ میں شامل کرنا قطعاً ساقط عن الاعتبار ہے۔

هذا ما عندي والعلم عندالله العلام وهو اعلم بالصواب۔ وصلى الله على خير خلقه سيدنا و مرشدنا محمد واله واصحابه اجمعين۔

سید محب اللہ

ہفت روزہ الاسلام لاہور

جلد ۱' شمارہ ۱۲ تا ۲۹' مورخہ از ۲۳ مئی تا ۱۹ ستمبر سنہ ۱۹۷۵ء

ہر فرض نماز اور وتروں کے بعد دو دو نفل بیٹھ کر پڑھنا بدعت ہے

سندھی تعاقب پر ایک نظر

ناظرین کرام! الاعتصام کی کسی گزشتہ اشاعت میں راقم الحروف عارف نے یہ مسئلہ واضح کیا تھا کہ وتروں کے بعد جو دو نفل بیٹھ کر پڑھے جاتے ہیں' لوگ ان کو اس طرح پڑھنا سنت اور مشروع سمجھتے ہیں۔ یہ بدعت ہے۔ وتر کے بعد عشاء کے وقت دو نفل بیٹھ کر پڑھنا کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ میرے اس مسئلہ پر مولانا سید محب اللہ شاہ پیر آف جھنڈا نے الاعتصام مطبوعہ ۱۳ ستمبر سنہ ۱۹۶۸ء اور ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۶۸ء میں تعاقب فرمایا جو دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ اس میں میرے بیان کردہ مسئلہ پر انکار کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وتروں کے بعد ہمیشہ دو نفل بیٹھ کر پڑھنا سنت ہے اور یہ دو نفل وتروں کے ساتھ لازم ہیں۔ جب بھی وتر پڑھے جائیں گے' یہ دو نفل ان کے ساتھ پڑھنے پڑیں گے۔ یہ دعویٰ سراسر باطل اور خلاف دلائل شرعیہ ہے۔

شاہ صاحب نے پورے مضمون میں اپنے دعویٰ پر کوئی صریح حدیث پیش نہیں کی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ عشاء کے وقت فرضوں کے بعد وتر پڑھے جائیں تو اس کے بعد دو نفل پڑھنے چاہئیں۔ جو دلائل پیش کئے ہیں اس سے تو اول روایتہ درایتہ استدلال صحیح نہیں۔ دوم ان میں عشاء کے وقت وتروں کے بعد دو نفل پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ صرف عموم اور اطلاق ہے۔ جس سے دعویٰ خاص پر دلیل لینا جائز نہیں کیونکہ' وتروں کے بعد ان دو نفلوں کا ذکر تہجد کے وقت کا ہے' جیسا کہ دوسری احادیث میں اس کی وضاحت پائی جاتی ہے تو اس عام کو خاص پر مبنی کیا جائے گا' جب کہ دوسرے وقت میں ان نفلوں کے پڑھنے کا ثبوت نہ ہو گا۔ عموم سے اس وقت دلیل لی جاتی ہے جب اس بارے میں دلیل خاص موجود نہ ہو۔ چنانچہ فتاویٰ نذیریہ ج۔ ۲' ص۔ ۳۴ میں بحوالہ فتح الباری لکھا ہے :ان حکم الشئی الخاص الذی لم یذکر فیہ نص داخل تحت حکم دلیل آخر بطریق العموم۔ "یعنی شے خاص کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں کوئی نص وارد نہ ہو تو پھر وہ دلیل عام کے تحت داخل ہوتی ہے۔"

اس اصول کی رو سے وتروں کے بعد کے نفلوں پر غور کیا جائے تو اس بارے میں خاص نص وارد ہو چکی ہے' وہ یہ ہے کہ ان نفلوں کو آنحضرت ﷺ تہجد کے وقت کبھی کبھی جب گیارہ رکعت سے کم نماز ہوتی تو اس حثیت سے بیٹھ کر نماز شروع کرتے' جب وہ ختم کر لیتے تو پھر کھڑے ہو جاتے اور رکوع کرتے۔ یہ جلوس اور قیام سے مرکب نماز ہے۔ جہاں مجمل ذکر ہے کہ آنحضور ﷺ ان کو بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ وہ اس مفصل بیان پر محمول ہے۔ پس عشاء کے بعد وتر پڑھ کر ان نفلوں کو بیٹھ کر پڑھنے کا ثبوت نہیں ہے۔ نماز تہجد کے ساتھ ملحقہ نفلوں پر عشاء کے وتروں کے بعد نفل پڑھنے کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے اور عبادات میں قیاس چلنے کی ضرورت نہیں ہے' اس میں نقل کی ضرورت ہے۔ مولانا بدیع الدین شاہ صاحب پیر آف جھنڈا (سندھی) بھی اس اصولی غلطی سے خطا میں پڑ کر رکوع کے بعد قیام کو قرات کے قیام پر قیاس کر کے اس میں رفع الیدین کے قائل ہو گئے ہیں' حالانکہ رفع الیدین اسی قیام سے مخصوص ہے جو رکوع سے پہلے قرات کے لئے ہے۔

اصل مسئلہ کی تحقیق پر غور کرنے سے قبل چند قواعد اور بدعت کی تعریف کا جاننا ضروری ہے۔ جس سے پیر آف جھنڈا ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو خصوصیت سے ان قواعد کے پیش نظر مسئلہ مابہ النزاع پر بحث کرنی چاہئے تاکہ وہ غلط فہمی سے بچ سکیں۔

(۱) صحیحین کی احادیث قطعی الثبوت ہیں ان کی صحت پر محدثین کا اجماع ہے۔ ان کی حدیث جو مجمع الصحہ ہو گی وہ سب احادیث پر جو غیر صحیحین کی ہیں مقدم ہو گی۔ صحیحین اور موطا امام مالک طبقہ اولیٰ کی کتابیں ہیں اور دیگر کتب یا احادیث طبقہ ثانیہ' ثالثہ یا رابعہ وغیرہ کی ہیں۔ طبقہ اولیٰ کی حدیثیں دیگر طبقوں کی اولیات پر مقدم رکھی جاتی ہیں۔ یہ اصول ترجیح حدیثوں کے تعارض کے وقت استعمال ہوتا ہے۔ نخبۃ الفکر' تدریب الراوی وغیرہ ملاحظہ کریں۔

(۲) قولی حدیث فعلی حدیث پر تعارض کے وقت مقدم ہوتی ہے' کیونکہ فعلی میں نبی اکرم ﷺ کے خاصہ کا احتمال ہوتا ہے۔ قولی حدیث میں امت کو خطاب ہوتا ہے اگر فعلی اس قولی کے خلاف وارد ہو اور قرآن سے خصوصیت ظاہر ہوتی ہو تو فعلی حدیث کو خاصہ نبوی تصور کیا جائے گا۔ جیسے آنحضور ﷺ کے فعل سے چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا ثابت ہے کہ ایک وقت نو بیویاں موجود تھیں اور امت کو حکم ہے کہ دو' تین' چار تک نکاح کریں چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح حرام ہے اور فعلی حدیث سے روزہ میں وصال ثابت ہے' تو اس مسئلہ میں قولی پر عمل ہو گا اور فعلی حدیث کو خاصہ نبوی ﷺ پر محمول کیا جائے گا۔

ٹھیک اسی طرح بیٹھ کر نفل نماز پڑھنے سے پورا ثواب ملنا جس طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کو ملتا ہے یہ خاصہ نبوی ہے' اگر امت میں سے کوئی شخص بیٹھ کر نفل پڑھے گا تو اس کو آدھا ثواب ملے گا۔ مثلاً دو نفل پڑھے گا تو ایک رکعت نفل کا ثواب ملے گا اور اگر چار پڑھے گا تو دو نفل کا ثواب پائے گا۔ آنحضور ﷺ کے بیٹھ کر پڑھنے سے پورے ثواب پر دلیل نہ لی جائے گی۔

(۳) اگر کسی کام میں کوئی حدیث مجمل آتی ہو اور دوسری اسی کام میں مفصل ہو تو مجمل کو مفصل سے ملا کر مسئلہ اخذ کیا جائے گا۔ دونوں کو الگ الگ کر کے مطلب نہیں لیا جائے گا۔ مثلاً قرآن میں ایک جگہ مطلق خون کی حرمت کا ذکر ہے۔ جس میں ہر خون خواہ کلیجے کا ہو یا تلی کا سب کو شامل کیا ہے اور دوسری آیت میں دم مسفوح کا ذکر ہے تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ بعض احادیث میں مطلق ذکر ہے کہ گھوڑے کے دموں کی طرح ہاتھوں کو نہ اٹھاؤ اور بعض میں سلام پھیرنے کے وقت ہاتھوں کو گھوڑے کے دموں کی طرح اٹھانے کا ذکر ہے تو یہ مطلق مقید پر محمول ہو گا۔

(۴) کسی مسئلہ میں کوئی حدیث صحیح وارد ہو اور اس کے خلاف ضعیف روایت ایک دو وارد ہوں' تو صحیح روایت ضعیف روایت پر خواہ وہ کئی ہوں مقدم ہے۔ مثلاً ضعیف روایتوں سے رکوع میں جانے سے رکعت کا شمار کرنا ثابت ہے اور صحیح حدیث میں بھی یہ آیا ہے کہ لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب اور لا صلوۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب۔ "یعنی سورہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہے اور جو شخص امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز صحیح نہ ہو گی" اور صحیح حدیث میں ہے : ما فاتکم فاتموا اور فاقض ما سبق یعنی جو چیز فوت ہو جائے اس کو پورا کرو اور قضائی دو' ان صحیح دلیلوں کے مقابلہ میں رکوع کے متعلقہ ضعیف روایتیں ہرگز نہ لی جائیں گی۔

کسی فعل نبی کو جو خاصہ پر محمول ہو امت کے لئے سنت قرار نہ دیا جائے گا' کیونکہ وہ آنحضور ﷺ سے مخصوص ہے۔

(۵) سنت کی تعریف یہ ہے : والسنۃ ما واظب علیہ بنفسہ (فتح القدیر) "یعنی سنت وہ کام ہے جس پر خود نبی کریم ﷺ نے ہمیشگی کی ہو" اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو قبل از نماز مغرب نفل پڑھنے کے بارے میں وارد ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا مغرب کی نماز فرضی سے پہلے دو رکعت پڑھو یہ دوبارہ فرما کر تیسری مرتبہ فرمایا کہ جو شخص پڑھنا چاہے پڑھ لے' یہ ارشاد اس لئے فرمایا کہ لوگ اس کو سنت نہ سمجھ لیں۔ جمع الفوائد میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پیشاب کیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وضو کے لئے پانی پیش کیا' تو تب آپ ﷺ نے فرمایا : ما امرت کلما بلت ان اتوضا ولو فعلت لکانت سنۃ "یعنی یہ مجھے حکم نہیں کیا گیا کہ جب پیشاب کروں تو اس وقت وضو کروں' اگر میں ہمیشہ اسی طرح عمل کرتا کہ جب میں پیشاب کرتا اور بعد میں وضو کرتا' تو کام سنت ہو جاتا۔"

ان احادیث سے یہ ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کبھی کوئی کام محض جواز کے طور پر کریں تو سنت قرار نہیں پاتا۔ سنت وہی ہے جس کو آپ نے ہمیشہ کیا ہو' جیسے رفع الیدین' اس فعل کے سنت ہونے میں شرط یہ ہے کہ وہ خاصہ نبوی نہ ہو اور اگر وہ خاصہ ہوا تو نبی کریم ﷺ سے ہی مخصوص ہو گا' سنت قرار نہیں دیا جائے گا۔

(۶) سنت کے مقابلہ میں بدعت ہے۔ مندرجہ ذیل احادیث سے ان کی تعریف سمجھی جاتی ہے۔ احادیث کتب "ترغیب و ترہیب" کی ہیں۔ پہلی حدیث یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے

فرمایا : من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد۔ ”جس شخص نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات پیدا کی وہ مردود ہے۔“

تیسری حدیث : من عمل عملا لیس علیه امرنا فهو رد۔ ”جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا حکم نہ تھا وہ مردود ہے۔“

چوتھی حدیث : ایاکم والمحدثات فان کل محدثة ضلالة ”دین میں نئے کام نکالنے اور کرنے سے بچو' کیونکہ ہر نیا کام گمراہی ہے۔“ آنحضرت ﷺ عموماً ہر خطبہ میں یہ فرمایا کرتے تھے۔ وشر الامور محدثاتها ”تمام کاموں میں بدترین کام وہ ہیں جو دین میں نئے پیدا کئے ہوں گے۔“

ان حدیثوں سے بدعت کی تعریف یوں مستفاد ہوئی کہ جو کام دین میں نیا ہو اور اس پر کوئی دلیل شرعی نہ ہو وہ بدعت اور مردود ہے۔ نیا کام ہونا دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اس چیز کا وجود ہی شرح محمدی میں نہ ہو۔ جیسے پیران پیر کی گیارہویں' میلاد مروجہ اور وظیفہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئا للہ تصور شیخ اور غیراللہ کے نعرے وغیرہ۔ وہ بدعات جن کا وجود ہی شرع میں نہیں ہے۔ ان چیزوں کو بنی اسرائیل کی طرح محض ہیر پھیر سے ایجاد کیا جاتا ہے جو مردود ہے۔ اس قسم کا نام بدعت حقیقی ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ اس چیز کا وجود تو شرع سے ثابت ہے۔ مگر اس کو ایسی ہیئت کذائیہ ـــــ صورت مخصوصہ سے مقصود شرعی سمجھ کر کیا جاتا ہے جو شرع سے ثابت نہیں ہے۔ مثلاً صلوة رغائب' قضاء عمری' نماز ظہر' احتیاطی' جمعرات' شب برات وغیرہ کی خیرات وصدقہ' گھروں میں فاتحہ خوانی' اذان کے بعد کلمہ اور اذان سے پہلے صلوة وسلام اور قبر پر اذان دینا' نماز سے پہلے زبانی نیت کرنا' نماز تسبیح کی جماعت کرنا کرانا' بیس تراویح سنت نبوی اور سنت خلفاء راشدین جان کر پڑھنا' ہمیشہ ننگے پاؤں ہو کر نماز پڑھنا' پگڑی یا ٹوپی وغیرہ سے سر ڈھانپ کر نماز پڑھنے کو ضروری جاننا' کھانے پر ختم پڑھنا اور نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنا اور ہر نماز کے بعد بحالت اجتماعی امام اور مقتدیوں کا ہاتھ اٹھا کر ہمیشہ دعا مانگنا' نماز فرض کے علاوہ سنتیں پڑھ کر دعا مانگنا اور نماز کے بعد تین بار ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا' اجتماعی صورت سے قرآن خوانی کرنا' چنوں پر کلمہ پڑھ کر میت کو ایصال ثواب کرنا اور ظہر' مغرب' عشاء اور وتروں کے بعد دو دو نفل ہمیشہ بیٹھ کر پڑھنا اور اس کو حکم شرعی سمجھنا وغیرہ بدعات میں شمار ہیں اور ان

کو بدعات حکمیہ کہتے ہیں اور یہ دین میں تشریع شرع جدید ہے۔ اسی طرح ہر شہر میں تعدد جمعہ اور جمعہ کے دن تین خطبے اور ہر مسجد جامع میں دو دو اذانیں بدعات حکمیہ میں داخل ہیں' جو سراسر گمراہی ہے۔ تمام اہلسنت پر واجب ہے کہ ان بدعات سے بچیں۔

(۷) احکام شرعیہ کے ثبوت میں کسی حدیث ضعیف سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ محدثین نے اصول حدیث میں یہ صراحت کر دی ہے کہ ضعیف حدیث' احکام حرام' حلال' واجب' سنت وغیرہ میں حجت نہیں ہے۔ امام نووی نے اس پر اجماع لکھا ہے۔ ہاں جس حدیث پر علماء اور محدثین کا اجماع پایا گیا ہو' وہ حجت ہے' کیونکہ اجماع سے اس ضعیف روایت میں قوت آجاتی ہے اور اجماع امت خود حجت ہے۔

پس یہ سات قواعد مسئلہ مابہ النزاع میں ہفت افلاک کا حکم رکھتے ہیں۔ براق عظیم پر سوار ہو کر ان ہفت افلاک کو صحیح وسالم رہ کر عبور کرنے والا مقصود عرش پر پہنچ کر حق سے ملاق ہو گا اور جو کسی فلک سے پھسل گیا' وہ اسفل السافلین میں گر کر ہلاک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ایسی لغزش سے سب کو بچائے اور صحیح اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

آمدم برسر مطلب : راقم الحروف کا مسلک یہ ہے کہ علی الاطلاق فرائض کے سوا' نفل نماز خواہ نماز تہجد ہو یا سنن موکدہ' نوافل ہوں یا وتر ان کو بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے' چنانچہ اس پر یہ حدیث ناطق ہے۔ مشکوۃ باب القصد فی العمل میں ہے۔ آنحضرت ﷺ سے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ کوئی شخص بیٹھ کر نماز پڑھے تو کیا حکم ہے؟ تو فرمایا : ان صلی قائما فھوا فضل ومن صلی قاعداً له نصف اجر القائم ومن صلی علی جنب فله نصف القاعد۔ (رواہ بخاری) ''جس شخص نے نماز پڑھی کھڑے ہو کر تو یہ افضل ہے کہ پورا ثواب ملے گا اور جس نے نماز پڑھی بیٹھ کر اس کو قائم کی نسبت آدھا ثواب ملے گا اور جس نے پڑھی لیٹ کر اس کو بیٹھنے والے کی نسبت آدھا ثواب ملے گا۔'' اس سے ظاہر ہے کہ اگر کھڑے ہو کر نوافل پڑھے گا اس کو پورا ثواب ہے اور جو بیٹھ کر نفل پڑھتے ہیں ان کو آدھا ثواب ہے۔ جیسے کوئی لیٹ کر پڑھے تو اس کو بیٹھنے والے کا نصف ثواب ہے۔

حدیث بخاری یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : صل قائما فان لم تستطع فقاعداً وان لم تستطع فعلی جنب۔ ''یعنی نماز کھڑے ہو کر پڑھو۔ پس اگر کھڑے ہونے کی طاقت

نہ ہو' تو پھر بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ کر نہ پڑھ سکو تو پھر پہلو پر لیٹ کر پڑھ لو۔" اس سے ظاہر ہے کہ جب کھڑے ہو کر آسانی سے پڑھ سکتا ہے' تو پھر بیٹھ کر پڑھنا اپنی نماز کو ناقص کرتا ہے۔ باقی رہا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے بیٹھ کر کیوں پڑھی؟ اس کے دو جواب ہیں۔ اول یہ کہ آنحضرت ﷺ آخری عمر میں جسیم ہو گئے تھے اور قرات طویل کرتے تھے' اس لئے بیٹھ کر بایں طور پڑھتے تھے کہ جب کچھ قرات باقی رہ جاتی تو کھڑے ہو کر پوری کر کے پھر رکوع کیا کرتے تھے۔

مشکوٰۃ میں ہے: عن عائشة رضی اللّٰہ تعالٰی عنها قالت لما بدن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وثقل کان اکثر صلوته جالسا۔ (متفق علیه) "یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ جسیم اور بوجھل ہو گئے تو اکثر بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔" دوسری حدیث میں یوں تفصیل ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ آخری عمر میں نماز پڑھتے ہوئے (رات میں) پس پڑھتے قرآن بیٹھے ہوئے۔ پس جس وقت کہ باقی رہتا قدر تیس یا چالیس آیات کے کھڑے ہوتے پھر رکوع کرتے اور سجدہ کرتے۔ پھر کرتے دوسری رکعت میں اس طرح۔ (رواہ مسلم)

پس اگر کوئی شخص بڑھاپے میں ہو تو وہ اس طرح نماز پڑھ لیا کرے' اگر بغیر عذر کے کوئی شخص نماز بیٹھ کر پڑھے گا تو اگر فرض نماز ہو تو وہ صحیح اور قبول نہ ہو گی اور اگر نفلی نماز ہے تو اس کا آدھا ثواب ملے گا۔ دو رکعت پڑھنے پر ایک رکعت کا ثواب حاصل ہو گا اور اگر دیگر سنن اور نوافل ہوں تو کھڑا ہو کر پڑھے اور اگر صرف دو دو نفل ظہر' مغرب' عشاء اور وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھنے مقرر کر لے اور اس حکم کو حکم شرعی تصور کرے کہ ان دو نفلوں کو بیٹھ کر پڑھنے کا ہی حکم ہے اور اس طرح پڑھنے کا ثواب پورا سمجھے تو بدعت ہے' کیونکہ یہ تقرری اور کامل ثواب شرع سے ثابت نہیں ہے' جو شخص اہلحدیث یا حنفی عالم اس عقیدہ سے اس طرح پڑھنے کا ثبوت کسی دلیل صحیح سے پیش کر دے تو اس کو مبلغ سو روپے بطور انعام پیش کیا جائے گا' واللہ علی ما اقول وکیل' عبدالقادر عارف حصاری بقلم خود

یہ بدعت عقیدہ اور تعین اور تخصیص سے پیدا ہوئی ہے۔ مطلق کو جب مقید کر کے مقصود شرعی بنا لیا جائے تو وہ بدعت میں شمار ہوتا ہے۔ جیسا نمبر۶ کے قاعدہ میں ذکر ہوا کہ کسی شرعی کام کی حیثیت بدلنے سے وہ کام بدعت ہو جاتا ہے' چونکہ مطلق کو مقید کرنے

سے حکم شرعی کی حیثیت تبدیل ہو گئی تو یہ بدعت میں داخل ہوا۔ مثلاً مسجد میں جس جگہ کوئی چاہے نماز پڑھ لے' لیکن اگر مسجد کے کسی مقام یا گوشہ کو مخصوص کرے گا تو یہ بدعت ہے۔ جیسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نماز میں سلام کے بعد جناب رسول اللہ کو بائیں طرف پھرتے دیکھا ہے جو شخص ہمیشہ دائیں طرف پھر جائے اس نے بھی اپنی نماز میں شیطان کا حصہ ٹھہرا لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیر کر دائیں طرف سے بھی پھر جاتے اور بائیں طرف سے بھی' لیکن جس نے بائیں طرف کا عمل ترک کر دیا اور ہمیشہ دائیں طرف پھرنے لگا تو یہ صرف مقصود شرعی ہو گا۔ پس یہ بدعت ہے۔ اسی طرح ظہر' مغرب' عشاء' وتر کے بعد نفلوں کو بیٹھ کر ہمیشہ پڑھنا بدعت ہے' ورنہ ثبوت لازم ہے۔ دوسرا جواب اس بات کا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفل بیٹھ کر پڑھے ہیں یہ ہے کہ یہ آپ کا خاصہ تھا کہ آپ کسی نفلی نماز کو بیٹھ کر پڑھتے تو اس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا ثواب ملتا تھا۔ پس آپ کی خاصانہ نماز کو قیاس کر کے امت کے لوگوں کو یہ حکم دینا کہ تم بھی نوافل بیٹھ کر پڑھ لیا کرو یہ بدعت ہے۔ خصوصاً وتروں کے بعد دو نفل ضرور بیٹھ کر پڑھو کہ ثواب پورا ملے گا' یہ مذہب باطل اور قول فاسد ہے اور یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے۔ جیسا کہ قاعدہ نمبر۔۵ میں یہ حکم بیان ہو چکا ہے کہ خاصہ نبوی میں پیروی جائز نہیں ہے۔

خاصہ کی تعریف بھی علماء نے یہ کی ہے: الخاصة ما يوجد في شئي ولا يوجد في غيره "یعنی خاصہ اس چیز کو کہتے ہیں کہ وہ کسی ایک چیز میں پایا جائے اور اس کے سوا کسی دوسری چیز میں نہ پایا جائے۔" مثلاً حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد پڑھتے پڑھتے سو جاتے اور خراٹے لینے لگتے پھر جب بیدار ہوتے تو نماز پڑھنی شروع کر دیتے' حالانکہ لیٹ کر سونے سے وضو فاسد ہو جاتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا وضو فاسد نہیں ہوتا کہ میری صرف آنکھیں سوتیں ہیں اور دل بیدار ہوتا ہے۔ ٹھیک اس طرح بیٹھ کر نوافل پڑھنا اور ان کا ثواب پورا ملنا یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔

چنانچہ اس کی دلیل یہ حدیث ہے' جو کہ مشکوۃ کے باب قصد فی العمل' فصل ثالث میں ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ مجھے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: صلوة الرجل قاعدا نصف الصلوة "جو شخص بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے اس کی نصف نماز ہے۔" تب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ میں

نے دیکھا کہ آنجناب ﷺ بیٹھے ہوئے نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک پر رکھ کر یہ عرض کیا کہ حضور مجھے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے: صلوۃ الرجل قاعدا علی نصف الصلوۃ "کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی آدھی نماز ہے۔" اور آنجناب ﷺ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں' یہ کیا بات ہے؟

آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں حکم تو اسی طرح ہے: ولکنی لست کاحد منکم (رواہ مسلم) "یعنی لیکن میں تمہارے جیسا نہیں ہوں۔" (یعنی نبی ہوں اور یہ میرا خاصہ ہے۔) یعنی مجھے پوری نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ بیٹھ کر نماز پڑھنا آنحضرت ﷺ کا خاصہ تھا۔ جیسے روزہ وصال رکھنا آپ ﷺ کا خاصہ تھا۔ اس پر سوال ہوا تو آپ نے بھی ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے جیسا نہیں مجھے اللہ تعالیٰ کھلاتا پلاتا ہے۔ پس خاصہ میں آنحضور ﷺ کی ریس کرنا اور آپ کی سنت سمجھ کر عمل کرنا حماقت ہے۔ یہ کیا سنت ہوئی کہ ثواب پورے سے آدھا ہو گیا۔

الغرض خاصہ کو سنت سمجھ کر اتباع کرنا سراسر جہالت ہے۔ جیسے آج کل لوگ معجزات غوثیہ میں کسی معجزہ کو بیان کر کے ختم پڑھنا جائز کر رہے ہیں جو سراسر باطل ہے۔

عشاء کے وتروں کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھنے پر بحث: نماز عشاء کے بعد جو وتر پڑھے جاتے ہیں' ان سے پہلے دو نفل کھڑے ہو کر پڑھنے درست ہیں۔ لیکن وتروں کے بعد جو دو نفل بیٹھ کر پڑھنے کا حنفیہ اور بعض اہلحدیثوں میں رواج ہے۔ یہ بدعت ہے' کیونکہ ان کو اس طرح ہمیشہ پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور یہاں اس پر کئی طرح سے بحث ہے' کیونکہ اس مسئلہ کی تحقیق میں مندرجہ ذیل امور تنقیح طلب ہیں۔

(۱) نماز وتر کے بعد کوئی نماز ہے؟

(۲) کیا نماز عشاء کے بعد جو وتر پڑھے جاتے ہیں ان کے بعد آنحضور ﷺ نے دو نفل بیٹھ کر پڑھے تھے؟

(۳) کیا یہ دو نفل وتروں کے ساتھ ہمیشہ لازم ہیں؟

(۴) کیا ان کو بیٹھ کر پڑھنا سنت ہے اور اس سنت سے ثواب پورا ملتا ہے؟

(۵) ان نفلوں کے بیٹھ کر پڑھنے کی کیفیت کیا ہے؟

(۶) کیا آنحضور ﷺ کے بعد ان نفلوں کو بیٹھ کر پڑھنے کا تعامل خلفاء یا دیگر صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم میں پایا گیا ہے؟

وتر رات کے نوافل میں آخری نماز ہے: مشکوٰۃ جلد اول باب الوتر میں حدیث ہے: عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہما عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اجعلوا اخر صلوتکم باللیل وترا۔ (رواہ مسلم) "ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا' آخری نماز وتر بناؤ۔" یعنی اس کو طاق رکھو اور اس سے پہلے دوگانہ ہے۔ یہ امت کو خطاب اور حکم ہے کہ وہ رات کو نفلی نماز کے آخری حصہ کو وتر رکھیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ وتروں کے بعد کوئی نماز نہیں۔ اگر وتر پڑھو گے تو دوبارہ وتر پڑھنے منع ہیں۔ اگر دوگانہ پڑھو گے تو آخری نماز وتر نہ رہے گی اور خلاف سنت ہو گا۔ مسند احمد باب الوتر میں یوں مروی ہے: عن ابن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ انہ کان یقول من صلی باللیل فلیجعل اخر صلوتہ وترا فان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم امر بذالک۔ "عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جو شخص رات کو نفل نماز پڑھے' وہ اپنی نماز کے آخری حصہ کو وتر بنا دے۔ اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے اس طرح کا حکم فرمایا ہے۔" اس روایت کے راوی صحابیؓ کا فتویٰ بھی ظاہر ہوا اور اس پر اس کا علم مرفوع پیش کرنا بھی اس امر کا مثبت ہے کہ رات کی نماز کا آخری حصہ وتر بنانا ضروری ہے۔ اس حدیث کو امام حاکم نے بھی لفظ "امر" سے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے حاکم کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔ (شرح فتح الربانی ج۔۴' ص۔۲۸۲)

مشکوٰۃ باب الوتر میں نافع نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ میں ابن عمرؓ کے ساتھ مکہ میں تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ حضرت ابن عمرؓ نے صبح ہونے کے خوف سے ایک رکعت نماز وتر پڑھی' اس کے بعد ابر کھل گیا' تو معلوم ہوا کہ ابھی رات باقی ہے' تو حضرت ابن عمرؓ نے ایک اور رکعت پڑھ کر دوگانہ بنا لیا۔ بعد میں دو دو رکعتیں پڑھتے رہے' پھر جب صبح کا وقت قریب ہوا تو ایک رکعت وتر پڑھ لیا۔ (رواہ مالک)

اس روایت سے حدیث کے راوی کا یہ عمل بھی واضح ہو گیا کہ وتر آخر میں پڑھنا ضروری ہے اور وتر کے بعد کوئی نماز نہیں ہے۔ اگر وتر کے بعد نماز پڑھنی جائز ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو مراد حدیث سے خود واقف تھے سابقہ وتر کی شکل نہ بدلتے اور نوافل شروع کر کے آخر میں وتر نہ پڑھتے' کیونکہ ایک رات میں دو بار وتر پڑھنا منع

ہے۔ پہلے جو وتر پڑھا اس کے ساتھ ایک رکعت اور پڑھ کر اس کو دوگانہ کر دیا۔ اب وہ وتر نہ رہا۔ وتر پھر آخر نماز کے بعد پڑھا۔

دوسری روایت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے کہ اگر عشاء کے وقت وہ وتر پڑھ لیتے اور پھر نماز تہجد کے وقت بیدار ہو کر قیام اللیل کرتے تو ایک رکعت اور پڑھ کر سابقہ رکعت سے ملا کر دوگانہ کر لیتے اور پھر دو دو رکعت پڑھتے جاتے اور آخر میں دوبارہ ایک رکعت پڑھ کر آخر نماز کو وتر بنا لیتے۔ یہ تکلف اس لئے کرتے کہ' حسب حکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد کوئی نماز نہیں ہے اور وتر نفلوں کے آخر میں ایک رکعت ہی پڑھنی چاہیے۔ اس کے بعد رات کی نماز یعنی تہجد ختم ہے۔ پھر صبح تک کوئی نماز نہیں' اگر کوئی پڑھے گا تو وہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کرے گا۔

بعض لوگ وتروں کے بعد نفل پڑھنے پر ان حدیثوں سے دلیل لیتے ہیں' جن میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتروں کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصول حدیث میں یہ قانون مقرر ہو چکا ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل قول کے معارض ہو' تو قول امت کے ساتھ خاص ہو گا اور فعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ قرار پائے گا۔

چنانچہ تنقیح الرواۃ جلد اول' ص۔۲۳۲ میں ہے : قد تقرر فی الاصول ان فعلہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یعارض القول الخاص بالامۃ فتکون الاحادیث التی فیھا الامر للامۃ بان یجعلوا اٰخر صلوۃ اللیل وترا مختصۃ بالامۃ وفعلہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یعارض ذالک۔ "یعنی علم اصول میں یہ قاعدہ مقرر ہو چکا ہے کہ فعل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس قول کے معارض نہیں ہوتا جو امت کے ساتھ خاص ہو۔ پس جن احادیث میں امت کو حکم ہے کہ وہ رات کی نماز کے آخر کو وتر کریں وہ امت کے ساتھ مختص ہیں۔ امت کو اس پر عمل کرنا چاہیے اور فعل نبوی ان حدیثوں کے معارض نہیں ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔" چنانچہ ہم نے قاعدہ نمبر۔۲ میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ علاوہ ازیں عشاء کے بعد وتر پڑھنے کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جس قدر فعلی حدیثیں وارد ہیں ان میں تہجد کے وقت کبھی کبھی دو رکعت وتر کے بعد پڑھنے کا ذکر ہے۔ جو عشاء کے وقت وتر کے بعد بیٹھ کر ہمیشہ پڑھے جاتے ہیں' یہ بدعت ہیں۔ عشاء کے وقت اس طرح نفل پڑھنے فعل نبوی کے بھی خلاف ہیں۔

مفتی الاعتصام مولانا حافظ محمد گوندلوی مدظلہ نے عشاء کے وقت ان نفلوں کے پڑھنے کو جائز لکھا ہے' مگر اس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ صرف مشکوٰۃ کا حوالہ دے دیا ہے کہ اس میں حدیث ہے۔ لیکن تمام مشکوٰۃ کو چھان مارو' اس میں عشاء کے وتروں کے بعد نفل پڑھنے کی کوئی حدیث نہیں ہے۔ البتہ ایک روایت حضرت ثوبان کی ہے۔ جس کے سمجھنے میں کئی علماء وفضلاء غلطی کر گئے ہیں اور کر رہے ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے : عن ثوبان عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ان ھذا السحر جھد وثقل فاذا اوتر احدکم فلیرکع رکعتین فان کان من اللیل والا کانتا لہ۔ (رواہ ترمذی والداری) "ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے' تحقیق یہ بیداری رات کی مشکل اور بھاری ہے' پس جب کوئی تمہارا وتر پڑھے تو چاہئے کہ پڑھے دو رکعتیں' اگر اٹھا رات کو تو بہتر ورنہ یہ دو رکعتیں اس کے لئے کافی ہو جائیں گی۔" اس حدیث کے تین جواب ہیں۔

(ا) اول یہ کہ اس کی اسناد مخدوش ہیں۔ تنقیح الرواۃ میں اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے : فی اسنادہ عبداللّٰہ ابن صالح کاتب اللیث ضعفہ بعضھم۔ اس کی اسناد میں عبداللہ بن صالح' لیث کا منشی وارد ہے۔ اس کو بعض ائمہ نے ضعیف کہا ہے۔ کثیر الغلط فی کتابہ وکانت فیہ غفلۃ۔ "یعنی عبداللہ بن صالح راوی بہت غلطیاں کرنے والا تھا۔" اس کی کتاب تھی جس میں غفلت پائی گئی ہے اور میزان الاعتدال میں عبداللہ بن صالح کا ذکر ہے۔ اس کی کتاب اور بعض روایات کا ذکر کیا تو یہ لکھا ہے : وقد اخطأہ بعض الحفاظ "یعنی بعض حفاظ نے اس کو مخطی کہا ہے۔"

مرعاۃ المفاتیح جلد دوم' ص۔۲۱۹ میں اس حدیث پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے : وفی سندہ الثلاثۃ عبداللّٰہ صالح کاتب اللیث ابن سعد وفیہ کلام۔ "اس حدیث کی تینوں سندوں میں جس کو تین اماموں نے روایت کیا ہے عبداللہ بن صالح کاتب اللیث واقع ہے' جس میں کلام کی گئی ہے۔" اس سے ظاہر ہوا کہ یہ مخدوش ہے اور حدیث ابن عمر جو قولی ہے وہ مجمع الصحت ہے' جس کا ثبوت یقینی ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ حجت نہیں ہو سکتی۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ سفر کا ہے۔ چنانچہ اس حدیث میں جس کو بیہقی وطبرانی نے روایت کیا ہے : عن ثوبان قال کنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی سفر فقال ان السفر جھد وثقل۔ (الحدیث) "ثوبان سے روایت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ سفر میں تھے' اس وقت آپ نے فرمایا کہ سفر میں مشقت اور بوجھ ہے۔" پس یہ واقعہ سفر کا ہے۔ اس پر حضر کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فرمان فاذا اوتر احدکم فلیرکع رکعتین کے مطلب میں دو احتمال ہیں۔ جیسا کہ مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ میں لکھا ہے: قال البیھقی یحتمل ان المراد به رکعتان بعدالوتر ویحتمل ان یکون اذا ارادن یوتر فلیرکع رکعتین قبل الوتر۔ یعنی امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ وتر کے بعد دو رکعت پڑھے' دوسرا یہ کہ جب وتر پڑھنے کا ارادہ کرے تو اس سے پہلے دو نفل پڑھے۔ اور ابن حجر سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ھذا لاینا فی خبرا جعلوا اخر صلوتکم باللیل وترا اما لان اوتر ھنا بمعنی اراد ای اذا اراد ان یوتر فلیرکع رکعتین فلیوتر ای بواحدۃ او بثلاث فیکون الرکعتان قبل الوتر نافلۃ قائمۃ مقام التھجد۔ یعنی "ثوبان کی یہ حدیث اس حدیث کے منافی نہیں ہے' جس میں یہ وارد ہے کہ رات کی نماز کے آخر میں وتر بناؤ' کیونکہ یہاں "اوتر" کا معنی یہ ہے کہ جب وتر پڑھنے کا ارادہ کرے تو دو رکعت پڑھے اور پھر ایک رکعت پڑھے' تو یہ دو رکعت تہجد کے قائم مقام ہو جائیں گی۔" میرے نزدیک یہی مطلب اقرب الی الصواب ہے' کیونکہ اس مراد سے دونوں احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما چونکہ قطعی ہے اور ثوبان رضی اللہ عنہ کی مخدوش اور ظنی ہے' اس لئے ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تاویل کرنی پڑے گی' کیونکہ کمزور کو قوی کے تابع کیا جاتا ہے۔ پس اس دلیل سے عشاء کے وتروں کے بعد دو رکعت نفل ہمیشہ بیٹھ کر پڑھنے پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ پس امت کو حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

جو روایات مولانا پیر جھنڈا صاحب نے پیش کی ہیں' وہ سب مخدوش ہیں اور ان میں عشاء کے بعد دو نفل ہمیشہ بیٹھ کر پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا ان سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

ابن ماجہ کی پہلی حدیث پر بحث: ابن ماجہ کی حدیث جو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' اس کی اسناد ضعیف ہیں۔ چنانچہ پیر آف جھنڈا صاحب نے خود یہ لکھا ہے کہ "میمون بن موسیٰ المرئی بھی صدوق ہے۔ ہاں مدلس ہے' اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ شاید

یہاں تدلیس سے کام لیا جاتا ہو۔"

میں کہتا ہوں کہ میمون راوی مدلس ہے۔ جس نے حسن سے یہ حدیث بلفظ "عن" روایت کی ہے۔ پس جس روایت کو مدلس بلفظ عن روایت کرے وہ ضعیف ہوتی ہے اور وہ قبول نہیں کی جاتی۔ چنانچہ مقدمہ مشکوٰۃ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں: قال الشیخ وحکم من ثبت عنه التدلیس انه لا یقبل منه الا اذا صرح بالتحدیث۔ "جس راوی کی تدلیس ثابت ہو جائے۔ اس کی حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔ جب تک کہ وہ لفظ "حدثنا" کے ساتھ صراحت نہ کرے۔" اس طرح دیگر کتب اصول حدیث میں لکھا ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔ باقی جو الزام پیر آف جھنڈا صاحب نے مجھ (عارف حصاری) پر یہ لگایا ہے کہ میں خود مدلسین کی روایتیں لاتا ہوں' سو اس کا جواب جب وہ کوئی مثال ہمارے مضمون سے ایسی پیش کریں گے جس میں احکام شرعیہ پر کسی مدلس کی روایت سے استدلال کیا گیا ہو' دیا جائے گا۔

مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ جلد دوم' ص۔۲۱۸ میں ہے: قاله العراقی قلت فی سنده میمون بن موسیٰ المرئی وهو صدوق لکنه مدلس وروی عن الحسن بالعنعنة۔ قال احمد کان یدلس لا یقول حدثنا الحسن (الآخر) الفلاس' صدوق لکنه یدلس۔ وقال النسائی وابو احمد الحاکم لیس بالقوی۔ "کہا امام عراقی نے کہ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کی سند میں میمون بن موسیٰ المرئی واقع ہے' جو مدلس ہے اور حسن سے لفظ "عن" سے روایت کرتا ہے اور امام احمد نے کہا کہ میمون مدلس ہے اور وہ حسن سے لفظ "عن" سے روایت کرتا ہے اور تحدیث کی صراحت نہیں کرتا۔ فلاس نے کہا کہ وہ صدوق ہے' مگر تدلیس کرتا ہے اور امام نسائی وابواحمد نے کہا کہ یہ روایت کرنے میں قوی نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ روایت ضعیف ہے کہ ایک تو میمون قوی نہیں ہے اور دوسرا مدلس ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس میں عشاء کے وتروں کے بعد نفل پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ الفاظ حدیث یہ ہیں: ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان یصلی بعد الوتر رکعتین خفیفتین وهو جالس۔ "ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد دو ہلکی پھلکی رکعتیں بیٹھ کر پڑھ لیا کرتے تھے۔" اس میں عشاء کے وقت کا کوئی لفظ نہیں۔ لفظ خفیفتین سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وتروں سے پہلے طویل رکعتیں پڑھتے تھے۔ چنانچہ مسلم

میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ابو سلمہ رضی اللہ عنہا کے سوال کے جواب میں آنحضرت ﷺ کی رات والی نماز یوں بیان کی : فقالت کان یصلی ثلاث عشرۃ رکعۃ یصلی ثمان رکعات ثم یوتر ثم یصلی رکعتین وھو جالس۔ "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ تیرہ رکعات پڑھتے تھے۔ پھر وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔" یہ روایت مفصل ہے جو رات کی نماز کی تفصیل بیان کر رہی ہے اور اس میں الفاظ کان یصلی مذکور ہیں۔ جس سے پیر آف جھنڈا صاحب ہیشگی کا تعامل ثابت کرتے ہیں۔

اس روایت نے واضح کر دیا کہ وتروں سے پہلے آٹھ رکعتیں پڑھ کر پھر وتر پڑھا کرتے تھے اور اس کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ یہ رکعتیں پہلی رکعتوں کی نسبت ہلکی ہوتی تھیں۔ جیسا کہ حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا میں مذکور ہے' تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی ملحق ہو گی۔ کیونکہ دونوں میں کان یصلی وارد ہے۔ جو بقول پیر آف جھنڈا صاحب ہیشگی پر دال ہے۔ تو یہ عمل ہمیشہ تہجد کے وقت ہوتا تھا' عشاء کے وقت نہ ہوتا تھا' اگر حدیث ام سلمہ کے عموم سے عشاء کا وقت مراد لیا جائے' تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مخالف ہو جائے گی۔ کیونکہ دو ہیشگیاں دو وقتوں میں ناممکن ہیں۔ دیگر یہ کہ حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا کمزور ہے' اس کو حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے مطابق کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ قوی ہے' جس کو مسلم نے روایت کیا ہے' جو طبقہ اولی کی کتاب ہے اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت مخدوش ہے' وہ ابن ماجہ کی ہے اور ابن ماجہ طبقہ ثانیہ کی کتاب ہے۔ پس طبقہ اولیٰ کی حدیث طبقہ ثانیہ پر مقدم اور راجح ہے۔

مخفی نہ رہے کہ ان احادیث میں جو ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ وتروں کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کا خاصہ تھا۔ جیسا کہ پہلے اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

نوٹ : جناب پیر صاحب آف جھنڈا نے الفاظ کان یصلی سے ہیشگی کا ثبوت دیا ہے اور وہ یہ سمجھے ہیں کہ لفظ "کان" مضارع پر وارد ہو' تو اس سے استمرار مراد ہوتا ہے اور اس طرح ماضی استمراری بن جاتی ہے۔

یہ قاعدہ تو ہے مگر کلیہ نہیں ہے۔ جب اس کے خلاف دلائل ہوں تو دوام مراد نہیں

ہوتا‘ محض ایک کا ہونا پایا جاتا ہے۔ شرح صحیح مسلم ج۱‘ ص۲۵۴ میں الفاظ کان یصلی پر امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فان المختار الذی علیه الاکثرون والمحققون من الاصولیین ان لفظة کان لا یلزم منها الدوام ولا التکرار وانما هی فعل ماض یدل علی وقوعه مرة فان دل دلیل علی التکرار عمل به والا فلا۔ "پس پسندیدہ بات یہ ہے جس پر محققین اہل اصول قائم ہیں کہ لفظ "کان" سے نہ ہیشگی اور نہ تکرار لازم آتی ہے اور صرف ایک فعل کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ خواہ ایک بار ہی ہو۔ کیونکہ یہ لفظ صیغہ ماضی کا ہے۔ ہاں اگر کوئی خارجی دلیل اس بات پر دلالت کرے کہ یہ فعل ہمیشہ وقوع میں آیا تو پھر ہیشگی مراد لی جائے گی‘ ورنہ نہیں۔" امام نووی رحمہ اللہ بطور فیصلہ لکھتے ہیں: قلت الصواب ان هاتین الرکعتین فعلهما صلی اللہ علیه وسلم بعد الوتر لبیان جواز النفل جالسا ولم یواظب علی ذالک بل فعله مرة او مرتین او مرات قلیلة ولا تغتر بقولها "کان یصلی" یعنی میں کہتا ہوں کہ درست بات یہ ہے کہ وتر کے بعد کی دو رکعتیں جو آنحضرت ﷺ نے پڑھی تھیں۔ یہ بیان جواز کے لئے تھیں۔ لیکن اس پر ہیشگی نہیں کی‘ بلکہ آنجناب ﷺ نے ایک دو دفعہ یا تین دفعہ کیا ہو گا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ کان یصلی سے مغالطہ میں نہ رہو۔

میں کہتا ہوں کہ اگر امام نووی رحمہ اللہ کا فیصلہ تسلیم کر لیا جائے‘ تو اس پر عمل تہجد کے وقت ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت نماز تہجد پڑھنے والے کو پہلے نوافل کے پڑھنے سے کچھ تھکاوٹ ہو جاتی ہے‘ اسی لئے اس پر عمل ہوا۔ اکثر احادیث اس پر دال ہیں کہ یہ رکعتیں وتروں کے بعد ہمیشہ نہیں پڑھیں۔

دوسری دلیل پر بحث: دوسری حدیث جو پیر آف جھنڈا نے پیش کی ہے‘ اس کا دارومدار ابو غالب پر ہے‘ جو مخدوش ہے۔ اس کا خاطی ہونا تو پیر صاحب نے خود تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ مجہول العدالت ہے۔ اس کی ثقاہت کتب اسماء الرجال میں پائی نہیں گئی۔ میزان میں اس کے نام میں اختلاف ظاہر کر کے یہ لکھا ہے کہ فیه شئی کہ اس میں کوئی چیز ہے۔ یعنی یہ مخدوش ہے‘ کیونکہ جس کے نام کا کوئی مستقل پتہ نہیں‘ تو اس کے حالات سے کیا آگاہی ہو سکتی ہے۔ ایسے مخدوش راویوں کی روایت سے استدلال کرنا بمقابلہ قطعی احادیث کے کسی طرح درست نہیں ہے۔ ابو غالب خطاکار کو دیگر کتب حدیث کے ان

راویوں پر قیاس کرنا جن کے متعلق خطا کرنے کا ذکر آیا ہے۔ قیاس مع الفارق ہے' کیونکہ ان کی ثقاہت وعدالت ومعرفت ثابت ہے' اس کے نام کا ہی کوئی پتہ نہیں اور یہ خطاکار ہے' تو اس مجہول الحال کی بابت احتمال خطا کا پیدا ہو گیا ہے' جو قطعیت کے خلاف ہے۔ پھر یہ روایت مقبول کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لئے کمزور روایت ان قوی روایتوں کے ساتھ ملحق کی جائے گی' جن میں آخری حصہ رات میں نماز تہجد کے ساتھ ان رکعتوں کا پڑھنا مذکور ہے' کیونکہ عشاء کے وقت کا اس میں ذکر نہیں ہے اور لفظ کان یصلی سے ہیشگی ثابت کرنا ہرگز درست نہیں' کیونکہ اس کے خلاف دلائل موجود ہیں۔ جن میں ان رکعتوں کے پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر لفظ کان یصلی ہیشگی پر دلیل ہیں تو پھر پیر صاحب مندرجہ ذیل احادیث پر عمل کیوں نہیں کرتے ہیں۔ مثلاً بخاری شریف میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا۔ اکان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یصلی فی نعلیہ قال نعم ''یعنی کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جوتیوں میں نماز پڑھا کرتے تھے؟ انس رضی اللہ عنہ نے کہا' ہاں پڑھا کرتے تھے۔'' اس حدیث میں الفاظ کان یصلی سے ہیشگی ظاہر ہوئی' تو پیر صاحب کو ہمیشہ جوتیاں پہن کر نماز پڑھنا چاہئے۔ خصوصاً اس کی تائید دوسری صحیح احادیث سے ہوتی ہے' جو ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : خالفوا الیهود فانهم لا یصلون فی خفافهم ونعالهم (او کما قال) ''یعنی تم یہود کے برخلاف کرو کہ وہ موزوں اور جوتوں میں نماز نہیں پڑھتے' تم پڑھا کرو۔''

پس پیر صاحب اور ان کے تمام مرید اور دیگر ان کے ہم خیال علماء اور ان کے مقتدی ہمیشہ ننگے سر اور ننگے پاؤں نماز پڑھتے ہیں۔ جوتیوں میں نماز نہیں پڑھتے۔ حالانکہ ازروئے حدیث بخاری شریف ان سب کو ہمیشہ جوتیوں میں نماز پڑھنی چاہئے۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے' جو مغرب کے بعد کی سنتوں کے متعلق ہے : ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یصلی رکعتین بعد المغرب فی بیتہ۔ ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مغرب کے بعد دو رکعتوں کو اپنے گھر میں پڑھتے تھے۔'' لیکن پیر صاحب اور ان کے مریدوں کا اس کے برخلاف عمل ہے کہ وہ ہمیشہ مغرب کی سنتیں مسجد ہی میں پڑھتے ہیں اور یہ بدعت ہے۔ جیسا کہ میں نے ''صحیفہ اہلحدیث'' کراچی میں ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۵ء کی تین قسطوں میں اس مسئلہ کی وضاحت کی ہے اور الاعتصام لاہور میں بھی اسی

زمانے میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کا آج تک کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی جواب ہو سکتا ہے۔ پس جو اہلحدیث ننگے پاؤں ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور جو ہمیشہ مسجد میں مغرب کی سنتیں پڑھتے ہیں' وہ سنت کے خلاف بدعت کا ارتکاب کرتے ہیں' کیونکہ یہ عمل قولی اور فعلی حدیثوں کے خلاف ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بغیر عذر اعتکاف وغیرہ کے یہ سنتیں مسجد میں نہیں پڑھیں اور تعامل صحابہ کرام خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بھی حوالہ دیا گیا ہے کہ وہ ان سنتوں کو گھر ہی میں پڑھتے تھے۔

علی سبیل تسلیم یہ حدیث نماز تہجد کے وتروں کے بعد کی دو رکعتوں پر محمول ہے' کیونکہ آنحضرت ﷺ اکثر' خصوصاً مثلاً آخر عمر میں وتر تہجد کے وقت ہی پڑھتے تھے اور کبھی کبھی ان دو رکعتوں کو بھی پڑھ لیتے تھے' ورنہ آپ ﷺ کا فرمان یہ ہے: قال الوتر ركعة من أخر الليل۔ (مسلم شریف جلد اول' ص۔۲۵۷) "یعنی فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ وتر آخری وقت رات میں ایک رکعت ہے۔" اور یہی آنحضور ﷺ کا معمول تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم کی فعلی حدیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے: عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى من الليل حتى يكون أخر صلوته الوتر۔ (جلد اول' ص۔۲۵۵) "یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کو جو نماز پڑھتے تھے اس کے' آخر میں وتر ہوا کرتے تھے۔" اس حدیث میں بھی كان يصلى ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ وتر نماز کے آخر میں ہوتے تھے۔ اب اگر دو رکعت بیٹھ کر پڑھی جائیں تو وتر نماز کے آخر میں نہیں ہو سکتے۔ اس قولی اور فعلی حدیث سے ثابت ہوا کہ نبی کریم ﷺ کا ہمیشہ یہی معمول تھا۔ پس ان قطعی حدیثوں کا وہ مخدوش روایتیں مقابلہ نہیں کر سکتیں جو پیر جھنڈا صاحب نے نقل کی ہیں۔ اصول حدیث کی رو سے قولی حدیث' فعلی پر ویسے بھی مقدم ہے۔ حصول المامول ص۔۱۷۶ دو معارض حدیثوں کی ترجیح میں یہ لکھا ہے: ان يكون احدهما قولا والاخر فعلا فيقدم القول۔ "یعنی دو حدیثیں مخالف آجائیں' جن میں ایک قولی ہو اور دوسری فعلی تو قولی کو مقدم کیا جائے گا۔"

اس کے علاوہ حدیث فعلی عام ہے اور حدیث قولی خاص ہے' تو خاص' عام پر مقدم ہے۔ نیز قولی اور فعلی حدیثیں قطعی الثبوت ہیں اور پیر صاحب کی نقل کردہ حدیثیں ظنی ہیں' تو قطعی ظنی پر مقدم ہے۔ قولی حدیثیں صحیحین کی ہیں اور پیر صاحب کی فعلی حدیثیں' دوسرے

تیسرے طبقہ کی کتابوں کی ہیں۔ لہٰذا بروئے اصول حدیث صحیحین کی حدیثیں ان پر مقدم ہیں۔ پیر صاحب کی مرقومہ حدیثیں مطلق ہیں اور ہماری پیش کردہ حدیثیں آخر رات کے ساتھ مقید ہیں۔ اب بروئے اصول حدیث مقید' مطلق پر مقدم ہے۔ نیز مسند احمد میں صریح حدیث ہے کہ آخر عمر میں نبی اکرم ﷺ کے وتر آخری رات ہی میں قائم رہے۔

چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا : فقال ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یوتر اول اللیل ثم اوتر فی وسطہ ثم اثبت الوتر فی ھذہ الساعۃ قال وذالک عند طلوع الفجر۔ "یعنی رسول اللہ ﷺ نے اول رات میں بھی وتر پڑھے اور درمیانی رات میں بھی وتر پڑھے اور پھر آخری رات میں بھی وتر پڑھے۔ پھر اسی ساعت پر قائم رہے کہ آخر وقت میں طلوع فجر کے قریب تک وتر پڑھتے رہے۔" اس حدیث پر شارح لکھتے ہیں : کان یوتر احیانا فی اول اللیل واحیانا فی وسطہ واحیانا فی اٰخرہ وکان اٰخر امرہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثبوتہ علی فعل الوتر اٰخر الیل قبیل الفجر۔ "آنحضرت ﷺ کبھی اول رات میں وتر پڑھتے' کبھی درمیانی رات' کبھی آخر رات۔ پھر آخر عمر میں آخر رات پر ثابت رہے جو فجر سے ذرا پہلے پڑھتے تھے۔" پس اس حدیث سے وتروں کے بعد نفلوں کے پڑھنے کا قصہ ختم ہوا' کیونکہ وتر فجر کے قریب پڑھتے تھے اور اس کے بعد فجر ہو جاتی تھی۔ پھر نفلوں کا وقت ہی نہ رہا۔ اگر پڑھتے ہوتے تو راوی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان فرما دیتے' تو یہ آخری عمل پہلے عملوں پر مقدم رہے گا اور یہی قولی حدیث کے مطابق ہے۔ پس وتروں کے بعد دو رکعتوں کا بیٹھ کر پڑھنا طریقہ نبوی ﷺ کے خلاف ہوا' جس کو بدعت قرار دیا جائے گا۔

شارح نے اس حدیث پر لکھا ہے : اسنادہ جید۔ "اس کی سند کھری ہے۔" مختلف روایات کو ہمیشہ قرآن کی روشنی میں چل کر سمجھنا چاہئے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے : ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک۔ (پارہ۔۱۵) "یعنی رات کے ایک حصے میں قرآن کے ساتھ نماز تہجد پڑھا کر' یہ حکم تیرے حق میں (اوروں سے زیادہ) ہے۔" اس سے ثابت ہوا کہ آنحضور ﷺ کو نماز تہجد پڑھنے کا حکم تھا اور تہجد سو کر بیدار ہونے کا نام ہے' تو یہ نماز عشاء کے بعد سو کر پڑھی گئی تھی۔ یہی طریقہ افضل ہے۔ قرآن میں سورہ المزمل کے دوسرے رکوع میں یہ معمول مذکور ہے : ان ربک یعلم انک تقوم ادنی من ثلثی اللیل ونصفہ وثلثہ

وطائفة من الذین معک۔ "یعنی تیرا پروردگار یہ خوب جانتا ہے کہ تو بھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی نصف کے لگ بھگ اور کبھی تیسرے حصے رات میں قیام کرتا ہے اور تیرے ساتھیوں میں سے بھی مومنین کی ایک جماعت عبادت میں مشغول رہتی ہے۔" ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ آنحضور ﷺ کا معمول عشاء کے بعد سو کر نماز پڑھنے کا تھا اور وتر اس نماز کے آخر میں ہوتے تھے۔ عشاء کے وقت وتر کبھی امت کی سہولت کے لئے پڑھ کر یہ فرمایا گیا کہ جو شخص ڈرے کہ وہ سو کر رات کی نماز کے لئے کھڑا نہیں ہو سکے گا وہ وتروں کو اول رات میں عشاء کے بعد پڑھ لے' یہ صورت غیر افضل محض جواز کے لئے ان لوگوں سے خاص ہے' جو نماز تہجد نہیں پڑھ سکتے اور جو لوگ پڑھ سکتے ہیں' ان کے لئے رات کے آخر حصہ میں ہی پڑھنے مسنون ہیں۔ پس عشاء کے وتروں کے بعد دو نفل پڑھنے کسی حدیث میں ذکر نہیں ہے۔ جو مطلق حدیثیں آئی ہیں وہ مقید پر محمول ہیں' اگر عشاء کے وقت رواج عام کے مطابق وتروں کے بعد نفل پڑھے جاتے تو ان کا ذکر ضرور ہوتا۔ تہجد کے وقت میں وتروں کے بعد نفل پڑھنے کا بعض روایتوں میں ذکر ہے' لیکن عشاء کے وقت وتروں کے بعد نفل پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

تیسری دلیل پر بحث: جناب پیر صاحب آف جھنڈا نے بحوالہ بیہقی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اس کا ضعف جناب پیر آف جھنڈا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ اس کی اسناد میں بقیہ اور قتادہ دو راوی مدلس ہیں' جو اپنی روایت کو صیغہ عن سے روایت کرتے ہیں اور پہلے گزر چکا ہے کہ مدلس راوی کی معنعن روایت مردود ہے اور تیسرا راوی عتبہ کثیر الخطاء ہے۔ پس جیسے عشاء کے بعد نفل پڑھنے والے اس مسئلہ میں کثیر الخطاء ہیں۔ ویسے ہی ان کے بیان کردہ روایتوں کے راوی ہیں۔ جیسے مدلس اور کثیرالخطاء کی روایتیں مردود ہیں ویسے ہی عشاء کے وقت وتروں کے بعد نفل پڑھنے کا مسلک غلط ہے۔ اور ہمارا مسلک کھرا اور طیب ہے' جس پر احادیث قطعیہ اور صحیحہ ناطق ہیں۔ یہ ضعیف روایتیں نہ خود مستقل حجت ہیں' کیونکہ ان میں عشاء کے وقت کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ تائید واستشہاد کے لئے کفایت کرتی ہیں' کیونکہ ضعیف ہیں۔ صحیح وہی بات ہے جو مقید حدیثوں میں وارد ہے کہ یہ دو رکعتیں نماز تہجد کے وقت وتروں کے بعد کبھی کبھی پڑھی جاتی تھیں مگر پھر عمل اس کے خلاف محض وتروں کو آخر پڑھنے پر منتہی ہوا۔ یہی افضل اور درست

ہے اور پہلے مسلک پر راجح ہے۔ اس کے خلاف عشاء کے وقت کا معمول مروجہ عامہ بدعت ہے۔ آخری رات میں وتروں کے بعد دو نفل پڑھنا خاصہ نبوی ہے جو امت کے لئے درست نہیں' کیونکہ قولی حدیث میں امت کے لئے یہ ہدایت ہو چکی ہے کہ وہ رات کی نماز کے آخر میں وتر پڑھیں اور فعل آنحضرت ﷺ کے ساتھ خاص ہے' تو امت کو قولی حدیث پر عمل کرنا چاہئے۔

چنانچہ حصول المامول میں قول و فعل کے تعارض پر بحث کرتے ہوئے (نمبر-۵) میں تعارض کو یوں دفع کیا گیا ہے کہ ان یکون القول عاما للامة فیکون الفعل علی تاخرہ مخصصاله من عموم معقول۔ یعنی قول امت کے لئے عام حکم ہو گا کہ وہ اس پر عمل کریں اور فعل اس قول کے عموم سے خاص کیا جائے گا' جب کہ اس سے متاخر واقع ہو گا۔یعنی وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مخصوص ہو گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر قولی اور فعلی دونوں ایک محل پر واقع ہوں تو اس کے خلاف جو فعل مقدم ہو گا وہ ناقابل عمل ہو گا اور فعل متاخر پر عمل کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ ذکر ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ بعض اوقات وتروں کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے لیکن آخری عمر میں آخری نماز وتر ثابت ہوئی اور قول بھی اسی عمل کے مطابق وارد ہوا کہ آخر نماز کو وتر بنائیں۔ پس یہی مسلک حق ہے' جس کو قبول کرنا واجب ہے اگر اس کے خلاف کیا گیا تو وہ بدعت متصور ہو گا۔ جس سے بچنا واجب ہے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے قول کا جواب یہ ہے کہ اس میں نماز وتر کے بعد نفل مروجہ پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف یہ ذکر ہے کہ جہاں وہ وتر پڑھتے تھے' اسی جگہ کوئی نماز پڑھتے تھے' یہ جائز ہے کہ وہاں سنت فجر کی دو رکعت پڑھی جائیں تو یہ قول قابل استدلال نہیں' کیونکہ احتمالی ہے اور اصول یہ ہے : المحتمل لا تقوم به حجه "یعنی احتمالی دلیل سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔"

اس کے خلاف ہم نے جو قول و فعل ابن عمر رضی اللہ عنہ کا پیش کیا ہے' جو قولی حدیث کا راوی ہے' اس میں صریح ذکر ہے کہ وہ وتر کے بعد کوئی نماز نفل نہ پڑھتے تھے۔ اگر پڑھنی ہوتی تو وتروں کو ایک اور رکعت ملا کر توڑ دیتے تھے۔ پس صریح قول مبہم قول پر مقدم ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے وتروں کو نقض کرنے سے یہ ظاہر ہوا کہ وتروں کے بعد کوئی نماز نہیں' ورنہ نقض کی ضرورت نہ تھی۔

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' جو قیام اللیل ص۔۱۲۸ میں ہے : ان ابن عباس قال اما انا فلوا وترت ثم قمت وعلی لیل لم ابال ان اشفع الیھا برکعۃ ثم اصلی بعد ذالک ما بدالی ثم اوتر بعد ذالک۔ "یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اگر میں عشاء کے بعد سونے سے پہلے وتر پڑھ لوں' پھر میں بیدار ہو کر قیام کروں اور ابھی رات باقی ہو' میں نہیں پرواہ کرتا کہ پہلی رکعت کے ساتھ دوسری ملا کر جوڑا کر دوں' پھر میں اس کے بعد نماز پڑھتا رہوں جس قدر میسر ہو' پھر اس کے بعد آخر میں وتر پڑھ لوں۔" اس سے ظاہر ہوا کہ وتر کے بعد نماز نہیں ورنہ وتر کو شفع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ قیام اللیل میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ سے قیام اللیل میں یوں مروی ہے : اما انا فاذا اردت ان اصلی من اللیل اوترت برکعۃ فاذا استیقظت صلیت الیھا رکعۃ ثم صلیت رکعتین رکعتین ثم اوترت۔ "یعنی سعد بن مالک رضی اللہ عنہ جو ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ کنیت رکھتے تھے وہ فرماتے ہیں کہ میں جب ارادہ کرتا ہوں کہ رات کو نماز پڑھ کر وتر پڑھوں ایک رکعت اور سو جاؤں۔ پھر بیدار ہو کر اس کے ساتھ ایک رکعت اور پڑھ کر ملا دیتا ہوں' تاکہ جفت ہو جائے۔ پھر دو دو رکعتیں پڑھتا رہتا ہوں اور پھر بعد ان کے وتر پڑھ لیتا ہوں۔"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ وہ بھی وتر پڑھ کر اس لئے شفع کرتے ہیں کہ وتر کے بعد کوئی نماز نہیں ہے۔ ورنہ دوبارہ وتر پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ پس صحابہ کرام وتر کے بعد دوگانہ ہرگز نہ پڑھتے تھے۔ اگر کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے مطلق یہ مروی ہو کہ وتر کے بعد اس نے نماز پڑھی ہے تب بھی اسی تعامل پر محمول ہے' جو ابن عباس رضی اللہ عنہ وابو سعید رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے اور جو اقوال پیر آف جھنڈا صاحب نے تابعین سے نقل کئے ہیں وہ ان صحابہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حجت نہیں ہیں' بلکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے نام رہ گئے ہیں کہ وہ بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔ مثلاً

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما : یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی تھے اور ان کے اہل بیت کا حکم رکھتے تھے۔ یہ تمام تابعین سے بہتر ہیں۔ یہ بھی اسی طرح کرتے تھے۔

ہشام بن عروہ تابعی : سے مروی ہے کہ وہ بھی اگر اول رات میں وتر پڑھ لیتے تو آخر رات میں اگر قیام کرتے تو شفع کر لیتے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ : خلیفہ ثالث بھی اسی طرح کیا کرتے تھے' جو سب تابعین پر فوقیت رکھتے ہیں اور خلیفہ راشد ہیں۔ جن کی اتباع کا حکم ہے۔

پس ان دو رکعتوں کو وتر کے بعد لازم قرار دینا سراسر باطل ہے' اگر صحیح ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرور عمل کرتے اور جس شخص نے ان نفلوں کے بغیر وتروں کو بتیرا کہا ہے اس نے نہایت غلط بات کہی ہے۔ چنانچہ قیام اللیل ص۔۱۱۹ میں ہے کہ "کسی شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ میں وتر کس طرح پڑھوں؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک رکعت پڑھ لے۔ اس شخص نے کہا کہ میں ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ یہ نماز بتیرا ہے۔" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا : سنة الله وسنة رسوله "یعنی یہ اللہ کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔" اور (جس نے بتیرا کہا ہے' درست نہیں کہا ہے) انما البتیرا ان یقوم الرجل فیصلی الرکعة یقرا فیها ویتم رکوعها او سجودها ثم یقوم فی الثانیة فلا یقرا فیها ولا یتم رکوعها ولا سجودها فتلک البتیرا۔ "یعنی سوائے اس کے نہیں بات یہ کہ بتیرا بایں طور نماز ہو گی کہ کوئی شخص ایک رکعت پڑھے اور اس میں قرات کرے اور رکوع و سجود پورا کرے' پھر دوسری رکعت پڑھے تو اس میں نہ قرات کرے اور نہ رکوع و سجود پورا کرے تو یہ بتیرا ہے۔" دیگر روایات جن میں یہ ذکر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین ایک رکعت وتر پڑھا کرتے تھے' ان کے بعد دو رکعت پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ہی رکعت وتر پڑھا کرتے تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ رات میں ایک ہی رکعت پڑھتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت عطا تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ مقیم ایک رکعت وتر پڑھ سکتا ہے؟ حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا : نعم لا یزید علیها "ہاں پڑھ سکتا ہے اس پر کوئی نماز زیادہ نہ کرے۔"

دوسرا امر تنقیح طلب یہ تھا کہ کیا عشاء کے بعد جو وتر پڑھے جاتے ہیں' ان کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفل بیٹھ کر پڑھے تھے؟

سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی قلیل طور پر وتروں کے بعد دو نفل پڑھے ہیں۔ اس سے بعض محدثین نے جواز سمجھا ہے اور بعض نے خاصہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ خاصہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے' جیسے کہ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے : اما الاحادیث التی فیها الامر للامة بان یجعلوا آخر صلوة اللیل وترا فلا معارضة بینها

وبین فعله صلی اللہ علیہ وسلم الرکعتین بعد الوتر لما تقرر فی الاصول ان فعله صلی اللہ علیہ وسلم لا یعارض القول الخاص بالامة فلا معنی للاستنکار۔ (نیل الاوطار ج۔۳' ص۔۳۸) "یعنی وہ حدیث جس میں امت محمدیہ ﷺ کو یہ حکم ہے کہ وہ رات کی نماز کے آخر کو وتر کریں۔ اس حدیث کا معارضہ آنحضرت ﷺ کے فعل سے نہیں ہے جس میں وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کا ذکر ہے' کیونکہ یہ اصول مقرر ہو چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا فعل اس قولی حدیث کے خلاف نہیں ہے' جو امت کے ساتھ مخصوص ہے۔"

پس اس میں کوئی وجہ انکار کی نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے جو دو نفل پڑھے ہیں یہ آپ ﷺ سے مخصوص ہیں' امت کے لئے سنت نہیں ہیں' کیونکہ خاصہ نبوی ﷺ سنت نہیں بن سکتا' لیکن یہ دو رکعتیں وتروں کے بعد تہجد کے وقت پڑھی گئی ہیں۔ چنانچہ مشکوۃ باب الوتر میں سعد بن ہشام سے مروی ہے' جس میں نو رکعت ایک ہی سلام سے پڑھنے کا ذکر ہے۔ پھر اس کے بعد یہ الفاظ ہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے : ثم یصلی رکعتین بعد ما یسلم وھو قاعد فتلک احدی عشرۃ رکعة "پھر نو رکعت کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے' جس سے پوری گیارہ رکعت ہو جاتی تھیں۔"

مشکوۃ میں دوسری حدیث ہے کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی رات کی نماز کیسے تھی؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا :

کان یصلی ثلاث عشرۃ رکعة یصلی ثمان رکعات ثم یوتر ثم یصلی رکعتین وھو جالس فاذا اراد ان یرکع قام فرکع ثم یصلی رکعتین بین الندا والاقامة من صلوۃ الصبح۔ "یعنی نبی اکرم ﷺ رات کو تیرہ رکعت نماز پڑھتے تھے۔ بایں طور کہ آٹھ رکعت نفل پڑھتے تھے۔ پھر وتر پڑھتے تھے۔ پھر دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ پس جب ان رکعتوں میں رکوع کرنے کا ارادہ کرتے' تو کھڑے ہو جاتے پھر رکوع کرتے' پھر ان کے بعد دو رکعت سنت صبح کی پڑھتے۔" ان دو حدیثوں سے واضح ہوا کہ وتروں کے بعد جو دو رکعت نبی اکرم ﷺ نے پڑھی ہیں وہ نماز تہجد کے بعد تھیں۔ عشاء کے وقت ان دو رکعتوں کے پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ پس جو حدیثیں ام سلمہ اور ابو اسامہ وغیرہ سے مروی ہیں' وہ مطلق ہیں' جو اس مقید پر محمول ہوں گی۔ جیسا کہ قاعدہ نمبر۔۳ میں بیان ہو چکا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ یہ رکعتیں نبی اکرم ﷺ نے وتروں کے بعد ہمیشہ نہیں پڑھی ہیں' بلکہ

کبھی کبھی ایک دو بار پڑھی ہیں۔ آخری عمل نبی اکرم ﷺ کا یہی تھا کہ وتر کو رات کی نماز کے آخر میں رکھتے تھے۔ جیسا کہ حدیث مسند احمد میں پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں آنحضرت ﷺ کا اکثری عمل یہی تھا کہ آپ ﷺ رات کی نماز میں وتر آخری رات میں پڑھتے تھے۔ جس کے بعد ان رکعتوں کے پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ چند روایات بطور ثبوت درج ذیل ہیں۔

(ا) قیام اللیل باب عدد صلوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ گیارہ رکعت پڑھتے تھے۔ ان میں آخر میں ایک رکعت وتر تھی۔

چنانچہ اس کی تفصیل دوسری روایت قیام اللیل میں ہے: کان یصلی ما بین ان یفرغ من صلوۃ العشاء وھی التی یدعوا الناس العتمۃ الی الفجر' احدی عشرۃ رکعۃ یسلم بین کل اثنتین ویوتر بواحدۃ۔ "یعنی نبی کریم ﷺ عشاء کے اور فجر کے درمیان گیارہ رکعت پڑھتے تھے' ہر دو دو رکعت میں سلام پھیرتے تھے اور ایک رکعت وتر آخر میں پڑھتے تھے۔"

دوسری روایت میں ہے کہ عشاء اور فجر کے درمیان آپ ﷺ گیارہ رکعت پڑھتے تھے' ہر دوگانہ کے بعد سلام پھیرتے تھے۔ پھر آخر میں وتر پڑھتے تھے' جس میں آخری سجدہ پچاس آیتوں قدر لمبا کرتے تھے اور اس کے بعد فجر کی دو سنتیں پڑھتے تھے اور داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی دیگر روایت میں ہے کہ رمضان اور غیر رمضان میں نبی اکرم ﷺ گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے' پہلے چار رکعت پڑھتے تھے۔ جن کا طول اور حسن نہ پوچھئے کہ بہت زیادہ ہوتا تھا۔ پھر اسی طرح چار رکعت اور پڑھتے تھے' پھر تین رکعت پڑھتے تھے۔

کان یصلی: ان تمام روایات میں کان یصلی وارد ہے' جو بقول پیر آف جھنڈا ہمیشگی پر دال ہے۔ جس سے ان کا یہ دعویٰ ٹوٹ گیا کہ نبی کریم ﷺ وتروں کے بعد ہمیشہ دو رکعت پڑھتے تھے' کیونکہ ان روایات میں گیارہ رکعت سے زائد اور سنت فجر کے بعد کوئی دوگانہ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔ پس یہ کہنا کہ آنحضرت ﷺ ہمیشہ وتروں کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے' صریح غلط ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت: ابوداؤد طیالسی جلد اول' ص ۱۱۹ میں حدیث ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں: کان یوتر عند الاذان ویصلی

رکعتین عند الاقامة "یعنی آنجناب ﷺ وتر" اذان کے متصل پڑھتے تھے اور سنت فجر اقامت کے نزدیک پڑھتے تھے۔" اس حدیث میں "کان یوتر" دوام پر دلالت کرتا ہے۔ جس سے پیر آف جھنڈا صاحب کو کوئی سبیل انکار نہیں ہے۔

ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت: ابوداؤد طیالسی کے اسی صفحہ میں ہے :عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوتروا قبل الفجر۔ "یعنی ابو سعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ صبح سے پہلے وتر پڑھو۔" یہ حدیث قولی ہے' جس میں صبح سے پہلے وتر پڑھنے کا ارشاد ہے۔ جس میں وتروں کے بعد دوگانہ پڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ: مشکوۃ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بابت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت ہوا کہ وہ عشاء کے بعد صرف ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں' تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "اس نے درست کیا اور وہ نبی کریم ﷺ کی صحبت میں رہے ہیں۔"

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ: وعن زید بن اسلم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من نام عن وترہ فلیصل اذا اصبح۔ (رواہ الترمذی) "زید بن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' جو کوئی سو جائے غافل ہو کر وتر اپنے سے پس چاہیے کہ پڑھے جس وقت کو صبح ہو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ: مسند احمد جلد۔۲' ص۔۲۸۲ میں ہے ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا :من صلی باللیل فلیجعل آخر صلوتہ وترا فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر بذالک۔ "یعنی جو شخص رات کو نماز پڑھے وہ نماز کے آخر میں وتر پڑھے اور رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کرنے کا حکم فرمایا۔"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ: مسند احمد باب الوتر میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ لکھتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے وتر کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا : اوتروا قبل الصبح "کہ صبح سے پہلے وتر پڑھو۔" یہ دونوں قولی حدیثیں ہیں' جن میں امت کو خطاب کیا گیا ہے۔ یہ ان فعلی حدیثوں پر مقدم ہیں جن کا فعل' نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے' کیونکہ ان حدیثوں میں امت کو حکم وارد ہے۔ جس کی تعمیل ضروری ہے۔ آپ کی وہ فعلی حدیث اس کے ساتھ ملائی جائے گی' جس میں رات کی

نماز کے آخر میں وتر پڑھنا مذکور ہے اور وہ احادیث کثیرہ ہیں جن میں بعض کا اوپر ذکر ہوا۔

مسند احمد : جلد۔۴ باب وقت الوتر میں ہے' ابو نہیک سے روایت ہے کہ ابودرداء نے لوگوں کو خطبہ دیا : لا وتر لمن ادرک الصبح۔ "یعنی جس شخص نے صبح کو پا لیا اس کا کوئی وتر نہیں ہے۔" یہ خطبہ سن کر آدمیوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ صبح کے بعد کوئی وتر نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا : کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصبح فیوتر۔ "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر صبح ہو جاتی' تب بھی وتر پڑھ لیتے۔" یعنی بعض وقت رات کی نماز پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔ پھر جب صبح ہوتی' تب وتر پڑھ لیتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وتر کے بعد نفل نہ پڑھتے تھے۔ پس دو نفلوں کو وتر کے بعد لازم قرار دینا سراسر باطل ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت مسند احمد میں ہے' جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں : فانتھی وترہ الی السحر۔ "کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر صبح تک منتہی ہوتے تھے۔" اس سے ظاہر ہے کہ وتر کے بعد کوئی نفل نہ تھا' اگر وتر اور صبح کے درمیان دو رکعت نماز ہوتی' تو اس کا ذکر ضرور ہوتا اور پھر اس کا انتہا صبح تک بتایا جاتا' لیکن کوئی نماز نہ تھی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت : مسند احمد باب جواز صلوۃ الوتر علی الراحلۃ میں ہے : عن ابن عمر رضی اللہ تعالٰی عنھما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوتر علی البعیر۔ "یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار ہوتے ہوئے وتر پڑھ لیا کرتے تھے۔" اس میں بھی دو نفل پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

قیام اللیل ص۔۴۷ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں اس لئے رات رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کا مشاہدہ کر سکوں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو کھڑے ہوئے اور وضو کر کے گیارہ رکعت نماز پڑھی' پھر بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی تو دو رکعت پڑھ کر مسجد کو نکلے اور پھر لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔

تیرہ احادیث : یہ تیرہ احادیث ہیں' جن سے ثابت ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتروں کے بعد دو رکعت نہیں پڑھتے تھے۔

پس یہ کہنا کہ وتروں کے بعد دو رکعت لازم ہیں اور ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ پڑھتے تھے. یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا ہے۔ جس کی سزا بڑی سخت ہے۔

تیسرا امر قابل تنقیح یہ تھا کہ یہ دو نفل وتروں کے ساتھ ہمیشہ لازم ہرگز نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہو چکا ہے۔ جس کو پیر جھنڈا صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں : لم یواظب علی ذالک بل فعله مرة او مرتین او مرات قلیلة۔ "یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو رکعتوں پر ہمیشگی نہیں کی' صرف چند دفعہ پڑھے ہیں۔

میں کہتا ہوں پھر وتروں کے بعد یہ دو رکعتیں پڑھنی چھوڑ دی گئیں۔ صرف وتر پر نماز کو ختم کیا گیا۔ جیسے مسند احمد کے حوالے سے حدیث پہلے نقل ہو چکی ہے اور ابوداؤد طیالسی کے شارح نے یہ لکھا ہے کہ احادیث کثیرہ میں وارد ہے کہ رات کی نماز کے آخر میں وتر پر اکتفا کیا گیا' لکھتے ہیں : فکیف یظن به صلی اللہ علیه وسلم مع هذه الاحادیث وانتباهها انه یداوم علی رکعتین بعد الوتر ویجعلها آخر صلاة اللیل؟ "یعنی باوجود ان حدیثوں کے کس طرح یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتروں کے بعد ان دو رکعتوں پر ہمیشگی کرتے رہے اور آخری نماز ان دو رکعتوں کو ٹھہرایا۔" یہ خیال غلط ہے۔

قیام اللیل میں صلوۃ اللیل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کئی انواع ذکر کیے ہیں' کسی میں تیرہ کا' کسی میں نو کا' کسی میں وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کا ذکر ہے۔ تمام صورتوں پر غور کرنے سے مداومت غلط ثابت ہوتی ہے۔

چوتھا امر تنقیح یہ تھا کہ کیا ان کو بیٹھ کر پڑھنا سنت ہے؟ اور اس سنت سے ثواب ملتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سنت بالکل نہیں ہے' اس کی تین وجوہات ہیں۔

(۱) یہ کہ یہ خاصہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور خاصہ نبوی امت کے لئے سنت نہیں ہوا کرتا۔

(۲) یہ کہ یہ دو تین دفعہ کا فعل ہے' پھر اس کے خلاف عمل ہوتا رہا ہے' کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں وتر پڑھتے رہے ہیں۔ جس کے بعد میں کوئی نماز نہیں پڑھی' تو یہ فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کے مطابق ہے۔ پس یہ سنت ہے جس پر عمل کرنے سے پورا ثواب ملتا ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ نفل تہجد کے وقت پڑھے گئے ہیں' عشاء کے وقت پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے' صرف ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ذکر ہے' سو وہ مسافر کے بیان میں ہے کہ اگر وہ تہجد کا عادی ہو تو وہ دو رکعت سے پہلے پڑھ لے تو وہ قائم مقام تہجد کے ہو جائیں گی۔ اس لئے عشاء کے وقت وتروں کے بعد ان نفلوں کو ہمیشہ پڑھنا بدعت ہے۔ جس کا ارتکاب بعض اہلحدیث اور مقلدین حنفیہ کر رہے ہیں اور تہجد کے وقت جو کام مسنون تھا اس کو چھوڑ رکھا

ہے' اگر تسلیم کیا جائے کہ وتروں کے بعد دو رکعت پڑھنی جائز ہیں' تو بھی ثواب آدھا ملے گا' کیونکہ آنحضور ﷺ کا فرمان ہے افضل کھڑے ہو کر پڑھنا ہے' جو بیٹھ کر پڑھے گا اس کو نصف ثواب ملے گا۔ اگر سنت ہوتا تو پورا ثواب ملتا' کیونکہ سنت کا ثواب ناقص نہیں ہوتا۔ پس پیر جھنڈا صاحب کا یہ کہنا کہ ہم سنت پر عمل کرتے ہیں ہم کو آدھا ثواب ہی کافی ہے۔ یہ بات عقل و نقل کے خلاف ہے کوئی ذی علم اس کا قائل نہیں ہو سکتا' کیونکہ آنحضور ﷺ نے بیٹھ کر یہ نفل پڑھے تو فرمایا :لست کاحد منکم "کہ میں تمہاری مثل نہیں ہوں۔" اب جو شخص اس کو سنت قرار دے کر عمل کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسا کوئی روزہ وصل رکھ کر کہے کہ یہ سنت ہے' میں اس سے ثواب حاصل کرتا ہوں تو یہ بجائے ثواب کے گناہ ہو گا۔

جیسے آنحضور ﷺ کی نماز تہجد کے بعض طریقوں میں یہ ذکر ہے کہ آپ ﷺ کچھ نماز پڑھ کر سو جاتے' پھر بیدار ہو کر آخر وقت میں وتر پڑھتے تھے اور وضو نہ کرتے تھے۔ اب کوئی شخص کہے کہ یہ سنت ہے اور میں اس پر عمل کرتا ہوں اور اس پر آیت فاتبعونی پڑھے اور ثواب حاصل کرنے کا ارادہ رکھے تو وہ بے وقوف ہے' کیونکہ یہ فعل خاصہ نبوی ہے اور خاصہ سنت نہیں ہو سکتا۔

<u>پانچواں امر تنقیح طلب</u> یہ تھا کہ ان نفلوں کے بیٹھ کر پڑھنے کی کیفیت کیا ہے؟

اس کی تحقیق عمیق یہ ہے کہ ان نفلوں کو اگر کوئی تہجد کے وقت وتروں کے بعد پڑھے تو اس طرح پڑھنے چاہئیں کہ بیٹھ کر شروع کرے جب قرات پوری ہو جائے تو کھڑا ہو جائے' پھر رکوع کرے اور سجدہ کر کے رکعت پوری کرے۔ اسی طرح دوسری رکعت پڑھے' اس طرح پڑھنے سے پورا ثواب ملے گا' کیونکہ اس میں قیام پایا گیا۔ چنانچہ مسلم کی حدیث میں یہ ذکر ہے' جس کے آخری الفاظ یہ ہیں : ثم یوتر ثم یصلی رکعتین وھو جالس فاذا اراد ان یرکع قام فرکع ثم یصلی رکعتین بین النداء والاقامۃ من صلوۃ الصبح۔ "یعنی آٹھ رکعت کے بعد وتر پڑھتے' تو پھر دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے۔ جب ارادہ کرتے رکوع کا تو کھڑے ہو جاتے اور پھر رکوع کرتے اور پھر دو رکعت سنت فجر کی پڑھتے۔ اس حدیث سے ان دو رکعتوں کے پڑھنے کی کیفیت ثابت ہو گئی کہ وہ بیٹھ کر اور کھڑے ہو کر تھی' صرف تمام رکعتوں کو بیٹھ کر پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے جس میں ذکر ہے کہ آنحضور ﷺ نے یہ دو رکعت بیٹھ کر پڑھیں' وہ مجمل ہے جس کو اس مفصل روایت پر محمول کیا جائے گا۔ صرف

"جالس" سے دو رکعتوں کے بیٹھ کر پڑھنے کا ثبوت نہیں ہوتا' جب تک اس میں تفصیل نہ ہو کہ رکوع بھی بیٹھ کر کیا تھا اور نماز بیٹھ کر ہی پوری کی تھی۔ چنانچہ باب السنن وفضائلھا میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نو رکعت پڑھتے جن میں وتر بھی شامل تھا۔ پھر لکھا ہے : کان یصلی لیلا طویلا قائما ولیلا طویلا قاعدا۔ لمبی رات تک کھڑے ہو کر نماز پڑھتے اور پھر لمبی رات تک بیٹھ کر پڑھتے۔ پھر پڑھنے کی تفصیل یوں کی ہے : اذا قرأ قاعدا رکع وسجد وھو قاعد۔ "یعنی جب بیٹھ کر نماز پڑھتے تو سجدہ اور رکوع میں بیٹھے ہوئے کرتے تھے اور جب فجر ہو جاتی تو دو رکعت سنت فجر کی پڑھ لیتے۔(رواہ مسلم) اس حدیث سے دو چیزیں واضح ہو گئیں۔

(۱) ایک یہ کہ تمام رات میں نو ہی رکعت پڑھیں جن میں وتر بھی شامل تھا۔ پھر دو رکعت سنت فجر کی پڑھیں۔ وتروں کے بعد دو رکعت پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں' سنت فجر کا ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ دو رکعت نہیں پڑھی تھیں۔ اگر پڑھی ہوتیں تو گیارہ رکعت بتائی جاتیں۔

(۲) دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ بیٹھ کر پڑھنے کی تفصیل ہو گئی۔ پس اس طرح اگر وتر کے بعد دو رکعتوں کی تفصیل بیٹھ کر پڑھنے کی اس طرح آجائے کہ رکوع اور سجود بھی بیٹھ کر کیا تو مان لیا جائے گا۔ ورنہ جس حدیث میں تفصیل ہے کہ کھڑے ہو کر رکوع کیا تو اس پر اس مطلق کو محمول کیا جائے گا۔ جس میں تفصیل نہیں ہے۔

پس مروجہ طریق وتروں کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا خصوصاً عشاء کے بعد ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بدعت ہے' کیونکہ اس کی ہیئت بدل گئی۔ جیسے کوئی عید کی نماز سے پہلے خطبہ پڑھے تو یہ بدعت ہے۔

اسی طرح اذان عثمانی رضی اللہ عنہ جو مروجہ طریق سے جاری ہے بدعت ہے' کیونکہ تعدد جمعہ شروع اور رائج ہے اور ہر ہر مسجد میں دو دو اذانیں دی جا رہی ہیں۔ جس سے عثمانی اذان کی ہیئت بدل گئی' تو یہ بدعت ہوا۔

چھٹا عمل قابل تنقیح : یہ تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان نفلوں کو بیٹھ کر پڑھنے کا تعامل خلفاء یا دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پایا گیا ہے یا نہیں؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ عشاء کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا کوئی تعامل نہیں پایا گیا۔ بعض صحابہ کرام سے عشاء کے بعد وتر

پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے' لیکن وتروں کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر یہ تعامل دائمی ہوتا تو ضرور اس کا ذکر پایا جاتا۔ جب اس کا ذکر نہیں پایا گیا تو اس کا عدم وجود سمجھا جائے گا۔ اسی کو بدعت کہتے ہیں کہ جس کا شرع میں ثبوت نہ ہو اور اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل جاری نہ ہوا ہو اور اس کو عبادت مقصودہ سمجھ لیا جائے تو وہ بھی بدعت ہے۔ جس کا ارتکاب آج کل اہلحدیث اور مقلدین حنفیہ کر رہے ہیں اور پھر اس پر طرہ یہ کہ اس کو سنت نبوی سمجھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس عمل کے بدعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں' بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان کی کراہت مروی ہے۔ چنانچہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے قیام اللیل ص-۱۳۰ میں یہ مذکور ہے : وعن ابی سعید الخدری رضی اللّٰہ عنه انه کرہ الصلوة بعد الوتر۔ یعنی "ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ صحابی رسول وتر کے بعد نماز پڑھنا مکروہ جانتے ہیں۔" قیام اللیل میں سعید بن جبیر تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ وتر کے بعد نماز کا کیا حکم ہے' تو فرمایا کہ نہیں جائز' یہاں تک کہ سو جائے۔

ابرہیم تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے قیام اللیل میں مروی ہے کہ انہوں نے بھی وتر کے بعد نماز کو مکروہ قرار دیا ہے۔

حضرت ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ نقض کر سکتے ہو۔

حضرت امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا : لا نعرف الرکعتین بعد الوتر جالسا وانما رکعهما ناس وقد جمعت الاحادیث علی صلوة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم انه کان یصبح علی ثلاث عشرة رکعة لیس فیها هاتان الرکعتان۔ یعنی "وتروں کے بعد ان دو رکعتوں کے بیٹھ کر پڑھنے کو ہم نہیں پہچانتے اور لوگ ان کو پڑھتے ہیں۔ تحقیق میں نے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ رکعت تک رات کی نماز پڑھتے تھے۔ مگر ان میں ان رکعتوں کے پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

امام مکحول رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وہ رمضان میں وتروں کے بعد دو رکعت کھڑے ہو کر پڑھتے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ صلوة رمضان آخر میں پڑھتے ہوں' تو انہوں نے ان دو رکعتوں کو جائز سمجھ کر پڑھ لیا ہو' مگر کھڑا ہو کر پڑھا کہ ثواب پورا ملے' لیکن امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ اس عمل کو نہیں لیتے تھے اور ولید بن مسلم نے بھی

ان رکعتوں سے انکار کیا ہے۔

پس یہ اقوال' ان اقوال کے معارض ہیں جو پیر جھنڈا صاحب نے نقل کئے ہیں۔ ان میں چونکہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ شامل ہے اور یہ حدیث قولی کے مطابق ہیں' اس لئے یہ ان پر راجح ہیں اور ان سے ہمارے مسلک کی تائید و تصدیق ہو گئی۔ اگر یہ سنت دائمی ہوتی تو سلف صالحین انکار نہ کرتے اور ان سے یہ پوشیدہ نہ رہتی۔ پیر آف جھنڈا صاحب نے جو احادیث وتروں کے بعد دو رکعت پڑھنے پر پیش کی ہیں' ان کی خود ہی تضعیف کر دی ہے۔ جس سے وہ قابل استدلال نہیں رہیں۔ ہماری پیش کردہ قولی اور فعلی احادیث قطعی الثبوت ہیں۔ جن پر عمل درآمد رکھنا چاہئے۔

اب خلاصہ بحث یہ ہے کہ خاص عشاء کے بعد وتر پڑھ کر دو نفل بیٹھ کر ہمیشہ پڑھنے اور ان کو سنت سمجھنا بدعت ہے۔

اسی طرح ظہر کے فرضوں اور سنتوں کے بعد دو نفل ہمیشہ بیٹھ کر پڑھنا اور مغرب کی دو سنتوں کے بعد دو نفل ہمیشہ بیٹھ کر پڑھنا اور عشاء کی سنتوں کے بعد اور وتروں سے پہلے دو نفل ہمیشہ بیٹھ کر پڑھنا بھی بدعت ہے' کیونکہ بدعت کسی گناہ اور بری چیز کو ہی نہیں کہتے' بلکہ وہ اہم طاعات اور عبادات بھی جن کو شریعت نے مطلق چھوڑا ہے' ان میں اپنی طرف سے قیود لگا دینا یا ان کی کیفیت کو بدل دینا یا اپنی طرف سے اوقات کے ساتھ متعین کر دینا اور اس کو مخصوص شرعی سمجھ کر ہمیشگی کرنا یہ بھی شریعت کی اصطلاح میں بدعت ہو گا اور شریعت اسلامی اس کو پسند نہیں کرے گی۔ اس کے نظائر بہت ہیں۔ مثلاً صلوۃ ضحیٰ پڑھنی جائز بلکہ مسنون ہے۔ جب لوگ اس کو اجتماعی طور پر مسجد میں پڑھنے لگے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو بدعت قرار دیا' کیونکہ ان کے اس فعل سے کیفیت بدل گئی تھی۔

اسی طرح اذان عثمانی کی کیفیت بدلی تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ بدعت ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مجلس کو اجتماعی صورت سے ذکر اللہ خاص تعداد سے سنگریزوں پر کرتے ہوئے دیکھا تو کہا "یہ بدعت ہے۔" اسی طرح اب جو اذان سے پہلے بلند آواز سے درود شریف پڑھا جاتا ہے' گھروں میں فاتحہ خوانی کی جاتی ہے جمعرات کو ایصال ثواب کیا جاتا ہے' یہ تمام امور بھی بدعت میں شمار ہیں' کیونکہ ان میں تخصیص اوقات و ایام و مقام و اجتماع پائے جاتے ہیں۔ جس سے متعلق حکموں کی کیفیت بدل

جاتی ہے۔ گویا شرعاً مطلق کو اپنی طرف سے مقید کرنا یا مقید کو مطلق بنا دینا' یا عام کو خاص یا خاص کو عام کر دینا شرعی حد سے تجاوز ہے۔ جس سے مشروع کام غیر مشروع ہو جاتے ہیں اور جائز کام ناجائز اور سنت بدعت بن جاتی ہے۔ اس لئے مروجہ طریق سے دو نفل بیٹھ کر پڑھنے اس اصول کی رو سے بدعت ہیں۔ اگر کوئی اہل علم ان مخصوص نفلوں کو ہمیشہ اس کیفیت سے پڑھنا کسی دلیل شرعی سے ثابت کر دے تو ہم کو اس کے تسلیم کرنے سے کوئی انکار نہیں ہے۔ ضد اور نفسانیت اور عصبیت کو ہم گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ جس سے اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں خصوصاً علماء کو بچائے۔ آمین۔ وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین۔

مولانا محب اللہ سندھی کا دعویٰ ہے کہ عشاء کے وتروں کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھنے سنت ہیں۔ یہ دعویٰ بے دلیل ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ اس کے خلاف ہمارا قول یہ ہے کہ عشاء کے بعد وتر پڑھے تو اس کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھنا ثابت نہیں ہیں۔ چنانچہ گزشتہ بحث میں ان کے دعویٰ اور دلائل کا ابطال کرتے ہوئے اپنا مسلک ثابت کر دیا گیا ہے۔ اب یہاں ایک حدیث لکھ کر اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔ وہ حدیث قیام اللیل ص۔۱۱۸ میں ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی العشاء صلی اربعا ثم اوتر بسجدۃ "یعنی نبی کریم ﷺ جب عشاء کی فرض نماز پڑھتے تو اس کے بعد چار رکعت نماز نفل پڑھ کر پھر ایک رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔" اس حدیث سے صاف ثابت ہوا کہ آنحضور ﷺ عشاء کے بعد وتر پڑھا کرتے تو اس کے بعد کوئی نفل نہیں پڑھتے تھے' اگر پڑھتے تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ان کا ذکر کر دیتے۔ اس بیان میں صحابی کا ان کے بیان سے سکوت کر جانا ان کے عدم پر دلیل ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ عشاء کے بعد جو وتر پڑھ کر دو نفل ہمیشہ بیٹھ کر پڑھے جاتے ہیں' یہ ثابت نہیں ہیں اور نہ ان پر صحابہ کرام کا تعامل تھا۔ لہٰذا یہ بدعت ہیں' جو مقلدین اہل رائے نے جاری کئے ہیں' ان سے بچنا ضروری ہے۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب' وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری

تنظیم اہلحدیث جلد۔۲۱' ۲۲' شمارہ۔۱' ۲' ۳' ۴' ۵' ۶' ۸' ۹' ۱۱' ۱۲

مورخہ ۱۲ مارچ سنہ۔۱۹۶۸ء تا ۱۳ جون سنہ۔۱۹۶۹ء

جنازہ کے مسائل

تلقین میت

اخبار تنظیم کی جلد-۱۲' شمارہ-۲۰ میں تلقین میت کو حضرت العلام مدظلہ العالی نے مولف سبل السلام کی اتباع میں جن کی مسئلہ عشر میں تردید فرما چکے ہیں' بدعت قرار دیا ہے- اس میں بھی مجھے نظر ہے کہ نیل الاوطار میں ابوامامہ کی حدیث مرفوعاً بروایت طبرانی منقول ہے- جس میں تلقین میت کا ذکر ہے- اس کے آخر میں امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قال الحافظ فی التلخیص واسنادہ صالح- حافظ ابن حجر نے تلخیص میں حدیث ابوامامہ کی اسناد کو اچھا کہا ہے- حافظ ابن حجر کا جرح و تعدیل میں جو مرتبہ ہے' وہ جناب سے مخفی نہیں ہے- اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو بھی قابل عمل ہے- جس کی دو وجہ ہیں-

ایک یہ کہ ضعیف حدیث فضائل اعمال میں حجت ہے- چنانچہ جناب نے خود رسالہ "شغار" کے ص-۹ پر فرمایا ہے کہ ضعیف حدیث فضائل اعمال میں تو معتبر ہے- حلال حرام میں معتبر نہیں ہے- اسی بناء پر آپ نے بروز عاشورہ وسعت طعام کو جائز رکھا ہے- حالانکہ اس کی روایت ضعیف ہے- عاشورہ کی وسعت طعام میں حدیث ضعیف کو لینا اور تلقین میت میں نہ لینا انصاف سے بعید اور اپنے قاعدہ مسلمہ کے خلاف ہے-

دوسری وجہ یہ ہے کہ سلف اور دیگر اہل علم کا اس پر تعامل ثابت ہے- چنانچہ منتقی میں سعید بن منصور کی روایت منقول ہے- جس میں قدماء تابعین حمصیوں کا بیان ہے کہ کانوا یستحبون ان یقال للمیت عند قبرہ الحدیث- یعنی صحابہ تلقین میت کو مستحب جانتے تھے-

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ظاہرہ ان المستحب لذلک الصحابۃ الذین ادرکرھم- یعنی "مستحب جاننے والے صحابہ ہیں جن کو ان تابعین نے پایا ہے-" شواہد تلخیص میں اور بھی ہیں- اصحاب شافعی اس کو مستحب جانتے تھے- اہل شام کا اس پر تعامل ہے پھر استحباب میں اس کے حجت ہونے میں کیا کلام ہے-

حدیث جمع بین الصلوتین بلا عذر کی روایت ضعیف ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ والعمل علی ھٰذا عند اھل العلم۔ اس میں اشارہ ہے کہ ضعف حدیث عمل اہل علم سے قوی ہو جاتی ہے۔ آپ کا اس کو بدعت قرار دینا محل نظر ہے۔ بدعت تو وہ چیز ہے جو کسی دلیل شرعی اور عمل سلف سے ثابت نہ ہو۔ تلقین کا ثبوت اور عمل تابعین و دیگر اہل علم سے بھی ثابت ہے۔ گو حدیث ضعیف ہے لیکن عمل اس پر روا ہے۔ بلکہ ظاہر الفاظ سے حدیث لقنوا موتاکم لا الہ الا اللّٰہ کہ اپنے مردوں کو لا الہ الا اللّٰہ کی تلقین کرو۔ روایت ضعیفہ کی صحیح موید ہے۔ یا یوں کہئے کہ روایت ضعیفہ اس مجمل کی تفسیر ہے۔

نواب صاحب کی کتاب "قضیۃ المقدور" اس باب میں قابل ملاحظہ ہے۔ لیکن وہ میرے پاس نہیں ہے۔ آپ کے پاس مجھ سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ آپ اس مسئلہ پر نظرثانی فرما کر اس کو ایسے علمی طریقہ سے بدعت ثابت فرمائیں کہ "ہم اہل بدعت کے ساتھ پوری بصیرت سے بحث کر سکیں۔"

میری آپ کے مسائل پر تنقید مقصود نہیں ہے بلکہ تفہیم و تحقیق حق مقصود ہے۔ مگر بیان ایسے دلائل سے ہو کہ تقلید نہ پائی جائے۔ والسلام

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم لاہور جلد ۱۳' شمارہ ۴' مورخہ ۱۶/ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

مسئلہ تلقین میت

اس پر مولوی عبدالقادر صاحب نے جو کچھ تنقید کی ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ضعیف حدیث فضائل اعمال میں معتبر ہے۔ تو پھر آپ "تلقین میت" کو بدعت کیوں کہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ: "اس کا دار و مدار سماع موتی پر ہے۔" سماع موتی عقائد کی قسم سے ہیں اور عقائد میں بالاتفاق ضعیف حدیث معتبر نہیں۔ اور جن لوگوں نے اس پر عمل کیا' ان کی ڈبل غلطی ہے۔ ان کا خیال اس طرف نہیں گیا کہ سماع موتی اعتقادی مسئلہ ہے۔ پس ان کا عمل کرنا کوئی دلیل نہیں۔

عبداللہ روپڑی از لاہور

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد ۱۳' شمارہ ۷' مورخہ ۲۳/ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

نماز جنازہ کے لیے منادی کا حکم

بعض شہروں اور دیہاتوں میں یہ رواج ہے کہ نقارہ بجا کر یا لاؤڈ سپیکر یا محلوں، گلی کوچوں، بازاروں میں کسی منادی کو بھیج کر اعلان اور بلند آواز سے اعلام کرتے ہیں کہ صاحبو! نماز جنازہ پر چلو۔ فلاں شخص کا جنازہ تیار ہے۔ اس پکارنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نماز جنازہ اور دفن میں لوگ زیادہ شریک ہو جائیں۔ کیا یہ صورت جائز ہے اور کسی دلیل شرعی اور تعامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ بینوا بالدلیل توجروا عنداللہ الجلیل۔ (السائل عبدالکریم ضلع بہاول نگر)

(الجواب بعون الوهاب وهو الموافق للصواب)

الحمد للّٰہ رب العلمین۔ اما بعد فاقول وباللّٰہ التوفیق۔ واضح ہو کہ نماز جنازہ کے لیے لوگوں کو منادی کر کے جمع کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے کوئی دستور اور خاص طریقہ مقرر نہیں کیا۔ مسند احمد میں حدیث ہے۔ عن ابی الزبیر قال سئل جابر عما یدعٰی للمیت؟ فقال ما اباح لنا فیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ولا ابوبکر ولا عمر رضی اللّٰہ عنہما (جلد۔۷، ص۔۳۵) باب ماجاء فی نعی المیت۔ اسنادہ جید۔ یعنی ابوالزبیر نے بیان کیا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ میت کے لیے لوگوں کو بلانے کا کیا دستور ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے اس بارہ میں کوئی دستور مقرر نہیں کیا تھا۔" اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مروجہ طریقہ منادی کرنے کرانے کا محدث (بدعت) ہے۔

عربی محاورہ میں موت کی خبر دینے کو لفظ نعی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محض لوگوں کا ایک دوسرے کو خبر دینا یا امام کا کسی غائب میت کی بابت لوگوں کو خبر کرنا" یہ تو جائز ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی جامع صحیح بخاری میں یوں باب باندھا ہے: "باب الرجل ینعی الی اہل المیت بنفسہ" یعنی آدمی اپنی ذات سے میت کے اہل کو خبر دے۔" پھر اس کے ثبوت کے لیے یہ حدیث پیش کی ہے۔ عن ابی ہریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نعی النجاشی فی الیوم الذی مات فیہ خرج الی المصلی فصف بہم وکبر اربعا۔ یعنی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حبش کے

ملک کے بادشاہ اصحمہ نجاشی کی موت کی خبر اسی دن دی جس دن وہ فوت ہوا پھر عیدگاہ کی طرف آپ نکلے اور لوگوں کی صف بندھوائی اور چار تکبیریں کہہ کر اس پر نماز پڑھی۔" ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ان اخاکم لنجاشی قدمات فقوموا فصلو علیہ" یعنی تمہارا مسلمان بھائی نجاشی مر گیا ہے' پس اٹھو اور اس کے لیے نماز پڑھو۔" اور دوسری حدیث امام بخاری نے یہ پیش کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے غزوہ موتہ کا ذکر کیا تو فرمایا اس جنگ میں پہلے زید رضی اللہ عنہ نے جھنڈا سنبھالا' وہ شہید ہو گئے پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جھنڈا لیا' وہ بھی شہید ہو گئے پھر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا سنبھالا تو وہ بھی شہید ہو گئے۔ یہ بیان کرتے وقت آپ کے آنسو جاری تھے۔ پھر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جن کو میں نے سردار نہیں بنایا تھا جھنڈا لیا تو ان کو اللہ نے فتح دی۔ ان احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ خود آنحضرت ﷺ نے ان غائب میتوں کی خبریں لوگوں کو بتائیں۔ یہ جائز ہے' یہ منادی مروجہ نہ تھی۔

دوسرا باب یوں باندھا ہے' "باب الاذن بالجنازۃ" یعنی "یہ باب اس بارہ میں ہے کہ نماز جنازہ کی خبر دینا جائز ہے۔" پھر اس کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک انسان مر گیا۔ آنحضرت ﷺ اس کی بیماری پرسی کیا کرتے تھے۔ وہ رات کو مرا جس کو صحابہ کرام نے دفنا دیا۔ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے اس کا ذکر کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ما منعکم ان تعلمونی" "تم کو کیا مانع پیش آیا کہ تم نے اس کی مجھے خبر نہ دی۔" لوگوں نے کہا کہ رات تھی اور اندھیرا بہت تھا' اس لیے ہم نے آپ کو تکلیف دینا برا سمجھا پھر آپ اس کی قبر پر آئے اور نماز جنازہ پڑھی۔ دوسری حدیث میں مسجد میں جھاڑو دینے والے مرد یا عورت کا قصہ ہے کہ وہ رات کو فوت ہوئی۔ صحابہ نے اس کا رات کو ہی کفن دفن کر دیا اور آپ کو تکلیف نہ دی۔ جب آپ نے اس کا حال پوچھا تو لوگوں نے بتلایا کہ وہ رات ہی دفن کر دی گئی۔ آپ نے فرمایا "ھلا آذنتمونی" کہ تم نے مجھے خبر کیوں نہ کی۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ امام کو جو نماز جنازہ پڑھتا ہو' میت کے جنازہ کی خبر کرنی چاہیے۔ پس نفس مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کی موت کی خبر کرنا اور جنازہ تیار ہونے پر ایک دوسرے کو بتانا کہ نماز جنازہ تیار ہے' یہ درست ہے لیکن منادی کرنا بلند آواز سے اور نقارہ بجانا یہ بدعت ہے۔

ان احادیث سے یہ ظاہر ہے کہ منادی نہیں کی گئی تھی۔ اگر مسجد یا بازاروں' گلیوں میں

منادی عام بلند آواز سے کی جاتی تو آنحضرت ﷺ کو بھی اس کا علم ہو جاتا۔ اذ لیس فلیس۔ کسی میت کی بابت عام اعلان اور منادی کرنا یہ جاہلیت کی رسم ہے۔ یہ نعی کی دوسری قسم ہے' یہ مکروہ اور ممنوع ہے۔ ترمذی شریف جلد ۱' ص ۱۱۷ میں ہے۔ باب ماجاء فی کراهیة النعی۔ یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بارہ میں ہے کہ نعی مکروہ ہے۔ پھر اس کے ثبوت میں حضرت حذیفہ صحابی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا "اذا مت فلا تئوذنوا بی احد کہ جب میں مر جاؤں تو میری بابت کسی کو خبر نہ دینا۔" فانی اخاف ان یکون نعیا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایک دوسرے کو خبر کرنے سے کہیں نعی ممنوعہ کی صورت نہ بن جائے۔ انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھی عن النعی یعنی میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ کسی کی موت کا اعلان کرنے اور عام خبر دینے سے منع فرماتے تھے۔"

پھر دوسری حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے ایاکم والنعی فان النعی من عمل الجاهلیة قال عبداللہ والنعی اذان بالمیت یعنی نعی سے تم بچو کیونکہ نعی جاہلیت کی رسم ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نعی میت کی بابت اعلان کرنے کو کہتے ہیں۔" یہ روایت مرفوعاً ضعیف ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ روایت مرفوع ہو یا موقوف' پہلی روایت حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی موید ہے' جس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی کی موت اور جنازہ کا اعلان کرنا اور منادی کرنا جائز نہیں ہے کہ یہ جاہلیت کی رسم ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ بعض اہل علم نے اس کو برا سمجھا ہے۔ "والنعی ان ینادی فی الناس بان فلانا قد مات یشھدوا جنازته یعنی نعی ان اہل علم کے نزدیک یہ ہے کہ کسی شخص کی موت کا اعلان کرنا تاکہ لوگ جنازہ پر حاضر ہو جائیں۔" اور بعض اہل علم نے یہ کہا ہے کہ اگر آدمی اپنے قرابت والے لوگوں کو خبر بتا دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارک پوری رحمہ اللہ اپنی کتاب الجنائز کے ص ۱۸ میں یہ لکھتے ہیں کہ قرابت مند اور دوست و احباب کو تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ میں شریک ہونے کے لیے موت کی خبر دینا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو اور صحابہ نے باہم

ایک دوسرے کو خبر دی ہے اور حدیث میں جو نعی کی ممانعت آئی ہے' سو نعی سے مطلق موت کی خبر دینا مراد نہیں ہے بلکہ اس طرح پر موت کی خبر دینا مراد ہے جس طرح جاہلیت میں دستور تھا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ جاہلیت کا دستور تھا کہ جب کوئی مرتا تو کسی کو محلوں کے دروازوں پر اور بازاروں میں بھیجتے۔ وہ گشت کر کے باآواز بلند اس کے مرنے کی خبر کرتا۔ اور نہایہ جزری وغیرہ میں یہ لکھا ہے کہ "جب کوئی شریف آدمی مرتا یا قتل کیا جاتا تو قبیلوں میں سے ایک سوار کو بھیجتے جو چلا کر اس کی موت کی خبر کرتا کہ فلاں شخص مرگیا یا فلاں شخص کے مرنے سے عرب ہلاک ہو گیا۔ پس موت کی خبر جاہلیت کے اس طریقہ پر دینا ممنوع و ناجائز ہے۔" پھر حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "میں کہتا ہوں کہ احتیاط اسی میں ہے کہ اس طرح پکارنے سے احتراز کیا جائے۔" فقہ حنفی کی کتاب ردالمختار میں لکھا ہے کہ "اگر میت عالم یا زاہد کی ہو جس کو لوگ متبرک سمجھتے ہوں تو ایسی میت کے جنازہ میں شریک ہونے کے لیے بازاروں میں پکارنے کو بعض متاخرین نے مستحسن سمجھا ہے۔" میں کہتا ہوں کہ بعض متاخرین کا یہ استحسان ٹھیک نہیں ہے کیونکہ انہیں خیرالقرون میں بڑے بڑے متبرک عالم اور زاہد گزرے ہیں لیکن کسی کے جنازہ میں شریک ہونے کے لیے بازاروں میں پکارا نہیں گیا۔

فتح الربانی شرح مسند احمد جلد۔۷' ص۔۱۴۶ میں ہے: "استحب جماعة من اهل العلم ان لا یعلم الناس بجنائزهم یعنی ایک جماعت اہل علم نے اس بات کو مستحب سمجھا ہے' لوگوں کو جنازہ کے لیے اعلان نہ کیا جائے۔" علامہ ابن قدامہ کی مغنی سے نقل کیا ہے: "یکره النعی وهوان یبعث منادیا ینادی فی الناس ان فلانا مات یشهد واجنازته یعنی ناجائز اور مکروہ نعی یہ ہے کہ کسی منادی کو بھیجنا کہ وہ لوگوں میں پکارے کہ فلاں شخص مرگیا ہے تاکہ اس اعلان سے لوگ جنازہ پر حاضر ہو جائیں۔" نیز یہ لکھا ہے: "قال کثیر من اهل العلم لاباس ان یعلم الرجل اخوانه ومعارفه وذوالفضل من غیر نداء۔" یعنی "بہت علماء نے یہ کہا ہے کہ اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے بھائیوں اور دیگر معروف اور بزرگ لوگوں کو کسی کی موت کی خبر دے مگر منادی اور اعلان نہ کرے۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ موت اور نماز جنازہ کی محض خبر دینا جائز ہے اور بلند آواز سے

منادی کرنا یا نقارہ بجانا بدعت ہے' اس سے بچنا چاہیے۔

از عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد-۲۳' شمارہ-۴۳' مورخہ ۲۶/ مئی سنہ-۱۹۷۲ء

جنازہ کے لیے سپیکر پر اعلان

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسائل میں؟

(۱) نماز جنازہ کے لیے سپیکر پر مسجد میں اعلان کرنا کہ فلاں وقت نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ یا فلاں شخص فوت ہو گیا ہے اور ازروئے شریعت جائز ہے کہ نہیں یا صحابہ کرام' تابعین و اتباع تابعین و دیگر سلف و صالحین سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ کسی نے کسی کی وفات پر مسجد میں بذریعہ لاؤڈ سپیکر وغیرہ سے جنازہ کا اعلان کیا ہو؟

جواب بعون الوہاب: نماز جنازہ کے لیے اعلان کرنا جائز ہے۔ سنن سعید بن منصور میں ابراہیم نخعی کا قول ہے: لا باس اذا مات الرجل ان یوذن صدیقه واصحابه (نیل جلد-۴' ص-۵۶) یعنی "جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اپنے دوست اور رشتہ داروں اور رفیقوں کو خبر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

ابوداؤد میں حصین بن وحوح انصاری سے روایت ہے کہ طلحہ بن براء بیمار تھے اور قریب المرگ تھے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب یہ فوت ہو جائے' فاذنونی به (تو مجھے خبر دینا)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جنگ موتہ کے شہداء کے فوت ہونے کی خبر دی۔ فالحاصل ان الاعلام للغسل والتكفين والصلوة والعمل والدفن مخصوص من عموم النهي الخ (نیل جلد-۴' ص-۵۷) یعنی "حاصل کلام کا یہ ہے کہ غسل' کفن و دفن اور نماز جنازہ کے لیے خبر دینا عموم نہی سے مخصوص ہے کہ یہ جائز ہیں۔"

محمد عبداللہ' ادارہ علوم اثریہ لائل پور (فیصل آباد)

تعاقب از عارف حصاری: واضح ہو کہ اس فتویٰ کے مفتی صاحب کوئی معمولی عالم یا مولوی نہیں ہیں بلکہ ادارہ علوم اثریہ کے شیخ الحدیث اور مفتی اعظم ہیں۔ جن کا اسم گرامی شیخ مولانا عبداللہ صاحب محدث لائل پوری مدظلہ العالی ہے۔ لیکن حیرانگی یہ ہے کہ انہوں

نے فتویٰ ایسا صادر کیا ہے جو ان کے شایان شان نہیں ہے۔ باوجودیکہ خود محدث اور شیخ الحدیث ہیں اور بلند پایہ محدث مرحوم کے شاگرد ہیں۔ پھر ایسا سادگی سے فتویٰ لکھا ہے کہ وہ سوال کے مطابق نہیں ہے جبکہ اس مقولہ کا مصداق ہے "سوال از آسمان جواب از ریسمان" یا یوں کہئے سوال گندم جواب چنا۔ اہل علم اور ناظرین دانشور خود سوال و جواب پڑھ کر غور فرمالیں کہ سوال سائل کا لاؤڈ سپیکر پر مسجد میں منادی کرنے کا ہے۔ جیسا کہ عام رواج ہے کہ دیہات اور شہروں میں ایسا کر رہے ہیں لیکن حضرت مفتی نے ادارہ علوم اثریہ کے سمندر علمی میں غوطہ لگا کر جواہرات نکالے ہیں وہ یہ ہیں کہ موت کی خبر کرنا' اپنے احباب رشتہ داروں اور رفیقوں کو جائز ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ عام منادی کرنا اور چیز ہے اور کسی شخص کا اپنے احباب اور اقرباء سے ملتے ہوئے کسی کی موت کی خبر بتانا اور چیز ہے۔ سائل کا سوال اول صورت سے ہے' دوسری کے جائز ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو سب مسلمان ایک دوسرے کو خبر بتا کر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ نہ اس میں اختلاف ہے کہ اپنے امام عالم کو خبر دے کر بلانا جائز ہے' نہلانے والے کو اطلاع دے کر غسل کروانا جائز ہے اور قبر کھودنے والوں کو بلانا اور بتانا جائز ہے۔

لیکن لاؤڈ سپیکر پر اعلان اور منادی کرنا یا بازاروں میں کسی ڈھنڈورچی کو بھیج کر منادی کرانا کہ فلاں شخص یا خان صاحب یا چودھری یا لیڈر یا صدر مملکت یا وزیراعظم یا مجسٹریٹ یا سشن جج یا شیخ الحدیث یا علامہ محدث وغیرہ کا نام لے کر اعلان اور منادی کرنا اور نماز جنازہ کا وقت بتلانا تاکہ اس وقت لوگوں کا کثیر اجتماع ہو جائے بلکہ کسی عالم کے جنازہ کو روک رکھنا اور دور دور کے شہروں کے علماء اور عوام کو بذریعہ تار یا ٹیلیفون کے خبر دے کر جنازہ پر بلانا یہ صورت جائز ہے یا نہیں' سائل کا مقصد یہی ہے۔

حضرت العلام مولانا عبداللہ صاحب محدث لائل پوری کو اس صورت کا مدلل جواب دینا چاہئے تھا۔ ان کے پاس ماشاء اللہ کتب شرعیہ کا اس قدر ذخیرہ ہے کہ اس کا نصف حصہ بھی اس قلیل البضاعۃ کے پاس نہیں ہے۔ لیکن ان کا فتویٰ محدثانہ نہیں ہے اور نہ فقیہانہ ہے بلکہ عامیانہ ہے اور طرز استدلال علماء اہل حدیث کا نہیں ہے بلکہ اہل رائے اور زمانہ کی مصلحت پر مبنی ہے۔ سائل نے عرض کیا تھا کہ فتویٰ ازروئے شریعت محمدیہ کے دیا جائے اور آنجناب نے سب سے پہلے ابراہیم نخعی پیشوا اہل رائے کا قول پیش کر دیا ہے جو سوال کے

جواب سے دور ہے۔ ابراہیم نخعی یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے احباب اور ساتھیوں کو یہ بتادے کہ فلاں شخص فوت ہوگیا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

یہ دلیل سائل کے سوال کا جواب نہیں ہے۔ مفتی صاحب محدثانہ طرز استدلال اختیار کرتے تو یوں جواب دیتے کہ منتقی الاخبار مع نیل الاوطار کے جلد۔۴' ص۔۵۶ پر یوں باب منعقد کیا گیا ہے "باب ماجاء فی کراھیة النعی" یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ موت کا اعلان کرنا مکروہ ہے۔ اور ترمذی شریف کا حوالہ دیتے کہ اس کے ص۔۱۱۷ میں "باب ماجاء فی کراھیة النعی" پھر آپ یہ حدیث مرفوع پیش کرتے عن حذیفة رضی اللّٰہ عنہ قال اذا مت فلا تئوذنوا بی احدا فانی اخاف ان یکون نعیا وانی سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینھی عن النعی (ھذا حدیث حسن) یعنی حضرت حذیفہ صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب میں فوت ہو جاؤں تو میری موت کی عام طور پر خبر نہ کرنا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ خبر کرنا نعی کی صورت اختیار نہ کر جائے۔ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے موت کی خبر عام پھیلانے اور مشہور کرنے سے منع فرمایا ہے۔ باب اور حدیث سے نعی کی ممانعت ثابت ہے۔ پھر امام ترمذی نے یہ حدیث پیش کی ہے جو پہلی حدیث کی موید ہے: عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ایاکم والنعی فان النعی من عمل الجاھلیة قال عبداللّٰہ والنعی اذان بالمیت۔ یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میت کا اعلان کرنے سے بچو کیونکہ اعلان کفر کے زمانہ کی رسم ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اعلان اور منادی کرنی کفر کے زمانہ کی رسم ہے۔ اس سے بچو۔

امام ترمذی فرماتے ہیں قد کرہ بعض اھل العلم النعی۔ یعنی بعض علماء نے نعی کو برا سمجھا ہے۔ پھر امام ترمذی فرماتے ہیں۔ والنعی عندھم ان ینادی فی الناس بان فلانا مات یشھدوا جنازتہ۔ یعنی نعی عربی محاورہ میں اہل علم کے نزدیک یہ ہے کہ لوگوں میں عام منادی کرنی کہ فلاں شخص فوت ہوگیا ہے۔ اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس میت کے جنازہ پر حاضر ہو جائیں۔ پھر ابراہیم نخعی کا قول لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے رشتہ دار کو بتادے کہ فلاں شخص مرگیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دیگر اہل علم نے بھی یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے قریبی کو اور اپنے بھائیوں کو خبر کر دے کہ فلاں شخص مرگیا ہے تو اس

میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

اس صراحت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ موت کی خبر ایک دوسرے کو بتانا تو جائز ہے لیکن منادی بازاروں میں اور سپیکر پر کرنا منع ہے۔ اس سے سائل کا سوال حل ہو گیا ہے کہ مسجد میں جو عام منادی کرتے ہیں کہ فلاں شخص فوت ہو گیا ہے' یا فلاں شخص کا جنازہ تیار ہے نماز کے لیے حاضر ہو جاؤ' یہ منع ہے۔ اگر منادی کرنا جائز ہوتا تو اذان اور تثویب جائز کی جاتی۔ حالانکہ یہ فرض کفایہ ہے۔ اس کے لیے ندا' اذان اور تثویب مشروع نہیں کی گئی۔ اس لیے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جو اعلم بالراد ہیں' اپنی قوم کے کسی میت کی عام خبر پھیلانے سے منع کرتے تھے۔

چنانچہ مسند احمد جلد-۷' ص-۱۴۴ باب ماجاء فی النعی المیت کے تحت یہ حدیث ہے عن حذیفة ابن الیمان رضی اللّٰہ عنه انه کان اذا مات لا توذ نوابه احدا انی اخاف ان یکون نعیا ای سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ینهی عن النعی۔ یعنی "حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جب ان کا کوئی شخص فوت ہوتا تو اس کی عام طور پر خبر نہ کرتے اس اندیشہ سے کہ کہیں یہ اس نعی کی صورت اختیار نہ کر جائے جو منع ہے کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ آپ کسی کی موت کا اعلان کرنے سے منع فرماتے تھے۔ اب مفتی صاحب انصاف کریں کہ جب صحابی بصورت احتیاط عام خبر پھیلانے سے منع فرماتے تو لاؤڈ سپیکر کی منادی کیسے جائز ہو گی؟ یہ تھا محدثانہ استدلال جس سے آپ نے دور رہ کر عامیانہ سہل روی کا طریقہ اختیار کیا کہ موت کی خبر دینی جائز ہے کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا۔ آپ نے قصر ادارہ علوم اثریہ میں چسپاں کر دیا جو شان محدثانہ نہیں ہے۔

آپ یہ بھی جانئے کہ منادی اور اعلان اور اعلام اور اذان بالمیت میں بہت فرق ہے۔ منادی کا معنی ہے پکارنے والا' اعلان کا معنی ہے مشتہر کرنا' کھولنا' پھیلانا' ظاہر کرنا۔ دونوں کا مطلب یہ ہوا کہ بازاروں میں یا لاؤڈ سپیکر پر کوئی شخص پکار کر اعلان کرے اور خبر پھیلائے کہ فلاں شخص مر گیا ہے یا یہ کہے کہ فلاں شخص کا جنازہ تیار ہے یا فلاں شخص وفات پا گیا یہ نعی ممنوع ہے۔ اعلام اور اذان بالمیت یہ ہے کہ اپنے کسی دوست یا رشتہ دار یا اپنے امام کو یہ اطلاع اور خبر دے کہ فلاں شخص مر گیا ہے۔ یا یہ کہے کہ فلاں شخص کی نماز جنازہ تیار ہے۔ یہ ایک دوسرے کو بتانا درست ہے۔ جن احادیث میں اذان بالمیت کا ذکر ہے' اس سے

یہی صورت مراد ہے' منادی مراد نہیں ہے' فافترقا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے احتیاطاً اس دوسری صورت اعلام سے بھی پرہیز کیا کہ کہیں یہ صورت اعلان ممنوعہ کی نہ ہو جائے۔ چنانچہ لفظ انی اخاف اس مراد کا مظہر ہے' فتذکروا۔

اس لیے سائل نے کہ وہ بھی ایک عالم ہے' سوال نمبر۔۴ میں یہ لکھا ہے کہ کسی کی وفات کی صرف ایک دوسرے کو خبر دینے اور بذریعہ سپیکر اعلان کرنے میں کیا فرق ہے اور ان دونوں میں سے کون سی چیز پر عمل کرنا جائز ہے؟ تو مفتی صاحب نے پہلو تہی کرتے ہوئے اس کا جواب نہ دیا۔ اور صرف یہ لکھنے پر کفایت کی کہ اس سوال کا جواب نمبر۱ میں آگیا ہے۔ حالانکہ اس کا جواب بالکل نہیں آیا۔ اگر آیا ہوتا تو سائل عارف حصاری کے پاس اس مسئلہ کا عرفان حاصل کرنے کو فتویٰ کیوں بھیجتا۔ عوام تو آپ کے فتویٰ سے دھوکہ یا مغالطہ کھا سکتے ہیں۔ عالم کو تسلی بغیر دلیل شرعی کے نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ شرعی حکم اور صورت اور ہے اور رواج عام اور ہے۔ دیہات میں جہاں سپیکر نہیں ہے' وہاں نقارہ بجاتے ہیں' یہ بھی بدعت ہے۔ دیہاتی مولوی اس کو بھی جائز کہتے ہیں کہ یہ بھی اعلام اور اذان بالمیت کی صورت ہے۔ یہ بھی مفتی صاحب کی طرح قیاس کرتے ہیں۔ یہ قیاس مردود ہے۔ نقارہ بجانا بھی اعلان اور منادی میں شمار ہے' جو ممنوع ہے۔

پھر مفتی صاحب نے ابوداؤد کے حوالہ سے حصین بن وحوح انصاری کی حدیث پیش کی ہے۔ اس میں بھی منادی اور اعلان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف یہ ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قریب المرگ ہے۔ جب یہ فوت ہو جائے تو اس کی مجھے خبر دینا۔ یہ کسی دانشمند کے نزدیک بھی منادی نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ آنجناب نے منادی اور نعی کی تعریف کے پیش نظر جواب نہیں لکھا ہے۔ پھر تیسری دلیل جنگ موتہ کے شہداء کی خبر کرنے کی پیش کی ہے کہ یہ بھی سوال کے مطابق نہیں ہے۔ لفظ اذان کئی محاوروں میں مشترک ہے۔ لغوی معنی اس کے آگاہ کرنے کے ہیں' شرعی معنی یہ ہیں کہ نماز کے لیے پکارنا جیسے صلوات خمسہ کے لیے اذان دی جاتی ہے کہ اس میں پکارنے کا مفہوم ہے۔ جب کسی بات کی خبر دی جائے تو اس کو بھی اذان کہتے ہیں۔ جیسے جھاڑو دینے والی عورت کو رات کو دفن کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ کی تو آپ نے فرمایا الا اذنتمونی یعنی تم نے مجھے خبر کیوں نہ دی۔ اور ایک حدیث میں ہے: فاذا فرغتن فاذنتنی یعنی تم میت کے غسل سے فارغ ہو جاؤ تو

مجھے خبر دینا۔ اس طرح شہدا کی آپ نے لوگوں کو خبر دی' نجاشی کی وفات کی خبر دی۔ یہ نعی ممنوع نہیں ہے۔

نعی کی تعریف جلد-۴' ص-۵۶ میں نہایہ کے حوالہ سے یہ لکھی ہے: نعی المیت نعیا اذا اعلن بموته واخبربه کہ میت کی نعی یہ ہے کہ اس کی موت کا اعلان کرنا اور اس کی لوگوں کو خبر دینا۔ پھر فتح الباری کے حوالہ سے یہ لکھا ہے: انما نهی عما كان اهل الجاهلية يصنعونه وكانوا يرسلون من يعلن بخبر موت الميت على ابواب الدور والاسواق یعنی کفر کے زمانہ کے لوگ جو نعی کرتے تھے' اس سے منع فرمایا اور وہ یہ ہے کہ اہل میت کسی کو بھیجتے تاکہ وہ لوگوں میں عام اعلان کر دے کہ فلاں شخص مر گیا ہے۔ وہ لوگوں کے دروازوں پر اور بازاروں میں اعلان کرتا پھرتا۔ اس واسطے ابن عون نے کہا کہ قلت لابراهيم هل كانوا يكرهون النعي قال نعم کہ میں نے ابراہیم نخعی سے پوچھا کہ صحابہ کرام نعی کو مکروہ جانتے تھے۔ اس نے کہا ہاں۔ انما كان يكره ان يطاف في المجالس کہ مکروہ یہ ہے کہ منادی کو مجلسوں میں پھرایا جائے کہ فلاں شخص فوت ہو گیا ہے' اعلان اور منادی کی صورت ہے جو شرعاً منع ہے۔

پھر امام شوکانی نے نعی کے تین حالات بیان کئے ہیں۔ اول یہ کہ اپنے رشتہ داروں کو اور دوستوں کو اور صالح لوگوں کو موت سے آگاہ کرنا' یہ تو سنت ہے۔ دوسرا یہ کہ اعلان کرنا کہ لوگ کثرت سے جمع ہو جائیں اور وہ فخر کریں کہ ہماری میت پر اجتماع کثیر تھا۔ تیسرا یہ کہ نوحہ اور بین کر کے لوگوں کو خبردار کرنا یہ دونوں حرام ہیں' پہلا جائز ہے۔ پہلے اعلام میں صرف ایک دوسرے سے ذکر کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص فوت ہو گیا ہے۔ یہ اعلان عام نہیں ہے۔ مجمع الزوائد جلد-۳ میں ہے عن ابن عباس قال جاء رجل يوذن بجنازة الناس فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ايها الناس سلوا الى الله لموتاكم ولا تنادوا بهم الناس رواه الطبرانی فی الكبير۔ یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ ایک شخص لوگوں میں جنازہ کی منادی کرتا ہوا آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! تم اپنے مردوں کی بابت اللہ تعالیٰ کی طرف سوال کرو اور لوگوں میں ان کے متعلق منادی نہ کرو۔

توضیح الکلام بر فتاویٰ علماء کرام: سابق مفتی صاحب کا نظریہ درست ہے۔ لیکن سوال کے جواب میں تشنگی ہے' جس کی وضاحت ضروری ہے۔ سوال میں یہ دریافت کیا گیا ہے کہ نماز جنازہ کے لیے لاؤڈ سپیکر میں اعلان کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا صحابہ کرام' تابعین اور تبع تابعین سے اعلان کا ثبوت ملتا ہے یا کہ نہیں۔ جواب یہ تھا کہ اصل مقصد رشتہ داروں' دوستوں اور دیگر صلحاء کو میت کی بخشش کی سفارش کے لیے مدعو کرنا ہے اور ساتھ ہی اہل میت کی ہمدردی' دلجوئی اور تعزیت بھی ہو جائے۔ باقی رہا سپیکر کا استعمال سو یہ دور حاضر کی ایجاد ہے۔ جس کے استعمال پر علماء کرام کا عموماً اتفاق ہو چکا ہے اور اس کی ممانعت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ البتہ یہ صرف جواز ہے فرض یا واجب نہیں ہے۔ سپیکر کے مسئلہ پر تفصیلی بحث فتاویٰ علماء حدیث کی جلد چہارم کے صفحہ ۸۷' ۹۷ پر گزر چکی ہے۔ جس میں مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ اور شیخ الحدیث مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کے خیالات ہیں۔

باقی محقق عارف حصاری صاحب مدظلہ کے تعاقب میں افراط و تفریط ہے۔ بعض ایسی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس کے نہ صرف سابق مفتی (مولانا محمد عبداللہ صاحب) بلکہ جماعت اہلحدیث کا کوئی فرد بھی قائل نہ ہو گا۔ مثلاً گلی کوچوں اور بازاروں میں ڈھنڈورچی بھیج کر منادی کرانا وغیرہ۔ محترم حصاری صاحب نے نعی المیت کی جو تعریف نہایہ ابن الاثیر اور فتح الباری سے نقل کی ہے' وہ صحیح ہے لیکن "مانحن فیه" سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یعنی کفر کے زمانہ میں لوگ جو نعی کرتے تھے' وہ یہ ہے کہ اہل میت کسی کو بھیجتے تاکہ وہ عامتہ الناس میں اعلان کر دے کہ فلاں شخص مر گیا ہے۔ وہ لوگوں کے دروازوں پر اور بازاروں میں اعلان کرتا تھا۔ اسی نعی کے بارے میں ابن عون نے ابراہیم نخعی سے دریافت کیا تھا کہ هل كانوا يكرهون النعى یعنی کیا صحابہ کرام نعی کو مکروہ جانتے تھے؟ تو ابراہیم نے جواب دیا انما يكره ان يطاف فى المجالس یعنی منادی کو مجالس میں پھرانا مکروہ ہے۔ منادی اور اعلان کی یہ صورت شرعاً منع ہے۔ پھر محقق شہیر نے نعی کے بارے میں امام شوکانی سے تین صورتیں ذکر کی ہیں۔ اول یہ کہ اپنے رشتہ داروں' دوستوں اور دیگر صلحاء کو مطلع کرنا یہ تو درست ہے۔ دوم یہ کہ اعلان کرنا تاکہ لوگ بکثرت جمع ہو جائیں اور اہل میت اس کثرت پر فخر کریں۔ سوم یہ کہ نوحہ اور بین کر کے لوگوں کو خبردار کرنا آخری دونوں صورتیں ناجائز

ہیں۔ سپیکر میں اعلان کرنا منادی اور ڈھنڈورہ نہیں ہے بلکہ اعزاء و اقربا اور احباب کو اطلاع دینے کا ایک طریقہ ہے جو پہلی صورت میں داخل اور جائز ہے۔ عبدالقادر عارف حصاری

فتاویٰ علماء حدیث باب التعزیت۔ ہفت روزہ الحدیث لاہور جلد ۲' شمارہ ۳۰

جنازہ لے جاتے وقت میت کا رخ کس طرف ہو؟

سوال : اگر گاؤں کا قبرستان مشرق کی جانب ہو تو میت کے پاؤں کس طرف کریں؟ قبرستان کی طرف یا مغرب کی جانب؟ جواب باصواب سے مستفیض فرمائیں۔

جواب : از حضرت مولانا عبدالقادر صاحب حصاری مدظلہ۔

میت کو قبرستان کی طرف چارپائی پر سر کی جانب سے لے جایا جاتا ہے۔ انسان ماں کے پیٹ سے نکل کر باہر دنیا میں آیا ہے تو سر کی جانب سے آیا ہے۔ اب دنیا سے رخصت بھی سر ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ قبر میں بھی اس کی پائنتی کی طرف میت کو رکھ دیں اور جب داخل کریں تو سر کی طرف سے اس کو آہستہ کھینچ کر قبر میں اتار دیں۔ جب انسان سوتا ہے تو سر کو تکیہ پر رکھ کر قبلہ رخ منہ کر کے سوتا ہے۔ جس طرح قبر میں میت کو رکھا جاتا ہے' اسی طرح چارپائی پر سونا مسنون ہے۔ حدیث میں النوم اخت الموت آیا ہے کہ نیند موت کی بہن ہے۔ دونوں میں منہ قبلہ کی طرف ہونا چاہیے اور لیٹنے کی ایک ہی صورت ہے' دوسری خلاف سنت ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس صورت میں پاؤں قبلہ کی طرف ہو جائیں گے تو گذارش ہے قطع نظر اس کے قبلہ کی طرف پاؤں کرنے کی ممانعت میں کوئی شرعی دلیل موجود بھی ہے یا نہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی جگہ میں قبلہ مشرق کی طرف ہو تو سر کے بل لے جانے سے میت کے پاؤں قبلہ کو نہ ہو جائیں گے؟ لہٰذا یہ خیال ہی درست نہیں' اسے غلط العوام کہنا چاہیے۔ اس کی کوئی دلیل شرع میں نہیں۔ یہ ادب شرعی ادب نہیں ہے۔ شرعی ادب یہ ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے پیشاب پاخانہ نہ کیا جائے۔ قبلہ کی طرف تھوکا نہ جائے۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ قبلہ کی طرف پاؤں نہ کرو بلکہ بروئے حدیث بیت اللہ سے مومن کی عزت زیادہ ہے۔ مومنوں نے بیت اللہ بنایا ہے اور مومنوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن بیت اللہ میں اپنے پاؤں رکھتا ہے اور بیت اللہ کی چھت پر چڑھتا ہے اور اس کے اندر اپنے پاؤں رکھ کر داخل ہوتا ہے۔ اگر پاؤں بیت اللہ کی طرف کرنے منع ہوں تو پھر اس

اندر پاؤں رکھنے بطریق اولیٰ منع ہونے چاہئیں کیونکہ اس میں زیادہ بے ادبی ہے۔ فتاویٰ اہلحدیث جلد-۲' ص-۲۱ پر سوال و جواب یوں درج ہے "قبلہ کی طرف پاؤں پھیلانے یا چارپائی کی پائیں کرنے کی ممانعت میں کوئی حدیث وارد ہے؟ اگر کوئی شخص عمداً قبلہ کی طرف کرے تو کیا وہ ازروئے شریعت مجرم ہے؟ جواب: قبلہ کی طرف پاؤں کرنے کی ممانعت میں کوئی صریح حدیث نہیں آئی۔ اس میں تشدد نہ کیا جائے۔"

عبداللہ امرتسری روپڑی۔

علاوہ ازیں ہمارے درس نظامی میں متداول فقہ حنفی کی کتاب قدوری کے حاشیہ ص-۷ توضیح ضروری ص-۳ میں ہے وفی در المختار ام یوضح مستلقیاً علی قفاہ نحو القبلہ لانہ الیسر لخروج روحہ یعنی پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ کسی شخص کی موت کا وقت ہو تو اس کو گدی کے بل چت لٹا دو اور اس کا منہ قبلہ کی طرف کر دو تاکہ روح آسانی سے نکل جائے۔ کذا فی الہدایہ۔ کچھ شک نہیں کہ جب انسان کو چت لٹا کر منہ قبلہ کی طرف کیا جائے تو اس کے پاؤں قبلہ کی طرف ہو جائیں گے۔ اگر قبلہ کی طرف پاؤں کرنا قبلہ کی تعظیم کے خلاف ہوتا تو حنفیہ دائیں پہلو پر لٹانا پسند کرتے کہ اس طرح بھی منہ قبلہ کی طرف ہو جاتا ہے لیکن انہوں نے استلقاء کو پسند کیا ہے۔ علاوہ اس کے ہدایہ میں صلوۃ المریض ص-۱۴۱ میں یہ لکھا ہے وان لم یستطع القعود استلقی علی ظھرہ وجعل رجلیہ الی القبلۃ واومی بالرکوع والسجود۔ یعنی "جو شخص بیمار ہے وہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ پشت کے بل لیٹ کر اور اپنے دونوں پاؤں قبلہ کی طرف کر کے اشارہ سے نماز پڑھے" اور حاشیہ میں اس پر ایک حدیث ذکر کی ہے۔ اخرجہ الدارقطنی یصلی المریض قائما فان لم یستطع فقاعدا فان لم یستطع یصلی مستلقیا ورجلاہ ممایلی القبلۃ یعنی "دارقطنی نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ مریض کھڑا ہو کر نماز پڑھے۔ اگر بیٹھ کر نماز کی طاقت نہیں رکھتا تو گدی کے بل لیٹ کر پاؤں قبلہ کی طرف کر کے اشارہ سے نماز پڑھے۔" اگر قبلہ کی طرف پاؤں کرنا قبلہ کے ادب و تعظیم کے خلاف ہوتا تو اس طرح نماز نہ پڑھائی جاتی۔ یہ جواب حنفی مذہب کی رو سے ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پاؤں قبلہ کی طرف کرنا کسی مذہب میں بھی منع نہیں ہے۔ تو جنازہ لے جانے میں پاؤں کیسے منع ہو گئے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔ (۸/ شعبان

سنہ-۱۳۹۴ھ)

از عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد-۲۶' شمارہ-۲۵' مورخہ ۱۷/ جنوری سنہ-۱۹۷۵ء

جواب نمبر-۲ : از حضرت استاذ الاساتذہ مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ الجواب ھو الموفق للصواب-

شریعت میں کوئی پابندی نہیں ہے- کیونکہ بعض وقت گلیوں میں گزارتے وقت اس کی پابندی کہ قبلہ کی طرف پاؤں نہ کیے جائیں' یہ عمل ہونا مشکل ہے- قرآن مجید میں ہے ما جعل اللّٰه عليكم في الدين من حرج- اس واسطے سر کو آگے کی طرف کرنا موزوں ہے' یہی درست ہے- العبد: محمد گوندلوی ۸/ شعبان سنہ-۱۳۹۴ھ)

جواب نمبر-۳ : از حضرت مولانا سلطان محمود صاحب جلال پوری سابق شیخ الجامعۃ السلفیہ لائل پور-

الجواب اس بارہ میں کوئی مرفوع حدیث یا اثر موقوف دیکھنے میں نہیں آیا- اسلاف کا تعامل اس بات پر ہے کہ سر آگے رکھا جائے- اور فقہ حنفیہ میں اس طرح ذکورہ نور ایضاح شرح وقایہ اور ہدایہ وغیرہ میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے- ھذا ما عندي واللّٰه اعلم بالصواب- (سلطان محمود بقلم خود جامعہ سلفیہ مہر جامعہ سلفیہ لائل پور پاکستان (۱۱-۸-۷۴-۱۹ء)

جنازہ میں شریک ہونے والوں کے اوصاف

سوال : شریعت محمدیہ کا کیا حکم ہے اس مسئلہ میں کہ جس حدیث میں آتا ہے کہ جس جنازہ پر چالیس آدمی ہوں وہ میت بخشی جاتی ہے- وہ چالیس کن کن اوصاف کے حامل ہوں- مثلاً موحد ہوں' نمازی ہوں' نیک صالح ہوں یا کہ مشرک و بدعتی ہوں' بے نماز فاسق و فاجر ہوں' یا کہ صرف چالیس کی گنتی پوری ہو-

السائل مولوی عبدالرحمٰن ساکن چک-۴۹۷ ضلع لائل پور

الجواب بعون الوھاب : الحمد للہ رب العالمین! امابعد فاقول وباللہ التوفیق- واضح ہو کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی کتاب الجنائز کے ص-۱۳۶ میں یہ حدیث ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ کوئی

مسلمان فوت ہوا ہو اور اس پر ایک جماعت مسلمانوں نے جنازہ پڑھا ہو اگرچہ ان کی تعداد سو تک نہ پہنچتی ہو اور وہ بیک زبان اس میت کے لیے دعا سفارش کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت اس میت کے حق میں قبول فرماتا ہے۔

دوسری حدیث اسی صفحہ پر ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ماصف صفوف ثلاثة من المسلمین علی میت الا اوجب یعنی "جس میت کا تین صفیں مسلمانوں کی جنازہ پڑھیں تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔" اور مسلم' ابوداؤد' مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اربعون رجلا لا یشرکون باللّٰہ شیئا الا شفعهم اللّٰه فیه۔ یعنی "چالیس شخص ایسے ہوں کہ انہوں نے شرک نہ کیا ہو' وہ کسی میت کے حق میں شفاعت کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت قبول فرماتا ہے۔" ان احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ میت بھی مسلمان ہو اگرچہ وہ گنہگار ہو اور جنازہ پڑھنے والے بھی مسلمان ہوں کہ ان میں نام کا مسلمان کوئی مشرک نہ ہو۔ اور وہ تین صف باندھ کر نماز جنازہ پڑھیں تو وہ میت باذن الٰہی بخشا جاتا ہے۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ اگر میت مسلمان نہ ہو تو ہزار مسلمان بھی اگر اس کا جنازہ پڑھیں تو بھی وہ ہرگز بخشا نہ جائے گا۔ مثلاً میت قبر پرست ہو یا تعزیہ پرست یا مرزائی ہو یا بے نماز ہو یا منکر حدیث ہو جس پر بروئے شریعت الٰہی شرک و کفر کا حکم عائد ہو سکے تو نہ اس کا جنازہ پڑھنا جائز ہے اور نہ ہی نماز جنازہ پڑھنے والوں کی اس کے بارہ میں سفارش قبول ہے۔ قبر پرستوں اور تعزیہ پرستوں' مرزائیوں کا کفر و شرک تو ظاہر ہے اور منکرین حدیث کا بھی کفر اہل حق میں مسلم ہے۔ باقی بے نمازوں کے متعلق بعض علماء کو کلام ہے جن کے مسلک کے حوصلہ پر اس دور ضلالت میں بے نمازوں کی اکثریت ہو گئی ہے اور ایسے علماء ان کا جنازہ کر رہے ہیں حالانکہ بے نمازوں کا کافر اور مشرک ہونا بروئے قرآن اور حدیث منصوص ہے اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ اسی طرح جنازہ پڑھنے والوں کا بھی بروئے شرع محمدی مسلمان ہونا ضروری ہے کہ وہ نام کے مسلمان نہ ہوں۔ مثلاً ان میں اہل بدعت قبوری نہ ہوں' رافضی یا مرزائی نہ ہوں اور بے نماز نہ ہوں ورنہ ایسے لوگوں کی سفارش ہرگز قبول نہ ہو گی کیونکہ ایسے فرقے کے لوگ درگاہ الٰہی میں سفارش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ علاوہ ان کے جو مسلمان نماز جنازہ پڑھنے والے ہیں وہ نماز جنازہ میں اس کے شرائط اور فرائض سے

واقف اور ان پر عامل ہوں۔ ورنہ ان کی بھی سفارش قبول نہ ہو گی۔ اگرچہ وہ کتنے ہی پکے مسلمان ہوں۔ چنانچہ نماز جنازہ کے شرائط اور فرائض یہ ہیں:

(۱) وضو یا عذر ہو تو تیمم (۲) نیت دل میں کہ یہ نماز واسطے اللہ کے ہے اور دعا سفارش واسطے میت کے پڑھتا ہوں (۳) توجہ الی القبلہ (۴) قیام (۵) تکبیر تحریمہ (۶) سورہ فاتحہ پڑھنا (۷) چار تکبیریں کہنا (۸) درود شریف پڑھنا (۹) میت کے لیے دعا سفارش پڑھنا (۱۰) سلام پھیرنا۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔

پس اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کو بھی عمداً چھوڑ دے گا تو اس کی نماز نہ ہو گی اور اس کا جنازہ میں شامل ہونا بالکل بیکار اور محض لحاظ داری اہل میت یا ریا نمود اور محض نمائش ہے۔ اس دور حاضرہ میں عام طور پر بعض میتوں پر شہروں اور دیہات میں نماز جنازہ کے لیے اجتماع کثیر اور بڑا انبوہ ہوتا ہے جس پر اہل میت اور دیگر احباب میت کے بہت خوش ہوتے ہیں کہ یہ بہت خوش قسمت تھا جس پر سینکڑوں' ہزاروں مسلمانوں نے جنازہ پڑھا ہے۔ حالانکہ چھان بین کرنے سے امام اور صرف چند لوگ بمشکل صحیح طریقہ پر ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ایسا دور ہے جو اس حدیث کا مصداق ہے۔

چنانچہ مستدرک حاکم جلد-۴' ص-۴۴۲ میں ہے۔ عبداللہ بن عمر نے فرمایا: یاتیی علی الناس زمان یجتمعون فی المساجد لیس فیھم مومن یعنی لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ مسجدوں میں بہت جمع ہوں گے لیکن ان میں مومن کوئی نہ ہو گا۔ یہ اگرچہ بظاہر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے لیکن مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کہ اس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ خبر غیبی کا مظہر ہے۔ اس میں قیاس نہیں ہو سکتا۔ پس یہ حدیث مرفوع حکمی ہے یعنی گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہ فرقوں کا دور دورہ ہے۔ مرزائیوں کی مسجدوں میں جاؤ مومن نہ ملے گا۔ اہل بدعت قبر پرستوں کی مسجدوں میں جاؤ مومن موحد نہ ملے گا۔ رافضیوں کی مسجدوں میں جاؤ تو وہاں کوئی مومن نہ ملے گا۔ علیٰ ہذالقیاس اکثریت مدعیان اسلام کی حالت خراب ہے۔ پھر بے نمازوں کی ہر جگہ بھرمار ہے۔ تو جنازوں میں سب ہی مذہبوں کے لوگ شامل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً بے نماز بھی ہوتے ہیں جو کافر خارج از اسلام ہیں اور یہ لوگ جنازہ میں صرف نمائش اور لحاظ ملاحظہ کے طور آتے ہیں۔ جن کا کچھ اعتبار نہیں تو ایسے لوگوں کی شمولیت سے میت کو کچھ فائدہ نہیں

ہے۔ علاوہ اس بات کے یہ امر ہے کہ عوام کو نماز جنازہ کی ادعیہ سفارش نہیں آتی ہیں۔ صرف فاتحہ درود پڑھ لیتے ہیں۔ فاتحہ سے تو اللہ تعالیٰ کا حق ادا ہوا اور درود سے نبی اکرم ﷺ کا حق ادا ہوا۔ جب دعاء سفارش کا موقعہ آیا تو اکثر شرکاء جنازہ عوام ایسے جاہل ہیں کہ ان کو جنازہ کی دعاء نہیں آتی تو انہوں نے میت کا حق ادا نہ کیا۔

حدیث میں یہ الفاظ ہیں فیشفعوا له الا شفعوا فیه کہ وہ سب لوگ شرکاء جنازہ اس میت کے حق میں سفارش کی دعا کریں۔ تو اللہ تعالیٰ اس میت کے بارہ میں ان کی شفاعت قبول کر لیتا ہے۔ جب انہوں نے سفارش ہی نہیں کی تو میت کو کیا فائدہ۔ پس میت کا حق ادا نہ ہوا پس دعا پڑھنی فرض ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء یعنی جب تم میت پر نماز پڑھو تو اس کے لیے خاص طور پر دعا کرو۔ پس جب نماز جنازہ پڑھنے والے اکثر مشرک اور بدعتی اور بے نماز اور بلا دعاء سفارش پڑھنے والے ہوئے تو میت کو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ صرف اکیلا امام دعاء سفارش کرے جس نے الفاظ اور جنازہ کا معاوضہ لینا ہے۔ تو پھر ایسے لوگوں اور بیکار اماموں سے میت کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اہل میت کو یہ ہدایت ہے کہ وہ کسی عالم متقی موحد اہل سنت والجماعت سے نماز جنازہ پڑھوائیں اور چالیس اشخاص موحد نمازی اہل سنت والجماعت کو ساتھ لاویں جو دعاء جنازہ کی جانتے ہوں اور اہل سنت اہل حدیث کا دوسرا نام ہے۔ آج کل کے مشرک مبتدعین نام نہاد اہل سنت مراد نہیں ہیں اور امام نماز اور اہل میت کو چاہیے کہ مشرکوں' بدعتیوں' بے نمازوں اور دعاء جنازہ نہ جاننے والوں کو جنازہ میں شامل ہونے سے روک دیں کہ یہ جائز ہے۔ چنانچہ تفسیر در منثور جلد-۳' ص-۲۷۲ میں ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم کو نبی کریم ﷺ نے ایسا خطبہ سنایا کہ میں نے کبھی ایسا خطبہ نہ سنا تھا۔ آپ نے یہ فرمایا کہ تمہارے یہاں جمعہ میں کئی لوگ منافقین ہیں۔ پس جب میں جس کا نام لے کر کھڑا ہونے کا حکم دوں تو وہ فوراً کھڑا ہو جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نام بنام لے کر یہ حکم دیا قم یافلاں کہ اے فلاں شخص تو یہاں سے کھڑا ہو جا۔ چنانچہ اس طرح حکم دے کر چھتیس شخصوں کو مسجد سے نکال دیا۔ یہ روایت تفسیر ابن کثیر جلد-۴' ص-۱۴۰ میں بھی ہے۔

جب جمعہ کے دن مسجد سے منافقوں کو نکال دیا تو ہم ان مشرکوں' کافروں کو کیوں نہ نکال دیا کریں کہ ان کا جنازہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ان سے نفرت کرنے کا حکم ہے۔ اسی طرح

جو دعاء سے سفارش نہ کریں' ان کو بھی نکال دیں تاکہ ان کو عبرت حاصل ہو کہ وہ دعاء نہیں جانتے اور بغیر دعاء کے جنازہ بیکار ہے اور بعض مولویوں نے بغیر مسئلہ اجتہاد کے محض اپنے نفسانی اور وجدانی قیاس سے یہ طریقہ نکالا ہے کہ وہ خود بلند آواز سے دعاء جنازہ پڑھتے ہیں اور مقتدیوں کو امین کہنے کا حکم دیتے ہیں۔ پھر سب آمین کہتے ہیں۔ یہ طریقہ سراسر بدعت ہے۔ کیونکہ اس کا ثبوت نہیں ہے اور نہ اس پر قرون ثلاثہ میں عمل ہوا ہے۔ اصل حکم یہ ہے کہ سب نمازیوں کو دعاء جنازہ کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ھذا ماعندی واللّٰہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف الحصاری

اہل حدیث لاہور جلد-۶' شمارہ-۳۱' مورخہ یکم اگست سنہ-۱۹۷۱ء

کیا مستورات گھروں میں نماز جنازہ پڑھ سکتی ہیں؟

کیا مسجد میں جو نماز جنازہ پڑھی جائے اور یہ اعلان کیا جائے کہ جو مستورات اس آواز کو بذریعہ سپیکر سنیں وہ بھی اپنے اپنے گھر نماز جنازہ پڑھ لیں۔ اس کو مسجد میں آنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی نماز جنازہ گھر میں ہی ہو جائے گی۔ کیا یہ مسئلہ ازروئے شریعت صحیح ہے اور مستورات کی نماز جنازہ گھر میں پڑھنے سے ہو جائے گی؟

(المستفتی ابوالعطا عبدالرحمٰن الحصاری الرحمانی چک نمبر۶۷۹ گ-ب ضلع فیصل آباد)

اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح عورتوں کو گھروں میں جنازہ پڑھانا اور پڑھنا بدعت سیئہ ہے۔ اس کا ثبوت نہ کسی حدیث میں ہے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس عمل کو کیا کرایا ہے۔ حدیث میں ہے: کل محدثه بدعة وكل بدعة ضلالة کہ "ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" اور دوسری حدیث میں ہے: کل ضلالة فی النار کہ "ہر گمراہی جہنم میں جانے کا موجب ہے۔"

کتبہ عبدالقادر الحصاری

الاعتصام لاہور جلد-۳۲' شمارہ-۳۸' بمطابق ۷/ اپریل سنہ-۱۹۸۱ء

جنازہ میں حنفیہ کی تکبیریں اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اختلاف

مصنف ابن ابی شیبہ کی کتاب الجنائز ص ۱۵ میں ہے۔ (ترجمہ) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی اسد کے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھی تو اس پر پانچ تکبیریں پڑھیں۔ اسی صفحہ پر دوسری روایت ہے کہ علقمہ بن قیس ملک شام سے آئے تو انہوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ میں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کو دیکھا ہے کہ وہ جنازوں پر پانچ تکبیریں کہتے ہیں۔ آپ ہمارے لیے کوئی مقدار مقرر کریں تاکہ اس میں ہم آپ حضرات کی اتباع کرتے رہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کچھ دیر ٹھہر کر اور سوچ کر فرمایا "کبروا ما کبر امامکم لا وقت ولا عدد" یعنی ان تکبیروں کی کوئی گنتی اور وقت مقرر نہیں ہے' جس قدر تمہارا امام تکبیریں کہے اسی قدر تم اس کی اقتداء میں تکبیریں کہتے رہو۔

ہدایہ جلد اول ص ۱۸۰ میں ہے کہ چار تکبیریں نماز جنازہ میں کہنی چاہئیں۔ اگر امام نماز جنازہ میں پانچ تکبیریں کہے تو مقتدی امام کی تابعداری نہ کرے' وہ صرف چار پر اکتفا کرے' پانچ نہ کہے۔ ہدایہ کے مصنف کو علم حدیث میں مہارت تامہ نہ تھی' اس لیے ہدایہ احادیث ضعیفہ سے بھرپور اور احادیث صحیحہ سے بہت دور ہے۔ چنانچہ نماز کسوف میں خطبہ پڑھنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے لیکن ہدایہ کا مصنف یہ لکھتا ہے: "ولیس فی الکسوف خطبة لانه لم ینقل" یعنی "کسوف میں خطبہ پڑھنا آنحضرت ﷺ سے منقول نہیں ہے۔" امام شوکانی نیل الاوطار جلد۔۳' ص ۳۲۷ میں لکھتے ہیں: "وقال صاحب الهداية من الحنفية ليس فى الكسوف خطبة لانه لم ينقل" یعنی "ہدایہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ نماز کسوف میں خطبہ نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے منقول نہیں ہے۔

اس غلط بات پر مصنف ہدایہ کا تعاقب کیا گیا ہے کیونکہ نماز کسوف میں خطبہ کے بارہ میں احادیث کثیرہ وارد ہیں۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رئیس المحدثین نے فتح الباری میں اس کی تصریح کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے درایہ تخریج ہدایہ بہ حاشیہ ہدایہ ص ۱۷۶ میں یہ فرمایا ہے: وهذا النفى مردود بما فى الصحيحين عن اسماء فقام فخطب الناس فحمد الله تعالى واثنى عليه (الحديث) یعنی "آنحضرت ﷺ نماز کسوف سے فارغ ہوئے جب سورج کھل گیا تو کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ سنایا۔"

میں کہتا ہوں کہ متفق علیہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں یہ صاف وارد ہے: ثم قام فخطب الناس فاثنی علی اللّٰہ بما ھو اھلہ۔ (الحدیث) یعنی "نماز کسوف کے بعد کھڑے ہوئے پھر لوگوں کو خطاب کیا اور اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد وثنا کی جس کے وہ لائق تھا۔"

میں کہتا ہوں کہ مؤلف ہدایہ نے یہ لکھا ہے کہ نماز کسوف دن کی نماز ہے اور وہ گونگی ہے کہ اس میں قرات بالجہر نہیں ہے' یہ بالکل غلط ہے۔ نماز کسوف میں قرات بالجہر ہے اور وہ بالکل گونگی نہیں ہے۔ درایہ تخریج ہدایہ حاشیہ ص-۱۷۶ میں ہے: عن عائشة ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم جھر فی رکعتی الکسوف بالقراۃ (متفق علیہ) یعنی "حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے نماز کسوف کی دو رکعتوں میں قرات جہر سے کی۔ (متفق علیہ)

پھر مؤلف ہدایہ کو اتنی بات بھی نہ سوجھی کہ دن کی نماز تو جمعہ بھی ہے پھر اس میں قرات بالجہر کیوں ہے اور عیدین کی نمازیں بھی دن کی ہیں' ان میں بھی قرات بالجہر ہے اور نماز جنازہ میں بھی قرات بالجہر جائز ہے۔ چنانچہ نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: فقرا بفاتحة الکتاب وسورۃ جھر فلما فرغ قال سنة وحق۔ یعنی "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی تو فاتحہ اور سورت قرآن کی جہر سے پڑھی اور فارغ ہو کر یہ فرمایا کہ اس طرح قرات پڑھنا سنت اور حق ہے۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مؤلف ہدایہ کا نماز کسوف میں قرات بالجہر کی نفی کرنا اور یہ کہنا کہ یہ دن کی نماز ہے' بالکل غلط ہے اور یہ ظاہر ہوا کہ مؤلف ہدایہ کو علم حدیث میں مہارت نہ تھی بلکہ جناب حضرت شاہ ولی اللہ مرحوم محدث دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ علماء حنفیہ کو قدماء و حدیثاً علم حدیث میں قلت ہی رہی ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ الاسلام لاہور جلد-۲' شمارہ-۴۲' مورخہ ۷/ اپریل سنہ-۱۹۷۲ء

نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کی تحقیق

فرقہ اہل الرائے اور ان کے علماء نے جب سے تقلید شخصی کا لبادہ اوڑھا ہے' تب سے وہ معیار صداقت سے گر گئے ہیں- جب امت میں افتراق ہو' اس وقت صداقت و ہدایت اس طائفہ ناجیہ کے ساتھ ہو گی جو معیار صداقت پر قائم ہے اور وہ معیار صداقت بروئے حدیث نبوی یہ ہے: ما انا علیه واصحابی یعنی آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں جو ملت اس عقیدہ و عمل پر قائم ہے جس پر "میں اور میرے صحابہ ہیں" وہ صادقہ و ناجیہ ہے-

پس نتیجہ صاف ہے کہ جو فرقے اس معیار پر پورے نہیں اترتے وہ جھوٹے اور راہ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں- مثلاً اس مسئلہ کو ہی لے لیجئے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ ضرور پڑھنی چاہیے یا اس کا پڑھنا جائز نہیں ہے؟

بندہ ایک گاؤں گیا' وہاں ایک دیوبندی عالم تین مذہب کے لوگوں کا امام تھا- اہلحدیث' دیوبندی اور بریلوی- اتفاقیہ وہاں ایک میت لائی گئی' وہ مولوی صاحب نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے کھڑے ہوئے- صفیں تین باندھی گئیں- چونکہ میت جماعت اہلحدیث سے تھی' اس لیے بندہ نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ کیا آپ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھیں گے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں-

میں نے کہا کیوں؟

انہوں نے کہا حنفی مذہب میں سورہ فاتحہ نماز جنازہ میں پڑھنی جائز نہیں ہے-

میں نے کہا یہ میت اہلحدیث ہے- اس کے اولیاء اہلحدیث ہیں اور مذہب اہلحدیث میں سورہ فاتحہ کے بغیر نماز جنازہ نہیں ہوتی- لہٰذا آپ پیچھے تشریف لے آیئے' اس کا جنازہ میں پڑھاؤں گا- جماعت اہلحدیث نے میری تائید کی اور بندہ نے امام ہو کر اس میت کی نماز جنازہ سورہ فاتحہ کے ساتھ بالجہر پڑھائی تو مقلدین اہل رائے نے بڑے تعجب کا اظہار کیا- اس لیے اس کی تحقیق ضروری ہے-

مخفی نہ رہے کہ دیہات کے عام ملا مولوی ہی نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو ناجائز نہیں کہتے بلکہ اس گروہ کے اکابر بھی سورہ فاتحہ پڑھنے کو جائز نہیں جانتے- چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ ص-۳۵۲ میں ایک سوال و جواب یوں درج ہے:

نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم

سوال : کیا سورہ فاتحہ صلوۃ جنازہ میں پڑھے یا نہیں؟ اور اگر تکبیریں اخیرین میں بھی بجائے دعا پڑھ لے تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب : یہ مسئلہ مختلفہ ہے۔ امام صاحب' حدیث سے ممانعت قراء قرآن کی نماز جنازہ میں ثابت کرتے ہیں۔ اگر دعا کی طرح پڑھے تو درست ہے۔ تو جب "نہی" اور "جواز" دونوں حدیث سے ثابت ہیں اور مسئلہ مختلفہ ہے۔ تو ایسے فعل کو کرنا کیا ضرور ہے۔ ایسے افعال کر کے "لامذہب" مشہور ہونا ہوتا ہے۔ اتقوا موضع التهم خود حکم شارع علیہ السلام کا ہے۔ مستحب' مختلف کو ادا کر کے فساد برپا کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں۔ فقط' واللہ تعالیٰ اعلم۔ (رشید احمد عفی عنہ)

یہ فتویٰ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا ہے۔ جو اپنے عہد میں دیوبندی جماعت کے رکن اعظم بلکہ پیرومرشد تھے اور ان کی قدرومنزلت حنفی دنیا میں مسلم ہے۔ اور خصوصاً دیوبندی گروہ کی حسن عقیدت جو حضرت گنگوہی کے ساتھ ہے' وہ تو حد سے گزری ہوئی ہے۔ چنانچہ علماء دیوبند نے ایک کتاب بنام "حکایات اولیاء" شائع کی ہے جس کے محشی جناب مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دیوبندی ہیں۔ اس کتاب کے ص۔۳۰۴ پر مولانا گنگوہی کا ایک خواب درج کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "حضرت نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ تخت پر جلوہ افروز ہیں اور مجھے سامنے کھڑا کیا ہے اور مجھ سے امتحاناً "سو مسئلے" پوچھے۔ اور سو کے سو کا میں نے جواب دے دیا۔ اور آپ نے سب کی تصویب فرمائی اور نہایت مسرور ہوئے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس روز سے میں خوش ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اگر سارے عالم میرے خلاف ہوں گے تو انشاء اللہ حق میری جانب ہو گا۔"

مولانا گنگوہی نے خواب کی رویت پر بھروسہ کر کے یہ دعویٰ کر دیا کہ "روئے زمین کے تمام علماء کے مقابلہ میں حق میری جانب ہو گا۔" لیکن صحابہ کرام جو حقیقی طور پر آنحضرت ﷺ کے فیض و صحبت یافتہ تھے' ان میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہ کیا کہ "سب کے مقابلہ میں حق میری جانب ہو گا۔"

دیوبندی حضرات نے مولانا گنگوہی کی صداقت پر آنحضرت ﷺ کی تصدیق پیش کر دی۔ اب کوئی لاکھ دلائل پیش کرے تو بے سود ہیں۔ کیونکہ کسی عالم کا امتحان لے کر آنحضرت ﷺ نے اس کے پاس ہونے کی سند نہیں دی۔ محشی صاحب مولانا تھانوی اس پر حاشیہ لکھتے ہیں: "اقول' اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کے نزدیک کثیر کے مقابلہ میں "واحد" حق پر ہو سکتا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ مولانا گنگوہی کے نزدیک ہی نہیں بلکہ آپ کو بھی یہ مسلم ہے کہ کثرت کے مقابلہ میں واحد حق پر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آپ اپنی کتاب "دنیا اور آخرت" کے ص-۱۵۳ پر لکھتے ہیں: "عوام کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے ایک قاعدہ نکال لیا ہے کہ جب کسی مسئلہ یا عمل میں علماء کا اختلاف ہو تو جدھر زیادہ ہوں' وہ حق ہے۔ نہ معلوم یہ قاعدہ کہاں سے نکالا ہے۔ حالانکہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کثرت اولہ سے ترجیح نہیں ہو سکتی۔"

اس سے مقلدین کی وہ دلیل کٹ گئی کہ ہم مقلدین اس لیے حق پر ہیں کہ ہماری کثرت عددی ہے اور ہم سواد اعظم ہیں۔ اس لیے ہماری پیروی کر کے سب مقلد ہو جاؤ۔ بہرحال دیوبندی علماء کی حسن عقیدت ہے کہ ہمارے مولانا گنگوہی کے ساتھ حق اور صداقت ہے۔ کیونکہ دربار نبوی سے امتحان کے بعد ان کو سند صداقت مل چکی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دربار نبوی ہی نہیں بلکہ دربار الٰہی سے بھی وعدہ ہو چکا ہے کہ مولانا گنگوہی سے کوئی غلط بات نہیں نکلے گی۔ چنانچہ "حکایات اولیاء" کے ص-۳۰۸ میں لکھا ہے: "حضرت (مولانا گنگوہی) نے فرمایا حق تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری زبان سے غلط نہیں نکلوائے گا۔"

چلئے فیصلہ ہوا کہ قادیانی نبوت کی طرح آپ نے معصوم ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔ اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ دربار نبوت اور دربار الٰہی سے تصدیق ہو گئی کہ حق مولانا گنگوہی کے ساتھ ہو گا۔ خواہ روئے زمین کے تمام علماء ان کے مخالف ہوں اور اللہ تعالیٰ ان سے کوئی غلط بات نہیں نکلوائے گا۔ شاید یہ وعدہ بھی خواب ہی میں ہوا ہو گا۔ ظاہری وحی نازل ہونے کے مولانا گنگوہی مدعی نہیں سنے گئے۔

اب میں دیوبندی دعوئی اور حسن عقیدت کی حقیقت واضح کئے دیتا ہوں۔ سنئے! مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دیوبندی گروہ میں حکیم الامت اور بڑے عارف اور محقق مشہور

ہیں۔ آپ اپنی آخری تصنیف "بوادر النوادر" جلد-۲ ص-۴۴۳ میں لکھتے ہیں: "معتبر کتابوں میں ہزاروں واقعات ایسے بلکہ اس سے بھی زیادہ شبہ ڈالنے والے منقول ہیں۔ آج تک کسی عارف نے خوابوں کو نصوص پر ترجیح نہیں دی بلکہ خوابوں کو غلط سمجھ کر نصوص پر عمل کیا (تا آخر)

غرض ہر حال میں ظاہری رسول خواب کا واجب الرد ہے۔ اس سے خواب والی صداقت اور سند تو رد ہو گئی۔ اب دوسری بات سنئے: مولانا حکیم امت حنفیہ "بوادر النوادر" کی جلد-۱ ص-۱۵۴ میں لکھتے ہیں۔ "پھر محض اس طرح بلا سند کوئی مضمون قابل اعتبار قطعہ سے نہیں ہو سکتا۔ ورنہ جو جس کے جی میں آئے' مشہور کر دیا کرے۔ شرع میں حکم ہے کہ جو بات ہو' خوب تحقیق کے بعد جس کو معتبر سمجھو۔"

لیجئے اس سے تقلیدی مسائل کا بھی رد ہو گیا۔ اور کسی بڑے سے بڑے عالم پر حسن عقیدت رکھ کر مسئلہ مان لینا اور تحقیق سے کام نہ لینا بھی مردود ہوا۔ اب مسئلہ متنازعہ فیہ کی تحقیق سنئے! فتاویٰ رشیدیہ کے ص-۳۵۴ میں ایک سوال و جواب یوں درج ہے۔

نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا حکم

سوال: سورہ فاتحہ صلوۃ جنازہ میں کہ حسب احادیث صحیحہ مسنون ہے۔ چنانچہ عن طلحة بن عبداللہ بن عوف رضی اللہ عنه قال صليت خلف ابن عباس علی جنازة فقرا فاتحة الكتب فقال لتعلموا انها سنة وحق رواه البخاری والنسائی انتہی۔ وعن ابی امامة رضی اللہ عنه قال السنة فی الصلوة علی الجنازة ان يقرا فی التكبير الاولی بام القراٰن مخافتة ثم يكبر ثلاثا والتسليم عند الاخرة رواه النسائی۔ اور محققین علماء بھی اس کی سنیت و افضلیت کے قائل ہیں۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں: ومن السنة قراءة فاتحة الكتب لانها خير الادعية واجمعها علمها اللہ تعالٰی عباده فی محكم كتابه۔

اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ بھی استحباب کے قائل ہیں۔ بنابر احتیاط مذہب شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے۔ چنانچہ ردالمختار میں ہے: وقول ملا علی قاری ایضا يستحب قراء تها بنية الدعاء خروجا من خلاف الشافعی۔

اور قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی وصیت نامہ میں فرماتے ہیں: "بعد تکبیر اولیٰ سورہ فاتحہ ہم خوانند" للہذا بہ رعایت اولہ مذکورہ فاتحہ پڑھنا ہی اولیٰ ہے یا نہیں؟

جواب : حضرت فخر عالم ﷺ نے فاتحہ نماز جنازہ میں احیاناً بجواز پڑھی ہے۔ ورنہ معمول ضروری نہ تھا۔ کیونکہ امام صاحب قرآن کی ممانعت حدیث سے ثابت فرماتے ہیں۔ البتہ بطور دعا پڑھنا مضائقہ نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (رشید احمد عفی عنہ)

سائل نے دلائل پیش کیے تو مولانا گنگوہی پہلے سے کچھ ڈھیلے ہو گئے اور یہ مان لیا کہ آنحضرت ﷺ نے فاتحہ پڑھی ہے تاکہ جائز ثابت ہو۔ اور یہ بھی فتویٰ دے دیا کہ بطور دعا پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

پہلے کہہ دیا تھا کہ اس مستحب مختلف کو ادا کر کے فساد برپا کرنا جائز نہیں اور اس پڑھنے کو للہذہی اور مواضع تہم میں شمار کیا تھا۔ نعوذ باللہ منہ۔

یہ سب ہیرا پھیری تقلید شخصی کے چکر میں آنے سے ہو رہی ہے کہ یہ لوگ اپنے اکابر کی تقلید نہیں چھوڑتے اور احادیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ان عقل مندوں سے کوئی پوچھے کہ تم علمیت کا بڑا دعویٰ رکھتے ہو اور اپنے اکابر کو بے مثل عالم بلکہ سب سے اعلم سمجھتے ہو کہ جب صحابہ کرام یہ کہہ رہے ہیں کہ: "فاتحہ نماز جنازہ میں پڑھنا سنت اور حق ہے۔" تو پھر تم مذہب اہل سنت کے مدعی ہو کر اس سنت اور حق کو قبول کیوں نہیں کرتے۔ محض جواز کا درجہ کیوں دیتے ہو؟

جب یہ سنت ہے تو فاتحہ نہ پڑھنے والے تارک سنت ہیں اور تارک سنت کو تمہاری کتابوں میں "محروم الشفاعہ" اور "ملعون" لکھا ہے۔ گویا سنت کا منکر امیدوار شفاعت نہیں ہو سکتا۔

اچھا اگر امام صاحب کو تم نے نبی ﷺ کی طرح واجب التقلید سمجھ لیا ہے تو لاؤ صحیح سند سے وہ حدیث پیش کرو جس کی بنا پر امام صاحب نے نماز جنازہ میں قرآن کی ممانعت کر دی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے تو ایک سائل کے جواب میں، جب اس نے پوچھا: یارسول اللہ افی کل صلوٰۃ قرأۃ قال نعم ذالک واجب۔ "اے اللہ کے رسول! کیا ہر نماز میں قراۃ ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہاں یہ ضروری ہے۔" (کتاب القراۃ ص-۸)

اور دوسری حدیث ص-۲۵ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کل صلوٰۃ لا یقرا فیھا

بام القرآن فھی خداج فھی خداج فھی خداج- "ہر ایک نماز جس میں فاتحہ نہیں پڑھی گئی وہ ناقص بے روح ہے' وہ ناقص بے روح ہے' وہ ناقص بے روح ہے-"

نماز جنازہ بھی نماز ہے- اس لیے اس کلیہ میں جو اصول کی رو سے استغراق کے لیے ہے' نماز جنازہ داخل ہے- اور ایک صحیح حدیث میں یوں آیا ہے: ان صلوٰتنا لا یصلح فیھا شئی من کلام الناس انما ھی التکبیر والتسبیح وتلاوۃ القرآن- "نماز میں لوگوں کی کلام نہیں ہوتی- اس میں تکبیر و تسبیح و تلاوت قرآن ہوتی ہے-" (مسلم کتاب القراۃ)

نماز جنازہ میں بھی یہی چیزیں ہیں تو ممانعت کس حدیث سے ہو گئی؟ شاید کوفہ میں کوئی ایسا حکم نازل ہوا ہو جس سے مکہ و مدینہ کے علماء محروم رہ گئے ہیں- اور اہل الرائے اس سے سیراب ہوئے- اگر کسی صحابی' تابعی کا قول ہے تو وہ احادیث نبویہ و تعامل صحابہ کے مقابلہ میں حجت نہیں ہے- چنانچہ فتاویٰ عبدالحی جلد-۲' ص-۲۱۷ میں ہے: "جب صحابی کا قول رسول کے قول کے خلاف ہو تو صحابی کے قول سے احتجاج جائز نہیں ہے بلکہ وہ صحابی معذور سمجھا جائے گا-"

اب فاتحہ بلکہ دیگر سورہ نماز جنازہ میں پڑھنے کا ثبوت سنئے!

قولی حدیث سے ثبوت: (۱) عن ام شریک الانصاریۃ قالت امرنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان نقرا الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب- (رواہ ابن ماجہ) یعنی "ام شریک انصاریہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنازہ پر سورہ فاتحہ پڑھیں-"

یہ حدیث قوی ہے اور اس میں امر کا لفظ ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے- اس سے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ثابت ہوا- اور حدیث متواترہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب یعنی جس نے سورہ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز صحیح نہیں ہے- یہ حدیث اپنے عموم سے اس حدیث کی موید ہے: (۲) عن ام عفیف قالت بایعنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حین بایع النساء فاخذ علیھن ان لا یحدثن الرجل الا محرما وامرنا ان نقرا علی میتنا بفاتحۃ الکتاب رواہ الطبرانی فی الکبیر- (مجمع الزوائد- استیعاب' حافظ ابن عبدالبر اصابہ حافظ ابن حجر) یعنی "ام عفیف رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیعت کی تو آپ نے یہ عہد لیا کہ محرم کے سوا کسی غیر شخص سے باتیں نہ کرنا ہو گا- اور میت پر سورہ فاتحہ پڑھنی ہو گی- یہ حدیث پہلی حدیث کی موید ہے-

(۳) عن اسماء بنت یزید قالت قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی الجنازۃ فاقرا بفاتحۃ الکتاب۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر (مجمع الزوائد) یعنی "اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ پر لوگوں کو یہ فرمایا کہ تم نماز جنازہ میں فاتحہ پڑھو۔" یہ حدیث بھی دوسری کی شاہد ہے۔

(۴) عن ابی امامۃ بن سہل بن حنیف یحدث سعید بن المسیب قال السنۃ فی الصلٰوۃ علی الجنازۃ ان تکبر ثم تقرا بام القرآن ثم تصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثم تخلص الدعاء للمیت ولا تقرا الا فی التکبیرۃ الاولٰی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ جزء رابع ص-۱۱۱ محلی ابن حزم جلد-۵' ص-۱۳۰ ابن جارود ص-۲۶۰) یعنی "ابو امامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے سعید بن مسیب کو یہ حدیث سنائی کہ نماز جنازہ میں طریقہ شرعیہ یہ ہے کہ پہلی تکبیر کہہ کر سورہ فاتحہ پڑھے پھر (دوسری تکبیر کے بعد) نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے پھر (تیسری کے بعد) میت کے لیے خاص دعا کرے اور قرات صرف پہلی تکبیر کے بعد ہے۔ جب صحابی کسی چیز کو سنت کہہ دے تو وہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہے یعنی وہ حدیث رسول ﷺ تصور ہوتی ہے۔ تو یہ بھی حدیث قولی حکمی مرفوع ہے۔ جو پہلی احادیث کی موید ہے۔

(۵) عن طلحۃ بن عبداللّٰہ بن عوف قال صلیت خلف ابن عباس علی جنازۃ فقرا بفاتحۃ الکتاب وسورۃ وجھر حتی اسمعنا فلما فرغ اخذت بیدہ فسألتہ فقال سنۃ وحق (اخرجہ النسائی وابن الجارود فی المنتقی ص-۲۶۳) یعنی طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو آپ نے سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ ایک سورۃ جہر سے پڑھی۔ یہاں تک کہ ہم کو سنایا۔ فراغت کے بعد میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے؟ تو انہوں نے فرمایا یہ سنت اور ضروری ہے۔ یہ پانچ احادیث قوی ہیں جن سے صریح طور پر ثابت ہوا کہ سورہ فاتحہ بطور تلاوت و قراۃ قرآن پڑھنا حق ہے۔ بلکہ حدیث نمبر-۵ سے سورہ فاتحہ پڑھنا اور بلند آواز سے پڑھنا بھی ثابت ہوا۔ سنت کا لفظ مندوب اور واجب سب پر بولا جاتا ہے۔ جس سے طریقہ شرعیہ مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض کتب فقہ اور فتح الباری وغیرہ شرح کتب حدیث میں مذکور ہے۔ سنت کے ساتھ لفظ حق قرینہ قویہ ہے کہ اس سے مراد وجوب ہے۔ جیسے فرمایا الجمعۃ حق واجبا علی کل مسلم یعنی "جمعہ ہر مسلمان پر حق اور ضروری ہے۔" جب فاتحہ پڑھنا حق ہوا تو نہ پڑھنا

باطل ہے۔ کیونکہ قرآن میں ہے: فماذا بعد الحق الا الضلال یعنی "حق بات کے بعد گمراہی ہے۔" پس مولانا گنگوہی کا یہ دعویٰ کہ سب علماء کے خلاف میرے ساتھ حق ہو گا' سراسر غلط ہے۔ حق .بفضلہ تعالیٰ اہل حدیث کے ساتھ ہے اور اہل رائی باطل کے ساتھ ہیں۔

نماز جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کا احادیث فعلیہ سے ثبوت: (۱) عن جابر قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یکبر علی جنائزنا اربعا ویقرا بفاتحۃ الکتاب فی التکبیرۃ الاولٰی رواہ الحاکم فی مستدرکہ والامام الشافعی فی الام۔ یعنی "جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہا کرتے تھے اور پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ کی قرات کرتے تھے۔

(۲) عن ابن عباس قال اتی بجنازۃ جابر بن عتیک او قال سھل بن عتیک وکان اول من صلی علیہ فی موضع الجنازۃ فتقدم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فکبر فقرا باء القرآن فجھربھا ثم کبر الثانیہ فصلّی علی نفسہ وعلی المرسلین ثم کبر الثالثۃ فدعا للمیت الحدیث۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط (مجمع الزوائد) یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنازگاہ میں ایک جنازہ جابر یا سہل کا لایا گیا۔ اور یہ پہلا جنازہ ہے جو جنازگاہ میں پڑھا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے ہوئے' آپ نے تکبیر کہی اور سورہ فاتحہ کی قرات بلند آواز سے کی پھر دوسری تکبیر کہی اور اپنے اور دیگر مرسلین پر درود شریف پڑھا اور پھر تیسری تکبیر کہی اور میت کے لیے دعا کی۔"

ان پانچ قوی احادیث کے ساتھ یہ دو فعلی احادیث ملا لی جائیں تو یہ سات دلیلیں سات افلاک کی طرح تقلیدی دنیا پر قائم ہو جاتی ہیں۔ جن کو وہ گرا نہیں سکتے۔

آثار صحابہ کرام سے نماز جنازہ میں فاتحہ کا ثبوت: اب تعامل صحابہ سے ثبوت!

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فعل پیچھے ذکر ہوا کہ آپ نے جنازہ پر فاتحہ پڑھی اور فرمایا یہ سنت اور حق ہے۔ بخاری میں بھی یہ حدیث ہے۔ امام الدنیا فی الحدیث نے کتاب الجنائز میں باب قراۃ فاتحۃ الکتاب علی الجنائز باندھ کر علماء حنفیہ بخاری پڑھانے والوں کا رد کر دیا کہ فاتحہ جنازہ میں بطور قرات پڑھی جاتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ مقلدین کتب حدیث کو بطور تبرک پڑھتے ہیں' عمل کے لیے نہیں پڑھتے۔ بلکہ محدثین کرام کا رد کرتے ہیں کہ یہ لوگ شافعی ہیں' ان کی باتیں نہ مانو۔

امام ترمذی نے بھی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ پر یوں باب باندھا ہے: "باب ماجاء فی القراۃ علی الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب" یعنی "یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ جنازہ پر سورہ فاتحہ کی قرات کرنی چاہیے۔" پھر حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بعد یہ فرمایا ہے: والعمل علی ھذا عند بعض اھل العلم من اصحاب النبی وغیرھم یختارون ان یقرا بفاتحۃ الکتاب بعد التکبیرۃ الاولٰی وھو قول الشافعی واحمد واسحٰق۔ یعنی "اس حدیث پر بعض صحابہ کا تعامل ہے کہ وہ پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ کی قرات کرتے تھے اور اس کو پسندیدہ سمجھتے تھے۔ یہی مذہب امام شافعی' امام احمد و امام اسحاق محدثین کا ہے۔"

پھر امام ترمذی نے یہ لکھا ہے کہ بعض اہل علم جنازہ پر قرات نہیں کرتے۔ وہ ثناء' درود' دعاء پر کفایت کرتے ہیں۔ یہ امام ثوری وغیرہ اہل کوفہ ہیں۔ ان میں امام ترمذی نے صحابہ کا نام نہیں لیا اور نہ دیگر تابعین اہل حجاز کا بلکہ کوفیوں کا نام لیا ہے جو اہل رائے ہیں۔

(۲) عن عبید ابن السباق قال صلی بنا سھل بن حنیف علی جنازۃ فلما کبر التکبیرۃ الاولٰی قرا بام القرآن حتّٰی اسمع من خلفہ (اخرجہ البیھقی فی السنن جلد-۴' ص-۳۹' دارقطنی جلد-۱' ص-۱۹۱' مصنف ابن ابی شیبہ جزء رابع ص-۱۱۳) یعنی "عبید بن سباق فرماتے ہیں کہ حضرت سہل بن حنیف نے ہمیں ایک جنازہ کی نماز پڑھائی تو انہوں نے پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ کی قرات کی کہ لوگوں کو سنایا۔" ان سب احادیث اور آثار میں قرات کا لفظ ہی آتا ہے' کسی جگہ دعا بالفاتحہ نہیں آیا۔

(۳) امام ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا: انہ قرا علی الجنازہ بالفاتحۃ (محلی ابن حزم ص-۱۲۹' بیھقی جلد-۴' ص-۳۹) یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی تو سورہ فاتحہ کے ساتھ قرات کی۔

حنفی مذہب کے علماء کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کا دارومدار ابن مسعود صحابی رضی اللہ عنہ پر ہے۔ مگر تقلید ایسی غالب ہے کہ یہ لوگ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں ان کے مخالف ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے مسائل میں' ان کی مخالفت کی ہے۔ تقلید کتنی بری چیز ہے کہ سب سے غداری کرا دیتی ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ "عبادت بتقلید گمراہی است"

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی قال قرات علیھا

بفاتحة الکتاب۔ یعنی "حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے جنازہ پر سورہ فاتحہ پڑھی ہے۔"

(۵) ان المسور بن مخرمة صلی علی جنازة فقرا فی التکبیرة الاولٰی فاتحة الکتاب وسورة قصیرة ورفع بهما صوته (اخرجه ابن حزم فی المحلٰی جلد۵' ص۱۳۶) یعنی "مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی تو پہلی تکبیر میں سورہ فاتحہ اور ایک چھوٹی سی سورۃ بلند آواز سے پڑھی۔"

نسائی کی حدیث اور ان آثار سے بلند آواز سے پڑھنا بھی جائز ثابت ہوا اور آہستہ بھی درست ہے۔

(۶) عن عبداللّٰه بن عمرو بن العاص انه کان یقرا بام القرآن بعد التکبیرة الاولی علی الجنازة اخرجه الامام الشافعی فی الکتاب الام (جلد۱' ص۲۴۲) المسند ایضًا قال الامام الشافعی فی الام وبلغنا ذالک عن ابی بکر الصدیق وسهل بن حنیف وغیرهما من اصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم۔ یعنی "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ جنازہ پر پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہم کو یہ پہنچا ہے کہ ابوبکر صدیق اور سہل بن حنیف اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔"

میں کہتا ہوں کہ حضرت امام شافعی قریشی سے تو مقلدین اہل رائے کو کچھ اس قسم کا بیر ہے کہ ان کی کوئی بات بھی امام ابوحنیفہ کوفی کے مقابلہ میں نہیں مانتے اور جو امام ابوحنیفہ کوفی فرما دیں تو بس وہ وحی آسمانی کی طرح مانی جاتی ہے۔ اب دیکھو امام شافعی اکابر صحابہ کرام سے نقل کر رہے ہیں کہ وہ پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ کی قرات کرتے تھے۔ لیکن مقلدین نہیں مانتے اور صرف امام ابوحنیفہ پر اعتقاد رکھ لیا کہ انہوں نے کہہ دیا کہ قرآن کی قرات جنازہ میں ممنوع ہے۔ خبردار کبھی نہ پڑھنا

(۷) غنیتہ الطالبین مترجم ص۸۸۸ میں ہے: یقرا فی الاولی الفاتحة لما روی عن ابن عباس انه قال امرنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان یقرا بفاتحة الکتاب علی الجنازة ثم یصلی علی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فی الثانیة کما یصلی فی التشهد لما روی مجاهد قال سالت ثمانیة عشر رجلا من اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فکلهم یقول کبر ثم اقرا بفاتحة الکتاب (الخ) یعنی "پہلی تکبیر جنازہ میں

سورہ فاتحہ پڑھیے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو حکم دیا کہ جنازہ پر سورہ فاتحہ پڑھا کرو اور دوسری میں درود پڑھا کرو جیسا کہ تشہد میں پڑھتے ہو۔ حضرت مجاہد تابعی نے بیان کیا کہ میں نے اٹھارہ صحابہ کرام سے یہ مسئلہ پوچھا سب نے بالاتفاق یہ کہا کہ پہلی تکبیر کہہ کر پھر سورہ فاتحہ پڑھو۔"

پس احادیث مرفوعہ اور آثار صحابہ کرام سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ بطور قرات قرآن پڑھنا حق اور مشروع ہے۔ اور یہی تعامل نبوی اور تعامل صحابہ کرام کا تھا۔ اس کو لامذہبی اور فساد قرار دے کر مواضع تہمت میں شمار کرنا سراسر گمراہی بلکہ کلمہ کفر ہے۔ کیونکہ مواضع متہم سے گناہ کے مقامات مراد ہیں۔ مثلاً:

خلوت میں کسی اجنبی عورت کے پاس بیٹھنا' قمار خانہ' شراب خانہ' زنا خانہ' چور بازاری وغیرہ میں جانا' یہ مواضع متہم ہیں۔ گو کسی دوسری نیت یا کام سے گیا ہو۔ دیکھنے والے اس پر بدگمانی کر کے تہمت لگا سکتے ہیں۔ نہایت افسوس ہے کہ مولانا گنگوہی نے باوجود عالم ہونے کے نماز جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کو مقامات تہمت میں شمار کر دیا جو نہایت فاسد خیال ہے اور وہ علت تقلید اور فرقہ بندی سے پیدا ہوا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

دین حق را چہار مذہب ساختند

رخنہ در دین نبی انداختند!

حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ: "من تمسک بسنتی عنه فساد امتی فله اجر شهید" یعنی "جو شخص امت کے فساد کرنے کے وقت سنت کو مضبوط پکڑے رہے' اس کو ایک شہید کا ثواب ملے گا۔"

مگر دیوبندی حضرات فرماتے ہیں کہ یہ منع ہے اور پھر دعوئی یہ ہے کہ ہم ہی اہل سنت ہیں ؎

ایں خیال است و محال است و جنوں

مولانا اشرف علی صاحب نے اپنے رسالہ "دنیا و آخرت" کے ص۔۳۵۲ سے ص۔۳۵۴ میں حدیث ما انا علیه واصحابی پر خوب بحث لکھی ہے۔ جس سے میرا اتفاق ہے۔ آخر میں بطور نتیجہ یہ فرماتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعت میں اہل حق ہونے کا وہی لوگ

دعویٰ کر سکتے ہیں جن کے عقائد کی طرح تمام اعمال و افعال و طرز معیشت آپ ﷺ کے اور آپ کے اصحاب کی طرز پر ہو۔"

میرا اس اصولی بات پر صاد ہے۔ مگر میں پورے وثوق اور اعتقاد سے کہتا ہوں کہ اس اصول کی رو سے جماعت اہل حدیث ہی اہل حق ہے۔ باقی فرقے خصوصاً مقلدین اہل رائے ہرگز اہل حق نہیں ہیں کہ ان کے عقائد و اعمال اس اصول پر پورے نہیں اترتے۔ جیسے کہ محققین علماء نے اپنی تصنیفات میں اس کی صراحت کر دی ہے۔ کچھ نمونہ سورہ فاتحہ ہی میں دیکھ لیں کہ آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام جنازہ میں اس کو پڑھتے تھے اور مقلدین اس کو فساد اور مواضع تہمت میں شمار کر کے واجب الترک جانتے ہیں۔ تو یہ بعد المشرقین ہے' فتدبروا۔

(۱) امام بخاری رحمہ اللہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں "قال الحسن یقرا علی الطفل بفاتحۃ الکتاب ویقول اللھم اجعلہ لنا سلفا وفرط واجرا" یعنی امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بچہ پر بھی سورہ فاتحہ پڑھی جائے۔ امام حسن بصری کا شان بہت بلند ہے۔ آپ کثیر صحابہ کرام سے صحبت اور فیض یافتہ اور بہت بڑے تابعی ہیں۔ اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں اکثر خواجہ حسن بصری کے اقوال سے استناد کیا ہے۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ جزء رابع ص-۱۰۲ میں ہے: عن الضحاک قال اقرا انی التکبیرتین الاولیین بفاتحۃ الکتاب۔ یعنی "حضرت ضحاک نے فرمایا نماز جنازہ کی پہلی دو تکبیروں میں' میں سورہ فاتحہ پڑھتا ہوں۔

(۳) نیز مصنف میں یہ اثر ہے: عن مکحول انہ کان یقرا فی التکبیرتین الاولیین بفاتحۃ الکتاب۔ یعنی "حضرت مکحول رحمہ اللہ نے پہلی دو تکبیروں میں سورہ فاتحہ پڑھی۔" اسی طرح دیگر علماء سلف و خلف سے ثابت ہے۔ باقی علماء حنفیہ جو آثار یعنی شرح بخاری وغیرہ سے نقل کرتے ہیں۔ ان کی سند مسلسل صحابہ کرام تک نہیں پہنچتی اور جو پہنچتی ہے' وہ ضعیف ہے۔

الا ابن عمر سے موطا میں وہ موول ہے۔ کیونکہ ان سے قرات کرنا بھی مروی ہے۔ پس دلائل کی رو سے راجح یہ حکم ہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ اور یہی طریقہ نبویہ ہے۔ حنفیہ کا یہ کہنا کہ جنازہ میں قرات نہیں ہے' بالکل بے دلیل ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ جزء رابع ص-۱۱۳ میں ہے: عن سعید عن ---- ابن عباس قرا علی الجنازۃ

وجھر وقال انما فعلت لتعلموا ان فیھا قراۃ۔ یعنی ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جنازہ پر قرات پکار کر پڑھی اور فرمایا میں نے پکار کر اس لیے پڑھی ہے کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ نماز جنازہ میں قرات ہے۔“

اب اہل علم غور کریں کہ ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی عبداللہ صحابی رضی اللہ عنہ کی بات مانیں یا امام ابوحنیفہ کی بات مانیں۔ ہمارا اعتماد تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پر ہے۔ ہم کسی اور کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ”سمجھ اپنی اپنی‘ پسند اپنی اپنی“ اور سنئے!

مصنف ابن ابی شیبہ کے ص-۱۱۲ میں یہ روایت ہے۔ فضالہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام بیان کرتا ہے کہ: ان الذی صلی علی ابی بکر وعمر قرا علیہ بفاتحۃ الکتاب۔ یعنی ”جس شخص نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر جنازہ کی نماز پڑھی تھی‘ اس نے اس میں سورہ فاتحہ پڑھی۔“ پھر ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے: ان ابن عمر انہ کان یقرا فی الصلٰوۃ علی المیت۔ یعنی ”ابن عمر رضی اللہ عنہ نماز جنازہ میں قرات کیا کرتے تھے۔

باقی بعض آثار غیر صحابہ سے مصنف ابن ابی شیبہ میں مذکور ہیں۔ وہ احادیث مرفوعہ اور آثار صحابہ کے مقابلہ میں متروک بلکہ مردود ہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امام شعبی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ”یبدأ بحمد اللّٰہ“ کہ پہلی تکبیر میں اللہ کی حمد سے شروع کرلے۔ اس سے مراد بھی سورہ فاتحہ پڑھنا ہے۔ جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: انہ کان یجمع الناس بالحمد ویکبر علی الجنازۃ ثلاثا۔ یعنی ”ابن عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو حمد الٰہی (یعنی الحمدللہ پڑھ کر) کے ساتھ جمع کرتے تھے اور تکبیریں تین کہتے تھے (یعنی علاوہ تحریمہ کے)

اس روایت میں حمد کے ساتھ جمع کرنے سے یہی مراد ہے کہ سورہ فاتحہ کی قرات بلند آواز سے شروع کر دیتے۔ تاکہ لوگ جنازہ میں جمع ہو کر شامل ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صاف صریح یہ روایت آتی ہے: عن زید بن طلحۃ عن ابن عباس انہ قرا علیھا بفاتحۃ الکتاب۔ (کتاب الجنائز ابن ابی شیبہ) یعنی ”ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جنازہ پر سورہ فاتحہ پڑھی۔“

پہلی تکبیر میں حمد ثناء سے مراد یہی ہے۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر حمد کسی چیز میں نہیں ہے۔ پس حنفیہ کا یہ تاویل کرنا کہ بطور قرات فاتحہ جائز نہیں ہے‘ بطور دعا جائز ہے۔ یہ ان

دلائل سے مردود ہوا۔ اگر بطور دعا ہو تو پھر بھی ہم کو مضر نہیں کہ سورہ فاتحہ دونوں کام دیتی ہے۔ حمدوثنا ہے اور دعا بھی ہے اور قراۃ قرآن بھی ہے۔ دعا تصور کرنے سے قرآن سے خارج نہ ہو گی۔ جیسے حنفیہ کا مذہب فتاویٰ قاضی خاں وغیرہ میں درج ہے کہ جس شخص کو نکسیر کا مرض ہو اور خون بند نہ ہو تو فاتحہ کو خون یا پیشاب سے مریض کی پیشانی پر لکھنا جائز ہے۔ (نعوذ باللہ) گویا انہوں نے فاتحہ کو قرآن نہیں سمجھا ایک دعا سمجھ لیا۔ یہ لوگ قدیم سے فاتحہ کی تحقیر و توہین کرتے چلے آئے ہیں۔ اس کی کچھ قدر و منزلت نہیں سمجھی۔ کبھی کہتے ہیں کہ نماز میں کسی جگہ سے قرآن پڑھ لو' نماز ہو جائے گی۔ فاتحہ نماز میں فرض اور رکن نہیں ہے۔ حالانکہ فاتحہ نماز کا روح ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی فاتحہ نہ پڑھے ورنہ منہ میں آگ کے انگار پڑیں گے۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ نماز جنازہ میں اس کو پڑھ کر لامذہب نہ بنو اور فساد برپا نہ کرو۔ اور اس سے جو تہمت پیدا ہو گی' اس سے بچو۔ ہاں مریض نکسیر کی پیشانی پر پیشاب یا خون سے لکھ دو تاکہ اس سے اس کو شفا ہو جائے۔ اب ناظرین' اہل علم انصاف اور ایمان سے بتائیں کہ حنفیہ نے قدر کی ہے؟ یہ نہ سمجھا کہ یہ ام القرآن ہے اور اس کی مثل نہ تورات میں ہے' نہ زبور میں' نہ انجیل میں ہے۔ یہ سب پر فائق ہے۔ پھر علماء حنفیہ فاتحہ کو نماز جنازہ سے نکالنے کے لیے جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے: اذا صليتم على الميت فاخلصوا له الدعا۔ یعنی "جب تم میت پر نماز پڑھو تو اس کے لیے خلوص کے ساتھ دعا کرو۔"

اس حدیث سے سورہ فاتحہ کی ممانعت کیسے ثابت ہوئی۔ میت کے لیے دعا کا مقام تیسری تکبیر کے بعد ہے۔ اس وقت میت کے حق میں اخلاص سے دعا کی جائے گی اور سورہ فاتحہ کا مقام پہلی تکبیر کے بعد ہے۔ وہ اپنے مقام پر پڑھی جائے گی۔ یہ دلیل دعویٰ کے مطابق ذرا بھی نہیں۔ ہاں یہ کہا جائے گا کہ ؎

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا + بھان متی نے کنبہ جوڑا

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی حنفی جو حنفیہ میں بڑے فاضل محقق شمار ہیں۔ اپنی کتاب غیث الغمام کے ص-۲۳۸ میں لکھتے ہیں: "وغاية ما استعمل به اصحابنا هو حديث ابى هريرة مرفوعا" اذا صليتم على الميت فاخلصوا له الدعاء وهو لا يثبت منع القراة بل الغرض منه الاثار فى الدعا للميت والاخلاص فيه ليستجاب فافهم واستقم" یعنی

"انتہائی کوشش کے بعد ہمارے حنفی بھائیوں کو ایک دلیل ملی ہے' جس سے وہ اپنے مذہب پر استدلال کرتے ہیں اور وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ اذا اصلیتم علی المیت الحدیث۔

سو اس سے قرات کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ میت کے حق میں خلوص دل سے دعا کرو تاکہ قبول ہو۔ اس صاف بات کو سمجھو اور سیدھی رہ پر چلو۔ (جس پر اہل حدیث چل رہے ہیں)

مولانا عبدالحی رحمہ اللہ نے نہایت منصفانہ بات کہہ دی اور یہ ہدایت بھی کر دی کہ بات کو سمجھا کرو اور سیدھی راہ پر چلو۔ میں کہتا ہوں کہ سمجھ بھی سکتے ہیں اور چل بھی سکتے ہیں مگر بیچارے کیا کریں تقلید شخصی کے سنگلوں اور طوقوں میں جکڑے ہوئے کوفہ کی جیل میں مقید پڑے ہوئے مجبور ہیں۔ جب تک تقلید کا طوق نہ ٹوٹے گا' کبھی کسی حدیث کو مان نہیں سکتے۔ سچ ہے: انا جعلنا فی اعناقھم اغلالا فھی الی الاذقان فھم مقمحون○ یعنی "ہم نے ان کے گلوں' گردنوں میں ٹھوڑیوں تک ایسے طوق ڈال دیئے ہیں کہ وہ سر اونچا کئے ہوئے ہیں۔" (اب نیچے ہو کر حق پر غور نہیں کر سکتے۔)

اس مسئلہ متنازعہ کا فیصلہ مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم نے حنفی دنیا کے لیے نہایت اچھا کر دیا ہے۔ اب ماننا نہ ماننا ان کا اختیار ہے۔ آپ خاتمہ امام الکلام ص-۲۳۳ میں فرماتے ہیں:

"اعلم انه قدوردت احادیث مرفوعة وآثار موقوفة دالة علی شرعیة قراة الفاتحة بعد التکبیرة الاولی فی صلوٰة الجنازة ووردت بعض الآثار بترکھا واختلف الصحابة فی فعلھا وترکھا وتبع ذٰلک اختلاف الایمة فی ذٰلک والمرجح فی ذلک ھو القراة علی وجه الاستحباب او السنة لثبوت ذٰلک بالاخبار المتواردة وھی وان کان بعضھا ضعیفة لکن ضم بعضھا الی بعض یعطی الوثاقة والقول بالکراھة مطلقا او بالکراھة بنیة القراة لا بنیة الثناء لا یدل علیه دلیل باحد وجوه الدلالة" یعنی "یہ بات جان لو کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کی مشروعیت میں مرفوع احادیث اور اقوال صحابہ وارد ہیں۔ بعض صحابہ سے اس کا نہ پڑھنا بھی آیا ہے۔ صحابہ کرام میں اختلاف ہے تو اس بنا پر آئمہ کے درمیان بھی اختلاف ہوا ہے۔ ترجیح اس بات کو ہے کہ فاتحہ کو نماز جنازہ میں پڑھا جائے خواہ مستحب جان کر یا مسنون جان کر پڑھے۔ کیونکہ احادیث سے ثابت ہے۔ گو بعض روایتوں میں

ضعف ہے۔ مگر ایک دوسری کو ملانے سے قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ رہا جنازہ میں فاتحہ کو مطلق مکروہ کہنا یا قرات کی نیت سے پڑھنا' مکروہ کہنا۔ سو اس پر کوئی دلیل ایسی نہیں پائی گئی جو کسی وجہ سے دلالت کرتی ہو۔

تعلیق المجد حاشیہ موطا امام محمد کے ص-۱۳۱ میں ہے: نفس! القرأة ثابت فلا سبیل الی الحکم بالکراھة بل غایة الامران لا یکون لازما۔ یعنی "نفس قراۃ سورہ فاتحہ کی تو ثابت ہے۔ لہذا مکروہ کے حکم لگانے پر تو کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پڑھنا لازم نہ ہو (مسنون نہ ہو)"

اسی طرح دیگر احناف اہل انصاف ان دلائل سے متاثر ہو کر فاتحہ پڑھنے کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ فاضل حسن شرنبلالی حنفی نے تو ہمارے پیش کردہ دلائل سے متاثر ہو کر ایک کتاب ہی لکھ کر شائع کر دی جس کا نام ہے "النظم المستطاب لحکم القراة فی الصلوٰة الجنازة بام الکتاب"۔

چنانچہ فاضل لکھنوی نے تعلیق المجد میں اس کتاب کی حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں: رد فیھا علی من ذکر الکراھة بدلائل شافیة وھذا ھو الاولی لثبوت ذالک عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم۔ یعنی "اس کتاب میں نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو مکروہ کہنے والوں کا خوب رد کیا ہے اور ان کی تردید کے لیے بہت کافی شافی دلائل پیش کئے ہیں اور بات بھی ٹھیک ہے کہ اس کا ثبوت آنحضور ﷺ اور آپ کے صحابہ سے پایا گیا ہے۔"

جناب قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی ملا بدمنہ کے ص-۹۳ میں لکھتے ہیں کہ "اکثر علماء کرام برانند کہ فاتحہ ہم خوانند" یعنی اکثر علماء فاتحہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ یعنی سورہ فاتحہ کے ساتھ وہ سواد اعظم ہے جن کی اتباع واجب ہے۔ قاضی مرحوم نے تو یہ وصیت لکھ دی تھی کہ میرے جنازہ پر سورہ فاتحہ ضرور پڑھیں کیونکہ ان کو یہ علم تھا کہ ہمارے حنفی فاتحہ کے چور ہیں کہ اس کو نماز جنازہ سے چرا لے جاتے ہیں۔ اس لیے وصیت کر گئے۔ اب اللہ جانے ان کی وصیت پر عمل کر کے کسی نے ان کے جنازہ پر فاتحہ پڑھی یا نہیں' واللہ اعلم۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ فتاویٰ رشیدیہ کا فتویٰ غلط اور ناقابل عمل ہے۔ اس سنت کو زندہ کرنا ضروری ہے۔ فتویٰ اور اقوال تو دیگر علماء محققین کے بھی بہت موجود ہیں لیکن مضمون کافی

حد تک طویل ہو چکا ہے۔ اس لیے اب آخر میں اپنی تائید اور تبرک کی غرض سے ایک فتویٰ حضرت امام الموحدین و زبدۃ العارفین مولانا عبدالجبار المحدث الغزنوی رحمہ اللہ کا پیش کرتا ہوں جو مجموعۃ الفتاویٰ کے ص-۱۰۰ پر درج ہے۔ آنجناب مرحوم سے یہ سوال ہوا کہ سورہ فاتحہ نماز جنازہ میں اور نمازوں کی طرح فرض ہے یا نہیں؟ حدیث لا صلوٰۃ بفاتحۃ الکتاب کے عموم پر نماز جنازہ میں شامل ہے۔ لیکن جو لوگ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کو فرض نہیں کہتے' ان کے پاس کیا دلیل ہے؟ اس کا جواب جو رئیس المتقین مرحوم نے ارشاد فرمایا وہ درج ذیل ہے:

الجواب: حدیث صحیح لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب کے عموم سے اور حدیث ابن ماجہ سے جو ام شریک سے مروی ہے: امرنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان نقراء علی الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب۔ نماز جنازہ میں فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور امام شافعی اور امام احمد وغیرہما کا بھی یہی مذہب ہے اور قول راجح بھی یہی ہے۔ بعض اہل علم قرات فاتحہ کو نماز جنازہ میں سنت جانتے ہیں اور دلیل ان کی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے جو صحیح بخاری میں ہے:

"عن طلحۃ بن عبیداللّٰہ قال صلیت خلف ابن عباس علی جنازۃ فقرا بفاتحۃ الکتاب قال تعلموا انھا سنۃ وروی عبدالرزاق والنسائی عن ابی امامۃ بن سھل بن حنیف قال السنۃ فی الصلوٰۃ علی الجنازۃ ان یکبر ثم یقرا بام القرآن ثم یصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ ثم یخلص الدعا للمیت ولا یقراء الا فی الاولی قال الحافظ اسناد صحیح۔"

امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک جنازہ میں قرات نہیں۔ عینی شرح بخاری میں ہے:

"ونقل عن ابی ھریرۃ وابن عمر لیس فیھا قراۃ وھو قول مالک والکوفیین وقال ابن بطال وممن لا یقراء فی الصلوٰۃ علی الجنازۃ وینکر عمر بن الخطاب وعلی بن ابی طالب وابن عمر وابوھریرۃ ومن التابعین عطاء وطاؤس وسعید بن المسیب وابن سیرین وسعید بن جبیر والشعبی والحکم وقال مالک قراۃ الفاتحۃ لیست معمولا بھا فی بلدنا فی الصلوٰۃ الجنازۃ۔"

مگر ان روایات کی صحت و ثبوت باسند مشکل ہے۔ حررہ عبدالجبار الغزنوی عفی

عنہ۔

میں کہتا ہوں سنت سے مراد ان روایتوں میں طریقہ شرعیہ ہے جو فرض اور سنت سب کو شامل ہے۔ ورنہ تکبیر اولیٰ کو بھی سنت ماننا پڑے گا۔ حالانکہ وہ بالاتفاق فرض ہے کہ بغیر اس کے نماز میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ صیانۃ الانسان کے ص-۳۴۷ میں محدث سہسوانی مرحوم فرماتے ہیں: "واطلاق السنة علی ما یشتمل الغرض وغیره شائع کما فی قوله صلی الله علیه وسلم فمن رغب عن سنتي فلیس مني" ای اعرض عن طریقتي فرضا او سنة قال الحافظ فی الفتح والمراد بالسنن ماتبلشونه عن النبی صلی الله علیه وسلم واجبا کان او مندوبا یعنی سنت سے مراد طریقہ ہے۔

پھر حافظ ابن حجر سے نقل کیا ہے: قال الحافظ فی الفتح المراد بالسنة الطریقة التی تقابل الفرض۔ یعنی "سنت سے مراد طریقہ ہے جو سنت کا محاورہ فرض کے مقابلہ میں ہے۔ وہ مراد نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں دعا اور درود دونوں نماز جنازہ میں فرض ہیں تو سورہ فاتحہ فرض کیوں نہ ہو۔ یہ بھی فرض ہے۔ باقی عینی کے حوالہ سے جن صحابہ کرام سے قرات کی نفی منقول ہے۔ اول تو یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بغیر کسی سے بسند صحیح مروی نہیں ہے۔ اگر ابن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے ثابت ہو۔ جیسے موطا امام مالک میں ہے تو اس سے مراد سورت فاتحہ کے دیگر سورہ کی قرات ہے۔ کیونکہ فاتحہ حمدوثنا بھی ہے اور قرات بھی ہے اور دعا بھی ہے۔ اس کے بغیر کسی کو چارہ نہیں ہے اور نہ کسی صحابی نے اس سے انکار کیا ہے۔ ابن بطال کا بیان بے ثبوت ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ بغیر سند کے کوئی بات مانی نہ جائے گی۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے جنازہ کا طریقہ جو موطا امام مالک سے منقول ہے۔ اس میں یہ ہے: فاذا وضعت کبرت وحمدت الله وصلیت علی نبیه ثم اقول اللهم (الخ) یعنی "جب جنازہ رکھا جاتا ہے تو میں تکبیر کہہ کر اللہ کی حمد کرتا ہوں یعنی درود پڑھتا ہوں پھر دعا پڑھتا ہوں۔"

اس میں اللہ کی حمد کرتا ہوں' سے مراد الحمد للہ پڑھنا ہے کہ اس میں حمدوثنا پائی جاتی ہے۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی مصفی ص-۲۰۰ میں فرماتے ہیں۔ مترجم گوید معنی کبرت وحمدت الله وصلیت علی نبیه آنفا بعد تکبیر اول حمد گوید خواہ سورہ فاتحہ خواند خواہ لفظ دیگر مثل سبحانک اللہ۔

میں کہتا ہوں کہ سبحانک اللہ پڑھنا کسی روایت سے ثابت نہیں ہے اور فاتحہ پڑھنا ثابت ہے اور اس کا حمد ہونا مسلم ہے تو بھی متعین ہے۔ چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے قول پر جو لا یقرا فی الصلوٰۃ علی الجنازۃ مذکور ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب یہ فرماتے ہیں: مترجم گوید تعقب کردہ شد بحدیث شیخین من السنۃ قرأۃ الفاتحۃ فی صلوٰۃ الجنازۃ۔ پس نزد شافعی قراۃ فرض است وترک جائز نیست خواندن قرآن در نماز جنازہ وسورہ فاتحہ را بقصد دعاء باک نیست یعنی "ابن عمر رضی اللہ عنہ کے قول پر حدیث بخاری و مسلم میں تعاقب کیا گیا ہے کہ جنازہ کا طریقہ شرعیہ یہ ہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھی جائے۔ اس لیے امام شافعی کے نزدیک فرض ہے اور حنفیہ ناجائز کہتے ہیں۔ مگر بقصد دعا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" حجتہ اللہ میں بھی شاہ صاحب نے جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کو تسلیم کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فاتحہ نہ پڑھنے کا مذہب مرجوح اور ضعیف بلکہ مردود ہے اور فاتحہ نماز جنازہ میں پڑھنا راجح اور صحیح ہے۔ پس اس پر تمام مسلمانوں کو عمل درآمد رکھنا چاہیے ورنہ نماز جنازہ صحیح نہ ہوگی کہ بغیر فاتحہ کے کوئی نماز فرض عین ہو یا کفایہ' خداج یعنی مردہ اور بے روح ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف الحصاری

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد ۱۸' شمارہ ۳۴' ۳۵' ۳۶' ۳۷' ۳۸' مورخہ ۱۸ و ۲۵ فروری ۵ و ۱۱ و ۱۸ مارچ سنہ ۱۹۶۶ء

نماز جنازہ میں قرأت قرآن کی تحقیق

بہشتی زیور حصہ یازدہم بنام بہشتی گوہر کے ص ۹۲ میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی حکیم امت حنفیہ یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں کہ "اس نماز (جنازہ) میں التحیات اور قرآن مجید وغیرہ کی قرات وغیرہ نہیں ہے۔"

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ نماز جنازہ میں التحیات نہیں ہے اور یہ مسئلہ حکمت نبوی کے سراسر خلاف ہے' اس لیے باطل ہے۔ حضرت شیخ جیلانی محبوب سبحانی "جن کو حنفیہ تاج الاولیاء کا لقب دے کر غوث اعظم کے نام سے خطاب کرتے ہیں' وہ غنیتہ الطالبین جلد ۲' ص ۸۸۸ مترجم میں فرماتے ہیں "فیکبر اربع تکبیرات یقرا فی الاولی الفاتحۃ لما روی

عن ابن عباس انه قال امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یقرا بفاتحۃ الکتاب علی الجنازۃ" یعنی "نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہے اور پہلی تکبیر میں سورہ فاتحہ پڑھے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھی جائے۔"

سورہ فاتحہ قرآن کی سورۃ ہے اور اس کی قرات قرآن کی قرات ہو گی۔ پس پیران پیر کی حکمت اور نبوی حکمت نے تھوی حکمت کو باطل کر دیا۔

غنیہ کی جلد۱، ص۲۱۱ مترجم میں ہے واجمع المسلمون علی ان من قرا فاتحۃ الکتاب فی صلوٰۃ انہ قاری کتاب اللہ یعنی "تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص سورہ فاتحہ نماز میں پڑھتا ہے تو اس کو قرآن کا قاری کہا جائے گا۔"

میں کہتا ہوں حنفیہ کو یہ بھی مسلم ہے کہ سورہ فاتحہ بھی قرآن ہے اور یہ تسلیم کرنے سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے کہ قرآن ناطق ہے: ولقد اٰتینک سبعاً من المثانی والقراٰن العظیم یعنی "اے ہمارے رسول! ہم نے تم کو سات آیتیں ایسی دیں جو (ہر نماز اور نماز کی ہر رکعت میں) دہرا کر پڑھی جاتی ہے اور قرآن عظیم دیا ہے۔" اس سے آیت سورہ فاتحہ کی بڑی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو ہر نماز کا رکن بلکہ ہر رکعت کا رکن اور جزو اعظم قرار دیا گیا ہے۔ اور رکن وہ ہوتا ہے جس کے ترک سے وہ چیز قائم نہ رہے، باطل ہو جائے۔

اس لیے شیخ جیلانی عالم ربانی یہ فرماتے ہیں: فان قراتھا فریضۃ وھی رکن تبطل الصلوٰۃ بترکھا۔ (ص۸۳۵) یعنی "سورہ فاتحہ نماز کا رکن ہے، اس کے ترک سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔" پس جس قدر حنفیہ نے بغیر سورہ فاتحہ کے جنازے پڑھے ہیں، وہ سب باطل ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب منعقد کیا ہے "باب قراۃ فاتحۃ الکتاب علی الجنازۃ" پھر حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے کہ طلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس کے پیچھے ایک جنازہ پر نماز پڑھی تو انہوں نے سورہ فاتحہ پڑھی اور کہا کہ یہی طریقہ نبویہ ہے۔

مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودی مرحوم نے ایک کتاب بنام ریاض الابرار لکھی ہے جس

میں مسائل اہلحدیث مذہب کے کتب حنفیہ سے التملا للحجتہ والزاما درج کئے ہیں۔ نماز جنازہ کے بارہ میں بحوالہ رسالہ الجوائز للملا علی قاری یہ لکھا ہے وما ابعدان حمله علی قصد الدعآء دون القرأة ومن این لهٗ معرفة هذه النية علی ان الجمع بينهما هو الاولٰی فانه نور علٰی نور فی المقام الاعلٰی (الٰی ان قالح يبعد عمله علٰی قصد الثناء مع ان عموم قوله عليه السلام لا صلٰوة الا بفاتحة الكتاب شاملة لها (الٰی ان قالح ولا يصح حمله علٰی قصد الثنآء والدعآء من غير موجب۔ یعنی "مولانا ملا علی قاری نے فرمایا کہ حق سے بہت دور چلا گیا وہ شخص جو کہتا ہے کہ یہ پڑھنا سورہ فاتحہ کا دعاء کی رو سے تھا۔ اس نیت کا علم اس کو کہاں سے ہوا۔ باوجود اس بات کے کہ دونوں کا جمع کرنا مقام اعلیٰ میں بہت ہی بہتر بلکہ نور علیٰ نور ہے اور قصد ثناء پر حمل کرنا بعید ہے باوجودیکہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ نہیں صحیح کوئی نماز مگر ساتھ فاتحہ کے یہ عموم سے نماز جنازہ کو بھی شامل ہے۔ پس اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کو قصد ثناء اور قصد دعاء پر حمل کرنا صحیح نہیں کہ یہ بلاوجہ اور دلیل موجب کے ہے۔" (ریاض الابرار ص-۲۶۹)

میں کہتا ہوں کہ مولانا عبدالحی لکھنوی بہ نسبت اکثر حنفیہ کے منصف مزاج تھے۔ انہوں نے اپنے رسالہ امام الکلام کے ص-۳۱۴ میں لکھا ہے اعلم انه قلوردت احاديث مرفوعة واٰثار موقوفة دالة علی شريعة قراة الفاتحة بعد التكبيرة الاولٰی فی صلٰوة الجنازة (الٰی ان قالح والرجح فی ذالک هو القراة علی وجه الاستحباب او السنية لثبوت ذالک بالاخبار المتواردة یعنی "یہ بات جان لیں کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے بارہ میں احادیث مرفوعہ اور اقوال موقوفہ وارد ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ جنازہ میں پہلی رکعت کے بعد فاتحہ پڑھنا مشروع ہے اور بعض آثار ترک پر وارد ہیں اور اس مسلک میں سلف اور ائمہ کا اختلاف ہے۔ لیکن راجح بات یہ ہے کہ نماز جنازہ میں قراۃ بطور استحباب یا سنت کے ہے کیونکہ اس کا ثبوت احادیث سے پایا گیا ہے۔"

پھر بحوالہ نسائی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی۔ فقرا فاتحة الكتاب وسورة وجهر حتّٰی اسمعنا فلما فرغ اخذت بيده فسألته فقال سنة وحق وعن ابی امامةِ انه قال السنة فی الصلاة علی الجنازة ان تقرا فی التكبيرة الاولٰی بام القراٰن فحافة (الحديث) یعنی "ابن عباس رضی اللہ عنہ

نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ اور سورہ قرآن کی جہر سے پڑھی اور ہم کو سنایا- میں نے بعد از فراغت ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ کیا یہ عمل درست ہے؟ انہوں نے فرمایا یہ طریقہ شرعیہ ہے جو حق ہے- اور ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نماز جنازہ میں سنت طریقہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد سورہ ام القرآن پڑھی جائے-"

ارشاد الساری ---- شرح بخاری کے حوالہ سے نقل کیا ہے: ھی من ارکانھا لعموم حدیث لا صلٰوۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب یعنی "سورہ فاتحہ نماز میں پڑھنا رکن ہے جو حدیث سے ثابت ہے کہ فرمایا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز صحیح نہیں ہے-"

بہرکیف مقلدین حنفیہ کی اس تاویل کو کہ سورہ فاتحہ جنازہ میں ثناء یا دعاء کی نیت سے پڑھی گئی غلط قرار دیا ہے- اور سورہ فاتحہ کا نماز جنازہ میں مشروع ہونا ثابت ہے- پس حکمت تھانوی حکمت نبوی کے مقابلہ میں قابل قبول نہیں ہے- اور شرح وقایہ و فتاوٰی قاضی خاں میں یہ لکھا ہے: ولا یقرا بفاتحۃ الکتاب کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے- یہ خلاف حدیث نبوی اور خلاف صحابہ کرام کے ہے-

مسجد میں نماز جنازہ کا حکم: بہشتی گوہر حصہ گیارہواں کے ص-۹۲ میں لکھا ہے کہ "جنازہ کی نماز اس مسجد میں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے جو پانچ وقتی نمازوں یا جمعہ یا عیدوں کی نماز کے لیے بنائی گئی ہو- خواہ جنازہ مسجد کے اندر ہو یا مسجد سے باہر ہو- (ردالمختار' درمختار' بحرالرائق وغیرہ) ---- میں کہتا ہوں کہ فقہ حنفیہ کی قدوری میں ہے ولا یصلی علٰی میت فی مسجد جماعۃ یعنی "جس مسجد میں نماز باجماعت کا انتظام ہو' اس میں نماز جنازہ نہ پڑھی جائے- یہ حکمت کوفی اور تھانوی خلاف نبوی اور تعامل صحابہ کرام کے ہے- والدلیل علیہ ما فی مسلم عن عائشۃ واللّٰہ لقد صلی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم علٰی ابنی بیضاء فی المسجد سھیل واخیہ (مرعاۃ المفاتیح جلد-۲' ص-۴۷۴) یعنی "اس کی دلیل صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حلفیہ بیان دیا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے دونوں بیٹوں سہیل اور اس کے بھائی کا جنازہ مسجد میں پڑھایا تھا-"

پھر لکھا ہے وقال الخطابی ثبت ان ابابکر وعمر صلی علیھما فی المسجد یعنی "امام خطابی نے یہ کہا کہ یہ بھی ثابت شدہ امر ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا جنازہ مسجد

میں پڑھلیا گیا ہے۔" پھر لکھا ہے کہ یہ امر عام معلوم ہے کہ عام مہاجرین و انصار اس جنازہ پر حاضر تھے' کسی نے انکار نہ کیا۔ یہ دلیل مسجد میں نماز جنازہ جائز ہونے کی ہے۔

نیز مرعاۃ المفاتیح میں ہے: ان عمر صلی علی ابی بکر فی المسجد وان صهیبا صلی علی عمر فی المسجد ..... ووضعت الجنازة فی المسجد تجاہ المنبر یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جنازہ مسجد میں پڑھا اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کا جنازہ مسجد میں پڑھا جو منبر کے سامنے رکھا گیا تھا۔ پھر حافظ ابن حجر سے نقل کیا ہے هذا یقتضی الاجماع علی جواز ذالک یعنی "یہ تعامل صحابہ کا اجتماعی اجماع شرعی پر دال ہے۔"

نیز ابن قدامہ سے نقل کیا ہے کان هذا بمحضر من الصحابة فلم ینکر فکان اجماعا یعنی "یہ تعامل صحابہ کرام کی حاضری میں ہوا ہے' اس پر کسی صحابی نے انکار نہ کیا تو یہ صحابہ کا اجماع ہو گیا۔" پھر بطور فیصلہ یہ لکھا ہے والحق انه یجوز الصلوة علی الجنائز فی المسجد من غیر کراهة یعنی "حق بات یہ ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔"

تراویح میں قل ھو اللہ تین بار پڑھنا مکروہ ہے: بہشتی گوہر کے ص-۳۲ میں لکھا ہے "مسئلہ صحیح یہ ہے کہ قل ھو اللہ احد کا تراویح میں تین مرتبہ پڑھنا جیسا کہ آج کل دستور ہے مکروہ ہے۔" یہ حکمت باطل ہے' اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ حکمت نبوی یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے کہ ایک بار سورہ اخلاص کا پڑھنا ثلث قرآن کا درجہ رکھتا ہے۔ پس تین بار پڑھنا پورے قرآن کا درجہ ہو گیا۔ حنفیہ کے نزدیک یہ فرض میں مکروہ ہے' نفل میں نہیں۔ نور الایضاح کے ص-۹۶ مکروہات نماز میں یہ لکھا ہے وتکرار السورة فی رکعة واحدة من الفرض یعنی "فرض کی ایک رکعت میں تکرار سورت کا مکروہ ہے۔"

بخاری میں ہے قال قتادة فیمن یقرا بسورة واحدة فی رکعتین او یردد سورة واحدة فی رکعتین کل کتاب الله یعنی "قتادہ نے کہا کہ ایک ہی سورہ کو دو رکعت میں پڑھے یا ایک ہی سورہ کو دو رکعتوں میں دہرا کر پڑھے تو یہ سب کتاب اللہ ہے۔" ایک شخص قل ھو اللہ احد کو ہر رکعت میں دہرا کر پڑھتا تو آپ نے اس کو جائز رکھا۔ (بخاری)

ابن کثیر جلد---' ص-۵۶۶ میں حدیث ہے: عن ابی سعید ان رجلا سمع رجلا یقرا قل هو الله احد یردد ها ---- فلما اصبح جاء الی النبی صلی الله علیه وسلم فذکر ذالک وکان الرجل یتلالها ---- فقال النبی صلی الله علیه وسلم والذی نفسی بیده انها

لتعدل ثلث القرآن یعنی "ایک شخص نے رات کو سنا کہ کوئی شخص سورہ اخلاص کو دہرا دہرا کر تمام رات پڑھتا رہا۔ جب صبح ہوئی تو اس نے جناب نبی کریم ﷺ سے ذکر کیا کہ رات کو اس طرح تکرار سے سورہ اخلاص پڑھی گئی۔ گویا اس نے اس قرات کو قلیل سی قرات سمجھا تو آنحضور ﷺ نے فرمایا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یہ تیسرے حصہ قرآن کے برابر درجہ رکھتی ہے۔" پس حکمت نبوی کی رو سے تکرار سورہ کا نماز میں جائز ہے' مکروہ نہیں ہے۔

قیام اللیل مولفہ مروزی کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ پس قیام اللیل اردو کے ص-۱۰۷ پر عنوان یہ ہے "نمازی کا ایک آیت کو بار بار پڑھنا اور تدبر کرنا" پھر اس کے تحت ایک حدیث طویل کا ترجمہ یہ ہے: "آنحضور ﷺ نے رات کو نفل پڑھنے شروع کئے تو آپ قیام اور رکوع' سجود میں صرف یہ آیت پڑھتے رہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ آپ کے مقتدی تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ حضرت جی پورا قرآن آپ کو یاد ہے پھر صرف ایک آیت کا انتخاب کیا یہ کیسا؟ فرمایا میں اپنی امت کے لیے دعا کرتا رہا ہوں۔ آیت یہ تھی: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمِ○ پس جب ایک آیت کا تکرار جائز ہو اور وہ بھی رکوع اور سجدہ تک ہر رکعت میں پھر تمام نوافل میں صبح تک تو تراویح میں جو بعینہ تہجد ہے' ایک سورہ کا تکرار مکروہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پس حکمت نبوی سے حکمت تھانوی کا رد ہو گیا۔

علاوہ ازیں دلائل قیام اللیل میں موجود ہیں۔ مقلدین حنفیہ میں خواہ کوئی ہزار علمی بن جائے' احادیث نبویہ اور آثار سلف صالحین سے ضرور لاعلم رہے گا کیونکہ شخصی تقلید نے انہیں یہی سبق دیا ہے کہ میزان شعرانی جلد-۱' ص-۱۰ میں ہے کہ امام شافعی نے فرمایا: خذوا علمکم من حیث اخذہ الائمة فلا تقنعوا بالتقلید فان ذالک عمی فی البصیرة یعنی "علم شریعت کو وہاں سے لو جہاں سے اماموں نے لیا اور تقلید پر قناعت نہ کرو' یہ اندھا پن ہے۔"

قیام اللیل میں ہے کہ حمزہ نے بیان کیا کہ مجھے حضرت اسماء نے بازار بھیجا۔ آپ نے سورہ طور شروع کر رکھی تھی۔ جب واپس آیا تو آپ وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ بار بار پڑھ رہی تھیں۔ نیز لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پڑوسی کا بیان ہے کہ آپ رات کو ایک آیت کو بار بار پڑھ رہے تھے۔ سعید بن جبیر آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ پڑھتے رہے۔ اور

انتیس (۲۹) بار پڑھی- اسی طرح دیگر سلف سے منقول ہے-

تاریخ بغداد میں ترجمہ امام ابوحنیفہ کا مستقل ایک جزء میں ہے جو بنام امام محمدی ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے- اس کے ص-۳۴ میں ہے کہ قاسم بن معین کہتے ہیں کہ ایک رات امام صاحب نے اسی ایک آیت میں گزاری- بار بار اسے پڑھتے رہے بل الساعة ادهى وامر یعنی "قیامت وعدے کا وقت ہے اور وہ بہت دہشت ناک اور کڑواہٹ والا دن ہے-"

تفسیر ابن کثیر جلد-۴' ص-۵۶۷ میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے تمام صحابہ کو جمع ہونے کا حکم دیا اور فرمایا میں تمہارے پر تیسرا حصہ قرآن کا پڑھوں گا- جب سب جمع ہو گئے تو آنحضرت ﷺ نے ان پر قل ھو اللہ احد پڑھ دی- اور فرمایا میں نے تم سے تیسرا حصہ قرآن کا پڑھ کر سنانے کو کہا تھا- الا وانها تعدل ثلث القرٰان خبردار! یہ سورہ تیسرا حصہ قرآن کا ہے- نیز ص-۵۶۸ میں حمید بن عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں کہ "ایک جماعت صحابہ کرام نے یہ حدیث نبوی سنائی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قل ھواللہ احد جس نے نماز میں پڑھ لی تو یہ تیسرا حصہ قرآن کے برابر ہوا- پس تھانوی حکمت سراسر باطل اور غلط ثابت ہوئی' فللہ الحمد-

کتبہ العبد عبدالقادر عارف الحصاری غفرلہ الباری

صحیفہ اہل حدیث جلد-۵۴' شمارہ-۹' مورخہ یکم جمادی الاول سنہ-۱۳۹۳ھ

سوال دربارہ مروجہ فاتحہ خوانی اور قل

کیا حکم ہے شرع محمدی کا اس مسئلہ میں کہ جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کے کفن دفن وغیرہ سے فارغ ہو کر پھر اس کے مکان پر فرش ڈال کر تین یا سات روز تک بیٹھنا اور فاتحہ خوانی کرتے کراتے رہنا پھر ساتویں روز سب کا قل کلمہ وغیرہ پڑھ کر اور کھلا کھلا کر بخشنا یہ مشروع ہے یا نہیں؟ اگر مشروع ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟ اگر مشروع نہیں تو مندرجہ ذیل احادیث کا کیا جواب ہے کہ مسلم شریف میں ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ اس پر حد زنا جاری ہوئی تو آپ نے فرمایا تھا کہ ماعز کے لیے بخشش کی دعا مانگو- تب صحابہ نے کہا غفراللہ لماعز بن مالک- اسی طرح ابوعامر صحابی رضی اللہ عنہ شہید ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اس کے حق میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی- ان احادیث سے دلیل لی جاتی ہے کہ میت کے حق میں

دعا مانگنی جائز ہے۔ ان کا جواب دیجئے۔

(السائل صوفی عبیداللہ پارچہ فروش ساکن چک نمبر۴۵ ضلع منٹگمری ساہیوال)

(الجواب بعون الوهاب وهو الموفق للصواب)

الحمد لله رب العالمين اما بعد فاقول وبالله التوفيق۔ میت کے گھر پر فرش بچھا کر مروجہ طریق سے فاتحہ خوانی کا سلسلہ جو پنجاب میں جاری ہے۔ یہ دیگر کسی اسلامی ملک یمن' حجاز' شام' نجد' ترکی وغیرہ میں جاری نہیں ہوا ہے۔ اور نہ علماء اہل سنت اس کے قائل و فاعل ہیں۔ کیونکہ یہ کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہے اور قرون ثلاثہ میں اس پر کوئی تعامل نہیں پایا گیا اور نہ آئمہ اربعہ سے اس کی کوئی روایت آئی ہے۔ یہ اہل بدعت کی ایجاد و ابتداء ہے۔ جیسے دیگر رسوم شرکیہ و بدعیہ' عرس' گیارہویں' ختم برطعام' ساتا' چہلم' برسی' احتیاطی' مولود وغیرہ ان کے ہاں مروج ہے۔ ایسے ہی یہ بھی ایک رسم بدعیہ ہے اور شر الامور محدثاتها کی مصداق ہے۔ اس سے بچنا واجب ہے۔

حدیث میں آیا ہے ایاکم ومحدثات الامور یعنی دین میں جو نئے کام پیدا ہوں' ان سے بچو۔ اور فرمایا من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو رد یعنی "جو شخص ہمارے دین میں نیا کام پیدا کرے' وہ مردود ہے۔

سائل نے جو کسی بدعتی ملا مولوی سے ایک دو احادیث سن کر لکھی ہیں' ان سے فاتحہ خوانی مروجہ ثابت نہیں ہوتی اور نہ اس کا ان میں کوئی ذکر ہے۔ ماعز بن مالک صحابی رضی اللہ عنہ کا قصہ مسلم شریف میں ہے کہ اس پر اس کے اقرار کی وجہ سے حد زنا جاری کی گئی تھی جس سے وہ فوت ہو گیا تھا۔ اس کے بارہ میں صحابہ کے دو فریق ہو گئے۔ بعض نے کہا کہ ماعز تباہ ہو گیا اور گناہوں نے اس کو گھیر لیا۔ دوسرا فریق کہتا تھا کہ ماعز کی توبہ سے بہتر کوئی توبہ نہیں۔ اس اختلاف پر چہ میگوئیاں کرتے ہوئے دو تین روز گزر ہو گئے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن تشریف لائے کہ صحابہ کرام بیٹھے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا اور بیٹھ گئے اور فرمایا کہ ماعز کے لیے بخشش مانگو۔ صحابہ نے کہا غفر اللہ لماعز بن مالک یعنی اللہ تعالیٰ ماعز کو بخشے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماعز نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ امت کے لوگوں میں بانٹی جائے تو سب کو کافی ہو جائے۔

یہ ایک خاص واقعہ ہے جو سنگسار شدہ زانی کے متعلق ہے۔ جس کے بارہ میں ایک تو

بعض لوگوں کی بدگمانی تھی کہ وہ تباہ ہو گیا۔ اس کو گناہوں نے گھیر لیا۔ اس لیے آپ نے اس کی فضیلت بیان کر دی اور اس کی توبہ کا ذکر کیا۔ اور دوسرا اس کے حق میں بخشش کا دعائیہ کلمہ کہلوایا۔ کیونکہ وہ اس کی مذمت کر چکے تھے۔ جس کی برائی کی جائے تو اس کے حق میں بھلائی کی دعا کرنے سے اس برائی کے گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ صحابہ نے زبانی طور پر غفراللہ لماعز کہہ دیا جیسے ہم لوگ بھی عام طور پر کسی میت مسلمان پر اس کا ذکر کرنے پر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخشے اور رحم کرے۔ اس حدیث کا فاتحہ خوانی مروجہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اہل بدعت زانیوں کے حق میں جبکہ وہ توبہ کریں تو یہ کلمہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر پہلے ان کو حد لگانی ضروری ہو گی۔

اسی طرح دوسری حدیث کو سمجھ لو کہ آنحضور ﷺ نے ابو عامر صحابی رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر دے کر اوطاس کی طرف بھیجا۔ ان کے ساتھ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ابو عامر رضی اللہ عنہ کو دشمن نے جب تیر مارا تو وہ اس سے شہید ہو گئے تھے۔ فوت ہونے سے پہلے انہوں نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے میرے بھتیجے تو رسول اللہ ﷺ کے پاس جا اور میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام عرض کر اور یہ کہہ کہ ابو عامر کے حق میں بخشش کی دعا کیجئے۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ جب لوٹ کر آئے تو آنحضرت ﷺ کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ اس وقت بان کے بنے ہوئے پلنگ پر ایک کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا نشان آپ کی پیٹھ اور پسلیوں پر بن گیا تھا۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے ابو عامر رضی اللہ عنہ کا حال بیان کیا اور یہ کہا کہ ابو عامر رضی اللہ عنہ نے آپ سے یہ درخواست کی تھی کہ میرے حق میں دعا فرمایئے۔ آنحضرت ﷺ نے پانی منگوایا اور وضو کیا اور دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا یااللہ ابو عامر کو بخش دے۔ یہاں تک ہاتھ اٹھائے کہ بغلوں کی سفیدی میں نے دیکھی۔ پھر فرمایا یااللہ ابو عامر کو قیامت کے دن بہت لوگوں کا سردار کریو۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یارسول اللہ! آپ میرے لیے بھی بخشش کی دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا بخش دے یااللہ عبداللہ بن قیس کے گناہوں کو اور قیامت کے دن اس کو عزت کے مکان میں لے جا۔ ابوبردہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک دعا ابو عامر رضی اللہ عنہ کے لیے اور دوسری ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کی۔

اس حدیث میں بھی فاتحہ خوانی اور مروجہ ایصال ثواب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اہل بدعت سینہ زوری سے غیر متعلق احادیث سے دلیل لاتے اور عوام کو مغالطہ و دھوکہ دیتے ہیں کہ

دیکھو اس سے میت کے حق میں فاتحہ خوانی کرنی ثابت ہو گئی۔ حالانکہ اس حدیث سے جو کچھ ثابت ہوا ہے وہ ان کا دعویٰ نہیں۔ اور جو ان کا دعویٰ ہے وہ اس حدیث سے ثابت نہیں۔ دلیل اور دعویٰ میں بعد المشرقین ہے۔ کجا فاتحہ خوانی مروجہ اور کجا ایک شہید کا مرتے وقت دعا کی درخواست کرنا کہ میرے حق میں آنحضور ﷺ دعا فرمائیں تب آپ نے دعا فرما دی۔ اور یہ دعا وضو کر کے کی گئی۔ اور کہاں بے وضو فاتحہ خوانی مروجہ کا حال کہ میت کے گھر جانا اور فرش پر بیٹھنا اور وہاں لوگوں کی آمدورفت شروع ہو جانا اور پھر سب کا ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا۔ پھر ایک بار ہوا تو دوسرے شخص کے آنے پر پھر اسی طرح کرنا۔ اسی طور پر کئی دنوں تک سلسلہ جاری رہا۔ جو صورت محدثہ ہے۔ دونوں میں فرق بین ہے۔

میت کے حق میں نمازوں کے بعد یا قبر پر جا کر اتفاقیہ کسی بزرگ سے مل کر دعا کرنا کرانا جائز ہے۔ ہم علی الاطلاق دعاء میت کا انکار نہیں کرتے۔ ہم ایسی مروجہ صورتوں اور رسموں کا انکار کرتے ہیں جن کا التزام خاص شکلوں میں کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک عورت جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی فوت ہو گئی۔ صحابہ نے اس کو دفن کر دیا۔ آنحضور ﷺ کو کوئی خبر نہ ہوئی کہ آپ عالم الغیب نہ تھے۔ آخر آنحضرت ﷺ نے ایک دن اس کا حال دریافت کیا تو صحابہ نے اس کا فوت ہو جانا بیان کیا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نے مجھے خبر کیوں نہ کی؟ پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی قبر بتاؤ۔ (کیونکہ آپ حاضر ناظر نہ تھے اور نہ عالم الغیب تھے) تب صحابہ نے قبر بتائی تو آپ نے اس کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔ اسی طرح ایک میت پر آپ نے ایک ماہ کے بعد قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی۔ (دار قطنی)

اب کوئی شخص اس اتفاقیہ واقعہ کو یوں رسم بنا لے کہ جب کوئی جنازہ سے رہ جائے وہ قبر پر جا کر جنازہ پڑھے اور لوگوں کو اپنے پیچھے کھڑا کر لیا کرے تو کیا کوئی اس دائمی رسم کو منظور کر لے گا؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اتفاقیہ آپ نے کبھی صلوۃ الضحیٰ مسجد میں پڑھی تو اب اگر تمام نمازی جمع ہو کر مسجد میں صلوۃ الضحیٰ کا اہتمام کر کے اس کو ادا کریں تو کیا یہ جائز ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو بدعت فرمایا ہے۔

الغرض اگر کسی نفس چیز کا دین میں احداث کرے تب بھی بدعت ہے۔ جیسے وظیفہ "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" یہ بذاتہ بدعت ہے کہ اس کا وجود شرع میں نہیں پایا گیا۔ یا کسی چیز کا وجود تو ثابت ہو لیکن اس کی ہیئت کو عمل میں اور عقیدہ میں لا کر بدلا جائے تو یہ بھی

بدعت ہے۔ جیسے صلوۃ الضحیٰ کی مثال گزری کہ نفس نماز ضحیٰ کا ثبوت ہے لیکن اجتماعی صورت ہے۔ اس کی حقیقت بدل گئی تو حضرت عمر بنی تینہ نے اس کو بدعت قرار دے دیا تھا۔

اسی طرح نماز کے بعد امام کو انحراف دائیں بائیں دونوں طرف سے جائز ہے۔ لیکن کوئی شخص دائیں طرف سے پھرنے کا التزام کرے اور بائیں طرف کو چھوڑ دے تو یہ بدعت اور نماز میں شیطان کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ وغیرہ کتب حدیث میں حضرت ابن مسعود بنی تینہ سے مروی ہے کیونکہ اس سے ہیئت کذائیہ ---- تبدیل ہو جاتی ہے۔ شامی شرح درمختار کی جلد ۵' ص ۳۵۰ میں ہے کہ جہر سے ذکر کرنا حرام ہے۔ کیونکہ عبداللہ بن مسعود بنی تینہ سے صحیح روایت کے ساتھ ثابت ہے کہ انہوں نے ایک جماعت کو مسجد سے محض اس لیے نکال دیا تھا کہ وہ بلند آواز سے لا الہ الا اللہ اور آنحضرت ﷺ پر درود شریف پڑھتی تھی۔ اور ان کو فرمایا تھا ما اراکم الا مبتدعین۔ یعنی "میں تم کو بدعتی تصور کرتا ہوں۔" اور حمری میں فتاویٰ قاضی خاں کے حوالہ سے یہ الفاظ بھی اس روایت کے آخر میں ہیں کہ ما عھدوا ذٰلک علٰی عھدہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی "یہ طریقہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں نہ تھا۔" یہ ہیئت جدیدہ ہے جو عہد نبوی میں نہ تھی۔ نفس کلمہ اور درود تو ثابت ہیں مگر اس ہیئت جدیدہ سے ثبوت نہ تھا۔ اس لیے بدعت قرار دیا۔ اب بھی نماز کے بعد اہل بدعت بلند آواز سے درود اور کلمہ پڑھتے تھے۔ اور اذان کے بعد بھی بلند آواز سے درود اور کلمہ پڑھتے ہیں۔ یہ سب شکلیں جدیدہ ہونے کی وجہ سے بدعت ہیں۔

پس اسی طرح میت کے گھر میں فرش بچھا کر جو فاتحہ خوانی کا سلسلہ شروع ہے' یہ بدعت ہے۔ کیونکہ یہ ہیئت جدیدہ ہے۔ ایسی ہیئت قرون ثلاثہ میں پائی نہیں گئی اور پھر اس کا التزام ایسا ہے کہ جو شخص فاتحہ خوانی نہ کرے تو اس پر طعن و ملامت کرتے ہیں لیکن نماز نہ پڑھے یا جماعت سے نماز نہ پڑھے یا داڑھی منڈائے تو ان کاموں پر کوئی ملامت اور طعن نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ جرائم قابل ملامت ہیں۔

فاتحہ خوانی کی مجلس میں حقہ رکھا جاتا ہے۔ اس کو پیتے رہتے ہیں اور فاتحہ خوانی کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ حقہ نوش کے منہ سے بدبو آتی ہے۔ اس کو قرآن اور درود پڑھنا حرام ہے۔ پھر جو حدیث ابوعامر بنی تینہ کی پیش کی ہے' اس میں آنحضور ﷺ کا وضو کر کے پھر دعا کرنے کا ذکر ہے لیکن فاتحہ خوانی میں بے وضو بلکہ بے استنجا بعض پاد مار کر بھی فاتحہ کرتے

رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد میت کی خیرخواہی ہرگز نہیں ہے بلکہ صرف ریا کے طور پر برادری کے رواج کو پورا کرنا ہے۔ ان جاہلوں کو جنازہ کی دعا نہیں آتی اور ان کے امام' ملا مولوی جنازہ میں فاتحہ نہیں پڑھتے۔ حقہ نوشی سے درود فاتحہ پڑھتے ہیں جو گناہ ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ مرگئے مردود نہ فاتحہ نہ درود۔ جنازہ بغیر سورہ فاتحہ کے قبول نہیں ہے۔ اور دعا بغیر درود کے قبول نہیں ہے۔ تو اکثر حقہ نوش جن کے مونہوں سے حقہ کی بدبو آتی ہے' فاتحہ خوانی میں درود پڑھتے ہیں جس کو فرشتے ہرگز نہیں لے جاتے۔ ایک تو یہ بنفسہ اس صورت سے بدعت کا کام ہے' دوم حقہ نوش کے فعل حرام سے منہ بدبودار ہو۔ اس لیے فرشتے درود نہیں لے جاتے کہ ان کو بدبو سے نفرت ہے۔

خلاصہ تمام بحث کا یہ ہے کہ فاتحہ خوانی مروجہ بدعت ہے جس سے میت کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس سے اجتناب واجب ہے۔ اہل بدعت بعض غیر متعلق احادیث میں ذرا اشارہ اور دعا کا ذکر دیکھ کر ان سے استدلال کر کے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں کہ اس سے فاتحہ خوانی ثابت ہو گئی۔ حالانکہ ان سے کسی مجتہد یا محدث یا عالم فقیہہ نے اس فاتحہ خوانی مروجہ کے جواز پر استدلال نہیں کیا۔ تو یہ مغالطہ اور دھوکہ ہے۔ لہٰذا اہل بدعت کے دھوکہ سے بچنا چاہیے۔

ھذا ماعندی واللّٰہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث کراچی جلد۔۷۴' شمارہ۔۲۳' مورخہ یکم ذوالحجہ سنہ۔۱۳۸۶ھ

نماز جنازہ بالجہر کے متعلق حکم

بندہ راقم الحروف حصاری غفرلہ الباری نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ بمع دیگر سورہ قرآنی پڑھنے کا ثبوت اپنے ایک مضمون میں جو اس سے پہلے تنظیم اہل حدیث میں شائع ہو چکا ہے' پیش کیا تھا۔ آج نماز جنازہ میں قراۃ و درود و دعا جنازہ کا حکم بیان کیا جاتا ہے۔ غور سے پڑھ کر انصاف فرمایئے اور حق قبول کیجئے۔

(۱) قراۃ نماز جنازہ: نماز جنازہ میں قراۃ دونوں طرح جائز ہے۔ آہستہ پڑھنی بھی جائز ہے جیسے کہ حدیث ابوامامہ بن سہیل رضی اللہ عنہ میں یہ الفاظ وارد ہیں: ان السنة فی الصلوة ان یکبر

الامام ثم یقراء بفاتحة الکتاب بعد التکبیرة الاولی سراً فی نفسه (الی آخره) ثم یسلم سراً فی نفسه۔ یعنی "نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ آہستہ پڑھے (پھر دعاء و درود کے بعد) سلام آہستہ پھیرے۔" (رواہ الامام الشافعی فی مسندہ)

اس حدیث سے سورہ فاتحہ آہستہ پڑھنا اور سلام آہستہ پھیرنا ثابت ہوا۔ اب زمانہ حاضرہ میں سورۃ فاتحہ یا تو پڑھتے ہی نہیں (یہ طریقہ خلاف شریعت ہے) یا پڑھتے ہیں مگر آہستہ اور سلام جہر یعنی بلند آواز سے پھیرتے ہیں۔ حالانکہ آہستہ بھی جائز ہے۔ بس آج کل وہی چیز معتبر سمجھی ہے جس کا رواج عام ہو۔ شرعی دلیل اگرچہ موجود بھی ہو لیکن کمزور ہو تو صرف عمل عامہ کو لے لیا جاتا ہے۔

(۲) جہر سے پڑھنا: سورۂ فاتحہ اور دیگر سورہ جہر سے پڑھنی بھی جائز ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث بحوالہ نسائی شریف' میرے گذشتہ مضمون میں درج ہو چکی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: فقرا بفاتحة الکتاب وسورة وجهر فلما فرغ قال سنة وحق یعنی "ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ اور دیگر سورہ بلند آواز سے پڑھی اور فرمایا یہ طریقہ حق ہے۔" اس حدیث نے سورہ فاتحہ اور دیگر سورہ نماز جنازہ میں بلند آواز سے پڑھنا ثابت ہوا۔

ابوامامہ بن سہل عبید بن سباق سے روایت کرتے ہیں صلی بنا سہل بن حنیف علی جنازة فلما کبر التکبیرة الاولی قرا بام القرآن حتی اسمع من خلفه (الحدیث۔ رواہ البیهقی) یعنی "حضرت سہل بن حنیف صحابی رضی اللہ عنہ نے ہم کو نماز جنازہ پڑھائی تو انہوں نے تکبیر اولی کے بعد سورہ فاتحہ پڑھی اور اس قدر آواز بلند کی کہ ان کے پیچھے جو مقتدی لوگ کھڑے تھے' انہوں نے سن لی۔" اس تعامل صحابی سے قراۃ جہر سے پڑھنا ثابت ہوا۔

دیگر دلیل یہ ہے: ان المسور بن مخرمة صلی علی جنازة فقرا فی التکبیرة الاولی فاتحة الکتاب وسورة قصیرة ورفع بهما صوته اخرجه ابن حزم فی المحلّٰی (جلد۔۵' ص۔۱۲۹) "حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی تو انہوں نے پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ اور ایک چھوٹی سی سورت بلند آواز سے پڑھی۔" مسور رضی اللہ عنہ کی روایت کے آخر میں ہے کہ مسور رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ نماز گونگی ہے مگر یہ ظاہر کرتا ہوں کہ اس میں قرات ہے۔ اس اثر سے بھی قراۃ بلند آواز سے پڑھنی جائز ثابت ہوئی۔

شرح مسند احمد بلوغ الامانی جلد سابع ص-۲۴۲ میں یہ لکھا ہے کہ: ظاھر حدیث ابن عباس استحباب الجھر بالفاتحۃ والسورۃ فی صلوٰۃ الجنازۃ۔ یعنی "ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ اور دیگر سورہ اونچی آواز سے پڑھنا ہی مستحب ہے۔"

مستدرک حاکم میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث وارد ہے' اس میں یہ الفاظ ہیں: انہ صلی علی جنازۃ بالابواء فکبر ثم قراء الفاتحۃ رافعا صوتہ (الحدیث) یعنی "ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ابواء بستی میں ایک نماز جنازہ پڑھی تو تکبیر کہی اور پھر سورۃ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی (پھر درود دعا پڑھی)" اور فارغ ہو کر فرمایا: ایھا الناس انی لم اقرا علیھا ای جھرا الا لتعلموا انہ سنۃ یعنی "اے لوگو! میں نے بلند آواز سے اس لیے قرات کی تاکہ تم معلوم کرلو کہ جہر سے پڑھنا بھی سنت ہے۔"

جمہور علماء آہستہ پڑھنے کے قائل ہیں وہ بھی اسی حدیث سے تمسک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے جہر سے اس لیے قرات کی ہے تاکہ تم معلوم کرلو کہ نماز جنازہ میں قراۃ کرنا سنت ہے۔

میں کہتا ہوں یہ معنی بھی درست ہے لیکن پھر بھی اس سے ضرورتاً بلند آواز سے پڑھنا جائز ثابت ہو گا کہ آج کل بھی ضرورت تعلیمی ہے۔ لہٰذا اونچی آواز سے پڑھنا چاہیے۔ نیز دیگر صحابہ کا تعامل بھی اسی جواز پر دال ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کوئی اونچی آواز سے پڑھے یا آہستہ کسی سے تعرض نہ کرنا چاہیے کیونکہ احادیث سے دونوں طرح جائز ثابت ہوتا ہے۔ مرعاۃ المفاتیح جلد-۲' ص-۴۷۸ میں ہے: وذھب بعضھم الی انہ یخیر بین الجھر والاسرار۔ یعنی "بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ جہر اور اسرار میں جو چاہے اختیار کرے۔" (جائز ہے) فتذکروا۔

حنفیہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ اور دیگر سورہ پڑھنا ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ان کے ایک بہت بڑے فاضل امام ابن ہمام نے یہ لکھ دیا ہے کہ قرات جنازہ میں ثابت نہیں ہے۔ حالانکہ ہمارے پیش کردہ دلائل سے قرات خوب ثابت ہو چکی ہے۔ اس لیے جناب مولانا حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حنفیہ کا قدیما و حدیثا علم حدیث میں شغل کم رہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ متقدمین سے لے کر متاخرین تک طائرانہ نگاہ ڈالو تو معلوم ہو گا کہ نہ

صرف حنفیہ کا علم حدیث میں شغل بہت کم رہا ہے بلکہ ان کے اکثر مسائل حدیث کے خلاف ہیں۔ اسی لیے ان کو اہل حدیث نہیں کہا جاتا بلکہ اہل الرائے کہا جاتا ہے۔ اب یہ جرات رائے سے کہتے ہیں کہ نماز جنازہ میں قرات نہیں ہے اور پھر اپنے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (اہل حدیث) کو بھی شامل کرتے ہیں کہ وہ نماز جنازہ میں قرات کے قائل نہ تھے۔ حالانکہ وہ سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے۔ کیونکہ خود اس حدیث کے راوی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے: عن ابی هريرة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرا علی الجنازة اربع مرات الحمد لله رب العالمين۔ یعنی "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ پر چار بار سورہ الحمد پڑھی۔" (رواہ الحافظ الہیثمی وقال رواہ الطبرانی فی الاوسط)

سورہ فاتحہ کے بہت سے نام ہیں۔ ان میں سے ایک نام الحمدللہ رب العالمین بھی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر چار بار الحمد للہ رب العالمین پڑھی یعنی اور سورہ ساتھ نہ ملائی اور بار بار اسی کو پڑھ دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگر صرف فاتحہ کو تکرار سے پڑھ لے تو بھی درست ہے فاتحہ بھی سورت کی جگہ کافی ہے۔

(۳) درود شریف بلند آواز سے پڑھنے کے ثبوت میں مجھے کوئی صریح روایت نہیں ملی لیکن راویوں کا یہ بیان کہ: ثم يصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی دوسری تکبیر کے بعد درود شریف پڑھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درود بھی بلند آواز سے تھا۔ ورنہ راوی کو پڑھنے کا علم کیسے ہوا؟

نیز جب قراۃ اور دعا کا بلند آواز سے پڑھنا ثابت ہے تو پھر درود بھی بلند آواز سے ہی ہونا چاہیے۔ دہلی میں مجھے ایک جنازہ کی نماز مولانا محمد صاحب جوناگڑھی رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ تو انہوں نے سورہ فاتحہ اور دیگر سورہ اور درود اور دعا جنازہ بلند آواز سے پڑھی۔ فراغت کے بعد حضرت مولانا اپنے دولت خانہ کو روانہ ہوئے تو راستہ میں جاتے ہوئے میں نے دریافت کیا کہ آپ نے درود شریف بھی بلند آواز سے پڑھا ہے' اس کی دلیل کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ اس کی صریح دلیل تو کوئی نہیں پائی گئی لیکن جب دیگر سب چیزیں بالجہر ہیں تو یہ بھی بالجہر ہی ہونا چاہیے۔ میرا بھی یہی خیال ہے لیکن آہستہ پڑھے تب بھی جائز ہے۔

(۴) دعا بھی بلند آواز سے جائز ہے اور آہستہ بھی جائز ہے۔ نیل الاوطار جلد۔۴' ص۔۶۵

میں ہے: والظاهر ان الجهر والاسرار بالدعاء جائزان یعنی "ظاہر بات یہی ہے کہ جہر اور اسرار دعا میں دونوں جائز ہے۔"

ابوداؤد طیالسی جزء اول ص۔ ۱۴۲ میں حدیث وارد ہے جو عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں: شهدت رسول الله صلى الله عليه وسلم علىٰ جنازة رجل من الانصار فسمعته: اللهم صلى عليه واغفرله ---- میں ایک جنازہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر ہوا۔ یہ ایک انصاری شخص کا جنازہ تھا۔ میں نے سنا کہ آپ نے اس پر یہ دعا پڑھی: اللهم صلى عليه واغفرله - پھر عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: انا اتمنّٰی ان اکون مکان الانصاری لما سمعت من دعاء رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ یعنی "میں نے آرزو کی کہ کاش اس انصاری کی جگہ آج میں ہوتا تو ٹھیک تھا۔ میں نے آپ سے یہ دعا سنی تو مجھے تمنا ہوئی۔"

اس سے دعا کا اونچی آواز سے پڑھنا ثابت ہوا۔ نیل الاوطار میں ہے: جميع ذالک یدل علىٰ ان النبى صلى الله عليه وسلم جهر بالدعاء یعنی "اس روایت کے سب الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا اونچی آواز سے پڑھی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ ابوداؤد میں یہ روایت ہے۔ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم علىٰ رجل من المسلمين نسمعته يقول اللهم ان فلان بن فلان فى ذمتک وحبل جوارک۔ الخ) یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو جنازہ کی نماز پڑھائی تو میں نے آپ کو یہ دعا پڑھتے سنا: اللهم ان فلان بن فلان فى ذمتک وجوارک (آخر تک)

اسی طرح دیگر حدیث وارد ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سمعته من النبى صلى الله عليه وسلم يقول اللهم انت ربها وانت خلقتها وانت هديتها للاسلام یعنی "میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ میں یہ دعا سنی (جو مذکور ہوئی)۔

ان احادیث سے جنازہ میں دعائیں بلند آواز سے پڑھنا ثابت ہوا۔ اب اگر کوئی ان دعاؤں کو اونچی آواز سے پڑھے تو اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیے کہ یہ بھی سنت ہے جو حدیث سے ثابت ہے۔

(۵) سلام آہستہ پھیرنا چاہیے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی روایت میں یہ گذر چکا ہے: ثم يسلم

سراً یعنی "پھر آہستہ سے سلام پھیرے۔" نیل الاوطار میں ہے: فیه دلیل علی مشروعیة السلام فی صلوة الجنازة والاسرار به وهو مجمع علیه۔ (یہ حدیث دلیل ہے کہ نماز جنازہ میں سلام ہے اور اس کو پوشیدہ پھیرنا چاہیے۔ اس پر اجماع کیا گیا ہے۔ پھر امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مجمع علیہ امر کے خلاف حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے: اخرج البیهقی عن ابن مسعود قال ثلاث کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یفعلهن ترکهن الناس احدهن التسلیم علی الجنائز مثل تسلیم الصلوة وله ایضاً نحوه عن عبدالله بن ابی اوفی۔ یعنی "ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تین چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے جن کو لوگوں نے عملاً چھوڑ دیا ہوا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جنازہ میں سلام اسی طرح پھیرا جاتا ہے جس طرح نماز میں ہے۔ اسی کی مثل دوسرے صحابی حضرت عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔"

لیکن مصنف ابن ابی شیبہ میں ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے: انه کان لا یجهر بالتسلیم علی الجنازة "کہ وہ جنازہ پر سلام آہستہ کہتے تھے۔" اور سعید بن مسیب سے یہ مروی ہے کہ سنت نماز جنازہ میں یہ ہے کہ اول سورہ فاتحہ پڑھے پھر درود پڑھے پھر میت کے لیے خالص دعا کرے۔ ثم یسلم فی نفسه (پھر آہستہ سلام پھیرے)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یزید بن مکفف کا جنازہ پڑھا جس پر چار تکبیریں کہیں: وسلم تسلیمة خفیة عن یمینه (مصنف ابن ابی شیبہ کتاب الجنائز ص-۱۱۸) یعنی "دائیں طرف ایک سلام خفیہ طور پر پھیرا۔"

زیادہ ترجیح اسی کو ہے کہ سلام آہستہ کہنا چاہیے۔

(۲) سلام جنازہ میں صرف ایک بار ہے۔ گو دوسری طرف بھی جائز ہے لیکن راجح یہ ہے کہ سلام صرف ایک ہی ہے۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت اوپر درج ہو چکی ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: فاذا فرغ سلم علی یمینه واحدة یعنی "جب جنازہ سے فارغ ہونا چاہتے تو دائیں طرف ایک سلام پھیرتے۔" عن ابن عباس انه کان یسلم علی الجنازة تسلیمة۔ یعنی "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جنازہ پر ایک ہی سلام پھیرتے تھے۔" حضرت ابوہریرہ، واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہما اور دیگر تابعین سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب الجنائز مصنف ابن ابی شیبہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جنازہ میں قراۃ فاتحہ' درود' دعا' سلام جہر سے بھی جائز ہیں اور آہستہ بھی لیکن زمانہ کی ضرورت کے پیش نظر اونچی آواز سے ہونی چاہیے تاکہ عوام بھی سن کر ساتھ ساتھ پڑھتے جائیں اور اگر آہستہ پڑھے تو بھی جائز ہے۔ باہمی ضد و تعصب سے گریز کرنا چاہیے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف الحصاری غفرلہ الباری

تنظیم اہل حدیث لاہور جلد---' شمارہ---' مورخہ ۸ جولائی و ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۶۶ء

جنازہ بالجہر کے بارہ میں

۳۰ مارچ سنہ ۱۹۵۶ء کے الاعتصام میں ایک سوال کے جواب میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ دیگر سورہ اور دعا بلند آواز سے پڑھی ہے' جس سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نماز جنازہمیں قرات فاتحہ اور سورہ اور دعا جملہ پڑھنا مسنون ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ نماز جنازہ بالسر پڑھنا سنت ہے اور بالجہر بطور تعلیم پڑھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ احمد حسن محدث دہلوی مرحوم حاشیہ بلوغ المرام ص ۱۰۶ میں فرماتے ہیں: کما روی ابن الجارود فی المنتقی عن ابی امامة انه قال ان السنة فی صلوٰة علی الجنازة ان یقراء بفاتحة الکتاب سراً ویصلی علی النبی صلی اللہ علیه وسلم ثم یخلص الدعا للمیت۔ یعنی "حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ سورہ فاتحہ آہستہ پڑھے اور آنحضور ﷺ پر درود پڑھے۔ پھر میت کے لیے خالص دعا کرے۔ پھر فرماتے ہیں: وذھب الجمهور الی انه لا یستحب الجهر فی صلوٰة الجنازة لان جهر ابن عباس کان لوجه کما قال ابن عباس لا اقرا من جهرا الا لتعلموا انه سنة ویوید قول الجمهور ما عن ابی امامة ان السنة ان یقرالفاتحة الکتاب بعد التکبیرة الاولی سرا فی القلب۔ یعنی "جمہور اس طرف گئے ہیں کہ نماز جنازہ بالجہر مستحب نہیں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو نماز جنازہ جہر سے پڑھی' وہ ایک وجہ سے تھی جو انہوں نے خود بیان کر دی ہے کہ میں نے جہر سے اس لیے پڑھا ہے تاکہ تم یہ معلوم کر لو کہ سورہ فاتحہ جنازہ میں پڑھنا مشروع ہے اور جمہور کے مذہب کی تائید حدیث ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے ہوتی ہے جس میں یہ صاف تصریح ہے کہ تکبیر اولیٰ کے بعد سورہ فاتحہ آہستہ پڑھنا

مسنون ہے۔"
مولانا وحید الزمان لکھنوی مرحوم بخاری شریف کے حاشیہ پر فرماتے ہیں: "میں نے پکار کر اس لیے پڑھی ہے کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔" (پ-۵' ص-۸۹)
اسی طرح تحفۃ الاحوذی ربع دوم میں تشریح کی گئی ہے لیکن کتاب الجنائز میں وہ فرماتے ہیں کہ "نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کو آہستہ پڑھنا چاہیے۔ نسائی میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورہ فاتحہ آہستہ پڑھا جائے۔"
پھر حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ پر لکھتے ہیں: "حاکم کی روایت میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک جنازہ میں الحمد کو جہر سے پڑھا پھر کہا کہ میں نے جہر اس لیے پڑھا ہے کہ تم لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نماز جنازہ میں الحمد پڑھنا سنت ہے۔"
حضرت ابوامامہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ان دونوں احادیث سے ثابت ہوا کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ آہستہ پڑھنا چاہیے۔ مدیر الاعتصام کو اپنے فتویٰ پر نظرثانی فرمانی چاہیے کہ جو حدیث آپ نے جنازہ بالجہر کے مسنون ہونے پر پیش کی ہے۔ اسی سے علامہ مبارک پوری نے آہستہ پڑھنا سنت ثابت کیا ہے کیونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہمیشہ جہر سے نہ پڑھتے تھے۔ کسی وقت انہوں نے بالجہر سے پڑھا اور اس کی وجہ یہ بیان کر دی کہ تم کو تعلیم دینے کے لیے میں نے ایسا کیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوا کہ جنازہ میں قرات بالجہر سنت مقصودہ نہیں ہے۔ آپ نے نیل الاوطار کا حوالہ دیا ہے لیکن شاید نیل میں آپ نے اس مسئلہ کی تمام بحث کو نہیں دیکھا۔ اس میں منتقی کی حدیث ابوامامہ موجود ہے جس میں یہ الفاظ ہیں سرا فی نفسہ اور بخاری کی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ والی نقل کی ہے۔ اس میں ہے: فقرا بفاتحۃ الکتاب وقال لتعلموا انہ من السنۃ۔ اس میں جہر کا ذکر نہیں لیکن لتعلموا انہ الفاظ موجود ہیں جن سے ظاہر ہے کہ انہ کی ضمیر قراۃ فاتحہ کی طرف راجع ہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ مسنون ہے۔
علامہ شوکانی نے امام ابن ابی حاتم کی علل سے ایک روایت نقل کی ہے۔ انہ قال السنۃ علی الجنائز ان یکبر الامام ثم یقرا ام القرآن فی نفسہ یعنی "جنازہ میں سورہ فاتحہ آہستہ پڑھنا مسنون ہے۔" پھر لکھتے ہیں: وذھب الجمور الی انہ لا یستحب الجھر فی صلوۃ الجنازۃ وتمسکوا بقول ابن عباس المتقدم لم اقرا ای جھرا الا لتعلموا انہ سنۃ وبقولہ

فی حدیث ابی امامة سرا فی نفسه-

اسی طرح آپ نے امام نووی کا فیصلہ بھی شاید پورے غور سے نہیں دیکھا- وہ لکھتے ہیں:
وقد اتفق اصحابنا علی انه ان صلی علیها بالنهارا سر بالقراة وان صلی باللیل ففیه وجهان الصحیح الذی علیه الجمهور یسر والثانی یجهر واما الدعاء فیسر به بلا خلاف وحیند یتاول هذا الحدیث علی ان قوله حفظت من دعاء ای علمنیه بعد الصلوٰة محفظة یعنی "ہمارے اصحاب نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ دن کو نماز جنازہ پڑھے تو قرات آہستہ پڑھے اور اگر رات کو پڑھے تو اس میں دو مذہب ہیں- ایک یہ کہ آہستہ پڑھے' یہ جمہور کا مذہب ہے جو صحیح ہے- دوسرا یہ کہ جہر سے پڑھے اور دعا آہستہ پڑھے- اس پر سب کا اتفاق ہے- اس وقت اس حدیث کی یہ تفسیر ہو گی کہ نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مجھے وہ دعا سکھلائی تو میں نے اس کو حفظ کر لیا-"

بہرکیف یہ جہر بھی تعلیم پر محمول ہو سکتا ہے- نیل الاوطار میں ہے: وذالک یدل علی ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم جهر بالدعاء وهو خلاف ما صرح به جماعة من استحباب الاسرار بالدعاء وقد قیل ان جهره صلی اللّٰہ علیه وسلم بالدعاء لقصد تعلیمهم واخرج احمد عن جابر قال ما اباح لنا فی دعاء الجنازة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ولا ابوبکر ولا عمر وفر اباح بمعنی قد قال الحافظ والذی وقفت علیه اباح بمعنی جهر والظاهر ان الجهر والاسرار بالدعاء جائزان- یعنی "جس حدیث میں حفظت وارد ہے وہ نبی کریم ﷺ کے جہر بلدعاء پر دال ہے اور یہ اس جماعت کی تصریح کے خلاف ہے جو آہستہ دعا پڑھنے کو مستحب کہتی ہے اور اس حدیث کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ آنحضور ﷺ کا اس دعا کو جہر سے پڑھنا تعلیم کی غرض سے تھا کیونکہ امام احمد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ہمارے لیے دعا کا کوئی اندازہ نہیں ٹھہرایا اور حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ معنی یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے جنازہ کی دعا کو جہر سے نہیں پڑھا اور ظاہر یہ ہے کہ جنازہ میں دعا جہر سے پڑھنا اور آہستہ پڑھنا دونوں طرح جائز ہے اور درود کے متعلق حضرت علامہ محدث مبارک پوری فرماتے ہیں اور درود آہستہ پڑھنا چاہیے-"
(کتاب الجنائز ص ۹۱)

حاشیہ میں فرماتے ہیں "نماز جنازہ میں درود جہر سے پڑھنا کسی حدیث صحیح صریح سے ثابت نہیں۔" دعا کو مولانا نے دونوں طرح جائز لکھا ہے۔ نیز ص-۶۷ پر فرماتے ہیں "ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک جنازہ پر سورہ فاتحہ اور ایک سورہ پڑھی اور جہر سے قرات کی اور فرمایا کہ میں نے بس اس لیے جہر سے قرات کی ہے کہ تم لوگوں کو بتا دوں کہ یہ سنت ہے۔" حاشیہ میں الفاظ یہ لکھے ہیں: وقال انما جهرت لا علمكم انها سنة - اس سے ظاہر ہے کہ جہر صرف اسی دن خلاف معمول پڑھا تھا جس کا سبب اعلام تھا کہ سورہ فاتحہ نماز جنازہ میں مشروع ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جنازہ میں قرات بالجہر سنت مقصودہ نہیں ہے۔ سنت آہستہ پڑھنا ہے۔ ہاں تعلیم کے لیے پڑھے تو جائز ہے۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

الاعتصام لاہور جلد-۷' شمارہ-۴۴' مورخہ ۱۵ جون سنہ-۱۹۵۶ء

نماز جنازہ میں آمین کہنا

سوال: کیا حکم ہے شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ میں میت کے لیے جو دعا کی جاتی ہے یہ بلند آواز سے ہونی چاہیے یا خفیہ آواز سے؟ اور امام و مقتدی سب کو دعا پڑھنی ضروری ہے یا صرف امام ہی پڑھے؟ اور مقتدی لوگ آمین کہتے ہیں' کیا یہ جائز ہے؟ عام طور پر یہ تعامل ہے کہ امام آہستہ دعا پڑھتا ہے اور جن مقتدیوں کو دعا یاد ہوتی ہے وہ تو امام کے پیچھے خفیہ دعا پڑھ لیتے ہیں اور جن کو دعا یاد نہیں ہوتی وہ خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن ساہیوال میں ایک حافظ صاحب امام مسجد نماز جنازہ میں دعا بلند آواز سے پڑھتے ہیں اور تمام مقتدی آمین بالجہر کہتے جاتے ہیں' کیا یہ جائز ہے؟ جس طرح دعا قنوت امام پڑھتا ہے تو مقتدی لوگ آمین کہتے ہیں۔ اسی طرح جنازہ میں یہ معمول ہے۔ اس کا ثبوت درکار ہے کیونکہ کسی اور جگہ یہ تعامل دیکھا نہیں گیا۔ نہ اہلحدیث میں نہ حنفیہ میں۔ اس واسطے یہ سوال پیش خدمت ہے' اس کا جواب دلیل شرعی سے صادر فرمایا جائے' مہربانی ہو گی۔

(السائل حافظ مظفر خان امام مسجد اہلحدیث ساہیوال)

الجواب بعون الوهاب وهو الموفق للصواب۔ الحمد للہ رب العالمین۔ اما بعد! پس

واضح ہو کہ کتاب الجنائز مصنف ابن ابی شیبہ ص-۱۰۹ میں باسنادہ یہ حدیث درج ہے: عن عوف بن مالک الاشجعی قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول علی المیت اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ الخ۔ یعنی حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک میت پر یہ دعا سنی۔ فرماتے تھے: اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ (تمام دعا اخیر تک) دیگر دعا باسنادہ یہ ہے کہ ابراہیم انصاری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں: سمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول فی الصلوٰۃ علی المیت اللّٰھم اغفر لحینا ومیتنا وشاھدنا وغائبنا الخ یعنی ان کے باپ نے یہ بیان کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ ایک میت پر یہ دعا پڑھ رہے تھے۔ اللّٰھم اغفر لحینا ومیتنا (تا آخر)

عثمان بن شماس کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے کہ ان کے پاس سے مسروق گزرے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ میں کس طرح دعا سنی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنازہ پر یہ دعا پڑھتے ہوئے سنا ہے: اللّٰھم انت ربھا وانت خلقتھا وانت ھدیتھا الی الاسلام وقبضت روحھا وانت اعلم بسرھا وعلانیتھا جئناک شفعاء فاغفرلہ۔ ان تین احادیث سے صاف یہ ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ میں میت کے لیے دعا بالجہر کرتے تھے جس کو صحابہ کرام سنا کرتے تھے پس دعا بالجہر پڑھنی سنت ہے۔

دیگر حدیث ص-۱۱۱ میں ہے۔ امام زہری کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے سنا' وہ سعید بن مسیب کو حدیث بیان کر رہے تھے کہ من السنۃ فی الصلوٰۃ علی الجنازۃ ان یقرا بفاتحۃ الکتاب ثم یصلی علٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثم یخلص الدعاء للمیت حتّٰی یفرغ ولا تقرا الامرۃ واحدۃ ثم یسلم فی نفسہ یعنی "سنت طریقہ نماز جنازہ کا یہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ پڑھے۔ دوسری تکبیر کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے پھر تیسری کے بعد میت کے لیے خاص دعا کرے یہاں تک کہ فارغ ہو جائے تو پھر آہستہ سے سلام پھیرے۔"

تلخیص الحبیر ص-۱۶۰ میں جنازہ کا طریقہ حدیث سے ثابت کرتے ہوئے ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں: ویفعل من وراہ ذالک یعنی جو امام کے پیچھے لوگ ہیں' وہ بھی اسی طرح کریں۔

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں: والسنة ان یفعل من ورائه مثل ما فعل امامه یعنی نماز جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ جس طرح امام کرتا ہے' تکبیریں کہتا ہے' سورہ فاتحہ پڑھتا ہے' درود پڑھتا ہے اور دعا پڑھتا ہے' رفع یدین تکبیروں میں کرتا ہے' سلام پھیرتا ہے۔ اسی طرح تمام مقتدی بھی کرتے جائیں۔ (الرحمتہ المهداۃ فصل رابع)

مشکوٰۃ کے ص-۸۷ میں ہے: والسنة ان یفعل من ورائه مثل ما فعل امامه رواه الحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم۔ اس کا ترجمہ بھی یہ ہے کہ سنت یہ ہے کہ جس طرح امام کرے' اسی طرح یہ لوگ بھی کریں جو امام کے پیچھے کھڑے ہوں۔

کتاب الجنائز ابن ابی شیبہ میں ہے کہ ابو صدیق ناجی نے حضرت ابوسعید سے سوال کیا کہ نماز جنازہ کا کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کنا نقول اللّٰھم انت ربنا وربه وارزقته واحییته وکفیت فاغفرلنا وله الخ۔ یعنی ہم لوگ نماز جنازہ میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے اللّٰھم انت ربنا... آخر تک۔

ابوموسیٰ جہنی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حکم اور شعبی اور عطا تابعین عظام سے پوچھا کہ جنازہ پر دعا مقرر ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کوئی دعا مقرر نہیں ہے مگر تو میت کا سفارشی ہے۔ اس لیے بہتر لفظوں سے اس کی سفارش کر۔ مشکوٰۃ میں یہ حدیث وارد ہے: عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء۔ (رواہ ابوداود وابن ماجه) یعنی "ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم کسی میت پر نماز جنازہ پڑھو تو خالص اس کے حق میں دعا کرو۔" اس حدیث سے اور پہلی احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ مقتدی لوگ بھی دعا کریں جس طرح امام دعا کرتا ہے کہ شفاعت کرنے کا سب کو حکم ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں بروایت مسلم یہ حدیث وارد ہے:

عن عائشة رضی اللّٰہ عنها عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال ما من میت تصلی علیه امة من المسلمین یبلغون ماة کلهم یشفعون له الا شفعوا فیه۔ یعنی "نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس میت پر مسلمانوں کی ایسی جماعت جس کی تعداد سو تک ہو' نماز جنازہ پڑھ دے اور وہ سب بیک زبان اس میت کے لیے دعا شفاعت کریں تو اس میت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت قبول فرمالیتا ہے یعنی اس میت کو بخش دیا جاتا ہے۔" اگر سو سے زیادہ ہوں تو یہ نور علیٰ نور ہے۔ لیکن اگر کم ہوں تو پھر بھی چالیس کی تعداد پوری

کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس تعداد کی سفارش قبول کرنے کی بشارت بھی وارد ہو چکی ہے۔

چنانچہ مشکوۃ میں بروایت صحیح مسلم یہ حدیث وارد ہے کہ کریب مولیٰ ابن عباس نے روایت کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیٹا فوت ہو گیا۔ جب اس کی نماز جنازہ کی تیاری ہوئی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کریب سے کہا کہ کیا جنازہ کے لے لوگ جمع ہو گئے ہیں؟ انہوں نے باہر نکل کر دیکھا تو کہا کہ لوگ نماز جنازہ کے لیے جمع ہو چکے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا ان کا شمار چالیس تک ہے؟ کریب نے کہا ہاں چالیس ہیں۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب میت کو باہر نکالو کیونکہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے تھے: مامن رجل مسلم یموت فیقوم علی جنازته اربعون رجلا لا یشرکون باللّٰه شیئا الا شفعهم اللّٰه فیه (رواہ مسلم) یعنی "نہیں کوئی مسلمان کہ مرجائے اور اس پر ایسے چالیس شخص نماز پڑھیں جنہوں نے بھی شرک نہ کیا ہو مگر یہ کہ اس میت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ ان کی سفارش قبول فرمالیتا ہے۔"

ان احادیث سے عام طور پر یہ ثابت ہوا کہ جو لوگ کسی میت کا جنازہ پڑھیں تو سب ہی دعاء جنازہ پڑھیں اور سب ہی اس میت کی سفارش کریں تب ہی نماز جنازہ پڑھنے والوں کو اور میت کو فائدہ ہو گا۔ ورنہ نہ تو میت کو کوئی فائدہ ہے اور نہ جنازہ پڑھنے والوں کو۔ کیونکہ نماز جنازہ کے ارکان یہ ہیں: نیت خالص' تکبیر' سورہ فاتحہ' درود شریف پڑھنا' میت کے لیے خالص دعا کرنا' سلام پھیرنا ایک بار۔ ان میں سے کوئی رکن ترک کر دیا تو اس کی نماز جنازہ باطل ہے۔ اہل میت کو چاہیے کہ اپنے میت کی یوں ہمدردی کریں کہ چالیس اشخاص ایسے مہیا کریں کہ جن میں دو وصف پائے جاتے ہوں۔ ایک یہ کہ وہ متقی اور موحد ہوں۔ مشرک' بدعتی اور بے نماز نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ سب دعاء سفارش جانتے ہوں۔ اگر ان صفتوں میں سے کوئی صفت ان لوگوں میں موجود نہ ہوئی تو پھر کسی میت پر لاکھ اشخاص بھی نماز جنازہ پڑھ دیں تو ایک رائی برابر بھی نہ میت کو کوئی فائدہ ہے اور نہ ان کے پڑھنے والوں کو کہ سب کی نماز بیکار ہے۔

نماز جنازہ میں فاتحہ ثنا تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور تکبیر بھی اسی کے لیے ہے اور درود شریف نبی کریم کا حق ہے اور دعا سفارش میت کا حق ہے اور سلام نماز سے خروج ہے۔ یہ

حاضرین اور فرشتوں کا حق ہے۔ پس جس شخص نے ان میں سے کوئی چیز ترک کر دی' اس نے ان کے حق کی حق تلفی کی جس کو کوئی اجر نہ ملے گا۔ باقی رہا مقتدیوں کا دعا نہ پڑھنا اور امام کی دعا پر آمین کہنا' یہ بدعت ہے۔ امام اور مقتدیوں میں کسی کا بھی یہ عمل قبول نہیں' سب مردود ہیں۔

حدیث میں ہے کہ جب کوئی بدعت آتی ہے تو اس جیسی سنت اٹھالی جاتی ہے۔ چنانچہ آمین کی بدعت آگئی تو لوگوں سے دعاء سفارش اٹھالی گئی۔ بدعتی شخص کا کوئی عمل صالح قبول نہیں ہے۔ جب تک اس بدعت کو ترک نہ کرے۔ امام کی دعاء سفارش پر لوگوں کا آمین کہنا اور اس کو دعا کا قائم مقام تصور کرنا' نہ کسی حدیث نبوی سے ثابت ہے اور نہ تعامل سلف صالحین' صحابہ کرام و تابعین سے ثابت ہے۔ جیسے دیگر بدعات قیاس استحسان اور مصلحت زمانی سے نکالی گئی ہیں' ان حافظ صاحب کو چاہیے کہ لوگوں کو دعاء جنازہ سکھلائے اور آمین کی بدعت قیاسی ترک کر دے۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث جلد ۵۱' شمارہ ۲۹' ۱۸/ اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء بمطابق ۱۶/ شعبان سنہ ۱۳۹۰ھ

ایک تعاقب۔۔۔ مشرک بدعتی کا جنازہ

اخبار اہل حدیث مطبوعہ یکم و ۱۵/ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کے آخری صفحہ پر سوال و جواب کے تحت "مشرک بدعتی کے جنازہ" کا مسئلہ درج ہے۔ سوال ہوا کہ مشرک ماں باپ یا کوئی مشرک بدعتی مرجائے تو حسن سلوک کے خیال سے اس کی نماز جنازہ میں شرکت کیسی ہے؟ اس کا جواب یہ ارشاد ہوا کہ "سخت قسم کے لوگ تو شرکت نہیں کرتے' نہ جائز سمجھتے ہیں۔ مگر حلیم الطبع بھائی اس متوفی مدعی اسلام شخص کے کچھ نیک اعمال جو مطابق شرع ہوں' پیش نظر رکھ کر جنازہ کی سفارش کر دیں تو ہرج بھی نہیں ہے۔"

اس کلام سے دو قسم کے مسلمان ظاہر ہوئے۔ ایک تو شدید الطبع' دوم حلیم الطبع۔ حلیم الطبع کے لیے یہ حکم جواز صادر ہوا کہ وہ مشرک بدعتی کا جنازہ کر دیں۔ ایسا واقعہ عہد نبوی میں بھی ہوا کہ ایک کلمہ گو جس کے کچھ نیک اعمال بھی تھے اور وہ بظاہر مدعی اسلام بھی تھا جس کا نام بھی موحدانہ عبداللہ تھا' وہ فوت ہوا تو شدید الطبع اور حلیم الطبع دو شخصوں کا

اختلاف ہوا۔ شدید الطبع جنازہ سے روکتا تھا اور حلیم الطبع جنازہ پر آمادہ تھا۔ دونوں میں مکالمہ ہوا' آخر حلیم الطبع اپنے عمل پر غالب ہوا اور اس نے جنازہ پڑھ دیا بلکہ اس عبداللہ کو جو نام کا مسلمان تھا اور حقیقت میں مشرک بدعتی یا منافق تھا' حلیم الطبع نے اپنا کرتہ بھی پہنا دیا اور اس کے منہ میں اپنا تھوک بھی ڈالا تھا۔ اس تمام کارروائی کے بعد آیت وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (سورہ توبہ) نازل ہوئی جس سے شدید الطبع کی تائید پائی گئی اور پھر حلیم الطبع نے بھی کبھی نہ جنازہ پڑھا۔ شاید مجیب کے نزدیک مرزائی مدعی اسلام کے بعض اعمال اچھے ہوں تو جنازہ جائز ہو گا کیونکہ وہ اس اصول فتویٰ کے تحت آتا ہے۔

مجیب صاحب کو معلوم ہو گا کہ حلیم الطبع نے ابوطالب کو کلمہ پڑھنے کی بابت منت سماجت بہت کی۔ آخر وہ کفار کے کہنے سے نہ مانا اور وہ مشرک ہی مر گیا تو حلیم الطبع نے پھر بھی بخشش مانگی تو اللہ شدید العذاب نے سخت ممانعت فرمائی۔ یہ واقعی ہر قسم کے مشرک کے لیے مطلق استغفار کی ممانعت پر ناطق ہے۔

متعاقب مولانا عبدالقادر عارف صاحب حصاری

اہل حدیث سوہدرہ جلد ۱۵' شمارہ ۲' مورخہ ۱۵/ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء

فتاویٰ جنازہ تارک زکوٰۃ و حج وغیرہ

راقم الحروف عارف حصاری کے مضامین کو حضرات علماء معاصرین تشدد پر محمول کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے کسی محدث متشدد کی جرح راویوں پر قبول نہیں کی جاتی ہے۔ اسی طرح مضامین میں جو احکام درج ہیں' وہ ناقابل قبول ہیں۔ اس لیے بندہ اپنے مضامین میں دیگر علماء محدثین و محققین کی تحقیقات بطور تصدیقات ذکر کر دیتا ہے تاکہ علماء پر یہ ظاہر ہو کہ بندہ اپنے مسلک میں منفرد نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں حضرت نواب محمد صدیق حسن خاں صاحب محدث بھوپالی کا فتویٰ درج کر دیا ہے کہ وہ تارک الزکوٰۃ والحج کے بارہ میں کیا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔ چنانچہ ان کا فتویٰ درج ذیل ہے۔

سوال : کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین اس بارے میں کہ جو شخص باوجود صاحب استطاعت اور نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ اور حج ادا نہیں کرتا' کیا اس کا جنازہ پڑھنا جائز

ہے؟

الجواب: نواب صاحب محدث بھوپالی کا منصفانہ فتویٰ: جناب نواب صاحب اپنی تفسیر ترجمان القرآن بلطائف البیان کے ص-۴۷۷ میں تحت آیت وللّٰہ علی الناس حج البیت الایہ۔ بہ لطیف بیان تحریر فرماتے ہیں: ''یہ آیت اور سارے اخبار و آثار مذکورہ و غیرمذکورہ دلیل واضح ہیں' اس بات پر کہ حکم تارک حج اور تارک نماز اور زکوٰۃ کا ایک ہی ہے۔ جس طرح عمداً نماز چھوڑنے سے کافر ہو جاتا ہے' اس طرح عمداً حج نہ کرنے سے کافر بن جاتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اسلام کی پانچ بنائیں ہیں۔ ان پانچوں کا حکم وجوب و فرضیت کا یکساں ہے۔ یہ بات غلط مشہور ہے کہ تارک روزہ و حج و زکوٰۃ فاسق ہوتا ہے نہ کافر بلکہ حنفیہ تو تارک نماز کو بھی کافر نہیں کہتے۔ مگر امام احمد و شافعی و تمام محدثین کے نزدیک نماز فرض کے ترک کرنے سے دیدہ و دانستہ بلا عذر شرعی کے جیسے سوگیا ہو یا بھول گیا ہو یا بیماری میں بیہوش رہا بلاشبہ کافر ہو جاتا ہے' اس کو بعد طلب توبہ کے اگر نہ مانے فی الفور قتل کریں۔ نماز جنازہ نہ پڑھیں' مقابر مسلمین میں دفن نہ کریں۔ یہی حکم ہے ہر بنائے اسلام کا جو حدیث ''بنی الاسلام علی خمس'' میں مذکور ہے۔ انتہی بلفظہ مشکوٰۃ فصل رابع کی بعض روایتوں سے یہ ظاہر ہے کہ ارکان خمسہ کا باہم ایسا ربط ضبط ہے کہ اگر ایک کو کوئی عمداً ترک کردے تو باقی کے ارکان بھی قبولیت سے گر جاتے ہیں اور وہ قابل اعتبار نہیں رہ جاتے۔ اس لیے کسی کو عمداً بلا عذر شرعی ترک کرنا کفر ہے۔

تمام مسلمانوں کو ارکان خمسہ کی خوب حفاظت رکھنی چاہیے۔ کسی کو بھی غفلت اور سستی سے ترک نہ کریں ورنہ کافر ہو جائیں گے۔ یہ دلیل کہ ہر کلمہ گو مسلمان ہے' نہایت غلط ہے۔ اس کی تفصیل مسئولات میں ہے' وہاں ملاحظہ فرمائی جائے۔

عبدالقادر عارف حصاری

بے نماز کا جنازہ

سوال : کیا حکم ہے شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کا دریں مسئلہ کہ جنازہ کرنا بے نماز کا جائز ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ کبھی نماز پڑھتے ہیں اور کبھی ترک کر دیتے ہیں' ان کی نماز کچھ اعتبار ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث سے جواب دینا چاہیے۔

(عبدالغنی و خان محمد وغیرہ مسلمانان گکھانوالہ)

جواب : الحمد لله رب العالمين○ والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد واله واصحابه اجمعين○ اما بعد فاقول وبالله التوفيق وعليه التكلان۔

واضح ہو کہ بے نماز کا جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ کافر ہے اور کافر کا جنازہ پڑھنا منع ہے۔ چنانچہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ولا تصل على احد منهم مات ابدا ولا تقم على قبره انهم كفروا بالله ورسوله وماتوا وهم فاسقون○ یعنی "جو ان کافروں اور منافقوں سے مر جائے' ان میں سے کسی کا جنازہ نہ پڑھو اور نہ ہی اس کی قبر پر (زیارت اور دعاء کے لیے) کھڑے ہو کیونکہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے تھے اور اسی بے دینی کی حالت میں مر گئے۔"

اس آیت سے ثابت ہوا کہ کافر پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ بے نماز چونکہ کافر ہے' اس لیے اس کا جنازہ جائز نہیں ہے۔ بے نماز کا کفران مندرجہ ذیل احادیث سے ثابت ہے۔ عن انس بن مالک قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من فارق الدنيا على الاخلاص لله وحده وعبادته لا شريك له واقام الصلوة واتى الزكوة مات والله راض عنه قال انس وهو دين الله الذى جاءت به الرسل وبلغوه عن ربهم قبل حرج الاحاديث واختلاف الاهواء وتصديق ذالک فى كتب الله فى اخر ما نزل يقول الله فان تابوا واقاموا الصلوة قال خلع الاوثان وعبادتها واقاموا الصلوة واتوا الزكوة وقال فى رواية اخرى فان تابوا واقاموا الصلوة واتوا الزكوة فاخوانكم فى الدين (ابن ماجه) یعنی "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے دنیا کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا رہا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ

ٹھہرایا اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ ادا کی تو مرے گا اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوا۔ کہا انس رضی اللہ عنہ نے اور یہی دین ہے' اللہ تعالیٰ کا جس کو انبیاء مرسلین لے کر آئے تھے اور لوگوں کو انہوں نے وہ دین پہنچایا قبل اس کے لوگوں کی باتیں (قیل و قال) اس میں مل جائیں اور مختلف خواہشیں پھیل جائیں اور اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سب کے آخر میں اتری ہے۔ اور فرمایا کہ اگر توبہ کریں اور نماز پڑھیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ توبہ کریں یعنی تھانوں (اور مزار' خانقاہوں قبور وغیرہ) سے یعنی ان کے پوجنے سے اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی فان تابوا الایۃ یعنی اگر توبہ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تمہارے دین میں بھائی ہیں۔"

اس حدیث سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ آنحضرت ﷺ اور تمام انبیاء کا یہ متفقہ دین چلا آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک جان کر اس کی خالص عبادت نماز اور زکوٰۃ کا پورا کرنا اور اسی پر فوت ہو جانا۔ دوسری یہ کہ قرآن مجید سے اور اس حدیث سے باتفاق یہ امر ثابت ہوا کہ جو شخص شرک سے توبہ کر کے نماز اور زکوٰۃ ادا کرے وہ ہمارا دینی بھائی ہے۔ جس کے حقوق' بیمار پرسی' نماز جنازہ وغیرہ ہمارے ذمے واجب ہوتے ہیں۔ اگر یہ کام نہ کرے تو ہمارا دینی بھائی نہیں ہے۔ اس کے حقوق' جنازہ اور عیادت وغیرہ ساقط ہیں۔

دوسری حدیث : عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیس بین العبد والشرک الا ترک الصلوٰۃ فاذا ترکھا فقد اشرک (رواہ ابن ماجہ باسناد صحیح) یعنی "حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے فرق درمیان بندہ اور شرک کے مگر ترک کرنا نماز کا۔ پھر جب اس نے ترک کیا نماز کو پس وہ مشرک ہوا۔"

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بے نماز مشرک ہے اور مشرک کا جنازہ کرنا حرام ہے۔

تیسری حدیث : عن بریدۃ قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول العھد الذی بیننا وبینھم الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ (احمد' ابوداؤد) یعنی "کہا بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہ میں نے آنحضور ﷺ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ وہ عہد جو ہمارے اور کافروں کے درمیان ہے وہ یہ ہے کہ نماز پڑھیں جو نماز چھوڑ دے گا وہ کافر ہو جائے گا۔"

چوتھی حدیث : عن بریدۃ بن الحصیب قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بکروا بالصلوٰۃ فی یوم الغیم فانہ من ترک الصلوٰۃ فقد کفر۔ (ابن حبان) یعنی "حضرت

بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ابر کے دن نماز اول وقت پڑھا کرو کیونکہ جس نے نماز کو ترک کر دیا وہ کافر ہوا۔"

ان احادیث سے بے نماز کا کفر ثابت ہو گیا۔ اس کفر پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ چنانچہ ترمذی وغیرہ میں ہے: کان اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلٰوۃ۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سوائے نماز کے کسی چیز کے عملوں میں سے ترک کرنے کو کفر نہ دیکھتے تھے۔" اس عبارت میں لفظ اصحاب جمع مضاف ہے، جس سے معلوم ہوا کہ تمام صحابہ بے نماز کے کفر پر متفق ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: من ترک الصلٰوۃ فقد کفر۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں: من لم یصل فھو کافر۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: من لم یصل فھو کافر یعنی "جو شخص نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔" شیخ ابن القیم کتاب الصلوٰۃ میں فرماتے ہیں: قال ابو محمد بن حزم وقد جآء عن عمر وعبدالرحمٰن ابن عوف ومعاذ بن جبل وابی ھریرۃ وغیرھم من الصحابۃ رضی اللّٰہ عنھم ان من ترک صلٰوۃ فرضا واحدۃ متعمداً حتّٰی یخرج وقتھا فھو کافر مرتد قالوا ولا نعلم لھٰؤلاءِ مخالفا من الصحابۃ۔ یعنی "امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ حضرت عمر و عبدالرحمٰن و معاذ اور ابو ہریرہ وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ جس نے ایک نماز فرض کو چھوڑ دیا جان کر یہاں تک کہ اس کا وقت چلا گیا تو وہ کافر مرتد ہو گیا۔ اور علماء کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے کوئی بھی اس بات کا مخالف نہیں ہے۔"

اور علماء کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے کوئی بھی اس بات کا مخالف نہیں ہے۔ حافظ عبدالحق اشبیلی اپنی کتاب الصلوٰۃ میں فرماتے ہیں: ذھب جملۃ من الصحابۃ ومن بعدھم الی تکفیر تارک الصلٰوۃ متعمداً لترکھا حتّٰی یخرج جمیع وقتھا۔ یعنی "سب صحابہ اور بعد کے لوگ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ جان کر نماز چھوڑنے والا کافر ہے۔" اور امام ابن القیم نے حضرت ایوب تابعی سے نقل کیا ہے: قال ترک الصلٰوۃ کفر لا یختلف فیہ یعنی "نماز چھوڑنا کفر ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

ائمہ عظام میں سے امام احمد اور اسحاق بن راہویہ اور عبداللہ بن مبارک وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی مذہب ہے۔ میزان شعرانی میں جمہور اصحاب احمد کا یہ مذہب لکھا ہے: انہ یقتل بکفرہ کالمرتد وتجری علیہ احکام المرتدین فلا یصلّٰی علیہ ولا یورث ویکون مالہ

فیا۔ یعنی "بے نماز کو کفر کی وجہ سے مثل مرتد کے قتل کیا جائے اور اس پر مرتدوں کے احکام جاری کیے جائیں۔ نہ جنازہ پڑھا جائے اور نہ ہی وارث کیا جائے بلکہ اس کا مال لوٹ لیا جائے۔"

محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے غنیۃ الطالبین میں بھی یہی فرمایا ہے کہ جنازہ نہ پڑھا جائے اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اس تصریح مختصر سے صاف عیاں ہو گیا کہ بے نماز عمداً نماز ترک کر دینے والا کافر مرتد ہے' اس کا جنازہ ممنوع ہے۔

بعض اہل علم جو یہ کہتے ہیں کہ کفر کا لفظ جو حدیث میں وارد ہے' یہ حقیقی معنی میں نہیں ہے بلکہ کفر مجازی ہے یعنی اس کا عمل کافروں والا ہے۔ سو یہ تاویل کئی وجہ سے غلط ہے۔ اول یہ کہ یہ اصولی قاعدہ ہے کہ جب حقیقی اور اصلی معنی متحقق ہو سکے تو مجاز لینا ناجائز ہے۔ یہاں حقیقی معنی کوئی متعذر نہیں ہے۔ دوم یہ کہ بے نماز کا کفر ایسا ہے جو ملت اسلامی سے خارج کر دیتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے جو باسناد لاباس بہ ابن ابی حاتم اور طبرانی میں مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تترکوا الصلوۃ عمدًا فمن ترکھا عمداً متعمداً فقد خرج عن الملۃ یعنی "نماز کو مت چھوڑو کیونکہ جس شخص نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دیا وہ ملت اسلامی سے خارج ہوا۔" سوم یہ کہ بے نماز کا کفر ایسا ہے کہ اس سے عمل برباد ہو جاتے ہیں۔ اسی واسطے حدیث بخاری میں وارد ہوا ہے کہ فرمایا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ من ترک صلوۃ العصر فقد حبط عملہ یعنی "جس شخص نے نماز عصر چھوڑ دی اس کے عمل برباد ہو گئے۔" چہارم وجہ یہ کہ بے نماز دوزخ کے کنوئیں میں جائے گا جہاں بڑے بڑے کفار ہوں گے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے: فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا○ الا من تاب وآمن وعمل صالحا فأولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون شیئا○ یعنی "ان کے بعد ایسے نالائق آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشوں کی پیروی کی سو وہ ملیں گے غی کو۔ مگر جو توبہ کر کے ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے وہ جنت میں داخل ہوں گے۔"

غی اس مقام کا نام ہے جہاں اہل دوزخ کی پیپ گرتی ہے سو وہ جہنم کے نیچے ہے۔ اس میں بے نماز ہو گا۔ اگر فاسق اہل کبائر سے ہوتا تو دوزخ کے طبقہ علیا میں ہوتا لیکن وہ بڑے بڑے کفار کے ہمراہ ہو گا۔ چنانچہ حدیث مشکوۃ میں ہے وکان یوم القیمۃ مع قارون

وفرعون وھامان وابی بن خلف یعنی "فرمایا آنحضور ﷺ نے کہ بے نماز قارون وفرعون وہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہو گا۔"

پنجم وجہ یہ کہ نماز کو اللہ عزوجل نے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا وما کان اللّٰہ لیضیع ایمانکم یعنی "اللہ تمہاری نماز ضائع نہ کرے گا۔" اس آیت میں نماز کو عین ایمان قرار دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ضائع ہونے سے تمام ایمان ضائع ہے۔ جیسے سورہ فاتحہ کو نماز قرار دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ضائع ہونے سے تمام ایمان ضائع ہے۔ جیسے سورہ فاتحہ کو نماز قرار دیا گیا ہے کیونکہ فاتحہ کے ترک سے تمام نماز ضائع ہے۔ ویسے ہی ترک نماز سے تمام ایمان ضائع ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی وجوہ ہیں جن کی وجہ سے ان احادیث میں کفر حقیقی مراد ہے' مجازی نہیں ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام کا اجماع بھی اسی کفر کو مقتضی ہے۔ الغرض بے نماز کافر ہے' اس کا جنازہ نہ پڑھنا چاہیے کیونکہ قرآن مجید سے کافر کے جنازہ کی ممانعت آچکی ہے اور یہ ممانعت ہر کافر کے حق میں علی الاطلاق ہے خواہ عملی ہو یا اعتقادی۔ اس لیے جنازہ بے نماز کا ممنوع ہے۔

اگر علیٰ سبیل التنزل بے نماز کو کافر تسلیم نہ کیا جائے تو بھی مخالفین کے نزدیک حد درجہ کا فاسق اور اشد گنہگار ہے۔ جس کا جنازہ مقتدر عالم متقی پرہیزگار کو نہ پڑھنا چاہیے کیونکہ آنحضور ﷺ نے قاتل نفس کا جنازہ بھی نہیں پڑھا تھا۔ (رواہ مسلم) اور نہ ہی غنیمت کے خائن کا۔ (رواہ ابوداؤد واحمد) اور مدیون پر انکار فرما دیا تھا۔ بہرکیف علماء و صلحاء بلکہ جملہ اہل علم باہم متفق ہو کر بے نماز کے جنازہ سے انکار کر دیں تو ان کو زجر اور تنبیہہ ہو جائے اور بے نمازوں کی کثرت مٹ جائے اور شرعی حکم بھی جاری ہو جائے۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک انصاری شخص کی جائیداد کے صرف چھ غلام تھے۔ اس نے مرتے وقت سب کے سب آزاد کر دیئے تو آنحضور ﷺ نے فرمایا اگر میں اس کی موت کے وقت حاضر ہوتا تو وہ مسلمانوں کی قبروں میں دفن نہیں کیا جاتا کیونکہ اس نے شریعت کے خلاف تہائی حصہ کو چھوڑ کر تمام مال وارثوں کا ضائع کر دیا۔ اسی طرح اہل بدعت کے جنازہ اور عیادت سے سلف نے ممانعت کی ہے۔ چنانچہ غنیہ وغیرہ میں یہ امر مصرح ہے۔ پس اگر سب علماء ترک جنازہ کریں تو بے نمازوں کو تادیب حاصل ہو۔ اسی واسطے علماء احناف اہل انصاف نے زجراً نماز جنازہ ترک کرنے کا فتویٰ دیا ہے۔ لیکن نہایت افسوس ہے بعض علماء ابناء

الزمان پر جو اس زمانہ فساد امت میں طمع دنیا کے لیے ایسے مسائل پر فساد عظیم برپا کیا ہوا ہے۔ ایک روپیہ اور چند روزہ میٹھی روٹی کے معاوضہ میں جنازہ جائز بلکہ ضروری کر دیا ہے' جس سے بے نمازوں کو بہت دلیری ہو گئی ہے اور وہ نماز پر آمادہ نہیں ہیں۔ بلکہ بعض تو کہتے ہیں کہ ذرہ نواز ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بخش دے۔ نمازوں میں کیا رکھا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بے نماز تو بہت اولیاء صاحب کرامت ہیں۔ اگر ترک نماز گناہ ہے تو وہ اولیاء کیوں ہوتے۔ میاں کلمہ پڑھنا ہی کافی ہے وغیرہ ذالک من الخرافات۔ یہ سب جرات ان بعض علماء کی طرف سے ہوئی جب کہ کلمہ کے فضائل کی بے محل احادیث سنا کر ان کو مسلمان ثابت کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نماز کی پابندی نہ کرنے والے کی نماز: دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ نماز وہ معتبر ہے جو ہمیشہ پڑھی جائے۔ اور نمازی بھی وہی مقبول ہے جو ہمیشہ پڑھے۔ قرآن مجید میں ہے: والذین هم علی صلوتهم دائمون○ جو لوگ نماز پڑھتے رہتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں وہ چھوڑنے کے وقت کافر ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر مرنے سے پہلے جبکہ علامات موت کی نمودار نہ ہوں' کوئی شخص خالص توبہ کر جائے اور نماز اسی حالت میں حسب طاقت پڑھنی شروع کر دے اور پھر مر جائے تو پھر اس کا خاتمہ درست ہوا۔ جنازہ پڑھنا اس کا جائز ہے۔ کیونکہ توبہ ایسے شخص کی ایسے وقت میں مقبول ہے۔ حدیث میں ہے کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب له هذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب۔ وأخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

کتبہ العاجز ابوالشکور عبدالقادر الحصاروی رضی اللہ عنہ وارضاہ ۔بقلمہ۔

فتاویٰ ستاریہ جلد اول' ص-۱۲۱ تا ۱۲۵

حج اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے صاحب حیثیت کا نماز جنازہ جائز ہے کہ نہیں؟

سوال: (۱) ایک شخص فوت ہو گیا اس کی دینی حالت یہ تھی کہ نہ اس نے کبھی زکوٰۃ ادا کی' اور نہ بیت اللہ کا حج کیا حالانکہ دونوں کی استطاعت رکھتا تھا مگر عمداً تارک تھا صرف

نماز عوام کی طرح پڑھتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد' مال اور تمام ورثہ لڑکوں کو تقسیم کر دیا اور انتقال سرکاری دستور سے کرا دیا تاکہ اس کی لڑکیاں مرنے کے بعد اس کا ورثہ نہ لے سکیں۔ اور لڑکیوں کو بالکل محروم کر دیا۔ اب وہ مرگیا ہے' اس کا جنازہ کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ یہاں اختلاف ہو گیا' بعض نے کہا یہ کلمہ گو مدعی اسلام ہے۔ اس کا جنازہ کرنا فرض ہے اور بعض نے کہا کہ یہ نام کا مسلمان تھا' اس نے ارکان اسلام پورے نہیں کیے اور ورثہ کفار کی رسم کے مطابق تقسیم کیا ہے۔ اس لیے یہ شخص مسلمان نہیں تھا' منافق اور کافر تھا۔ اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور نہ اس کے حق میں بخشش کی دعا کی جائے کیونکہ کافر اور منافق کی نماز جنازہ پڑھنا منع ہے۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ بروئے کتاب و سنت اس نزاع کا فیصلہ اور صحیح فتویٰ صادر فرمایا جائے۔ بینوا بالدلائل توجروا عنداللّٰہ الجلیل۔

(السائل۔ مولوی عبدالعزیز تعویذ ساز عامل ملنے والہ موڑ ضلع ساہیوال)

الجواب بعون الوہاب وھو الموفق للصواب۔ الحمد للّٰہ رب العالمین اما بعد فاقول وباللّٰہ التوفیق۔ واضح ہو کہ بشرط صدق سوال' جواب اس کا یہ ہے کہ اس شخص کی میت پر نماز جنازہ بالکل نہ پڑھی جائے کہ ممنوع ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کا جنازہ نہ کیا جائے کیونکہ یہ مسلمان نہ تھا' وہ حق پر ہیں اور ان کا مذہب صحیح ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح توحید اور کلمہ شہادت پڑھنا اور اس پر عقیدہ رکھنا اسلام کا رکن ہے اور پانچ وقت نماز پڑھنا اسلام کا رکن ہے' اسی طرح مال کی زکوٰۃ دینا اسلام کا رکن ہے اور بیت اللہ کا حج کرنا اسلام کا رکن ہے۔ رکن اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی شے قائم ہو۔ اگر اس کو گرا دیا جائے تو وہ شے قائم نہ رہے اور گر جائے۔ علمائے اصول نے یہ لکھا ہے رکن الشئی مایقوم بہ ذالک الشیئی۔ جب اس شخص نے زکوٰۃ اور حج دو رکن اسلام کے گرا دیئے تو اس کا اسلام قائم نہ رہا اور وہ غیر مسلم ہو گیا۔ بعینہٖ فرقہ مرجیہ اور ان لوگوں کے جو ملائکہ اور انبیاء اور اولیاء' علماء' صلحاء کے ایمان اور فساق فجار کلمہ گو تارکان نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ کے ایمان کو یکساں مساوی جانتے ہیں۔ باقی رہا تمام ائمہ دین اور علماء اسلام محدثین و فقہاء کا جو اہل حق اور فرقہ ناجیہ شمار کیے جاتے ہیں اور حقیقی معنوں میں اہل سنت والجماعت ہیں' ان کا مسلک یہ ہے کہ ارکان اسلام ایمان کا جزء ہیں' ان میں سے کسی رکن کو عمداً

ترک کر دیا تو اس کا ایمان نہ رہے گا۔ مثلاً نماز عمداً ترک کر دی تو اس کا ایمان نہ رہا کیونکہ نماز عین ایمان ہے۔ جیسا کہ آیت وما کان اللّٰہ لیضیع ایمانکم سے صاف ظاہر ہے اور حدیث میں آیا ہے لا دین لمن لا صلٰوۃ لہ اور دوسری حدیث ہے لا سھم فی الاسلام لمن لا صلٰوۃ لہ۔ (ترغیب) یعنی بے نماز بے دین ہے' اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور دیگر حدیث میں ہے لا تترکو الصلٰوۃ عمداً فمن ترکھا عمدا فقد خرج عن الملۃ۔ (ترغیب) یعنی نماز کو نہ چھوڑو' جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کر دی وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہوا۔ جب وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہوا اور اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہ رہا تو اس کو مسلمان کہنا درست نہیں ہے۔ خواہ وہ بظاہر مدعی اسلام ہو کیونکہ اس کا دعویٰ باطل ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہاں اس کو کافر و مشرک کہنا روا ہے کہ احادیث میں اس کو کافر و مشرک ہی کہا گیا ہے' مسلمان نہیں کہا گیا۔

حضرت علی و جابر رضی اللہ عنہما نے صاف صریح طور پر یہ کہا ہے: من لم یصل فھو کافر کہ "جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔" اسی طرح روزہ بھی رکن اسلام ہے۔ اگر اس کو ترک کر دیا تب بھی وہ کافر ہے۔ چنانچہ ترغیب میں ابو یعلی کی روایت باسناد حسن منقول ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ثلاثۃ علیھن اسس الاسلام ومن ترک واحدۃ منھن فھو بھا کافر حلال الدم۔ یعنی "اسلام کے تین ستون ہیں جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اگر ان میں سے ایک عمداً ترک کر دیا تو وہ کافر ہوا۔ اس کا قتل کرنا حلال ہے۔" -------- اسی طرح زکوٰۃ رکن اسلام ہے۔ اگر مال کی زکوٰۃ نہ دی تو وہ مسلمان نہ رہا چنانچہ ترغیب میں حدیث ہے: من اقام الصلٰوۃ ولم یود الزکٰوۃ فلیس مسلم۔ (ترغیب) کہ "جس شخص نے نماز پڑھی اور زکوٰۃ نہ دی تو وہ مسلمان نہیں ہے۔" سوال میں جو یہ لکھا ہے کہ وہ نماز پڑھتا تھا' اس کی نماز کا کچھ اعتبار نہیں ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: لا صلٰوۃ لمن لم یزک یعنی "جس شخص نے زکوٰۃ نہ دی تو اس کی نماز نہیں ہے۔" قرآن میں ہے: وویل للمشرکین الذین لا یوتون الزکٰوۃ یعنی "ان مشرکوں کے لیے ویل ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔"

نیز ترغیب میں یہ حدیث میں ہے: عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ظھرت لھم الصلٰوۃ فقبلوھا وخفیت لھم الزکٰوۃ فاکلوھا اولٰئک ھم

المنافقون۔ یعنی "فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ نماز تو ظاہر تھی' اس کو قبول کر لیا اور زکوۃ پوشیدہ تھی' اس کو ہضم کر گئے۔ یہ لوگ منافق ہیں۔" نیز ایسے لوگ ملعون ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود بنٹی نے فرمایا: مانع الصدقة ملعون علی لسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم یوم القیامة۔ یعنی "زکوۃ نہ دینے والا نبی کریم ﷺ کی زبان پر ملعون ہے دن قیامت کے۔" پس ایسے منافق ملعون کا جنازہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح حج کا حکم ہے کہ یہ بھی رکن اسلام ہے۔ قرآن میں ہے: وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین۔ یعنی "اللہ کے لیے بیت اللہ کی حج کرنا لوگوں پر فرض ہے جبکہ وہ رستہ پر چل کر وہاں جانے کی طاقت رکھیں جو شخص حج نہ کرے کافر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ جہان والوں سے غنی ہے۔"

فتح البیان ص ۱۵ و فتح القدیر شوکانی ص ۳۳۲ میں ہے: وقیل ان من ترک الحج وھو قادر علیہ فھو کافر۔ یعنی "یہ کہا گیا ہے کہ جو شخص حج کرنے پر قادر تھا اور اس نے حج نہ کیا تو وہ کافر ہوا۔" نیز یہ لکھا ہے: انہ عبر بلفظ الکفر عن ترک الحج تاکیداً لوجوبہ وتشدیدا علی تارکہ یعنی "ترک حج کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں وجوب کی تاکید ہے اور تارک پر تشدید فرمائی گئی ہے۔

حضرت نواب صاحب محدث بھوپالی اپنی تفسیر ترجمان القرآن ص ۴۷۶ میں تشریح فرماتے ہیں کہ "جس طرح نماز روزہ فرض ہے' اسی طرح حج بھی فرض ہے۔ سو جس طرح ترک نماز عمداً کفر ہے' اسی طرح ترک حج باوجود استطاعت کے کفر ہے۔ جب کفر ہوا تو موت اس کی آپ ہی مثل کفار کے ہو گی۔ یہود و نصاریٰ کافر ہیں' حج نہیں کرتے۔ اس نے بھی حج نہیں کیا۔ یہ مثل ان کے ٹھہرا۔

میں کہتا ہوں کہ فتح الباری پارہ ۲۹' ص ۶۵۷ میں ہے کہ آپ نے حج کی فرضیت بیان کی تو ایک شخص نے کہا یارسول اللہ! کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا تم پر فرض ہو جاتا۔ ولو ترکتموہ لکفرتم یعنی اگر تم اس کو چھوڑ دیتے تو کافر ہو جاتے۔ نیز ترمذی' بیہقی' ابن جریر' ابن ابی حاتم وغیرہ محدثین نے یہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص راستے کے خرچ کا اور سواری وغیرہ کا مالک ہو جو اس کو بیت اللہ تک پہنچائے اور پھر باوجود طاقت و وسعت کے حج نہ کرے تو وہ یہودی یا

عیسائی ہو کر مرے گا یعنی اس کی موت اسلام پر نہ ہو گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وللّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ومن کفر فان اللّٰہ غنی عن العالمین۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ حدیث جو کئی طریقوں سے مروی ہے' اس آیت کی تفسیر ہے۔ سعید بن منصور اور ابن ابی شیبہ نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جو شخص حج کی طاقت رکھتا ہے اور وہ حج نہ کرے تو وہ جس طرح چاہے مرے یہودی یا نصرانی یعنی اسلام پر نہ مرے گا۔ (ابن کثیر)

تفسیر درمنثور اور فتح البیان میں ہے: اخرج سعید بن منصور عن عمر بن الخطاب قال لو ترک الناس الحج نقاتلنھم علیہ کما نقاتلھم علی الصلٰوۃ والزکٰوۃ۔ یعنی "حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر لوگ حج کرنا چھوڑ دیں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا۔ جیسے ہم نماز اور زکوۃ کے تارکوں سے جنگ کرتے ہیں۔" اس سے ثابت ہوا کہ ارکان اسلام کے تارکوں سے مثل کفار کے جنگ کرنا جائز ہے کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اگر جنگ نہ کیا جائے تو ان پر جزیہ لگا دیا جائے۔

چنانچہ دوسری روایت اس پر صاف دال ہے: اخرج سعید بن منصور بسند صحیح عن عمر بن الخطاب قال هممت ان ابعث رجالا الی ھذہ الامصار فلینظروا کل من کان لہ جدۃ ولم یحجج فیضربوا علیھم الجزیۃ ماھم بمسلمین ماھم بمسلمین۔ (درمنشور' فتح البیان) یعنی "حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں کچھ لوگوں کو تفتیش کرنے کے لیے بھیجوں۔ وہ شہروں میں جا کر دیکھیں کہ جس کے پاس مال ہے اور اس نے حج نہیں کیا تو اس پر جزیہ لگا دیں کیونکہ یہ مسلمان نہیں ہیں۔" جب یہ لوگ مسلمان نہیں (تو) یہودی اور کافر واجب القتل ہیں تو ان کا جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: عن ابن عمر قال من وجد الی الحج سبیلا سنۃ ثم سنۃ ثم مات ولم یحج لم یصل علیہ لا یدری مات یھودیا او نصرانیا۔ (اخرجہ سعید بن منصور۔ فتح البیان درمنثور) یعنی "جس شخص کے پاس حج کرنے کی وسعت ہو کہ بیت اللہ پہنچ سکے پھر وہ ایک سال بھی نہ گیا' دوسرے سال بھی نہ گیا' تیسرے سال بھی نہ گیا حتیٰ کہ بغیر حج کے مر گیا تو اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے کہ معلوم نہیں وہ یہودی مرا ہے یا نصرانی۔

واخرج ابن ابی شیبۃ عن سعید بن جبیر قال لو کان لی جار موسراً ثم مات ولم

یحج لم اصل علیہ۔ یعنی "حضرت سعید بن جبیر رئیس التابعین نے فرمایا کہ اگر میرا کوئی پڑوسی ہو اور وہ مال دار ہو کر پھر حج کئے بغیر مر جائے تو میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا" (در منثور) اس سے ثابت ہوا کہ ترک حج عمداً کفر ہے اور آیت ومن کفر سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ خازن جو قرآن کی مشہور تفسیر ہے' اس میں اس آیت کی بابت لکھا ہے: نزلت فی من وجد ما یحج ثم مات ولم یحج فهو کفر بہ۔ یعنی "یہ آیت اس شخص کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو مال دار ہو کر حج نہ کرے' وہ کافر ہے۔" اور تفسیر فتح القدیر للشوکانی میں اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے: عن ابن عمر من مات وهو موسر ولم یحج جاء یوم القیامة وبین عینیه مکتوب کافر۔ یعنی "ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص مر گیا اور وہ ملدار تھا اور اس نے حج نہ کیا وہ دن قیامت کے جب عدالت الٰہی میں آئے گا تو اس کی پیشانی پر آنکھوں کے درمیان "کافر" لکھا ہو گا۔" پس ایسے شخص کا جنازہ پڑھنا درست نہیں ہے۔"

پھر اس نے لڑکوں کو اپنی جائیداد موروثی تقسیم کر دی اور لڑکیوں کو تقسیم میں حصہ نہ دیا بلکہ محروم کر دیا اور یہ تقسیم اس غرض سے کی کہ میرے مرنے کے بعد حسب قانون سرکار حصہ نہ پائیں' یہ صریح ظلم اور رسم کفار ہے۔ جس میں بہت نام نہاد مسلمان مبتلا ہیں اور وہ لڑکیوں کو ورثہ دینا تسلیم نہیں کرتے اور اس کو برا سمجھتے ہیں۔ اس پر علمائے اسلام نے ایک فتویٰ علمائے اسلام کا عہد ہند میں شائع کیا تھا جس کا نام ظلم پنجاب تھا۔ اس میں ان لوگوں کی تکفیر کی گئی تھی۔ جو میت کی متعلقہ اور رشتہ دار عورتوں کو ورثہ نہیں دیتے بلکہ اب تو یہاں تک بددیانتی ہو رہی ہے کہ لڑکیاں زندہ موجود ہیں اور ورثہ کی جائیداد انتقال کرانے کے وقت صاف کہہ دیتے ہیں کہ اس میت کے صرف لڑکے ہیں' لڑکیاں موجود نہیں ہیں۔ یہ صریح جھوٹ اور فریب کاری اور شرعی قانون کی تکذیب ہے تو پھر ان کے کافر ہونے میں کیا شک ہے۔ لیکن ملا' مولوی دیہات اور شہروں میں لگاتار ایسے کافروں کے جنازے پڑھ رہے ہیں۔ یہ علماء یا تو اصل میں طمع عبدالدنیا والدرہم ہیں جو اسقاط کے ذریعہ اکل المال بالباطل کے مرتکب ہیں یا مداہن ہیں جو اپنے مقتدیوں کو خوش کرنے کے لیے جنازے ایسے کافروں کے پڑھتے ہیں یا پھر چودھریوں' رئیسوں سے مرعوب ہیں کہ اگر جنازہ نہ پڑھا تو ہماری امامت چلی جائے گی اور ہم بے روزگار ہو کر مفلس ہو جائیں گے۔ یہ سب مردود اور شرار

العلماء کے ہیں جنہوں نے لوگوں کے حالات کو خراب کر رکھا ہے۔ اب اگر کوئی عالم باللہ ایسے بے دینوں کے جنازے نہیں پڑھتا تو اس کی سخت ممانعت کی جاتی ہے اور اس کو امامت سے معزول کیا جاتا ہے۔ تمام املاک مساجد عوام الناس کے محکوم ہیں' آزادی سے عمل نہیں کر سکتے' الا ماشاء اللہ۔ بروئے قرآن جو شخص عورتوں کو وراثت سے محروم کر کے جاہلیت کے دستور پر عمل کرتا ہے وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ قرآن کی وہ آخری آیت جو پارہ چہارم کے رکوع یوصیکم اللّٰہ میں وارد ہے' صاف اس پر ناطق ہے۔

اور حدیث میں آیا ہے: من قطع میراث وارثه قطع اللّٰہ میراثه من الجنة یوم القیامة (اخرجه ابن ماجه) یعنی "جس شخص نے اپنے وارث کی وراثت ظلم سے قطع کر دی تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی وراثت قطع کر دے گا یعنی وہ ہمیشہ جہنم -------- میں رہے گا۔ جب وہ جنت میں ورثہ نہیں پا سکتا تو پھر جنازہ پڑھ کر دعا سے اس کو ورثہ دلانا فضول اور لغو ہے۔

الجواب: دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میت کی آنکھوں میں سرمہ ڈالنے کا ثبوت مجھے کسی دلیل شرعی سے نہیں ملتا۔ میں اس کے جائز ہونے کا حکم نہیں دے سکتا۔ اور لا ادری پر اکتفا کرتا ہوں۔ ھذا ماعندی' واللّٰہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف الحصاری

اعتصام جلد ۱۹' شمارہ ۱۷' مورخہ ۲۴ نومبر سنہ ۱۹۶۷

بے نماز کے جنازے کا فیصلہ

بروئے احادیث صحیحہ و اجماع صحابہ کرام بے نماز کافر و مشرک خارج از ملت اسلامیہ ہے۔ لیکن علماء حنفیہ اور بعض علماء اہلحدیث بے نماز کو فاسق اور گنہگار مومن قرار دیتے ہیں۔ اس لیے جنازہ میں بھی یہ اختلاف ہے کہ جو علماء اہلحدیث بے نماز کو کافر د مشرک قرار دیتے ہیں وہ بے نماز کا جنازہ نہیں پڑھتے اور جو علماء اہلحدیث اور علماء حنفیہ بے نماز کو مسلمان گنہگار کہتے ہیں' وہ اس کی نماز جنازہ پڑھنا اور بخشش کی دعاء اور شفاعت کرنا جائز جانتے ہیں۔

مولانا ظفر احمد عثمانی حنفی کا فتویٰ رسالہ الہادی بابت ماہ محرم سنہ ۱۳۵۴ھ ص ۳۴ میں یوں درج ہے جو کتب فقہ کی عبارات لکھ کر فرماتے ہیں: "ان عبارات سے معلوم ہوا کہ تارک

صلوٰۃ عمداً بشرطیکہ وہ نماز سے استہزاء نہ کرتا ہو حنفیہ کے نزدیک کافر نہیں بلکہ فاسق ہے۔"
رسالہ الهادی بابت جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۳ھ میں یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ اگر کوئی کسی کو یہ کہے کہ نماز پڑھ' وہ کہے کہ لا اصلی میں نماز نہیں پڑھتا تب بھی وہ کافر نہیں ہے کیونکہ یہ کلمہ بھی محتمل ہے۔
مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اپنی آخری کتاب "بوادر النوادر" کے حصہ اول ص ۱۵۵ میں کسی شخص کے وصیت نامہ کی تردید فرماتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔ "اسی طرح اس میں لکھا ہے کہ تارک صلوٰۃ کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں' یہ حکم صاف حدیث کے خلاف ہے۔ صلوا علی کل بر وفاجر یہ بھی قرینہ ہے' اس وصیت نامہ کے غلط ہونے کا۔"
رئیس الحنفیہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی مرحوم اپنے مجموعہ فتاویٰ کی جلد ۱' ص ۳۴۴ میں سوال و جواب درج فرماتے ہیں: (سوال) جس شخص نے عمر بھر نماز نہ پڑھی ہو' مرنے کے بعد اس کے جنازے کی نماز پڑھنے کی نسبت کیا حکم ہے؟ (جواب) اس کا غسل اور اس کی نماز جنازہ وغیرہ سب مسلمانوں کی طرح ہونا چاہیے کیونکہ حدیث میں ہے: صلوا علی کل بر وفاجر "ہر نیک اور بد پر نماز پڑھو۔"
تمام علماء حنفیہ کا یہی فتویٰ ہے اور یہی کتب فقہ میں لکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ اور مسلک غلط بلکہ باطل ہے اور جس حدیث سے نماز جنازہ نیک و بد کا جائز ثابت کیا ہے' اس سے استدلال دو وجہ سے غلط ہے۔ اول یہ کہ یہ حدیث ضعیف ہے' دوم اس میں فاجر کا ذکر ہے' بے نماز تو کافر و مشرک ہے۔ اس کا حکم محض فاجر کا نہیں ہے بلکہ فاجر کافر و مشرک کا حکم ہے۔ سو وہ بروئے قرآن یہ ہے کہ نہ اس کا جنازہ پڑھا جائے نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا مانگی جائے کیونکہ اس نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا ہے۔ اس نکتہ کو حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے باوجود مقلد حنفی ہونے کے خوب سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ آنجناب نے خطبہ جمعہ اور اپنے اخبار خدام الدین لاہور مطبوعہ ۲۰/ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ "بے نماز کافر ہے" اور اس کا جنازہ جائز نہیں ہے۔ ان کے مضمون سے ایک دو اقتباس نقل کرتا ہوں۔
مولانا المحترم فرماتے ہیں: "حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر یعنی "جس نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑا پس تحقیق وہ کافر ہو گیا۔" اس طرح جو روزہ

جان بوجھ کر نہ رکھے اور حج کی توفیق ہونے کے بعد نہ کرے' اگر مال ہو زکوٰۃ نہ دے تو وہ سب کافر ہیں خواہ وہ کتنے ہی بڑے عالم کیوں نہ ہوں۔ اگر بی۔ اے' ایم۔ اے نماز نہیں پڑھتے تو وہ سب بے ایمان ہیں۔

پھر فرماتے ہیں سنو! میں کہا کرتا ہوں کہ اگر تم اپنا نام مادھو سنگھ 'گنگا رام رکھواؤ' نماز پانچ وقت ادا کرو' زکوٰۃ پائی پائی گن کے دو' حج فرض ہے تو کر کے آؤ' روزے رمضان کے تیسوں رکھو تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ تم پکے مسلمان ہو۔ (مگر خلاف شرع نام رکھنے اور ان کو نہ بدلنے کی وجہ سے گنہگار ہیں) اگر کوئی اپنا نام محمد الدین' عبداللہ خان' اللہ رکھا' محمد جان رکھوائے لیکن نماز ایک نہ پڑھنے پائے' حج فرض ہے تو نہ کر کے آئے' روزہ ایک نہ رکھے' زکوٰۃ باوجود واجب ہونے کے بالکل نہ دے تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ ھذا کافر حقا کہ یہ پکا کافر ہے۔ (خدام الدین ص-۶' کالم نمبر-۱)

پھر صفحہ-۶ کالم-۲ پر فرماتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کسی نے ساری عمر نماز نہ پڑھی ہو' روزہ ایک نہ رکھا ہو تو اگر ملا نماز جنازہ پڑھے گا بھی تو ہرگز نماز جنازہ قبول نہ ہو گی اور اس کے لیے مغفرت کریں گے تو قبول نہ ہو گی۔

میں کہتا ہوں کہ جب قبول نہ ہو گی تو پھر جنازہ کی نماز ایسے لوگوں کی جائز نہیں بلکہ لغو اور بے فائدہ ہے۔ چنانچہ مولانا المکرم عبداللہ بن ابی کا واقعہ لکھ کر یہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی لیکن اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی۔ (خدام الدین لاہور مطبوعہ ۲۰/ اکتوبر سنہ-۱۹۶۱ء)

حضرت مولانا احمد علی صاحب مدظلہ نے اپنے ہم مسلک علمائے متقدمین و متاخرین کے فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کتاب و سنت کی روشنی میں جو یہ منصفانہ فتویٰ صادر فرمایا ہے' قابل ستائش ہے اور بالکل صحیح ہے۔ دیگر علماء کو بھی اس سے عبرت حاصل کر کے یہی فتویٰ دینا چاہیے اور تارک نماز کے خلاف سخت قدم اٹھانا چاہیے۔

جناب محبوب سبحانی پیر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ "سستی سے نماز ترک کرنے والا کافر قابل قتل ہے' اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھی جائے۔ اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔" پیر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر مذاہب اس بارہ میں ذکر کر کے اسی مسلک کی ترجیح کی ہے اور احادیث سے اس کو مدلل بیان

کیا ہے۔

مولانا اشرف علی صاحب حکیم امت حنفیہ نے "بوادر النوادر" حصہ دوم کے ص-۵۴۰ میں جو لکھا ہے' اس سے مولانا احمد علی صاحب کی تائید ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں "ترک صلوٰۃ اس زمانہ (نبوی) میں کفرہی کی علامت تھی۔" پس اس کا حاصل کفرہی ہوا۔ جیسے شد زنار کو فقہا نے شعار کفر فرمایا ہے۔ اس سے تمام احکام کفر کے جاری کر دیئے جائیں گے اور اس زمانہ میں ترک صلوٰۃ کی علامت کفر ہونے کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے۔

پھر میں نے احادیث تکفیر بے نماز اور اجماع صحابہ کا قول نقل کیا ہے۔ اسی طرح بہشتی زیور میں بے نماز کا کفر ثابت کیا ہے۔ وھو الحق۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہل حدیث سوہدرہ جلد-۱۴' شمارہ-۲' مورخہ یکم دسمبر سنہ-۱۹۶۱ء

مقروض میت کی کفالت اور اس کا جنازہ

سوال : ایک شخص کاروبار کیا کرتا تھا- کبھی مال دار ہو جاتا تھا اور کبھی مفلس- موت آئی تو وہ مقروض اور اس قدر مفلس کہ اس کو کفن بھی مسلمانوں نے چندہ فراہم کر کے دیا- جب اس کی نماز جنازہ کے لیے تیاری ہوئی تو مقامی عالم نے اس کا جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا اور اس کی دو وجہ بتائیں- ایک یہ کہ یہ شخص بدکار اور حرام خور تھا- دوم یہ کہ اس شخص کے ذمہ قرض ہے' جب تک اس کے قرض کا کوئی کفیل نہ بنے' جنازہ نہیں کیا جائے گا- کیا اس عالم کا یہ کہنا درست ہے؟ اور کیا میت کے قرض کی کفالت صحیح ہے؟ دلیل شرعی سے جواب دیا جائے-

الجواب بعون الوہاب : واضح ہو کہ قمار بازی سخت کبیرہ گناہ ہے- اگر کوئی شخص دو چار بار جوا بازی کرے اور اس کو گناہ سمجھے اور دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف آئے کہ میں اس کی نافرمانی کر رہا ہوں' وہ ضرور مجھ سے بازپرس کرے گا تو ایسا شخص فاسق ہے' جس کا جنازہ کرنا جائز ہے- اور اگر وہ جوا بازی کو اپنا پیشہ بنا لے جیسے کسبی عورتوں نے زنا کو اپنا کسب اور پیشہ بنا رکھا ہے' جس سے دل میں خوف الٰہی نہ رہے اور جب اس کو اس کسب حرام سے ہٹایا جائے تو وہ لا پرواہی سے حکم شرعی کو ٹھکرا دے اور اسی کسب پر اصرار رکھے کہ بغیر توبہ کے

یہ کسب کرتا ہوا مر جائے تو ایسے جوئے باز کا جنازہ کرنا جائز نہیں ہے کہ یہ حد کفر کو پہنچ گیا ہے۔ آج کل کسبی عورتوں اور جوئے بازوں کا یہی حال ہے کہ وہ اس پیشہ کو مباح جانتے ہیں اور اس سے آمدنی ہو تو بہت خوش ہوتے ہیں اور اگر منع کیا جائے تو اس کو برا مناتے ہیں اور طرح طرح کی حجتیں کرتے ہیں۔ یہ ان کے کفر پر دلیل ہے۔

تفسیر فتح العزیز میں زیر آیت بلٰی من کسب سیئۃ (الآیہ) سورہ بقرہ جزء اول میں یہ لکھا ہے باید دانست کہ استباحت معصیت کفر است و معنی استباحت آں ست کہ در دل خوف و عقاب بر آں نماند وقبح آں از اعتقاد زائل شود گو بداند کہ ایں معصیت را در شرع حرام کردہ اندو ازاں منع شدید نمودہ وبزبان ہم اقرار نماید کہ ایں معصیت است زیرا کہ معنی استباحت مباح دانستن است نہ مباح گفتن وچوں خوف عقاب از معصیت زائل شد آں معصیت در اعتقاد قبیح نماند مباح گردید ومعاملہ مباحات باآں معصیت بوقوع آمد ظاہر بیناں فقہ می فہمند کہ انکار در او حرمت او در شرع نیز لازم استباحت است رایں معنی نادر الوقوع است از روئے احادیث وآیات در تحقیق استباحت ہمل قدر کافی است انکار درو وحرمت و در شرع بدل یا بزبان ضرور نیست ص-۳۲۸-

یعنی جاننا چاہیے کہ گناہ اور نافرمانی کو مباح جاننا کفر ہے اور مباح جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اس گناہ کرنے میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کا عذاب دل میں نہ رہے اور برائی اس گناہ کی دل سے زائل ہو جائے گو یہ جانے کہ یہ گناہ شرع میں حرام ہے اور اللہ و رسول نے اس سے سخت منع کیا ہے اور زبان سے یہ اقرار بھی کرے کہ یہ گناہ ہے کیونکہ استباحت کا معنی مباح جاننا ہے مباح کہنا نہیں ہے۔ جب اس گناہ پر سے خوف الٰہی زائل ہوا اور گناہ دل میں برا معلوم نہ ہوا تو مباح ہو گیا اور اس سے وہی معاملہ ہوتا پایا گیا جو مباح کاموں سے ہوتا ہے۔ فقہ کے ظاہر بینوں نے استباحت میں یہ لازم سمجھا ہے کہ اس کام کے معصیت اور حرام ہونے سے انکار کرے تب سمجھا جائے گا کہ یہ حرام کو مباح جانتا ہے حالانکہ یہ معنی استباحت کا نادر الوقوع ہے از روئے آیات و احادیث استباحت کی بھی تحقیق درست اور کافی ہے۔ دل اور زبان سے انکار معصیت اور حرمت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں قرآن ناطق ہے: لا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون "کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو خسارہ پانے والے ہیں۔" اور حدیث میں ہے:

ما امن بالقرآن من استحل محارمه یعنی "جس شخص نے حرام چیزوں کو حلال کر لیا' وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتا۔" خسارہ علی الاطلاق قرآن میں کفار کے حق میں آیا ہے۔ جیسے سورہ عصر میں وارد ہوا تو گناہ پر بے خوف ہو کر مصر ہونے والے اور اس کو پیشہ بنانے والے کفار میں شمار ہیں۔ آیت من کسب سیئۃ ایسے لوگوں کو شامل ہے۔ پس کسبی عورتیں اور ان کے ورثاء زنا کو اپنا پیشہ بنانے والے مسلمان نہیں ہیں۔

آیت من کسب سیئۃ میں علماء سلف میں سے اعمش و سدی وغیرہ نے سیئہ سے کبیرہ گناہ مراد لیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص استخفافاً وامتحاناً مرتکب کبیرہ اپنے ہادی و ملنع کو برا جانے اور ناصح کو جھٹلائے اور گناہ کو اچھا سمجھ کر کرے اور اس میں لذت اور فائدہ سمجھے اور ہمیشہ کے لیے قصداً وہ راہ اختیار کرے اور پھر بلا توبہ مر جائے تو وہ آیت من کسب سیئۃ کا مصداق ہے اور قرآن میں سود خور لوگوں کے حق میں یہ آیا ہے: ومن عاد فاولائک اصحاب النار ھم فیھا خالدون کہ جو لوگ بیاج کے متعلق حکم اور نصیحت سن کر پھر یہ کسب کرتے رہیں گے تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اسی طرح رسالہ تعلیم القرآن راولپنڈی مطبوعہ ماہ مئی سنہ ۱۹۶۰ء میں فتاویٰ حمادیہ سے یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ جس شخص نے کسی گویا راگ پیشہ سے یا کسی غیر راگ پیشہ سے کوئی راگ حرام سنا یا کوئی فعل حرام دیکھا اور پھر اس کی تحسین کی اور اس کو اپنے اعتقاد میں اچھا سمجھا یا بغیر حرام کے اس گناہ کے کام کو سراہا تو وہ مرتد ہو گیا۔ بایں وجہ کہ اس نے شریعت کا حکم بیکار کر دیا اور اس کو پھر سمجھا تو جو شخص شرعی حکم کو لچر سمجھے اور بیکار کر دے' وہ تمام مجتہدین کے نزدیک مومن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی کوئی عبادت قبول نہ کرے گا بلکہ اس کی ہر نیکی اکارت کر دے گا اور اس کی بیوی اس سے جدا ہو جائے گی یعنی نکاح ٹوٹ جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ فتاویٰ قاضی خان میں بھی فعل حرام اور گناہ کی تحسین کرنے پر فتویٰ ارتداد ہے۔ اس اصول کی رو سے وہ داڑھی منڈے جو داڑھی کی اور داڑھی والوں کی برائی اور مذمت کرتے ہیں اور ان کی تصویریں کھینچ کر مذاق اڑاتے ہیں کافر مرتد ہیں کیونکہ داڑھی شعار اسلام ہے جس کا رکھنا فرض ہے اور منڈانا حرام ہے اور اس پر اصرار کر کے بے خوف ہو کر داڑھی رکھنے کو برا سمجھنا کفر ہے جس میں نام کے مسلمان کلمہ گو مبتلا ہیں۔ یہی حال تمام گناہ پیشہ لوگوں کا ہے کہ اسلامی معاشرہ دور حاضرہ میں سخت خراب ہو چکا ہے۔

عرب و عجم میں کبیرہ گناہوں کو عادت اور پیشہ بنا لیا گیا ہے۔

کف الرعاع کے ص۔۱۴ میں یہ لکھا ہے کہ حدیث میں ہے: عن علی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من مات ولہ قینۃ فلا تصلوا علیہ (رواہ الحاکم فی تاریخہ والدیلمی) یعنی "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مر گیا اور اس نے گانے والی لونڈی رکھی ہوئی تھی جس سے گانا سنا کرتا تھا تو اس پر نماز جنازہ مت پڑھو۔" اس راگی کا جنازہ نہ پڑھنے کا حکم اسی وجہ سے ہوا کہ ہمیشہ راگ سننے سے نفاق پیدا ہو کر جم جاتا ہے اور پھر وہ کفر کی حد کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی حال جوئے بازوں کا ہے بلکہ جوئے باز راگی سے بدترین ہے کیونکہ جوا صریح نص قرآنی سے حرام ہے جس میں گناہ کبیرہ ہے۔ اور جوئے باز حرام خور ہے اور حرام خور کی کوئی عبادت قبول نہیں ہے۔ اس لیے جوئے بازوں کا جنازہ نہ کرنا چاہیے۔

پھر جوئے کے بارہ میں قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ ذکر الٰہی یعنی نماز سے روکتا ہے۔ جب جوئے باز جوئے میں مستغرق ہوتا ہے تو نماز سے غافل ہو جاتا ہے۔ اول بے وقت پڑھنے لگتا ہے پھر بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ جب نماز کا تارک ہو گیا تو پھر کافر و مشرک ہوا۔ کیونکہ احادیث صحیحہ میں بے نماز کو کافر و مشرک کہا گیا ہے۔ اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ تو اب ایسے جوئے باز کا جنازہ پڑھنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں کافر و مشرک کے جنازہ کی ممانعت وارد ہے۔ پس جس عالم نے جوئے باز کا جنازہ نہ کیا، اس نے بہت اچھا کیا، وہ اہل حق سے ہے۔ اکثر علماء کا علم طمع نفسانی نے ضائع کر دیا ہے۔ وہ ہر ایک بدکار بلکہ کافر کا جنازہ پڑھ دیتے ہیں بلکہ شہری علماء کی بابت یہ سنا اور اخباروں میں پڑھا گیا ہے کہ جب کوئی حکومت کا بڑا مشہور افسر یا قوم کا لیڈر فوت ہو جاتا ہے تو اس کا جنازہ پڑھتے ہیں۔ بعض غائبانہ جنازہ ادا کر کے اخباروں میں شائع کرتے ہیں کہ ہم نے آنجناب کا جنازہ اتنے لوگوں کے ساتھ پڑھ لیا۔ تاکہ حکومت اور اس افسر کے اقربا اور احباب ان علماء کی تحسین کریں حالانکہ وہ متوفی بے نماز، شرابی بلکہ انگریزی داں عقیدہ کے لحاظ سے ملحد ہوتا ہے۔ ایسے علماء دنیا دار اہل ریا ہیں پھر اس دور میں حق پسند اور حق گو علماء بہت قلیل ہیں۔

اس عالم کا یہ مسئلہ ٹھیک ہے کہ جو شخص ناجائز اور حرام کاموں میں لوگوں سے قرض لیتا رہا اور پھر ادا نہ کیا اور مر گیا تو اس کا جنازہ نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ قرضہ بھی حقوق العباد سے

ہے جو جنازہ اور سفارش سے معاف نہیں ہوتا۔ آنحضور ﷺ نے مقروض کا جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ حدیث میں ہے عن جابر قال کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یصلی علی رجل مات علیہ دین (الحدیث) یعنی آنحضرت ﷺ مقروض کا جنازہ نہ پڑھا کرتے تھے۔ (اور دیگر لوگوں کو پڑھنے کی اجازت دی) جس سے ظاہر ہوا کہ امام پیشوا جنازہ نہ پڑھے' ہاں عوام پڑھ دیں۔

دیگر حدیث یہ ہے کہ ابن عباس قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یصلی علی من مات وعلیہ دین فمات رجل من الانصار فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اعلیہ دین۔ قالوا نعم فقال صلوا علی صاحبکم فنزل جبرئیل فقال ان اللّٰہ یقول انما الظالم عندی فی الدیون التی حملت فی البغی والاسراف والمعصیۃ فاما المتعفف ذوالعیاب فانا ضامن ان اودی عنہ فصلی علیہ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعد ذالک من ترک ضیاعا او دینا فالی وعلی ومن ترک میراثا فلاھلہ فصلی علیہ (کتاب الاعتبار المغازی ص-۱۳۰) یعنی "ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ مقروض میت کا جنازہ نہ پڑھتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص انصاری فوت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا اس میت کے ذمہ قرض ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں اس کے ذمہ قرض ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے ساتھی پر نماز جنازہ پڑھ لو۔ (میں تو نہیں پڑھتا) تب جبریل علیہ السلام نازل ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ظالم میرے نزدیک قرضوں کے بارے میں وہ شخص ہے جس نے برائی کے کاموں اور اسراف کی جگہوں اور گناہ کی جگہوں پر قرض اٹھایا ہے لیکن جو شخص حرام سے بچنے والا عیالدار ہو' جس نے مجبوری میں قرض لیا تو اس کا میں ضامن ہوں کہ قیامت کو اس کی طرف سے ادا کر دوں گا۔ پس آنحضرت ﷺ نے اس انصاری کا جنازہ پڑھ دیا۔ اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ جو شخص بال بچے محتاج چھوڑ جائے' اس پر قرضہ ہو تو میرے ذمہ ہے۔اور جو ورثہ چھوڑے وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ پس جنازہ اس کا پڑھ دیا کرتے تھے۔"

حدیث جابر رضی اللہ عنہ اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علیحدہ علیحدہ واقعہ ہیں۔ اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہوا کہ گناہ اور اسراف کی جگہوں میں قرض لے کر مال صرف کرنے

والے شخص کا جنازہ نہ کرنا چاہیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور جو عفیف اور عیالدار ہو کہ مجبوری میں قرض لیتا رہا پھر ادا نہ کر سکا اور ارادہ ادا کرنے کا رکھتا تھا تو اس کا جنازہ کر دینا چاہیے۔ پس جو جوئے باز لوگوں سے روپیہ مال ادھار لے کر جوا کھیلتے ہیں اور پھر ہار جاتے ہیں اور ان کے قرض ان کے ذمہ رہ جاتے ہیں یا جوئے باز لوگوں کے گھروں سے مال اور چیزیں چوری کر کے لے جاتے ہیں اور پھر ہار جاتے ہیں اور مال مسروقہ واپس نہیں کرتے۔ ایسے ظالموں کے جنازے نہ کرنے چاہئیں۔

چنانچہ حدیث میں ہے: عن جابر بن سمرة ان رجلا قتل نفسه بمشاقص فلم یصل علیه النبی صلی الله علیه وسلم۔ (منتقی) یعنی جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے تیر کے پھلوں سے اپنی جان کو قتل کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فاسق ظالم قاتل وغیرہ کا جنازہ نہ پڑھنا چاہیے لیکن عوام پڑھ دیں تو خیر۔ عالم دین اور مقتدا کو انکار کر دینا چاہیے تاکہ ظالموں اور قاتلوں کو عبرت حاصل ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خائن پر جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا اور یہ فرمایا کہ "صلوا علی صاحبکم" یعنی تم اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو' میں تو نہیں پڑھتا۔ فتغیرت وجوه القوم لذالک یعنی یہ بات سن کر لوگوں کے چہروں کی رنگت بدل گئی۔ تب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے مال غنیمت میں خیانت کی ہے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ میت کے قرضہ کی کفالت و ضمانت صحیح ہے یا نہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر میت نے مال اس قدر چھوڑا ہے کہ اس سے اس کا قرضہ ادا ہو سکتا ہے تو اس کے متروکہ مال سے قرض ادا کرنا واجب ہے۔ قرض ادا کرنا ورثہ (وارثوں کو) تقسیم کرنے سے مقدم ہے۔ اگر مال موجود نہ ہو تو پھر میت مفلس کے قرضہ کی کفالت و ضمانت جائز ہے اور احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے اور جمہور ائمہ دین کا یہی مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہ امام اہل رائے اس مسئلہ کے خلاف ہیں۔ ان کا قول ہے کہ میت کی ضمانت و کفالت کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے ان کے دو شاگردوں امام ابویوسف قاضی اور امام محمد نے اس مسئلہ میں ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ محدثین کے موافق ہو گئے تھے۔ چنانچہ حدیث یہ ہے کہ سلمہ ابن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ ایک جنازہ لایا گیا اور لوگوں نے کہا کہ یارسول اللہ! اس پر نماز جنازہ پڑھیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ اس نے کوئی مال چھوڑا؟ لوگوں نے کہا کچھ نہیں چھوڑا۔ آپ نے فرمایا کیا اس کے ذمہ قرضہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اس کے ذمہ تین دینار ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ پھر تم ہی اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو۔ (میں تو نہیں پڑھتا) تو ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا صل علیه یارسول اللّٰہ! وعلی دینه فصلی علیه (رواہ احمد والبخاری والنسائی) یعنی یارسول اللہ! اس پر جنازہ کی نماز پڑھ دیجئے' اس کا قرضہ میرے ذمہ ہے۔ تب آنحضرت ﷺ نے اس پر نماز جنازہ پڑھ دی۔ اس طرح کئی روایتوں میں یہ قصہ آیا ہے۔ امام شوکانی ان روایتوں کو نقل کر کے نیل الاوطار میں فرماتے ہیں کہ یہ احادیث اس بات پر دلیل ہیں کہ میت کی طرف سے ضامن ہونا صحیح ہے اور ضامن پر اس قرضہ کا ادا کرنا اسی طرح لازم ہو گا جس طرح میت پر لازم تھا۔ میت غنی ہو یا فقیر ضمانت درست ہے۔ والی ذالک ذھب الجمهور یعنی جمہور علماء اسلام کا یہی مذہب ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ میت کی طرف سے ضمانت صحیح نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حنفیہ کی اصولی کتاب مسلم الثبوت کے ترجمہ السبیل الاقوم کے آخری ورق ص ۷۹ پر یہ لکھا ہے: "میت کے ذمہ چونکہ کسی حق کا مطالبہ باقی نہیں رہتا' اس لیے بعد موت اگر اس کے دین کا کوئی کفیل ہو گا تو امام صاحب کے نزدیک یہ کفالت غیر صحیح ہو گی۔ اس لیے کہ کفالت کے یہ معنی ہیں کہ اصیل کے ساتھ کفیل بھی مطالبہ میں شریک کیا جائے اور میت کے ذمہ جب مطالبہ ہی نہیں تو پھر شریک کرنے کے کیا معنی؟ بخلاف صاحبین اور ائمہ ثلاثہ کے کہ ان کے نزدیک یہ کفالت صحیح ہے بدلیل حدیث جابر رضی اللہ عنہ (پھر ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی ضمانت والی حدیث لکھ کر یہ لکھا ہے) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت کی کفالت صحیح ہے دیگر اینکہ موت دین وغیرہ حقوق سے بری نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اخروی مطالبہ اس کے ذمہ بالاجماع باقی رہتا ہے اور اگر تبرعاً کوئی اس کے دین کو ادا کرے تو ادا ہو جاتا ہے۔

اس مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کا مسلک حق اور صواب تھا کیونکہ اس پر صحیح حدیث دلیل موجود تھی اور قول امام صرف قیاسی ہے لیکن تقلید شخصی نے مقلدین کو مجبور کیا تو انہوں نے حدیث کو تاویل فاسد سے ٹھکرا دیا اور قول امام کو ثابت اور صحیح رکھا۔ چنانچہ السبیل الاقوم کے اسی صفحہ پر یہ لکھا ہے کہ اس کا جواب یہ ہے کہ قول ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ھما!

علي يارسول الله! اس میں یہ احتمال بھی نکلتا ہے کہ اس قول سے ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے کفالت نہیں کی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وعدہ کیا ہو کہ میں ان کو ادا کروں گا- اور یہ احتمال نکل سکتا ہے کہ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے میت کی زندگی میں جو کفالت کی تھی' اس کا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اس قول سے اقرار کیا ہو- اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال-

رہا اخروی مطالبہ چونکہ یہ باعتبار گناہ کے ہوتا ہے' اس لیے یہ اس کو متدعی نہیں کہ میت پر ذمہ بھی باقی رہے- یہ احتمال کہ زندگی میں کفالت کی تھی' اس کا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اظہار کیا' سراسر باطل ہے اور یہ احتمال نکالنا اس بات پر دلیل ہے کہ مقلدین اہل اصول نے جو اصول اپنے امام کے مذہب کو ثابت کرنے کے لیے اختراع کئے ہیں' یہ باطل ہیں اور ان کو علم حدیث میں مہارت نہ تھی بلکہ جہالت تھی- چنانچہ اس حدیث کے تمام طرق اور متون کا علم رکھنے والے محدثین نے اس احتمال کو رفع کر دیا ہے کہ منتقی میں لکھا ہے وقال فيه النسائي وابن ماجه فقال ابوقتاده انا اتكفل به وهذا صريح في الانشاء لا يحتمل اتكفل بما مضى یعنی نسائی اور ابن ماجہ نے جو ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ذکر کیا ہے' اس میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ مروی ہیں انا اتكفل به یعنی میں اس میت کے قرضہ کا کفیل بنتا ہوں- یہ صاف صریح بات ہے کہ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ آئندہ کے لیے کفیل بنے تھے- پس زمانہ ماضی کی کفالت کی خبر دینے کا احتمال رفع ہوا-

میں کہتا ہوں کہ نیل الاوطار جلد-۵' ص-۲۳۸ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ایسا ہی درج ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک میت مدیون کے جنازہ سے انکار کیا کہ اس کے ذمہ دو درہم تھے- فقال علي رضى الله عنه يارسول الله هما علي وانا لهما ضامن- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یارسول اللہ آپ جنازہ پڑھ دیں' قرض ادا کرنے کا میں ضامن ہوں- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ پڑھ دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا جزاک الله عن الاسلام خيرا وفك رهانك كما فككت رهان اخيك ما من مسلم فك رهان اخيه الا فك الله رهانه يوم القيامة- یعنی اللہ تجھے اسلام کی طرف سے جزائے خیر بخشے اور جس طرح تو نے حقوق واجبہ سے سبکدوش کیا ہے' اللہ تجھے حقوق سے سبکدوش کر دے- ہر وہ مسلمان جو اپنے بھائی مسلمان کو اس کے حقوق سے سبکدوش کر دے گا' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو حقوق سے سبکدوش کر دے گا-

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ میت کی کفالت و ضمانت صحیح ہے۔ دیگر حدیث کہ آنحضرت ﷺ نے خود مفلس میتوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لی تھی اور فرمایا تھا من ترک دنیا فعلی کہ جو نادار میت قرض چھوڑ جائے' اس کا قرضہ میرے ذمہ ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ بھی ضامن ہے کہ متعفف عیالدار کا قرضہ میں وائن کو ادا کر دوں گا کما تقدم۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ حنفیہ اور ان کے امام صاحب کا یہ قول کہ میت کی کفالت صحیح نہیں' سراسر باطل ہے۔ اور اسی طرح اکثر مسائل حنفیہ احادیث نبویہ کے خلاف ہیں جن میں یہ لوگ احادیث کو چھوڑ دیتے ہیں اور قول امام کو اپناتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اصول مذہب ابی حنفیہ کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں قول ابو حنفیہ کے قائم رکھنے اور احادیث نبویہ کو چھوڑنے کے قاعدے لکھے گئے ہیں۔ اس کا ذکر فتاویٰ عزیزی فارسی کے ص-۶۳ میں ہے۔ اس میں چھٹا قاعدہ یہ ہے السادسة قول ابن همام في بعض كتبه ما صححه البخاري ومسلم ونظراً هما لا يجب علينا قبول الخ یعنی چھٹا قاعدہ حنفی مذہب کا یہ ہے کہ جس کو امام ابن ہمام نے بعض کتابوں میں ذکر کیا ہے کہ امام بخاری و امام مسلم اور ان کے مثل دیگر محدثین جن احادیث کو کہہ دیں اور وہ ہمارے مذہب کے خلاف ہوں تو ان کا قبول کرنا ہم پر واجب نہیں ہے۔

ساتواں قاعدہ یہ لکھا ہے السابعة قال بعض اصحاب الفتاویٰ اذا كان في المسئلة قول لابي حنفية وصاحبيه وخالفه حديث يحكمون بصحة وجب اتباع قولهم دون الحديث یعنی جب کسی مسئلہ میں ابو حنیفہ اور صاحبین کا قول آجائے اور حدیث نبوی اس کے خلاف ہو جس کو محدثین کرام نے صحیح قرار دیا ہے تو اماموں کا قول قبول کرنا واجب ہے' حدیث قبول کرنی درست نہیں۔ آٹھواں قاعدہ یہ لکھا ہے كل حديث لم يروه الا من ليس فقيها فان انسد فيه باب الراى لا يجب قبوله یعنی ہر وہ حدیث جس کا راوی کوئی صحابی غیر فقیہ ہو اگر اس کے لینے سے دین میں رائے قیاس چلانے کا دروازہ بند ہوتا ہو تو ایسی احادیث کا قبول کرنا واجب نہیں ہیں۔ پس ایسے اصول بنا کر مقلدین حنفیہ نے احادیث نبویہ کی تکذیب کی ہے۔ اس لیے ایسی تقلید عندالشرع شرک فی الرسالۃ ہے اور ایسے حنفیہ اہل سنت سے خارج اور گمراہ فرقوں میں شمار ہیں۔ ان کی کتب فقہ اور اصول فقہ پڑھنا حرام ہے کیونکہ ان کے پڑھنے سے گمراہ ہونے کا خطرہ عظیم ہے۔ کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد-۱۸' شمارہ-۳۳' ۳۴' ۳۵' مورخہ ۱۷ و ۳۱ مارچ سنہ-۱۹۶۷ء

مذاکرہ علمیہ

جنازۂ منافق

نویں سوال کا جواب

نویں سوال کا جواب یہ ہے کہ آنحضور سید اولاد آدم خیر البشر ﷺ نے ابن ابی منافق کا جنازہ پڑھا اور یہ ایسی احادیث صحیحہ قطعیہ سے ثابت ہے جن کا انکار سراسر گمراہی ہے۔ اور یہ واقعہ تمام کتب احادیث متداولہ میں اور کتب تفاسیر معتبرہ میں موجود ہے جس سے انکار کرنا تمرد ہے۔ اصح الکتب صحیح بخاری شریف میں یہ حدیث جس میں ابن ابی کے جنازہ کا واقعہ مذکور ہے' متعدد مقام پر وارد ہے۔ کہیں مختصر ہے اور کہیں مفصل ہے۔ "باب الکفن فی القمیص کتاب الجنائز" سے مختصر ترجمہ حدیث نقل کرتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ عبداللہ بن ابی جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا (اس کا نام بھی عبداللہ تھا اور وہ پکا مسلمان تھا) آیا اور اس نے آنحضرت ﷺ سے یہ درخواست کی کہ آپ اپنا قمیص عنایت فرمایئے کہ اس میں اپنے باپ کو کفنا دوں اور آپ اس پر نماز جنازہ پڑھیں اور اس کے لیے بخشش کی دعا فرما دیں۔ آپ نے اس کو اپنا کرتہ دے دیا اور فرمایا کہ جب جنازہ تیار ہو تو مجھے اطلاع دینا تاکہ میں اس پر نماز جنازہ پڑھوں۔ پس آپ کو خبر کی گئی اور آپ نے اس پر نماز پڑھنے کا قصد کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو روکا اور عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقوں پر نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو اختیاروں کے درمیان ہوں اور آپ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: استغفرلهم اولا تستغفرلهم ان تستغفرلهم سبعين مرة فلن يغفرالله لهم یعنی "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان منافقوں کے لیے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں اور اگر آپ ستر بار بھی بخشش مانگیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہ بخشے گا۔ فصلی علیه پس آپ نے اس منافق پر نماز جنازہ پڑھا دی۔ پھر سورت برات کی آیتیں اتریں کہ ولا تصل على احد منهم مات ابدا ولا تقم على قبره (الآیہ) یعنی جو منافق مرجائے اس پر کبھی نماز مت پڑھو اور نہ اس کی قبر پر (دعا کے لیے) کھڑے ہو۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ابن ابی منافق کی نماز جنازہ آنحضور ﷺ نے پڑھی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ جب آیت میں منع تھا تو کیوں جنازہ پڑھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کفر دو قسم ہے۔ ایک کفر جحود اور دوسرا کفر نفاق۔ جس شخص میں پہلا کفر ہو' اس کو کافر و مشرک اور مطلق خارج از اسلام کہتے ہیں۔ اس کے جنازہ اور دعا سے صاف ممانعت وارد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ماکان للنبی والذین اٰمنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی من بعد ما تبین لھم انھم اصحاب الجحیم۔ یعنی "نہیں لائق ہے واسطے نبی اور مومنوں کے کہ بخشش کی دعا مانگیں واسطے مشرکوں کے اگرچہ وہ رشتہ دار ہوں' بعد اس بات کے کہ ان کے لیے یہ ظاہر ہوا کہ وہ دوزخی ہیں۔" اس آیت کے بعد نبی کریم ﷺ نے کسی منکر اسلام اور مشرک خارج اسلام کے لیے دعا نہیں کی۔

اب رہے کفار بالنفاق جو باطنی طور پر تو کافر تھے اور ظاہر میں مسلمان تھے کیونکہ وہ ظاہر میں کلمہ پڑھتے تھے' نمازیں پڑھتے تھے' زکوٰۃ دیتے تھے اور جنگ میں بھی ساتھ جاتے تھے۔ لیکن باطنی اعتبار سے کافر تھے اور رافضیوں کی طرح تقیہ کیے ہوئے تھے۔ ان کے لیے دعا مغفرت کی صاف طور پر ممانعت وارد نہ ہوئی تھی۔ صرف ایک آیت سورہ توبہ کی تھی جس میں پہلے الفاظ سے تو آپ کو اختیار دیا گیا کہ بخشش مانگ یا نہ مانگ اور دوسرے شرطیہ جملہ میں لفظ سبعین کے ساتھ یہ فرمایا گیا کہ اگر آپ ستربار بھی بخشش مانگیں گے تو اللہ ہرگز نہ بخشے گا۔ اس میں ستربار کا عدد دو چیزوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ یہ عدد مخصوص ہے۔ اس تحدید کے لیے جس کے لیے وضع کیا گیا ہے اور یہ اصل ہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے تکثیر مراد ہو تحدید نہ ہو۔ یہ محاورہ بھی ملک عرب میں تھا۔ پس خاص عدد سے تحدید اور خاص عدد بول کر اس سے تکثیر دونوں عرب کے محاورہ میں شامل تھے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو تکثیر کا محاورہ مراد لے کر اس آیت سے ممانعت سمجھی کہ اس آیت سے منافقوں پر نماز پڑھنا منع ہے۔ جب اللہ ان کو بخشے گا نہیں تو نماز جنازہ سے فائدہ کیا؟ اور نبی کریم ﷺ نے اس سے تحدید سمجھی کہ ستربار پر اللہ نے منافقین کے لیے مغفرت کی نفی فرمائی ہے۔ اگر ستربار سے زیادہ مغفرت کی جائے تو رحمت کا امکان ہے اور شروع آیت میں میرے لیے تخییر ہے' اس لیے فرمایا کہ انی خیرت فاخترت لو اعلم انی ان زدت علی السبعین یغفرلہ لزدت علیھا قال فصلی علیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ یعنی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو اختیار ملا ہے۔ اگر میں یہ جانوں کہ ستر بار سے زیادہ دعا کروں تو اللہ ان کو بخش دے گا' میں ستر بار سے زیادہ دعا کروں گا۔ پس آنحضرت ﷺ نے اس پر جنازہ کی نماز پڑھ دی۔"

آیت میں احتمال تو دونوں تھے لیکن آپ میں لینت اور رحم کی صفت زیادہ غالب تھی کہ جس طرح ہو سکے لوگ دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں۔ بعض موقعہ پر آپ مصلحت وقتی سے بھی کام لیتے تھے جبکہ کسی بارہ میں حکم خاص نازل شدہ نہ ہوتا۔ چنانچہ ایک بار ایک منافق نے ناشائستہ الفاظ آپ کے بارہ میں استعمال کیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ تب آپ نے منع کیا اور یہ فرمایا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو (جو کلمہ پڑھ کر ساتھ رہتے ہیں) قتل کر رہا ہے۔ پس رحم اور مصلحت وقتی کے پیش نظر آپ نے تحدید کے احتمال کو ترجیح دی اور آرزو کی کہ اگر ستر بار سے زیادہ دعا کرنے پر اللہ بخش دے تو میں زیادہ کے لیے بھی تیار ہوں۔

حدیث میں لفظ (لو) وارد ہے جس کے متعلق سائل نے لکھا ہے کہ یہ مثبت کو منفی کر دیتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے لیکن "لو" کا استعمال ہمیشہ ہی اس طرح نہیں ہوتا بلکہ اس کا استعمال کئی چیزوں کے بارہ میں ہے۔ یہ تخصیص کے لیے بھی آتا ہے۔ جیسے ارشاد ہے لو لا تستغفرون اللّٰہ اور توبیخ کے لیے بھی مستعمل ہے۔ جیسے فرمایا لو لا جاؤا علیہ باربعۃ شھدا اور عرض کے لیے بھی آتا ہے۔ جیسے کہا گیا ہے لو تنزل عندنا فتصیب خیرا اور تمنی کے لیے بھی اس کا استعمال بکثرت ہے۔ جیسے قرآن میں ہے: فلو ان لنا کرۃ فنکون من المؤمنین اور حدیث میں ہے کہ دو شخصوں کے بارہ میں حسد کرنا جائز ہے۔ ایک تالی قرآن پر کہ یوں کہے لو اوتیت مثل ما اوتی ھذا لفعلت کما یفعل - دوسرا جس کو اللہ نے مال دیا ہے اور وہ فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر یوں کہے کہ لو اوتیت مثل ما اوتی لفعلت کما یفعل۔

ایک حدیث میں ہے آنحضور ﷺ نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا کہ لولا ان قومک حدیث عھدھم بالجاھلیۃ فاخاف ان تنکر قلوبھم ان ادخل الجدر فی البیت وان الصق بابہ فی الارض۔ اس سے جواز سمجھ کر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں عمل کیا۔ سائل ان امثلہ پر غور کر کے سمجھ لے کہ "لو" ہمیشہ مثبت کو منفی

بتانے کے لیے نہیں آتا بلکہ اس کے مختلف مواقع ہیں جن پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ تو آیت پیش کردہ پر آنحضور ﷺ کا لفظ "لو" بولنا یہ تمنی کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کلام کرنے کے بعد آپ نے جنازہ پڑھا دیا جس پر یہ الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ فصلی علیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ اگر منفی ہوتا تو آپ جنازہ نہ پڑھتے اور دعا سے رک جاتے۔ جو لوگ اس حدیث "لو" سے جنازہ کی نفی کرتے ہیں' وہ غلط کار ہیں۔ سائل کو ان کی باتوں سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ اور آیت محتمل تھی آپ نے ایک توجیہہ پر عمل کر لیا کہ اس میں کرم اور مصلحت تھی۔

چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں انه صلی اللّٰہ علیه وسلم فعل هذا اکله اکراما لابنه وکان صالحا ولانه ایضا من مکارم اخلاقه صلی اللّٰہ علیه وسلم وحسن معاشرته لمن انتسب ای صحبه (جلد-۲' ص-۳۶۸) یعنی آنحضور ﷺ نے' یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ اس رئیس المنافقین کا لڑکا عبداللہ بڑا نیک مسلمان تھا اس کا اکرام کرنا مناسب سمجھا اور دوسرا یہ کہ کرم کرنا اور دشمن سے بھلائی کرنا آپ کی اخلاقی خوبیوں سے تھا اور سوم یہ کہ جو آپ کے فریق میں شمار ہوا اور آپ کی مصاحبت سے آپ کی طرف منسوب ہوا' اس سے حسن معاشرت کا ثبوت دیا۔

میں کہتا ہوں کہ جب شرع میں آپ کو دو چیزوں کا اختیار دیا جاتا یا لوگ آپ کو دو باتوں کا اختیار دیتے ہیں تو آپ ان میں سے آسان صورت کو اختیار کر لیا کرتے تھے۔ جبکہ وہ گناہ نہ ہوتی۔ چنانچہ مسلم جلد-۲' ص-۲۵۶ میں حدیث ہے کہ ماخیر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بین امرین احدهما ایسر من الاخر الا اختارا یسرهما مالم یکن اثما فان کان اثما بعد الناس منه۔ اس صورت آمدہ میں بھی آپ نے آسان اور مفید صورت اختیار کی گویا یہ باطن میں غلطی تھی مگر بظاہر نافع تھی کہ اس سے رحمت و رافت مترشح تھی۔ یہی اصول آپ کے جد امجد کا تھا کہ باپ کافر رہا لیکن پھر بھی فرماتے ہیں کہ میں تیرے لیے اللہ سے بخشش مانگوں گا اور فرمایا ومن عصانی فانک غفور رحیم یعنی "جنھوں نے میری نافرمانی کی اور میرا دین قبول نہ کیا تو یااللہ وہ تیرے سپرد ہیں اور تو غفور رحیم ہے۔"

آنحضرت ﷺ نے بھی چچا کو آخری وقت تبلیغ کی مگر وہ نہ مانا۔ آپ تب بھی یہ فرماتے ہیں کہ واللّٰہ لاستغفرن لک مالمانه عنک یعنی "واللہ! میں آپ کے لیے ضرور بخشش

مانگتا رہوں گا جب تک کہ اس سے روک نہ دیا جاؤں۔" یہ ابوطالب کی ہمدردی اور تکلیف کے لیے فرمایا اور سفارش کی جو کسی قدر منظور ہو گئی۔ چنانچہ مسلم شریف جلد-۱، ص-۱۵ میں یہ حدیث ہے کہ حضرت عباس بنائیہ نے آنحضور ﷺ سے استفسار کیا کہ یارسول اللہ ابوطالب آپ کی حمایت اور حفاظت کرتا تھا اور آپ کی جانب سے اپنی برادری سے بھی لڑتا تھا۔ هل نفعت اباطالب بشئی کیا آپ نے ابوطالب کو کچھ نفع دیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں وجدته فی غمرات من النار فاخرجته الی ضحضاح یعنی وہ آگ کی بڑی سختیوں میں تھا۔ میں نے اس کو نکال کر ٹخنوں تک کروا دیا ہے۔ لولا انا لکان فی الدرک الا سفل من النار۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے بہت نیچے کے طبقہ میں ہوتا۔ یہ سب آپ کی مہربانیاں تھیں کہ آپ جہان بھر سے زیادہ مہربان تھے۔ آپ کی اس مصلحت وقتی کا یہ انجام ہوا کہ ابن ابی کی قوم سے ایک ہزار شخص مسلمان ہو گیا۔

چنانچہ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری حاشیہ بخاری جلد-۲، ص-۶۷۴ پر لکھتے ہیں وروی انه اسلم الف من قومه لما راوه بتبرک بقمیص النبی صلی اللہ علیه وسلم یعنی یہ روایت کیا گیا ہے کہ ابن ابی کی قوم نے جب دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کی قمیص سے تبرک حاصل کیا گیا ہے تو ان میں سے ایک ہزار شخص مسلمان ہوا۔ الغرض آنحضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا تو آپ نے منافقوں کا جنازہ چھوڑ دیا۔

یہ آپ کا ایک اجتہاد تھا جس میں زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ سے بھول ہوئی جس پر آپ کو مطلع کر دیا گیا۔ چنانچہ نور الانوار ص-۲۱۴ میں آنحضرت ﷺ کے اجتہاد پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ فان کان اصاب فی الرائی ینزل الوحی للتبنیه علی الخطا وما تقرر علی الخطاء قط بخلاف سائر المجتهدین فانهم ان اخطاتو ایبقی خطاتوهم الی یوم القیامة یعنی "آنحضرت ﷺ دلائل شرعیہ سے اجتہاد کرتے تھے۔ پس اگر آپ کا اجتہاد درست ہوتا تو اس حادثہ ---- میں وحی نازل نہ ہوتی تھی۔ (کیونکہ اجتہاد منشا الٰہی کے مطابق ہوتا تھا) اور اگر اجتہاد میں خطا ہوتی تو اس خطا پر تنبیہہ کرنے کے لیے وحی نازل ہو جاتی تھی اور آپ کو راہ صواب بتلا دیا جاتا تھا۔ آپ خطا پر ٹھہرائے نہیں گئے۔ بخلاف تمام مجتہدین کے کہ ان کی خطاء قیامت تک باقی رہ سکتی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اتباع نبی واجب ہے اور مجتہدین میں سے کسی کی تقلید شخصی ضروری

نہیں کہ اس سے قیامت تک کی خطا کی پیروی لازم آتی ہے اور کوئی مجتہد خطا سے معصوم نہیں ہے۔ بعض لوگ ان احادیث صحیحہ کی تکذیب کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ احادیث صحیح نہیں ہیں۔ ان میں راویوں سے لغزشیں ہوتی ہیں اور دلیل یہ ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہیں۔ چنانچہ جماعت اسلامی کا لیڈر یہی کہتا ہے لیکن یہ سراسر باطل ہے۔ کیونکہ قرآن میں کسی منافق مظہر اسلام کے جنازہ کی ممانعت ثابت نہیں ہے۔ من ادعی فعلیہ البیان۔ ہاں مشرک منکر اسلام کی بابت ممانعت وارد ہے۔ لیکن اس میں نزاع نہیں ہے اور احادیث متعدد طرق سے کتب حدیث میں وارد ہیں جن کی صحت ائمہ حدیث میں مسلم ہے۔

حاشیہ بخاری میں مولانا احمد علی صاحب فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کے حال پر تعجب ہے جو اس حدیث کی صحت سے انکار کرتے ہیں کیونکہ اس حدیث کے طرق کثیر ہیں اور شیخین کا اس کی صحت پر اتفاق ہے اور سب محدثین نے اس حدیث کی تخریج کی ہے' الا ماشاء اللہ (جلد-۲' ص-۶۷۴) جو شخص ایسی ثابت شدہ حدیث کا انکار کرتا ہے وہ منکرین حدیث کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح ہر قوم کے لیڈر اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر قرآن اور حدیث کو باہم لڑاتے رہیں گے اور جو حدیث ان کی عقل و فکر میں نہ آسکی اس کو چھوڑتے رہیں گے' یہ سراسر ضلالت ہے۔ ہدایت اس میں ہے کہ محدثین عظام کی تصحیح پر اعتقاد کر کے احادیث کو قبول کیا جائے اور ان کی تطبیقات سے قرآن و حدیث میں مطابقت کی جائے۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف الحصاری

ہفت روزہ اہل حدیث سوہدرہ جلد-۹' شمارہ-۳۳' ۳۴' مورخہ ۱۶' ۲۴ ستمبر سنہ-۱۹۵۷ء

میت کو کس رخ دفن کرنا چاہیے؟

سوال: میت کو دفن کرنا سیدھی کروٹ پر قبلہ رخ چاہیے یا بحسب رواج چت منہ قبلہ؟ (نوٹ) کتاب احکام جنازہ مصنف مولوی علی احمد صاحب زاہد کے صفحہ-۲۶ پر بحوالہ الروضۃ الندیہ یہ مضمون لکھا ہے کہ "میت کو قبر میں داہنی کروٹ پر لٹانا مسنون ہے۔" مہربانی فرما کر واضح فرما دیں۔

سید غلام احمد شاہ ضلع لائلپور (فیصل آباد)

جواب: درایہ تخریج ہدایہ ص-۱۴۰ میں ہے کہ ان البراء ابن معرور لما توفی اوصی ان یوجه الی القبلة فقال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اصاب اخرجه الحاکم- یعنی براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے وصیت کی کہ جب میں فوت ہو جاؤں تو مجھے قبلہ کی طرف متوجہ کیا جائے- یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ درست وصیت ہے-

حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی وفات کی حدیث جو مسند احمد میں ہے وہ طویل ہے- اس کے یہ الفاظ ہیں واضطجعت واستقبلت وجعلت یدها تحت خدها یعنی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو قبر میں لٹایا گیا اور قبلہ کی طرف منہ کیا گیا اور داہنی کروٹ پر کر کے ان کا ہاتھ ان کے رخسارہ کے نیچے کیا گیا- (اگر میت کے لیے یہ صورت ممکن نہ ہو تو کوئی ضروری نہیں ہے کیونکہ تکلیف مالایطاق ہو گا)

میں کہتا ہوں کہ اس طرح ہی سونا سنت ہے کہ داہنی کروٹ پر لیٹے اور ہاتھ رخسارہ کے نیچے رکھے اور دعاء مسنونہ اللهم باسمک اموت واحیی پڑھے- احادیث میں اور دعائیں بھی ہیں- سونے کے متعلق ابن السنی کی کتاب عمل الیوم واللیلہ ص-۱۹۲ میں ہے: عن علی قال اذا اخذت مضجعک فقل بسم اللّٰہ وعلی ملة رسول اللّٰہ وحین یدخل المیت فی قبره یعنی "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب سونے کی جگہ پر آؤ یا میت کو قبر میں رکھو تو بسم اللّٰہ وعلی ملة رسول اللّٰہ دعا پڑھو-" ص-۱۹۵ میں حدیث ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کان اذا اوٰی الٰی فراشه اضطجع علی یمینه (الحدیث) یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے بستر پر آکر سوتے تو دائیں کروٹ پر لیٹتے-"

دیگر روایت اسی صفحہ پر بایں الفاظ ہے کہ کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اذا اخذ مضجعه جعل کفه الیمنٰی تحت خده الایمن یعنی "آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے بستر پر لیٹتے تو داہنی ہتھیلی کو داہنے رخسارہ کے نیچے کر کے سوتے تھے-

ان تمام روایتوں کو ملانے سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ سونے اور میت کو قبر میں لٹانے کی کیفیت ایک ہے- سونا بھی موت ہے- لفظ اموت اس پر دال ہے اور حدیث النوم اخت الموت کہ نیند موت کی بہن ہے' بھی اس پر دلالت کرتی ہے- اہل جنت کو نہ نیند نہ موت کہ دونوں قریب قریب ہیں- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سونے اور میت کو رکھنے کے وقت

بسم اللہ وعلیٰ ملة رسول اللہ پڑھو کہ حکم ایک ہی ہے۔ فرصت نہیں ہے' ثبوت اسی قدر کافی ہے۔ باقی کتاب احکام جنازہ منگوا کر پڑھو۔ اس میں سب احکام ہیں' والسلام۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص-۱۷۶

قبر میں مٹی ڈالتے وقت آیت مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ پڑھنے کی تحقیق

واضح ہو کہ اکثر لوگوں کو دیکھا اور سنا ہے کہ جب میت کو دفن کرتے وقت مٹی ڈالتے ہیں تو دونوں ہاتھوں کو ملا کر تین لپیں بھرتے ہیں تو پھر پہلی لپ کے وقت سورۃ طٰہٰ کی ایک آیت کا یہ جملہ پڑھتے ہیں مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ اور دوسری مرتبہ مٹی ڈالتے وقت وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ اور تیسری بار میں کہتے ہیں وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى ۔ چنانچہ مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "علمائے حنفیہ و شافعیہ نے لکھا ہے کہ پہلی بار میں منها خلقنكم اور دوسری بار میں وفيها نعيدكم اور تیسری بار میں ومنها نخرجكم تارة اخرى پڑھنا مستحب ہے۔

مسند احمد میں اس بارے میں ایک ضعیف حدیث آئی ہے۔ پھر حضرت مولانا مرحوم نے حاشیہ میں اس کا حوالہ یوں دیا ہے: قال القاری فی المرقاۃ جلد-۲' ص-۳۷۷ وروى احمد باسناد ضعيف انه يقول مع الاولىٰ منها خلقنكم ومع الثانية وفيها نعيدكم ومع الثالثة ومنها نخرجكم تارة اخرى۔ یعنی "ملا علی قاری نے مرقاۃ میں یہ لکھا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اسناد ضعیف کے ساتھ یہ روایت ذکر کی ہے کہ پہلی بار مٹی ڈالے تو منها خلقنكم پڑھے اور دوسری بار یہ پڑھے وفيها نعيدكم اور تیسری بار یہ پڑھے ومنها نخرجكم تارة اخرى۔"

مولانا مبارک پوری کے سیاق کلام سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اس طرح مٹی ڈالنے اور آیت کے جملوں کو اس کیفیت سے پڑھنے کے جواز کے قائل ہیں۔ (ایسے ہی امام شوکانی بھی نیل ص-۸۴ جلد-۴ نیز) اپنی تفسیر فتح القدیر جلد-۳' ص-۳۵۹ میں زیر آیت مذکورہ یہ لکھتے ہیں: وفي حديث في السنن انه اخذ قبضة من التراب فالقٰها في القبر وقال منها خلقنكم ثم اخرى وقال وفيها نعيدكم ثم اخرى وقال وفيها نخرجكم تارة اخرى۔ یعنی سنن

میں یہ حدیث ہے' نبی کریم ﷺ نے مٹی سے مٹھی بھری اور قبر میں ڈالی اور یہ پڑھا منھا خلقنکم پھر دوسری مٹھی ڈالی تو یہ پڑھا وفیھا نعیدکم پھر تیسری مٹھی بھر کر ڈالی تو یہ پڑھا ومنھا نخرجکم تارۃ اخری۔

علامہ شوکانی بلاشبہ بڑے محقق بلکہ انہیں رئیس المحققین بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان سے یہ عظیم مسامحت ہوئی کہ (غالباً بہ تبیعت حافظ ابن کثیرؒ) ایسی روایت کہ جس کا کتب حدیث میں وجود ہی نہیں ہے' سنن میں ہونا لکھ دیا۔ حالانکہ سنن اربعہ بلکہ کسی سنن میں بھی یہ نہیں پائی گئی۔ اسی طرح حافظ ابن کثیر دمشقی نے بھی جو بہت بڑے محدث اور مفسر شہرۂ آفاق ہیں' اپنی تفسیر ابن کثیر جز ثالث ص-۱۵۶ میں یہ حدیث اسی طرح "سنن" کے حوالے سے درج کر دی ہے۔ کس قدر تعجب ہے کہ سنن کیا حدیث کی کسی کتاب میں بھی یہ حدیث موجود نہیں ہے۔ یونہی ایک دوسرے کی تقلید اور حسن ظن کی بناء پر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کسی نے بھی کتب حدیث کا مطالعہ کر کے یہ غلطی ظاہر نہیں فرمائی۔

ہاں ایک مولانا عبیداللہ صاحب محدث مبارک پوری رحمانی ادام اللہ بقاہٗ نے اپنی کتاب مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ جلد-۲' ص-۵۴۴ میں ملا علی قاری کی عبارت لکھ کر اس پر یہ تبصرہ فرمایا ہے: والحدیث الذی اشار الیہ القاری لم اقف علی مخرجہ ولا علی انہ من این اخذ ھذا الحدیث ولم اجد احدا ذکرہ ولا یطمئن القلب بنقل القاری فانہ لیس من اھل ھذا الشان۔ یعنی "قبر میں مٹی ڈالنے کے بارہ میں جو حدیث ملا علی قاری نے نقل کی ہے مجھے اس پر اطلاع نہیں ہو سکی کہ اس کا مخرج کیا ہے اور قاری نے کہاں سے اخذ کی ہے اور مجھے تو کہیں نہیں ملی۔ مجھے ملا علی قاری کی نقل پر اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ اس فن کے آدمی نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے۔"

میں کہتا ہوں کہ حنفیہ اور شافعیہ اور بعض علماء اہل حدیث نے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی مکھی پر مکھی ماری ہے کہ آیت مذکورہ سورہ طٰہٰ کو تین حثیات (لپوں) میں پڑھنا عملاً سنت ٹھہرا دیا ہے اور ایک خیالی روایت کو جس کا ذکر کتب حدیث میں نہیں ہے' اس کا ثبوت پیش کر دیا ہے حالانکہ یہ طریقہ غلط ہے۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ میت کی قبر میں مٹی ڈالنے کے لیے تین لپیں بھرنا اور ہر لپ پر آیت مذکورہ کا ایک ایک جملہ پڑھنا تو بدعت کے زمرہ میں آتا ہے۔ اس لیے کہ کسی حدیث نبوی اور تعامل صحابہ کرام سے ثابت

نہیں ہے۔

چنانچہ ایک عالم مولانا علی احمد صاحب زاہد جبل پوری نے کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "احکام جنازہ"۔ اس کے ص-۲۱ پر یہ لکھا ہے: "اکثر لوگ مٹی ڈالتے وقت قرآن مجید کی یہ آیت منها خلقنكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرى پڑھتے ہیں۔ یہ بدعت ہے اور آنحضرت ﷺ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

لیکن مولانا حافظ عبداللہ صاحب محدث روپڑی نور اللہ مرقدہ باوجود کثیر العلم اور مفتی اعظم ہونے کے غلطی کر گئے۔ کتاب الصلوٰۃ حصہ دوم کے ص-۸۹ پر یہ لکھتے ہیں: "اس کے بعد گیلی مٹی سے سوراخ اچھی طرح بند کر کے مٹی ڈال دی جائے۔ ہر شخص کو کم از کم تین اونجلے (بک) مٹی ضرور ڈالنی چاہیے اور مٹی ڈالتے وقت آیت مذکورہ منها خلقنكم پڑھی جائے۔"

شاید اس کتاب کی رو سے ان کے معتقدین عموماً اس طرح سے اس آیت کو پڑھتے ہوں گے حالانکہ یہ بدعت ہے جیسے وضو کے بعد سورۃ القدر پڑھنا اور شروع نماز کے وقت تکبیر تحریمہ سے پہلے آیت انی وجهت پڑھنا بدعت ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جو علامہ ابن الہمام نے فتح القدیر باب نکاح الرقیق میں لکھی ہے۔ كثير ما يقلدون الساهون الساهين یعنی "بہت لوگ بھولنے والے بھولے ہوؤں کی تقلید کرتے چلے جاتے ہیں' خود تحقیق نہیں کرتے۔"

مسند احمد کی شرح الفتح الربانی جلد-۸' ص-۳۴ میں لکھا ہے: (قال القاضي حسين والمتولي واخرون) ليستحب ان يقول في الحثية الاولى منها خلقنكم وفي الثانية وفيها نعيدكم وفي الثالثة ومنها نخرجكم تارخ اخرى۔ یعنی "قاضی حسین اور متولی اور دیگر علماء نے یہ لکھا ہے کہ مستحب بات یہ ہے کہ قبر میں مٹی ڈالتے وقت پہلی بار منها خلقنكم پڑھے اور دوسری بار وفيها نعيدكم پڑھے اور تیسری بار وفيها نخرجكم تارة اخرى پڑھے۔"

پھر شارح علامہ احمد الساعاتی لکھتے ہیں: وقد يستدل له بحديث ابى امامة رضى الله تعالى عنه قال لما وضعت ام كلثوم بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم في القبر قال رسول الله صلى الله عليه وسلم منها خلقنكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم

تارة اخری۔ یعنی "قبر میں اس طرح مٹی ڈالنے والے نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ام کلثوم رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی قبر میں رکھی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت آیت منھا خلقنکم آخر تک پڑھی۔"

میں کہتا ہوں کہ ملا علی قاری نے جو امام احمد رحمہ اللہ کی روایت کا حوالہ دیا ہے وہ بھی ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ اس میں قبر میں تین حثیات سے مٹی ڈالنے کا ذکر نہیں بلکہ میت کو قبر میں رکھنے کا ذکر ہے کہ اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ پڑھی۔ چنانچہ مسند احمد میں یہ روایت ہے اور اس میں اس آیت کے ساتھ بسم اللّٰہ وفی سبیل اللّٰہ وعلٰی ملة رسول اللّٰہ پڑھنے کا ذکر ہے اور اس میں اینٹ روڑے لگانے اور اینٹوں کے سوراخ بند کرنے کا ذکر ہے۔

چنانچہ مولانا حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ کتاب الصلوۃ میں بسم اللّٰہ وباللّٰہ وعلٰی ملة رسول اللّٰہ میت کو قبر میں اتارنے کے وقت پڑھنے کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں اور ایک روایت میں یہ آیت بھی آئی ہے منھا خلقنکم وفیھا نعیدکم ومنھا نخرجکم تارة اخری - یہ روایت مسند احمد میں ضرور ہے۔ لیکن امام ذہبی اس روایت کی بابت فرماتے ہیں وقال الذھبی لم یتکلم علیه الحاکم وھو خبر واہ لان علی بن یزید متروک (مرعاة المفاتیح جلد ۲، ص ۵۰۴) یعنی "امام ذہبی نقد رجال میں مہارت تامہ رکھتے ہیں فرماتے ہیں یہ واہی ہے کیونکہ اس میں ایک راوی علی بن یزید متروک ہے۔"

تلخیص جلد ۱، ص ۱۶۴ میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ "سند ضعیف" کہ اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ مجمع الزوائد جلد ۳، ص ۴۳ میں ہے۔ رواہ احمد واسنادہ ضعیف۔ جب روایت ضعیف اور حدیث واہی ہے تو اس سے قبر میں مٹی ڈالنے اور تین حثیات کے وقت آیت پڑھنے پر دلیل لینا باطل ہوا۔ اس لیے الفتح الربانی میں لکھا ہے وخالف فی ذالک المالکیة والحنابلة فقالوا لا یطلب ذکر الایة او غیرھا عند حمو التراب۔ یعنی "مالکیہ اور حنابلہ نے شافعیہ اور حنفیہ کی اس بارہ میں مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ مٹی ڈالنے کے وقت آیت مذکورہ وغیرہ کچھ پڑھنا شرعاً مطلوب نہیں ہے۔"

پس مولوی اشرف علی تھانوی نے جو بہشتی زیور حصہ گیارہویں میں یہ لکھا ہے کہ مٹی تین بار ڈالے اور یہ آیت پڑھے، یہ بدعت ہے اور ان کا یہ مسئلہ غلط ہے۔ مشکوٰۃ کی حدیث

میں ہے تم دین میں نئے کاموں سے بچو۔ ہر نیا کام بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہے۔ پس جن اصولوں کی رو سے اہل بدعت کی بدعات اور رسومات حرام ہیں۔ انہی اصولوں کی رو سے یہ آیت قبر میں مٹی ڈالتے وقت پڑھنا حرام اور بدعت ہے۔ البتہ میت کو قبر میں اتارتے وقت اس آیت اور بسم اللّٰہ وفی سبیل اللّٰہ وعلی ملۃ رسول اللّٰہ کا پڑھنا ایک حدیث ضعیف سے ثابت ہے۔ اگر میری معروضات پر اہل علم حضرات کو اعتراض ہو تو اس مسئلہ کا کسی صحیح حدیث سے ثبوت پیش کریں۔ ودونہ خرط القتاد۔

عبدالقادر عارف الحصاری

الاعتصام جلد۔۲۳، شمارہ۔۳۹، مورخہ ۲۸/ اپریل سنہ۔۱۹۷۲ء

قبروں پر اذان کہنا

واضح ہو کہ شریعت محمدیہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ پر نازل فرما کر اہل اسلام کو یہ خوشخبری سنائی الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (پارہ۔۶، المائدہ) یعنی "آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی اس روحانی نعمت کو تم پر پورا فرما کر تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔" (اسی کی پابندی کرو)

اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین اسلام قرآن و حدیث کی صورت میں جمع ہوا جو نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے سپرد فرمایا۔ چنانچہ مستدرک حاکم جلد اول، ص۔۹۳ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے اجتماع عظیم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یآیھا الناس انی قد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابدا کتاب اللّٰہ وسنۃ نبیہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ "اے لوگو! میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ وہ دو چیزیں یہ ہیں: اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اس کے نبی ﷺ کی سنت (یعنی حدیث شریف)"

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان دونوں چیزوں کے تمام زندگی پابند رہے۔ اس لیے ان کا زمانہ بہترین اور پاکیزہ رہا۔ پھر وہ لوگ جنھوں نے قرآن و حدیث کا علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حاصل کیا اور ان پر اپنی پوری زندگی نہایت پابندی سے عمل

کرتے رہے۔ ان کو تابعین کہتے ہیں۔ ان کا زمانہ بھی بہتر اور پاکیزہ تھا۔ ان کے بعد جن لوگوں نے ان سے قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی اور ان پر عمل کیا ان کو تبع تابعین کہتے ہیں۔ ان کا زمانہ بھی خیر تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان تینوں زمانوں کے بہتر اور خیر ہونے کی خبر دی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اوصیکم باصحابی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم یفشوا الکذب۔ (مشکوٰۃ ص-۵۵۴) یعنی "اے لوگو! میں تم کو اپنے صحابہ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ ان کے تابع ہو کر ان کے نقش قدم پر چلنا پھر جو ان کے تابع اور ملنے والے ہیں' ان کے بارے میں وصیت ہے۔ پھر جو ان تابعین سے ملنے والے ہوں' ان کے بارے میں وصیت ہے۔ پھر ان زمانوں کے بعد جھوٹ عام پھیل جائے گا۔" یعنی پھر ایسے لوگ ظاہر ہوں گے کہ ان کے عقائد اور اعمال صحابہ کرام' تابعین اور تبع تابعین کے خلاف ہوں گے اور ان کا سلسلہ قیامت تک ردوبدل ہوتا رہے گا۔ تم ایسے لوگوں کے عقائد و اعمال کا اعتبار اور اتباع نہ کرنا کہ دن بدن اختلاف' تفرقہ اور شر قیامت تک دین میں پھیلتا جائے گا۔ کسی زمانہ کے لوگوں کے اعمال کا جو خلاف خیرالقرون ہوں کچھ اعتبار نہیں' سب باطل ہیں۔

مسلم شریف جلد اول' ص-۲۸۵' مشکوٰۃ شریف جلد اول' ص-۲۷ میں سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا خطبہ منقول ہے۔ آپ امابعد کہہ کر ارشاد فرمایا کرتے تھے: فان خیر الحدیث کتاب اللّٰہ وخیر الھدی ھدی محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ۔ یعنی "بہترین کتاب اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) ہے اور بہترین طریقہ عمل محمد مصطفیٰ ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور آپ کی سیرت طیبہ ہے۔ اور سب سے بدتر وہ کام ہیں جو شریعت الٰہی میں نئے ایجاد کئے جائیں اور ہر وہ کام جو دین میں نیا ایجاد کیا گیا وہ گمراہی ہے۔"

جو نیا کام دین اور ثواب سمجھ کر کیا جائے وہ بدعت ہے۔ اور بدعت گمراہی کا موجب ہے اور گمراہی دوزخ میں لے جانے کا موجب ہے۔ اس لیے بدعت سے بچنا واجب ہے کہ یہ شرک کے بعد تمام گناہوں سے بری اور بدترین گناہ ہے۔ پارہ-۲۱' سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو یوں خطاب فرمایا ہے: لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللّٰہ والیوم الاخر وذکر اللّٰہ کثیرا○ یعنی "تمہارے لیے اللہ کا رسول عمدہ نمونہ

ہے' اس شخص کے لیے جو امید رکھتا ہے اللہ کی اور یوم آخرت کی اور اللہ کی یاد بہت کرتا ہے۔"

پس جب اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے سیدالانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہمارے لیے اسوہ حسنہ اور عمدہ نمونہ بنا کر بھیجا ہے تو ہر عمل اسی نمونہ کے مطابق کرنا چاہیے۔ دین میں نئے کام ایجاد کرنا نہایت ہی خطرناک جرم ہے۔ اب نہایت سنجیدگی اور پورے غوروفکر کے ساتھ اذان کی بابت اسوۂ حسنہ ملاحظہ کرو۔ شرق سے غرب اور جنوب سے شمال تک پوری اسلامی دنیا پر طائرانہ نظر دوڑاؤ کہ دن رات کے پانچ مقررہ اوقات ہیں جو اذان کہی جاتی ہے' یہی اذان عہد نبوی' عہد صحابہ کرام' عہد تابعین' عہد تبع تابعین' ائمہ محدثین و فقہائے دین سے آج تک جاری اور مروج ہے۔ میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان کہنا اسوہ حسنہ میں' قرون ثلاثہ میں' ائمہ دین کے زمانے میں اس کا نام و نشان نہیں ملتا۔ اگر شریعت میں اس کا کوئی وجود ہوتا تو ضرور پانچ وقتی اذان کی طرح نماز جنازہ کے وقت' دفن کے وقت یا دفن کے بعد اذان کہنا منقول ہوتا۔ جب شریعت میں اس کا نشان ہی نہیں تو یہ کام شرالامور کی فہرست میں شمار ہو کر بدعت اور قابل رد ہوا۔ اس پر عمل کرنے والے بھی بدعتی ہوئے۔

چنانچہ مسلم شریف جلد-۲' ص-۷۷ میں حدیث ہے۔ قاسم بن محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں مجھے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد یعنی "نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہ تھا تو وہ مردود ہے۔"

ابوداؤد شریف میں حدیث ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من صنع امرا علی غیر امرنا فھو رد۔ یعنی "جس شخص نے ایسا کام کیا جو ہمارے طریقہ کے خلاف ہو' وہ مردود ہے۔"

نبی علیہ السلام اور صحابہ کرام دفن میت کے بعد دعا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس میت کو فرشتوں کے حساب لینے پر ثابت قدم رکھے۔ دفن میت کے بعد قبر پر اذان کہنا طریقہ نبوی اور عمل صحابہ کرام کے خلاف ہے' لہٰذا بدعت ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی اپنی کتاب ردالمحتار عرف شامی جلد-۱' ص-۶۵۹ میں لکھتے ہیں: وفی الاقتصار علی ماذکر من الوارد

اشارة انه لا یسن الاذان عندا دخال المیت فی قبره کما هو المعتاد الان وقد صرح ابن حجر فی فتاویٰ بانه بدعة یعنی "پہلے جو کچھ ذکر کیا گیا ہے کہ قبروں کی زیارت اور دعا مشروع ہے' اس پر اقتصار کرنا چاہیے۔ اس میں اس بات پر اشارہ ہے کہ میت کے دفن کے وقت قبر پر اذان کہنا مسنون نہیں ہے جیسا کہ اب بعض لوگوں میں رواج ہے۔ حافظ ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں یہ صراحت کی ہے کہ یہ مروجہ اذان بدعت ہے۔"

حنفیہ کی کتاب درر البحار ---- میں ہے: من البدع التی شاعت فی الهند الاذان علی القبر بعد الدفن۔ یعنی "ان بدعات میں سے جو ملک ہند میں رائج ہیں' ایک بدعت یہ ہے کہ دفن میت کے بعد قبر پر اذان کہتے ہیں۔" بریلویوں کی کتاب "جاء الحق" ص-۳۰۳ میں لکھا ہے: وقد صرح ابن حجر بانه بدعة وقال من ظن انه سنة فهو غیر مصیب۔ یعنی "امام ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ تصریح کر دی ہے کہ یہ اذان بدعت ہے جو اس کو سنت خیال کرتا ہے' وہ صحیح نہیں غلط ہے۔"

پس علمائے حنفیہ اور علمائے شافعیہ سب کے نزدیک اذان علی القبر بدعت قرار پائی تو اس بدعت کے کرنے والے بھی بدعتی ہوئے۔ حدیث میں ہے کہ بدعتی کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ نہ نماز' نہ روزہ' نہ حج' نہ زکوٰۃ وغیرہ۔ چنانچہ ابن ماجہ میں حدیث ہے: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ابی الله ان یقبل عمل صاحب بدعة حتّٰی یدع بدعته۔ یعنی "اللہ تعالیٰ نے بدعتی کا عمل قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ جب تک کہ وہ بدعت سے تائب نہ ہو۔"

بدعت کی تعریف یہ ہے جو حنفیہ کی کتاب عمدۃ القاری جلد-۵' ص-۳۵۶ میں درج ہے۔ والبدعة فی الاصل احداث امر لم یکن فی زمن رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ یعنی "بدعت اصل میں نئی چیز پیدا کرنے کا نام ہے جو زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ تھی۔"

فتح الباری شرح صحیح البخاری جلد-۴' ص-۲۱۹ میں علامہ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: والبدعة اصلها ما احدث علی غیر مثال سابق وتطلق فی الشرع فی مقابل السنة فتکون مذمومة۔ یعنی "بدعت اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جو بغیر کسی پہلے نمونہ کے نئی پیدا کی گئی ہو۔ شریعت کی اصطلاح اور محاورہ میں بدعت کا اطلاق سنت کے مقابلہ میں ہوتا ہے' اس لیے بدعت بری ہوتی ہے۔"

میں کہتا ہوں عرس کرنا' گیارہویں کرنا' مولود مروجہ کرنا' میت کا چالیسواں کرنا' تیجہ کرنا' ساتواں کرنا' جمعرات منانا کہ اس رات میں روحیں حاضر ہوتی ہیں' شب برات کو حلوہ وغیرہ پکانا' قبر کو پختہ کرنا اور ان پر گنبد بنانا' خانقاہ بنانا' مریدوں کا نذریں دینا' اولیاء کی منت ماننا' مسجدوں میں نقارہ بجانا' جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھ کر پھر ظہر احتیاطی پڑھنا' جمعہ کے دن تین خطبے دینا' نماز عید مسجدوں میں پڑھنا جیسا کہ آج کل مروج ہے' قبروں پر چراغ جلانا' قبروں کا طواف کرنا' کھانے پر ختم پڑھنا' میت کے گھر قل پڑھنا' وہاں کلمہ پڑھنا' اذان سن کر انگوٹھے چومنا' میت کے گھر فرش بچھا کر فاتحہ خوانی کرنا' ائمہ دین میں سے ایک ایک امام کا انتخاب کرنا' ان کی تقلید کرنا اور ان کے نام کے مذہب بنانا' کفنی لکھنا' قضا عمری پڑھنا' نماز معکوس پڑھنا' میت کا اسقاط کرنا' درود ہزاری اور درود تاج پڑھنا' دعا سریانی اور دعا گنج العرش وغیرہ وغیرہ بیشمار بدعات ہیں جن کا نام و نشان نبی ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں نہ تھا۔ یہ سب بدعات خیرالقرون کے بعد اہل بدعت نے اپنی اپنی رائے اور دین میں قیاس دوڑا کر ایجاد کی ہیں اور نبوی سکہ کے مقابلہ میں اپنا جعلی سکہ جاری کیا ہے۔ یہ اختراع دین اسلام پر افترا ہے۔ ان چیزوں کا اسلام میں کوئی وجود نہیں ہے بلکہ مقلدین نے اپنی رائے سے یہ بدعات کا فتنہ قائم کیا ہے۔

مجمع الزوائد جلد ۱' ص ۱۷۹ میں عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ستفترق امتی علی بضع وسبعین فرقة اعظمهم فرقة قوم یقیسون الامور برایهم فیحرمون الحلال ویحللون الحرام۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت ستر (۷۰) سے زیادہ کئی فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سب سے زیادہ افتراق ڈالنے میں وہ قوم ہو گی جو دینی امور میں اپنی رائے سے کام لے کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرے گی۔"

دین میں رائے سے مسائل نکالنے والوں کو محدثین نے اصحاب الرای واہل الرای کا لقب دیا ہے۔ مثلاً نکاح حلالہ حرام ہے۔ اہل الرای اس کو ثواب جانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ محلل طلاق دہندہ پر احسان کر کے ماجور ہو گا۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ برہنہ۔ اسی طرح غیر اللہ کے تقرب کے لیے جو اشیاء غیر کے نام پر پکاری گئیں' وہ سب حرام ہیں لیکن فرقہ غالیہ ان کو حلال کہتا ہے۔ اسی طرح جو بدعات پہلے ذکر ہوئی ہیں' وہ سب ممنوع ہیں لیکن فرقہ غالیہ ان

کو جائز سمجھ کر کرتا ہے جن کی ان کے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ محض رائے سے ان کے مولویوں اور پیروں نے یہ رسمیں ایجاد کی ہیں۔ محض تقلیداً ان پر عامل ہو گئے' یہ تقلید شرک ہے۔

چنانچہ حنفیہ کی معتبر کتاب مجالس الابرار میں لکھا ہے: فمن احدث شیئا یتقرب به الی اللّٰه من قول او فعل من غیر ما شرعه اللّٰه تعالٰی فقد شرع فی الدین مالم یاذن به اللّٰه تعالٰی فمن تبعه فقد اتخذه شریکا ومعبودا کما قال اللّٰه تعالٰی فی حق اهل الکتاب اتخذوآ احبارهم ورهبانهم اربابا من دون اللّٰه۔ یعنی "جس شخص نے قول یا فعل سے کوئی ایسی چیز ایجاد کی جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے مشروع نہیں کیا تھا تو اس نے بغیر اذن الٰہی کے دین میں اپنی شریعت ایجاد کی پس جو لوگ ایسے موجد کی تقلید کرتے ہیں' وہ اس کو اللہ تعالیٰ کا شریک اور اپنا معبود بناتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے حق میں فرمایا کہ انہوں نے اپنے علماء اور پیرومشائخ کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب بنا لیا ہے۔"

آگے لکھتے ہیں: فقال عدی بن حاتم للنبی علیه السلام ما عبدوه فقال علیه السلام اطاعوهم فمن اطاع احدا فی دین لم یاذن به اللّٰه فقد عبده واتخذه ربا۔ "عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ (جو کہ اس وقت تک عیسائی تھے) نے کہا کہ یارسول اللہ یہ غلط الزام ہے ہم ان کو اپنا پیشوا جانتے ہیں' معبود نہیں جانتے اور نہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔ تب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ تم نے ان کی بغیر اذن الٰہی کے تقلید کی پس جو شخص دین الٰہی میں بغیر اذن الٰہی کے کسی کی تقلید کرے' وہ اس کی عبادت کرتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کا شریک بناتا ہے۔"

پھر مصنف مجالس الابرار حنفی المذہب لکھتے ہیں: فعلم من هذا ان کل بدعة فی العبادات البدنیة المحضة لا تکون الا سیئة۔ یعنی "ہماری تصریح مذکورہ بالا سے معلوم ہوا کہ عبادات بدنیہ میں جو بدعت ہو گی وہ سیئہ ہو گی' حسنہ نہیں ہو سکتی۔"

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ام لهم شرکآء شرعوالهم من الدین مالم یاذن به اللّٰه۔ یعنی "کیا ان کے واسطے اللہ تعالیٰ کے ایسے شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں جو ان کے لیے بغیر اذن الٰہی کے دین میں شریعت بنا کر دیتے ہیں؟"

اس سے ظاہر ہے کہ جو پیر' ملا مولوی' علماء' مشائخ اپنی طرف سے عبادات اختراع کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیتے ہیں' یہ سب مشرک ہیں- کیونکہ شریعت مقرر کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے- جیسا کہ ارشاد ہے: لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا- یعنی "ہم نے تم سب کے لیے شریعت اور دین میں چلنے کا راستہ مقرر کر دیا ہے-" اب اس دین اور شریعت میں جو شخص اپنی طرف سے کمی بیشی کرتا ہے' ایسے لوگ کافر ہیں کیونکہ قرآن مجید ناطق ہے: ومن لم یحکم بمآ انزل اللّٰه فاولٰئک هم الکٰفرون○ یعنی "جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق حکم نہیں کرتے' وہ کافر ہیں-"

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا- فعلیکم بسنتي وسنة الخلفآء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة- (سنن ابی داؤد جلد-۲) یعنی "اختلاف کے وقت تم میری سنت اور میرے خلفاء کی سنت کو لازم پکڑ لینا اور خوف مضبوطی سے قابو رکھنا اور تم دین میں نئی نئی چیزوں سے بچنا کیونکہ ہر نئی چیز دین میں بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے-"

اس حدیث شریف کی رو سے اہل بدعت نے جو جو رسمیں نکالیں ہیں' وہ سب بدعت ہیں- ان سے بچ کر سنت نبوی پر عمل کرو کہ قبر میں میت کو دفن کر کے دعا کرو- یہ نبی ﷺ سے ثابت ہے- قبر پر اذان کہنا اہل بدعت نے ایجاد کیا ہے- لطف یہ ہے کہ اس پر شرعی دلیل بھی قائم نہ کر سکے- اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث میں قبر پر اذان پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے- یہ بریلوی حضرات کی ایجاد و تجویز کردہ بدعت ہے' اس سے بچنا واجب ہے- اگر یہ کار ثواب ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر ضرور عمل کرتے- انہوں نے میت دفنانے کے وقت ایسا نہیں کیا-

کتاب السنن والمبتدعات متعلقہ اذکار و صلوات کے ص-۵ اور الاعتصام علامہ شاطبی کے ص-۳۲ میں ہے: قال حذیفة رضی اللّٰه عنه کل عبادة لم یتعبدها اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فلا تعبدوها فان الاول لم یدع للاخر مقالا فاتقوا اللّٰه یامعشر القرآء خذوا بطریق من کان قبلکم- یعنی "حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر وہ عبادت جس کو نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے نہیں کیا وہ عبادت مت کرو کیونکہ سلف صالحین

نے متاخرین کے لیے تعبدی امور میں دخل دینے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اے قاریو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سلف صالحین کے نقش قدم پر چلو (بدعتیں نہ نکالو)"

یہ جو اہل بدعت کہتے ہیں کہ نیکی کو اور نیک کام کو بڑھانا جائز ہے۔ یہ عقیدہ اور قول سراسر باطل ہے۔ ایسی نیکی اور کام جو امور داعیہ کے ہوتے ہوئے آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام نے نہ کیا ہو' وہ نیکی اور نیک کام نہیں ہے بلکہ بدعت اور گناہ ہے۔ اگر کوئی مسجد میں ایسا کام کرے تو اس کو مسجد سے نکال دینے کا حکم ہے۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب شامی جلد۔۵' ص۔۳۵۰ میں لکھا ہے: عن فتاوی قاضی خان انه حرام لما صح عن ابن مسعود انه اخرج جماعة من المسجد یهللون ویصلون علی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم جهرا وقال لهم ما اراکم الا مبتدعین۔ یعنی "فتاویٰ قاضی خان سے یہ منقول ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا حرام ہے کیونکہ صحیح روایت ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ بلند آواز سے کلمہ لا الہ الا اللہ اور بلند آواز سے نبی ﷺ پر مسجد میں درود شریف پڑھ رہی تھی تو ان کو مسجد سے نکال دیا اور فرمایا میں تم کو بدعتی سمجھتا ہوں۔" (مسجدوں میں بدعتیوں کا کوئی کام نہیں) اس سے ثابت ہوا کہ قبر پر اذان کہنے والوں کو قبرستان سے اور اذان سے پہلے یا بعد صلوٰتین کہنے والوں کو مسجدوں سے نکال دینے کا حکم ہے۔

پس خلاصہ کلام یہ کہ میت کی قبر پر اذان کہنے کا نبی ﷺ نے حکم نہیں فرمایا۔ نہ ہی صحابہ کرام نے ایسا کیا' اس لیے بدعت اور ناقابل عمل ہے' فقط

عبدالقادر عارف الحصاری

صحیفہ اہل حدیث جلد۔۵۴' شمارہ۔۲' مورخہ ۱۹/ محرم سنہ۔۱۳۹۵ھ

مسئلہ تزاور الاموات فی قبورھم

مردوں کا آپس میں زیارت کرنا

قابل توجہ مولانا احمد حسین صاحب نامہ نگار تنظیم اہلحدیث

ناظرین کرام! اس مسئلہ کے متعلق اخبار تنظیم نمبر۱' جلد-۳' مطبوعہ ۱۴/ ذیقعد سنہ-۱۳۵۲ھ میں ایک مضمون بعنوان تحقیق الکلام فی قول المشہور کلام الموتی مع الموتی فی القبور درج ہوا ہے- جو مولانا احمد حسین مدظلہ العالی کی جانب سے ہے- آنجناب نے جو کچھ محققانہ طریق پر لکھا ہے' وہ بجا اور صحیح ہے- صرف ایک مسئلہ میں مجھے لغزش اور غلطی معلوم ہوتی ہے- جس کے متعلق آنجناب کی خدمت میں نظرثانی کرنے کی گذارش کرتا ہوں- وہ مسئلہ یہ ہے کہ ارواح آپس میں ملاقات نہیں کرتے اور ایک دوسرے سے مل کر باتیں نہیں کرتے ہیں-

چنانچہ آپ فرماتے ہیں "اور نہ ہی روحیں آپس میں باتیں کرتی ہیں- ان کو تو اپنی مصیبت کا بوجھ اٹھانا ہو گا-" ص-۱۰' کالم-۲ اور کالم-۳ میں فرماتے ہیں: "غور کا مقام ہے ایسے نازک وقت اور ایسے سنگین پہرے اور ایسی قیامت کی مصیبت سے کون سی روح جمعرات کے دن گھر کو آجائے گی یا آپس میں ایک دوسری روح سے حالات دریافت کرے گی' انتہی کلامہ-"

یہ مسئلہ تو بیشک صحیح ہے کہ مردوں کی روحیں دنیاوی گھروں میں نہیں آتی ہیں- کیونکہ اس کے متعلق جو بعض روایات اہل بدعت پیش کرتے ہیں' وہ موضوع ہیں- چنانچہ موضوعات کبیر میں علامہ ملا علی قاری حنفی فرماتے ہیں: ان المیت یری الناس فی بیته سبعة ایام قال البیهقی فی مناقب احمد سئل عنه احمد فقال باطل لا اصل له قال السخاوی وینظر معناه قال النووی فی متنه کلام مظلم و واضعه مجرم قبح اللّٰه من وضعه ولا برد مضجعه انتهٰی- یعنی "یہ روایت کہ میت اپنے گھر آکر سات روز لوگوں کو دیکھتی ہے- امام احمد نے اس کو باطل فرمایا ہے اور کہا ہے کہ اس کا کوئی اصل نہیں ہے- اور

امام سخاوی نے کہا ہے کہ اس کے معنوں ہی کی غرابت پر نظر غور کرلو تو ظاہر ہو جائے گا کہ یہ بے اصل ہے اور امام نووی نے کہا ہے کہ اس روایت کے متن میں کلام مظلم ہے اور واضع اس کا مجرم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے بنانے والے کا برا کرے اور اس کی قبر کبھی سرد نہ ہو۔"

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ گھر میں روح آنے کی روایت موضوع ہے۔ پس اس کی بنا پر یہ اعتقاد نہیں رکھا جا سکتا کہ روح گھر میں آتی ہے اور نہ ہی اس بنا پر صدقہ کیا جا سکتا ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ روحیں آپس میں ملاقات کرتی ہیں یا نہیں؟ سو اس کے متعلق میری تحقیق یہ ہے کہ روحیں آپس میں ملاقات کرتی ہیں۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب اپنے رسالہ قصیۃ المقدور علی فتنۃ المقبور ص-۲۱ میں فرماتے ہیں۔ فصل روح میت مومن کی ارواح دیگر مومنین سے ملاقات کرتی ہے۔

ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں روح مسلمان کی جب قبض کرلی جاتی ہے تو اہل رحمت بندگان الٰہی میں سے اس کی ملاقات کرتے ہیں' جس طرح دنیا میں کسی آنے والے سے ملاقات کی جاتی ہے۔ آپس میں کہتے ہیں کہ ذرا اس اپنے یار کو فرصت دو کہ آرام لے۔ وہ کمال رنج و شدت میں تھا۔ پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ فلاں فلاں کیا کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ وہ مجھ سے پہلے مرچکا ہے تو افسوس کرتے ہیں۔ انا للہ کہتے ہیں۔ پھر یہ کہتے ہیں کہ اس کو طرف ہاویہ یعنی دوزخ کے لیے گئے۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط) یعنی جب تو وہ آکر ہم سے نہیں ملا۔ اگر بخشا ہوتا تو ہم سے اس کی ملاقات ہوتی۔ یہ بھی حضرت نے فرمایا ہے کہ حال تمہارے اعمال کا تمہارے اقرباء اور قوم سے جو پہلے مرچکے ہیں کہا جاتا ہے (تا آخر) ملاقات کرنا مردوں کا جو پہلے مرچکے ہیں اور خوش ہونا ان کا ملاقات مردہ حال سے اور استقبال کرنا بیٹے کا جو پہلے مرچکا ہے باپ کو جس طرح کہ کسی غائب کا استقبال کرتے ہیں۔ احادیث میں آیا ہے۔ انتہی کلام بعینہ۔

نیز نواب مرحوم اپنے رسالہ ثمار التنکیت میں اس مسئلہ پر مندرجہ ذیل حدیث پیش کرتے ہیں: عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسنوا اکفان موتاکم فانھم یتباسون ویتزاورون فی قبورھم اخرجہ الحارث بن ابی اسامۃ والدیلمی فی الدرایۃ والعقیلی وعن ابی ھریرۃ مرفوعا خزیمہ عند ابن عدی واخرج مسلم فی

صحیحه اذا دفن احدکم اخاه فلیحسن کفنه ونحوه مرفوعا عن انس وزاد فانهم یتزاورون فی اکفانهم اخرج العقیلی والطحاوی فی التاریخ ومثله عن ابی قتادة مرفوعا عند النسائی وابن ماجة ومحمد بن یحیی الهمدانی فی صحیحه وابن ابی الدنیا والبیهقی فی شعب الایمان۔ یعنی "حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں کو کفن اچھا دو کیونکہ وہ فخر کرتے ہیں اور آپس میں ملاقات کرتے ہیں اپنی قبروں میں۔ بیان کیا اس حدیث کو حارث بن ابواسامہ نے اور دیلمی نے درایہ میں اور عقیلی نے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً اسی طرح مروی ہے۔ نکالا اس کو عقیلی نے اور طحاوی نے تاریخ میں اور اسی کی مثل نسائی اور ابن ماجہ میں ہے۔ اور محمد بن یحییٰ ہمدانی نے اپنی صحیح میں اور ابن ابی الدنیا نے اور بیہقی نے شعب الایمان میں بیان کیا ہے۔"

پھر نواب صاحب مرحوم نے علامہ ابن القیم کی کتاب الروح سے یہ عبارت نقل کی ہے:

الارواح قسمان معذبه ومنعمة فاما المعذبه فهی فی شغل عن التزاور والتلاقی واما المنعمة المرسلة غیر المحبوسة فتلاقی وتتزاورو تتذاکر ماکان منها فی الدنیا فیکون کل روح منها مع رفیقها التی علی مثل عملها و روح نبینا صلی اللّٰہ علیه وسلم فی الرفیق الاعلٰی قال تعالٰی ومن یطع اللّٰہ والرسول فاولٰئک مع الذین انعم اللّٰہ علیهم الایه وهذا المعیة ثابتة فی الدنیا وفی البرزخ وفی دارالجزاء والمعاد مع من احب فی هذا الدور الثلاث انس۔ یعنی "روح دو قسم ہیں۔ ایک منعم دوم معذب۔ معذب تو عذاب میں گرفتار ہیں۔ ان کو تو ملاقات کی فرصت نہیں ہے اور منعم جو غیر محبوس اور آزاد ہیں وہ ملاقات کرتے ہیں اور آپس میں زیارت کرتے ہیں اور دنیاوی حالات کا ذکر کرتے ہیں۔ پس ہر روح اپنے اس ساتھی کے ہمراہ ہو گا جس ساتھی کی مثل عمل کرتا رہا ہے۔ ہمارے نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روح اطہر رفیق اعلیٰ کے ساتھ ہے پس جو شخص اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے گا' وہ ان لوگوں کے ہمراہ ہو گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے۔ انبیاء اور صدیق اور شہید اور صلح لوگ۔ پس یہ میت دنیا اور برزخ اور آخرت میں ہو گی۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ انسان ان ہی لوگوں کے ساتھ ملحق کیا جائے گا جن سے دوستی رکھتا ہے۔"

پھر علامہ ابن القیم نے یہ بھی فرمایا ہے ان شواهدها وادلتها اکثر من ان یحصرها الا اللّٰہ تعالٰی۔ یعنی "اس مسئلہ پر اس قدر دلائل اور شواہد ہیں کہ ان کا حصر اللہ تعالیٰ کے سوا

کوئی نہیں کر سکتا۔" پھر نواب صاحب نے شہدا اور صلحاء کا التقا بیان کیا ہے۔ اس طرح علامہ ابن القیم نے کتاب الروح میں اس کی تصریح کی ہے۔ جناب حافظ محمد صاحب مرحوم لکھوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی احوال الآخرت میں فرمایا ہے کہ ملاقات ہوتی ہے ؎

میت نواں جے آوے کوئی اگلے پچھلے خبراں
آپو اپنیاں یاراں خویشاں خبراں پچھن وچہ قبراں

پھر حاشیہ پر اس کا ثبوت لکھا ہے کہ مشکوۃ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مومن کے روح کے ذکر میں ہے کہ فرشتے اس کو مومنین کی ارواح میں لے جاتے ہیں تو ارواح بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ جس کا خویش سفر میں گیا ہوا گھر میں واپس آجاتا ہے۔ تو پھر اس روح سے پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص کا کیا حال ہے؟ پھر کہتے ہیں اسے چھوڑو یہ دنیا کے غم میں تھا۔ تو وہ نووارد روح بتاتی ہے کہ وہ شخص تو مرچکا ہے۔ کیا تمہارے پاس نہیں آیا؟ وہ کہتے ہیں کہ اسے اس کے اعمال ہاویہ کے پاس لے گئے۔ (احمد' نسائی)

اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ارواح کی باہم ملاقات ہوتی ہے۔ مولوی احمد حسین صاحب ارواح انبیاء اور شہدا کی ملاقات مانتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ "ہاں یہ پاک ارواح آپس میں ملتی ہیں۔ جیسا کہ پیغمبر علیہ السلام سے معراج کی رات انبیاء کرام سے ملاقاتیں ہوئیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس طرح معراج کی حدیث میں وارد ہے کہ آدم علیہ السلام کے دست راست کی جانب ارواح مومنین موجود تھیں جن کو دیکھ کر آدم علیہ السلام ہنستے تھے اور دست چپ (بائیں) کی جانب ارواح کفار تھیں جن کو دیکھ کر حضرت آدم علیہ السلام روتے تھے۔ پس ہر دو قسم ارواح کا دائیں اور بائیں جانب مجتمع ہونا ملاقات کو مستلزم ہے۔ ماھو جوابکم من ارواح الانبیاء فھو جوابنا من ارواح المسلمین فتامل۔

مخفی نہ رہے کہ انبیاء اور شہداء کے مقام استقرار متفاوت ہے۔ لیکن تاہم مولوی احمد حسین صاحب ان کی ملاقات کے قائل ہیں۔ اسی طرح مومنین کے منازل بھی متفاوت ہیں لیکن ہم ملاقات کے قائل نہیں۔ ثمار التنکیت میں ہے: عن ضمرة ابی خبیب قال سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ارواح المومنین فقال فی طیر خضر تسرح فی الجنة حیث شات قالوا یارسول اللہ فارواح الکفار قال محبوسة فی سجین اخرج

الطبرانی- یعنی "ضمرہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ارواح مومنین کہاں ہیں؟ تو آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ سبز پرندوں کی شکل میں جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں- پھر سوال ہوا کہ کفار کے ارواح کہاں ہیں؟ تو آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ سجین میں قید ہیں-"

ارواح مومنین کاملین جنت میں ہونے کے متعلق یہ آیت کریمہ بھی نص ہے- یایتھا النفس المطمئنة ارجعی الٰی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (سورہ فجر) یعنی "اے اطمینان والی روح لوٹ جا اپنے رب کی طرف تو اس سے راضی ہے وہ تجھ سے خوش ہے- میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں چلی جا-"

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ دنیا سے نکلنے کے وقت میت کو بشارت دی جاتی ہے- چنانچہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں آنحضور ﷺ نے اس آیت کے پڑھے جانے کے متعلق فرمایا تھا: ان الملک سیقول لک عند الموت اخرجه عبد بن حمید وابن جریر وابن ابی حاتم وابن مردویه وابو نعیم فی الحلیة- یعنی یہ تجھے موت کے وقت فرشتہ کہے گا- نیز ابن ابی حاتم سے ابن کثیر میں منقول ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عباس مفسر القرآن رضی اللہ عنہ کا انتقال طائف میں ہوا تو ایک پرندہ آیا جس جیسا پرندہ کبھی زمین پر دیکھا نہیں گیا تھا- وہ نعش میں چلا گیا- پھر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا- جب دفن کیا گیا تو قبر کے کونے سے یہ آواز آئی کہ کوئی اس آیت کی تلاوت کر رہا ہے لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کون پڑھ رہا ہے- طبرانی میں بھی یہ روایت موجود ہے- (جامع البیان)

اگر بعض تفسیروں میں یہ وارد ہوا کہ یہ قیامت کے دن کہا جائے گا تو یہ اس کے مخالف اور منافی نہیں ہے- ہم ہر دو امر کے وقوع کے قائل ہیں- جیسے مومن کامل کو بروز حشر جنت میں داخل ہونے کا حکم ہو گا- اسی طرح مومن کامل کے روح کو جنت میں داخل ہونے کا حکم ہو گا- ارواح مومنین کے جنت میں داخل ہونے پر ایک دلیل یہ حدیث ہے: عن کعب بن مالک ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال انما نسمة المومن طائر تعلق فی شجر الجنة حتی یرجعه اللّٰه الی جسده یوم یبعثه ابن القیم گفته وهذا من صحاح الحادیث وان لم یخرجه صاحب الصحیح (ثمار)- یعنی "کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا مومن کی روح پرندہ کی شکل میں جنت کے درختوں میں لٹکائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بروز حشر اپنے جسم کی طرف لوٹائی جائے گی۔ یہ حدیث احادیث صحیحہ سے ہے۔ اگرچہ شیخین نے اس کو اپنی کتابوں میں بیان نہیں کیا۔"

اب اگر مولوی احمد حسین صاحب یا دیگر کوئی اہل علم وہ روایات پیش کرے جن میں بعض ارواح کے لیے دیگر منازل متفاوتہ کا ذکر ہے تو وہ اس مسئلہ کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے محل پر درست ہیں۔ کیونکہ انبیاء اور شہداء کی طرح مومنین صالحین کے جس طرح مراتب متفاوت ہیں' اسی طرح ان کے منازل متفاوت ہیں۔ اور شہدا کے منازل بھی متفاوت ہیں۔ ہر ایک شہید شہداء سے ملاقات نہیں کر سکتا۔

كما في المسند عن عبدالله بن محمد بن جحش ان رجلا جاء الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يارسول الله مالي ان قتلت في سبيل الله قال جنة ثم ولى فقال الا الدين سارني به جبرائيل انفا ومنهم من يكون محبوسا علٰى باب الجنة كما في الحديث الاخر رايت صاحبكم محبوسا علٰى باب الجنة ومنهم من يكون محبوسا في قبره لحديث صاحب الشملة التي غلها ثم استشهد فقالوا هنيئا له الجنة فقال النبي صلى الله عليه وسلم كلا والذي نفسي بيده ان الشملة التي غلها لتشتعل عليه في قبره نار او منهم من يكون مقوه بباب الجنة كما في حديث ابن عباس ان الشهداء علٰى بارق فهو بباب الجنة في قبة خضراء يخرج لهم رزقهم من الجنة بكرة وعشية رواه الامام احمد۔ (ثمار التنكيت) یعنی مسند احمد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ اگر میں اللہ کے رستہ میں قتل کیا جاؤں تو مجھے کیا اجر ملے گا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جنت۔ جب وہ پیٹھ کر کے چلا مگر قرض یعنی جس نے قرض دینا ہو' وہ نہیں جا سکتا یہ جبرائیل علیہ السلام نے مجھے ابھی بتایا ہے۔ بعض شہید جنت کے دروازے پر مقید ہیں۔ جیسے ایک حدیث میں وارد ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں نے تمہارے ساتھی کو جنت کے دروازے پر محبوس دیکھا ہے (یہ مدیون تھا) بعض شہید وہ ہیں جو قبر میں محبوس ہیں۔ جیسے حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص مقتول فی سبیل اللہ کو لوگوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو۔ پس آنحضور ﷺ نے یہ سن کر فرمایا خبردار! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ چادر جو اس نے مال غنیمت سے

خیانت کر کے لی تھی وہ قبر میں اس کے اوپر آگ کے شعلہ مارنے کا موجب ہو رہی ہے۔ اور بعض شہید وہ ہیں جن کی جائے استقرار دروازہ جنت پر ہے۔ جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں وارد ہے کہ شہداء دروازہ جنت کے ساتھ چمکتی ہوئی نہر پر ایک سبز قبہ میں ہیں جن کو صبح و شام جنت سے رزق دیا جاتا ہے۔

بہرحال شہداء کے حسب شہادت و اعمال مراتب متفاوت ہیں جس کی وجہ سے منازل بھی متفاوت ہیں۔ اسی طرح انبیاء کرام کے درجات اور منازل ہیں۔ چنانچہ شب معراج میں مختلف مقامات پر آنحضرت ﷺ نے ملاقات کی تھی۔ سب سے ایک جگہ نہیں کی تھی لیکن بایں ہمہ مولوی احمد حسین صاحب انبیاء اور شہداء کی ملاقات باہمی کے قائل ہیں۔ اگر مومنین صالحین کے ارواح کی ملاقات باہمی کے بھی قائل ہو جائیں تو کیا حرج ہے اور کیا اشکال ہے؟

مولوی احمد حسین صاحب نے ارواح مومنین کی عدم ملاقات پر واقعہ عزیر علیہ السلام سے استدلال کیا ہے' جو بالکل غلط ہے۔ ہاں یہ ارواح انبیاء کی عدم تلاقی پر استدلال صحیح ہے جو مولوی احمد حسین صاحب کے مسلک کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ پاک ارواح آپس میں ملتی ہیں۔ جب ملتی ہیں تو نبی عزیر --- علیہ السلام ایک سو برس تک مرا رہا۔ ہزاروں انبیاء ان سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ نہ ہی ان سے اس نبی کی روح ملی اور نہ ہی بات چیت کی اور نہ ہی ان ارواح کا اس نبی کو پتہ لگا۔ بلکہ جب مولا کریم نے اس کو سو برس کے بعد زندہ کیا تو دریافت کرنے پر جواب دیا کہ مجھ کو تو اتنا علم ہے کہ یہاں پر میں ایک دن سویا رہا ہوں یا نصف دن یا کچھ معلوم نہیں۔ ماهو جوابکم فی هذا المقام فهو جوابنا بالاخر۔

مولانا احمد حسین صاحب کی خدمت بابرکت میں نہایت ادب سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ پر نظرثانی بغور فرمائیں کیونکہ ہم سے پہلے جو محققین ہوئے ہیں وہ ارواح مومنین کی آپس میں ملاقات کرنے کے قائل ہیں۔ زیادہ تحقیق گوارا نہ فرمائیں تو علامہ ابن القیم کی کتاب الروح ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ ہماری تحقیق تو یہ ہے کہ ارواح فجار معذبین تو عذاب میں گرفتار ہیں' ان کو تو اس شغل کی وجہ سے آپس میں ملاقات کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اور ارواح انبیاء اور شہداء اور صالحین کاملین کی باہمی ملاقات ہوتی ہے' بشرطیکہ ان کا درجہ اور

مقام استقرار متحد ہوں۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری از سگا ضلع حصار

تنظیم اہل حدیث روپڑ ضلع امرتسر جلد۔۳' شمارہ۔۵' مورخہ ۲۹ مارچ سنہ۔ ۱۹۳۴ء

کیا قبرستان میں قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر مردوں کو ایصال ثواب کر سکتے ہیں؟

سوال : ابو محمد سمرقندی نے سورۃ اخلاص کے فضائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ (ترجمہ) یعنی جو شخص قبرستان میں گذرا اور قل ھو اللہ احد○ گیارہ (۱۱) مرتبہ پڑھا پھر اس کا اجر مردوں کو بخشا تو دیا جائے گا وہ ثواب سے برابر گنتی مردوں کی۔ دوسری حدیث قاسم بن سعد بن علی انجانی نے اپنے فوائد میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص قبرستان میں داخل ہوا پھر سورہ فاتحۃ الکتاب اور قل ھواللہ اور الھاکم التکاثر کو پڑھا پھر کہا الٰہی کیا میں نے ثواب اس چیز کا جو پڑھا کلام اللہ سے واسطے قبرستان والوں مردوں مومن عورتوں کے مگر ہوں گا شفاعت کرنے والے اس کا۔ سوال یہ ہے کہ دونوں احادیث پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

سائل ابو عبدالوکیل عبدالحمید قریشی باول والے قائد آباد کراچی

جواب : یہ احادیث غیر معتبر کتابوں کی ہیں جن کی سند ثابت نہیں ہے۔ ایصال ثواب صدقہ مالی سے کرو یا دعا کرو یا قرآن گھر پڑھ کر ایصال ثواب کرو تو جائز ہے۔ اصل اموات کے حق میں صدقہ مالی اور دعا کرنا کتب حدیث صحاح ستہ سے ثابت ہے۔ اس پر عمل چاہیے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری --- الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص۔۱۴۹

صاحب میت کتنے دن اپنے گھر روٹی نہ پکائے؟

سوال : اگر گھر میں میت ہو جائے تو کتنے دن میت والا گھر روٹی نہ پکائے؟ کتنے دن تک وہ کنبہ کے گھر سے روٹی کھا سکتا ہے؟ واپسی بمعہ حدیث شریف حوالہ تحریر کریں ازحد تاکید ہے۔ جناب کے جواب کا مشکور' انتظار میں ہوں اور دیگر تمام جماعت اہلحدیث ڈونگہ بونگہ کی طرف سے آپ کو السلام علیکم قبول ہو۔ اور حدیث کا پوری طرح سے حوالہ دے کر مسئلہ تحریر کریں' فقط والسلام۔

منشی نور محمد چوہان خادم جماعت اہلحدیث ڈونگہ بونگہ ضلع بہاولنگر

جواب: میت والے غم و صدمہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے رشتہ داروں یا دیگر مسلمانوں سے کوئی ازراہ ہمدردی کھانا پکا کر دے دے تو ان کو ثواب ہے۔ کوئی ایک دن دے دے یا دو دن دے دے' کوئی خاص تعداد مقرر نہیں ہے۔ لیکن یہ اس لیے نہیں ہے کہ میت والوں کو اپنے گھر کھانا پکانا ناجائز ہے۔ اگر وہ چاہیں تو پکا سکتے ہیں۔ یہ صرف ان کی ہمدردی کے لیے دوسروں کو کھانا دینے کا حکم ہے کہ وہ مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ تین دن تک سوگ رکھ سکتے ہیں۔ اس سوگ کا مطلب یہ نہیں کہ ان کو کھانا پکانا منع ہے۔ سوگ یہ ہے کہ وہ زینت اور خوشی کا کام نہ کریں۔ غم زدہ ہیں' وہ صورت غم سے رہیں۔ غمگین کو غم تازہ ہو تو کھانا پکانے کی طرف توجہ نہیں رہتی۔ اس لیے دوسرے لوگ پکا کر کھلاتے ہیں۔ دوسرے دن غم کم ہو جاتا ہے۔ تیسرے دن اس سے کم ہو جاتا ہے' اس لیے زینت اور خوشی کے کام نہیں کر سکتے۔ مگر بچوں کو یا اپنے لیے کھانا پکا کر کھا لینا درست ہے' یہ سوگ کے خلاف نہیں ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص-۱۸۰

زندوں کا اموات کو نفع پہنچانا

حضرات مسلمانان ڈیرہ غازی خان! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ امابعد فاقول وباللہ التوفیق۔

واضح ہو کہ دنیا میں انسانوں کی حیات و ممات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتدائے دنیا سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ قانون کلیہ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے۔ کل نفس ذائقة الموت کہ "ہر زندہ انسان موت کا جام نوش کرنے والا ہے۔" اسی طرح زندگی اور موت میں تمام انسانوں کا باہمی برتاؤ اور استفادہ اور افادہ کا سلسلہ بھی قدیم سے جاری ہے۔ زندگی میں آپس کا برتاؤ تو سب کو معلوم ہے' موت کے وقت یا موت کے بعد جو برتاؤ کیا جاتا ہے' وہ بھی اہل اسلام سے پوشیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کو یہ خطاب فرماتا ہے: انک میت وانهم میتون○ کہ "آپ بھی میت ہونے والے ہیں اور دیگر لوگ بھی میت ہو جائیں گے۔"

جب انسان میت ہو جاتا ہے تو جو انسان زندہ ہوتے ہیں وہ اس میت کو یہ فائدہ پہنچاتے ہیں اور برتاؤ کرتے ہیں کہ اس کو غسل دیتے ہیں اور کفن پہناتے ہیں اور پھر اس پر کھڑے ہو کر نماز جنازہ پڑھتے ہیں اور دعاء جنازہ میں اس کے حق میں دعاء کرتے ہیں۔ اور صحیح حدیث میں یہ حکم ہے: اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعآء یعنی "جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لیے خالص دعا مانگو۔ (مشکوٰۃ)

اور فتح الباری جلد اول' ص-۲۹۰ میں حدیث ہے۔ جس میں جنازہ کی نماز کا مسنون طریقہ مذکور ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں: ثم یخلص الدعآء للمیت - یعنی نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ اور درود پڑھنے کے بعد میت کے لیے خالص دعاء کرے۔ وہ خالص دعاء مسلم شریف میں عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت ﷺ سے یوں منقول ہے: اللهم اغفر له وارحمه (الی قوله) وادخله الجنة واعذه من عذاب القبر ومن عذاب النار۔ یعنی "اے اللہ اس میت کو بخش دے اور اس پر رحم فرما اور اس کو جنت میں داخل کر اور قبر کے عذاب سے بچا اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

اس دعاء کے پڑھنے سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ زندوں کی طرف سے میت کو

فائدہ اور نفع پہنچتا ہے۔ دوسرا یہ کہ قبر کا عذاب برحق ہے۔ ابوداؤد اور نسائی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعاء منقول ہے: اللّٰھم انت ربھا (الی قولہ) جئنا شفعاء فاغفرلھا۔ یعنی "اے اللہ تو اس میت کا رب ہے' ہم اس کے سفارشی ہو کر تیرے پیش ہوئے ہیں' تو اس کو بخش دے۔"

اس حدیث اور دعاء سے زندوں کا میت کو نفع پہنچانا اور اس کی سفارش کرنا ثابت ہوا۔ اگر کسی میت مسلمان کی نماز جنازہ نہ پڑھی گئی ہو اور وہ بلا نماز دفن کیا گیا ہو تو اس کی قبر پر جا کر کوئی عالم بمع دیگر مسلمانوں کے نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں' یہ درست ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رات کو مر گیا تو لوگوں نے اس کو رات ہی کو دفن کر دیا۔ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی تم لوگوں نے خبر کیوں نہ دی۔ لوگوں نے کہا کہ رات اندھیری تھی اس وجہ سے ہم نے آپ کو تکلیف دینا پسند نہ کیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور قبر پر نماز جنازہ پڑھی اور دوسری روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ میں یہ ذکر ہے کہ ہم لوگوں نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔

دیگر حدیث بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے مرنے کی خبر دی اور اسی روز لوگوں کو خبر دی جس روز وہ مرا تھا۔ پھر آپ لوگوں کو لے کر مصلیٰ کی طرف نکلے اور لوگوں نے آپ کے پیچھے صف باندھی اور آپ نے نماز جنازہ پڑھائی اور چار تکبیریں کہیں۔ اس حدیث سے میت غائب پر نماز جنازہ پڑھنی ثابت ہوئی۔ پس میت حاضر ہو یا غائب اس کو نماز جنازہ اور دعاء سے نفع پہنچانا اور میت کا زندوں کے عمل سے مستفید ہونا ثابت ہوا۔

مسلم کی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس مسلمان میت کے جنازہ پر چالیس آدمی کھڑے ہوں' جنھوں نے شرک نہ کیا ہو تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اس میت کے بارے میں شفاعت قبول کرتا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس میت پر مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت جنازہ کی نماز پڑھے جن کی تعداد ایک سو تک ہو اور وہ سب اس میت کی سفارش کریں تو ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں مسلمان موحدین کا کثرت سے شریک

ہونا میت کے حق میں بہت مفید اور قبولیت دعاء کا باعث ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو اس پر ٹھہرتے اور لوگوں سے فرماتے کہ اپنے بھائی کے واسطے دعاء مغفرت کرو اور اس کے لیے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ اس وقت اس کا حساب ہو گا۔

امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے جان کنی کے وقت اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ جب میں مر جاؤں تو میرے جنازے کے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی عورت نہ جائے اور نہ میرے جنازے کے ساتھ آگ جائے اور جب مجھ کو دفن کرو تو سہولت اور آہستگی سے مجھ پر مٹی گرانا پھر میری قبر پر اتنی دیر تک کھڑے رہنا جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ مجھے تم لوگوں کی وجہ سے انسیت ہو اور میں جان لوں کہ اپنے رب کے بھیجے ہوئے کو یعنی منکر نکیر کو کیا جواب دیتا ہوں۔

ان احادیث کی بناء پر جو علماء حنفیہ نے درمختار وغیرہ میں یہ لکھا ہے کہ میت کے دفن کے بعد دعاء اور قراۃ قرآن کے لیے قبر کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا مستحب ہے کہ جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کو تقسیم کیا جائے۔ ان احادیث سے زندوں کی طرف سے اپنے اعمال کا میت کو نفع پہنچانا ثابت ہوا اور یہ ثابت ہوا کہ قبر میں میت کا محاسبہ ہونا برحق ہے۔

امام الدنیا فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع صحیح میں محاسبہ اور عذاب قبر پر مستقل باب منعقد کر کے قرآن و حدیث سے اس کا اثبات کیا ہے اور اس کے تحت ایک یہ حدیث ذکر کی ہے جو حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں: قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطیبا فذکر فتنۃ القبر التی یفتن فیھا المرء فلما ذکر ذالک ضج المسلمون ضجۃ۔ یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا جس میں فتنہ قبر کا ذکر کیا جس میں میت مبتلا ہو گی اور اس قدر خوف دلایا کہ مسلمان سامعین سخت دھاڑھیں مار کر رونے لگے کہ چیخیں نکل گئیں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے۔ عذاب القبر حق (رواہ البخاری) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ قبر میں عذاب ہونا برحق ہے۔ امام نووی نے مسلم شریف کی شرح میں قبر میں حساب و عذاب کا ہونا ثابت کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ تمام اہل سنت

علماء کا اس عقیدہ پر اتفاق ہے۔ گمراہ فرقے معتزلہ' خوارج' مرجیہ اس کے منکر ہیں۔ وقد تظاهرت دلائل الکتاب والسنة کہ اس مسئلہ پر کتاب و سنت میں اس قدر کثرت سے دلائل وارد ہیں جو ایک دوسرے کو قوت دیتے ہیں۔ وجب قبوله واعتقاده۔ اس عقیدہ کو قبول کرنا اور اس پر اعتقاد رکھنا واجب ہے۔

لیکن ڈیرہ غازی خان میں ایک شخص بنام عبداللہ نلنی والا اس عقیدہ کا منکر ہے جو جماعت غرباء اہل حدیث سے خارج ہو کر منکرین حدیث پرویزی فرقہ کا ہمنوا ہوا۔ بخاری و مسلم جنہیں صحیحین کہا جاتا ہے جن کی متفقہ احادیث پر اہل شرق و غرب کے علماء اہل سنت کا اجماع ہے' ان کو موضوع اور بناوٹی کہہ کر ان کی تکذیب کرتا ہے اور پھر اتنا بے شرم اور ڈھیٹ ہے کہ صحاح ستہ کے محدثین کو وضعی احادیث اور جھوٹی احادیث کے بیان کرنے والے قرار دے کر پھر ان کی ان احادیث سے استدلال کرتا ہے جو اس کی خواہش نفسانی کے موافق ہیں۔ حالانکہ اصول حدیث کی رو سے جھوٹی احادیث کے بیان کرنے والے محدثین سے کوئی حدیث جائز نہیں ہے تو یہ علماء یہود کی طرح نومن ببعض ونکفر ببعض کا قائل ہے۔ لہٰذا تمام باشندگان ڈیرہ غازی خاں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ یہ عبداللہ نلنی والا مرجائے تو کوئی شخص مسلمان اس کی نماز جنازہ نہ پڑھے ورنہ سخت گنہگار ہو گا اور نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے کیونکہ یہ عذاب و حساب قبر کا منکر ہے۔ اس کو خصوصی طور پر عذاب قبر نہایت سخت ہو گا تو اس سے دیگر اہل قبور ایذا پائیں گے۔ یہ حال دوہائی چیخ پکار بہت کرے گا۔ اہل قبور اس سے پریشان اور بے آرام ہوں گے۔ جب یہ شخص یہ مردود عقیدہ رکھتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کام آئیں گے' دوسروں کی نہیں تو پھر مسلمانوں کا اس کے حق میں دعا کرنا اور نفع پہنچانا کس طرح مناسب اور جائز ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی غیور ہے کہ ممنوع کاموں پر غیرت کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی غیور ہیں کہ ممنوع کام کرنے والے سے اعراض کرتے ہیں اور مومن بھی غیرت مند ہے کہ ممنوع کرنے والے سے نفرت کرتا ہے پھر فرمایا کہ جو شخص معکوس القلب ہے' وہ غیرت نہیں کرتا۔

پس باشندگان ڈیرہ غازی غیور بنیں کہ نہ اس دنیا میں اس سے برتاؤ کریں اور اس کی اقتداء میں نمازیں نہ پڑھیں اور سلام کلام اس سے بند کریں۔ اور جب مرجائے تو نماز جنازہ اس کی نہ پڑھیں تاکہ ظاہر ہو کہ قبر کے عذاب کے منکر اور زندوں کے اعمال کا فائدہ میت

کو نہ پہنچنے کا عقیدہ رکھنے کا یہ انجام ہے کہ مسلمانوں نے اس کا جنازہ نہیں پڑھا ہے۔ اس سے لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور اس کا گروہ اس سے متنفر ہو جائے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ قبر کے حساب اور ثواب اور عذاب کے قائل تھے۔ جب وہ فوت ہوئے تو سولہ لاکھ مسلمان ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے تھے جن کا یہودی عیسائیوں نے یہ منظر دیکھا تو بیس ہزار یہودی' عیسائی اور مجوسی مسلمان ہو گئے تھے۔ (نقض المنطق ص-۹) اب چاہیے کہ اس کے جنازہ میں ایک شخص بھی شامل نہ ہو کیونکہ یہ حدیث متواترہ اور مسلمانوں کے اجماعی عقیدہ حساب قبر کا منکر ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں یہ اصول لکھتے ہیں: من عمد فخالف ماصح عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم لم یسلم بقلبه او بلسانه انه کحکمه علیه السلام فهو کافر۔ اور جلد-۴' ص-۵۸۱ میں ہے: من صح عنده حدیث عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ثم خالفه یعنی باعتقاده فهو کافر۔ اور جلد-۴' ص-۵۸۰ میں ہے: فهو کافر مرتد یعنی جس شخص نے احادیث نبویہ صحیحہ کی عمداً مخالفت کی اور دل و زبان سے نہ مانا تو وہ کافر مرتد ہوا۔

مختصر تذکرہ قرطبی مطبوعہ مصر کے ص-۳۶ میں ہے۔ فاعلمو ایها الاخوان ان عذاب القبر ونعیمه حق کما صرحت به الاحادیث الصحیحه (الٰی قوله) ومن شک فی ذالک فهو ملحد۔ یعنی "اے بھائیو! تم یہ مسئلہ خوب سمجھ لو کہ قبر کا عذاب اور اس کی راحت برحق ہے۔ جیسا کہ اس بارے میں احادیث صحیحہ صریح دلالت کرتی ہیں پس جس شخص نے اس میں شک کیا وہ ملحد ہے یعنی بے دین ہے۔"

اور خواجہ ابوشکور سالمی اپنی کتاب تمہید میں یہ فرماتے ہیں: فاما عذاب القبر للمومنین من الجائزات وللکافرین من الواجبات (الٰی قوله) ومن انکر هذا یصیر کافرا۔ یعنی "قبر کا عذاب مومنوں کے لیے جائز اور کافروں کے لیے واجب ہے۔ اور جو اس کا منکر ہے وہ کافر ہے۔"

انبیاء کرام کو قبروں میں شہداء کی طرح برزخی زندگی حاصل ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں: حیاة النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فی قبره هو وسائر الانبیاء معلومة عندنا علما قطعیا لما قام عندنا من الادلة فی ذالک وتواترت به الاخبار الدالة علی ذالک۔ (فتاوی امام سیوطی جلد-۲' ص-۱۴۷) یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قبر میں حیات اور دیگر انبیاء کی اپنی

قبروں میں زندگی قطعی طور پر ثابت ہے۔ اور اس پر دلائل قائم ہیں اور متواتر احادیث وارد ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں۔"

نیز المنظم المتناثرہ من الحدیث المتواترہ ص-۴ میں امام سیوطی نے یہ لکھا ہے: ان من جملة ماتواتر عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم حیاة الانبیاء فی قبورهم۔ یعنی "جو چیزیں آنحضرت ﷺ سے تواتر کے ساتھ مروی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔" تو یہ علماء نے تصریح کر دی ہے کہ میت کی برزخی زندگی جس میں اس کا حسب ثواب و عذاب ثابت ہوا ہے' وہ ایک دو احادیث سے نہیں بلکہ بکثرت احادیث سے ثابت ہے جو حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں اور اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔ والسلف مجمعون علی هذا وقد تواترت الاثار عنهم۔ یعنی سلف کا میتوں کی برزخی زندگی پر اجماع ہے اور اس بارے میں متواتر روایتیں ان سے مروی ہیں۔ (ابن کثیر جلد-۳' ص-۴۳۸)

ایک عالم فاضل شخص نے کتاب مرام الکلام فی عقائد الاسلام شائع کی ہے جس میں اسلامی عقائد پر بحث درج ہے۔ احوال برزخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وتسمی فتنة القبر والحدیث به متواتر - یعنی "قبر کے حساب کا نام فتنہ قبر ہے۔ اس بارے میں متواتر حدیث وارد ہے۔ پھر اس کا ثبوت یوں دیا ہے کہ جس جس محدث نے فتنہ قبر کی حدیث کو روایت کیا ہے اور جس جس صحابی سے وہ روایت مروی ہے۔ اس کا ذکر کر کے حدیث کو متواتر ثابت کیا ہے۔ چنانچہ یوں لکھا ہے:

اخرجه الشیخان واحمد وابوداؤد فی سننه والبیهقی فی عذاب القبر وابن مردویه والدیلمی عن انس مرفوعا والبزار والطبرانی وابن السکن عن ایوب بن بشیر عن ابیه مرفوعا واحمد والطبرانی فی الاوسط والبیهقی وابن ابی الدنیا من طریق ابی الزبیر عن جابر مرفوعا وابن ابی الدنیا وابو نعیم عنه مرفوعا وابن ابن ابی عاصم وابن مردویه والبیهقی عن طریق ابی سفیان عنه مرفوعا والبیهقی فی عذاب القبر عن ابن عباس مرفوعا۔ والبیهقی وابن ابی حاتم عنه موقوفا واحمد وابن ابی الدنیا والطبرانی والاجری وابن عدی بسند صحیح وابن عمر مرفوعا۔ والطبرانی فی الکبیر والبیهقی فی عذاب القبر وابن ابی شیبه والحاکم فی التاریخ والبیهقی فی عذاب القبر عن عمر الخطاب مرفوعا۔ وابو نعیم وابن ابی الدنیا والاجری والبیهقی عن عطاء بن یسار

مرفوعا- ومسلم عن عمرو بن العاص مرفوعا- وابن المبارک وابن ابی شیبه والاجری عن ابی الدرداء موقوفا- واحمد والبزار وابن ابی الدنیا وابن ابی عاصم وابن مردویه والبیهقی بسند صحیح عن ابی سعید الخدری مرفوعا- والطبرانی وابونعیم والبزار والبیهقی عن ابی رافع مرفوعا- وابن ابی حاتم والطبرانی فی الاوسط وابن منده ----- عن ابی قتاده موقوفا والترمذی حسناً وابن ابی الدنیا والاجری وابن ابی عاصم والبیهقی فی عذاب القبر والطبرانی فی الاوسط وابن مردویه وهناد فی الزهد وابن ابی شیبة وابن جریر وابن المنذر وابن حبان فی صحیحه وابن ماجه والحاکم عن ابی هریرة مرفوعا واحمد وابن ابی شیبة والبخاری عنه وعن اسماء بنت ابی بکر مرفوعا واحمد والبیهقی بسند صحیح عن عائشة مرفوعا- (الٰی آخره)

پس ان راویوں اور روایتوں کی تعداد سے اور علماء دین کی شہادت سے ثابت ہوا کہ قبر کی برزخی زندگی اور اس میں حساب اور ثواب اور عذاب کا ہونا یقینی امر ہے کیونکہ متواتر حدیث سے ثابت ہے۔

تدریب الراوی اصول حدیث کی کتاب میں لکھا ہے: والحدیث اذا روی من عشرة فهو متواتر علی القول المختار۔ یعنی "حدیث جب دس مختلف راویوں سے مروی ہو تو مختار مذہب کی رو سے متواتر ہے۔"

اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر طرق اور روات حدیث میں اتنی تعداد ہو کہ عقل ان کے تواطئو علی الکذب کو تجویز نہ کر سکے تو وہ حدیث متواتر ہوتی ہے۔ یہ تعریف علماء میں عام مشہور ہے تو اس رو سے یہی حدیث حساب قبر کی متواتر ہے کیونکہ حدیث کے راویوں پر جو صحابہ کرام ہیں عقل یہ تجویز نہیں کرتی کہ انہوں نے یہ قصہ عذاب اور حساب کا خود گھڑ لیا ہے اور نہ تابعین اور نہ تبع تابعین پر یہ ظن کیا جا سکتا ہے اور نہ دیگر محدثین پر یہ بدگمانی ہو سکتی ہے تو ضرور یہ اللہ اور اس کے رسول کا فرمان ہے جو واجب الایقان ہے اور ایمان میں داخل ہے۔ چنانچہ سب اولیاء کے سرتاج شیخ المشائخ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ غنیہ مترجم اردو ص-۱۵۰ میں یہ فرماتے ہیں: ونؤمن بان منکرا و نکیرا یاتیان الی کل احد نیز لان سوی النبیین یسئلانه ویمتحنانه مما یعتقده من الادیان وهما یاتیان القبر فیرسل فی ذالک المیت الروح ثم یقعد فاذا سئل سلب روحه بلا الم۔ یعنی "ہمارا ایمان یہ ہے

کہ انبیاء کے سوا ہر میت کے پاس منکر نکیر فرشتے آتے ہیں اور میت کی طرف روح لوٹائی جاتی ہے۔ چنانچہ منکرین میت کو بٹھا کر اس کے ایمان اور عقیدہ کا امتحان لیتے ہیں اور سوال کرتے ہیں۔ امتحان کے بعد بلا تکلیف روح جسم سے خارج ہو جاتی ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ پھر اپنے ٹھکانے پر پہنچائی جاتی ہے لیکن اس کا تعلق جسم سے قائم رہتا ہے جیسے نائم کی روح قبض کی جاتی ہے لیکن اس کا تعلق جسم سے رہتا ہے۔ اس تعلق سے میت کو راحت ثواب یا عذاب محسوس ہوتا رہتا ہے جس کی کیفیت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پس جو شخص ان متواتر احادیث کا منکر ہے اور طرح طرح کی حجتیں اور سوالات کر کے اس مسئلہ کی تکذیب کرتا ہے' وہ خارج از اسلام ہے۔

شرح فقہ اکبر ص-۱۹۹ میں یہ لکھا ہے: من انکر الاخبار المتواترہ فی الشریعۃ کفر یعنی "منکر متواتر احادیث کا کافر ہے۔" تدریب الراوی ص-۳۷۴ میں قبر میں منکر نکیر کے حساب لینے کی حدیث کو متواتر قرار دیا ہے۔ جب عبداللہ ثانی والا بار بار اشتہار بازی کرتا ہوا قبر کے حساب' عذاب اور ایصال ثواب کی تکذیب کرتا ہے اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو اس کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لہٰذا مسلمانان ڈیرہ غازی خاں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ اس عبداللہ سے بائیکاٹ کیا جائے اور جب وہ مرجائے تو اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے۔ والسلام۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

صحیفہ اہل حدیث کراچی مورخہ ۱۶/ محرم سنہ-۱۳۹۸ھ

دفن کرنے کے بعد کپڑا بچھا کر تین روز تک تلقین و افسوس کیلئے بیٹھنا اور برائے ایصال ثواب اکٹھے ہو کر قرآن خوانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال: بخدمت جناب مولانا عبدالستار صاحب امام جماعت غرباء اہلحدیث! السلام علیکم۔ مندرجہ ذیل مسئلوں کا حدیث سے جواب تحریر فرمائیں' نہایت مہربانی ہو گی۔ (۱) شریعت اس

مسئلہ میں کیا فرماتی ہے کہ مردہ کے دفن کرنے کے بعد تین روز برائے تلقین یا افسوس کپڑا بچھا کر بیٹھنا جائز ہے یا کہ نہیں؟ (۲) نبی ﷺ کے زمانہ میں میت کے دفن کرنے کے بعد تین دن کس طرح کرتے تھے؟ (۳) قرآن مجید اکٹھے بیٹھ کر پڑھنا اور بعد میں مردہ کو بخشا کیا جائز ہے یا کہ نہیں؟

جمعدار مرزا عبدالقدیر بیگ پٹوی

جواب : (ا) میت دفن کرنے کے بعد اہل میت گھر آجائیں تو ان کو تین دن سوگ رکھنا جائز ہے۔ بایں طور کہ وہ کوئی خوشی اور زینت کا کام نہ کریں۔ غمگین صورت سے رہیں۔ ان کو کھانا پکا کر دینا دوسرے رشتہ دار اور مسلمانوں کو حکم ہے۔ (۲-۳) نیز تعزیت کے لیے ان کے پاس جانا اور ان کو صبر دلانا درست بلکہ مسنون اور کار ثواب ہے۔ لیکن دروازہ پر فرش بچھانا اور فاتحہ خوانی کرنا اور اکٹھے ہو کر قرآن پڑھنا یہ بدعت ہے۔ قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت نہیں۔ ہاں نماز پڑھ کر میت کے حق میں دعا کریں یا مالی صدقہ دے کر ایصال ثواب کریں تو یہ درست ہے مگر تیجہ ساتا کوئی دن مقرر نہ کریں۔ قبر پر جا کر دعا کریں تو یہ درست ہے مگر گھر جا کر فاتحہ خوانی کرنا یہ ثابت نہیں ہے۔ جس قدر ہو سکے سنت کے مطابق عمل کریں۔ بدعت نہ کریں ورنہ ثواب نہ ہو گا۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص-۱۶۸

میت کا تیجا کرنا کیسا ہے؟

سوال : ہمارے علاقے سندھ میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے اور لوگ اس کے غسل کفن جنازہ اور دفن وغیرہ سے فارغ ہو کر آتے ہیں تو تیسرے دن میت کے رشتہ دار ان لوگوں کی جو جنازہ اور دفن وغیرہ میں شامل ہوئے تھے' دعوت کرتے ہیں اور رات کو کھانا کھلاتے ہیں۔ کیا اسلام میں یہ رسم جائز ہے؟ حدیث اور فقہ کی روشنی میں اس کی وضاحت فرما کر مشکور فرمائیں۔

السائل: محمد رمضان کھڈ محمدی ڈیپلو ضلع تھرپارکر (سندھ)

جواب : تیسرے دن کی دعوت مروجہ کسی شرعی دلیل اور تعامل سلف صالحین سے

ثابت نہیں ہے۔ لہذا بدعت ہے اور حدیث شر الامور محدثاتھا میں داخل ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمام کاموں سے بدترین کام وہ ہیں جو دین میں لوگوں نے اپنی رائے سے بغیر دلیل شرعی کے ایجاد کئے ہیں۔

دوسری حدیث میں ہے: ایاکم والمحدثات یعنی بعد عہد نبوی جو کام لوگوں نے دین میں نت نئے پیدا کئے ہیں' ان سے بچو۔ پس تیجہ' ساتا' چالیسواں' میلاد' عرس' گیارھویں' ختم طعام وغیرہ تمام امور محدثات ہیں جن سے اجتناب واجب ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہل حدیث مورخہ ۲۵ دسمبر سنہ۔ --------۱۹۷ء

ایصال ثواب و عذاب قبر

کچھ عرصہ ہوا ایک اہل حدیث شخص نے ایک اشتہار مجھے لا کر دیا کہ آپ اس کا مطالعہ کر کے اس کا جواب دیں۔ اس اشتہار کا عنوان یہ ہے۔ "اعمالنامہ" اس کو پڑھ کر خیال آیا کہ شاید یہ کوئی مشتہر اپنا یا کسی شخص کا کارنامہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ جب اشتہار کے نیچے نظر ڈالی کہ اس کا مشتہر کون ہے؟ تو یہ لکھا ہوا تھا "عبداللہ خطیب بلاک سی ڈیرہ غازی خان" تب یہ معلوم ہوا کہ یہ وہی عبداللہ ثانی کا پروردہ منکر حدیث ہے جو مذہب اہل حدیث سے مرتد ہو کر پرویزی فرقہ منکرین حدیث کا لبادہ پہنے ہوئے احادیث نبویہ کی تکذیب کرتا رہتا ہے ؎

گر منکر نوحہ گر باشد در حدیث
جز طمع نہ بود مراد آں خبیث

اشتہار پڑھنے سے ظاہر ہوا کہ اس نے اپنی غلطی بے بضاعتی' نافہمی اور گمراہی کا پورا فوٹو کھینچ دیا ہے۔ بدتہذیبی اور بے ادبی کے سرکش و بے لگام خچر پر سوار ہو کر احادیث نبویہ میں زبان درازی کی ہے اور کم عقلی کے مراحل اور نادانی کے منازل طے کرنے میں اپنے ہم پیشہ منکرین حدیث سے سبقت لے گیا ہے اور مذہب اہل حدیث کیا دین اسلام سے ہی خارج ہو چکا ہے۔ کما یخرج السھم من الرمیتہ۔ اور بڑے ناز نخرے سے جو اس نے اشتہار میں بے لگام ہو کر کلام کیا ہے' اس سے اس کی دینی گمراہی خوب عیاں ہو گئی ہے ؎

ہر کہ بے ادبی گردن افرازد
خویشتن را بگردن انداز د

اس کا یہ دعویٰ کہ میں اہل حدیث ہوں اور احادیث کو مانتا ہوں' سراسر جھوٹ اور منافقانہ دعویٰ ہے۔ منافقوں نے بھی کلمہ پڑھ کر اسلام اور ایمان کا دعویٰ کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون کہ "اللہ تعالیٰ یہ گواہی دیتا ہے کہ تحقیق یہ منافق جھوٹے ہیں۔" جب انہوں نے آمنا باللّٰہ وباليوم الآخر کہا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور دن قیامت پر تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وما ھم بمؤمنین کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یہی حال اس منکر حدیث کا ہے کہ وہ اپنے اشتہار میں یہ لکھتا ہے۔ "میں اللہ کے فضل و کرم سے قرآن و حدیث کو تسلیم کرتا ہے اور اس پر اپنی طاقت کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ یہ اس کا منافقانہ دعویٰ ہے کیونکہ اس کا عمل اس کی تکذیب کرتا ہے کہ وہ قبر کے حساب اور اس میں ثواب و عذاب کا منکر ہے جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ وہ ایصال ثواب کا منکر ہے جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ وہ حج بدل کا منکر ہے جو حدیث صحیح سے ثابت ہے۔ اسی طرح اور کئی مسائل ہیں' ان مسائل کے بارے میں جو احادیث وارد ہیں ان کو محدثین عظام اور فقہاء کرام متقدمین و متاخرین نے صحیح قرار دیا ہے جو علم روایت اور علم حدیث کے ماہرین ہیں۔ اب یہ شخص جو ان کے مقابلہ میں جاہل ہے' ان احادیث کو غلط کہے تو اس کا قول پرے کاہ کے برابر سمجھا جائے گا اور یہ شخص منکر حدیث قرار پائے گا۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب الروح میں احادیث صحیحہ ذکر کر کے احیاء کے اعمال سے اموات کو انتفاع ثابت کیا ہے اور انہوں نے یہ لکھا ہے کہ بعض بدعتی لوگ یہ کہتے ہیں کہ زندوں کے اعمال کا اجروثواب میت کو نہیں پہنچتا۔ پس مشتہران میں سے ہے جس کا کچھ اعتبار نہیں ہے بلکہ قبر کی راحت اور عذاب برحق ہے جس کا انکار کفر ہے۔

علامہ خواجہ ابو الشکور سالمی اپنی کتاب تمہید مطبوعہ لاہور کے ص-۱۲۵ میں فرماتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ عذاب قبر مومنوں کے لیے جائز (جو گنہگار ہیں) اور کفار کے لیے واجب ہے جیسے فرعونیوں کے بارہ میں قرآن میں ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر صبح و شام آگ پیش کی جاتی ہے۔ عذاب کا ہونا صحیح ہے۔ جس جگہ بھی ہوں اور جس حالت میں ہوں ومن انکر ھذا یصیر کافرا کہ جو شخص عذاب قبر کا منکر ہوا وہ کافر ہے۔

مختصر تذکرہ قرطبی ص-۳۶ مطبوعہ مصر میں ہے کہ عذاب قبر حق ہے جیسا کہ اس پر

احادیث صحیحہ دلالت کرتی ہیں ومن شک فی ذالک فھو ملحد کہ جو شخص اس مسئلہ میں شک کرے وہ ملحد بے دین ہے۔

محلی جلد اول' ص-۱۱ میں امام ابن حزم نے یہ اصول لکھا ہے وکل من کفر بما بلغه وصح عنده عن النبی صلی اللہ علیه وسلم او اجمع علیه المومنون عما جاء به النبی صلی اللہ علیه وسلم فھو کافر۔ یعنی "ہر وہ شخص جس کو احکام الٰہی پہنچ گئے' ان کا اس نے انکار کیا یا نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث آگئی یا کسی مسئلہ پر مومنوں کا اجماع ہو گیا جو نبی کریم ﷺ سے آچکا تھا اس میں سے کسی کا بھی انکار کیا تو وہ کافر ہوا۔"

علامہ ابن قیم نے کتاب الروح ص-۱۷۷ میں لکھا ہے کہ یہ سوال ہے کہ کیا ارواح موتی کو زندوں کے عملوں کا کوئی نفع پہنچتا ہے یا نہیں؟ پھر جواب دیا ہے انھا لتنتفع من سعی الاحیاء بامرین مجمع علیھما بین اھل السنة من الفقھاء واھل الحدیث والتفسیر یعنی زندوں کی عملی سعی ارواح اموات کو دو ایسے امروں سے نفع پہنچانا ثابت ہے جن پر فقہاء و اہل سنت کا اور علماء اہلحدیث کا اجماع ہو چکا ہے پھر یہ دو امر ذکر کئے ہیں۔ ایک میت کے لیے مسلمانوں کی دعا اور استغفار۔ دوسرا امر یہ کہ میت اپنی زندگی میں اجر و ثواب پہنچنے کا سبب بنا کر دنیا سے رخصت ہوا جیسے صدقہ جاریہ مسجد' نہر' مسافرخانہ بنایا یا علمی کتابیں تصنیف کر گیا۔ درس گاہ قرآن و حدیث کی تعلیم کے لیے بنا گیا یا نیک اولاد چھوڑ گیا جو اس کے لیے دعا و استغفار کرتی رہے۔ ان کا اجر و ثواب میت کو پہنچتا رہا اور وہ اس سے منتفع ہوا۔

چنانچہ ثانی والے ملحد نے باوجود علی الاطلاق انکار کر کے پھر ان اعمال کے انتفاع کا اقرار کر لیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے "صدقہ جاریہ' علم' اولاد کی تربیت وغیرہ یہ سب کچھ زندگی میں انسان کرتا ہے جو اس کے اعمال نامے میں درج ہو جاتے ہیں۔ یہ اعمال اپنی زندگی میں کئے ہوئے جاری رہتے ہیں۔" اس جاری رہنے کا مطلب کیا ہے؟ یہ مطلب ہے کہ اس کے اعمالنامہ میں اس کی حسنات درج ہوتی رہتی ہیں یا ان کا اجر و ثواب اس کو پہنچتا رہتا ہے؟ اگر شق اول ہے تو ملحد کا یہ دعویٰ باطل ہوا کہ ہر انسان اپنی موت کے بعد اعمالنامہ ساتھ لے جاتا ہے۔ اس اعمالنامہ کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر شق ثانی ہے کہ اجر و ثواب ان اعمال کا اس کو پہنچتا رہتا ہے جس سے وہ منتفع ہوتا رہتا ہے تو اس سے اس کا یہ عقیدہ باطل ہوا کہ میت کو کچھ نہیں پہنچتا کہ وہ نیست و نابود ہوا۔

ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا انما یلحق المومن من عمله وحسناته بعد موته کہ مومن کو اس کی نیکیاں اور عمل بعد موت کے بھی اس کو ملتی ہیں۔ پھر ان اعمال کا ذکر کیا ہے کہ علم جو اس نے پھیلایا یا اولاد صالحہ چھوڑی یا قرآن چھوڑا یا مسجد بنائی یا مسافر خانہ بنایا یا نہر جاری کی یا صدقہ جاریہ کیا "تلحقه بعد موته" یہ اعمال اس کو بعد موت کے ملتے ہیں۔ جب یہ اعمال اس کو ملتے ہیں تو اس کی صورت کیا ہے؟ اس کے اعمال نامہ میں درج ہوتے رہے ہیں یا ان کا ثواب اور اجر اس کو ملتا رہتا ہے جس سے وہ میت مستفید ہوتا رہتا ہے؟ اگر اعمالنامہ میں اس کے ان اعمال کا اندراج ہوتا ہے تو اس سے ملحد کا پہلا دعویٰ باطل ہوا اور اگر اجروثواب ملتا ہے جس سے وہ مستفید ہوتا ہے تو عالم برزخ میں ایصال ثواب ثابت ہو کر ملحد کے دوسرے دعویٰ کے بطلان کا موجب ہوا۔ نیز اولاد صالحہ دعا کرے تو میت کو ایصال ثواب ہو گیا جس سے ملحد کا عقیدہ باطل ہو گیا کیونکہ اس کا اپنا عمل ہو یا دوسرے کا اس کا ثواب تو اللہ تعالیٰ نے پہنچانا ہے۔

ایصال کا معنی پہنچانا ہے۔ اس کے لیے ایک موصل ہوتا ہے دوسرا موصل الیہ۔ موصل اللہ تعالیٰ ہے اور موصل الیہ میت ہے یعنی پہنچانے والا اور جس کو پہنچایا گیا۔ اب اس پہنچانے کا اور پہنچنے کا مقصد یہ ہے کہ جس کو کوئی چیز پہنچائی جائے اور وہ اس کو پہنچے اور وہ اس سے مستفید ہو ورنہ ایصال اور الحاق ولحوق کا سلسلہ ہی غلط ہو گا تو یہ احادیث ہی لغو ہو جاتی ہیں۔ یہ خیال شرعاً باطل ہے تو اس ملحد کا عقیدہ باطل ہوا۔ جب صحیح حدیث میں یہ آچکا ہے کہ اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاث یعنی "جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں مگر تین عمل منقطع نہیں ہوتے۔" وہ جاری رہتے ہیں۔ یہ استثناء انقطاع عمل سے ہے تو ان عملوں کا موت کے بعد منقطع نہ ہونا اس بات پر دال ہے کہ وہ اس کے اعمال نامہ میں درج ہوتے ہیں۔ عدم اندراج کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر ان عملوں کا اندراج نہ ہوا تو کہاں گئے ضائع تو ہو نہیں سکتے کیونکہ فرمان الٰہی ہے انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی "کہ میں کسی مرد عورت کا عمل ضائع نہیں کرتا۔"

پس اگر اس کے اعمال نامہ میں درج ہو گئے تو وہ محفوظ ہو گئے' اگر نہ ہوئے تو بیکار ہو گئے اور ملحد کا یہ کہنا کہ یہ اعمال اپنی زندگی میں کئے ہوئے جاری رہتے ہیں' یہ ناقص کلام ہے۔ یہ کہنا چاہیے تھا کہ موت کے بعد جاری رہتے ہیں' ان کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔

جب سلسلہ جاری رہا تو ان کا اندراج بھی جاری رہے گا۔ اس ملحد کو حدیث کی فقاہت حاصل نہیں ہے۔ پھر صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کا اچھا اجروثواب ملے گا اور اس کے بعد جن لوگوں نے عمل کیا (اس طریقہ پر) تو ان کا اجروثواب بھی اس نیک طریقہ جاری کرنے والے کو ملے گا اور ان عاملوں کے ثواب میں سے کچھ کم نہ کیا جائے گا۔ سب کو رحمت و فضل سے پورا ملے گا۔

اس حدیث صحیح سے اس منکر ملحد کا رد ہو گیا کیونکہ اس سے دوسروں کے اعمال کا ثواب میت کو پہنچنا ثابت ہو گیا اور پھر اس حدیث میں فرمان ہے کہ اگر کسی شخص نے برا طریقہ بدعت و شرک کا جاری کیا تو اس کو گناہ ہو گا اور اس برے طریقہ پر عمل کرنے والوں کا گناہ بھی اس کو ہو گا اور اس برے طریقہ پر عمل کرنے والوں کے گناہ میں سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اس حدیث سے بھی ثواب و عتاب زندوں کے ذریعہ اموات کو پہنچنا ثابت ہو گیا۔ دیگر صحیح حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی کو قتل کرتا ہے تو اسی کے گناہ کے برابر حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے قابیل کو ملتا ہے کیونکہ قتل اور خونریزی کا کام پہلے اسی نے جاری کیا تھا۔ اس حدیث سے بھی دوسرے شخص کے گناہ کا میت کو پہنچنا ثابت ہو گیا کیونکہ وہ اس کا موجب تھا۔

گناہ پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ضرر اس کو زیادہ پہنچے یا اس کے اعمال نامہ میں درج ہو۔ کیفیت اس کی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جس طرح وہ چاہے کرے' ہم نفس ایصال کے قائل ہیں۔ اگر اولاد صالحہ اپنے متوفی والد کے حق میں دعا مغفرت کرے تو یہ دعا بشرطیکہ قبولیت کو پہنچ جائے تو اس کے والد کی مغفرت ہو جائے گی۔ بشرطیکہ وہ موحد ہو مشرک نہ ہو۔

کتاب الروح کے ص-۱۷۸ میں بحوالہ مسند احمد یہ حدیث ہے کہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ عاص بن وائل نے زمانہ جاہلیت میں یہ نذر مانی تھی کہ میں سو اونٹ راہ الٰہی میں ذبح کروں گا۔ وہ فوت ہو گیا۔ ہشام بن عاص نے تو اپنے باپ کی طرف سے پچپن اونٹ ذبح کر کے نذر اپنے حصہ کی پوری کر دی۔ کیا اب میں بھی اپنے باپ کی طرف سے اپنا حصہ کی باقی نذر پوری کر دوں تو کیا اس کو نفع ہو گا؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا "اما ابوک فلو اقر بالتوحید فصمت و تصدقت عنه ینفعه ذالک" یعنی اگر تیرے باپ نے توحید کا اقرار کیا اور کلمہ پڑھا ہے تو اس کی طرف سے تو اگر روزہ رکھے گا یا

صدقہ کرے گا تو تیرے باپ کو اس کا نفع پہنچے گا۔ پس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ احیاء کے اعمال صالحہ کا نفع اموات کو پہنچتا ہے جبکہ ایصال ثواب کی نیت سے کئے جائیں۔

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الروح کے ص-۱۷۶ پر یہ فصل منعقد کی ہے کہ میت کے یعنی اعمال کے سوا احیاء کے اعمال کا ثواب جو ایصال ثواب کے ارادہ سے میت کے انتفاع کے لیے کئے جائیں تو اس کو نفع پہنچتا ہے۔ اس پر قرآن و حدیث ناطق ہیں اور اجماع اہل حق اور قواعد شرع بھی اس کے مثبت ہیں۔ چنانچہ اس کے اثبات کے لیے وہ دلائل ذکر کئے ہیں جو اہل علم میں مسلم ہیں۔ چنانچہ میت پر نماز جنازہ بھی اسی اصول پر مشروع ہے۔

حضرت العلامہ فرماتے ہیں: قد دل علی انتفاع المیت بالدعاء ---- اجماع الامۃ علی الدعاء له فی صلوۃ الجنازۃ یعنی "نماز جنازہ میں جو میت کے لیے دعاء کی جاتی ہے اس سے میت کو نفع پہنچتا ہے۔" اس پر امت کا اجماع ہے۔ لیکن اس مسلمہ حقیقت پر بھی ڈیرہ غازی خاں کا نانی والا ملحد اپنے اشتہار میں یہ لکھتا ہے کہ جب میت کو کچھ نہیں پہنچتا تو جنازہ کیوں پڑھا جاتا ہے؟ یہ سوال منکرین سے بالکل منقول ہے۔ لیکن ملحد مجہول اس کا یہ جواب دیتا ہے جو اس کی جہالت پر بین دلیل ہے کہ جنازہ ہر شخص پر فرض نہیں ہے۔ یہ کیسی غیر معقول بات ہے جس کو نفس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ نماز جنازہ فرض عین ہو یا فرض کفایہ۔ دس شخص پڑھیں یا لاکھوں بہرکیف اس میں نفع میت کے لیے دعائیں مشروع ہیں جن سے میت کو نفع ہوتا ہے تو اس سے احیاء کے اس عمل سے اموات کو انتفاع ثابت ہوتا ہے جس سے اس ملحد کا دعویٰ باطل ہوا۔

پھر اپنی عقل کا یوں ماتم کرتا ہے کہ "میت کے ورثاء اقرباء یار دوست جمع ہوتے ہیں۔ دعا کرنے کا ایک ذریعہ نماز جنازہ قائم کر دیا گیا تاکہ رونے میں مشغول نہ ہوں' دعاء مغفرت میں مشغول ہو جائیں" کیسی احمقانہ بڑھانکدی کہ یہ نماز جنازہ گھر والوں کو رونے سے ہٹانے کے لیے ایک شغل ہے۔ اس لیے نماز جنازہ قائم کی گئی ہے۔ میت کو نفع پہنچانے کے لیے نہیں ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ جس میت پر لوگ نہ روئیں تو اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے ؂

بریں عقل و دانش بباید گریست

یہ ملحد ایسی بیہودہ باتوں کی اشاعت کے لیے اشتہار بازی کرتا رہتا ہے۔ نماز جنازہ اموات

کی مغفرت کے لیے بہت بڑا وسیلہ ہے جس کو یہ ثنائی کی سی عقل رکھنے والا ایک طبعی شغل تصور کرتا ہے جو اس کے بلید الفہم ہونے پر پختہ دلیل ہے۔ منتقی بمع نیل الاوطار جلد۔۴' ص۔۵۴ میں یہ حدیث ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسلمان فوت ہوا اور اس پر ایسے چالیس موحدین نے نماز جنازہ پڑھ دی جنہوں نے شرک نہیں کیا تو انہوں نے جو اس نماز میں میت کے لیے بخشش کی دعاء اور سفارش کی ہے' اس کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ اسی طرح کی کئی احادیث وارد ہیں' جن سے احیاء کی طرف سے انتفاع للمیت ثابت ہوتا ہے اور ملحد کے بد عقیدہ کی ناک کٹ جاتی ہے۔

تمام علماء عرب و عجم نماز جنازہ اور دعاء للمیت کے قائل و فاعل ہیں اور ملحد ثنائی والا شاذ رہ کر من شذ شذ فی النار کا مصداق ہو چکا ہے ؎

پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

ملحد نے خلاف حدیث نبوی یہ بکواس کی ہے کہ دعا بھی خاص میت کے لیے نہیں ہے۔

سب زندہ اور مردہ' مرد عورت' چھوٹے بڑے' موجود غائب سب کے لیے دعا کی جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ملحد کا یہ قول مردود ہے۔ جب یہ شرارت پر آتا ہے تو بخاری و مسلم کی احادیث صحیحہ کو غلط کہہ دیتا ہے جن کی صحت پر امت کا اجماع ہوتا ہے اور جب اپنی خواہش کے مطابق کسی روایت کو پاتا ہے تو اس کو قبول کر لیتا ہے خواہ اس میں جرح اور قدح پائی جاتی ہو۔ چنانچہ زندہ مردہ کی مشترکہ دعاء کی روایت پر بعض محدثین کی جرح نیل الاوطار وغیرہ میں مذکور ہے اور ان احادیث کو عمداً نظر انداز کر دیا ہے جو میت کی مخصوص دعاؤں کے بارے میں وارد ہیں۔ چنانچہ منتقی بمع نیل جزو رابع' ص۔۳۳ میں یہ قولی حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء (رواہ ابوداؤد وابن ماجه) یعنی "جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھو تو اس کے حق میں خالص دعاء کرو۔" اس حدیث کی تائید صحیح مسلم و نسائی کی اس حدیث سے ثابت ہے کہ عوف بن مالک رض نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک میت پر نماز جنازہ پڑھی تو یہ دعاء پڑھی: اللهم اغفر له وارحمه واعف عنه وعافه واکرم نزله ووسع مدخله واغسله بماء وثلج وبرد ونقه من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس وابدله دارا خیره من داره واهلا خیرا من

اهله وزوجا خیرا من زوجه وقه فتنة القبر وعذاب النار یعنی "یااللہ بخش گناہ اس میت کے اور رحم کر اس پر اور عافیت بخش اس کو اور معاف کر اس کو اور عزت والی کر مہمانی اس کی اور فراخ کر قبر اس کی اور پاک کر اس کے گناہوں کو پانی سے اور برف سے اور اولوں سے اور پاک کر دے اس کو گناہوں سے جس طرح پاک کرتا ہے تو سفید کپڑے کو میل سے اور دنیا کے گھر سے بہتر اس کو گھر دے اور اس کے اہل سے بہتر اہل دے' الخ۔

راوی حدیث صحابی حضرت عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: فتمنیت ان لو کنت انا المیت لدعاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لذالک المیت "کہ میں نے یہ دعاء سن کر آرزو کی کہ کاش یہ میت آج میں ہوتا تو اس میت کے لیے جو دعاء پڑھی ہے اس سے شرف حاصل کرتا۔" اس حدیث سے میت کے لیے خصوصی دعاء ثابت ہوئی اور یہ بھی ظاہر ہوا کہ زندوں کی دعاء سے اموات کو نفع پہنچتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ عذاب اور فتنہ قبر کا حق ہے۔ اس ملحد کے تینوں باطل عقیدے اس حدیث سے مردود ہوئے۔

مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رئیس الصحابہ نے ایک بچہ کا جنازہ پڑھا تو اس پر یہ دعا پڑھی: اللھم اعذہ من عذاب القبر کہ "یااللہ اس بچہ کو عذاب قبر سے بچانا۔" اس روایت سے بھی عذاب قبر کا ہونا ثابت ہوا اور عذاب قبر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

مرعاۃ المفاتیح جلد ۲' ص ۴۹۵ میں ہے: لیس المراد بعذاب القبرھنا عقوبة بل مجرد الالم بالغم والحسرة والوحشة والضغطة وذالک بعم الاطفال وغیرھم یعنی "اس حدیث میں عذاب سے مراد سزا دینا نہیں ہے بلکہ محض تکلیف قبر میں بچہ کو تنہائی کی گھبراہٹ اور تنگی وغیرہ مراد ہے۔"

یہ حدیث بظاہر فعل صحابی کا ہے مگر حکماً مرفوع ہے کہ اس میں رائے اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ بہرکیف نماز جنازہ میت کو نفع پہنچانے کے لیے مشروع کی گئی ہے اور یہ نفع اہل ایمان کے لیے ہے۔ اہل کفر کو یہ نفع پہنچانا ممنوع ہے۔ چنانچہ قرآن میں وارد ہے کہ مت نماز پڑھ ان میں سے کسی پر بھی جو مر گیا ہے اور نہ دعا کے لیے اس کی قبر پر کھڑا ہو کیونکہ کفر کیا ہے انہوں نے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے اور مر گئے وہ اس حال میں کہ نافرمان تھے۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ نماز جنازہ میت پر پڑھنا اور قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا مغفرت

کا بہت بڑا وسیلہ ہے جو مومن کے لیے مشروع اور کافر اور منافق کے لیے ناجائز ہے۔ پس اس کو رونے پیٹنے کے دفع کرنے کے لیے شغل ٹھہرانا اور میت کو نفع پہنچانے سے انکار کرنا بدیہی کفر ہے جس کا ثانی والے ملحد نے ارتکاب کیا ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں بخاری و مسلم کی صحیح روایت ہے کہ مسجد میں جھاڑو دینے والی عورت کی قبر پر جا کر آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھی تو پھر فرمایا ان هذه القبور مملوة ظلما علی اهلها وان الله ینورهالهم بصلٰوتی علیهم (متفق علیه) یعنی "یہ قبریں بھری ہوئی ہوتی ہیں تاریکیوں سے مردوں پر، پس تحقیق روشن کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو میری نماز جنازہ سے۔" اس حدیث سے صاف طور پر ثابت ہوا کہ زندوں کے عمل سے اموات کو نفع پہنچتا ہے خواہ اس کے اعمال نامے میں درج ہو یا نہ ہو۔ اس کا منکر کافر ہے اور اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ قبر پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ پھر اس ملحد نے میت کے قرضہ ادا کرنے کی بابت یہ لکھا ہے کہ جس نے قرضہ ادا کیا، اسی کے کاغذات میں درج ہوں گے کہ فلانے کا قرضہ فلاں شخص نے ادا کر دیا ہے۔ یہ حقوق العباد ہے، حقوق اللہ دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔ خواہ کسی کے کاغذات میں درج ہو۔ یہ تو مان لیا ہے کہ احیاء کے عمل سے اموات کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس سے اس ملحد کا یہ دعویٰ اشتہاری باطل ہوا کہ اعمال کرنے والے کے اعمال نامے میں درج ہوتے ہیں تو مرنے والے کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ یہاں قرضہ کے بارے میں غور کر لو کہ میت کا قرضہ ادا کرنے والے کے اعمال نامے میں قرضہ ادا کرنا درج ہوا لیکن میت کو یہ فائدہ ہوا کہ اس کا قرضہ ادا ہو گیا۔ زندہ کے عمل سے میت کو نفع پہنچ گیا ہے۔ حالانکہ میت کے اعمالنامے میں درج نہ تھا۔ قرض کی ادائیگی میراث کی تقسیم پر مقدم ہے۔ میت مقروض کا آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب ایک شخص نے اس کی ادائیگی کا ذمہ لے لیا تب نماز جنازہ پڑھ دی۔

مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدیون میت کے بھائی کو یہ فرمایا: ان اخاک محبوس بدینه فاقض عنه یعنی "تیرا بھائی قرضہ کے بدلہ میں قید ہے تو اس کا قرضہ ادا کر دے۔" یعنی عالم برزخ میں وہ قید ہے کہ وہ نعمتوں کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ صالحین میں شامل ہو سکتا ہے۔ صحابی راوی حدیث بیان کرتا ہے: فذهبت فقال فقضیت عنه ثم جئت فقلت یارسول الله قد قضیت عنه یعنی "پس گیا میں اور اپنے بھائی کا قرضہ ادا کر دیا اور واپس آ کر

عرض کیا کہ میں نے اپنے بھائی کا قرضہ ادا کر دیا ہے۔"

ایسی کئی احادیث ہیں جن سے یہ ثابت ہوا کہ مقروض عالم برزخ میں ماخوذ ہوتا ہے اور اس کا وارث قرض ادا کر دے تو وہ رہا ہو جاتا ہے۔ اس حدیث سے عالم برزخ میں عذاب و ثواب کا وجود پایا جاتا ہے جس پر امت کا اجماع ہے جس کا منکر کافر ہے۔ جیسے حقوق العباد میں نیابت درست ہے اور وہ غیر کی طرف سے ادا ہوتے ہیں' ایسے ہی حقوق اللہ کا قرضہ بھی ادا ہو جاتا ہے۔ ملحد نے اپنے اشتہار ناقابل اعتبار میں اس کی نفی کی ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے خود اس سے استدلال کیا ہے۔ چنانچہ صحیح احادیث میں یہ وارد ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا کہ میری والدہ وفات پا گئیں اور اس کے ذمہ ایک ماہ کے روزے تھے۔ یارسول اللہ! کیا میں وہ روزے اس کی جانب سے ادا کر سکتا ہوں؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہاں۔ فدین اللّٰہ احق ان یقضی "کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قرضہ ہے جو مخلوق کے قرضہ کے ادا کرنے سے زیادہ ادا کرنے کے لائق ہے۔"

حج کے بارے میں ایک عورت نے سوال کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی' وہ حج نہ کر سکی اور مر گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا' ارایت لو کان علی امک دین اکنت قاضیته "بھلا یہ بتا کہ اگر تیری ماں کے ذمہ قرض ہوتا تو اس کو اتارتی یا نہ۔" اقضوا اللّٰہ فاللّٰہ احق بالقضاء۔ یعنی "اللہ تعالیٰ کو اس کا حق ادا کرو وہ سب سے زیادہ حقدار ہے کہ اس کا قرضہ ادا کیا جائے۔"

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ کتاب الروح کے صفحہ ۱۰۰ میں فرماتے ہیں: اجمع المسلمون علی ان قضاء الدین یفسامه من ذمته ولو کان من اجنبی او من غیر ترکته یعنی "اس بات پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اگر میت کا کسی نے قرضہ ادا کر دیا تو ادا ہو جائے گا' خواہ کوئی اجنبی ادا کر دے اور خواہ اس کے ترکہ سے ادا نہ کرے بلکہ اپنی طرف سے ادا کر دے۔"

بہرصورت قرضہ ادا ہو جائے گا۔ پس اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرضہ بھی ادا کرنے سے ادا ہو جائے گا۔ اب جو شخص اس کی تکذیب کر کے استدلال نبوی کو باطل اور بیکار کرے گا وہ کافر ہے جو تکذیب رسول کا مرتکب ہو گا۔ اور وہ خارق اجماع ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: من اعتقدان الانسان لا ینتفع الا بعمله فقد خرق الاجماع وذالک باطل من وجوہ کثیرہ یعنی "جس شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنے عمل کے سوا کسی کے عمل

سے انتفاع حاصل نہیں کر سکتا وہ خارق اجماع ہے اور اس کا یہ عقیدہ کئی وجوہ سے باطل ہے۔" ایک یہ کہ انسان دوسرے کی دعا سے نفع حاصل کرتا ہے' یہ عمل غیر سے انتفاع ہے۔ دوم یہ کہ آنحضرت ﷺ موقف حشر میں شفاعت کرائیں گے' یہ عمل غیر سے انتفاع ہے۔ سوم یہ کہ اہل کبائر کی شفاعت کرائیں گے' یہ عمل غیر سے انتفاع ہے۔ چہارم یہ کہ ملائیکہ اہل ایمان کے لیے دعا مغفرت کرتے ہیں' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ پنجم یہ کہ اللہ تعالیٰ جہنم سے بغیر عمل کے لوگوں کو اپنی رحمت سے نکالیں گے' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ ششم یہ کہ اولاد مومنوں کی اپنے باپوں کے عمل سے ان کے ساتھ شامل ہو گی' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ ہفتم دو یتیم بچوں کے خزانہ کو بچایا کہ ان کا باپ صالح تھا۔ اس کے طفیل سے' ہشتم میت کو ان کے وارثوں کے صدقہ خیرات سے نفع ملتا ہے' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ نہم حج سے میت کو نفع ملتا ہے' یہ نفع بھی غیر ہے۔ دہم حج منذور۔ سوم منذور کی ادائیگی سے نفع ملتا ہے' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ گیارھواں یہ کہ آنحضرت ﷺ نے مدیون کے جنازہ سے انکار کیا تو ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے قرض ادا کر دیا۔ یہ نفع بعمل غیر ہے۔ بارھواں ایک شخص جماعت سے رہ گیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو اس شخص پر صدقہ کرے کہ جماعت کرا کر نماز پڑھا دے' یہ عمل غیر سے نفع ہے۔ تیرھواں کسی مدیوں کا لوگ قرضہ ادا کر دیں تو یہ نفع بعمل غیر ہے۔ چودھواں یہ کہ جس نے کئی مظالم کئے' لوگوں نے اس کا تصفیہ کرا دیا تو یہ عمل غیر سے نفع ہے۔ پندرھواں یہ کہ صالح ہمسایہ نے اس کی زندگی اور موت کے بعد نفع پہنچایا' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ سولھواں یہ کہ اہل ذکر کے پاس جو شخص بیٹھا اس کو بخش دیا' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ سترھواں نماز جنازہ مسلمانوں سے نفع ہوا' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ اٹھارواں قرآن میں ہے کہ جب تک آپ ان لوگوں میں ہیں' اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرتا' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ انیسواں صدقہ فطر چھوٹی اولاد اور غلام کا مالک ادا کرتا ہے' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ بیسواں یہ کہ یتیم لڑکے اور دیوانہ کے مال سے زکوٰۃ ان کا متولی اور وارث ادا کرتا ہے ان کو نفع ملتا ہے' یہ نفع بعمل غیر ہے۔ علاوہ ان کے بہت صورتیں ہیں۔ لہٰذا یہ عقیدہ صحیح نہیں ہے۔

ثانی والے ملحد نے اشتہار میں یہ لکھا ہے کہ مرنے کے بعد دوسرے کے عمل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا خود عمل کرو اور دوسرے کی طرف سے عمل نہ کرو۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ھی من نجاسات معد اصحابھا ورجیع افواھم "یہ قیاسی باتیں اور بکواسات

ان کے موہنہ کی نجاستیں ہیں جو اپنے اصحاب کو تیار کر کے دے رہے ہیں۔" شریعت الٰہی میں ایسی نجاستوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

پھر ص-۲۰۷ کتاب الروح میں حدیث لکھتے ہیں کہ ایک عورت آنحضرت ﷺ کے پاس آئی: قالت فانها ماتت وعليها صوم شهر قال صومي عن امك قالت وانها ماتت ولم يحجج قال حجي عن امك (رواه مسلم في صحيحه من اوجه عن عبدالله بن عطاء) یعنی "اس عورت نے یہ دریافت کیا کہ میری ماں مرگئی' اس کے ذمہ ایک مہینہ کے روزے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ تو اس کی طرف سے روزے رکھ۔ پھر اس نے کہا کہ وہ مرگئی اور اس نے حج بھی نہیں کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تو اس کی طرف سے حج بھی کر۔ اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں کئی طریقوں سے روایت کیا ہے۔"

پس ملحد منکر حدیث کی اشتہاری بکواس نجاست ثابت ہوئی جو اس نے اپنے اصحاب پر پھینکی ہے۔ یہ ملحد اس طرح نیابت کے عمل کو شرک قرار دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو شرک کی تعلیم دینے والے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو عمل کرنے والے تھے' ان کو مشرک ٹھہرا رہا ہے جو سراسر اس کے منہ اور قلم کی گندگی ہے جو اس کی دبر کی گندگی سے بدترین ہے اور ص-۲۰۲ میں حدیث کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ہے: من مات وعليه صيام صام عنه وليه یعنی "جو شخص مرگیا اور اس کے ذمہ روزے تھے تو اس کا وارث اس کی طرف سے روزے رکھے۔" (اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے) یہ حدیث صحیح ہے جس کی بابت فرماتے ہیں: ولا سبيل الى مقابلته الا بالسمع والطاعة والاذعان والقبول یعنی "اس حدیث کے مقابلہ کی کوئی شخص طاقت نہیں رکھتا مگر یہ کہ وہ اپنی خطا کا اقرار کر کے اس کو مان لے اور عمل کر لے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ ملحد تو ایسا ڈھیٹ اور بے شرم ہے' خواہ حدیث بخاری و مسلم کی کیسی ہی صحیح ہو' وہ اپنے منہ کی نجاست اس پر ضرور پھینکے گا۔ چنانچہ اپنے اشتہار میں یہ ملحد بلکار کہتا ہے' "محمد ﷺ و خلفاء اربعہ نے اپنے فوت شدہ کے لیے کچھ نہیں کیا۔ یہ صرف علماء کی ایجاد ہے۔" نہایت افسوس ہے کہ ٹلانی والا ملحد اپنی گمراہی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا ہے کہ اس نے آنحضرت ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم پر افتراء باندھ دیا کہ انہوں نے فوت شدہ کے لیے کچھ نہ کیا۔ حالانکہ انہوں نے فوت شدگان کے حق میں بہت کچھ کیا جس کی تفصیل

احادیث میں موجود ہے اور علماء سلف و خلف پر بہتان باندھ دیا کہ انہوں نے یہ مسئلہ اپنی طرف سے اختراع کیا ہے۔ لعنة اللّٰه علی الکاذبین۔

قرآن شاہد ہے کہ وہ یہ دعاء کرتے رہے ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان کہ اے رب ہمارے بخش تو ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گذر چکے ہیں۔ دعاء مغفرت سے بڑھ کر فائدہ کیا ہو گا۔ اور اموات کے لیے نماز جنازہ میں دعائیں کرتے رہے۔ اور قبروں کی زیارت کے وقت بھی دعائیں کرتے رہے اور ان پر سلام بھیجتے رہے۔

اور منتقی الاخبار بمع نیل الاوطار جلد۔۵' ص۔۱۰۹ میں ابو رافع رضی اللہ عنہ کی روایت سے حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دنبے موٹے چت کبرے سینگدار قربانی میں ذبح کیے۔ ایک سالم اپنی سب امت کی طرف سے جس پر ذبح کے وقت یہ فرمایا اللھم ھذا عن امتی جمیعا من شھد لک بالتوحید وشھد لی بالبلاغ "کہ یااللہ یہ قربانی میری سب امت کی طرف سے ہے جنہوں نے توحید اور رسالت کی گواہی دی ہے۔" اس حدیث سے ملحد کی ناک کٹ گئی جو یہ تھی کہ دوسرے کی طرف سے عمل نہ کرو اور دوسرے کے عمل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دنبہ اپنی تمام امت موحدین کی طرف سے قربانی کیا جس کا سب کو فائدہ پہنچا۔

سبل السلام جزء۔۴' ص۔۹۰ میں امام محدث امیر صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انه یصح نیابة المکلف عن غیره فی فعل الطاعات وان لم یکن من الغیر امر ولا وصیته فیصح ان یجعل ثواب عمله لغیره صلٰوة کانت او غیرها یعنی "حدیث قربانی نبوی سے یہ مسئلہ صحیح ثابت ہوا کہ مکلف شخص کی غیر کی نیابت تعبدی امور میں درست ہے۔ اگرچہ غیر شخص نے ان میں نیابت کرنے کا نہ حکم کیا ہو اور نہ وصیت کی ہو۔ پس صحیح ہے کہ اپنے صالح عمل کا ثواب خواہ نماز ہو یا اور کوئی عبادت کا کام اپنے غیر کو پہنچا سکتا ہے۔" پس ملحد کا عقیدہ باطل ہوا۔

ابوداؤد میں یہ حدیث ہے کہ حنش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ دو دنبے قربانی کیا کرتے تھے۔ تو میں نے کہا کہ کیا کرتے ہو؟ قربانی میں تو ایک دنبہ کافی ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ وصیت کی تھی کہ میں ان کی طرف سے قربانی

کیا کروں۔

اس حدیث کی اسناد میں حنش ایک راوی ہے جس پر جرح ہے لیکن دوسری حدیث اس کی شاہد اور موید ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک دنبہ اپنی سب امت کی طرف سے کیا تھا۔ عون المعبود جلد ثالث ص-۵۰ میں ہے: فالاموات والاحیاء کلھم من امتہ صلی اللہ علیہ وسلم دخلوا فی اضحیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم "کہ امت محمدیہ کے مردے اور زندے سب آنحضرت ﷺ کی قربانی میں شامل ہیں۔ لیکن ملحد کے سر پر ایسے گمراہی کے سینگ ہیں کہ وہ مستی میں ہو کر شریعت محمدیہ کا مسئلہ کتنا جبل عظیم ہو' وہ اس سے ضرور ٹکراتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اشتہار میں جس سے اہل حق بیزار ہیں یہ لکھتا ہے کہ یہ بات جھوٹی احادیث کی بنا پر عام مشہور ہو گئی ہے کہ حضور ﷺ تک درود پہنچایا جاتا ہے جبکہ زندگی میں حضور ﷺ تک درود نہیں پہنچایا تو انتقال کے بعد کیسے پہنچایا جاتا ہے۔

چونکہ یہ ملحد نہ اہل حدیث اور اہل سنت ہے اور نہ اہل ایمان سے ہے۔ اس لیے ان صحیح اور حسن احادیث کو منکرین حدیث کے گروہوں میں شمولیت کر کے جھوٹی کہہ رہا ہے۔ اس بناء پر یہ شخص ملحد اور زندیق ہے جس کے کسی مسئلہ کا اعتبار نہ کرنا چاہیے۔

ابوداؤد جلد اول' ص-۲۷۹ میں یہ صحیح حدیث وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ما من احد یسلم علی الارد اللہ علی روحی حتی ارد علیہ السلام یعنی "کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام کہتا ہو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے' یہاں تک کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں۔"

عون المعبود جلد ثانی' ص-۱۷۱ میں ہے کہ امام نووی نے اذکار اور ریاض الصالحین میں کہا ہے اسنادہ صحیح کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔ اور ابن حجر نے کہا ہے رواتہ ثقات کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں۔ نیز ابوداؤد بمع عون المعبود جلد اول' ص-۴۰۵ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: فاکثروا علی من الصلوٰۃ فیہ فان صلوٰتکم معروضۃ علی "کہ جمعہ کے دن مجھ پر بکثرت درود پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔"

ابن ماجہ میں صحیح حدیث ہے: ان احد الن یصلی علی الاعرضت علی صلواتہ حتی یفرغ منھا قال قلت وبعد الموت وقال وبعد الموت۔ یعنی "کوئی شخص جو مجھ پر درود پڑھتا ہے وہ مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو۔ میں نے کہا کہ موت

کے بعد بھی پیش ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا- ہاں موت کے بعد بھی-"

اس حدیث کے بارے میں علامہ عزیزی سراج منیر جلد اول' ص-۲۹۰ میں فرماتے ہیں ورجالہ ثقات کہ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں- تہذیب التہذیب میں ہے: رجالہ ثقات اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں- اسی طرح اور احادیث بھی وارد ہیں جو سب ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں-

عون المعبود میں ہے کہ اس کی سند بالکل کھری ہے- نسائی شریف جلد اول' ص-۱۴۳ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ان اللہ ملائکتہ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام "کہ بیشک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے فرشتے مقرر ہیں جو زمین میں گھومتے پھرتے ہیں اور میری امت کا سلام مجھ پر پہنچاتے ہیں-" مجمع الزوائد میں ہے کہ اس حدیث کو بزار نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں- حدیث صحیح ہے-

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ عالم برزخ میں زندہ ہیں- اور امت کے لوگوں کا سلام و درود آنحضرت ﷺ کو بذریعہ ملائیکہ پہنچایا جاتا ہے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے- اس کا کسی عالم محقق اور محدث نے انکار نہیں کیا- منکرین حدیث نے انکار کیا ہے' سو یہ فرقہ علماء اسلام کے نزدیک مردود ہے- اس گروہ کے علماء سے بچنا واجب ہے- والسلام

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث جلد-۵۸' شمارہ-۲۰' ۲۱' مورخہ ۲۹ شوال و یکم ذوالقعدہ سنہ-۱۳۹۷ھ

میت پر فاتحہ خوانی

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ جس گھر میت ہو جائے تین دن یا چار دن فاتحہ خوانی کرنی حدیث صحیحہ سے ثابت ہے یا نہیں- بینوا توجروا-

(السائل مولوی عبدالرحیم خطیب مسجد اہل حدیث چک نمبر-۲۸۱ ڈا کھانہ خاص ضلع لائل پور)

جواب: الحمد للہ رب العالمین- اما بعد! پس صورت بالا مذکورہ کا جواب یہ ہے کہ

آنحضرت ﷺ اپنے ہر خطبہ میں حمدوثناء کے بعد یہ فرمایا کرتے تھے: اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللّٰہ وخیر الھدی ھدی محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ یعنی "حمدوثناء کے بعد پس واضح ہو کہ سب کلاموں سے بہترین کلام اللہ تعالیٰ کی ہے جو بصورت قرآن نازل ہوئی ہے اور بدترین کاموں کے وہ کام ہیں جو دین میں اپنی طرف سے نئے پیدا کیے گئے اور ان کو دین سمجھا گیا۔" (یہ روایت صحیح مسلم کی ہے)

ترغیب و ترہیب جلد اول' ص-۸۷ میں بحوالہ ابوداؤد وترمذی یہ حدیث ہے: عن العرباض بن ساریۃ رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ایاکم والمحدثات وان کل محدثۃ ضلالۃ۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دین میں نئے کام نکالنے سے بچو۔ کیونکہ ہر نیا کام دین میں کرنا سراسر گمراہی ہے۔ ان دو احادیث سے یہ اصول ثابت ہوا کہ دین کے ہر کام میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ دیکھنا چاہیے۔ جو کام اسوہ حسنہ پر پورا اترے وہ کیا جائے' وہ امر مسنون ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ نہ کیا جائے' وہ محدث ہے۔ اسی کو بدعت کہتے ہیں۔ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں جانے کا موجب ہے۔ کہ بعض احادیث میں کل ضلالۃ فی النار بھی آیا ہے کہ ہر گمراہی آگ جہنم میں جانے کا موجب ہے۔

صورت مذکورہ در سوال جو ملک ہندوپاک میں مروج ہے۔ جس کے اکثر عوام کالانعام و خواص کالعوام عامل اور عادی ہیں۔ یہ سراسر بدعت اور گمراہی ہے۔ کیونکہ اس سے یہ کام عہد نبوی و عہد صحابہ و تابعین و عہد تبع تابعین و مجتہدین و محدثین میں باوجود داعیہ کے نہیں پایا گیا ہے۔ من ادعٰی فعلیہ البیان بالبرھان۔ پہلے اس صورت مروجہ پر غور کریں پھر ثبوت دیں۔ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اہل میت جنازہ و دفن سے فارغ ہو کر میت کے گھر پر فرش بچھا دیتے ہیں پھر سب بیٹھ کر ہاتھ اٹھا کر بحیثیت اجتماعی دعا کرتے ہیں جس میں فاتحہ اور قل ھواللہ پڑھ کر ایصال ثواب کرتے ہیں۔ اور فرش پر تین دن تک بیٹھتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح فاتحہ خوانی کرتے رہتے ہیں۔ جب کوئی نووارد آتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ کلام بخشو۔ پھر سب ہاتھ اٹھا کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ پھر دس منٹ یا آدھ گھنٹہ بعد کوئی آجاتا ہے تو وہ بھی اسی طرح کہتا ہے۔ تو پھر سب ویسے ہی کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ تین دن تک تو متواتر

جاری رہتا ہے- پھر فرش اٹھایا جاتا ہے اور کچھ کھانا پکا کر کھلایا جاتا ہے- پھر بیرونی لوگ تعزیت کے لیے آتے ہیں جو دوست' یار اور میت کے رشتہ دار ہوتے ہیں- وہ بھی اسی طرح کرتے ہیں- اگر کوئی محض تعزیت کے لیے آتا ہے تو وہ میت کے ورثاء کے پاس آتا ہے کہ فاتحہ خوانی کرے- اگر میت کا وارث گھر نہ ہو تو واپس ہو جاتا ہے- جب وہ ملتا ہے تو پھر اس سے مل کر فاتحہ خوانی کرتا ہے- یہ حال اس زمانے کے رواج کا ہے- پس یہ صریح بدعت اور گمراہی ہے- کیونکہ اس طرح کا تعامل آنحضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے- اگر یہ کام اچھا ہوتا تو آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرور اس پر عمل کرتے- تب یہ عمل تمام امت محمدیہ کے لیے اسوہ حسنہ مقرر ہو جاتا اور سب ہی اس پر عمل کیا کرتے- لیکن نہ آنحضرت ﷺ نے ایسا عمل کیا اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا تو پھر بدعت ہونے میں کیا شبہ رہا- بدعت نہایت بری چیز ہے- بخاری و مسلم وغیرہ کی یہ حدیث ہے: من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد "کہ جس شخص نے ہمارے دین میں ایسا نیا کام جاری کیا جو دین میں اس طور سے نہ تھا تو وہ کام اور کرنے والا شخص مردود ہے-"

پس فاتحہ خوانی محض لوگوں کا رواج ہے- جس پر پاک و ہند کے مسلمان رسمی طور پر عمل کر رہے ہیں- وضو ہو یا بے وضو' خواہ نمازی ہو یا بے نماز میت کے گھر فرش پر بیٹھ کر ضرور فاتحہ خوانی کرتا ہے- اور جو نہ کرے اس کو برا جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہنود یہود کی طرح بیٹھ کر چلا گیا ہے- حکم صرف یہ ہے کہ جس شخص نے سنا کہ فلاں مسلمان فوت ہو گیا ہے' اس کے گھر جا کر افسوس کرے' انا للہ پڑھے اور میت کے وارثوں' گھر والوں کو صبر دلائے اور زبانی طور پر یہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اور بخشے- تم صبر کرو' اللہ تم کو اجر دے گا- جزع' فزع اور نوحہ سے بچو- کہ اس سے گناہ ہوتا ہے اور اجر ضائع ہو جاتا ہے- پھر کفن دفن اور جنازہ میں شامل ہونے کی کوشش کرے اور قبر پر دعا کرے- پھر واپس ہو کر سب کو منتشر ہو جانا چاہیے- جب کوئی نووارد شخص تعزیت کرے تو زبانی طور پر اس طرح کر دے- اگر کسی شخص نے میت کی خیر خواہی کرنی ہو تو قبر پر جا کر یا نماز پڑھ کر اسی میت کے حق میں دعا کر دے اور کلام الٰہی سے یا مال سے ایصال ثواب کر دے- میت کے گھر اہل میت کے سامنے فاتحہ خوانی کرنا صرف باہمی لحاظ داری اور رسم قوم برادری کی ہے- میت کی خیر خواہی مقصود نہیں ہے- رسمی رواجی طریق سے جو دینی کام ہو اور اس میں لحاظ داری' ریا'

نمود وغیرہ کی ملاوٹ ہو تو وہ حرام اور منع ہے پھر ایسا کام جس کا ثبوت ہی نہ ہو' محض رسم کے طور پر کیا جائے تو اس کے بدعت اور حرام ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ للذا اہل حدیث لوگوں کا یہ فرض ہے کہ ایسی بدعات سے بچیں کیونکہ بدعت ایک تو خود گناہ ہے' دوسرا بدعت کرنے والے کے اعمال صالحہ کے قبول ہونے سے مانع ہے۔

حدیث میں ہے: ابی اللہ ان یقبل عمل صاحب بدعة حتی یدع بدعة۔ (ابن ماجه) یعنی "اللہ تعالیٰ نے انکار کیا ہے کہ میں بدعتی شخص کا کوئی عمل قبول نہیں کروں گا جب تک بدعت ترک نہ کرے۔" کیونکہ مروجہ فاتحہ خوانی بدعت ہے' اس سے بچنا واجب ہے۔ بندہ نے اس پر ایک رسالہ لکھا ہے' جس کا نام "فاتحہ خوانی" ہے۔ وہ کراچی برنس روڈ مسجد محمدی اٹیلری میدان نمبر۱ دفتر صحیفہ اہل حدیث اسی پتہ پر منگوا کر پڑھیں کہ اس میں اس مسئلہ پر مفصل بحث ہے۔ اور دیگر دیوبندی اور اہل حدیث علماء کے فتوے بھی موجود ہیں۔

عبدالقادر عارف الحصاری

ہفت روزہ اہل حدیث لاہور جلد-۲' شمارہ-۴۵' مورخہ ۵/ نومبر سنہ ۱۹۷۱ء

مروجہ فاتحہ خوانی اور تعزیت کا مسنون طریقہ

حضرات! اس زمانہ میں دیگر بدعات اور رسومات کی طرح ایک یہ طریقہ بھی عام طور پر رائج ہے کہ جس گھر کوئی شخص مرجاتا ہے' اس کے دفن کرنے کے بعد اہل میت مکان پر دری یا چٹائی بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب کوئی تعزیت کرنے والا آتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے "دعا کرو یا کلام بخشو" تب سب فرش پر بیٹھنے والے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ جب منہ پر ہاتھ پھیر کر فارغ ہوتے ہیں تو پھر حقہ نوشی کرنے لگ جاتے ہیں اور باتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات حقہ پیتے جاتے ہیں اور دعا کئے جاتے ہیں۔ اتنے میں کوئی دوسرا آجاتا ہے تو وہ بھی اسی طرح کہتا ہے۔ پھر سب ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ اسی طرح تعزیت کرنے والے دن اور رات میں یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں اور کلام بخشنے کا یہ طریقہ جاری رہتا ہے۔ تین دن تو مسلسل پابندی کے ساتھ جاری رکھتے ہیں پھر حسب ضرورت کسی نووارد کے آنے پر یا "موکان" آنے پر کرتے ہیں۔ اور اسی طرح کلام بخشتے رہتے ہیں۔ (میت کے رشتہ دار مرد عورت یا دوست احباب تعزیت کے لیے باہر سے

آئیں تو اس کو پنجابی میں "موکان" کہتے ہیں)

اور اس کا ایسا التزام ہے کہ جو شخص اس طرح دعاء نہ کرے اور کلام نہ بخشے تو اس کو بہت طعن کرتے ہیں بلکہ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں اور جو یہ کہہ دے کہ یہ طریقہ مشروع اور مسنون نہیں ہے بلکہ ایک رسم ہے تو اس سے لڑتے ہیں اور یہ جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم وہاں جا کر ہندوؤں کی طرح بیٹھ جائیں اور زانوں ٹکائیں یعنی اس طرح کلام نہ بخشنے والے کو ہندوؤں کے مشابہہ جانتے ہیں۔ یہ رواجی مسلمان اسی غرض سے ماتمی فرش بچھا کر گھر میں مجلس قائم کرتے ہیں کہ آنے جانے والے ان کی میت کی تعزیت کرتے رہیں اور اس کو کلام بخشتے رہیں۔ اس مجلس میں حقہ نوشی کا عام رواج ہے۔ خوب حقہ پیتے ہیں اور جب کوئی آجائے تو پھر فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر کلام بخشنے لگ جاتے ہیں۔ مگر سب بے وضو ہوتے ہیں اور اکثر دنیا کی باتوں میں مشغول رہتے ہیں۔

اگرچہ شہروں میں بعض جگہ قل یا کلمے پڑھنے کا رواج بھی ساتھ ہے۔ لیکن عام دیہات میں بھی رواج ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ اور اس رواج میں حنفی' دیوبندی' بریلوی اکثر اہلحدیث بھی غرق ہیں۔ حلانکہ یہ کام سراسر بدعت ہے اور محض رسم ہے' جس کا ثبوت اس ہیئت کذائیہ سے قرآن و حدیث و فقہ و تعامل سلف صالحین میں نہیں پایا گیا۔ اور نہ ہی آئمہ محدثین و مجتہدین نے اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ من ادعٰی فعلیہ البیان بالبرھان۔ چونکہ یہ وباء عام پھیلی ہوئی ہے' اس لیے اس کے بدعت ہونے پر مندرجہ ذیل دلائل اور علمائے دین کے فتوے پیش کرتا ہوں تاکہ اہل سنت صادقین اور حق پسند لوگ اس سے اجتناب حاصل کریں۔

دلائل : (۱) قرآن مجید میں ہے: واذکروہ کما ھداکم وان کنتم من قبلہ لمن الضالین○ یعنی "یاد کرو تم اللہ کو جس طرح اس نے تم کو سکھلایا ہے اور تحقیق تم اس کے بتلانے سے پہلے گمراہوں سے تھے۔" اس آیت سے ثابت ہوا کہ انسان نہ عبادت کے طریقہ سے آگاہ ہے اور نہ دعاء اور نہ ذکر الٰہی سے واقف ہے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور پیغمبر ﷺ کو بھیج کر انسان کو عبادت اور ذکر کا طریقہ سکھلایا ہے' وہی معتبر اور مقبول ہے۔

پس تمام قرآن مجید اور احادیث نبویہ کے دفتر میں نگاہ کیجئے۔ کسی جگہ میت کے گھر میں بیٹھ کر فاتحہ خوانی کرنے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا طریقہ نہیں سکھلایا گیا ہے۔ اور جو کچھ

سکھلایا گیا ہے' اس میں فاتحہ خوانی اور بار بار ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا ذکر نہیں ہے۔

(۲) قرآن کریم میں ہے: لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللّٰہ والیوم الاخر وذکر اللّٰہ کثیراO یعنی "البتہ تحقیق تمہارے لیے رسول اللہ ص نہایت اچھا نمونہ ہیں اور اس شخص کے واسطے اسوۂ حسنہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اپنے عملوں کے ثواب کی امید رکھتا ہے۔ اور دن قیامت کے رحمت چاہتا ہے اور ذکر الٰہی بہت کرتا ہے۔"

اس آیت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تمام مسلمانوں کے لیے جو اپنے عملوں کی قبولیت اور ثواب چاہتے ہیں اور قیامت میں اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ان کے لیے رسول اللہ ﷺ اسوہ حسنہ ہیں۔ ہر نیک کام میں آپ کی اقتداء اور پیروی کرنی ضروری ہے۔ شادی میں اور غمی میں آپ کے تعامل اور ہدایت کو دیکھنا چاہیے کہ آپ نے اس موقعہ پر کیا عمل کیا ہے؟ اور کس طرح کیا ہے؟ مثلاً جب کوئی شخص مر گیا تو کیا آپ نے اس کے گھر جا کر فاتحہ خوانی کی اور کلام بخشی ہے اور ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کا کام کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو ہمیں بھی کرنا چاہیے اور اگر کرنا ثابت نہیں ہے تو پھر ہمیں بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لا تقدموا بین یدی اللّٰہ ورسولہ "کہ اے مومنو! تم اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھو" یعنی صرف اتنا کام کرو جتنا وہ حکم دیں۔

(۳) آنحضور ﷺ نے خطبہ پڑھا تو فرمایا کہ فان خیر الحدیث کتاب اللّٰہ وخیر الھدی ھدی محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا ----- وکل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔ (نسائی وغیرہ) یعنی "سب کتابوں سے بہتر کتاب اور سب کلاموں سے بہتر کلام تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور سب طریقوں سے بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے اور بدترین چیزوں میں وہ چیزیں ہیں جو دین میں نئی نکلی ہوئی ہیں اور ہر نیا کام گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں ہے۔"

اس خطبہ نبویہ سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ جو کچھ قرآن اور تعامل نبوی سے ثابت ہوا وہ صحیح ہے اور جو نیا کام دین میں پیدا ہوا وہ بدعت ہے۔ اور ہر بدعت دوزخ میں جلنے کا موجب ہے۔ میت کے گھر میں بیٹھ کر فاتحہ خوانی کرنا اور ہاتھ اٹھا کر کلام بخشنا قرآن اور تعامل نبوی اور طریقہ محمدی سے ثابت نہیں ہے بلکہ دین میں نیا پیدا کیا گیا ہے۔ اور ملک ہندوستان

اور پاکستان میں پیدا ہوا ہے لہٰذا بدعت ہے- اور اس بدعت پر اڑنے والے دوزخی ہیں-

(۴) عن العرباض بن سارية قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اياكم والمحدثات فان كل محدثة ضلالة (ترغیب و ترهیب) یعنی "عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نئے نئے کاموں سے بچو- کیونکہ دین میں ہر نیا کام گمراہی ہے-" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین میں نیا کام کرنا گمراہی ہے- لہٰذا فاتحہ خوانی مروجہ گمراہی ہے- کیونکہ یہ دین میں نیا کام ہے-

(۵) حدیث میں ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم یفشو الکذب "کہ سب زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو ان کے قریب ہیں پھر ان لوگوں کا جو ان کے قریب ہیں پھر جھوٹ پھیل جائے گا-" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو دین کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ میں ہوا ہے' وہ تو درست ہے اور اس پر عمل جائز ہے اور جو ان کے بعد ہوا وہ جھوٹ ہے- اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے- چنانچہ میت کے گھر فاتحہ خوانی کرنا اور ہاتھ اٹھا کر کلام بخشنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں نہیں پایا گیا بلکہ یہ بعد کے زمانہ میں پھیلا ہے- لہٰذا یہ سراسر جھوٹ ہے اور جائز سمجھ کر کرنے والا بالکل جھوٹا ہے- جو شخص اس کے جائز ہونے کا دعویٰ کرے اس کو چاہیے کہ ان تین زمانوں میں اس کے ہونے کا ثبوت پیش کرے-

(۶) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے کہ من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ایسا قول یا فعل ایجاد کرے کہ وہ ہماری شریعت میں قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہے تو وہ شخص اور اس کا وہ کام دونوں مردود ہیں- جب فاتحہ خوانی مروجہ ثابت نہیں ہے تو یہ کام کرنے والے مردود ہوئے- جب یہ کام اور اس کے کرنے والے مردود ہوئے تو میت کو کچھ بھی نہیں پہنچے گا-

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابی الله ان یقبل عمل صاحب بدعة (ابن ماجه) یعنی "اللہ تعالیٰ نے بدعتی شخص کے عمل قبول کرنے سے انکار کیا ہے-" جب تک کہ بدعت کو ترک نہ کر دے- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بدعتی کے اعمال صالحہ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور صدقہ خیرات' دعاء و درود وغیرہ کچھ بھی قبول نہیں- چونکہ فاتحہ خوانی مروجہ

بدعت ہے۔ لہٰذا جب تک اس کو ترک نہ کیا جائے تب تک فاتحہ خوانی کرنے والوں کا کوئی عمل صالحہ قبول نہیں ہے۔ جب یہ عمل قبول نہیں تو میت کو کیا خاک پہنچے گا۔

(۸) عن انس بن مالک قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ حجب التوبة عن کل صاحب بدعة حتّٰی یدع بدعة۔ (ترغیب و ترھیب) یعنی "حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی شخص کی توبہ روک لی ہے یہاں تک کہ وہ بدعت کو چھوڑ دے۔" اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بدعتی شخص کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ پس فاتحہ خوانی مروجہ کرنے والوں کی توبہ قبول نہیں ہے۔

(۹) ترغیب میں حدیث ہے کہ غضیف بن حرث ثمالی کہتے ہیں کہ میری طرف عبدالملک بن مروان نے کہلا بھیجا کہ ہم نے لوگوں کو دو چیزوں پر جمع کیا ہے۔ ایک جمعہ کے دن ممبروں پر ہاتھ اٹھانا یعنی رفع یدین کرنا اور دوسرا صبح اور عصر کے بعد قصے بیان کرنا۔ غضیف نے جواب دیا کہ یہ دونوں کام بدعت ہیں۔ میں ان دونوں میں سے کسی کے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ عبدالملک نے کہا کہ کیوں؟ تو غضیف نے جواب دیا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب کوئی قوم بدعت شروع کرتی ہے تو اس کی مثل سنت ان سے اٹھالی جاتی ہے۔ پس سنت کو مضبوط پکڑنا بدعت کے پیدا کرنے سے بہتر ہے۔ پس اسی طرح فاتحہ خوانی مروجہ کرنے والوں کا یہ کام جو وہ مل کر کرتے ہیں بدعت ہے۔ اور اس کے عوض ان سے تعزیت مسنونہ مرفوع ہو گئی ہے۔ ان کو چاہیے کہ یہ بدعت چھوڑ کر سنت کو اختیار کریں۔

(۱۰) تلبیس ابلیس ص ۱۷ میں ہے کہ ابوالبختری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک مرد نے آکر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو یہ خبر دی کہ تحقیق ایک گروہ مغرب کے بعد مسجد میں بیٹھتا ہے۔ جن میں سے ایک شخص سب کو یہ کہتا ہے کہ اتنی دفعہ اللہ اکبر کہو اور اتنی دفعہ سبحان اللہ کہو اور اتنی دفعہ الحمد للہ کہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب جس وقت تم ان کو یہ کام کرتے دیکھو تو مجھے ان کی اس مجلس کی اطلاع دینا۔ جب اس نے خبر دی تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان کے پاس پہنچے اور بیٹھ گئے۔ جب ان کو اس طرح کہتے سنا تو کھڑے ہو گئے۔ مزاج کے سخت تھے (جوش میں) فرمانے لگے کہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہوں۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ تم بدعت اور ظلم کا ارتکاب کر رہے ہو۔ کیا تم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے علم میں فضیلت رکھتے ہو؟ عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اللہ

سے معافی چاہتا ہوں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم سیدھے راستہ کو لازم پکڑ لو اور اسی سے چمٹ جاؤ۔ اگر تم دائیں بائیں چلے تو سخت گمراہ ہو جاؤ گے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ خواہ ذکر الٰہی ہو یا کوئی عبادت ہو۔ اگر اسی کی ہیئت کذائیہ میں تغیر تبدل کر کے اس کی کسی ایسی صورت مکانیہ یا زمانیہ کا التزام کر لیا جس کا ثبوت قرآن و حدیث و تعامل صحابہ سے نہیں ہے تو وہ بدعت ہے۔ اس لیے فاتحہ خوانی مروجہ جس میں میت کے گھر جانا' میت کے وارث سے کہنا کہ کلام بخشو۔ اگر وہ گھر نہ ملے تو واپس چلے جانا اور فاتحہ وغیرہ کی تعیین کرنا ہاتھ اٹھانے کا التزام وغیرہ امور بدعت ہیں۔ یہ رسم اس ہیئت کذائیہ سے عہد نبوی اور صحابہ میں پائی نہیں گئی۔

(۱۱) عن ابن عمر انه یقول ان رفعکم ایدیکم بدعة لان ورسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لم یرفع علی هذا یعنی علی الصدر۔ (رواہ احمد) "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہارا زیادہ اونچے ہاتھ اٹھانا بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعاء میں سینہ سے اوپر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔" اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص کو لازم ہے کہ اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے۔ وہ یہ کہ نماز کے بعد داہنی طرف سے پھرنے کو ضروری سمجھنے لگے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بسا اوقات بائیں جانب سے پھرتے بھی دیکھا ہے۔ (بخاری مسلم)

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ کسی چیز کی ہیئت میں تغیر کرنا اور اس کا التزام کرنا یا کسی امر غیر ضروری کو ضروری جان کر اس کا التزام کرنا اور اس طور پابندی کرنا کہ فرائض اور واجبات سے زیادہ اس کا اہتمام ہو اور اس کے ترک کو مذموم اور تارک کو ملامت کی جائے تو یہ شرعی حکم کو بدل دینا ہے۔ اس تقید' تعیین' تخصیص التزام سے وہ جائز کام بھی بدعت ہو جائے گا۔ اس واسطے فقہاء نے نماز میں کسی خاص سورۃ کے معین کر لینے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور فتاویٰ عالمگیری میں استنجا کی پانچ قسمیں لکھی ہیں۔ جن میں سے چار کو جائز اور پانچویں کو بدعت قرار دیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ والخامس بدعة وھو الاستنجاء من الریح کہ ہوا خارج ہونے پر استنجا کرنا بدعت ہے۔ یہ گیارہ دلائل ہیں جن کے ساتھ ہر بدعت کے کام کو جانچا جائے گا اور ہر سنت کام بدعت کے کام سے ممتاز ہو جائے گا۔

رایت احد عشر کوکبا: ان گیارہ دلائل پر غور کرنے سے روز روشن کی طرح یہ ثابت

ہو جائے گا کہ میت کے گھر میں مروجہ فاتحہ خوانی بدعت ہے اور اس کے کرنے والے اہل بدعت میں شمار ہیں۔ خواہ وہ نام سے اہلحدیث کہلاتے ہوں یا اہل سنت، حقیقت میں وہ بدعتی ہیں۔ بدعت نہایت بری چیز ہے۔ خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اعتقادی ہو یا عملی اس سے پرہیز کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

چیلنج: بعض ملا، مولوی خصوصاً بعض رواج پرست اہلحدیث اس فاتحہ خوانی اور مروجہ کلام بخشی کو جائز کہتے ہیں اور عوام کو یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ یہ جائز اور درست ہے اور اس کا ثبوت ہے۔ لہٰذا ہم ان کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اس مروجہ فاتحہ خوانی اور کلام بخشنے کا ثبوت بعینہٖ قرآن و حدیث و تعامل صحابہ کرام و سلف صالحین سے پیش کریں۔ اگر ثبوت درست ہوا اور اس دعویٰ اور دلیل شرعی میں تقریب تام ہوئی تو ہم نہایت شکریہ کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہوئے اس کا ثبوت دینے والے کو مبلغ ایک سو (۱۰۰) روپیہ انعام دیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔ واللّٰہ علی ما نقول وکیل۔ ہاں البتہ عوام کی تسلی کے لیے ہم اہلحدیث علماء اور حنفی فقہاء کے فتوے پیش کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ مروجہ فاتحہ خوانی بدعت ہے۔ چنانچہ وہ فتوے درج ذیل ہیں، غور سے ملاحظہ فرما کر عمل درآمد فرمائیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ میت کے گھر میں فرش بچھا کر اہل میت بیٹھ جاتے ہیں پھر تعزیت کرنے والے آتے ہیں اور آکر ہاتھ اٹھا کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ زید کہتا ہے کہ یہ بدعت ہے۔ صرف زبان سے اہل میت کو صبر دلا کر میت کے حق میں اللھم اغفرلہ وارحمہ کہہ دینا درست ہے۔ بکر کہتا ہے کہ اگر آنے والے فرداً فرداً میت کے گھر میں آئیں اور میت کے حق میں ہاتھ اٹھا کر دعا کریں تو جائز ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ایسا کیا تھا جس کو آنحضرت ﷺ نے جائز رکھا تھا۔ جس کی کتاب الجنائز مصنف مولانا مبارک پوری میں تفصیل ہے۔ خلد کہتا ہے کہ فاتحہ خوانی اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بحالت مجموعی اہل میت اور تعزیت کنندگان کا جائز ہے جس کی دلیل حدیث فاطمہ رضی اللہ عنہا ہے اور دیگر مطلق احادیث ہیں جن سے ثابت ہے کہ دعاء سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جواب باصواب سے ممنون فرمایا جائے۔

الجواب: زید کا قول بالکل صحیح ہے۔ دیکھو مولانا مبارک پوری کی کتاب الجنائز ص-۵۳، ۵۷ حدیث فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نہ تو اہل میت کے یہاں فرش بچھانا ثابت ہوتا ہے

نہ اجتماع تعزیت کنندوں کا نہ فاتحہ پڑھنا نہ ہاتھا اٹھانا- اس باب میں میرا رسالہ جمع الرساتین ملاحظہ فرمائیے- والعلم عنداللہ المرقوم ۲۴/ رمضان سنہ ۱۳۵۵ھ (کتبہ محمد ابوالقاسم للمحمدی السنی السلفی الاثری السعیدی الراجفوتی البنارسی)

مفتی اعظم روپڑی کا فتویٰ: رسول اللہ ﷺ جب دفن میت سے فارغ ہوتے تو اس پر کھڑے ہوتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لیے بخشش مانگو اور ثابت قدمی کا سوال کرو کیونکہ وہ اس وقت سوال کیا جاتا ہے- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سنت طریق یہ ہے کہ وہیں کھڑے ہو کر بخشش کی دعاء مانگی جائے- اور ثابت قدمی کا سوال کیا جائے- چالیس قدم آکر دعا کرنا سنت کے خلاف اور بدعت ہے- جو شخص رسول اللہ ﷺ کا طریق چھوڑ کر اپنی طرف سے کوئی طریقہ جاری کرے' وہ رسول اللہ ﷺ کی امت سے نہیں- اب جو لوگ میت کے گھر میں صبح و شام جمع ہوتے ہیں- ان کو اس بات سے توبہ کرنی چاہیے- ایسا نہ ہو کہ ان کا یہ فعل نوحہ میں داخل ہو کر لعنت کا سبب ہو جائے- ثواب حاصل کرتے کرتے عذاب میں گرفتار ہو جائیں- مسند احمد میں زہیر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل میت کے گھر جمع ہونا' نیز کھانا تیار کرنا ہم نوحہ میں سمجھتے تھے- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل میت کے گھر جمع ہونا نوحہ یعنی پیٹنے میں داخل ہے- رسول اللہ ﷺ نے نوحہ کرنے والی اور سننے والی پر لعنت کی ہے- (خلاصہ مضمون رسالہ رد بدعات ص ۴'۵)

مولانا سید محمد یحییٰ کا فتویٰ: فاتحہ مروجہ شرعاً درست نہیں بلکہ بدعت سیئہ ہے- ثبوت جواز مدعی پر ہے- (سید محمد یحییٰ بن حضرت شاہ صاحب امیر جماعت اہلحدیث صوبہ پنجاب)

دیوبند کا فتویٰ: کلام مجید پڑھ کر ایصال ثواب کرنا تو فی نفسہ بہتر اور موجب ثواب ہے لیکن اس کا ایسا التزام و اہتمام جو سوال میں مذکور ہے' بلاشبہ بدعت ہے- اجتناب اس سے واجب ہے- شرح مبینہ میں ایسے التزام کے بدعت ہونے کی تصریح موجود ہے- واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم- ۲۵/ محرم سنہ ۱۳۵۴ھ (کتبہ احقر محمد شفیع غفرلہ خادم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

مفتی دہلوی کا فتویٰ: ایصال ثواب فی ذاتہ جائز ہے لیکن مذکورہ بلا تخصیصات اور تعینات کسی اصل شرع سے ثابت نہیں- واللہ اعلم- (فقیر محمد یوسف دہلوی محلہ چوڑی گراں دہلی)

خلاصہ ان سب فتوؤں کا یہ ہے کہ میت کو ایصال ثواب درست ہے۔ لیکن اسی طریقہ سے جس طریقہ سے شرع میں آیا ہے لیکن اس زمانہ میں جن صورتوں کا تخصیصات و تعینات کے ساتھ التزام کر لیا گیا ہے کہ میت کے گھر اہل میت جمع ہوں۔ ماتمی فرش بچھا ہو' اہل میت کو کہنا کہ کلام بخشو پھر بحالت مجموعی سب کا کلام بخشنا اور اس کا اعادہ بار بار کرنا بدعت ہے۔ مسلمانوں کو اس سے بچنا واجب ہے ورنہ بدعت ایسی بری چیز ہے کہ اس سے سب نیک اعمال بھی مردود ہو جائیں گے اور توبہ بھی قبول نہ ہو گی۔

تعزیت کا مسنون طریقہ: تعزیت کسی اہل مصیبت اور جن کا کوئی مر جائے ان کو صبر دلانے اور تسلی کرانے کو کہتے ہیں۔ تعزیت مسنون ہے۔ اہل میت کو صبر کی تلقین کرنا اور تسلی دینا سنت ہے۔ تعزیت کرنے والوں کو اجر ملتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان اپنے کسی بھائی کی مصیبت میں اس کی تعزیت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن بزرگی کا حلہ پہنائے گا۔ فائدہ اس تعزیت کا یہ ہے کہ مغموم اور متفکر دلوں کو تسلی ہو جاتی ہے اور صبر آجاتا ہے اور اس ہمدردی کے اظہار سے ان کے دلوں کو سکون حاصل ہو جاتا ہے اور ہمدردی کرنے والے کو ثواب ملتا ہے۔ یہ تعزیت خواہ دفن سے پہلے کرے خواہ بعد دفن کے کرے۔ ایک بار مسنون ہے۔ حدیث اور فقہ سے یوں ہی ثابت ہے کہ تعزیت خواہ میت کے گھر جا کر کرے یا راستہ میں مل کر کر لے یا مسجد میں اتفاق ہو جائے تو وہاں کر لے' تعزیت ہو جائے گی اور ثواب مل جائے گا اور اگر دور ہو تو خط بھیج کر بھی تعزیت کر سکتا ہے۔

چنانچہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا لڑکا فوت ہوا تو آنحضور ﷺ نے ان کو خط بھیج کر تعزیت فرمائی تھی۔ تعزیت کے لیے کوئی خاص الفاظ اور دعا مقرر نہیں ہے۔ بس ایسے الفاظ کہنے چاہئیں جن سے اہل میت کو صبر اور تسلی آجائے اور میت اور اہل میت کو ہمدردی ظاہر ہو جائے۔ مثلاً یوں کہے تمہاری میت پر اللہ رحم کرے۔ وہ اللہ کی امانت تھی' اس نے لے لی۔ تم صبر کرو' اللہ تعالیٰ تم کو اجر دے گا۔ انا للہ پڑھے وغیرہ وغیرہ۔ پس اس سے زائد جو رسومات زمانہ حال میں مروج ہیں' وہ بدعت ہیں۔ جو دفن سے پہلے اہل میت کے پاس ہمدردی کرنے جائے یا جنازہ میں مل جائے یا دفن کے وقت دعا کر جائے اور جنازہ و دفن کے وقت اہل میت کو تسلی دے جائے' اس کو دوبارہ ماتمی فرش پر آنا اور فاتحہ خوانی کرنا جیسا کہ عام رواج ہے یہ

بدعت ہے، اس سے بچنا واجب ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سنت پر عمل کرنے کی توفیق بخشے اور رواج اور بدعت اور برادری کی رسومات اور ریاکاری کے عملوں سے بچائے۔

وما علینا الا البلاغ وأخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

عبدالقادر عارف الحصاری۔

الاعتصام سوہدرہ جلد۔۴، شمارہ۔۱، ۲، ۳، مورخہ یکم و ۸ و ۲۱ جنوری سنہ۔۱۹۵۲ء